مکتبہ جامعہ دہلی

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے

سیاست کی پہلی کتاب   قیمت   مہر

اجتماعی زندگی کی ابتدا ر . . . . " . . . ۵ر

ہندوستان کا دیہی قرض . . . . " . . . مہر

مسئلہ آبادی . . . . " . . . . مہر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

دہلی ۔ نئی دہلی ۔ لاہور ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی

جلد ۳۳ - نمبر ۱ | جنوری سنہ ۱۹۴۰ء | چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

فہرستِ مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

ہندوستان کی بہترین اُردو کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو اُردو اکاڈمی کے ممبر ہو جائیے۔ اور کتابیں مفت پڑھئے۔ قواعد وضوابط ذیل کے پتہ سے طلب کیجئے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ۔ نئی دھلی

جلد ۳۳ نمبر ۸ | فروری سنہ ۱۹۴۰ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

• پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

ہندوستان کی بہترین اردو کتابوں کا مطالعہ کرنا
چاہتے ہوں تو اُردو اکاڈمی کے ممبر ہو جائیے۔ اور
کتابیں مفت پڑھیے۔ قواعد وضوابط ذیل کے پتہ سے
طلب کیجئے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی

جامعہ

زیر ادارت:۔ نورالحسن ہاشمی۔ ایم۔ اے

جلد ۳۳ ۔ نمبر ۳	مارچ سنہ ۱۹۴۰ء	چندہ سالانہ ۵ روپے فی پرچہ ۸ آنے

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن مجیب المطابع دہلی

آپ کی کتابوں کی طباعت

آپ اپنی کتابوں کی طباعت واشاعت ہمارے سپرد فرماکر مندرجہ ذیل باتوں سے بالکل مطمئن ہو سکتے ہیں :-

۱- کتاب صحیح چھپے گی ۔

۲ - دیدہ زیب کتابت ہوگی ۔

۳- اچھا دبیز کاغذ استعمال کیا جائے گا ۔

۴ - نفیس طباعت ہوگی ۔

۵- نہایت خوشنما اور مضبوط جلد سازی کی جائے گی ۔

۶ - بہت خوبصورت گرد پوش دیا جائے گا ۔

غرضکہ

آپ کی کتاب جملہ لوازم طبع سے آراستہ ہوگی

لیکن

یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب

(۱) آپ اپنی کتاب کی طباعت کا انتظام ہمارے سپرد فرمائیں ۔

(۲) سستے خراب کام کے مقابلے میں اچھے نفیس کام کے لیے نسبتاً زیادہ خرچ کریں ۔

مکتبہ جامعہ، قرولباغ ، دہلی

جامعہ

زیر ادارت :- نور الحسن ہاشمی۔ ایم۔ اے

جلد ۳۳ - نمبر ۴	اپریل سنہ ۱۹۴۰ء	چندۂ سالانہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن۔ محبوب المطابع دہلی

ہندوستان کی بہترین اردو کتابوں کا مطالعہ کرنا
چاہتے ہوں تو اُردو اکاڈمی کے ممبر ہو جائیے۔ اور
کتابیں مفت پڑھیے۔ قواعد و ضوابط ذیل کے پتہ سے
طلب کیجیے۔

مکتبہ جامعہ ملیّہ۔ نئی دہلی

آپ کی کتابوں کی طباعت

آپ اپنی کتابوں کی طباعت و اشاعت ہمارے سپرد فرما کر مندرجہ ذیل باتوں سے بالکل مطمئن ہو سکتے ہیں:-

۱. کتاب صحیح چھپے گی۔

۲. دیدہ زیب کتابت ہوگی۔

۳. اچھا دبیز کاغذ استعمال کیا جائے گا۔

۴. نفیس طباعت ہوگی۔

۵. نہایت خوشنما اور مضبوط جلد سازی کی جائے گی۔

۶. بہت خوبصورت گرد پوش دیا جائے گا۔

غرضکہ

آپ کی کتاب جملہ لوازم طباعت سے آراستہ ہوگی

لیکن

یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب

(۱) آپ اپنی کتاب کی طباعت کا انتظام ہمارے سپرد فرمائیں۔

(۲) سستے خراب کام کے مقابلے میں اچھے نفیس کام کے لئے نسبتاً زیادہ خرچ کریں۔

جامعہ

زیر ادارت :- نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۳ - نمبر ۵	مئی سنہ ۱۹۴۰ء	چندہ سالانہ صہ؍ فی پرچہ ۸؍

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے۔ آکسن۔ محبوب المطابع دہلی

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۴ - نمبر ۶	جون سنہ ۱۹۴۰ء	چندہ سالانہ ۵ھ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن۔ محبوب المطابع دہلی

جامعہ

زیر ادارت:۔ نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

چندہ سالانہ صہ فی پرچہ ۸ر	جولائی سنہ ۱۹۴۰ء	جلد ۳۳۔ نمبر ۷

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن محبوب المطابع دہلی

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۳ - نمبر ۷	اگست سنہ ۱۹۴۰ء	چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے آکسن۔ محبوب المطابع دہلی

اُردو کی لائبریری

آپ اپنی تیار کر سکتے ہیں طریقہ بہت آسان
ہے اُردو اکادمی کے ممبر ہو جائیے دو چار سال
میں آپ کی بہترین اُردو کی کتابوں کی لائبریری تیار
ہو جائیگی۔ اکادمی کے قواعد وضوابط ذیل کے سے
طلب کیجئے

مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی

جامعہ

زیر ادارت:۔ نورالحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۳ نمبر ۹	ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء	چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر (آٹھ آنہ)

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن محبوب المطابع دہلی

جامعہ

زیرِ ادارت :- نورالحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۳ نمبر ۱۰ | بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے آکسن۔ محبوب المطابع دہلی

اُردو کی لائبریری

آپ اپنی تیار کر سکتے ہیں طریقہ بہت آسان ہے

اُردو اکادمی کے ممبر ہو جائیے دو چار سال میں آپکی

بہترین اُردو کی کتابوں کی لائبریری تیار ہو جائیگی

اکادمی کے قواعد و ضوابط ذیل کے پتہ سے طلب کیجیے

مکتبۂ جامعہ نئی دہلی

جامعہ

زیرادارت :- نورالحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۳ نمبر ۱۱ | بابتہ ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء | چندہ سالانہ ۵ فی پرچہ ۸ آنہ

فہرست مضامین

پرنٹر وپبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن)، محبوب المطابع دہلی

اُردو
کی لائبریری

آپ بھی اپنی تیار کر سکتے ہیں، طریقہ بہت آسان ہے صرف
اُردو اکادمی کے ممبر ہو جائیے دو چار سال میں آپ کی بہترین
اُردو کی لائبریری تیار ہو جائے گی اکادمی کے
قواعد وضوابط ذیل کے پتہ سے طلب کیجئے

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۳۔ نمبر ۱۲ | بابتہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء | چندہ سالانہ ۵؎ فی پرچہ آٹھ آنہ ۸؍

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

ریاست کے بارے میں اس انداز سے لکھنا شروع کیا جس سے معلوم ہوگیا کہ ہر ہٹلر اس کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، اور ۱۶ مارچ کو جرمنی کا اس ریاست پر قبضہ بھی ہوگیا شیر شکار کو نکلا تھا۔ گیدڑ بھی اس کے پیچھے لگ گئے۔ جرمنی نے چکوسلوواکیا کے دھڑ کو ہڑپ کیا تو دم اور پائے پولینڈ اور ہنگری اڑا لے گئے۔ اسی ہلڑ میں اٹلی نے البانیہ پر حملہ کر دیا اور اُسے دبوچ کر بیٹھ گیا (۷ اپریل)

پچھلے سال ستمبر میں میونچ کی کانفرنس میں ہر ہٹلر نے وعدہ کیا تھا کہ انھیں اُن کا حق مل گیا تو پھر وہ چکوسلوواکیا کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ ان کی عہد شکنی سے مسٹر چیمبرلین کو بہت صدمہ ہوا، اور اگرچہ وہ ایسے نیک ہیں کہ جرمنی اور اٹلی کو راضی کرنے اور راضی رکھنے کی خواہش ان کے دل سے نہیں نکلی تھی، انھوں نے سوچا کہ برطانیہ کو پیش قدمی کرکے جرمنی اور اٹلی کی سیاست کو قابو میں کرنا چاہیے۔ چنانچہ مارچ، اپریل اور مئی میں انھوں نے برطانیہ کو پولینڈ، رومانیہ یونان اور ترکی کی سلامتی کا ذمہ دار بنایا، اور ترکی سے ۱۲ مئی کو ایسا معاہدہ بھی کر لیا کہ وہ تجارت اور سیاست میں روس اور جرمنی کا دستِ نگر نہ رہے۔ وسط جون میں انھوں نے بڑی ہمت کرکے روس سے بھی گفتگو چھیڑی۔ اس خیال سے کہ اب تو ضرور ہر ہٹلر کو یقین ہو جائے گا کہ برطانوی حکومت ہوشیار ہوگئی ہے اور اس کی مخالفت خالی نصیحت نہیں بلکہ سیاسی مقابلے کی شکل اختیار کرے گی۔ ہر ہٹلر نے الزام لگانے اور بدنام کرنے کو ایک فن بنا دیا ہے، اور انھیں برطانوی سیاست کی ان کارروائیوں نے الزام لگانے کا پورا موقع دیا۔ انھوں نے فوراً اعلان کیا کہ برطانیہ انھیں گھیرنے کی فکر کر رہا ہے، انھیں ایک خوں خوار درندہ ٹھہرا کر چاہتا ہے کٹہرے میں بند کر دے۔ وہ پولینڈ سے ڈانزگ کے معاملے میں جھگڑ گئے، اور ۲۸ اپریل کو ایک طرف تو اس معاہدے کو منسوخ قرار دے دیا جو انھوں نے برطانیہ سے بحری قوت کا توازن قائم کرنے کے لئے کیا تھا اور دوسری طرف اس معاہدے کو ختم کر دیا جو ۱۹۳۴ء میں پولینڈ اور جرمنی کے درمیان ہوا تھا۔ پھر

یہ دکھانے کے لئے کہ جس طرح جرمنی اور اٹلی کے درمیان مسٹر چیمبرلین خیر خواہ بن کر کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کر سکے ویسے ہی اب وہ مخالف بن کر کوئی رخنہ اندازی نہ کر سکیں گے۔ ہر ہٹلر نے ۲۲ مئی کو مسولینی سے باضابطہ معاہدہ کر لیا۔ ظاہر میں تو یہ معاہدہ صرف گہری دوستی قائم رکھنے کا عہد و پیمان ہے۔ لیکن اس کی چند خفیہ دفعات بھی ضرور ہوں گی۔ یعنی جرمنی اور اٹلی نے اپنا اپنا پروگرام طے کر لیا ہوگا، تاکہ دونوں بغیر کسی غلط فہمی کے اپنے خاص محاذ پر آگے بڑھ سکیں اور اپنے ارادے پورے کر سکیں۔ معاہدے سے چار دن پہلے، یعنی ۱۸ مئی کو جنرل فرینکو میڈرڈ میں داخل ہو چکے تھے، اور جرمنی اور اٹلی کی مدد سے ہسپانیہ کی سوشلسٹ حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اٹلی اور جرمنی کا معاہدہ اس کا دعوی تھا کہ آیندہ بھی اُن کا اتحادِ عمل قائم رہے گا اور اسی طرح کامیاب ہوگا۔

اس کا صحیح اور مناسب جواب تو یہ تھا کہ برطانیہ روس سے معاہدہ کر کے اس کا انتظام کرے کہ جن ملکوں کی سلامتی کا اس نے ذمہ لیا تھا ان کی وہ واقعی حفاظت کر سکے۔ لیکن روس جس طرح کا ہمہ گیر معاہدہ کرنا چاہتا تھا اس کے لئے انگریز تیار نہیں تھے، گفتگو نے طول کھینچا اور اس درمیان میں ہر ہٹلر نے پولینڈ پر اتنے شدید الزام لگا دیئے تھے کہ اس کو سزا دینا اُن کا اخلاقی اور سیاسی فرض ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی برطانیہ کو غصہ نہیں آیا اور ہر ہٹلر نے اس کے ضبط اور تحمل کو دیکھ کر روس کی وہ تمام شرطیں منظور کر لیں جن پر برطانیہ سے حجت ہو رہی تھی۔ کوئی چوبیس گھنٹے کے اندر روس اور جرمنی میں معاہدہ ہو گیا، برطانیہ کے نمائندے روس سے اس طرح نکلے کہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں کوئی ڈرا دھمکا کر بھگا رہا ہے اور پولینڈ کی قسمت کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ ۲۴ اگست کو روس اور جرمنی کا معاہدہ ہوا، ۲۵ اگست کو برطانیہ اور پولینڈ کا معاہدہ۔ یہ سب جانتے تھے کہ برطانیہ پولینڈ کو کسی طرف سے مدد نہیں پہنچا سکتا، ۲۵ اگست کے معاہدے کا نتیجہ صرف یہ ہو سکتا تھا کہ جرمنی دانت پیس کر پولینڈ پر حملہ کرے اور اسے مار کر ہی چھوڑے۔

پولینڈ مردوں کی برائی نہ کرنا ایک اچھا اصول ہے جس پر عمل کرنا تہذیب میں شامل ہو گیا ہے لیکن ہم کو دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھانا اور عبرت بھی حاصل کرنا چاہیئے اور پولینڈ کی مثال ایسی ہے کہ جن کا ذکر کئے بغیر سیاست کا سبق ادھورا رہ جاتا ہے۔

پولینڈ کا اٹھارویں صدی میں روس، جرمنی اور آسٹریا کے درمیان تین دفعہ بٹوارہ ہوا، لیکن یہ قوم ایسی تھی کہ مصیبت کو سر پر سوار دیکھ کر اُسے ہوش نہ آیا۔ گدھوں اور چیلوں کو منڈلاتے دیکھ کر اُسے خیال نہ ہوا کہ یہ مردار کھانے والے پرند کس اُمید میں ہیں۔ جنگِ عظیم کے بعد پولینڈ کی ریاست نئے سرے سے قائم کی گئی، اور باوجودیکہ اسے دشمن ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے اس نے اپنے بچاؤ کی تدبیر نہ کی۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں جرمنی اس قدر کم زور تھا کہ اُسے پولینڈ سے دوستانہ معاہدہ کئے بغیر بن نہ پڑا، لیکن پولینڈ نے جرمنی کی بڑھتی طاقت دیکھ کر اپنی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کیا، بلکہ اپنے جانی دشمن کو اپنا خیر خواہ سمجھتا رہا۔ ایسی قوم دشمن کا میدان میں بھی کیا مقابلہ کرتی۔ لڑائی میں سپاہیوں نے جواں مردی سے جان دی اور سپہ سالاروں اور مدبروں نے بھاگ کر لندن اور پیرس میں پولینڈ کی 'آزاد' حکومت قائم کی۔

جرمنی کی سیاست ہر ہٹلر اپنی سیاست کے تمام مقاصد اپنی تصنیف "میری جد و جہد" میں بیان کر چکے ہیں۔ لیکن برطانیہ کیا، ساری دنیا کے سیاسی لیڈر کتابیں بہت کم پڑھتے ہیں اور ان کے دل سے یہ خیال نہیں نکل سکتا کہ کتابیں وہی لوگ لکھتے ہیں جو اور کسی کام کے لائق نہیں ہوتے۔ ہر ہٹلر کی سیاسی کارگذاری سے سب واقف ہیں ان کی تقریریں غور سے سنتے یا پڑھتے ہیں، مگر اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا کہ تقریر کسی خاص معاملے کے متعلق اور ایک وقتی چیز ہوتی ہے اور "میری جد و جہد" میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جب ہر ہٹلر نے صلح نامہ درسائی کی مخالفت شروع کی تو برطانیہ نے اُن سے مصلحت آمیز ہمدردی برتی۔ انھیں جرمنی کی فوجی طاقت بڑھا لینے دی، آسٹریا کو ملحق کر لینے دیا۔ چیکوسلوواکیا کے جرمن علاقے دلوا دئے۔ اور میونچ کانفرنس میں ہر ہٹلر نے کہا کہ اب

وہ اور زمین کی ہوس نہ کریں گے تو اُن کے قول پر اعتبار کیا۔ اسی وجہ سے جب ہٹلر نے چکوسلوواکیا کے چک علاقوں پر قبضہ کرلیا اور اسی کے ساتھ اپنی سیاست کے ایک اور زیادہ وسیع مقصد کا اعلان کیا تو سب کو ان کی بے باکی پر حیرت ہوئی اور اُن کی وعدہ خلافی پر غصہ آیا لیکن ہر ہٹلر نے موقع کو مناسب دیکھ کر کوئی نئی بات نہیں کہی تھی۔ وہ اپنے اصل سیاسی مقصد کو میری جدوجہد میں وضاحت کے ساتھ پیش کرچکے ہیں، اور اُن کا اصل منشار اسی مقصد کو حاصل کرنا ہے۔ اب تک جو تماشا انھوں نے دکھایا ہے وہ اس بڑے تماشے کی تمہید تھی۔

چکوسلوواکیا پر قبضہ کرنے کے بعد ہر ہٹلر نے دعوےٰ کیا کہ جرمنی کو (LEBERSRAUM) چاہیے۔ اس اصطلاح کے لفظی معنی ہیں "رہنے کے لیے جگہ" لیکن اس میں بڑی لوچ ہے، یہ "سمٹے تو دل عاشق، پھیلے تو زمانہ" ہے، اس سے مراد غریب کا جھونپڑا بھی ہو سکتا ہے اور امیر کا محل بھی، قوم کا آزاد اور خوش حال ہونا بھی اور اس کا دنیا پر حکومت کرنا بھی۔ ہر ہٹلر کی نظر میں جرمنی کی آزادی اور خوش حالی نہیں ہے بلکہ دنیا پر اس کی حکومت، کیوں کہ وہ دوسرے سلسلے میں اس کا دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ آرین یا نورڈک نسل، جس کا سب سے خالص نمونہ جرمن قوم ہے۔ دنیا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ ہر ہٹلر کی خاص عنایت یا شاید وقت کی مصلحت ہے کہ وہ اپنی قوم کے لئے "رہنے بھر کی جگہ" یا "ہاتھ پانوں پھیلانے کی جگہ" مانگتے ہیں۔ دنیا کی حکومت نہیں مانگتے۔ مگر وہ بڑے ڈھیٹ ہیں، انھیں کامیابی ہوتی رہی تو وہ اُسے بھی مانگ بیٹھیں گے۔

دیکھنے میں یہ اُن کا مطالبہ صریحی زیادتی ہے۔ مگر ہر ہٹلر کی منطق ہی نرالی ہے وہ پوچھتے ہیں کہ برطانیہ اور فرانس کو کس نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ یورپ کی ہر قوم کے طرزِ عمل کو جانچیں اور جسے مناسب سمجھیں قصور وار ٹھہرائیں۔ کس نے انھیں پنچ بنایا ہے کہ وہ ہر معاملے میں دخل دیں اور جس قوم کے حوصلے کو چاہیں یہ کہہ کر دبا دیں کہ یہ آئین سیاست اور اخلاق یعنی ان کی اپنی مصلحت کے خلاف ہے۔ جرمنی بہر حال ان کے سامنے جواب دینے یا اپنی

صفائی پیش کرنے پر مجبور نہیں۔ اس کی سیاست اس کے اپنے اختیار کی چیز ہے، اور جب تک برطانیہ اور فرانس یہ ثابت نہ کر دیں کہ جرمنی انھیں کوئی نقصان پہنچا رہا ہے انھیں روک ٹوک کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہر ہٹلر کو یقین ہے کہ چکوسلوواکیا اور پولینڈ پر جرمنی کا قبضہ ہو جانے سے برطانیہ اور فرانس نے کوئی نقصان نہیں اُٹھایا، اگر انھوں نے ان دونوں ملکوں کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ جرمنی کی ترقی روکی جائے۔ جرمنی سے توقع کرنا بالکل غلط ہے کہ اگر دوسرے اسے زنجیروں میں جکڑیں تب بھی وہ زنجیروں کو توڑنے کی کوشش نہ کرے گا۔

اب تک ہر ہٹلر اپنے تمام منصوبے پورے کر چکے ہیں۔ اب آگے ان کی سیاست برطانیہ اور فرانس کے رویے پر منحصر ہوگی۔ وہ ہر موقع پر برطانیہ اور فرانس کو یقین دلاتے رہے ہیں کہ جرمنی کو اُن سے کوئی عداوت نہیں، اور اس کے لئے وہ یہ کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ انھوں نے فرانس اور جرمنی کی موجودہ سرحد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی سرحد مان لیا ہے اور اس کے آگے وہ کبھی نہ بڑھیں گے۔ آخر اگست میں جنگ چھڑنے سے پہلے انھوں نے فرانس کے وزیر اعظم موسیو دلادئے کو پھر اس کا یقین دلایا تھا لیکن ہر ہٹلر چاہتے ہیں کہ انھوں نے یورپ کی جو تقسیم سوچی ہے اسے فرانس اور برطانیہ دونوں تسلیم کر لیں اور یہ تجویز سیاست اور اخلاق کے مانے ہوئے اصولوں کے اس قدر خلاف ہے کہ برطانیہ اور فرانس کبھی اس پر راضی نہیں ہو سکتے۔ ہر ہٹلر اب کہتے ہیں کہ اچھا، نہ سہی۔ آپ میری بات ماننے سے انکار کرتے رہیئے۔ میں نے جو کچھ سوچا ہے وہ میں کرتا رہوں گا۔

ہر ہٹلر نے جو کچھ سوچا ہے وہ ان کی اگست اور ستمبر کی تقریروں سے اور اس معاہدے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے جو انھوں نے روس سے کیا ہے۔ انھوں نے یورپ کو چند حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک بحر روم کا حلقہ ہے، کہ جس میں وہ اٹلی کو سب سے بڑا حصہ دار مانتے ہیں، دوسرا شمال مغربی یورپ کہ جس میں وہ برطانیہ اور فرانس

کو ہر طرح کا اختیار دیتے ہیں۔ تیسرا حصہ وسطی یورپ ہے، جس پر کہ جرمنی کے سوا کسی کا حق نہیں، چوتھا جنوب مشرقی یورپ۔ اس میں سے وہ بحر اڈریاٹک کا مشرقی ساحل یعنی یوگوسلاویا، مقدونیا اور یونان وہ اٹلی کو دینا چاہتے ہیں اور رومانیہ کا شمالی حصہ، یعنی بس آرابیہ، وہ روس کو دے دیں گے۔ باقی سب پر جرمنی کی عمل داری ہونا چاہیے۔ پولینڈ کو تقسیم کرنے کا ارادہ شاید اسی وقت کر لیا گیا تھا جب روس سے معاہدہ ہوا، اور اسی وقت یہ بھی طے کر لیا گیا کہ روس اگر لتھوئینا، لیتویا، استونیا اور فن لینڈ کو فوجی معاہدے کرنے پر مجبور کرے تو جرمن کو اس پر اعتراض نہ ہوگا۔ چنانچہ ۱۹ ستمبر کو پولینڈ، روس اور جرمنی کے درمیان تقسیم ہو گیا، اور ۱۰ اکتوبر تک لتھوئینا، لیتویا اور استونیا نے روس سے اس کے حسب منشا معاہدے کر لیے۔ صرف فن لینڈ سے سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس سے اب لڑائی ہو رہی ہے۔

ہر ہٹلر نے اس محاذ پر اپنا مقصد حاصل کر لیا تو پھر وہ برطانیہ اور فرانس سے مخاطب ہوئے اور ۶ اور ۱۰ اکتوبر کی تقریروں میں اپنے خاص انداز سے انھیں سمجھانا چاہا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب لڑائی جاری رکھنا فضول کی ضد کرنا ہے۔ لیکن برطانیہ کو ان کی تقریروں میں ندامت، افسوس اور بے باک سیاست سے توبہ کرنے کا ارادہ کہیں نظر نہ آیا، اور جنگ بدستور جاری رہی۔

برطانیہ کی سیاست دوسری طرف برطانیہ کے مطالبے بھی ایسے ہیں جنھیں ہر بھلا آدمی حق بجانب ضرور کہے گا۔ مگر سیاست کی موجودہ فضا میں اُن کا پورا کرنا مشکل ہے۔ برطانیہ آزاد جمہوری حکومت کا حامی ہے۔ لیکن جرمن قوم اس طرح کی حکومت نہیں چاہتی اور برطانیہ کے لیے اس کی کوشش کرنا بے کار ہے کہ جرمنی میں جمہوری حکومت قائم ہو۔ برطانیہ نے ہر ہٹلر پر یہ الزام لگایا ہے، جو کہ حقیقت میں بالکل صحیح ہے کہ وہ جھوٹے وعدے کرکے لوگوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں، اور اس سے بڑھ کر یہ الزام ہے کہ انھوں نے دو آزاد ریاستوں کا خون کیا

ہے۔ یہ الزام بھی کون کہے گا کہ ثابت نہیں۔ لیکن ایسے جرمنوں کو سزا دینا بھی دشوار ہے۔ ہرہٹلر
سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ سچ بولیں اور اگر وہ سچ بولنے کا ارادہ کرلیں تو ان کے اور
ساری دنیا کے لئے ہوگا بھی بہت اچھا، مگر اس کا وہ کسی کو یقین کیسے دلائیں گے کہ وہ سچ
بول رہے ہیں۔ چکوسلوواکیا اُن سے چھینا جا سکتا ہے، آسٹریا اور سڈیٹن علاقے بہرحال
ان کے قبضے میں رہیں گے اور اس قبضے کی وجہ سے چکوسلوواکیا ایسا بے بس ہو جاتا ہے
کہ اُسے اگل دینے کے بعد ہرہٹلر جب چاہیں اُسے پھر نگل جائیں گے اور برطانیہ اور فرانس
کچھ نہ کر پائیں گے۔ پولینڈ کو دوبارہ زندہ کرنا اور بھی مشکل ہے، کیونکہ آدھے پولینڈ پر روس
کا قبضہ ہے اور اس حصے کی آبادی نسل کے اعتبار سے اکر آئنی اور روسی ہے۔ یعنی اس
معیار کے مطابق جو پریسیڈنٹ ولسن نے جنگ عظیم کے بعد مقرر کیا تھا اس علاقے پر پولینڈ
کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ رہا جرمنی کا حصہ سو اسے واپس نہ کرنے کے لئے یہ عذر رہے گا کہ
روس نے اپنا حصہ نہیں چھوڑا تو وہ اپنا کیوں چھوڑے۔ پولینڈ کی خاطر جرمنی سے لڑائی
ہو رہی ہے، روس کی دشمنی بھی مول لے لینا عقل مندی کی بات نہیں اور برطانیہ نے
اپنے نیک ارادوں کے باوجود اب تک روس کو تنبیہ نہیں کی ہے۔

پہلی ستمبر سے اس وقت تک برطانیہ اور جرمنی کی جنگ ہو رہی ہے لیکن جسے لڑائی کہتے
ہیں وہ ہوئی ہی نہیں۔ ریڈیو پر مقابلے ہوتے ہیں، کبھی غلطی سے ہوائی جہازوں کی مڈبھیڑ
ہو جاتی ہے۔ برطانیہ جرمنی کی، جرمنی برطانیہ کی تجارت بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے،
مگر اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ دونوں فریقوں کو نقصان اتنا کم
ہو رہا ہے کہ اس صورت میں جنگ برسوں جاری رہ سکتی ہے اگر عام آبادی ہوائی حملوں کے
مستقل خوف اور جنگ کی ضمنی تکلیفوں کو برداشت کرتی رہے۔ فرانس کی ماژی نو لائن اور
جرمنی کی زیگفریڈ لائن دونوں اس قدر مضبوط ہیں کہ انھیں توڑ کر نکل جانا ممکن نہیں معلوم
ہوتا۔ ۱۱ر نومبر کو جرمنی نے ہالینڈ کی سرحد پر بہت سے ہوائی جہاز اور حملے کے لئے

اور تمام سامان جمع کیا تھا۔ اُمید اس کی تھی کہ ہالینڈ پر دھاوا کیا گیا تب بھی بلجیم غیر جانب دار رہے گا۔ مگر یہ اُمید بے بنیاد ثابت ہوئی اور ہالینڈ پر حملہ کرنے کا منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ اس کے سوا مغربی محاذ پر جنگ کی نوعیت بدلنے کی اور کوئی صورت نہیں۔

اصل میں اس محاذ پر نہ جنگ کا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے نہ سیاست کا کوئی انقلاب۔ جو کچھ ہوگا مشرقی یورپ میں ہوگا۔

روس کی سیاست ادھر ہر چیز کا دارمدار روس کی سیاست پر ہے۔ ستالن نے جرمنی جیسے دین و ایمان کے دشمن سے دوستی اور باہمی امداد کا معاہدہ کر لیا ہے، برسوں سرمایہ داری اور ملوکیت پر لعنت بھیجنے کے بعد سرمایہ داری کی سب سے خوں خوار شکل یعنی فاشزم سے بغل گیر ہوا ہے اور فن لینڈ کو تباہ کر کے وہی سب کچھ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے جس کی وجہ سے سرمایہ داری حکومت ناقابل برداشت مانی جاتی تھی۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ روس کی سیاست کہاں پر دم لے گی، فن لینڈ پر قبضہ کر کے مطمئن ہو جائے گی یا سویڈن پر بھی حملہ کرے گی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ جرمنی کو روس کے ارادوں کا پتہ تھا یا نہیں اور ہر ہٹلر سمجھتے تھے کہ آدھے پولینڈ اور بحر بالٹک کے مشرقی ساحل پر مسلط ہو جانے کے بعد روس بیٹھ رہے گا یا اُن سے طے ہو گیا تھا کہ وہ فن لینڈ اور پھر سویڈن پر بھی قبضہ کرے گا۔ بہر حال اس کی ذمہ داری تو ہر ہٹلر پر ہے کہ انھوں نے روس کو گوشہ نشینی کا مسلک چھوڑنے پر آمادہ کیا اور اب جو وہ دنیا میں پہنچ گیا ہے تو دیکھنا ہے کہ اس کی ہوس کتنا زور باندھتی ہے۔

پھر بھی ہر ہٹلر روس کی ہوس سے اس قدر خائف نہ ہوں گے جتنا کہ اخباروں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے وہ روسیوں کو اپنی قوم کے مقابلے میں نکمّے سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ روس کی صنعتی ترقی قریب قریب انتہا کو پہنچ چکی ہے، اور اب بھی یہ حال ہے کہ جرمن انجنیرں اور مشینوں کے بغیر اس کا کام نہیں چلتا۔ روس نے جتنی زیادہ ہوس کی اتنا ہی وہ کم زور ہو جائے گا، اور اس کی ہوس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ دنیا کے سرمایہ دار ملک، برطانیہ

جاپان ، امریکہ ، فرانس سب اس کی مخالفت پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر روس نے زیادہ ہوس نہ کی تب بھی ہر ہٹلر کی کوئی تدبیر الٹ نہیں جاتی۔ وہ جنگ کو بدستور جاری رکھیں گے اور روس اور اٹلی کو مال غنیمت میں شریک کر کے جنوب مشرقی یورپ کو تقسیم کر لیں گے۔

سیاست کا نیا انقلاب | شاید ۱۲ دسمبر کو جنیوا سے یہ خبر آئی تھی کہ بہت سے جرمن نامہ نگار خوب صورت خوب صورت عورتوں کو بطور سکریٹری ساتھ لے کر لیگ کے اجلاس کا تماشا دیکھنے آئے اور اسی سلسلے میں انھوں نے نہایت بے تکے طریقے پر یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ اور فرانس جرمنی سے ان شرطوں پر صلح کر لیں کہ جرمنی چکوسلوواکیا کے خالص چیک اور سلوواک علاقوں کو آزاد کر دے ، اور ڈانزگ اور پولینڈ کے اس حصے کے سوا جو "برآمدہ" کہلاتا ہے باقی ملک کو جو اس کے قبضے میں آیا ہے چھوڑ دے ، اور اس میں ایک آزاد پول ریاست قائم کر دی جائے۔ برطانیہ اور فرانس نے بظاہر اس تجویز کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ اور جب وہ خود ہر ہٹلر کی بات پر اعتبار نہیں کرتے تو چند مسخرے نامہ نگاروں کی تجویزوں کو کیوں سنتے۔ لیکن یہ تجویز بذاتِ خود ایسی معقول ہے ، اور روس کی نو خیز ملوکیت نے کچھ ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ برطانیہ اور فرانس ان شرطوں پر صلح کر لیں تو کوئی تعجب نہ ہوگا۔ اگر برطانیہ اور فرانس نے واقعی صلح کر لی تو پھر ہر ہٹلر کو روس سے لڑائی چھیڑنے میں کچھ دیر نہ لگے گی، اور تب پھر کیا ہے ، جرمن قوم کے حوصلے ہوں گے اور ترقی کے لئے ایک وسیع میدان۔

اٹلی کی سیاست | جب سے جنگ شروع ہوئی ہے سینور مسولینی اس طرح سے خاموش ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اُن کا مزاج ہی بدل گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس دوران میں بیمار ہوئے بعض کہتے ہیں کہ اُن کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور وہ انھیں کا توڑ کرنے میں معروف ہیں۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اٹلی کا کسی یورپی جنگ میں شریک ہونے کا ارادہ نہیں ، اور فی الحال ہر ہٹلر نے اپنی مصلحت سے سینور مسولینی کو غیر جانب دار رہنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ اٹلی ، برطانیہ اور فرانس کی مصروفیتوں اور مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اپنی تجارت

کو بڑھا رہا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بہت سا مال جو شمال کے بحری راستوں سے برطانوی بلوکیڈ کے سبب جرمنی نہیں پہنچ سکتا وہ ادھر سے جاتا ہوگا۔

لیکن اب جو صورت پیدا ہونے والی ہے وہ کچھ ایسی ہوگی کہ سینور مسولینی اس وقت کی طرح اطمینان سے نہ بیٹھ سکیں گے۔ ہر ہٹلر نے روس سے اشتراک عمل قائم رکھ کر جنوب مشرقی یورپ کی نئی تقسیم کی تو یوگوسلاویا اٹلی کو پیش کیا جائے گا، اور اٹلی نے تحفہ قبول نہ کیا تو یہ ملک جرمنی کے قبضے میں چلا جائے گا۔ اٹلی والے اس پر پریشان ہیں کہ جنوبی ٹیرول میں اُن کی سرحد جرمنی سے مل جاتی ہے، اور وہ یہ کسی طرح گوارا نہ کر سکیں گے، کہ بحر ایڈریاٹک کا سارا مشرقی ساحل جرمنی کے قبضے میں پہنچ جائے۔ سینور مسولینی کو تحفہ قبول ہی کرنا ہوگا۔ اور برطانیہ اور فرانس کو کسی نہ کسی طرح اس پر آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ انھیں یوگوسلاویہ پر حملہ کرنے کے باوجود غیر جانب دار مانتے رہیں۔ اس میں وہ کامیاب ہوں گے یا نہ ہوں گے یہ بالکل اُن کے سلیقے پر منحصر ہے۔

ترکی کی سیاست | ترکی نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس کا بھی اس موقع پر امتحان ہوگا۔ ترکوں کو روس سے کوئی اندیشہ نہیں ہے، جرمنی کی بات انھوں نے نہیں مانی اور ہر ہٹلر اُن سے بہت خفا ہیں لیکن ترکوں کو اس کا ڈر نہیں ہے کہ جرمنی اُن کے ملک کو بھی فتح کرے گا۔ ترکوں کے لئے خطرہ اس کا ہے کہ جرمنی کے بھروسے پر اٹلی مشرقی بحر روم میں قدم بڑھائے اور ترکی کو اس طرح گھیرے کہ وہ اٹلی کی سیاست کا بالکل پابند ہو جائے اور اٹلی کی منظوری کے بغیر دنیا میں کسی سے دوستانہ یا کاروباری تعلقات قائم نہ کر سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ترکوں کو مجبور دیکھ کر اٹلی اناطولیہ کے مغربی ساحل پر قبضہ کرنا چاہے، اگرچہ اٹلی کی ہمت مردانہ ایسی مہم کو بائیں ہاتھ کا کھیل نہ سمجھ سکے گی۔

موجودہ بین الاقوامی سیاست
فن لینڈ
منظور، منظور
لتھونیا
لٹیویا
نازی
کہو بھئی اس طرف گھیرنے
پر کوئی اسپیچ دی ؟
بلقان
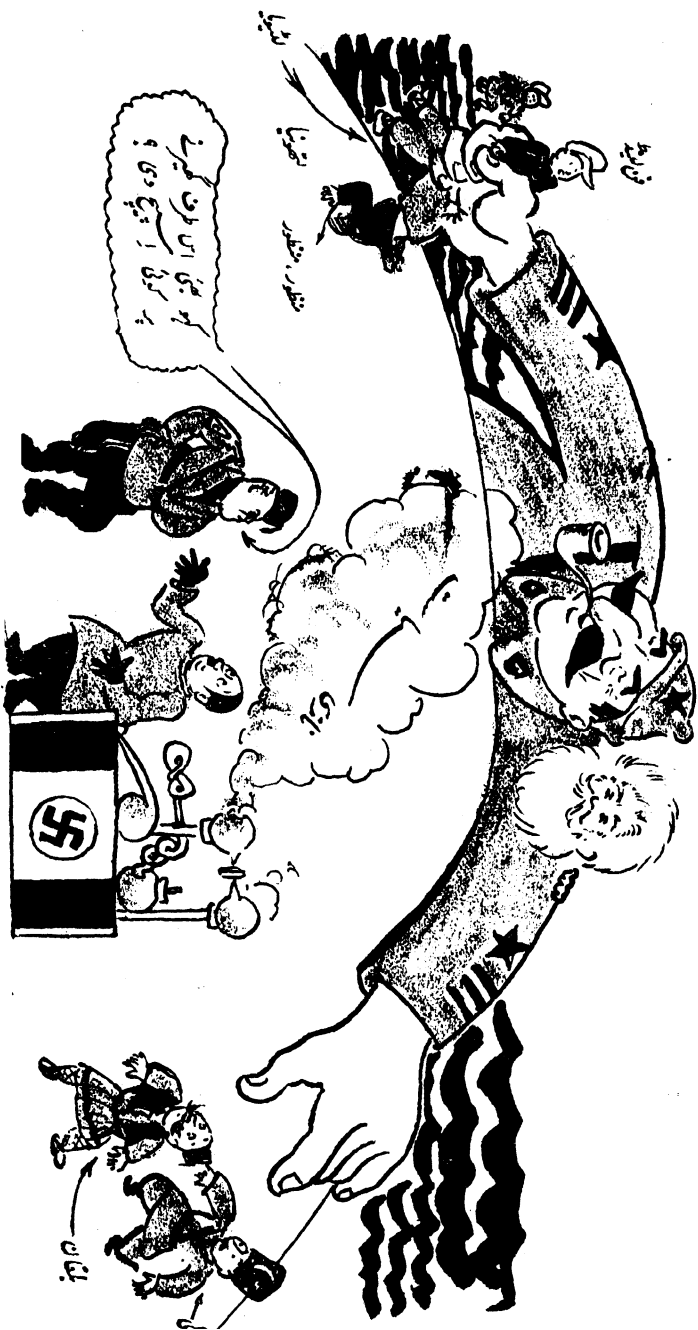
مُسلمانانِ چین

خواجہ معین الدین صاحب بی اے (عثمانیہ)

اسلام اور چین اسلام سے قبل ایام جہالت میں عرب تاجر خشکی کے راستے سے وسط ایشیا تک آتے تھے اور بحری راستے سے جزائر ملایا و جزائر شرق الہند سے گذر کر چین کے جنوبی بندرگاہوں سے تجارت کیا کرتے تھے اور اس زمانے میں عرب تاجر بین الاقوامی تجارت کے گویا ٹھیکے دار تھے۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر اسلام مبعوث ہوئے اور اسلامی تعلیمات عرب میں پھیل گئیں اور جب تمام عربی قبائل مشرف بہ اسلام ہوئے تو یہ مسلمان عرب تاجر مال و اسباب کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی وسط ایشیا میں لائے اور جب اسلام عرب سے بڑھ کر تمام ایشیا و شمالی افریقہ میں پھیل گیا تو خلافتِ راشدہ کے دور میں اسلامی فتوحات کا سیلاب وسط ایشیا تک پھیل گیا۔ سنہ ۶۳۸ء میں شاہ ایران یزدگرد مسلمانوں سے شکست کھاکر مرے فرار ہوگیا اور شاہنشاہ چین ٹانگ سے مدد طلب کی اور سنہ ۶۵۰ء میں عرب حملہ آوروں کے خلاف خسرو نے شاہنشاہ چین سے پھر دوبارہ مدد طلب کی تھی۔

خلفائے بنی اُمیّہ کے زمانے میں حضرت قطیبہ نے افغانستان سے بڑھ کر بخارا، سمرقند، فرغانہ اور کاشغر کو فتح کرلیا۔ یہ علاقے آج کل سویٹ روس کے قبضے میں ہیں۔ جب وسط ایشیا پر قطیبہ کا قبضہ ہوگیا تو انھوں نے ٹنگ دربار میں اپنا وفد روانہ کیا۔ جب مسلم قاصد شاہنشاہ ہشین ٹیشنگ کے دربار میں پہنچا اور جب اُس سے شاہنشاہ کو سجدہ کرنے کے لیے کہا گیا تو اُس نے جواب دیا کہ وہ صرف خدا کو سجدہ کرتا ہے اور حکمران کو نہیں۔ سنہ ۷۵۶،۷۵۷ء میں شاہنشاہ سیو ٹیسنگ نے اپنے باغی سرداروں کے خلاف خلیفہ ابو جعفر سے فوجی امداد طلب کی تھی اور

عربی افواج نے چینی جرنلوں کو جنھوں نے بغاوت کی تھی شکست دے کر ٹینگ دارالسلطنت کو پھر فتح کرلیا اور آن لیو شان کی باغی افواج کا بالکلیہ خاتمہ ہوگیا اس طرح عربوں کی دھاک چینی سپہ سالاروں پر بیٹھ گئی اُن عرب افواج کی تعداد چار ہزار تھی وہ چین ہی میں آباد ہوگئی اور مقامی عورتوں سے شادیاں کرلیں اور صوبہ شنسی میں بس گئے۔ لاکھوں چینی انھیں عرب جنگ جو بہادروں کی اولاد ہیں۔ جنوبی چینی بندرگاہوں میں بہت سے عرب آباد ہوگئے تھے۔ اُن کی کوٹھیاں قائم تھیں۔ ابتدا ہی سے مسلمان نے اپنے جداگانہ ملت کو اور سماجی و مذہبی خصوصیات کو برقرار رکھا۔

خاندانِ سنگ کے دورِ حکومت میں (۹۶۰ء تا ۱۲۸۰ء) مسلمانوں کی تعداد چین میں بڑھنے لگی۔ بیرونی مسلمان بھی چینی عورتوں سے شادی کیا کرتے تھے اور چین ہی میں رہا کرتے تھے۔ وہ عموماً تجارت کے سلسلے میں یا سیر و سیاحت کے لئے آجایا کرتے تھے ینّن کی ایک تاریخی دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۰۷۰ء میں سوفیر دس ہزار فوج کے ساتھ بخارا سے آکر ینّن میں آباد ہوگیا تھا۔ موجودہ ینّن کے مسلمان اُنھیں مسلمانوں کی اولاد ہیں۔ خاندانِ سنگ کے بعد منگول خاندان چین میں برسرِ اقتدار ہوا اور اُن کی حکومت (۱۲۸۰ء تا ۱۳۶۸ء) تک رہی۔ اُن کے دورِ حکومت میں مسلمان سپاہی، مہم جو، علما، مبلغ اور تاجر کثیر تعداد میں آکر چین میں آباد ہونے لگے۔ منگول سلاطین نے مسلمانوں کو اعلیٰ خدمات عطا کیں۔ اُن کو ہر طرح کے حقوق اور مراعات دیے اور کنفیوشیئنزم کی طرح اسلام کی بھی ترقی کرنے کے لئے ماحول کو صاف کیا۔ سرکاری جانب سے اسلام کو خالص و سچا مذہب تسلیم کیا گیا اور ابھی تک اسلام کا سرکاری نام "شنگ شن شیو" ہے۔ اسی زمانے میں ایرانی بخاری، ترک اوگر اور دوسرے مسلمان قبائل چین میں آکر آباد ہوتے گئے اور عربی نسل کے مسلمانوں سے گھل مل گئے اور مسلمانوں نے اپنے ملت و سیاسی و مذہبی وحدت کو اس خوبی سے استوار کیا تھا کہ جب منگس بادشاہ چین پر حکمراں رہے اور کنفوشش

مذہب کے مقابلے میں اسلام کو دبایا گیا اور مسلمانوں پر بندشیں عائد کر دی گئیں تھیں۔ تو اسلام نہ چین سے غائب ہوگیا اور نہ مسلمان ختم ہوگئے۔ بلکہ اسلام نے منازل ارتقا کو طے کر ہی لیا۔ اس کے برعکس عیسائی جماعتیں ختم ہوگئیں۔ اس قدیم دور کی مساجد آج کل بھی جاری ہیں۔ منگ خاندان کے بعد مانچو خاندان برسراقتدار آیا اور اس نے ۱۶۴۴ء تا ۱۹۱۱ء تک حکومت کی۔ اسلامی علم و ادب میں ترقی ہونے لگی اور اسی دور میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت عمل میں آئی۔

خاندانِ مانچو کے دورِ حکومت ہی میں مسلم بغاوت کا آغاز ہوا جو صوبہ کالنسو میں ہوئی۔ مسلم افواج نے گورنر کو قتل کر دیا اور چار اہم شہروں پر قبضہ کر لیا پانچویں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ مگر بعد میں ایک کثیر چینی فوج نے انھیں منتشر کر دیا اور جنرل شنسی نے بغاوت کا خاتمہ کر دیا۔ اس وقت سے لے کر جنگ عظیم سے قبل تک شمالی مغربی سرحدوں پر ہمیشہ مسلمانوں نے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوتیں کیں جس کی وجہ سے شمال مغرب میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے بغاوتوں کا سب سے بڑا سبب ہمیشہ یہ رہا ہے کہ مسلمان آزاد مملکت قائم کرنا چاہتے تھے۔ بعض اوقات حکومت کے خلاف ان کو سماجی و مذہبی شکایات ہوا کرتی تھیں یا کبھی ناجائز ظلم و زیادتی کے خلاف وہ بغاوت کر دیا کرتے تھے۔ یا اکثر اوقات طاقت ور مسلم سردار بغاوت کر دیا کرتے تھے۔ مگر ان بغاوتوں کا ہمیشہ یہ نتیجہ نکلا کہ غیر مسلم چینی حکومت اُن کو سخت بندشوں میں جکڑ دیا کرتی تھی۔ مزید تہدیدات عائد کر دئے جاتے تھے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مغربی محاذ پر مسلمان حکومت سے جنگ کرتے تھے تو مشرقی چین میں مسلمان پرامن زندگی بسر کیا کرتے تھے۔

مسلمانانِ چین کی سیاسی و معاشی حالت | ۱۹۱۱ء میں جنرل سن یاٹ سن نے شاہی کا خاتمہ کر دیا اور ایک زبردست انقلاب کے بعد چین میں جمہوریت قائم کی مسلمانوں میں بھی احساس خودی بیدار ہوا اور وہ بھی اپنے جداگانہ سیاسی وحدت کو برقرار رکھے رہے

دستور کی رو سے انھیں چین کی پانچ جماعتوں میں تسلیم کر لیا گیا۔ مسلمانوں کو ان پانچ نسلوں میں سے ایک مان لیا گیا جن پر چینی جمہوریت کی بنیاد ہے اور جمہوریہ چین کے پانچ رنگی جھنڈے میں سفید نشان مسلمانانِ چین کی سیاسی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ مسلمانوں میں بھی نسلی خصوصیات کا خیال پیدا ہوگیا اور سیاسی بیداری کے ساتھ قومیت کا جذبہ بھی پیدا ہوگیا مسلمانوں کو چین میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ شہری حقوق حاصل ہیں اور معاشی طور پر وہ مرفع الحال ہیں۔ مسلمان تاجر اپنی ایمان داری، خوش معاملگی اور وسیع اخلاق کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کو تجارت میں خاص مہارت حاصل ہے۔ وہ زیادہ تر چار اُون اور چمڑے کی تجارت کرتے ہیں۔ وہ نہایت دلیری کے ساتھ خطرناک مقامات کو چلے جاتے ہیں جہاں دوسرے جانے سے ڈرتے ہیں۔ اپنی غیر معمولی دلیری، وسیع ذرائع اور حمل ونقل کی کثرت کی وجہ سے مسلمان شمالی علاقہ دریائے زرد میں تجارت پر حاوی ہیں دریائے زرد کے شمالی علاقوں میں پولوشس کا علاقہ تجارتی مرکز تھا۔ وہ جاپانی قبضہ میں ہے مگر وہاں کی تمام تر تجارت مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔ مسلمان تجارت پر بندشیں یا کھلا مقابلہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔ شمالی چین میں تمام تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے جو جاپانی تجارتی کاروان مسلمانوں کے علاقوں میں جاتے ہیں ان پر مسلمان قبضہ کر لیتے ہیں شمالی چین سے لے کر تبت تک مسلمان بستیاں آباد ہیں وہ بھی جاپانی تجارتی کاروانوں پر اپنا قبضہ کر لیتے ہیں۔ جاپان کی تبت سے تجارت بند ہوگئی ہے۔ مسلمانوں کی تمام چین میں ہوٹلیں اور ریسٹورنٹس قائم ہیں۔

جہاں تک زراعت کا تعلق ہے مسلمان دیگر چینیوں سے کمتر ہیں علاقہ کانسو ہشنسی و نینن میں وہ کثرت سے آباد ہیں حالانکہ زراعت میں وہ چینیوں سے کم ہیں مگر جہاں تک گلہ بانی اور مویشی چرانے کا تعلق ہے مسلمان اُن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ شہد نکالنا۔ مسکا بنانا اور پنیر تیار کرنا تمام تر مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ مسلمان مذہب کے بڑے سخت پابند ہیں۔

وہ مساجد کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ شمالی مغربی چین میں ایک مرتبہ نماز کے وقت مسجد کے سامنے سے سور بے جانے کی وجہ سے مسلمانوں نے فساد مچا دیا اور اتنا زبردست کشت وخون ہوا کہ اب کوئی مسجد کی بے حرمتی کا خیال تک نہیں کر سکتا ہے اسی طرح دورانِ جنگ میں کئی سو جاپانیوں نے صوبہ شان ٹنگ میں سور کاٹ کر کھانے کی کوشش کی۔ مسلمانوں نے مسجد کی قربت کی وجہ سے ان کو روکا مگر وہ نہ مانے جس کی بنا پر جاپانیوں اور چینی مسلمانوں میں جھڑپ ہوئی اور سینکڑوں جاپانی مارے گئے۔ مسلمانانِ چین ملک کی صنعت وحرفت میں بھی کافی حصہ رکھتے ہیں۔ وہ ریلوے ورک شاپ، کانوں میں اور دیگر فیکٹریوں میں ملازم ہیں اور فنی مہارت رکھتے ہیں مسلمانوں نے شمالی چین میں حمام خانے تجارتی اصول پر قائم کیے ہیں اور چینی وجاپانی ان صاف حمام خانوں میں آکر نہاتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس تجارت سے بہت فائدہ ہے۔

جمہوریتِ چین کے قیام کے بعد سے مسلمان سرکاری ملازمتوں میں بھی داخل ہوگئے اور بعض مسلمان عہدہ دار تو خاصی سیاسی اہمیت رکھتے ہیں۔ صوبہ داری نظم ونسق میں اُن کا کافی حصہ ہے۔ منگولین اور تبتی امور مملکت میں مسلمان عہدہ دار بہت حاوی ہیں عدالت العالیہ میں بعض قابل مسلمان جج کے فرائض انجام دے رہے ہیں صوبہ جات ننگ شیا، سنگھائی اور سنگ کیانگ میں اکثر اوقات مسلمان گورنر رہ چکے ہیں اور بعض صوبہ جات میں اب بھی ہیں۔

بہر حال چین میں مسلمان بہ حیثیت سپاہی کے نمایاں اہمیت وعظمت کے حامل ہیں تاریخ چین اور موجودہ جنگ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانانِ چین نے نہایت بہادری سے مادر وطن کی خدمت کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ جاپانی وروسی بھی اس کے معترف ہیں۔ ادگار اسنو اخبار "چین پر سرخ تارہ" میں لکھتے ہیں کہ اشتمالی ایجنٹوں نے شمال مغربی چین کے مسلمانوں کو اپنے طرف کرنے کے لیے زبردست پروپیگنڈا کیا اور

روسی حکومت اُن کو حسب ذیل مراعات تک دینے پر آمادہ ہوگئی تھی تاکہ مسلمانوں کی تائید حاصل کرے :-

(۱) مسلمانوں کو ہر طرح کی مالی معاشی امداد دی جائے گی۔

(۲) ان سے سر ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔

(۳) اسلامی علاقوں میں مسلمانوں کی صوبہ جاتی خود اختیاری حکومت قائم کرنے میں روس مدد دے گا۔

(۴) قرضے معاف کر دیئے جائیں گے۔

(۵) اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت کی جائے گی۔

(۶) ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔

(۷) مخالف جاپان اسلامی فوج کی جدید آلات حرب سے مسلح تشکیل کی جائے گی۔

(۸) تمام مسلمانان چین کو متحد کرنے میں روسی امداد دی جائے گی۔ منگولیا سن کیانگ اور سوئیٹ روس کے مسلمانوں کو متحد کیا جائے گا

یہ ایسے خوش کن عہد تھے جو لبرل جاپانیوں کی جانب سے بھی نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ۱۹۳۷ء تک سرخ عہدے دار فخریہ کہتے تھے کہ انھوں نے ان وعدوں پر مسلمانان چین کی ہمدردی حاصل کرلی ہے۔ مگر جب بیرون منگولیا میں روسی افواج نے اسلامی علاقوں میں نقل و حرکت کی تو مسلمان مسلح جماعتوں نے اُن کو مار بھگایا۔ عیسائی مشنری مسلمانوں کے جو حالات بیان کرتے ہیں ان کے سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانان شمالی چین کی فوجی قوت کی دھاک ایک جانب جاپانیوں دوسری جانب روسیوں پر بیٹھی ہوئی ہے اور دونوں طاقت ور ہمسایہ دول مسلمانوں کو اپنے طرف کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مگر مسلمان ان ہمسایہ طاقت ور قوتوں سے مقابلے میں مرکزی حکومت چین کے طرف دار ہیں اور ہمیشہ ان ممالک کے خلاف چین کا ساتھ دیتے رہتے ہیں۔ مسلمان محض وعدوں

پر ضمیر فروشی نہیں کرتے ان کے پیش نظر اُن کی قومی آزادی ہے وہ اس کی بقا اور تحفظ کی خاطر ہر قوت سے متصادم ہونے کے لئے آمادہ ہے۔ اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جاپانی اقدام کو شمالی مغربی چین میں مسلمانوں ہی نے روکا اور جاپانی پیش قدمی مغرب کی طرف رک گئی۔ اس لیے جاپان نے مشرقی وجنوبی چین کی طرف پورا زور ڈال دیا۔ مگر مسلمانوں کی چونکہ جنگ سے جاپانی افواج کی سرعت رفتار کم ہوگئی اور جنگ میں طوالت وسکوت پیدا ہوگیا اور اب بہت ممکن ہی چینیوں اور مسلمانوں کے غیر معمولی جوش شجاعت کے مقابلے میں جاپان کچھ حیلے بہانے کر کے چین سے صلح کرلے۔ ایک سوال بین الاقوامی اہمیت حاصل کرتا جا رہا تھا وہ یہ کہ آیا شمالی مغربی چین میں مسلمانانِ چین کیا جاپان موافق حکومت قائم ہونے دیں گے اور کیا وہ جاپان سے تعاون عمل کریں گے؟ اس کا جواب آدن لسٹمود نے نفی میں دیا۔ وہ لکھتا ہے کہ قدیم دور میں مسلمانوں پر طاقت ور سردار حکومت کیا کرتے تھے اور وہ مرکز گیر یز ہوا کرتے تھے۔ اور اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر مرکزی حکومت چین سے علیحدہ آزاد مملکت بنانا چاہتے تھے اسی لئے بغاوتیں وغیرہ کیا کرتے تھے مگر موجودہ دور میں اُن سرداروں کا اثر جاتا رہا ہے اب قومی بیداری اور سیاسی شعور اور ذہنی وسعت کے پھیلنے و پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسلمانانِ چین عام چینیوں کے ساتھ عمومی رجحانات رکھتے ہیں اور آج کل جاپانی اقدام کے خلاف دیگر چینی افراد مملکت سے تعاون کر رہے ہیں اور جنگ آزادی میں حصہ لے رہے ہیں۔ دفاع وطن میں ہر طرح کی قربانی کر رہے ہیں۔ قومیت و آزادی کا احساس پوری قوم میں سرایت کر گیا ہے مسلمانوں کی پوری تائید مرکزی حکومت چین کو حاصل ہے اور مسلمانانِ چین کبھی موافق جاپان یا موافق روس ہو نہیں سکتے۔ وہ آزادی اور عمومیت کے دل دادہ ہیں۔

اکثر یورپی و امریکن سیاح جو چین جاتے ہیں ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانانِ چین نے کس طرح مذہبی تمدنی و تاریخی روایات کو برقرار رکھا مسلمان

بارہ سو سال سے چین میں آباد ہیں اور ہمیشہ اپنے مذہب، کلچر و ثقافت اور تہذیب و تمدن تاریخی روایات کو قائم رکھا۔ اُن کا ملی اتحاد نہایت مستحکم ہے اگر کوئی مسلمان دنیا کے کسی حصے سے بھی چین چلا جائے تو وہ یہی محسوس کرے گا کہ چینی مسلمانوں کے درمیان وہ گویا اپنے ہی وطن میں ہے۔ چین جیسے ملک میں جہاں بدھ مت اپنے اصلی روپ میں باقی نہ رہا۔ جہاں عیسائیت اور صیہونیت کئی سال قبل ختم ہوگئے۔ اسلام کا اس طرح زندہ رہنا اور مسلمانوں کا اسلامی روایات و تعلیمات کو برقرار رکھنا خود اسلام کا ایک معجزہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان صوبہ جات شنسی، کانسو، ننگ شیا اور شنک کیانگ میں کثرت سے آباد ہیں، اکثر اُن پر چینی قومی حکومتوں نے بھی ظلم و ستم کیا ہے۔ اُن کے جداگانہ مذہبی و تمدنی وحدت کو مٹانے کی کوششیں کی گئیں۔ مگر مسلمانوں نے بزور شمشیر ان کی حفاظت کی چینی حکومت سے مسلسل کش مکش اور جد و جہد کرنے سے ان میں قوت انانیت بڑھ گئی ہے اور اب وہ کسی سختی یا دباؤ کو معمولی سمجھتے ہیں

وسط ایشیا میں بھی روسی علاقوں میں اشتمالی حکومت نے مسلمانوں پر فلک شکن مظالم ڈھائے۔ مگر چونکہ چین و وسط ایشیا میں مسلمان ہمیشہ روسی و چینی حکومتوں کے دباؤ میں رہے ہیں اور ہمیشہ تصادم ہوتا رہا ہے اسلئے انھوں نے اتنی تکالیف برداشت کی ہیں کہ اب انھیں اس کا احساس باقی نہیں رہا "مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آساں ہوگئیں" اور یہ بالکل نفسیاتی کیفیت ہے۔ مسلمان چونکہ غیر معمولی بہادر، جوشیلے اور ہر طرح کی قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہیں اور ہمیشہ اسلام کی مدافعت کی خاطر طویل و خونریز جنگوں میں اپنی جانوں کو قربان کیا ہے اس لئے اب بھی اسلام و مسلمان زندہ ہیں۔ اور ترقی کرتے جارہے ہیں بعض چینی مسلم لیڈر فخریہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی مدافعت کے لئے کبھی باہر سے مالی یا فوجی امداد حاصل نہیں کی۔ ہمارے پاس گو بہت زیادہ دولت یا علم نہیں ہے مگر ہم سب متحد ہیں اور آڑے وقت ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

ایک فرانسیسی مدبر کمانڈنٹ ڈی الون جس نے ایک مشن کی قیادت کی تھی اور جو کئی سال چین میں رہ چکا ہے۔ چینی مسلمانوں کے متعلق لکھتا ہے کہ " وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی مدد کیا کرتے ہیں۔ کوئی غریب مسلمان بغیر مدد کے نہیں رہتا۔ ہر مسلمان ہر صورت سے اپنے بھائی مسلمان کی مدد کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ اسلامی سماج میں اتنی خوبیاں پائی جاتی ہیں کہ غیر مسلم چینی اسلام میں داخل ہوتے ہی جاتے ہیں "

مسلمانوں کو اپنی قومی تنظیم کا خاص خیال ہے اور وہ مذہب کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔ مسٹر فنڈلے اینڈریو جنھوں نے جنگِ عظیم کے دوران میں مسلمانانِ چین میں زندگی بسر کی تھی لکھتے ہیں کہ مسلمان چین مذہب اسلام کے ایسے ہی سختی سے پابند ہیں جیسے عرب میں وہابی۔ شمال مغربی چین کے زیادہ تر مسلمان عربی و ایرانی نسل ہیں اور اکثر ترکی و منگول نسل سے بھی ہیں لیکن وہ نسل اور جغرافیے کا لحاظ نہیں کرتے وہاں اسلامی مساوات کارفرما ہے۔ مسلمانان چین حنفی مذہب کے پیرو ہیں۔ ان کے تین گروہ ہیں۔ ایک طبقہ قدیم جو حنفی المذہب ہے اور جن کی اکثریت ہے دوسرا گروہ نیا طبقہ ہے جو وہابیت سے متاثر ہے اور اسلام کی ترقی کا ممد و معاون ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ صحیح معنوں میں اسلام کو قرن اول کا مذہب بنا دیں۔ تیسرا گروہ طبقہ جدید ہے یہ ستر سال سے قائم ہوا ہے۔ کسی شخص نے آج سے ستر سال قبل مسیح موعود مہدی آخرالزماں ہونے کا دعویٰ کیا تھا اُس کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا جانشین ہوا مگر وہ قید کر دیا گیا تھا۔ بعض لوگ طبقہ جدیدہ کے اس مسیح موعود چینی کے پیرو ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ مگر یہ طبقہ واریت فروعی چیز ہے اور مسلمانانِ چین بہ حیثیت جداگانہ ملت کے سب متحد و منظم ہیں۔

مسلمانان چین قرآن عربی زبان ہی میں پڑھتے ہیں ابھی تک اس کا چینی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا اور وہ اس کو گناہ خیال کرتے ہیں۔ مذہبی تعلیم عام ہے۔ اگر کوئی قابل بننا چاہتا ہو تو اس کے لئے عربی پڑھنا لازمی ہے۔ عربی، ترکی زبانیں عموماً پڑھے لکھے لوگ اچھی طرح

بولتے ہیں۔ چینی مسلمان حج بھی کرتے ہیں اور حاجی کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی ہے مسلمانان چین نے اسلامی ثقافت و لٹریچر کو عام کرنے اور تبلیغ کرنے کے لئے ایک ادارہ پیپنگ میں قائم کر لیا ہے جو "عام اسلامی تحریکِ ترقی" کے نام سے موسوم ہے اور جس کا صدر وانگ ہوجان ہے جس نے ترکی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ "اسلامی تحریک ترقی" کا تعلق صرف مذہب و تمدن سے ہے اور سیاسیات سے تعلق نہیں۔ یہ ادارہ تمام چین میں اسلامی تعلیمات کے تراجم، مدارس اور تقاریر کے ذریعے اشاعت کرتا ہے اس کی ہر شاخ بڑے شہروں، صوبوں اور ضلعوں تک میں ہے الغرض تحریک ترقی کا پورے ملک میں چرچا ہے اور تبلیغ اشاعت اسلام میں وہ سرگرم عمل ہے۔

مسلمانانِ چین دیگر مسلمانانِ عالم سے بالکل غیر متعلق یا علیحدہ نہیں۔ وہ عالم اسلام سے عقیدت رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر سربرآوردہ مسلمانوں کو ترکی حکومت نے شاندار اسلامی خدمات کے صلے میں تمغے عطا کئے تھے اُن کی آؤ بھگت کی گئی تھی اور وہ ہر سال حج کرنے مکہ شریف جاتے ہیں اور مشرقِ قریب اور ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ مصری و ترکی و عربی استاد چین میں مساجد و مدارس میں دینی تعلیم کے لئے مامور ہیں۔ غیر چینی مسلمان سے چینی مسلمان بہ حیثیت مہمان کے بڑی مہربانی سے پیش آتے ہیں اس کی خاطر تواضع کرتے ہیں اور چینی مسلم نوجوان اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جامعہ ازہر (مصر) میں شرکت کرتے ہیں۔[۱]

حکومت چین مسلمانوں کی اسلامی تحریک ترقی کو تسلیم کرتی ہے اور اس کی ہر طرح سے مدد کرتی ہے۔ اس کی کوششوں کی وجہ سے مسلمانوں کو تبت اور منگولیا کے نظم و نسق میں کافی نمائندگی دی گئی ہے۔ حکومت مسلمانوں کی تعلیم کا خاص بندوبست کرتی ہے کمیونسٹ ایجنٹ بھی مسلمانوں میں خفیہ پروپگنڈا کرتے ہیں کہ مسلمان روس کی تائید میں ہو جائیں مگر وہ ناکام ہی رہتے ہیں جاپانی ایجنٹ بھی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان اس کا ساتھ دیں مگر کامیابی

نہیں ہوتی۔ مسلمانان چین من حیثیت القوم مرکزی حکومت چین کے ساتھ ہیں۔

مسلمانان چین کی اہمیت اور موجودہ حیثیت مسلمانان چین کے متعلق آج کل عجیب عجیب طرح کا پروپگنڈا کیا جارہاہے۔ جاپانی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ پانچ کرور مسلمانان چین سویٹ روس کے سرخ خطرے کا مغربی شمالی ایشیا میں سدباب کرنے کے لیے جاپانی کے سائھ ہیں اور یہ بھی کہا جارہا ہے کہ چینی مسلمان جاپان کی قائم کردہ پینگ گورنمنٹ کے حامی ہیں اور جاپان سے تعاون عمل کرنا چاہتے ہیں اس کے برعکس روسی ایجنٹ اس بات کا پروپگنڈا کرتے ہیں کہ مسلمانانِ چین متحدہ طور پر جاپانی افواج کا مقابلہ کر رہے ہیں اور بیرون منگولیا کے بعض مقامات پر بہادر و مسلح مسلمانوں نے جاپانی افواج کو پسپا کر دیا اور مادرِ وطن کی حفاظت اور اپنے قومی تحفظ کی خاطر ہر طرح کی قربانی کر رہے ہیں اور وہ روس کے مدّاح ہیں کیونکہ سویٹ روس مسلمانوں کو جدید آلات سے مسلح کر رہی ہے اور اُن کو سامانِ خوردو نوش وغیرہ فراہم کرتی ہے اگر روسیوں کا یہی خوش کن طرزِ عمل رہا تو تمام اسلامیانِ چین روس کے ساتھ تعاون عمل کریں گے؛

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ جاپان و روس کے متضاد بیانات و پروپگنڈے حقائق و صداقت پر مبنی نہیں اور حکومتِ چین کے سرکاری اعلان میں جو یہ خبر شائع ہوئی کہ پانچ کرور مسلمانانِ چین متحدہ طور پر مرکزی حکومت کے حامی ہیں بالکل صحیح خیال کرتے ہیں۔ چین کی معلومات عامہ کیٹی نے ہانکو سے یہ خبر شائع کی تھی کہ مسلمانانِ چین متحدہ طور پر مرکزی حکومتِ چین کے ساتھ ہیں۔ ہانکو کی جامع مسجد میں تمام سلطنتِ چین کے مسلم نمائندے شریک ہوئے تھے اور مسلم جنرل پائی ٹنگسی جو جنرل اسٹاف کے رکن بھی ہیں۔ دورانِ تقریر میں مسلمان نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمانانِ چین کو ہر طرح کی قربانی کرنے اور آزادی وطن وحق و انصاف کی خاطر جنگ کرنے پر آمادہ ہوجانا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانانِ چین کئی نسلوں سے چین میں آباد ہیں اُن کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے اگر مادر وطن جارحانہ اقدام کا شکار

ہو تو مدافعت میں اُن کو سینہ سپر ہو جانا چاہیئے۔ مذہب و وطن کی حفاظت میں انھیں دشمنی سے جہاد کرنا چاہیے۔ چین میں مسلمان زیادہ تر صوبہ ننگ سیا، کانسو، شنگھائی اور سن کیانگ میں آباد ہیں۔ حکومتِ چین کے مخالفین کی جانب سے پروپگنڈا کیا جاتا ہے کہ مسلم قائد جنرل ما ہنگ مرکزی حکومتِ چین اور جنرل شیانگ کینک سے ناراض ہے۔ اور مسلمانوں کی الگ ریاست بنانا چاہتا ہے۔ مگر یہ افواہ غلط ہے۔ حکومت چین کے سرکاری محکمہ معلومات عامہ نے اس کی تردید کی اور اعلان کیا کہ مسلمانانِ چین جو زیادہ تر شمال و مغرب میں آباد ہیں مرکزی حکومتِ چین کے وفادار ہیں اور جاپانی افواج کا بڑی بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ شمالی مغربی چین میں جاپان، روس و چین کی سرحدیں ملتی ہیں اور وہاں مسلمان کثرت سے آباد ہیں۔ جاپان و روس ہمیشہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ مسلمان ان کی مدد کریں اور یہ واقعہ ہے کہ جب سے جاپان نے چین پر جارحانہ اقدام کیا ہے اس وقت سے روس چین کی جدید آلاتِ حرب سے مدد کر رہا ہے اور سب سے پہلے ان چینی مسلمانوں کو جو بڑے بہادر اور جنگجو ہیں روسی حکومت نے جدید آلاتِ حرب سے مسلح کر دیا ہے لیکن اُن کی تمام تر تائید چین کی مرکزی حکومت کے ساتھ ہے اور روس سے محض خوش گوار ہمسایہ تعلقات ہیں جب ٹینٹسن کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا اور جاپانی حکام اس علاقے میں برطانوی مراعات کا خاتمہ کئے ہوئے رہے تھے۔ برطانوی قوم کے افراد کے ساتھ ذلت کا برتاؤ کیا جار تھا۔ جاپانی صحافت انگریزوں کے خلاف پروپگنڈا کر رہی تھی اس وقت شمالی مغربی چین پر جاپانی افواج نے یورش کی مگر وہاں کے باشندے مسلم تھے فوراً اس حملے کو پسپا کر دیا گیا اور جاپان کو محسوس ہوا کہ اگر مسلمان جدید آلات حرب سے اسی طرح روس کی مدد سے مسلح رہیں گے تو وہ اس طرف پیش قدمی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نے مسلمانوں کی دل جوئی اور اطمینان دہی کی حکمتِ عملی اختیار کی اور مسلمانوں کی وہاں آزاد ریاست قائم کرنے کا

پروپگنڈا کیا مگر ناکامی ہوئی۔ اسی موقع پر مسٹر چیمبرلین نے ایک مرتبہ دوران تقریر کہا تھا کہ جاپان ٹینٹسن میں انگریزوں کو ذلیل کر رہا ہے مگر وہ بہادر و مسلح مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا" ایک ہی حملے کی پسپائی سے جاپانی افواج بدحواس ہوگئیں۔ مسلمانان چین جدید آلات سے مسلح ہوکر جاپانیوں کے حق میں خطرۂ عظیم بنے ہوئے ہیں، اور روس بھی ان کی قوت کا احساس کرتے ہوئے دوستانہ تعلقات برقرار کئے ہوئے ہے۔ مسلمانانِ چین مرکزی حکومت کے حامی ہیں اور جب سے انھوں نے جنرل ما وغیرہ کی قیادت میں جاپانی افواج کا مقابلہ شروع کیا ہے تو اس وقت سے جاپانی کامیابی جو سرعت سے جاری تھی رک گئی اور جنگ طول کھینچتی جا رہی ہے اور یہ طوالت چین کے حق میں مفید ہی ہوگی۔ مسلمانانِ چین زیادہ سے زیادہ مسلح ہوتے جا رہے ہیں۔ جاپان کے خلاف مسلمانوں میں جذبۂ نفرت پھیل گیا ہے۔ جاپان بلا وجہ مسلمانوں کا دوست بننا چاہتا ہے تاکہ ان کی تائید حاصل کرکے پورے چین پر قبضہ جما لیا جائے۔ قیصر جرمنی نے بھی سلطنتِ برطانیہ کو توڑنے کے لیے مسلمانوں کے دوست ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اسی طرح جاپان بھی مسلمانوں کی دوستی کا دم بھر کے چینی مملکت کا خاتمہ کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔

مسلمانانِ چین کی سیاسی اہمیت موجودہ دور میں بہت بڑھ گئی ہے ایک جانب جاپان دوسرے جانب روس ان کی تائید حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن مسلمانانِ چین مرکزی حکومت کے وفادار ہیں اور جاپان کے میدان جنگ میں چھکے چھڑا دے رہے ہیں۔ مسلمانان چین سد سکندری سے زیادہ طاقت ور ہیں اور اس کا ثبوت ہمیں شمال مغربی مسلم صوبوں میں جاپان کی شکست سے ملتا ہے۔

جاپان اور اسلام | جاپان نے مسلمانان چین کو خوش کرنے اور اُن کی تائید حاصل کرنے کے لئے اسلامی ممالک اور مسلمانوں سے خوش گوار تعلقات پیدا کرنا شروع کئے اور ۱۹۳۵ء میں شہر کوب میں ایک خوب صورت مسجد بنائی اور سرکاری طور پر اسلام

کو بہ حیثیت مذہب کے تسلیم کیا گیا۔ مسلمانان جاپان کو بھی خصوصی مراعات دیئے گئے۔ شہزادہ یمن سیف السلام نے ٹوکیو میں ایک جدید مسجد کا افتتاح کیا اور جاپانی حکومت نے اسلام کی دوستی کا دم بھرنا شروع کیا۔ ٹوکیو مسجد کے افتتاح کے موقع پر عالم اسلام سے مہمان بلوائے گئے تھے اُن کی بڑی آو بھگت کی گئی تاکہ عالم اسلام کی دوستی حاصل کی جائے۔ جاپانی وزیر خارجہ ہیروڈٹا نے ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم مسلمانوں سے تعلقات استوار کر رہے ہیں۔ ایران کے سفیر کو بدلنے کا یہی مقصد ہے ہمارے جاپانی طلبا ر اسلام سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اور شمالی مغربی چین سے مسلمانوں کو جن کی فوجی و جغرافی اہمیت بہت زیادہ ہے روس کے خلاف اور جاپان سے موافق کرنے کی ہر طرح کوشش کی جا رہی ہے"

جاپانی حکومت نے یہ کوشش کی تھی کہ شمالی مغربی چین میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت بنالی جائے اور وہ چین کی مرکزی حکومت سے آزاد ہو اس لیے جاپانی حکومت نے مصر کے شاہی خاندان کے بعض افراد سے گفت و شنید کی تھی تاکہ کسی شاہی خاندان کے فرد کو شمالی چین کا بادشاہ بنایا جائے۔ مگر اس میں ناکامی ہوئی

جنگ چین و جاپان کے دوران میں بعض وفادار سر برآوردہ چینی لیڈروں نے چین کی جنگ آزادی میں عالم اسلام کی اخلاقی تائید حاصل کرنے کے لیے اسلامی ممالک کا سفر کیا ترکی ایران و مصر میں چینی مسلم وفد کا خیر مقدم کیا گیا اور جاپانی اقدام کی مسلمانانِ عالم نے مذمت کی۔ چینی وفد عالم اسلام سے چینی مسلمانوں کا مذہبی اور تمدنی تعلق بھی قائم کرنا چاہتا تھا اس میں اس کو خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانان چین عالم اسلام کے ساتھ اخلاقی و اسلامی رشتے میں منسلک ہو گئے گو مذہبی طور پر سب منسلک ہی ہیں مگر اب تعلقات خوش گوار و مستحکم ہو گئے ہیں ترکی حکومت نے استنبول میں جاپانی خفیہ کانفرنس کی مذمت کی اور جاپانی پروپگنڈا ایجنٹوں کو ترکی سے نکال دیا۔ جب ترکی حکومت کو معلوم ہوا کہ جاپان ایشیا میں مسلمانوں کو متحد کر کے مخالف روسی جتھا بنانا چاہتا ہے

تو ترکی نے اس کی مخالفت کی اور مسلمان جاپانی ریشہ دوانیوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہے۔

جاپان نے وسط ایشیا میں تمام مسلمانوں کو متحد کرکے ایک وفاقی سلطنت قائم کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر چینی مسلمانوں نے اس سے تعاون نہیں کیا۔ جاپان ہر طرح سے مسلمانوں کو اپنی طرف کرنا چاہتا ہے مگر مسلمان جاپانی جارحانہ اقدام کے خلاف چین کی آزادی اور تحفظ کی خاطر جاپان سے لڑ رہے ہیں۔ چینی مسلم وفد جس نے تمام عالم اسلام و ہندوستان کا دورہ کیا اپنے بیانات میں اعلان کیاہے کہ مسلمانان چین کے خلاف عالم اسلام میں جاپان یہ غلط پروپگنڈا کر رہاہے کہ چینی مسلمانوں کی تائید جاپان کو حاصل ہے بلکہ اس کے برعکس مسلمان جاپان کی ترقی میں سدراہ ہو رہے ہیں۔ مادر وطن کی آزادی و مدافعت میں مسلمان جاپان کے خلاف ہر معرکے میں کافی حصہ لے رہے ہیں۔ مسلم چینی وفد نے اس بات کا یقین دلایا کہ جنگ آزادی میں مسلمانانِ چین ہمیشہ مرکزی حکومت چین کا ساتھ دیں گے اور اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ عالم اسلام و ہندوستان کے چین سے مذہبی و تمدنی تعلقات قائم کئے جائیں تاکہ مسلمانانِ عالم و ہند کی تائید جنگ آزادی میں چین و چینی مسلمانوں کو حاصل رہے۔ مسلمانان چین کی فوجی قوت سے جاپان مرعوب ہے۔ جاپان چین پر غالب ہونے کی فکر میں ہے لیکن چینی اور مسلمان اُن کے حوصلوں کو پست کر رہے ہیں۔ غلبہ اشیاء کے لئے جاپانی ہر طرح کوشش کر رہے ہیں مگر شمالی چین اور وسط ایشیا کے مسلمان ان کے خواب کو شرمندہ عمل ہونے نہیں دیتے۔ مسلمانانِ وسط ایشیا ہی جاپان کے فتوحات کے سیلاب کو روکے ہوئے ہیں۔ انھوں نے روس و جاپان کے درمیان توازن قوتِ برقرار رکھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانانِ چین جن کے تعلقات عالم اسلام سے خوش گوار ہیں اُن کا مستقبل بہت ہی شاندار ہے۔ حکومت جاپان موجودہ چین و جاپان کی جنگ کی سست رفتار سے مطمئن نہیں ہے۔ جنگ کی طوالت

کے باعث چین کی دفاعی قوت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور جاپان پر معاشی بار پڑ رہا ہے۔ جب سے جنگ یورپ کا آغاز ہوا ہے جاپانی حکومت نے اپنی حکمت عملی بدل دی جرمنی نے سویٹ روس سے معاہدہ عدم اقدام کر کے مخالفِ اشتمالیت پیمان کی خلاف ورزی کی اور جاپانی و جرمن تعلقات کا خاتمہ ہوگیا جاپانی کابینہ میں تبدیلی ہوئی اور جاپان نے عمومی دول سے دوستانہ تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش کی اس لیے اب برطانیہ و فرانس و امریکہ کے جائز معاشی مفادات کا چین میں احترام کیا جارہا ہے اور یہ کوشش کی جارہی ہے کہ عمومی دول مداخلت کر کے چین و جاپان کی جنگ کا خاتمہ کردیں۔ اور مشرق اقصےٰ میں امن قائم ہوجائے۔ جاپان شمالی چین میں "نئی تنظیم" قائم کرنا چاہتا ہے اور وہ عمومی دول کے مفادات کا احترام کرنے پر آمادہ ہے۔ مسلمانانِ چین کی بھی دل جوئی کی جارہی ہے۔ روس کی شاہنشاہی پالیسی سے جاپان و چین کو خطرہ محسوس ہورہا ہے دیکھیے اب اونٹ کس کل بیٹھتا ہے۔

لیون ٹروٹسکی کا بیان

(اشتراکیت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس دلچسپ مضمون کو ضرور پڑھیں۔ "مدیر")

(جناب ایم۔ ایم جوہر صاحب میرٹھی)

لینن کی موت کے بعد سویٹ یونین میں کئی پارٹیاں بن گئیں تھیں ان میں سے دو تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہیں ایک پارٹی کے لیڈر اسٹیلن ہیں اور دوسری کے ٹروٹسکی۔ اول الذکر سویٹ یونین کے رہبر ہیں اور موخرالذکر آج کل میکسیکو میں جلاوطن ہیں۔ ان دونوں لیڈروں کے اختلاف نے خانگی تنازعہ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ سویٹ یونین میں سیاسی مقدمے اور سیاسی لیڈروں کا قتل اور جلاوطنی اسی خانگی جھگڑے کا نتیجہ ہیں۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں موسکو میں سویٹ حکومت نے پاٹا کو اور ریڈک وغیرہ کے خلاف مقدمہ چلایا تھا جس میں تمام مجرمین نے مختلف الفاظ میں اقرار جرم کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اُن کے جرائم کی تمام ذمہ داری ٹروٹسکی پر ہے جو روسی حکومت کے خلاف تمام سازشوں کا روح رواں ہے۔ اس مقدمے کے دوران سماعت میں ریڈک وغیرہ نے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ وہ ٹروٹسکی کے بہکانے میں آگئے تھے۔ جس کی انھوں نے حکومت سے معافی مانگی تھی۔ جب یہ بیانات دنیا کے سامنے آئے تو امریکہ میں ٹروٹسکی کی صفائی یا عذرداری کی خاطر ایک کمیٹی بنی اور اس نے چاہا کہ ٹروٹسکی کے بیانات بھی لیے جائیں تاکہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی دنیا کے سامنے آجائے چنانچہ امریکن کمیٹی نے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے میکسیکو جاکر ٹروٹسکی کے بیانات قلم بند کئے۔ یہ بیانات سوال وجواب کی شکل میں چھ سو صفحے پر مشتمل ہیں ہم ان بیانات کے صرف وہ حصص پیش کر رہے ہیں جو تاریخی اور سیاسی اعتبار سے عام دلچسپی کا باعث ہوں گے

اس سے پیشتر کہ ٹروٹسکی کا بیان شائع کیا جائے یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گولڈمین ٹروٹسکی کے وکیل ہیں اور اُس سے بیان دلوا رہے ہیں۔ فینرٹی کمیشن کے پیروکار ہیں اور جرح کر رہے ہیں۔ باقی حضرات کمیشن کے ممبر ہیں اور ٹروٹسکی سے سوال کر رہے ہیں۔

فیزڈی:۔ مسٹر ٹروٹسکی کیا آپ مختصراً یہ بتائیں گے کہ کمیونسٹ پارٹی کب ترتیب دی گئی اور اس کے ممبر ہونے کی کیا شرطیں تھیں؟

ٹروٹسکی:۔ کمیونسٹ پارٹی ۱۹۰۳ء میں بنی لیکن پارٹی کے نام سے پہلا اعلان ۱۹۰۵ء میں نکلا تھا۔ پارٹی کا پروگرام لمبا چوڑا نہ تھا اور جو شخص پارٹی کے پروگرام پر عمل کرنے اور احکام ماننے پر راضی ہو جاتا تھا وہی پارٹی کا ممبر شمار ہونے لگتا تھا۔ لیکن چونکہ پارٹی کا کام کرنے میں ایثار اور قربانی کرنی پڑتی تھی اور ہر قسم کے خطرے سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا اس لئے ایسے لوگ جن کے کوئی مفاد مدنظر ہوتا تھا ممبر نہیں بنتے تھے جو سچے دل سے ہمارے مقصد سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اور اپنی ذمہ داری کو سمجھنے والے اور آڑے وقت میں میدان چھوڑنے والے نہ ہوتے تھے۔ کیونکہ ہماری پارٹی غیر قانونی تھی اور ہم کسی ایک خاص جگہ اجلاس نہیں کرسکتے تھے اس لئے پارٹی میں باقاعدگی پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں پارٹی کا باقاعدہ اجلاس ہوا۔ اس وقت پارٹی کے شاید تین لاکھ ممبر تھے اکتوبر کے انقلاب کے بعد چونکہ تمام تر طاقت ہمارے ہاتھ میں آ گئی تھی اس لئے اس زمانے میں ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ لیکن ان نئے ممبروں کا یہ حال تھا کہ پارٹی کی شکست ہوتے دیکھی تو ممبری بھی ختم کردی اگر فتح ہوتی دیکھی تو ممبر بن گئے۔ ۱۹۱۹ء میں لینن نے اس پارٹی کا نام کمیونسٹ پارٹی رکھا۔ اس نام کے بہت سے ممبر مخالف تھے اور سوشل ڈیمو کریٹ پارٹی نام رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن لینن نے کہا "جس طرح میلی قمیص کو بدلنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح پارٹی کا نام بدلنا بھی ضروری ہے۔" سوشل ڈیمو کریٹ پارٹی نے دوران جنگ میں بہت کم زوری دکھائی تھی اس وجہ سے اس نام کے ساتھ کم زوری اور شکست کے تخیلات وابستہ ہو گئے تھے۔ پارٹی کا نام بدلتے ہی ایک نیا آسمان دکھائی دینے لگا۔ ہمیں طاقت حاصل ہوتے ہی بہت سے خودغرض اونچے طبقے کے لوگ ہماری پارٹی کے ممبر ہونے لگے۔ اب ہمیں یہ ڈر ہوا کہ یہ لوگ ہماری پارٹی کا نظام اور اخلاق نہ بگاڑ دیں۔

اس لئے ہم نے اُن کے ممبر بنانے کا یہ قاعدہ بنا دیا کہ جب تک اونچے طبقے کے لوگوں کا ماضی معلوم نہ ہو اور کوئی معتبر پارٹی ممبر اُن کی ذمہ داری نہ لے اس وقت تک اُن کو ممبر نہیں بنایا جاتا تھا۔ لیکن مزدور کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ہماری پارٹی مزدوروں کی سرپرست تھی

ہماری پارٹی کی تین کمیٹیاں تھیں:۔

(۱) **مرکزی کمیٹی**:۔ یہ سب سے اہم ادارہ تھا۔ سب اہم اور مختلف فیہ مسائل اس کے سامنے پیش ہوتے تھے اور اس کا فیصلہ ناطق ہوتا تھا۔ اس کا صدر لینن تھا۔

(۲) **سیاسی کمیٹی**:۔ تمام بیرونی اور سیاسی معاملات اس کمیٹی کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اس ادارے میں اگر کسی معاملے پر اختلافِ رائے ہوتا تھا تو وہ مرکزی کمیٹی کے روبرو پیش ہوتا تھا۔ میں بھی اس کمیٹی کا ایک ممبر تھا۔

(۳) **انتظامیہ کمیٹی**:۔ پارٹی کے متعلق جتنے بھی انتظامی معاملات ہوتے تھے ان کی دیکھ بھال یہ کمیٹی کرتی تھی اور سیاسی کمیٹی کے ماتحت تھی۔ اس کا صدر اسٹیلن تھا۔

سیاسی اور انتظامیہ کمیٹیوں کے ممبروں کو مرکزی کمیٹی منتخب کرتی تھی - یہ تینوں کمیٹیاں پارٹی کی "حاکم جماعتیں" تھیں۔

اب سویٹ یونین کو لیجیے اس کے بنیادی ادارے سویٹ کہلاتے تھے ان کے انتخابات میں سوائے سرمایہ داروں یا اخلاقی طور پر گرے ہوئے یا ان لوگوں کے جو دوسروں کی محنت سے خود فائدہ اُٹھاتے تھے سب کو رائے دینے کا حق تھا۔ جو لوگ سویٹ کے ممبر منتخب ہوجاتے تھے وہ اپنے نمائندے کانگرس میں بھیجتے تھے۔ کانگرس ایک مجلس عالمہ منتخب کرتی تھی جس میں تقریباً ۱۰۰ ممبر ہوتے تھے مجلس عالمہ کابینہ انتخاب کرتی تھی۔ جس کے ممبر "کمیسار" کہلاتے تھے۔ کمیسار حکومت کے مختلف شعبوں کے ذمہ دار ہوتے تھے۔

فینر لی:۔ مسٹر ٹروٹسکی اب آپ یہ بتائیں کہ کمیونسٹ پارٹی اور کمیسار میں کیا تعلق تھا۔ کیا یہ ایک دوسرے پر اثر ڈال سکتے تھے؟

ٹروٹسکی :- تمام کمیسار ہماری پارٹی کے ممبر ہوتے تھے۔ عوام چونکہ کمیونسٹ پارٹی پر اعتماد رکھتے تھے اس لئے وہ ہمیں ہی منتخب کرتے تھے۔ جو اہم ملکی مسئلہ ہوتا تھا وہ پہلے پارٹی کی سیاسی کمیٹی کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ اگر وہاں فیصلہ نہ ہوتا تھا تو سیاسی کمیٹی لینن (جو مرکزی کمیٹی کا صدر تھا) کے سامنے پیش کرتی تھی۔ لینن مرکزی کمیٹی کا اجلاس بلاتا تھا۔ اور جو کچھ اجلاس میں فیصلہ ہو جاتا تھا وہی ناطق ہوتا تھا اور سوویٹ یونین میں اسی پر عمل درآمد ہوتا تھا کمیسار پارٹی کا حکم مانتے تھے۔

فینرٹی :- آپ کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کمیسار کمیونسٹ پارٹی کے احکام بجالاتے تھے حالانکہ ان کو سوویٹ کی نمایندگی کرنی چاہئے تھی۔ سوویٹ میں سب مزدور خواہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہوں یا نہ ہوں رائے دے سکتے تھے اس لئے سوویٹ بہ نسبت کمیونسٹ پارٹی کے اداروں کے جمہوریت کا زیادہ عنصر لئے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کا صاف یہ مطلب ہے کہ آپ کے زمانے میں زیادہ جمہوری ادارے کم جمہوری اداروں کے محکوم ہوتے تھے۔ میرے خیال میں جب سے سوویٹ یونین کی بنیاد رکھی گئی ہے اس وقت سے سوویٹ یونین کبھی بھی جمہوری نظام نہیں ہوا اور اب اسٹیلن پر یہ الزام لگانا کہ وہ جمہوریت پسند نہیں ہے درست معلوم نہیں ہوتا۔

ٹروٹسکی :- میں آپ کے خیال سے متفق نہیں ہوں۔ واقعہ یہ ہے چونکہ روس میں ہماری پارٹی نے عوام کو آزادی دلوائی تھی اور غریب کی مدد کی تھی اس لئے سوویٹ کے انتخاب میں عوام ہماری پارٹی ہی کے ممبر منتخب کرتے تھے۔ ہمیں منتخب کرنے سے پہلے رائے دہندگاں کو یہ علم ہوتا تھا کہ ہم ہر ملکی معاملہ اپنی پارٹی کے حکم کے بموجب حل کریں گے اس لئے عوام جب ہمیں منتخب کرتے تھے تو دراصل ہمیں وہ یہ ہدایت کرتے تھے کہ ہم اپنی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا حکم مانیں۔ یہ درست ہے کہ عوام ہماری پارٹی کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے تھے دخل دینا صرف پارٹی کے ممبران کا حق تھا لیکن عوام یہ کہہ سکتے تھے کہ اگر ان کو ہماری پارٹی کے مقاصد سے اتفاق نہ ہوتا یا ان کو ہمارا پروگرام غلط معلوم ہوتا تو وہ دوسری پارٹی کے ممبر منتخب کر سکتے تھے ظاہر تھا کہ دوسری پارٹی کے ممبر کمیونسٹ پارٹی کے قید و بند سے آزاد ہوتے

لیکن جب عوام ہماری ہی پارٹی کے ممبروں کو منتخب کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کو بھی پسند کرتے تھے کہ ہم مرکزی کمیٹی کے احکام مانیں۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں منتخب کرکے وہ مرکزی کمیٹی میں اعتماد کا ووٹ پاس کرتے تھے۔ ہماری کمیونسٹ پارٹی جمہوریت پسند تھی اس معنی میں نہیں کہ ہر شخص اس کا ممبر ہو سکتا تھا بلکہ اس معنی میں کہ پارٹی کا ہر ممبر آزادی کے ساتھ بحث و مباحثہ کرسکتا تھا اور پارٹی کا لیڈر بن سکتا تھا۔ لیکن اسٹیلن کے زمانے میں نہ پارٹی میں جمہوریت ہے نہ سویٹ یونین میں جمہوریت ہے اور نہ ٹریڈ یونین میں جمہوریت ہے

فینرلی:۔ کیا ہمیں آپ یہ بتائیں گے کہ پرولتاریوں کی آمریت سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟

ٹروٹسکی:۔ پرولتاریوں کی آمریت کے یہ معنی ہیں کہ ان تمام لوگوں کے ہاتھ سے جو دوسروں کی محنت پر جیتے ہیں ملک کی باگ ڈور نکل کر ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو خود محنت کرتے ہیں۔ صرف انقلابی پرولتاری جماعت اور ان عوام کو جو اس جماعت کے حامی ہیں یہ حق حاصل ہے کہ ملک کی تقدیر کا فیصلہ کریں۔

فینرلی:۔ سویٹ یونین میں پرولتاریوں کی آمریت تھی یا پرولتاریوں کے لئے آمریت تھی ؟

ٹروٹسکی:۔ یہ تعلق کا سوال ہے اگر پرولتاریوں کا کمیونسٹ پارٹی پر اعتماد ہے اور پارٹی کے انتخابات آزادی سے ہوتے ہیں تو 'کی' اور 'کے لئے' میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ ساری جماعت تو کسی صورت سے بھی حکومت میں حصہ نہیں لے سکتی۔ ہمیشہ کسی جماعت کے چند نمائندے ہی حکومت میں حصہ لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ نمائندے آزاد انتخاب کا نتیجہ ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ساری جماعت حکومت کر رہی ہے۔ اس کو آپ ڈکٹیٹر شپ کہہ سکتے ہیں لیکن اس میں بھی جمہوریت کا بہت بڑا عنصر موجود ہے لیکن اسٹیلن کے دور حکومت میں یہ بھی غائب ہوگیا۔ اب سویٹ یونین میں حکومتی طبقہ رہ گیا ہے۔ جو کسی کے روبرو جواب دہ نہیں ہے۔ وہ طبقہ پرولتاریوں کے مفاد کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ صرف اپنے مفاد کی پرواہ کر رہا ہے۔ میرے لئے کسی حکومت کو جانچنے کا یہ معیار ہے کہ وہ حکومت عوام کی ادبی اور اخلاقی حالت کس درجہ

ملک سدھارتی ہو یہ نہیں ہے کہ حکومت نے کاغذ پر کیا آئین و قوانین بنا رکھے ہیں۔ آئین و قوانین بھی اپنی جگہ ضروری ہوتے ہیں۔ لیکن میرا ترقی کا معیار عوام کی ترقی ہے۔

ڈیوی:۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ سوویٹ یونین میں اقتصادی جماعتیں نمودار ہوگئی ہیں؟

ٹروٹسکی:۔ ذاتیں کہیئے۔ ذاتیں نمودار ہوگئی ہیں۔

فیزلی:۔ سوشلسٹ نظام میں طریق پیداوار حکومت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس کو چلانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حکومت ماہرین فن رکھے اور اُن سے کام کرائے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ماہرین فن کی کچھ عرصے بعد ایک ذات بن جاتی ہے۔ ہر سوشلسٹ ملک میں ذاتوں کا بن جانا ناگزیر ہے آپ کے نزدیک کیا یہ تحلیل درست نہیں ہے؟

ٹروٹسکی:۔ ذاتوں کا بہت کچھ انحصار ملک کی عام حالت پر ہے۔ اگر عوام پڑھے لکھے اور ترقی یافتہ ہیں تو ماہرین فن کی ذات اتنی طاقتور نہیں ہوسکتی کہ عوام پر حکومت کرے۔ ایک متمدن ملک کے عوام و خواص کی دماغی، اخلاقی اور اقتصادی ترقی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ایسے ملک میں ماہرین عوام کے ماں باپ نہیں بن سکتے۔ لیکن سوویٹ یونین میں ذات کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ روس ایک غیر متمدن ملک تھا جس کی تاریکی ہمیں ترکے میں ملی تھی۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ چوبیس گھنٹے میں صدیوں کی تاریکی دور کردیتے۔ اگر روس ترقی یافتہ ملک ہوتا تو وہاں ذاتوں کا پیدا ہونا ممکن ہی نہ ہوتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ملک میں جہاں بھی سوشلزم جاری ہو وہاں ذاتوں کا نمودار ہونا بھی لازمی ہے۔ ترقی یافتہ ملک میں یہ ضروری نہیں کہ وہاں روس کی سی ذاتیں پیدا ہوں اگر ایک میز پر کھانے والے کم ہوں اور کھانا زیادہ ہو تو اس میز پر آمریت کی کیا ضرورت ہوگی اس میز پر بدعنوانی کا کوئی احتمال ہی نہیں ہوسکتا۔ لیکن جب میز پہ کھانا کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں اس پر ہر ایک بھوکے کی یہ کوشش ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ کھانا اُٹھائے۔ اس میز پر آمریت کا ہونا ضروری ہے۔ ذاتوں کے نمودار ہونے کا انحصار ملک کی اقتصادی حالت پہ ہے۔ ایک غریب پس ماندہ سوشلسٹ ملک میں ابتداً ذاتوں کا پیدا ہوجانا ایک تاریخی ضرورت

ہے۔ ان ذاتوں سے مفر نہیں ہوسکتا یہ ترکہ میں ملتی ہے۔ اگر جرمنی اور روس میں بیک وقت سوشلسٹ انقلاب ہوجاتا تو جرمنی میں ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے ذاتیں نہ بنتیں اور اس امر کا اثر روس پر یہ ہوتا کہ وہاں کی ذاتیں بہت جلد فنا ہوجاتیں۔ اسٹیلن ذاتوں کی زندگی کم کرنے کی بجائے ان کی زندگی بڑھا رہا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں اس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ حکومتی طبقے کو سوائے خانہ جنگی کے دوسری تحریک اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ عوام یا پارٹی کی رائے کا حکومتی طبقے پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔"

فینرلی:۔ آپ کا اس کی بابت کیا خیال ہے کہ اجتماعی تشدد سے سیاسی طاقت حاصل ہوسکتی ہے۔

ٹروٹسکی:۔ میں ایک مثال دے کر اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ جب روس میں اکتوبر کا انقلاب ہوا اس وقت خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرا لیکن کچھ ہی دن بعد جنرل کرسینیٹو نے بغاوت کی۔ ہم نے اس کو قید کر دیا لیکن غلطی یہ کی کہ چند دن بعد چھوڑ دیا اس نے جنوبی روس میں سفید روسیوں کی ایک فوج بنالی اور ہزاروں لاکھوں مزدوروں اور کسانوں کو جو ہم سے ہمدردی رکھتے تھے قتل کر دیا۔ اس قتل و غارت میں فرانس کی سرمایہ دار جماعت اور انگلستان کے ایجنٹوں کا بھی ہاتھ تھا۔ جب ہم نے یہ دیکھا کہ دوسری حکومتیں بھی باغیوں کی مدد کر رہی ہیں اور ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں تو گولی کا جواب گولی سے دیا۔ روس میں جو کشت و خون ہوا اس کی تمام تر ذمہ داری سرمایہ دار ملکوں پر ہے۔ اگر کوئی مجھ پر قاتلانہ حملہ کرتا ہے تو اپنی جان بچانا میرا فرض ہے اگر اس کوشش میں حملہ آور کو قتل کرنا پڑے تو مجھے قتل کرنے میں دریغ نہیں ہوگا۔ غریب عوام کو امیر حملہ آوروں سے بچانے میں جو کشت و خون ہماری پارٹی کو کرنا پڑا اس کی تمام ذمہ داری میں لینے کو تیار ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر یورپ کے اور ممالک میں بھی انقلاب ہوجاتا تو روس میں کشت و خون کی نوبت نہ آتی۔ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے اجتماعی تشدد کی ضرورت نہیں۔

فینرلی:۔ اس بیان سے آپ کا یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی حفاظت کے

لئے تشدد استعمال کرے لہذا اگر اسٹیلن تشدد کرتا ہے تو وہ حق بجانب ہے۔

ٹروٹسکی:۔ گرد و پیش کے حالات و واقعات سے علیحدہ کر کے کسی حق کے جواز و غیر جواز کا سوال اٹھانا درست نہیں حکومت کے ہر حق کو حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ آج کل سوویٹ یونین میں اجتماعی تشدد ہو رہا ہے اور حکومت آئے دن مقدمے چلا رہی ہے اور عوام و خواص کو گولی کا نشانہ بنا رہی ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ سوشلزم سوویٹ یونین سے مفقود ہوتا جا رہا ہے آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ سوویٹ یونین میں چوری بہت عام ہے کسی ملک میں زیادہ چوری ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہاں کی اقتصادی اور ذہنی حالت بہت گری ہوئی ہے۔ بجائے اس کے کہ سوویٹ یونین کی حکومت ملک کی اقتصادی حالت درست کرے چور کو سزا دیتی ہے ایک سوشلسٹ ملک میں چوری کا ہونا اور حکومت کا چور کو سزا دینا اس امر کا بہت ہی زبردست ثبوت ہے کہ وہاں سوشلسٹ نظام ختم ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں سوویٹ یونین میں یہ قانون تھا کہ بارہ برس کا بچہ بھی اگر چوری کرے تو اس کو سولی دے دی جائے اور لطف یہ ہے کہ اسی سال اسٹیلن نے یہ اعلان کیا کہ اب سوویٹ یونین میں مکمل سوشلزم ہو گیا ہے۔ کیا سوشلزم اس اقتصادی اور اخلاقی حالت کا نام ہے کہ عوام چوری ڈاکہ کر کے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں۔ ان سب برائیوں کی وجہ حکومتی طبقہ ہے۔ یہ طریق پیداوار کو اس طرح چلا رہا ہے کہ طریق پیداوار کے سب فوائد حکومتی طبقے کو ہی حاصل ہیں۔ عوام بہت کم مستفید ہوتے ہیں۔ در اصل واقعہ یہ ہے کہ اگر روس اقتصادی اعتبار سے ترقی یافتہ ملک ہوتا تو یہ صورتیں پیش نہ آتیں۔ کیوں کہ ترقی یافتہ ہونے کی صورت میں دو تین ماہ ہی میں ملکی طاقت ہمارے ہاتھ میں آجاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تقریباً تین سال تک خانہ جنگی رہی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملک کی تمام طاقت کو فوجی اصول پر ایک مرکز پر لانا پڑا اور جب ایک مدت تک طاقت چند ہاتھوں میں رہتی ہے تو اس کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے انقلابی دور میں حکومتی طبقہ تھا ہی نہیں۔ جراثیم موجود تھے۔ لیکن جراثیم کا ہونا کسی حکومت کو استبدادی

نہیں بناتا۔ جس طرح بے رحمی کم و بیش ہر انسان میں ہوتی ہے۔ لیکن ہر انسان قاتل نہیں ہوتا۔ بے رحمی کا بڑھ جانا اس کو قاتل بنا دیتا ہے۔ اسی طرح جراثیم کا ہونا حکومت کو استبدادی نہیں بناتا میں ہیگل کے کمیت اور کیفیت کے نظریے کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ استبدادیت کے جراثیم ہم میں بھی موجود تھے۔ لیکن ہم استبدادیت پسند نہیں تھے ہماری کوشش یہ تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو عوام کے ہاتھ میں طاقت دے دیں۔ لیکن کچھ عرصے میں سویٹ یونین میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں کہ جن لوگوں نے انقلاب کیا تھا اور جو انقلاب کے زمانے کے لیڈر تھے وہ یا جلاوطن یا قتل کر دیے گئے اور ان کی جگہ رجعت پسند اور استبدادیت پسند لوگ آ گئے۔ اب اسٹیلن اس حکومتی طبقے کا کھلونا بن گیا ہے۔ اسٹیلن نے اپنے قیام اور استحکام کے لیے حکومتی طبقے کو طاقتور بنایا۔ لیکن اب وہ طبقہ اتنی طاقت پکڑ گیا ہے کہ اگر اسٹیلن اس کو دبانا بھی چاہے تو نہیں دبا سکتا البتہ اگر حکومتی طبقہ اسٹیلن کو ہٹانا چاہے تو ہٹا سکتا ہے اب اسٹیلن اس طبقے کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا ہے۔ روس کی خفیہ پولیس کا سرغنہ یگوڈا تھا اسی نے یہ سب جعلی مقدمے ترتیب دئے تھے۔ لیکن اب وہ خود دو ماہ سے جیل میں ہے۔ اب اسٹیلن کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ اپنی طاقت کی پیاس بجھانے کے لئے حکومتی طبقے کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہے۔ ہم نے باغی سرمایہ داروں کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ اسٹیلن کمیونسٹ کا شکار کر رہا ہے۔

لا فیلیٹ :۔ سویٹ یونین فسطائی طاقتوں سے گھرا ہوا ہے بہت ممکن ہے کہ حکومتی طبقہ اس لئے اپنے ہاتھ میں طاقت رکھنا چاہتا ہو کہ اس کو فسطائی طاقتوں کی طرف سے خطرہ ہے۔

ٹروٹسکی :۔ میرا یہ خیال نہیں ہے فسطائی طاقتیں سویٹ یونین کے اندرونی حالات کیسے بدل سکتی ہیں۔ اگر سویٹ یونین فسطائی طاقتوں سے گھرا ہوا ہے تو فوج کو طاقتور بنانا چاہیئے نہ کہ خفیہ پولیس قائم کرنا چاہیئے۔ خفیہ پولیس ہٹلر کے خلاف نہیں ہے وہ تو سویٹ یونین کے اندرونی دشمنوں کے خلاف ہے اور وہ دشمن باغی سرمایہ دار نہیں ہیں

بلکہ انقلاب پسند کمیونسٹ مزدور ہیں روس کی خفیہ پولیس اس امر کا بین ثبوت ہے۔ کہ حکومتی طبقہ فسطائی طاقتوں سے ڈر کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہیں رکھ رہا ہے بلکہ اس کو طاقت کی ہوس ہو گئی ہے۔

ڈیوی:۔ کیا آپ یہ بتائیں گے کہ ایک ملک میں سوشلزم کے قیام کا مسئلہ ایسا مختلف فیہ مسئلہ کیوں بن گیا؟"

ٹراٹسکی:۔ صرف ایک ہی ملک میں سوشلزم کے قیام کے مسئلے کو ماننا ہماری نظر میں بین الاقوامی انقلاب اور سوشلزم کی تردید ہے۔ ہمارے لئے بین الاقوامی سوشلزم کوئی خیالی محض اور ناقابل عمل اصول نہیں ہے بلکہ اس کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے اگر صرف ایک ملک میں سوشلزم کا اصول مان لیا گیا تو مختلف ملکوں کے مزدوروں میں ہمدردی اور اتحاد عمل ختم ہو جاتا ہے اور سوشلزم کا یہ مقصد کہ تمام دنیا ایک رشتے میں منسلک ہو جائے مفقود ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ملک میں سوشلزم کا قیام اور بین الاقوامی انقلاب کا اصول ساتھ ساتھ ترقی نہیں کر سکتے۔ میرا مطلب مثال سے صاف ہو جائے گا۔ سویٹ یونین میں انقلاب قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہوا کہ فرانس سے اتحاد قائم کیا جائے۔ فرانس سرمایہ دار ملک ہے جہاں سرمایہ دار اور مزدور جماعت کے مفاد قدرتی طور پر ٹکراتے ہیں جب سویٹ یونین فرانس کا دوست بن گیا تو سویٹ اس پر مجبور رہا کہ فرانس کی سرمایہ دار جماعت کے مفاد کا خیال رکھے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ فرانس کی مزدور جماعت کے خلاف ہونا پڑا۔ مزدور جماعت کی مخالفت کا یہ نتیجہ نکلا کہ سویٹ یونین اور فرانس کی مزدور جماعت کے تعلقات ختم ہو گئے۔ جب اسپین میں انقلاب ہوا تو سویٹ یونین فرانس سے اتحاد کی وجہ سے اس پر مجبور رہا کہ اسپین کی کمیونسٹ جماعت کی مدد نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ جب مختلف ملکوں کے کمیونسٹ آڑے وقت میں ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے تو ان میں ہمدردی اور اتحاد عمل کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہر مزدور جماعت اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے لگی اسی لئے کمیونسٹ انٹرنیشنل

مردہ ہو گئی ہے۔ مختلف ملکوں کے مزدور تو الگ الگ ہو گئے لیکن سرمایہ داروں کا بین الاقوامی اتحاد اور مضبوط ہو گیا ہے۔ اسٹیلن نے یہ نظریہ پیش کر کے کہ سوشلزم صرف ایک ملک میں زندہ رہ سکتا ہے سوشلزم کی روح فنا کر دی۔ ۱۹۲۳ء میں اسٹیلن خود ایک ملک میں سوشلزم کے نظریے کے خلاف تھا اس نظریے کی تردید میں اسٹیلن نے اپریل ۱۹۲۴ء میں خود ایک رسالہ لکھا تھا جس کی جلد میرے پاس موجود ہے۔ ہم ملکی ترقی کے خلاف نہیں تھے ہم کہتے تھے کہ سویٹ یونین میں اقتصادی ترقی بڑی شد و مد کے ساتھ ہونا چاہئے لیکن ہمیں اپنا بین الاقوامی فرض بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ کمنترن کا کام یہی ہے کہ وہ دنیا کی مزدور جماعت کی رہنمائی کرے۔ اگر صرف ایک ملک میں سوشلزم کا نظریہ درست مان لیا جائے تو کمنترن کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی تمام انقلابی لیڈر جنھوں نے کمنترن کی بنیاد ڈالی ایک ملک میں سوشلزم کے نظریے کے خلاف تھے۔

ڈیوی:۔ مسٹر ٹروٹسکی آپ پہلے کہہ چکے ہیں کہ بولشیوک پارٹی کے ممبر کو پارٹی کے اصول اور اس کے احکام کی پابندی کرنی پڑتی تھی کیا آپ بتائیں گے کہ وہ اصول اور پابندیاں کیا تھیں؟

ٹروٹسکی:۔ پارٹی کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ اس میں بحث و مباحثہ کی پوری آزادی تھی اور پارٹی کے احکام کی پوری پابندی ہوتی تھی۔ میں اس کو ذرا اور تفصیل سے بیان کروں گا۔ مجھے اکثر مرکزی کمیٹی کی تجاویز کی مخالفت کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اگر وہ تجویز پاس بھی ہو جاتی تھی تب بھی جب کبھی اس کا ذکر آیا میں نے برابر اس کی مخالفت کی لیکن میں نے کبھی عملی طور پر مرکزی کمیٹی کے فیصلوں کی مخالفت نہیں کی اور میں اسی کو پارٹی کے احکام کی پابندی سمجھتا ہوں۔

ڈیوی:۔ آپ نے ذکر کیا تھا کہ چین کے معاملے میں پارٹی کے فیصلے کے خلاف آپ نے ایک ٹائپ شدہ پرچہ نکالا تھا کیا اس عمل سے پارٹی کے احکام کی نافرمانی نہیں ہوئی۔

ٹروٹسکی:۔ جب اسٹیلن کی حکومت نے ہمارے مضمون چھاپنے سے انکار کر دیا تو گویا اس نے

پارٹی کا ایک بنیادی اصول توڑ دیا۔ ہمارا یہ رویہ کہ ہم نے پرچے بانٹے اس بنیادی اصول کی عملی حمایت تھی کہ ہر ایک ممبر کو اظہار خیال کا حق حاصل ہے۔ ہمارا یہ طرز عمل حکومت کی چنگیزیت کے خلاف عملی احتجاج تھا۔ ہم نے پارٹی کی پابندیوں کے خلاف کچھ نہیں کیا بلکہ پہلے ہمارے مخالفوں نے پارٹی کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کی تب ہم نے احتجاج کیا۔

فینرٹی :۔ لیکن اعتراض و اختلاف کا حق اس وقت تک ہی رہتا ہے جب تک کہ مرکزی کمیٹی کسی امر کا فیصلہ کرے۔ جب ایک مرتبہ فیصلہ ہو گیا تو ممبروں کو حق نہیں رہتا کہ اس فیصلے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ یہ بغاوت کی شکل ہے۔[1]

ٹراٹسکی :۔ مرکزی کمیٹی کے فیصلے کے باوجود ممبروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی فیصلے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہیں کیونکہ مرکزی کمیٹی کے اوپر بھی ایک حاکم موجود ہے یعنی پارٹی کانگرس۔ پارٹی کے ہر ایک ممبر کو یہ حق ہے کہ اپنے خیالات کی تلقین کرے تاکہ پارٹی کے جو عام ممبر ہیں اُن کو اپنی طرف کر سکے اور مرکزی کمیٹی کے فیصلے کو مسترد کرا سکے لیکن جب تک وہ فیصلے کو مسترد نہ کرا سکے اس وقت تک اس کو فیصلے کی پابندی کرنی لازمی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اکتوبر کے انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر ہم نے اپنی پارٹی کے لئے چند نعرے مقرر کئے تھے وہ یہ ہیں :۔

(۱) لینن کی وصیت پوری کرو

(۲) دائیں جماعت کا نیا اقتصادی پروگرام کے حامیوں کا۔ کولک اور حکومتی طبقہ کی مخالفت کرو۔

(۳) مزدوروں کی اصلی جمہوریت قائم کرو۔

(۴) لینن کی پارٹی میں اتحاد رکھو

(۵) لینن کی مرکزی کمیٹی کی مدد کرو وغیرہ

حکومتی طبقے نے ان جھنڈوں کو چھین لیا جن پر یہ نعرے نسب تھے اور جو لوگ جھنڈے

---

[1] ناظرین پوتس والا معاملہ پیش نظر رکھیں۔

لئے ہوئے تھے اُن کو گرفتار کرلیا۔ ہم نے یہ جو کچھ کیا ہمیں اس کا حق تھا۔ آزاد اظہار خیال تو پارٹی کا بنیادی اصول تھا۔ پارٹی کا کوئی قانون ممبر سے آزاد اظہار خیال کا حق نہیں چھین سکتا۔ اگر پارٹی آزاد اظہار خیال کے خلاف قانون بناتی ہے تو ہر ممبر کا فرض ہے کہ اس قانون کی عدول حکمی کرے کیونکہ ایسا قانون پارٹی کے بنیادی اصول کو توڑتا ہے

ڈیوی:۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کے اختلاف سے اسٹیلن نے یہ خیال کیا ہو کہ بیشتر اس کے کہ اختلاف بڑھ کر کوئی ناخوش گوار شکل اختیار کرے اس کو پہلے ہی دبا دینا چاہیئے۔

ٹراٹسکی:۔ اگرچہ ہماری پارٹی میں شروع ہی سے آہنی باقاعدگی تھی لیکن لینن نے ہمیشہ اس پر زور دیا کہ کسی چیز کی روح اس کی ہیئت سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اور اگر روح کی تازگی کو برقرار رکھنے میں ہیئت کچھ بگڑ بھی جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ خیالات کا آزادی سے اظہار کرنا پارٹی کی باضابطگی قائم رکھنے سے زیادہ اہم ہے۔ اگر خیالات کے اظہار کرنے میں پارٹی کی باضابطگی توڑنی بھی پڑے تو توڑ دینی چاہیئے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں بولشیوک پارٹی نے روس حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ زینوویو اور کیمنٹو جو ہماری پارٹی کے اہم ممبر تھے بغاوت کے مخالف تھے۔ اس وقت ہمارے لئے بغاوت کرنے اور نہ کرنے کا مسئلہ بہت اہم تھا ان دونوں کی مخالفت سے لینن بہت گرم ہوگیا اور زینوویو اور کیمنٹو کو غدار کہنے لگا اور اس پر زور دینے لگا کہ ان کو پارٹی سے نکال دینا چاہیئے۔ لیکن ہم نے اس کی مخالفت کی اور ان کو نہیں نکلنے دیا۔ دو دن بعد لینن نے اس کا خود اس کا اعتراف کیا کہ ان کا نکالنا غلطی ہوتا۔ ہم مخالفوں کو حکومت میں حصہ لینے دیتے تھے۔ روس میں شروع ہی میں تین پارٹیاں ہوگئیں تھیں۔ منیشوک۔ سوشل انقلابی جماعت اور بالشیوک۔ بالشیوک پارٹی نے عوام کو اپنا ہم خیال بنالیا لیکن اس پر بھی ہم نے دوسری پارٹیوں کو حکومتی اداروں سے نہیں نکالا البتہ جب مینشوک اور سوشل انقلابی جماعتیں ہمارے مخالفوں کی طرف ہوکر ہم سے لڑیں۔ تب ہم نے اُن پر ہاتھ اُٹھایا۔ ہمارا ان جماعتوں کے خلاف ہاتھ اُٹھانا کسی

سیاسی اختلاف کی بنا پر نہیں تھا بلکہ فوجی ضرورت تھی۔ سویٹ یونین کے پہلے ملکی نظام میں کوئی ایسی دفعہ نہیں تھی۔ جس کی رو سے ملک میں ایک سے زیادہ پارٹیاں ہونا منع ہو پہلے چار پارٹیاں ہوتی تھیں اور انارکسٹ بھی ایک پارٹی تھی۔ لیکن نیا قانون ایک سے زیادہ پارٹیوں کو حکومت میں حصہ لینے سے قانوناً روکتا ہے۔ اس کے برخلاف جولائی ۱۹۱۸ء میں ہماری کابینہ میں پانچ یا چھ جماعتوں کے ممبر شریک تھے۔ جب سوشل انقلابی ممبروں نے بغاوت کی اور کشت و خون پر اُتر آئے اس وقت ہم نے اُن کا مقابلہ کیا لیکن یہ واضح رہے کہ ہم نے ان کو کابینہ سے نہیں نکالا۔ انھوں نے خود استعفیٰ دیے۔ آخر تک اُن کی پارٹی کا ایک اخبار نکلتا رہا اور ان کو اظہار خیال کا پورا موقع دے دیا گیا۔ ہم اُن سے اختلاف رائے پر نہیں لڑتے بلکہ جب انھوں نے بغاوت کی تو ہم نے طاقت استعمال کی۔

ڈیوی:۔ آج کل کی سیاسی بین الاقوامی حالت کے مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا بین الاقوامی انقلاب کا تخیل ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

ٹروٹسکی:۔ مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ اسپین میں جو کچھ ہو رہا ہے فرانس کی جو سیاسی حالت ہے اور بین الاقوامی تعلقات میں سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے جو کشیدگی پیدا ہو رہی ہے۔ یہ آپ کے خیال کی تائید نہیں کرتیں۔ اگر انسانیت کو بچانا ہے اور انسان کو دوبارہ وحشی بننے سے روکنا ہے تو سوشلسٹ انقلاب کرنا ضروری ہے۔

ڈیوی:۔ کیا آپ کے خیال میں مختلف ملکوں کے مزدور اس قدر بیدار ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے جماعتی حالات کو بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں۔

ٹروٹسکی:۔ میرا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں رہ کر پرولتاری خود بخود اتنے بیدار نہیں ہو سکتے کہ اپنے معاملات کو بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے دیکھ سکیں۔ اس کے لئے ان میں تبلیغ کی بہت ضرورت ہے۔ تبلیغ کے لئے خاموش فضا کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں انفرادی کشت و خون اور وحشت پھیلانے والی کارروائیوں کے خلاف ہوں کیوں کہ اُن سے ملک

کی فضا میں اس قدر انتشار اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے کہ تبلیغی کام نہیں ہو سکتا۔ ہر آدمی کشت و خون کے قصے سننے سنانے میں لگ جاتا ہے اور چونکہ وہ عوام کی دلچسپی کی چیز ہوتے ہیں۔ اس لئے عوام دوسری بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ سرمایہ داری کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مزدوروں کو ایک جگہ جمع کرے اور ان کو نچوڑے۔ ایک جگہ اجتماع کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ مزدوروں میں طاقت کا احساس پیدا ہو اور بغاوت پر آمادہ ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کوئی ان کی رہنمائی کرنے والا پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ مزدوروں کو معقول قسم کے لیڈر نہیں ملتے اس لئے وہ ہمیشہ شکست کھاتے ہیں۔

ڈیوی:۔ مسٹر ٹروٹسکی آپ کا اس کی بابت کیا خیال ہے کہ اگر کوئی غیر ملکی ادارہ خواہ وہ کمیونسٹ انٹرنیشنل ہی کیوں نہ ہو۔ جب کسی دوسرے ملک کے انقلاب میں حصہ لے گا تو وہاں کے عوام اس بیرونی امداد کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھیں گے۔

ٹروٹسکی:۔ میرا یہ خیال نہیں ہے۔ مختلف ملکوں کی مزدور سبھائیں ایک دوسرے کی مدد کرتی رہتی ہیں اور اس بیرونی امداد کو کبھی شبہ کی نظر نہیں دیکھا جاتا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ اگر بیرونی امداد مشروط طریق پر اپنے مفاد کے لئے دی جائے تو وہ ضرور دوسرے ملک میں مخالفت پیدا کرے گی اور عوام اس پر شبہ کرنے پر حق بجانب ہوں گے لیکن اگر دوستی اور خلوص سے کام ہو اور عوام کو یہ یقین ہو جائے کہ بیرونی امداد سے ان کا اپنا ہی فائدہ ہے نہ کسی غیر ملک کا تو عوام امداد کو شبہہ کی نظر سے نہ دیکھیں گے۔ جب ہڑتال بڑے پیمانے پر ہو جاتی ہے تو وہی انقلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ڈیوی:۔ آپ کا یہ نظریہ ہے کہ اقتصادی حالات انقلاب پیدا کرتے ہیں تو کیا دنیا کی اقتصادی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ انقلاب ہونا ضروری ہے۔

ٹروٹسکی:۔ میرا خیال ہے کہ مدت سے دنیا کی اقتصادی حالت ایسی ہے کہ انقلاب کا امکان ہر وقت موجود ہے۔ یہ کیفیت ۱۹۱۳ء سے ہے۔ جنگ عظیم اس بات کا ثبوت تھی کہ سرمایہ داری

بغیر کشت و خون اور غارت گری کے نہیں چل سکتی اگر دنیا کے پرولتاریوں نے ۱۹۱۴ء میں انقلاب کر دیا ہوتا تو دنیا جنگ عظیم کی ہولناکی سے بچ جاتی۔ لیکن چونکہ مزدور جماعت میں بیدار طبقہ جو انقلاب کی رہنمائی کرے پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس لئے انقلاب ہونا دوبھر ہو گیا ہے۔

فیلسنرٹی:۔ فرض کیجئے کہ تمام ملکوں میں سوشلسٹ انقلاب ہو بھی جائے تو کیا کوئی ایسا پروگرام موجود ہے جس کے مطابق دنیا کی اقتصادی حالت درست کی جا سکے۔ اور ریاستوں کے باہمی اقتصادی تعلقات کو قائم کیا جا سکے۔

ٹروٹسکی:۔ سویٹ یونین میں تو یہ ہو ہی گیا ہے کہ مقابلے کی بجائے اب اقتصادی پروگرام طریق پیداوار کو چلاتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہو گیا ہے کہ باوجود حکومتی طبقے کی ناتجربہ کاری اور کوتاہ نظری کے طریق پیداوار ایک پروگرام سے چلانا زیادہ سودمند ہے۔ آپس کے مقابلے سے سماجی ترقی اتنی تیزی سے نہیں ہوتی جتنی کہ پروگرام سے ہوتی ہے۔ پروگرام اگر ایک ملک میں ہو سکتا ہے تو دوسرے ممالک میں بھی ہو سکتا ہے۔ اگر سب ملکوں کے رہنما سر جوڑ کر بیٹھ جائیں تو ریاستوں کے باہمی اقتصادی تعلقات کا مسئلہ بھی بہت جلدی اور آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

اسٹول برگ:۔ مسٹر ٹروٹسکی آپ کا اس کی بابت کیا خیال ہے کہ کسی ملک کی کمیونسٹ پارٹی خود مختار ہونی چاہیئے یا کمیونسٹ انٹرنیشنل کے ماتحت ہونی چاہیئے؟

ٹروٹسکی:۔ اس سوال کے جواب کا انحصار اس پر ہے کہ خود مختاری سے مراد مکمل خود مختاری ہے تو کمیونسٹ انٹرنیشنل ایک بے معنی چیز رہ جاتی ہے اور اگر ماتحتی سے مراد یہ ہے کہ کمنٹرن دوسرے ملک کی کمیونسٹ پارٹی کے ہر معاملے میں دخل دے۔ اور پارٹی کمنٹرن کے اشاروں پر چلے تو دوسرے ملک کی کمیونسٹ پارٹی میں کوئی بیدار مغز انسان شریک ہی نہیں ہو گا اور بغیر بیدار مغز لوگوں کی شرکت کے پارٹی مقامی حالت کو کس طرح سنبھال سکتی ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ دوسرے ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کو نہ مکمل طریق پر خود مختار ہونا چاہیئے اور نہ ہر معاملے میں ماتحت ہونا چاہیئے ان کی حالت درمیانی ہونی چاہیئے۔ اصولی باتوں میں

کمشنر کی ماتحتی اور مقامی معاملات میں خود مختاری۔

اسٹول برگ:۔ آپ نے اپنی کتاب The Revolution Betrayed میں یہ لکھا ہے کہ سویٹ یونین میں ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے جس کو آپ نے ذات کے نام سے موسوم کیا ہے۔ آپ ذات اور جماعت میں کیا فرق کرتے ہیں؟

ٹروٹسکی:۔ ابھی تک سویٹ یونین میں ملکیت کی شکل اشتراکی ہے۔ اگرچہ اشتراکی طریق پیداوار سے جو ترقی ہو رہی ہے۔ اس کا فائدہ صرف حکومتی طبقے کو پہنچ رہا ہے۔ اس حکومتی طبقے کو میں ذات کہتا ہوں لیکن اگر کچھ عرصے بعد اشتراکی ملکیت کو بدل کر انفرادی ملکیت کر دی گئی دوسرے الفاظ میں سماجی انقلاب کر دیا جائے اور باپ کا ترکہ بیٹے کو ملنے لگے تو وہ ذات نہ رہے گی۔ بلکہ جماعت ہو جائے گی۔

اسٹول برگ:۔ آپ کے خیال کی بموجب اقتصادی نظام جدلیات سے پیدا ہوتا ہے۔ آج سرمایہ دار جماعت اپنی مخالف مزدور جماعت پیدا کر رہی ہے۔ اب ان دونوں کی لڑائی سے ایک تیسری چیز یعنی سوشلزم پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن جب سوشلزم پھیل جائے گا اور سماج میں جماعتیں مفقود ہو جائیں گی تو اس وقت آپ کا جدلیات کا نظریہ کس طرح کام کرے گا۔

ٹروٹسکی:۔ سوشلسٹ نظام میں جدلیات۔ فنونِ لطیفہ۔ فلسفہ اور سائنس میں کام کرے گی۔ اس دور میں نہ ابتدائی تفریق ہو گی اور نہ جماعتی جھگڑے بلکہ علمی اختلاف اور جدوجہد ہو گی انسانیت ارتقا کی اس منزل پر پہنچ چکی ہو گی۔ جہاں جدلیات اقتصادی اور مادی میدان سے بلند ہو کر علمی میدان میں کام کرے گی۔

ڈیوی:۔ مسٹر ٹروٹسکی۔ آپ نے اپنی کتاب The Revolution Betrayed میں لکھا ہے "جب سویٹ یونین میں سرمایہ داروں سے کام کرانے کی کوشش کی گئی تو سویٹ جمہوریت کی طاقت منتشر ہونے لگی۔ سویٹ جمہوریت اُن سے کام لینے پر مجبور تھی کیونکہ اسی جماعت کے

لوگ اقتصادی۔ علمی اور سائنس کے معاملات سمجھتے تھے۔ طریق پیداوار کا چلانا وہی لوگ جانتے تھے۔ وہی انجینیر اور پروفیسر تھے۔ غرض سماجی زندگی کے سب مورچوں پر وہی قابض تھے اور وہی اس کی نگہداشت کرسکتے تھے۔ جب ابتدا میں مجبوراً ان لوگوں کی مدد لینی پڑی تو وہ ایک ذات بن گئی اور ایک علیحدہ طبقہ پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا" تو کیا ایک غیر ترقی یافتہ ملک ہی میں ایسا ہونا ممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ایک ترقی یافتہ ملک میں بھی انقلاب ہوتا تو وہاں بھی یہی صورت پیدا ہوتی۔

ٹراٹسکی:۔ اس کا بہت کچھ انحصار ملک کی اقتصادی اور اخلاقی حالت پر ہے۔ اگر عام طور پر یقین ہو جائے کہ ہر روز نہ صرف کھانا مل جائے گا بلکہ تعلیم کے مواقع اور اظہار خیال کی آزادی بھی ہو گی تو کوئی تعلیم یافتہ آدمی یہ نہ کرے گا کہ دو روٹیاں کھائے اور دو روٹیاں دبا رکھے ترقی یافتہ ملک میں مزدوروں کو بھی اچھی غذا ملتی ہے اور میرا خیال ہے کہ اور سہولتوں کی موجودگی میں ہر ایک آدمی خواہ وہ مزدور سے کتنا ہی زیادہ پڑھا لکھا کیوں نہ ہو۔ مزدور کا کھانا کھانے پر راضی ہو جائے گا اور ذاتیں نہیں بنیں گی۔ لیکن سوویٹ یونین میں مزدور کا معیار اتنا گرا ہوا تھا کہ کسی طرح بھی مختلف طبقے کے لوگوں کے مختلف معیاروں کو ایک سطح پر نہیں لایا جا سکتا تھا۔ سوویٹ چونکہ غیر ترقی یافتہ ملک تھا اس لئے یہ ضرورت پیش آئی کہ پڑھے لکھے اور کاریگر لوگوں کو اناڑی مزدور کی محنت کے معاوضے سے زیادہ معاوضہ دیا جائے۔ لیکن ایک ترقی یافتہ ملک میں مزدور اور دوسرے طبقوں کے معیار میں اتنا نمایاں فرق نہیں ہوتا۔ اگر قدرے ہوتا بھی ہے تو اس کو آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے اور ذاتوں کو بہت جلد ختم کیا جا سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)

اسکول ماسٹر

عبدالغفور صاحب ایم۔ اے مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ولایت کی یونیورسٹی کا ایک پروفیسر تعلیمات ایک مرتبہ فرانس گیا اور وہاں اس نے ایک فرانسیسی اُستاد کو سبق پڑھاتے دیکھا۔ سبق کیا تھا۔ استاد نے اپنی زندگی کے تاثرات کو چند لمحات کے قلیل عرصے میں منقطر کر دیا تھا۔ پروفیسر مذکور سبق سنتے رہے جب ختم ہوا تو اُستاد اُن کے پاس آیا۔ تھکا ہارا۔ پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتا ہوا پروفیسر نے پوچھا کہو سبق کیسا رہا۔ فرانسیسی اُستاد بولا۔ میں نے ان بچّوں کو زندگی عطا کر دی ہے اور پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگا۔ کیوں نہیں! انھوں نے مجھے ایک نئی زندگی اس کے بارے میں دے دی ہے۔

چیخوف کے اس افسانے میں ہیرو ایک ایسا اُستاد ہے جس نے سچ مچ اپنی زندگی بچّوں کو دے دی ہے۔ موت کا خوفناک سایہ اس پر دم بدم گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ مگر اس کی تاریکیوں میں بھی اسکول ماسٹر اس شمع کو نہیں بھولتا ہے جس نے اس کی زندگی میں جوش عمل اور نیک نیّتی کی کرنیں دوڑا دیں۔ اور اس قدر قربانی۔ اس قدر ایثار کا بدلہ۔ پانچ سو روبل نہیں اس کا اصلی اور صحیح صلہ وہ نذر عقیدت ہے جو سماج ایک اچھے استاد کی خدمت میں پیش کر سکتی ہے وہ صلہ جو اسلامی اور ہندو نظام تعلیم کے ماتحت استاد اور گرد کو نصیب ہوا جنھوں نے اپنی خدمت کا صلہ کسی اقتصادی ترازو سے نہیں کیا بلکہ سماجی اور خلاقی اقتدار کی کسوٹی پر پرکھا۔ ہندوستان میں ہمیں سیدھے سادے برّ دنی کے قسم کے لوگوں کی ضرورت ہے جو افسرانہ، سرمایہ دارانہ منبر سے اُتر کر اُستاد کے کام کو انسانی نقطۂ نگاہ سے جانچیں۔ جو اپنی سادگی، اپنے خلوص سے تصنع اور بناوٹ کے بندو قیود کو توڑ ڈالیں اور انسپکٹر صاحبان بھی (مجھے تو انسپکٹر کا نام لیتے ہی خفیہ پولیس یا جیل کے انسپکٹر یاد آتے ہیں) حکومت کا کاغذی نقاب اپنے چہرے پر سے نوچ کر پھینک دیں اور میکانکی اور محض

دفتری آرائش اور کارگذاری کی بجائے انسانی ہمدردی اور دلی گرم جوشی پر ایمان لے آئیں تو خدا جانے کتنے دور افتادہ۔ گمنام گوشوں میں کام کرنے والے اُستادوں کے دل میں اپنے کام کی سچی محبت اور اُن کی بے کیف زندگی میں جائز افتخار کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ (مترجم)

ماسٹر صاحب سالانہ ڈنر کے تیار ہو رہے تھے۔ ہر سال امتحان کے بعد مدرسے کی انتظامیہ انجمن کی طرف سے ابتدائی مدارس کے انسپکٹر کے اعزاز میں ایک شان دار دعوت دی جاتی تھی جس میں کارخانے کے منیجر مزدوروں کے جمع دار، انجینیر وغیرہ سبھی لوگ مدعو ہوتے تھے۔ اگرچہ تھی تو یہ سرکاری دعوت۔ پھر بھی اس میں خوب خوب لطف رہتا تھا۔ کھانا ختم ہونے کے گھنٹوں بعد لوگ میز پر بیٹھے رہتے تھے کچھ عرصے کے لئے وہ اپنے رسمی امتیازات کو بھول جاتے تھے محض نام کی بجائے وہ کام کی یاد تازہ کرتے۔ ساتھ ساتھ کھاتے بھی جاتے تھے۔ اتنا کھاتے تھے کہ پیٹ میں گنجائش نہ رہتی۔ شراب کا دور بھی چلتا تھا۔ گپ بازی اس قدر جوش وخروش سے ہوتی تھی کہ بعض کے گلے بیٹھ جاتے تھے۔ برخاستگی کہیں دیر رات گئے ہوتی اس وقت اُن کے مدبھرے۔ لڑکھڑاتے ہوئے گیتوں اور وداعی بوسوں کے چٹخاروں سے کارخانے کی آبادی میں کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔

ماسٹر صاحب بچارے اس قسم کے ۱۳ ڈنر کھا چکے تھے کیونکہ انھیں اس جگہ ملازم ہوئے ۱۳ سال گذر چکے تھے۔ اب وہ چودھویں ڈنر کی تیاری میں مصروف تھے اور چاہتے تھے کہ اُن کی چال ڈھال پوشاک میں ضیافتی شان پیدا ہو جائے۔ بڑھاپا اور ناطاقتی، ایک گھنٹہ مکمل سیاہ سوٹ کی صفائی میں لگ گیا اور اتنا ہی وقت آئینے کے سامنے لگ گیا۔ وہ ایک بانکی قمیص پہننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر کم بخت بٹن ہیں کہ اپنے ننھے کاجوں میں گھستے ہی نہیں اسی کوشش میں ماسٹر صاحب نے اپنی بیوی کو ہزاروں شکائتیں، گلے، شکوے اور طعنے سنا دیئے۔

اِدھر بیوی بچاری ہے کہ گھنٹوں سے اُن کی صدقے ہو رہی ہے۔ غریب دوڑتی بھاگتی پریشان ہو رہی ہے اور آخر میں تو خود ماسٹر صاحب بھی تھک کر بے دم ہو گئے۔ اور جب باورچی خانے سے اُن

کے چمکیلے بوٹ لائے گئے تو اُن میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ انھیں پاؤں پر چڑھا سکیں۔ آخر ہانپتے کانپتے لیٹ گئے اور پانی کا ایک گلاس منگوایا

بیوی ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں "اللہ رحم کرے۔ کتنی کمزوری ہو گئی ہے۔ تمھیں آج ڈنر کے لئے ہرگز نہ جانا چاہیئے۔"

ماسٹر صاحب غصّے میں بھنا کر بولے "جناب اپنی نصیحت اپنے پاس ہی رکھیں۔

کچھ دنوں سے ماسٹر صاحب کا مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اور اس کی اصل وجہ پچھلا امتحان تھا۔ ویسے تو امتحان خوب ہو گیا۔ اوپر کی جماعت کے سب طلبا کو سندیں مل گئیں۔ بعض نے انعام بھی حاصل کئے۔ کارخانے کے منیجر اور سرکاری حکام سبھی نتائج سے بے حد مطمئن ہوئے لیکن ماسٹر صاحب؟ ماسٹر صاحب کے دل سے ابھی تک اس کی تلخی نہیں گئی تھی۔ انھیں اس امتحان کے بعض تاریک لمحات اب تک نہیں بھولے تھے۔ بابکین (ایک لڑکے کا نام) نے عمر بھر کبھی املا میں غلطی نہ کی تھی۔ اور اس مرتبہ اس کے تین الفاظ غلط نکلے! اور سرجی ییف تو اتنا گھبرا گیا کہ پندرہ اور سترہ کی ضرب نہ بتا سکا۔ اس مرتبہ انسپکٹر بھی ایک ناتجربہ کار لڑکا تھا۔ اس نے املا کے لئے بہت مشکل جزو چنا۔ اور لیاپوکوف کو لکھانے کے لئے کہا۔ لیاپوکوف نے (جو ایک نزدیک کے مدرسے کا معلم تھا) حقِ دوستی ادا نہ کیا۔ لکھاتے وقت بعض الفاظ کھا ہی گیا۔ تلفظ میں گڑبڑ الگ کر دی۔

ماسٹر صاحب نے بیوی کی امداد سے بوٹ پہن لئے آخری مرتبہ آئینے میں جھانکا اور چھڑی لے کر ڈنر کے لئے چل دیے۔ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ کارخانے کے منیجر کے مکان کے عین سامنے جہاں ڈنر کی تیاری کی گئی تھی انھیں شدید کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا اور کم بخت کھانسی نے اتنے جھٹکے دیئے کہ سر سے ٹوپی گر گئی۔ ہاتھ سے چھڑی نکل گئی۔ اور جب اُن کی کھانسی کی آواز سُن کر انسپکٹر اور دوسرے اُستاد دوڑے ہوئے باہر نکلے تو ماسٹر صاحب نچلی سیڑھی پر بیٹھے تھے پسینے میں شرابور۔

انسپکٹر نے حیرانی سے پوچھا سیسوییف "فیوڈر کیوچ! اخاہ! تم ہو؟ تم آ ہی گئے!

"بھلا میں کیوں نہ آتا؟"

"بھئی بہتر تو یہی تھا تم گھر پر آرام کرتے۔ آج تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔"

"میں تو کل کی طرح اچھا خاصا بھلا چنگا ہوں۔ ہاں اگر آپ کو میری موجودگی پسند نہ ہو تو البتہ میں واپس جا سکتا ہوں۔"

"ارے بھئی یہ کیا کہہ رہے ہو۔ تم تو بُرا مان گئے۔ آؤ اندر آجاؤ۔ یہ سب تقریب تمہارے اعزاز میں تو کی ہی گئی ہے اور بھلا تمہارے متعلق یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں؟ تمکو یہاں دیکھ کر تو مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔"

اندر تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ کھانے کے بڑے کمرے میں نئے وارنش کی بُو۔ پھولوں کی مہک جھلملیوں میں سے دوپہر کی گرم روشنی نے اچھا خاصا جھٹپٹے کا سا عالم پیدا کر دیا تھا۔ ویسے تو اس کمرے میں سبھی چیزیں دلچسپ تھیں مگر سب سے دلچسپ چیز میزبان تھا۔ ایک چھوٹا سا خوش طبع جرمن۔ چھوٹا سا گول توندا اور چھوٹی چھوٹی محبت آمیز آنکھیں۔ اس کا نام برونی تھا۔ وہ کھانے کی میز کے اردگرد اس پھرتی سے لپک رہا تھا گویا تمام گھر میں آگ لگی ہوئی ہے۔ کبھی شراب کے پیالوں کو بھرتا تھا۔ کبھی قابوں کو پُر کرتا اور کبھی میز پر دوسری چیزیں چنتا تھا۔ ہر طریقے سے مہمانوں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کسی کے شانوں کو تھپکی دیتا۔ کسی کی نگاہ میں نگاہ ڈال کر ہنستا اور کبھی فرط مسرت سے بار بار ہاتھ ملتا تھا۔

میزبان:۔ (سیسو دلیف کو دیکھ کر) "اخاہ آج میں یہاں کسے دیکھ رہا ہوں؟ فیوڈر۔ تم کہاں؟ مجھے کتنی خوشی ہے کہ تم بیماری کے باوجود بھی آ گئے۔ حضرات میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں فیوڈر آپہنچے۔"

اساتذہ کا پہلے ہی میز پر جمگھٹا لگ چکا تھا اور کھانا شروع ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر سیسو دلیف کی پیشانی پر بل آگیا۔ اخاہ ان لوگوں نے میرا انتظار کئے بغیر کھانا شروع کیسے کر دیا؟ اتنے میں اس کی نگاہ لیاپونوف پر پڑی جس نے امتحان میں املا لکھوایا تھا

ماسٹر کسی دوسری بات کے بغیر سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ اور ذرا گرما کے بولا:۔

"واہ جناب آپ نے اچھا دوستی کا حق ادا کیا (تمتماکر) بھلا کسی شریف آدمی نے اس طریقے پر بھی کبھی املا لکھایا ہے۔"

لیاپونوف کے چہرے پر ناراضگی کی جھلک آگئی "ارے بھئی خدا کا واسطہ۔ اسے مدت ہوگئی اب تو بخشو۔ تم نے تو ناک میں دم کردیا۔ کیا یہ بے وقت کا راگ الاپتے ہی رہوگے؟"

"ہاں، ہاں کیوں نہ الاپوں؟ میرے بابکین نے عمر بھر کوئی غلطی نہ کی تھی۔ میں تمھیں خوب سمجھتا ہوں تمہارا مقصد یہی تھا کہ میرے شاگرد فیل ہوجائیں اور تمھارے اسکول کا نتیجہ مقابلتہً اچھا رہے۔ میں تو تم لوگوں کے رگ و ریشے سے واقف ہوں۔"

لیاپونف غرّا کر بولا:۔ "ارے تو خواہ مخواہ لڑائی کیوں مول لے رہے ہو؟ جب دیکھو سر ہی پر چڑھے آتے ہو۔"

اتنے میں انسپکٹر صاحب نے مداخلت کی "حضرات۔ آپ ایک معمولی سی بات پر اس قدر کیوں گرم ہو رہے ہیں۔ تین غلطیاں ہوئیں یا ایک۔ یہ بھی کوئی اہم معاملہ ہے؟"

"ہاں جناب اہم کیوں نہیں؟ بابکین نے اب تک کبھی غلطی نہیں کی۔"

لیاپونوف غصّے سے ناک بھوں چڑھا کر بولا:۔ "ابھی یہ حضرت اس بات کو بھلا کب چھوڑیں گے۔ یہ اپنی بیماری کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور سبھی کا ناک میں دم کر رہے ہیں۔ آج سے میں تو ان کی بیماری کا لحاظ کروں گا بھی نہیں۔"

"میری بیماری گئی جہنم میں" سیسوالیف بولا:۔ "تمھیں اس سے کیا غرض۔ جو ہے۔ یہی بک رہا ہے۔ بیماری! بیماری! بیماری! گویا میں جناب کی ہمدردی کا خواستگار ہوں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ کے دماغ میں میری بیماری کا خیال کیسے گھس گیا۔ مانا کہ میں امتحان سے پہلے بیمار تھا مگر اب تو میں بالکل تندرست ہوں۔ محض کچھ کم زوری باقی رہ گئی ہے۔"

اتنے میں پادری نکولائی بولا "الحمدللہ۔ خدا نے آپ کو صحت نصیب کی تو آپ کو خوش ہونا چاہیے تھا اس کے برعکس آپ اور بھی چڑچڑے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔"

سیسوییف اک تڑپ سے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "رہنے بھی دو۔ تم سب سے بڑھ کر نکلے۔ بچوں کو سوالات ہمیشہ سیدھے سادھے سلجھی ہوئی زبان میں کرنا چاہئیں۔ اور تم اُن سے پہیلیاں بجھوا رہے تھے۔ یہ بھی کوئی امتحان لینے کا ڈھنگ ہے؟"

آخرکار سب مل جل کر ماسٹر صاحب کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

کھانے کے بعد جامِ صحت شروع ہوئے۔ کرسیاں ذرا پیچھے ہٹادی گئیں۔ چہروں پہ تبسم کی روشنی جھلکنے لگی اور جام جام سے ٹکرا کر کھنا کھن کی صدا دینے لگے۔

سب سے پہلے کارخانے دار کا جامِ صحت پیا گیا۔ پھر برَونی نے انسپکٹر کا جامِ صحت تجویز کیا آخر میں سیسوییف کی باری تھی۔ آج وہ معمول سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ پہلے تو وہ کھانسا۔ اپنے کھانسنے کی آواز خود ہی سُن کر اس میں ایک خود اعتمادی کا احساس پیدا ہوگیا۔ پھر اس نے تقریر شروع کردی "حضرات مجھے تقریر کرنا تو آتی نہیں۔ نہ میں اس موقعہ پر تقریر کرنے کے لئے تیار ہوں۔ پچھلے چودہ سال کے عرصے میں میرے خلاف بہت سی سازشیں۔ کئی ایک خفیہ حملے۔ بہت سی پوشیدہ رپورٹیں ہوتی رہیں (اپنے لہجے میں ایک معنی خیز دباؤ ڈال کر) میں اپنے ان دشمنوں کو جانتا ہوں جنھوں نے میرے خلاف اطلاعیں پہنچائیں۔ مگر میں کسی کا نام نہ لوں گا۔ کیونکہ ایسا نہ ہو کہ کسی صاحب کی ایسی باتیں سُن کر بھوک ماری جائے۔ لیکن پھر بھی ان سب مخالفتوں کے باوجود میرا اسکول صوبے بھر میں سب سے اول رہا ہے۔ نہ صرف اخلاقی لحاظ سے بلکہ مادّی لحاظ سے بھی ....

ہر جگہ اساتذہ کو دو سو سے تین سو روبل تک تنخواہ ملتی ہے۔ مگر مجھے پانچ سو مل رہے ہیں۔ میرے گھر کی دوسری دفعہ مرمت کرائی گئی ہے اور کارخانے کے خرچ پر اس میں سامانِ فرنیچر مہیا کیا گیا ہے اور اس سال تو دیواروں پر نیا کاغذ بھی چڑھا دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور ان سب سہولتوں کے لئے ہمیں کارخانے دار کا شکر گذار نہیں ہونا چاہیئے وہ تو غیر ملک میں رہتے ہیں اور انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اُن کے کارخانے میں کتنا کامیاب مدرسہ چل رہا ہے۔ اس مدرسے کی کامیابی کا سہرا برَونی کے سر ہے جو باوجود جرمن نژاد اور پروٹسٹ ہونے کے دل سے رُوسی ہے۔

سیسوییف اپنی تقریر کافی لمبی کھینچ گئے۔ کبھی سانس لینے کے لئے رک جاتے تھے اور کہیں کہیں بلاغت بھی فرمانے لگتے تھے۔ تقریر بدمزہ اور قدرے بدمذاقی کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ اس نے کئی مرتبہ اپنے دشمنوں کا ذکر کیا۔ اُن پر فقرے کسے۔ اکثر کہی ہوئی باتوں کو دوہرایا۔ آخرکار وہ بالکل تھک گیا اور پسینے میں شرابور۔ اب اُس نے جھٹکے دار لہجے میں بولنا شروع کیا۔ اتنی مدھم آواز سے گویا اپنے آپ کو ہی سنا رہا ہے اور آخر میں اپنی تقریر کچھ عجب بے ربط انداز میں ختم کردی۔

میں بردنی کا جام صحت تجویز کرتا ہوں۔ جو یہاں موجود ہے۔ ہمارے درمیان .... عام طور پر .... آپ سمجھ گئے نا .... ؟

جب وہ تقریر ختم کرچکا تو سب نے ہلکی سی آہ بھری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ٹھنڈا پانی چھڑک کر فضا کو صاف کردیا ہے۔ محض بردنی کو کسی بدمزگی کا احساس نہیں تھا۔ اس کے گول مول چہرے پر ایک قدرتی تبسم کھل رہا تھا۔ اس کی حساس آنکھیں اس کے جذبات کی ترجمانی کررہی تھیں۔

وہ سیسوییف سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا: "شکریہ، شکریہ" یہ کہہ کر اس نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا "مجھے اس بات سے کس قدر مسرت ہوئی کہ تم نے مجھے جان لیا ہے۔ میں پورے دلی جذبات سے تمھاری بہبودی کا متمنی ہوں۔"

"مجھے یہ کہنے میں کوئی دریغ نہیں کہ آپ نے میرے متعلق بہت مبالغے سے کام لیا۔ میرے گرامی قدر دوست اسکول کی یہ حالت محض تمھاری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو اسے دوسرے اسکولوں سے کون تمیز کرسکتا۔ تمھارا یہ خیال ہے کہ یہ جرمن چکنی چپڑی باتیں لگا رہا ہے یا آپ کی تعریف کررہا ہے۔ نہیں فیوڈر۔ ہرگز نہیں۔ میں تو سیدھا سادھا آدمی ہوں۔ مجھے تعریفی تقریروں سے کیا مطلب۔ اگر ہم تمھیں پانچ سو روبل دیتے ہیں تو اس لئے کہ ہم تمھاری صحیح قدر کرتے ہیں۔ حضرات کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ ہم کسی اور اُستاد کو اتنی تنخواہ ہرگز نہ دیں گے۔ سچ پوچھئے تو ایک اچھا اسکول کارخانے کے لئے قابل فخر چیز ہے۔"

اس پر انسپکٹر صاحب بولے :۔ "اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ کا اسکول حقیقتاً ایک غیر معمولی ادارہ ہے اور یہ کوئی خوشامد نہیں۔ میں نے تو عمر بھر میں کوئی ایسا اسکول نہیں دیکھا۔ جب میں امتحان لے رہا تھا تو میرا دل ان بچوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ کس قدر ذہین بچے! کتنا کچھ جانتے ہیں اور پھر جواب کس پھرتی اور ہشیاری سے دیتے ہیں۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ ان بچوں میں ایک عجیب آزادانہ انداز ہے۔ نہ کوئی جھجک۔ نہ اپنے پر بے اعتمادی۔

فیوڈور۔ اصل تو یہ ہے کہ تمھارے شاگرد تم سے محبت کرتے ہیں۔ مدرسی کا جذبہ تمھارے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گیا ہے۔ حق یہ ہے کہ تم ایک پیدائشی استاد ہو۔ تم میں سبھی خوبیاں موجود ہیں قدرتی طور پر تدریس سے محبت، تجربہ اور کام کے لئے ایک والہانہ الفت اتنی کم زور صحت کے ساتھ کس قدر جوشِ عمل! کتنی سمجھ! کتنا استقلال! تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ تم میں کس قدر خود اعتمادی ہے؟ انتظامیہ انجمن کے کسی رکن نے کیا خوب کہا ہے کہ تم اپنے کام کے لئے شاعر ہو........ حقیقت یہ ہے کہ تم ایک شاعر ہو، ایک استاد شاعر" انسپکٹر کی اس بات پر ایسا معلوم ہوا گویا کسی سیلاب کا بند ٹوٹ کر بہ نکلا ہو۔ حاضرین نے بہ یک زبان سیسوییف کی حیرت انگیز قابلیت کی تعریف کرنا شروع کر دی۔ سچے جوشیلے جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آیا اور تعریفی الفاظ کی رَو ان پر خاروادیوں سے بہ نکلی جس سے محتاط اور شکی طبیعتیں بچ کر نکلتی ہیں۔ سیسوییف کی تقریر، اس کا ناقابلِ برداشت لہجہ، اس کی بدنما صورت سب بھول گئے۔ ہر شخص آزادی سے گفتگو کرنے لگا۔ شرمیلے۔ خاموش نوجوان استاد بھی، مفلسی کے مارے، پاؤں کے نیچے کچلے ہوئے نوجوان! جو انسپکٹر سے کبھی حضور اور جناب کے بغیر خطاب نہیں کرتے۔ وہ بھی کھل گئے۔ کم از کم یہ چیز ناقابلِ انکار تھی کہ اپنے حلقے میں سیسوییف خاص اہمیت رکھتا تھا۔

ماسٹر صاحب پچھلے چودہ سال سے ایسی کامیاب تقریبوں اور تفریحی جملوں کے عادی ہو گئے تھے اور وہ اپنے معترفین کی باتوں کو مخصوص شان استغنا سے سنتے رہے۔ اصل میں تو یہ روئی تھا جو سب تعریفی جملے شہد کے گھونٹ کی طرح پی رہا تھا۔ وہ ہر لفظ کے لئے لپکتا تھا اس کا گول گپے کا سا

چہرہ پھیل کر ایک درخشاں تبسم بن جاتا تھا۔ وہ فرطِ انبساط سے ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا اور ماسٹر صاحب کی شان میں تعریفی کلمات سُن کر اس کا چہرہ انکساری سے یوں سُرخ ہو جاتا تھا گویا یہ سب اسی کی شان میں کہا جا رہا ہے۔ "شاباش! شاباش! بالکل ٹھیک! بس تم نے میرا مطلب خوب سمجھا! بہت نفیس" اس قسم کے جملے اس کی زبان سے پے در پے نکل رہے تھے۔ آخر کار وہ زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکا ایک دم اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اپنی تیز آواز میں پکارا "حضرات مجھے آپ سے کچھ اور عرض کرنا ہے۔ ہُش ہُش۔ خاموش آپ سب کی طرف سے ایک ہی جواب دے سکتا ہوں۔ کارخانے کے منتظمین فیوڈر لوکوچ کا احسان بھلا نہیں سکتے۔"

اس جملے پر سب خاموش ہو گئے۔ سیسوییف نے اپنی نگاہیں جرمن کے سرخ چہرے پر جمادیں۔ برونی نے اپنی آواز کو ذرا دھیما کیا اور اپنی تقریر جاری رکھی "ہمیں اُن کی خدمات کے اعتراف کا طریقہ معلوم ہے۔ آپ کے تفریحی کلمات کے جواب میں میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ......... فیوڈر لوکوچ کے خاندان کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا اور اس مقصد کے لئے مہینہ ہوا ایک معقول رقم بنک میں جمع کرادی گئی ہے۔"

سیسوییف نے استفسارانہ لہجے میں پہلے منیجر کی طرف اور پھر اپنے شرکائے کار کی طرف دیکھا۔ اس کی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے خاندان کا اتنا خیال کیوں رکھا جا رہا ہے کیا اُسے خود کوئی صلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے بعد معاً سب کے چہروں کو، سب کی غیر متحرک آنکھوں کو دیکھا جو اس پر لگی ہوئی تھیں۔ ان میں اس ہمدردی، اس جذبۂ ترحم کی جھلک نہ تھی جس کی تاب وہ نہ لا سکتا تھا۔ بلکہ اس کے سوا کچھ اور چیز تھی۔ اک بے حد نازک سا احساس جو بہ یک وقت بے حد ڈراؤنا اور ایک خوفناک حقیقت تھی جس کا خیال آتے ہی اس کے بدن میں کپکپی چھوٹ گئی اور اس کی روح ایک خاموش مایوسی کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ کسی نوری جذبے کی تحریک سے وہ یک لخت اچھل پڑا اور اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ایک آدھ منٹ تو وہ ٹھٹک کر کھڑا رہا۔ اس نے ایک خوف زدہ انداز میں اپنی نگاہیں اپنے سامنے جمادیں گویا وہ موت کا انتظار کر رہا ہے

پھر زیادہ تاب نہ لا سکا اور بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔" ہیں، ہیں! ہوش سنبھالو۔ پانی لاؤ لو تھوڑا سا پانی پیو۔"

اس قسم کے ٹوٹے ہوئے جملے وہ ارد گرد سنتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت میں سکون ہو گیا لیکن حاضرین میں پہلے جیسی شگفتگی نہ آسکی۔ ڈنر ایک غمگین خاموشی میں ختم ہوا اور وقت سے بہت پہلے لوگ منتشر ہو گئے۔

جب سیسوییف گھر پہنچا تو اس نے سب سے پہلے آئینے میں جھانکا پھر اپنے سُتے ہوئے چہرے اور پچکے ہوئے گال اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو دیکھ کر آپ ہی آپ کہنے لگا "بھلا وہاں ٹسوے بہانے کا کیا موقع تھا آج میرے چہرے پر کل کی نسبت زیادہ سرخی ہے۔ مجھے درحقیقت کمیٔ خون کی شکایت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ معدے کی خرابی کی وجہ سے کھانسی بھی ہے" ان الفاظ سے ایک گونہ اُسے تسلّی ہو گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ کپڑے اتارنا شروع کئے۔ اپنے نئے سیاہ سوٹ کے برش کرنے میں کافی وقت لگا۔ پھر اس نے اُسے تہ کر کے احتیاط سے رکھ لیا۔

اس کے بعد وہ میز کے قریب گیا۔ یہاں بچوں کی مشق کی کاپیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بالکین کی کاپی اُٹھالی اور بیٹھ کر بچے کی خوب صورت تحریر کو دیکھنے لگا۔ اور ایک مدت تک اُسے ہی دیکھتا رہا۔

جب وہ کاپیاں دیکھ رہا تھا تو ڈاکٹر ایک دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا اس کی بیوی سے چپکے چپکے کہہ رہا تھا کہ ایسے مریض کو جس کی زندگی ایک ہفتے سے زیادہ باقی نہ رہ گئی ہو ہرگز ہرگز ڈنر کے لئے باہر جانے کی اجازت نہ دینا چاہیے۔

(چیخوف)

ملک الشعراء ذوق

(۲) غزلیات

ظرافت[۵] و تفریح اُس عہد کی خاص چیز ہے اور ذوق اکثر مُسکراتے ہوئے پائے جاتے ہیں لیکن بیشتر واعظ و ناصح پر۔ اس کے علاوہ ان کی ظرافت گہری یا پُرمعنی یا طنزیہ نہیں محض تفریحی ہوتی ہے اور کبھی ضلع جگت یا رعایت لفظی سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ذوقؔ نہ لاابالی بے فکر بذلہ سنج مصاحب تھے نہ زندگی اور اس کے علائق پر سوچ کر ہنسنے والے مفکر لیکن طبیعت میں شگفتگی تھی اور قلم میں جوش اس لئے اکثر شعروں میں اور بیشتر مجلسوں میں ہنس لیا کرتے تھے۔

ذوقؔ زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر — وسمہ آب بنگ سے مہدی مئے گل رنگ سے

ذوقؔ جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں ملا — ان کو مے خانے میں لے آؤ سنور جائیں گے

چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم — شکست توبہ لئے ارمغاں ۔ مغاں کیلئے

اس بت پہ گر خدا بھی ہو عاشق تو کسے ہو رشک — ہر چند جانتا ہوں کہ وہ پاک باز ہے

اب ذوقؔ بس نہ آپ کو صوفی بتائیے — معلوم ہے حقیقت ہُو حق جناب کی

چاہئے زر ان بتان سیم تن کے واسطے — یاں قلندر ہیں نہیں کوڑی کفن کے واسطے

شور قلقل یہ کیوں ہے دختر رز — کیا کسی آشنا سے لڑتی ہے

رات اک بگڑی ہوئی تھی میکدہ میں رہن سے — ذوقؔ وہ تیری ہی دستار فضیلت ہو تو ہو

ہم اُن کی چال سے پہچان لیں گے ان کو بیٹھے ہیں — ہزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پاؤں تک

مسواک نے بڑھایا ہے زاہد کا اعتبار — ہے یہ بھی اس کے اک شجر مکر و فن کی شاخ

اب میکدہ میں شام کو ناقوس پھونکیے — مسجد میں مدتوں رہے تسبیح خوان صبح

ریش سفید شیخ میں ہے ظلمت فریب — اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمان صبح

اے ذوقؔ کچھ نہ پایا شب وصل کا مزہ — یا آج صبح ہم نہیں یا طائران صبح

ہوئے انسان ہم درد و محبت کے لئے پیدا — فرشتے ہوتے گر ہوتے عبادت کے لئے پیدا

بعد فراق کوئی دن ایسا نہ وصل کا ہوا — وہ کہیں تم کو کیا ہوا ہم کہیں تم کو کیا ہوا

آدم دوبارہ سوئے بہشت بریں گیا — دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا

تیرا مکاں تو ہے کیا لامکاں میں کود پڑیں — امید وصل میں ہم بام عرش پر چڑھ کر

عام طرز ذوقؔ کی شاعری کا ایک طرح کی گرمی ہے چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی لیکن اُن کی گرمی کلام چستی ترکیب۔ خوبی محاورہ اور عام فہمی ادنیٰ درجے کی نہ تھی بلکہ ایسی کہ جس لفظ یا محاورے کو یہ باندھ دیتے بڑے بڑے شاعر عاجز ہو جاتے اور اب بھی کسی کو ہمت نہیں جو اُن کے مقابلے میں ان الفاظ یا تراکیب کو اُن سے بہتر باندھے جو انھوں نے باندھی ہیں۔ رنگ اُن کی شاعری کا مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع اور شاہ نصیر کا ڈھنگ تھا۔ معروف کے شعر بنانے میں ولیؔ اور دردؔ کا کچھ رنگ آیا۔ ظفرؔ کی اُستادی میں جرأتؔ، انشاؔ و مصحفیؔ کا طریقہ اختیار کیا۔ لیکن اُن کی غزل کا عام رنگ نصیرؔ و ناسخؔ کا ہے یعنی لکھنوی نہ کہ دہلوی۔ عام پہچان ذوقؔ کی غزل کی یہ ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی محاورہ، کہاوت یا روزانہ کا تجربہ ضرور باندھتے ہیں۔

ذوقؔ کی شاعری کی آج کل بہت برائیاں کی جاتی ہیں اور واقعی وہ صحیح ہیں یعنی یہ کہ انھوں نے نظیرؔ کی طرح خارجی شاعری کی۔ نہ دردؔ کی طرح صوفیانہ، نہ غالبؔ کی طرح حکیمانہ، نہ میرؔ کی طرح عاشقانہ یعنی یہ کہ صداقت اُن کے یہاں سرے سے مفقود ہے مگر اس امر میں وہ اپنے ماحول سے مجبور تھے۔ مذاق شعری اور نظریہ شاعری اس زمانے میں یہی تھا کہ الفاظ اور اُن کی ترکیب میں غیر معمولی قدرت حاصل ہو۔ مضمون و خیال کو محدود اور بندش الفاظ کو لامحدود سمجھا جائے۔ اور اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذوقؔ کو یہ قدرت تمام و کمال حاصل تھی اور اسی بنا پر جو وہ ملک الشعرا بنائے گئے تو اُن کا انتخاب حق بجانب تھا۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا ذوقؔ کی شاعری محض بے کار ہے؟ یہ صحیح کہ وہ طبیعتاً شاعر نہ تھے محض زبان کے ماہر تھے۔ نہ اُن کے یہاں روحانی واردات کے نقشے ملتے ہیں نہ قلبی کیفیات نہ فطرت انسانی کا مطالعہ یہ بھی صحیح کہ اُن کو آج کل کے معیار یا کسی معیار سے شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ان کی زبان کی خدمات سے کسی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا اُردو جو اُن کے زمانے تک بہت وقعت سے نہ دیکھی جاتی تھی اور قلیل عمر کی ہوتے ہوئے ناپختہ اور غیر مربوط تھی۔ اُن کی شاعری اور لفظی تراکیب کی بندشوں میں آکر مستحکم اور پختہ ہو گئی۔ ہر زبان کی تشکیل میں اس قسم کے مجاہد پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ذوقؔ کی شاعری کو کسی طور پر بے کار نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بحیثیت شاعر کے نہ مانے جائیں نہ سہی لیکن اگر انھیں محض

قواعد داں ہی سمجھ لیا جائے جس نے زبان کو محفوظ اور مربوط بنانے کے لئے اپنے قواعد اپنے محاورے اپنی صنعتیں منظوم کردی ہیں۔ تب بھی ذوقؔ کی خدمتِ زبان بہت سے شاعروں کی خدمت ادب پر فوقیت لے جائے گی۔ اُن کے کلام سے زبان کی ارتقا کی اچھی خاصی تاریخ بنائی جا سکتی ہے اور اس لئے کسی ماہر لسانیات کے لئے اُن کا دیوان نادر تحفہ کہا جا سکتا ہے۔ ہندی اور فارسی کا امتزاج جو عرصے سے کشمکش میں تھا۔ ذوقؔ کے کلام میں پختہ ہو کر اُردو ہو گیا ہے۔ اور یہی اُردو آگے چل کر داغؔ میں منجھ گئی ہے۔

کیا ذوقؔ شاعر ہو سکتے تھے؟ اس میں شک نہیں کہ بعض اشعار اُن کے دیوان میں خیالات و جذبات کے اعتبار سے بہت اچھے[۵] ملتے ہیں اور جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاعر ہو سکتے تھے لیکن شاہ نصیر

۵؎
آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ   پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا
پردہ درِ کعبہ سے اُٹھانا تو ہے آساں   پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا
جب کیا عشق کے دریا نے تلاطم اے ذوقؔ   تو کہیں موج بنا اور کہیں گرداب بنا
معنیِ رنگ خموشی سے جو دل ہو آگاہ   برگِ گل میں لبِ اظہار نظر آتا ہے
الفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جائے   یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے
پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے   ہر روش پر جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے
مرضِ عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے   نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے
تم جسے یاد کرو پھر اُسے کیا یاد رہے   نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ   تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی   ہوتی نہ محبت تو یہ آفت بھی نہ ہوتی
پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے   حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے   اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
آلودۂ اظہار نہ ہو رازِ محبت   دم ہونٹوں پہ آجائے مگر میں دکھوں ہے
اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات   ہنس کر گزار یا اُسے رو کر گزار دے
تغافل سے فرصت نہیں واں نظر کو   یہاں منتظر لب پہ جانِ حزیں ہے
نہیں وہ رہے ہم سے تم تھے جو پہلے   زمانے کو تو کچھ تغیر نہیں ہے
ق
وہی ہے زمانہ وہی رات دن ہے   وہی آسمان اور وہ ہی زمیں ہے
نہ کی آہ سو زخم دل پر اُٹھائے   تجھے آفریں ذوقؔ صد آفریں ہے
چپکے چپکے غم کا کھانا ہم سے کوئی سیکھ جائے   جی ہی جی میں تلملانا ہم سے کوئی سیکھ جائے

کی شاگردی اور ان کے مقابلے نے نیز دیوانِ ناسخ و گوشہ نشینی و بادشاہ اور معروف کی اصلاح و فرمائشات نے انھیں تباہ کر دیا۔ لیکن ان چند اچھے اشعار کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اچھے شاعر ہوتے اس

بقیہ صفحہ ۵۹

بیاں دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو — زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

امید ہوگئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس — بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لئے

تجھ کو کچھ یاد بھی ہیں پہلی وہ الفت کے مزے — بے مزہ ہونے کے لطف اور شکایت کے مزے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے — ہنستے تو ہیں پر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

خوب روکا شکائتوں سے مجھے — تو نے مارا عنائتوں سے مجھے

ہے ان کا سادہ پن بھی تو کس کس پھبن کے ساتھ — سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کے ساتھ

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے — تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ — تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

وقت پیری شباب کی باتیں — ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اے دل وہ سترِ غمزۂ پنہاں نہ عیاں کر — آنکھوں سے دیکھ اور زباں سے بیاں نہ کر

عہدِ پیری نے بھلایا دوڑ چلنا۔ کودنا — ہائے طفلی کھیلنا۔ کھانا، اچھلنا۔ کودنا

آنا تو خفا آنا جانا تو خفا جانا — آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

جلکے اک بار نہ پھرنا تھا جہاں اں مجھ کو — بے قراری ہے کہ سو بار لئے پھرتی ہے

سب کو دیکھا اس سے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ — وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگ بو و گل — وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

اس تپش کا ہے مزا دل ہی کو حاصل ہوتا — کاش میں عشق میں سر تا بقدم دل ہوتا

میں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جاکر — گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا

تمہارا مجھ کو پاسِ آبرو تھا — وگرنہ اشک تھم جاتے ابھی سے

ذوق کے مرنے کی سن کر پہلے تو چپ ہو گئے — پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر اچھا ہوا

چند غزلیں جو ان کے مذاق کو ظاہر کرتی ہیں۔

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا — فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا

مقدر ہے یہ گر سود و زیاں سے — تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام — خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

وہ از خود رفتہ ہوں جس کو خودی سے — خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا

کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم — غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوق — کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

لئے کہ اتنا سوز و گداز تو فرد و ہر بشر کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اچھے شاعر کی روح کو سرتاپا گداز ہونا چاہیئے اس لئے اُن کے اچھے اشعار کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مستثنیات ہیں ان کے اپنے اصلی رنگ سے الگ اور محض اتفاقات جو بیشتر کثرتِ مشق و کمالِ استادی سے یوں رواں خوب صورت اور عمدہ نکل آئے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا سچ مچ ان کے دل سے نکلے ہیں۔

کہاوتوں، مثلوں کی طرح اُن کے کلام سے اُن کے زمانے کے عقائد و مختلف رسوم[5] کا پتہ بھی چل سکتا

بقیہ صفحہ

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا   گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا
مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا   پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا
ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں   شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
آیا ہے دم آنکھوں میں دمِ حسرتِ دیدار   پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا
آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت   پھر دیکھئے آنا بھی ہے دم یا نہیں آتا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا   جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا   نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا   اگر پارہ کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا
تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے   الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا   کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں   اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا
دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں   فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

سر بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے   یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے   مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
بس کرم سوزِ دروں پھنک جائیں گے دل اور جگر   تھم جوشِ گریہ چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے
بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے   اف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے
چھیڑتا ہے کس لئے تیرا تصور رات دن   تو تو ہے پردہ نشیں پھر کیوں نظر آجائے ہے
نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار   جانبِ در دیکھے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

قطعہ

کہوں کیا ذوقؔ احوالِ شبِ ہجر   کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب خال رکھا تھا اندھیرا   مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم   اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے   کہ او بے مہر بد اختر کمینے

ہے اور ساتھ چند ایسے واقعات[لہ] بھی جو اُن کی زندگی میں خاص وقعت رکھتے ہیں یا وہ نئے نئے[۵۲]
اختراعات ایجادات یا علمی انکشافات جن کا اثر انگریزوں کی آمد کے بدولت لوگوں کے ذہنوں پر

بقیہ صفحہ

کہاں میں اور کہاں یہ سب نگر تھے — مرے جانب سے تیرے دل میں کینے
سوا اس ظلمت کے پردے میں گئے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قرینے تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہے اور گاہے بٹھایا — مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوع صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقین ہے صبح تک دے گی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی یاسین سرہانے بے کسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
موذن مرحبا بر وقت بولا — تری آواز مکے اور مدینے

۱لہ۶

عشق کے مکتب میں ہو فرہاد سبقت تیز تو — تین دن چاٹے اگر تعویذ میری گور کا
وہ ہوں ناکام سمجھا نامرادی جو مراد آئی — مرے مرقد پہ جلہ اس نے اگر دوستاں باندھا
زلف کی پیچی سے دل ڈرتا نہیں — بھوت بھاگے تھے وگرنہ مار سے
واہ وا شور محبت خوب ہی چھڑکا نمک — استخواں میرا اُٹھا کس کس مزے سے کھائے ہے

ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
وہاں گیسو کا تیرے مارا نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

لہ

نہ ہوبے وقر ترک سجدۂ ابلیس سے آدم — عدو کی سرکشی سے ذوق کب رتبہ ہو کم میرا — معترضیں کو جواب
نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا — میرلیوں پر چوٹ
ذوق ہے ترک وطن میں صاف نقص آبرو — بکتا پھرتا ہے گہر ہو کر سمندر سے جدا
ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن — کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر
اہل جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک — لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر — دکن سے بلائے جانے پر

پڑھا لکھا تھا۔ ان کے علاوہ ان کی ذاتی سیرت[۵] بھی اُن کے بیشتر اشعار سے جھلکتی ہے۔

بقیہ صفحہ ۶۲ احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں } بارہ ٹوپیوں والے
نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل — میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں } واقعے پر

یا اکثر ایسی غزلیں جن میں شاہ نصیر پر چوٹیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

[۴] گذرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں — کہ جیسے جائے کوئی کشتی دُخانی میں
خدا دے دوربینی اور اس چشم تصور کو — کہ لاکھوں کام اس سے دُور کے بے دُوربیں نکلے
خواہ پھرتا ہے فلک اور خواہ پھرتی ہے زمیں — پر ہمارے واسطے یاں منزل راحت نہیں
اس نے خط جو قلم سرمہ سے لکھا ہم کو — لکھا ایسا کہ خموشی ہے یہ گویا ہم کو
نہیں کچھ بھی میں وہ فرنگی زاد — ماہ ہے منزل ہوائی میں
دین و ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا افسوس میں — اب نہ کچھ دین ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

---

۵ دل فقیر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے — دنیا کے زر و مال پہ میں تف نہیں کرتا
ملے اکسیر گر اس کشت دخوں سے میں نہ لوں ہرگز — مرے مذہب میں خوں کرنا ہے کشتہ کرنا پارے کا
اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر — آرام سے ہے وہ جو تکلف نہیں کرتا
اے ذوق کس کو چشم حقارت سے دیکھیے — سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں
جو کنج قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر — ہے ذوق برابر انھیں کم اور زیادہ
ہفتاد و دو طریق حسد کے عدو سے ہیں — اپنا یہ ہے طریق کہ باہر حسد سے ہیں
نہیں ہے قانع کو خواہش زر وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر — جہاں میں مانند کیمیا گر ہمیشہ محتاج دل غنی ہے
زباں کھولیں گے مجھ پر بدزباں کیا بد شعاری سے — کہ میں نے ان کے منہ میں خاک بھر دی خاکساری سے

جناب فرساد صاحب میرٹھی

برف کے محل سے نکلی روح دوڑاتی ہوئی — ذوقِ پیدائی کو ہر ذرّے کے چونکاتی ہوئی
اک جہانِ رنگ و بو کو وجد میں لاتی ہوئی — آرسی ہر جلوۂ قدرت کو دکھلاتی ہوئی

کیا کسی کی آرزو میں ہے رواں دیوانہ وار
وادی و صحرا سے جھپٹی چیر ڈالا کوہسار

صبح جب اٹکھیلیاں کرتی ہے بادِ خاوری — ہے خرام ناز اس کا ایک سحرِ سامری
مضطرب کرتی ہے تجھ کو اس کی طرزِ دلبری — تیرے ہر قطرے کو تڑپاتی ہے اسکی ساحری

اس کی ہر لغزش سے تیرا شیشۂ دل چور ہے
نور کی موجوں میں تو ڈوبی ہوئی اک حور ہے

ایک آوارہ و سرگرداں شعاعِ آفتاب — جس کا جسم آتشیں مانند حسن بے نقاب
مست موجوں نے پلادی اسکو کچھ ایسی شراب — تیری سطحِ مرمریں پر ناچتی ہے بے حجاب

تیرا سینہ ہر شعاعِ حسن کا گہوارہ ہے
شاہدِ فطرت کی نیرنگی کا اک نظارہ ہے

اے محبِّ ملک اے سرمایۂ ہندوستاں — آبیاری سے تری سرسبز تھا یہ بوستاں
تیری وادی کے ترنم ریز رشیوں کی زباں — گا رہی تھی عظمتِ ہندوستاں کی داستاں

تیری موجوں سے پلا تہذیبِ ہندی کا شجر
تیری شفقت اور محبت سے ہوا تھا بارور

لیکن اب تیرے کنارے وہ شجرِ نادیدہ ہے
ہے فلک فرسا مگر زیرِ زمیں پوشیدہ ہے

چشمِ ہندی گلشنِ مغرب کی اب گرویدہ ہے
اس کی سحر آرائیوں سے چشمِ دل خوابیدہ ہے

تیرے سینے میں نہاں ہے اس کا رازِ زندگی
چھیڑ دے پھر محفلِ ہندی میں سازِ زندگی

ایک اشکِ گرم نکلا دیدۂ پُرآب سے
اور لگا کہنے کہ کیا تو چونک اٹھا خواب سے

اپنے دل کو آشنا کر سوز کے آداب سے
نغمۂ دل دوز پیدا کر اسی مضراب سے

سعیِ پیہم سے رُبابِ زندگی پُرجوش ہے
آرزوئے تازہ سے دل حشر درآغوش ہے

پھر قتیلِ آرزو بن پھر شہیدِ جستجو
فکرِ باطل سے نکل گرویدۂ جام و سبو

فلسفے کی دلق بوسیدہ نہ رکھ پھر رفو
پھر دلِ محروم کو دے دعوتِ لا تقنطو

کاروانِ آرزو کو پھر بنا وقفِ رحیل
حاصلِ کشتِ عمل کیا ہے، خرامِ موجِ نیل

گرمیِ ہنگامہ تک ہے بزمِ ہستی کا قیام
گردشِ پیہم نہیں تو ہیچ ہیں مینا و جام

ہے کشاکش ہی پہ قائم سارے عالم کا نظام
ہے لگا پورے دما دم دہر کا واحد پیام

تیری ہستی سعیِ پیہم کے سوا کچھ بھی نہیں
ہے یہی رازِ بقا، رازِ بقا کچھ بھی نہیں

زندگیِ غنچہ و گل کیا ہے؟ اک ذوقِ نمو
زندگیِ حسن الفت کیا ہے؟ جوشِ آرزو

زندگیِ عشق و عرفاں کیا ہے؟ سعیِ جستجو
زندگیِ دین و ایماں کیا ہے جز لا تقنطو؟

جذبۂ سوزِ دروں سے سنگِ خارا ریزہ ریزہ
پیچ و تابِ زندگی سے شعلۂ ہستی تیز تیز

(میرزا ثاقب لکھنوی)

حقیقت اگر اپنی تو جانتا ہے — تو بیشک خدا کو بھی پہچانتا ہے

کمالِ ہنر کو وہ پہچانتا ہے — جو اُس فن کا ہر جزو و کُل جانتا ہے

اٹھاتا ہے دل ذلتیں ذلتوں پر — مگر میرا کہنا نہیں مانتا ہے

ادھر سر نگوں میں اُدھر میرا قاتل — پئے قتل دامن کو گردانتا ہے

وہ جویائے عُزلت نہ ہو تو کرے کیا — جو دنیا کی رفتار پہچانتا ہے

طریقِ نیاز اور طرزِ تغافل — یہ میں جانتا ہوں وہ تو جانتا ہے

ستمگر مری چُپ سے راضی ہے ورنہ — گلہ کیجئے تو بُرا مانتا ہے

مشیّت وہاں ہے بعنوانِ دیگر — یہاں اور کچھ دل میں تو ٹھانتا ہے

صفائی کہاں خاکدانِ جہاں میں — وہ سب کرکرا ہے جسے چھانتا ہے

بری ہوں میں لوثِ گنہ سے مگر دل — مجھے اپنے کردار میں سانتا ہے

سرِ اتحاد اور رنگِ دوروئی — مُنافق ہی ممکن اسے مانتا ہے

غنیمت ہے ثاقب کا دم لکھنؤ میں
وہ جو کچھ بُرا یا بھلا جانتا ہے

غزل

(از رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ایم اے الہ آباد یونیورسٹی (شعبہ انگریزی)

اب تو میں ہوں اور بھری دنیا کی ہیں تنہائیاں
یاد تھیں مجھکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

تو نے سمجھا ہی نہیں ہے حسن کا رازِ نشاط
تو نے دیکھی ہی نہیں ہیں عشق کی رعنائیاں

جلوۂ لیلیٰ ہو اے دل یا غبارِ قیس ہو
حسن بھی پرچھائیاں ہے عشق بھی پرچھائیاں

اب تو غم سی غم۔ خوشی سی بھی خوشی ہوتی نہیں
اے خیالِ یار یہ کیا ہیں نشاط آرائیاں

بے نیازِ قرب و دوری اور گرم جستجو
یہ سکونِ عاشقی یہ بادیہ پیمائیاں

سر بسر شورِ بہاراں خوفِ دامِ رنگ و بو
حسن کی پیدائیاں ارسوائیاں اگیرائیاں!

لے اڑی ہے اک جہاں کو مسکرانے کی ادا
کیا نشاطِ حسن کی بھی ہیں جنوں افزائیاں!

حسن کی کوئی جھلک رکھتی نہیں اپنا جواب
عالمِ کثرت کی بھی دیکھے کوئی یکتائیاں

درد جو دنیا کے دل میں تھے دبے اٹھنے لگے
دھیمے دھیمے چل رہی ہیں عشق کی پروائیاں

بے حجابانہ تری جلوے ہیں۔ لیکن عشق کو
کیوں حریمِ حسن میں آنے لگیں انگڑائیاں

شوخیاں یہ کب حجابِ رنگ و بو میں تھیں فراقؔ
رنگ لائیں رفتہ رفتہ حسن کی رسوائیاں

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

حیات و کلیاتِ اسمٰعیل

اردو ادب کے قدیم و جدید مذاہب میں فورٹ ولیم کالج حدّ فاصل قائم کرتا ہے۔ ہندوستانیوں کو مشرقی ادب کی "تاریکی" میں رکھ کر جدید مغربی ادب کی "روشنی" سے محروم کرنے ہی کی نیت ہی سے سہی، مگر واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں نے اس کالج کو قائم کرکے ہندوستان اور بالخصوص اردو ادب میں ایک انقلاب کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہی وہ پہلا مرحلہ تھا جہاں سے شروع کرکے اردو ادب نے منزل بہ منزل موجودہ فضا میں قدم رکھا ہے۔

اردو ادب کی خوش قسمتی کہئے کہ اس سفر میں سرسید جب قافلہ سالار مل گیا جسے زمانے کے تجربوں نے راہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کی سیاسی معاشرتی اور دینی ہی اصلاح نہیں کی، بلکہ اُن کی زبان اور ادب میں انقلاب پیدا کیا۔ کسے خبر تھی کہ اُردو شعر و ادب جمالیات کے خرابے سے نکل کر زندگی کے کیف و کم کی ترجمانی کرے گا۔ مگر اسی مسیحا نفس اور اس کے حواریوں کا فیض تھا کہ اس مردے میں پھر سے جان آگئی۔

مگر نظم میں طرح نو کا سہرا غالبؔ کے اور اُن کے ہم عصر حضرت ذوقؔ کے تلامذہ رشید حالیؔ اور آزادؔ کے سر رہا۔ اِن بزرگوں کے ایثار و خلوص .... ہاں ایثار ہی کہئے کہ اپنے یکتائے روزگار اساتذہ کے مقبول و مرغوب انداز کو چھوڑ کر ایک بالکل مختلف رنگ اختیار کیا: .... نے شعر اردو کی کایا پلٹ کر دی۔

انقلاب کے اسی دور میں ہمیں ایک اور ایثار پیشہ شاعر نظر آتا ہے اسمٰعیل۔ بظاہر گمنام مگر بباطن شعر اُردو کا سچا خادم۔ زیرِ نظر کتاب اسی کے کلام کے مجموعے کا نقش ثانی

ہے جسے مولانا محمد اسلم سیفی صاحب نے ازسر نو ترتیب دیا ہے۔

مولوی اسمٰعیل گمنام تھے اور گمنام ہی رہتے اس لئے کہ اول تو انھیں کوئی سر سید نہیں ملا اور دوسرے انھیں تصوف نے شہرت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ مگر صوبہ متحدہ کے ابتدائی اور مڈل مدارس میں اُن کی ریڈروں نے انھیں روشناش کرایا۔ مولانا معاش کے سلسلے میں صوبہ متحدہ کے محکمۂ تعلیمات میں کلرک تھے۔ اس لئے تعلیم سے ذوق پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ پھر شعر و ادب میں صلاحیت خداداد تھی۔ اس لئے حکومت کے ایما سے انھوں نے ابتدائی مدارس کے لئے ریڈریں تالیف کیں جو اس قدر مقبول ہوئیں کہ اُن کو بدلنے کا خیال اس وقت تک نہیں پیدا ہوا جب تک ملکی حالات میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوگئی۔ غالباً یہی محرکات تھے جنھوں نے مولانا کو بچوں کے لئے نصیحت آموز نظمیں لکھنے کی طرف مائل کیا اور اُن کی شاعری کا یہی پہلو ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس لئے کہ اُن سے پہلے شاعری میں سادگی، حقیقت نگاری اور روانی کا آغاز تو ضرور ہو چکا تھا۔ مگر بچوں کے لئے اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ اس ضرورت کو مولوی اسمٰعیل ہی نے پورا کیا

مولانا اسمٰعیل نے بچوں کے علاوہ حالی اور آزاد کے رنگ میں اور نظمیں بھی کہیں، مثلاً مثنوی جریدۂ عبرت۔ نوائے زمستاں وغیرہ مگر بقول سیرت نگار انھیں اور اُن کی نظموں کو وہ مواقع نہیں ملے جو حالی اور آزاد کی کامیابی اور شہرت کا راز تھے۔ مثنوی جریدۂ عبرت جو مولانا نے مسلمانوں کے تمدن کی زوال پذیری سے متاثر ہو کر لکھی تھی، حالی کے "مد و جزر اسلام" سے ٹکر کھاتی ہے اور غالباً اُن کے سارے کلام کا حاصل ہے مگر اسے "دل کی فریاد" اور "پن چکی" جیسی شہرت بھی تو حاصل نہیں ہوئی

کلیات کے اس نقش ثانی کے ساتھ مولانا کی سیرۃ بھی شامل کر دی گئی ہے سیرۃ نگار نے مولانا کی مکمل اور مفصل سوانح عمری پیش کی ہے اور سیرت نگاری کی ذمہ داریوں کا احساس بھی ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن کہیں کہیں جوش عقیدت بہت زیادہ ہو گیا ہے اور چند ایسے واقعات

قلم بند کئے گئے ہیں جو مولانا کی سیرت سے غیر متعلق ہیں ۔ مثلاً مولانا کے احباب کا شجرہ اُن کے پیر طریقت کے مکمل حالات وغیرہ ۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا کے احباب کی صحبت اور ان کے مرشد کی شخصیت نے ان کی سیرۃ پر بہت کچھ اثر کیا مگر صرف اس بات سے مولانا کی سیرت میں اُن بزرگوں کی سیرت کا شمول صحیح نہیں ثابت ہوتا۔

اسی طرح مولانا کی علمی و ادبی حیثیت کے سلسلے میں بھی بعض موقعوں پر قلم کو لغزش ہوئی ہے۔ مثلاً مولانا نے نجم الاخبار کے دریر کی عدم موجودگی میں اس کی چند اشاعتوں کو ترتیب دیا تھا اور مقالہ افتتاحیہ لکھا تھا۔ سیرت نگار نے اس واقعے کو مولانا کی صحافیانہ صلاحیت کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ حالانکہ دو ایک اشاعتوں کی ترتیب سے کسی فرد کا صحافی ہونا لازم نہیں آتا۔ مگر بہ حیثیت مجموعی سیرت مکمل اور جامع ہے اس لئے یہ لغزشیں نظر انداز کی جاسکتی ہیں

کتاب حیات اور کلیات اسمٰعیل دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حیات بڑے سائز کے ۱۵۲ صفحات اور کلیات ۱۶۱ صفحات پر محیط ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ اور جلد مضبوط اور خوب صورت ہے ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ' سے چار روپئے میں مل سکتی ہے (ب، ع، ف)

نادر خطوط غالب :-

غالب مرحوم کے غیر مطبوعہ خطوط اکثر حضرات کے پاس محفوظ ہیں اور اُن میں اکثر ملک کے ادبی رسائل میں گاہے گاہے چھپ بھی جاتے ہیں۔ یہ مجموعہ بھی ایسے ہی ستائیس خطوط کا ہے جنھیں سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی گیاوی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ آپ کے جد امجد جناب کرامت ہمدانی مرحوم کے پاس غالب کے جتنے خطوط آئے تھے انھیں اُن کے صاحب زادے سید شاہ علی حسین عالی ہمدانی نے صاف کرا کے کتابی صورت میں مرتب کر لیا تھا اور تاریخی نام نادر خطوط غالب" رکھا تھا ۔ یہ خطوط چند مجبوریوں کی وجہ

سے چھپ نہ سکے۔ اب رسا صاحب نے ان میں سے ستائیس خطوط منتخب کرکے کتاب کی شکل میں شائع کردیے ہیں۔ جن میں ۲۳ خط کرامت ہمدانی کے نام ہیں۔ تین خط صفیہ بلگرامی کے نام ہیں اور ایک خط صوفی منیری بہاری کے نام۔

پہلے خط کے متعلق جو کرامت ہمدانی مرحوم کے نام ہے۔ رسا صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اُردو زبان میں پہلا خط ہے جو غالب نے لکھا۔ اس کی دلیل میں وہ غالب کی عبارت نقل کرتے ہیں۔

"شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے جو میں تمھیں اردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبان فارسی میں خطوط کا لکھنا آج سے متروک ہے ...."

اس جملے سے یقینی طور پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس سے پہلے کسی کو بھی اُردو میں غالب نے خط نہیں لکھا۔ ممکن ہے کہ شاہ کرامت صاحب کو جتنے خطوط پہلے لکھے گئے ہوں ان میں یہ پہلا خط اُردو میں لکھا گیا ہو۔ ہمارے اس شبہہ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رسا صاحب کا دعویٰ غلط ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ اس امر کی تحقیق ہونا چاہیے اور اس میں وہ باذوق حضرات کافی مدد کرسکتے ہیں جن کے پاس غالب کے غیر مطبوعہ خطوط اب تک موجود ہیں۔ یہاں اگر ہم اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی اور مسعود حسن صاحب ادیب سے درخواست کریں تو بے جا نہ ہوگا کہ اُن کے پاس جو خطوط ہیں ان کی روشنی میں وہ اگر اس مسئلے پر کچھ لکھیں تو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ جناب غلام رسول صاحب مہر۔ جناب اکرام صاحب۔ مالک رام صاحب اور عرشی صاحب رام پوری کے لئے بھی اس میں کچھ کم دلچسپی نہیں ہے۔ ان سے بھی امید ہے کہ وہ خامہ فرسائی فرمائیں گے۔

آخر میں رسا صاحب سے ایک بات کہنی ہے وہ یہ کہ اگر وہ تاریخی نام کی رعایت نہ فرماتے اور بجائے ۲۷ خطوط کے تمام خطوط ایک کتاب کی شکل میں شائع کردیتے تو اُردو ادب ایک بڑی دولت سے مالا مال ہوجاتا۔

ایسے گراں قیمت شہ پاروں میں انتخاب کرنا ادبی بخل ہے۔ یہ مجموعہ کاشانۂ ادب گھسیاری منڈی لکھنؤ سے آٹھ آنے میں مل سکتا ہے۔ (ص۔ ا۔ ص)

فاؤسٹ :-

مترجمہ شاہد احمد صاحب ایڈیٹر ساقی۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی۔ قیمت عہ

مشہور جرمن شاعر اور مفکر گوئٹے کے ڈرامے 'فاؤسٹ' کا ترجمہ تو پہلے سے اردو میں موجود ہے لیکن شاہد احمد صاحب نے اسے فلم کے لئے لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ اس نئی صورت میں پیش کرنے کی وجہ سے انھیں رنگ آمیزیاں کرنا پڑی ہیں اور کافی تصرف بھی کرنا پڑا ہے۔ مناظر کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ بعض مناظر اصل ڈرامے کے چھوڑ دیے گئے ہیں بعض نئے بڑھائے ہیں۔ لیکن خاکہ وہی گوئٹے کا ہے۔ البتہ اس ردّ و بدل سے قصّے کی دلچسپی میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ گوئٹے کے فاؤسٹ کو سمجھنے کے لئے یہ ایک بہترین تعارف کا کام دے گا۔ جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے شاہد احمد صاحب بہت کامیاب رہے ہیں۔ عبارت صاف سلیس، رواں اور شگفتہ ہے۔

سات تارے :-

ناشر سید وصی اشرف دہلوی۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔ قیمت عہ

سات افسانہ نگاروں نے ایک ہی پلاٹ پر افسانے لکھے ہیں۔ افسانے کا پلاٹ یہ ہے "ایک مرد اور ایک عورت کسی طرح خط و کتابت کرنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ناآشنا ہیں۔ خطوط سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر ایک عورت سے اس مرد کا واسطہ پڑتا ہے اور اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ شادی ہو جاتی ہے اور سابقہ خط کتابت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی اپنی تاہل کی زندگی میں مسرور رہنے لگتا ہے۔ پھر کچھ ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے۔

اور آدمی ناخوش ہوکر پھر پہلی خط کتابت کا سلسلہ قائم کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک اتفاقیہ واقعے سے یہ بھید کھلتا ہے کہ میاں بیوی ہی ایک دوسرے کو خط لکھ رہے ہیں۔" جب حقیقت کا انکشاف ہوجاتا ہے تو کیا گذری ہوئی بہاریں پھر لوٹ آتی ہیں۔ یا حقیقت خواب کو برباد کردیتی ہے ان سوالات کا جواب ہر افسانہ نگار نے اپنے اپنے خیالات کے مطابق دیا ہے۔ اور افسانہ نگاری میں یہ ایک انوکھی اور دلچسپ چیز ہے۔ بہتر تھا کہ صادق الخیری صاحب کا افسانہ انکشافِ حقیقت بھی جو اسی پلاٹ پر ہے اس میں شامل کرلیا جاتا۔

فرہنگِ عامرہ :-

از عبداللہ خاں خویشگی۔ فیروز منزل متصل جامع مسجد، خورجہ (یوپی) قیمت عگار

عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی یہ لغت عبداللہ خاں صاحب نے نہایت کاوش سے اور بہت اچھی تیار کی ہے۔ مولف نے اس میں دو باتوں کا خاص التزام رکھا ہے۔ ایک تو یہ کہ عربی فارسی کے بہت سے الفاظ کا املا ایک ہی ہوتا ہے لیکن اعراب میں اختلاف ہونے کی وجہ سے اس کے معنی میں بڑا تغیر ہوجاتا ہے۔ مولف نے تمام الفاظ پر اعراب دے دئے ہیں تاکہ تلفظ میں غلطی نہ ہونے پائے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ بعض الفاظ پر کے چہروں پر اتنے پردے پڑے ہوتے ہیں کہ باوجود صحیح املا ہونے کے ان کا صحیح تلفظ نہیں ہوسکتا۔ مولف نے اس دقت کو آسان کرنے کے لئے اس لفظ کے سامنے اس کا براہِ راست تلفظ درج کردیا ہے مثلاً لفظ آبائی کو اس کے سامنے قوسین میں اس طرح لکھ دیا ہے آ ، بَا ، اِی تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ اسی طرح تمام لفظ لکھے ہیں۔ یہ طریقہ دراصل انگریزی ہے لیکن اردو یا فارسی لغات میں ہندوستان میں ابھی تک کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔

الفاظ کی واحد، جمع بھی دی گئی ہے نیز کثیر الاستعمال فارسی مصادر کے نیز ان مضارع

کے سماعی اور قیاسی مشتقات بھی درج کردیے گئے ہیں۔ زمانہ حاضرہ کے نئے معربات اور مفرسات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ تقریباً چالیس ہزار الفاظ ہیں۔ جن کا اعراب کے ساتھ صحیح چھپ جانا بھی ایک کارنامہ ہے۔

گذشتہ میں لغات کی تدوین اکثر تجارتی امور کی بنا پر ہوتی رہی۔ اس کو ایک فن نہیں بنایا گیا یعنی اس کی تدوین میں تہذیب اور تجدید سے کبھی کام نہیں لیا گیا۔ اس لئے عبداللہ خاں صاحب کی یہ کاوش اور بھی قابل داد اور لائق ستائش ہے۔ اردو دانوں کے لئے بھی یہ لغت بہت مفید ہے۔ کیوں کہ اردو میں کافی الفاظ عربی، فارسی اور ترکی کے شامل ہیں۔

لالہ رُخ :-

مترجمہ ل، احمد اکبرآبادی۔ کتب خانہ علم وادب دہلی۔ قیمت عہ

طامس مور کی مشہور مثنوی کا اردو ترجمہ ہے۔ جناب لطیف الدین احمد صاحب کا یہ ترجمہ بہت عرصہ ہوا نگار میں چھپا تھا اور اس کا پہلا سادہ اڈیشن بھی نگار بک ڈپو سے نکلا تھا۔ موجودہ اڈیشن مصور اڈیشن ہے۔ ناشرین نے خاصی تعداد میں تصویریں پیش کی ہیں۔ سرورق کی تصویر خاص کر خوب ہے۔ مور کی یہ مثنوی اتنی زیادہ کامیاب اور مشہور ہو چکی ہے کہ مور کا نام لینے سے لالہ رُخ اور لالہ رُخ کے نام پر مور کا خیال فوراً آجاتا ہے۔ مختصر پلاٹ یہ ہے کہ بخارا کا فرماں روا اورنگ زیب کا مہمان ہوتا ہے۔ قیام کے دوران میں اس کے ولی عہد اور دہلی کی شہزادی لالہ رُخ کی نسبت قرار پا جاتی ہے اور یہ بھی طے پاتا ہے کہ شادی کی رسم کشمیر کی وادی میں عمل پذیر ہو۔ شاہ بخارا نے جو خدام اور کنیزیں عروس کی معیت کے لئے روانہ کیں ان میں ایک کشمیری مغنی فرامرز بھی تھا۔ جو ہر منزل پر لالہ رُخ کو کہانیاں گا گا کر سنایا کرتا تھا۔ لالہ رُخ اس نوجوان سے

بے حد مانوس ہو گئی۔ بعد میں وہی اس کا شوہر نکلتا ہے۔

ادب عالیہ کا ترجمہ کرنا واقعی مشکل ہوا کرتا ہے۔ اگر مترجم میں پاکیزہ ذوق۔ ادب اور لطیف شاعرانہ دل و دماغ نہ ہو تو اس مرحلے سے عہدہ برآ ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ لطیف صاحب واقعی اس ترجمے پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کہ موّر کی رومانی اور پرکیف طرز اسلوب کے ساتھ حتی الامکان پرواز کی ہے۔

تاریخ اسلام (حصہ اول) :-

شاہ معین الدین احمد ندوی دارالمصنّفین۔ اعظم گڈھ۔ قیمت سے،

انجمن دارالمصنّفین اعظم گڈھ نے تاریخ اسلام کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو تقریباً دس بارہ جلدوں میں ختم ہو گا۔ یہ پہلی جلد پیش نظر ہے۔ اور عہد رسالت و خلافت راشدہ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ غلط مشتبہ، مختلف فیہ اور قابل تحقیق واقعات پر بحث و تنقید کے بجائے مولف نے محض واقعات دے دیئے ہیں اور ان کی تشریح قاری کی ذہنیت پر چھوڑ دی ہے۔ یہ سلسلہ بہت مفید ہے۔ خدا کرے بخیر انجام پائے۔

حیات کیا ہے :-

از محشر عابدی صاحب۔ انجمن ترقی اُردو۔ دہلی۔ قیمت عہ،

اُردو میں سائنس کی کتابوں کی بیحد کمی ہے۔ محشر عابدی صاحب نے مختلف کتابوں اور رسالوں سے مواد اخذ کر کے حیات اور اس کی ابتدا و ارتقا کو آسان زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے بہت سی رنگین اور سادہ تصویریں بھی سمجھانے کی خاطر دے دی گئی ہیں۔ طلبا ر حیوانیات کو اس کتاب سے بہت مدد ملے گی۔

امید ہے کہ عابدی صاحب آئندہ بھی ایسی مفید کتابوں سے اردو کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

حکایات رومی (حصہ اول)

مترجمہ لبیب صاحب۔ انجمن ترقی اردو۔ قیمت ۹ر

مولانا روم کی مثنوی میں بہت سی حکائتیں اخلاقی مسائل کو سمجھانے کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ عام اردو دان طبقہ نہ اس سے لطف اندوز ہو سکتا تھا نہ فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ انجمن ترقی اردو نے نظام شاہ صاحب لبیب سے اس کا ترجمہ کرایا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے ترجمہ تو اچھا کیا ہے لیکن دکنی اور دہلی کے پرانے محاورے رکھ دئے ہیں جو شمالی ہند کے پڑھنے والوں کی سمجھ میں مشکل سے آتے ہیں بعض جگہ نظر ثانی کی بھی ضرورت ہے۔ تاہم ترجمہ بحیثیت مجموعی اچھا ہے اور کتاب بہت مفید۔

اخوان الصفا:۔

مترجمہ مولوی اکرام علی مرحوم۔ انجمن ترقی اردو دہلی۔ قیمت مجلد ۱۴ر غیر مجلد ۸ر

اخوان الصفا کے صحیح ترجمہ کی اردو میں بہت ضرورت تھی۔ پیش نظر ترجمہ مولوی اکرام علی صاحب نے ۱۸۱۰ء میں ولیم ٹیلر صاحب کے ایما سے کیا تھا زبان اس کی حالانکہ پرانی ہے لیکن مطالب صاف واضح ہو جاتے ہیں۔

اخوان الصفا کے مصنفین کے متعلق مختلف روایات رہی ہیں۔ لیکن اتنا مسلم ہے کہ ایک جماعت بصرہ میں تھی (جس میں ابو سلمان ابو الحسن ابو احمد وغیرہ نام بتائے جاتے ہیں جو آخر دور عباسیہ میں مسلمانوں کی جہالت کو دور کرنے کے لئے مختلف مضامین گمنام طور پر لکھا کرتی تھی۔ آج کل یہ مضامین عربی ادب میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

منجملہ اکاون رسالوں کے یہ رسالہ انسانوں اور حیوانوں کے مناظرہ پر ہے۔ رسالہ کا مقصود یہ ہے کہ حقایق و معارف حیوانوں کی زبان سے ادا کئے جائیں تاکہ "غافلوں کو اس کے دیکھنے سے کمالات حاصل کرنے کے واسطے رغبت ہووے" انجمن ترقی اردو نے اس ترجمہ کو اردو میں پیش کرکے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔

ارمغان باز:۔

ایک ۳۲ صفحہ کا چھوٹا سا مجموعہ کلام تراب علی خاں صاحب باز حیدرآبادی نے چھپوایا ہے۔ بندشس الفاظ و محاورہ کی طرف طبیعت زیادہ موزوں ہے۔ اکثر محاورے خالص حیدرآبادی ہیں۔ طرز قدیم ہے۔ ہماری صلاح یہ ہے کہ تراب علی خاں صاحب اپنا تخلص بدل دیں کیونکہ سنجیدہ مضامین کے ساتھ یہ زیب نہیں دیتا۔ "لیلیٰ کا منظوم خط" بھی اس سنجیدہ مجموعہ میں نہیں پھبتا۔ "سرسری نظر" کی ضرورت نہیں۔

مجموعہ پر قیمت درج نہیں۔ کاشانہ باز، بازار گھانسی میاں۔ حیدرآباد سے مل سکتا ہے

کیوں اور کیسے:۔

از مرزا عظیم بیگ چغتائی، بی اے۔ ضخامت ۱۰۲ صفحے سائز چھوٹا کتابت وطباعت اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۱۲ ر ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس بدایوں۔

اس کتاب میں بہت سے عنوانات پر سوال قائم کرکے اُن کے جواب دئے گئے ہیں طرز بیان بہت سلجھا ہوا اور دلچسپ ہے۔ اس قسم کی ایک کتاب لاہور سے بھی شائع ہو چکی ہے لیکن یہ اس سے زیادہ کار آمد ہے۔ بچوں کے علاوہ معمولی استعداد کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ قیمت ۱۲ ر ذرا زیادہ ہے۔

رسالہ جات

عالمگیر:۔

حسب عادت عالمگیر کا سالنامہ اس سال بھی بہت خوبصورت شائع ہوا ہے اور اب کے مضامین بھی اچھے تحقیقی اور مفید ہیں۔ قیمت غالباً عہ رہے۔

طبیہ کالج میگزین علی گڈھ:۔

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی سے طب کے متعلق یہ رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ مضامین طلبار کے لئے بہت مفید ہیں۔ "فلسفہ طب" خصوصیت سے عام قارئین کے لئے بھی دلچسپ ہے

ہندوستان میں السی کی تجارت:۔

السی کی تجارت کے متعلق یہ رسالہ گورنمنٹ آف انڈیا سے موصول ہوا ہے۔ ہندوستان میں سب جگہ اس کی تجارت کے بارے میں جو جانچ پڑتال کی گئی تھی اس کے نتیجے اس رپورٹ میں دئے گئے ہیں۔ جن لوگوں کو اس کی تجارت سی تعلق ہی اُن کو نیز اسکولوں زراعتی کالجوں اور گاؤں سدھار والے محکموں کو اس رپورٹ سے بہت مدد ملے گی۔ ہر گورنمنٹ کی مطبوعات فروخت کرنے والے کتب فروشوں سے مل سکتی ہے۔ قیمت ۱۰ر

رسید کتب:۔

ترک اور جنگ عظیم	عبدالرب صاحب وکیل الہ آباد
متاع حق	امیر احمد صاحب وکیل۔ بجنور
شہزادی نیلوفر	عصمت بک ڈپو دہلی
دواع راشد	

لیون ٹروٹسکی کا بیان

(۲)

(اشتراکیت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس دلچسپ مضمون کو ضرور پڑھیں۔ "مدیر")

(جناب ایم۔ایم جوہر صاحب میرٹھی)

گولڈمین:۔ مسٹر ٹروٹسکی کیا آپ مختصراً یہ بتائیں گے کہ سوویٹ یونین کی بابت بحیثیت ایک (ٹروٹسکی کا وکیل) ریاست اور ایک اقتصادی نظام کے آپ کا کیا خیال ہے؟

ٹروٹسکی:۔ وہاں پرولتاریوں نے پرولتاری آمریت قائم کی ہے۔ اس آمریت کا منشاء یہ ہے کہ اقتصادی اعتبار سے اشتراکی ملکیت کو زندہ رکھے سیاسی اعتبار سے وہ جمہوریت ہی حالانکہ کمیونسٹ پارٹی کا جہاں تک دوسری پارٹیوں سے تعلق ہے اس کی حیثیت ڈکٹیٹر کی ہے لیکن خود پارٹی میں جمہوریت کے اصول کارفرما ہیں، روس کے غیر ترقی یافتہ ہونے، غیر ممالک سے تعلق نہ ہونے اور دوسرے ممالک میں پرولتاریوں کی شکست نے اسٹیلن کو یہ موقع دیا کہ وہ ایک حکومتی طبقہ بنالے۔ اسٹیلن کے آج کل دو کام ہیں ایک تو سرمایہ دار جماعت اور سرمایہ دار ملکوں کے حملوں سے اشتراکیت کو بچانا دوسرے اس اشتراکی ملکیت سے جو فائدہ ہے وہ کل حکومتی طبقے کو پہنچانا۔ ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ اسٹیلن اور اس کی حکومت کو سرمایہ دارانہ جماعت کے حملوں سے بچائیں گے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہماری یہ بھی کوشش ہوگی کہ اشتراکی ملکیت کو حکومتی طبقے کے حملوں سے بچائیں۔

گولڈمین:۔ کیا سوویٹ یونین ابھی تک مزدور طبقے کی حکومت ہے؟

ٹروٹسکی:۔ جی ہاں۔ ایک بگڑی ہوئی مزدور حکومت ہے ایک گری ہوئی مزدور حکومت۔

گولڈمین:۔ اس کی اقتصادی حالت کیسی ہے؟

ٹروٹسکی:۔ وہاں ایک بگڑا ہوا اجتماعی طریق پیداوار رائج ہے۔

گولڈمین:۔ کیا وہ درمیانی حالت ہے۔ یعنی سرمایہ دارانہ اور اشتراکی طریق پیداوار کے مابین کوئی طریق پیداوار ہے؟

ٹروٹسکی:۔ جی ہاں۔ سوویٹ یونین میں طریق پیداوار کا سرمایہ دارانہ اور اشتراکی طریق کے مابین ہونا لازمی تھا لیکن آج وہ سرمایہ داری سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے حالانکہ اب بھی وہاں کے اقتصادی حالات میں یہ قابلیت موجود ہے کہ بغیر سماجی انقلاب کے ان کو اشتراکی رنگ دیا جاسکتا ہے۔

گولڈمین:۔ آپ اسٹیلن کی حکومت اور سوویٹ یونین میں جو تفریق کرتے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟

ٹروٹسکی:۔ سوویٹ یونین کا سماجی نظام اکتوبر کے انقلاب کا ماحصل ہے لیکن اسٹیلن کی حکومت سوویٹ یونین کے لئے ایسی ہی ہے جیسے انسان کے لئے کوڑھ کی بیماری۔ اس لئے میں سوویٹ یونین کو دشمنوں کے حملوں سے بچاؤں گا اور اس بیماری کو دفع کرنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔ بعض دوست اور بہت سی کمیونسٹ پارٹیاں مجھ سے اس بات پر ناراض ہیں کہ میں سوویٹ یونین کی مخالفت کیوں نہیں کرتا مجھے یقین ہے کہ میرے دوست غلطی پر ہیں۔ سوویٹ یونین کو اکتوبر کے انقلاب نے پیدا کیا اور وہ ہماری تمام عمر کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ وہاں ابھی تک اشتراکی ملکیت موجود ہے۔ سوویٹ یونین کو تباہ کرنا سخت غلطی ہوگی۔ ہماری مخالفت تو اسٹیلن کی حکومت سے ہے اس کو بدلنا ہمارا فرض ہے۔

گولڈمین:۔ عام خیال یہ ہے کہ موجودہ سیاسی حالات میں اسٹیلن کی مخالفت کرنے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ سوویٹ یونین کے دشمنوں کو اس کے خلاف جرأت پیدا ہوتی ہے۔ آپ کا اس کی بابت کیا خیال ہے۔

ٹروٹسکی:۔ ہر رجعت پسند حکومت ترقی یافتہ اور انقلاب پسند جماعت کے سامنے یہی حجت

پیش کرتی ہے ۱۹۲۶ء سے لگا کر آج تک اسٹیلن، مولوٹف وغیرہ ہر موقعہ پر یہ کہتے رہے ہیں کہ مخالفت کو سختی سے روکنا چاہئے کیونکہ لڑائی کا خطرہ سر پر کھڑا ہے۔ ہر چنگیزی حکومت لڑائی کے خطرہ کا بہانہ کر کے معترض جماعت کا گلہ گھوٹنا چاہتی ہے میں یہ کہتا تھا کہ اگر لڑائی ہونے والی بھی ہے تو بھی ہمیں آزادی سے اعتراض کرنے کا موقع ہونا چاہئے اور ایک تقریر میں میں نے کلیمنشو کا حوالہ دیا تھا کہ دوران جنگ میں فرانس جیسی سرمایہ دار حکومت نے بھی کلیمنشو کی مخالف تقریروں پر بندش نہیں لگائی۔ جنگ عظیم کے تیسرے سال وہ برسر پیکار حکومتوں کے خلاف تقریریں کرتا تھا ۱۹۱۷ء میں اس نے فرانس کی پارلیمنٹ کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور جنگ میں فتح پائی۔ میرا اس بیان سے یہ مطلب ہے کہ آزاد تحریر اور تقریر کی دوران جنگ میں بھی ضرورت ہوتی ہے اگر سرمایہ دار حکومتوں کے لئے یہ آزادی ضروری ہے تو ایک پرولتارین حکومت کے لئے تو از حد ضروری ہے۔ سرمایہ دار حکومت کا ڈرنا تو قرین قیاس ہے کہ مخالف تقریریں شاید عوام کو بھڑکا دیں کیونکہ ان کی لڑائی عوام کی بہبودی کے لئے نہیں ہوتی ان کی لڑائی تو سرمایہ دار جماعت کے قیام کے لئے ہوتی ہے لیکن ہمارے خلاف یہ اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔ ہماری لڑائی عوام کے لئے ہوتی ہے۔ ہمیں عوام کا مفاد مدنظر ہوتا ہے۔ ہم خود کسی سے لڑنے نہیں جاتے۔ ہماری لڑائی تو مدافعانہ ہوتی ہے۔ پھر ہمیں اعتراض سے کیا خوف ہو سکتا ہے۔ روسی حکومت خطرہ کا بہانہ کر کے انقلابی جماعت کا گلہ گھونٹنا چاہتی ہے۔

فینرٹی :- یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ جنگ میں فرانس۔ انگلستان اور روس ایک طرف (کمیشن کا وکیل) ہوں اور جرمنی۔ جاپان دوسری طرف۔ اس وقت آپ کا کیا رویہ ہوگا؟

ٹروٹسکی :- یہ کافی پیچیدہ سوال ہے۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ جنگ میں سوویٹ کی دوست سرمایہ دار سلطنتیں اس کو اس پر مجبور کریں گی کہ وہ سماجی نظام میں بہت سی تبدیلیاں کردے جو موجودہ نظام کو سرمایہ دارانہ نظام کے بہت ہی قریب لے جائیں گی میرا خیال ہے کہ جنگ

کے ختم ہونے پر سوویٹ یونین میں بجائے سوشلسٹ سوویٹ حکومت کے سرمایہ وارانہ سوویٹ حکومت ہوگی۔ سرمایہ دار حکومتیں سازباز کرکے یونین کو اس پر مجبور کریں گی کہ وہ اپنا نظام بدل دے میں نہیں سمجھتا کہ جنگ کے بعد بھی سرمایہ دار حکومتیں سوویٹ کی دوست رہیں گی۔ میں انگلستان اور فرانس کی مدد نہیں کرتا میرا خیال ہے کہ سوویٹ اور فرانس کے اتحاد کی شکل میں بھی فرانس کی پرولتاری جماعت کو وہاں کی سرمایہ دار جماعت کے خلاف رکھنا چاہیئے تاکہ فرانس کی سرمایہ دار جماعت سوویٹ یونین کو سرمایہ داری کی طرف نہ کھینچ سکے۔ میں سوویٹ یونین کی جانب سے لڑوں گا اور حکومتی طبقہ کے خلاف آواز بلند کرتا رہوں گا۔ میں معمولی سپاہیوں کے دوش بدوش لڑوں گا اور جب فتح ہوتی ہوگی اس وقت فوج سے کہوں گا کہ ہم کو اس حکومتی طبقہ کو ختم کردینا چاہیئے اگر میں روس میں ہوں تو فوج میں بھرتی ہوکر لڑوں گا۔

اسٹول برگ:۔ فرض کیجیئے کہ روس۔ فرانس متحد ہوکر جرمنی و جاپان سے لڑیں۔ اس صورت (کمیشن کا ممبر) میں اگر آپ فرانس میں ہوں تو کیا کریں اور جرمنی یا جاپان میں ہوں تو کیا کریں؟

ٹروٹسکی:۔ میں فرانس میں یہ کوشش کروں گا کہ انقلاب ہوجائے اور پرولتاری جماعت فرانس پر قبضہ کرلے اس کے لئے میں تبلیغ کروں گا۔ اگر میں جرمنی یا جاپان میں ہوں تو اس امر کی کوشش کروں گا کہ فوج میں اور سامان حرب بنانے کے کارخانوں میں بدنظمی پھیلے ان میں ایسی خرابی پیدا کروں کہ کام ہونا بند ہوجائے۔ وہاں میں تبلیغی نہیں بلکہ فوجی طریق کار اختیار کروں گا کیونکہ وہاں فوری بدنظمی کی ضرورت ہوگی۔

گولڈمین:۔ کیا آپ کو یہ اعتبار نہیں کہ فرانس اور انگلستان سوویٹ یونین کے دوست ہو سکتے ہیں اور اس کا تحفظ کریں گے؟

ٹروٹسکی:۔ فرانس اور انگلستان کی حکومتیں میری دوست نہیں ہوسکتیں وہ سوویٹ یونین کے حکومتی طبقہ کی دوست ہوسکتی ہیں میرے دوست تو تمام ملکوں کے کام کرنے والے

مزدور ہیں میں انھیں کی دوستی پر اعتبار کرتا ہوں۔ میری سیاست یہ ہے کہ بین الاقوامی انقلاب ہو۔ میری سیاست سیاسی سمجھوتوں تک محدود نہیں۔ مجھے سوویٹ یونین کے دوستوں سے کچھ امید نہیں وہ ایک دوسرے سے دعا کرسکتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ جہاں دس مزدور ہوں گے اور واقعات کی حقیقت کو سمجھیں گے ان کا اتحاد راسخ ہوگا۔ وہ سو مزدوروں کو اپنا ہم خیال بنائیں گے اور سو مزدور ہزار سپاہیوں کو اپنا ہم خیال بنائیں گے اس طرح ایک ایسی برادری پیدا ہو جائے گی جس میں آپس میں غداری کا امکان نہ ہوگا۔

ریہل:۔ سوویٹ یونین سرمایہ دار سلطنتوں کے نرغے میں اس درجہ پھنس سکتا ہے کہ آپ اسٹالین کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائیں ایسی حالت میں آپ کیا کریں گے؟

ٹروٹسکی:۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ان لوگوں کے خلاف ہوں جو اصلاحات میں اُلجھے رہتے ہیں میں جوؔلے کے خلاف ہوں (جوؔلے فرانس کی مزدور سبھا کا لیڈر رہے) وہ میرا بدترین دشمن ہے۔ لیکن اگر فسطائیوں نے جوؔلے پر حملہ کیا تو میں اس کی طرف سے لڑوں گا۔ میرا رویہ اسٹالین کے ساتھ بھی یہی ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ دوران انقلاب میں کرنسکی نے مجھے جرمن جاسوس ہونے کے الزام میں جیل کر دی تھی۔ جرنل کورنیلف نے کرنلسکی کی حکومت پر حملہ کر دیا اور کرنلسکی کے لئے حالات اتنے گرم ہو گئے کہ اس کو مجھے آزاد کرنا پڑا۔ میں جیل سے سیدھا تحفظ کمیٹی کے اجلاس میں پہنچا اور کرنلسکی کے نمایندوں کے ساتھ تعاون کیا۔ اصولی معاملات میں ذاتیات اور جذبات کو دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طریق کار سے عوام کا بھلا ہوتا ہے۔

گولڈمین:۔ تو کیا اگر سرمایہ دار حکومتیں سوویٹ یونین پر حملہ کریں گی تو آپ یونین کی طرف سے لڑیں گے؟

ٹروٹسکی:۔ یقیناً

ڈیوی:۔ فرض کیجیے کہ انگلستان اور فرانس کی مدد سے سوویٹ یونین جرمنی اور جاپان کو شکست

(صدر کمیشن)

ویدے تو کیا اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ سوویٹ یونین سرمایہ دار ملک ہو جائے گا؟

ٹروٹسکی:۔ یقیناً۔ اور فرانس فیسسٹ ہو جائے گا کیونکہ آج کل میں یہ دیکھتا ہوں کہ فرانس فیسزم کی طرف بہت جھکا ہوا ہے۔

لافیلیٹی:۔ اگر ہٹلر اور سوویٹ میں سمجھوتا ہو جائے تو آپ کا کیا رویہ رہے گا؟ (ممبر کمیشن)

ٹروٹسکی امکان اس کا بھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یونین میں کچھ عرصہ ہوا چند سربرآوردہ اصحاب کا یہ خیال تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو ہٹلر سے دوستی کر لینی چاہیئے کیونکہ ہٹلر نہ صرف سوویٹ یونین کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ بلکہ حکومتی طبقہ کے لئے بھی ہو ۱۹۳۳ء میں اسٹیلن نے کہا تھا "ہم نے ہٹلر کی تحریک کی کبھی مخالفت نہیں کی ہے" میں نے اسٹیلن کے اس رویہ پر اعتراض کئے لیکن اسٹیلن نے صاف صاف اعلان کر دیا "ہم نے ہٹلر کی تحریک کی کبھی مخالفت نہیں کی اور ہم اس سے اسی خلوص و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں جس طرح 'ویمر جرمنی' کے ساتھ رہتے تھے" ۱۹۳۴ء کے وسط میں اسٹیلن کی یہ خواہش تھی کہ جرمنی سے بنی رہے۔ میں اسوسٹیا اخبار سے ایک اقتباس سناتا ہوں "سوویٹ ہی وہ واحد حکومت ہے جس نے جرمنی کی مخالفت نہیں کی خواہ وہاں کی حکومت کسی طرز خیال کی کیوں نہ رہی ہو" جب ہٹلر نے اس اشارے کو ٹھکرا دیا اس وقت اسٹیلن نے فرانس کا رخ کیا۔ جب اسٹیلن جرمنی سے دوستی کرنا چاہتا تھا تو مجھ پر یہ الزام تھا کہ میں فرانس کا دوست ہوں۔ جب فرانس سے دوستی ہوئی تو یہ ہوا کہ میں ہٹلر کا دوست ہوں۔ گویا آئے دن میرے لئے یہ ممکن ہے کہ اپنے دوست بدلتا رہوں پراویدا اخبار کبھی یہ لکھتا ہے کہ میں لارڈ بیوربرک کا دوست ہوں کبھی چرچل کا۔

گولڈمین:۔ کیا آپ کے خیال میں عنقریب سوویٹ یونین کے شکست ہونے کا احتمال ہو؟

ٹروٹسکی:۔ یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب سرمایہ دار ملکوں میں جنگ عظیم ہوگی اگر اس کے

اثر سے مختلف ملکوں میں انقلاب نہ ہو گئے تو سوویٹ یونین کی شکست لازمی ہے میرا
یہ خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اس درجہ بوسیدہ ہوگیا ہے کہ اس کا قلع قمع ہونا تاریخی ضرورت
ہے انقلاب ہو کر رہے گا۔ لیکن بہ فرض محال جنگ ختم ہوگئی اور سرمایہ دار ملکوں میں انقلاب
نہ ہوا تب سوویٹ یونین کی خیر نہیں۔

بیلس:۔ آپ کا اسپین کی لڑائی کی بابت کیا خیال ہے وہاں پرولتاریوں کو کس طرح فتح ہوسکتی ہے؟

ٹروٹسکی (ممبر کمیشن) اسپین میں اس طرح فتح ہوسکتی ہے کہ کسان طبقہ سے یہ کہا جائے کہ زمین تمہاری ہے
اور کارخانہ کے مزدور طبقہ سے یہ کہا جائے کہ کارخانے تمھارے ہیں لیکن اسٹیلن
فرانس کی سرمایہ دار جماعت کی دوستی کی وجہ سے دبا ہوا ہے وہ ایسا نہیں کہہ سکتا۔ اسٹیلن
اسپین میں انفرادی ملکیت کی حمایت کر رہا ہے۔ اسپین کا کسان سیاسی تقریروں کو نہیں سمجھتا
اگر اس کو زمین نہ ملی تو اس کی بلا سے اسپین کا مالک فرنکو بنا ہے یا کا بالیرو۔ روس میں انقلاب
کی کامیابی ہماری فوجی قابلیت اور طاقت کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس لئے ہوئی کہ ہم
نے کسان سے یہ کہا کہ زمین تمھاری ہے اس پر وہ کسان جو ہمارے مخالفوں سے جا ملے تھے ہم سے
آملے جب لاکھوں کسان ہماری طرف ہو گئے تو ہماری فتح ہوگئی۔ اسٹیلن، اسپین میں یہ
کہتا ہے "فتح ہونے دو پھر ملکی نظام کی بابت سوچیں گے اس وقت جنگ ہے ہمارا کام
لڑنا ہے۔ اصلاحات کا سوال اس وقت پیدا ہوگا جب ہم فتح پالیں گے[۱]" جب اسپین
کا کسان یہ باتیں سنتا ہے تو بے توجہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے "یہ میری جنگ نہیں ہے۔ یہ
جنرلوں کی جنگ ہے۔ مجھے اس میں حصہ لینے سے کیا فائدہ۔ ان کو لڑنے دو" اسپین کے
کسان کا یہ خیال ہے اور درست ہے۔ میں کسان کے ساتھ ہوں مجھے یقین ہے کہ
اسٹیلن کی سیاست اسپین کو تباہ کر کے رہیگی چین میں اسٹیلن نے اپنی حماقتوں کی وجہ سے
انقلاب کھویا۔ جرمنی میں بھی یہی ہوا اور اب فرانس اور اسپین میں اس کی تیاری ہے ہمیں
اب تک صرف ایک فتح ہوئی ہے اور وہ سوویٹ یونین کا اکتوبر کا انقلاب ہے جو اسٹیلن

[۱] کانگریس بھی یہی کہتی ہے پہلے انگریز پر فتح پالینے دو پھر ملکی نظام کی بابت سوچیں گے۔

کے سیاسی نظریوں کے مطابق عمل کرنے سے نہیں ہوا بلکہ ہم انقلاب اس طرح کرسکے کہ ہم نے
اسٹیلن کے موجودہ سیاسی نظریوں کے بالکل خلاف کیا تھا۔

اسٹول برک (ممبر کمیشن) اگر آپ اسپین میں ہوتے تو کس سے مل کر کام کرتے؟

ٹروٹسکی:۔ ظاہر ہے کہ میں بائیں پارٹی کی طرف ہو کر فرنکو سے لڑتا۔ لیکن اسپین کی حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کرتا کیونکہ وہ انفرادی ملکیت کی حامی ہے۔ روس میں بھی ایسا ہوا تھا۔ ہم کرنسکی کی حکومت میں شامل نہیں ہوئے۔ میں اسپین میں کابالیرو کی مدد کروں گا لیکن کیونسٹ پارٹی کو یہ مشورہ نہیں دوں گا کہ اس کی حکومت میں حصہ لیں بلکہ ایسے موقع کی تلاش میں رہیں کہ وہ مزدوروں کی حکومت قائم کرسکیں جو اشتراکی ملکیت قائم کرے۔ کسی دوسری جماعت کی حکومت میں شریک ہو جانے سے عوام کی نگاہ میں کیونسٹ پارٹی کا دوسری پارٹی سے صینی فرق ختم ہو جاتا ہے اور انفرادیت غائب ہو جاتی ہے۔ عوام اس کو اسی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں جس نظر سے عمر رسیدہ لوگ بچوں کو دیکھتے ہیں۔ اشتراکی پارٹی جو مفید کام کرتی ہے وہ سب حکومتی پارٹی کی محنت کا نتیجہ خیال کیا جانے لگتا ہے۔ جس سے عوام کی نگاہ میں حکومتی پارٹی کا وقار بہت بڑھ جاتا ہے جس کو وقت ضرورت حکومتی پارٹی اشتراکی پارٹی کے خلاف استعمال کرنے میں دریغ نہیں کرتی اور اشتراکی جماعت کو ذرا سا بہانہ نکال کر کچل ڈالتی ہے۔ میں اشتراکی جماعت کے کسی دوسری جماعت کی حکومت میں حصہ لینے کے سخت خلاف ہوں[1]۔

بیلس:۔ کیا آزانا کی حکومت کی ناکامی کی یہی وجہ نہیں ہوئی کہ دوسری پارٹیاں اس کی حکومت میں شریک نہیں ہوئیں؟

ٹروٹسکی:۔ آزانا کی حکومت اس وجہ سے ناکام ہوئی کہ وہ آدھا بلکہ ایک تہائی انقلاب کرنا چاہتی تھی۔ جب تک مکمل انقلاب کی دل میں نہ ٹھان لی ہو اس وقت تک انقلاب نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ آدھا یا تہائی انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی کوشش ہمیشہ ناکامیاب

[1] ہندوستانی اشتراکیوں کے لئے یہ کافی غور طلب مسئلہ ہے کہ ان کی کانگرس اور کانگرسی حکومتوں میں شرکت مفید ہے کہ مضر۔

ہوتی ہے۔عوام پر اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ لیڈروں پر سے اعتقاد جاتا رہتا ہے اور عوام ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔جب لیڈر مکمل انقلاب کرنے نکلتے ہیں تب بھی عوام اپنے تلخ تجربوں کی بنا پر ان کی طرف سے لاپروا رہتے ہیں[۵]۔جب مکمل انقلاب ہوجاتا ہے تو وہ صرف سیاسی انقلاب نہیں رہتا

بیلیس:۔جس پالیسی پر آپ کاربند ہونا چاہتے ہیں اس سے تو فرنکو ہی کو کامیابی ہوگی۔

ٹروٹسکی:۔فرنکو کی فتح ہونی لازمی ہے۔کیونکہ کمنٹرن کی پالیسی بہت ہی لچر ہے۔اسپین کے پرولتاری چھ سال میں چھ مرتبہ فتح حاصل کرسکتے تھے۔انھوں نے بہت دلیری۔قوت عمل اور سمجھداری کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کے لیڈر ناکارہ تھے انقلاب اگرچہ پرولتاریوں کے بل پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی کامیابی کا انحصار بہت کچھ لیڈر کی دانشمندی پر ہوتا ہے۔انقلابی دور میں سمجھدار لیڈر کا ہونا بہت ضروری ہے اور اسپین میں وہ لیڈر مفقود ہے۔اسپین کے پرولتاریوں کو جو فتح نہیں ہورہی اس کی ساری ذمہ داری کمیونسٹ انٹرنیشنل پر ہے یہ سرمایہ دار کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور سرمایہ داروں کی حکومت میں حصہ لینے کا مشورہ دے رہی ہے نہ صرف یہی بلکہ انفرادی ملکیت کی حامی ہے۔کیبلرو خود انفرادی ملکیت کا پجاری ہوگیا ہے۔جب عوام فرنکو اور کیبلرو دونوں کو انفرادی ملکیت کی پوجا کرتے دیکھتے ہیں تو وہ ان میں کچھ فرق نہیں کرتے ان کی بلا سے کوئی برسر اقتدار آجائے ان کے نزدیک کیبلرو اور فرنکو دونوں برابر ہیں اور دونوں دشمن ہیں۔

گولڈمین:۔کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ کیبلرو کو میدان جنگ میں فتح ممکن نہیں؟

ٹروٹسکی:۔میں یقین کے ساتھ کچھ کہہ نہیں سکتا۔لیکن اگر کیبلرو کو فتح بھی ہوگئی تو بھی یہ ممکن ہے کہ اسپین میں اشتراکی نظام قائم نہ کیا جائے اور اسپین فسطائی ہوجائے۔

بیلیس:۔مسٹر ٹروٹسکی میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کس طرح اسپین کی مدد کرسکتے ہیں۔میرا یہ خیال ہے کہ آپ کی پالیسی سے فرنکو ہی کو فتح ہوگی۔

[۵] ہندوستان میں بھی انقلاب نہ ہونے کی یہی وجہ ہے کہ بیدار طبقہ ہی انقلاب کرنا چاہتا ہے۔

ٹروٹسکی:۔ میں نے اپنے خیالات کا خلاصہ آپ کو بتا دیا ہے وہ یہ کہ کیبلرو کے دشمن سے خوب جان توڑ کر لڑو لیکن صرف بندوق سے لڑنا ہی کافی نہیں ہے یہ ضروری کہ اپنے خیال کی تبلیغ بھی کی جائے۔ میں معمولی کسان کے دوش بدوش لڑوں گا لیکن کسان سیاست نہیں سمجھتا۔ مجھے اس کو واقعات سمجھانا چاہئیں۔ مجھے یہ کہنا چاہئے" یہ درست کرتے ہو کہ تم فرنکو سے لڑتے ہو تم کو فسطائیوں کو ضرور تباہ کرنا چاہئے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ تم کو اسپین میں بھی ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہئے جس میں فرنکو کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہ رہے۔ ہمیں وہ سماجی نظام تباہ کر دینا چاہئے جو فرنکو پیدا کرتا ہے یعنی سرمایہ داری کو تباہ کر دینا چاہئے" یہ خیال میرے سب خیالات کی جان ہے۔ اب آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔

بیلس:۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ فرنکو کے خلاف لڑیں گے لیکن کیبلرو کی حکومت میں حصہ نہیں لیں گے؟

ٹروٹسکی:۔ اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں۔ روس میں ہم نے کرنسکی کی گورنمنٹ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن ہم اس کے دشمن کورنیلو کے خلاف خوب لڑے۔ روس میں بہترین سپاہی اور ملاح ہم بولشیوک ہی تھے کورنیلو نے جب بغاوت کی تو کرنسکی مجبور ہوا کہ بالٹک کے بیڑے کے ملاحوں سے مدد مانگے کہ وہ اس کی حکومت کو بچائیں۔ میں اس زمانہ میں قید تھا۔ جب کرنسکی ملاحوں سے ملنے گیا تو انھوں نے کرنسکی کو حراست میں لے لیا اور میرے پاس یہ دریافت کرنے کو وفد بھیجا کہ کرنسکی کی مدد کریں یا اس کو گرفتار کرلیں۔ یہ تاریخی واقعہ ہے میں نے وفد سے کہا کہ آج کرنسکی کو حراست میں رکھو کل گرفتار کرنا۔

گولڈمین:۔ مسٹر ٹروٹسکی عام طور پر یہ خیال ہے کہ آپ سوویٹ یونین کی شکست چاہتے ہیں سوویٹ یونین کی شکست سے کیا سوشلزم کو دھکا نہ لگے گا؟

ٹروٹسکی:۔ سوویٹ یونین کی شکست سوشلزم کے لئے بہت بڑی شکست ہوگی میں نے اپنے رسالہ "سوویٹ یونین کا تحفظ" میں لکھا تھا کہ ہم سوویٹ یونین کی کامیابی چاہتے ہیں۔ ہم اپنے اعمال سے اس کا ثبوت دیتے رہیں گے اور تحفظ کے معاملہ میں ہم کسی سے دوسرے نمبر پر نہیں ہیں۔

گولڈمین: مسٹر ٹروٹسکی جب آپ اور لینن برسرِ اقتدار تھے تو بیرونی ممالک سے کن اصولوں پر تعلقات رکھے جاتے تھے؟

ٹروٹسکی: ہم روسی انقلاب کو انقلاب عالم کا ایک جز سمجھتے تھے ہم روسی انقلاب کو ہر شکست سے بچانا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ ہمارا یہ بھی خیال تھا کہ دوسرے ممالک کی انقلابی تحریکات میں روسی انقلاب کی حیات و قیام مضمر ہے۔ ہماری کبھی یہ کوشش نہیں تھی کہ دوسرے ممالک کی انقلابی تحریکات سے خود کچھ فائدہ اٹھائیں یا اُن کو آلۂ کار بنائیں کیونکہ اپنے ملکی مفاد کو دوسرے ممالک کے مفاد پر ترجیح دینے سے دوسرے ممالک کی انقلابی تحریک کو نقصان پہنچتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ لینن کی زندگی کے آخری سال میں زینو ویف نے یہ غلطی کرنی چاہی تھی کہ دوسرے ممالک کے انقلابی لیڈروں کو اپنے دباؤ سے بدل دے۔ لینن نے زینو ویف کو اس رویہ کے متعلق لکھا تھا "اس طریق کار سے ایسے لوگوں کے لیڈر ہو جانے کا خطرہ ہے جن کی کمر میں نہ بوتا ہوگا اور نہ دماغ میں گودا۔ ہمیں کمیونسٹ انٹرنیشنل میں ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں جن میں نہ قوت ارادہ ہو نہ دماغ، اور نہ قوت عمل"۔ مجھے افسوس ہے کہ آج کل حکومتی طبقہ نے یہی طریق اختیار کر لیا ہے کہ اپنے پٹھوؤں کو دوسرے ملکوں کی انقلابی تحریکات کا لیڈر مقرر کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نااہل لوگ لیڈر بن گئے ہیں۔

گولڈمین: آپ کے خیال میں اسٹیلن نے بیرونی سیاست میں کیا تبدیلی کر دی ہے؟

ٹروٹسکی: آج کل اسٹیلن نے ایک نئے نظریئے کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔ جو خود ان کی کاوش دماغی کا نتیجہ ہے۔ نظریہ یہ ہے کہ صرف ایک ملک میں سوشلسٹ طریق پیداوار رائج کیا جا سکتا ہے۔ نظریہ بظاہر معصوم معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مختلف ممالک کی انقلابی تحریکات کا باہمی تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ مزدور جماعتیں اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے لگتی ہیں اور ایک عالمگیر انقلاب کے تخیّل کو بہت صدمہ پہنچتا ہے۔ اب سوویٹ یونین میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ دنیا میں کچھ ہی کیوں نہ ہو روس میں سوشلزم جاری رہے گا۔

ہم اپنی آنکھوں سے اسپین۔جرمنی۔اٹلی۔اسٹریا میں فسطائیت پھیلتی دیکھ رہے ہیں لیکن روسی حکومتی طبقہ یہی کہہ رہا ہے کہ سوویٹ یونین میں سوشلزم ترقی کر رہا ہے۔ہم مارکسٹ یہ نہیں سمجھتے۔ہم یہ کہتے ہیں کہ فسطائیت جو رجعت پسندی کی ایک شکل ہے۔اس کا اثر روس پر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور دراصل ہو رہا ہے اگر دنیا میں رجعت پسندی کا زور اسی طرح بڑھتا رہا تو سوویٹ یونین میں سوشلزم کے دن ختم ہو گئے۔

گولڈمین:۔ کیا آپ نے کبھی یہ کیا تھا کہ دوسرے سرمایہ دار ملکوں میں بولشیوک فوج بھیج کر انقلاب کرنا چاہیئے۔

ٹروٹسکی:۔ یہ ممکن ہے کہ ایک ملک میں دو جماعتیں ہوں ایک فسطائی اور دوسری اشتراکی۔ دونوں جماعتیں حکومت پر قبضہ کرنا چاہتی ہوں۔اشتراکی جماعت مجھ سے مدد مانگے ایسی صورت میں میں ضرور مدد دوں گا۔جس طرح ہڑتال کی صورت میں دوسرے ممالک کی مزدور جماعتوں کو چاہیئے کہ ہڑتالیوں کی مدد کریں اسی طرح مختلف ممالک کی اشتراکی جماعتوں کو چاہیئے کہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کریں۔لیکن اگر کسی ملک میں مزدور جماعت ہی نہ ہو یا اگر ہو بھی تو انقلاب نہ چاہتی ہو۔ وہاں یونین کی فوج لے جا کر انقلاب کرنا دیوانگی ہوگی وہاں انقلاب ہو ہی نہیں سکتا اور اگر ہو گیا تو قائم نہیں رہ سکتا۔

گولڈمین:۔ کیا یونین سرمایہ دار ملکوں کے درمیان رہ کر اشتراکی رہ سکتا ہے؟

ٹروٹسکی:۔ میرے خیال میں سوویٹ یونین کی جو آج کل حالت ہے وہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتی۔کیونکہ سرمایہ دار ممالک کی حالت برابر بدل رہی ہے یا تو وہ اشتراکیت کی طرف آرہے ہیں یا فسطائیت کی طرف جا رہے ہیں دونوں حالتوں میں یونین کے تعلقات ان ممالک سے بدلتے رہیں گے۔لیکن سرمایہ دار ممالک آج کل بہت طاقتور ہیں ان ممالک کی طاقت اشتراکیت کے لئے زبردست خطرہ ہے۔سوویٹ یونین میں اشتراکی طریق پیداوار کا دارومدار اس امر پر ہے کہ دوسرے ممالک میں پرولتاریوں کی انقلابی تحریک کس منزل میں ہے۔اگر

دوسرے ممالک میں پرولتاریوں کی تحریک زور پر ہوئی تب وہاں کی حکومتوں کو یہ جرأت نہیں ہو گی کہ سوویٹ یونین پر آنکھ اٹھا کر دیکھیں ورنہ یونین کے خلاف سرمایہ دار ملکوں کے متحد ہونے کا خطرہ ہے جو اشتراکیت کو ختم کر دیں گے اس نظریہ کی بنا پر مجھے لوگ مایوس انسان سمجھنے لگے ہیں۔ میں مایوس نہیں ہوں۔ میرے نزدیک اشتراکیت تمام عالم کے مزدوروں کا سوال ہے۔ اگر میں سوویٹ یونین کا مستقبل روشن نہیں دیکھتا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تمام عالم کے مزدوروں سے مایوس ہوں مجھے امید ہے کہ دنیا کے مزدور بین الاقوامی اشتراکیت کی بنیاد ڈالیں گے۔ اس وقت دنیا کی حالت کچھ ایسی ہے کہ انسانیت اور سرمایہ میں تضاد واقع ہو گیا ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام جاری رہا تو انسانیت ختم ہو جائے گی لیکن مجھے دنیا کے انسانوں سے یہ امید ہے کہ وہ از سر نو دنیا کو وحشی بننے سے روک دیں گے اور دنیا کی مزدور جماعت نئی تہذیب و تمدن کی بنا ڈالے گی۔ میں انقلاب روس کو انقلاب عالم کی ایک کڑی سمجھتا ہوں۔ میرا یہ خیال ہے کہ اگر ہمیں سوویٹ یونین کو اشتراکی رکھنا ہے تو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ دوسرے ممالک بھی اشتراکی ہو جائیں اس کام کے لئے تبلیغ ضروری ہے اور تبلیغ کے لئے جنگ مضر ہوتی ہے۔ کسی ملک میں بیرونی ملک کی فوج سے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرنا دوسرے ملک کی رجعت پسند طبقہ کی مدد کرنا ہے سرمایہ دار فوراً ملک اور قوم کا جذبہ پیدا کر دیتے ہیں اور عوام اس جذبہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اور سرمایہ دار طبقے کی مدد پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اسپین میں بغیر روسی فوج بھیجے انقلاب ہو گیا لیکن کیا ہم نے وہاں فتح پالی؟ جرمنی میں کئی انقلاب ہوئے جب ہٹلر کا قبضہ ہوا اس وقت بھی جرمنی میں انقلابی حالات موجود تھے۔ ہٹلر کی کامیابی سے قبل جرمنی میں اشتراکی انقلاب پیدا کرنے کے لئے بہت اچھی فضا تھی تو کیا ہم وہاں انقلاب پیدا کر سکے؟ ملکوں میں بغیر بیرونی فوج کی مدد کے انقلابی حالات تو پیدا ہو جاتے ہیں لیکن انقلابی پارٹی اور انقلابی لیڈر پیدا نہیں ہوتے جن کا ملک پر اثر ہو۔ ہمیں ایسی پارٹی اور لیڈر پیدا کرنے

کی ضرورت ہے جن کا تخیل اشتراکی ہو اور جن کا عوام پر اثر ہو اس کے لئے وقت درکار ہے اور بغیر ان کی موجودگی کے انقلاب کرنے کی کوشش مہمل ہے۔ یورپ میں اگر پرولتاریوں کی طاقت نہ بڑھی اور جنگ عظیم ہوگئی تو تہذیب کا خاتمہ ہے۔ انسانیت امریکہ کا ترکہ ہو جائے گی اور یورپ میں تاریکی ہوگی۔ جب اسٹیلن نے جرمنی سے اتحاد کی کوشش شروع کی تو میں نے کہا تھا "تم ایک زبردست رنگل پال رہے ہو" انقلاب کے زمانہ میں رنگل ہماری مخالف فوجوں کا افسر اعلیٰ تھا۔ چنانچہ ہٹلر کی حیثیت اب رنگل کی سی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں مضمون لکھے کہ ہٹلر کی دوستی سوویٹ یونین کو راس نہیں آسکتی۔ ان سب واقعات کے باوجود مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں ہٹلر کا ایجنٹ ہوں۔ اصل واقعہ سوویٹ یونین کے اخبار اسوسٹیا کے اقتباس سے واضح ہو جائے گا کہ میں ہٹلر کا دوست ہوں یا اسٹیلن۔ اسوسٹیا ۴ مارچ ۱۹۳۳ء کے پرچہ میں لکھتا ہے "سوویٹ روس ہی وہ واحد حکومت ہے جس کو جرمنی سے کوئی بیر نہیں ہے اور نہ اس کو جرمنی کے نظام حکومت پر کسی اعتراض کی ضرورت ہے"! اسٹیلن نے یہ بھی کہا کہ "ہم نے جرمن تحریک کی کبھی مخالفت نہیں کی"۔ جرمن کمیونسٹ پارٹی بھی ایسی لچر نکلی کہ انھوں نے بلا لڑے ساری طاقت ہٹلر کے ہاتھ میں جانے دی میں نے اس پر کہا تھا کہ یہ ہماری تاریخ میں کمیونسٹ پارٹی کی دنیا کی مزدور جماعت کے خلاف سب سے بڑی غداری ہے۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل نے میری اس صاف گوئی کو جرم سمجھا۔ میں نے جرمن شکست کا کمنترن کو ذمہ دار ٹھیرایا۔ جرمن کمیونسٹ لیڈروں نے یہ غضب کیا کہ جب عمل کا وقت آیا اور خطرے سے دوچار ہونے کا احتمال پیدا ہوا تو پاسپورٹ لے کر دوسرے ممالک کو چل دیئے اور دشمن کے لئے میدان خالی چھوڑ گئے۔ کمیونسٹ پارٹی اور کمنترن نے میرے جواب میں یہ کہا "خوب ہوا ہٹلر برسر اقتدار آگیا یہ تو کچھ دن کا مہمان ہی دوبارہ انقلاب ہوگا اور ہمارا ہی دور دورہ ہو جائے گا" اس وقت میں نے یہ پیشینگوئی کی تھی کہ جرمنی میں کمیونسٹ کو معمولی شکست نہیں ہوئی ہے اس کا اثر بہت مدت تک رہے گا۔

گولڈمین: کیا آپ اس کے موافق ہیں کہ سوویٹ یونین سرمایہ دار ملکوں سے سمجھوتا کرلے؟

ٹروٹسکی:۔ اگر سوویٹ یونین کے تحفظ کے لئے سرمایہ دار ملکوں سے سمجھوتا کرنے پڑے تو کیا مضائقہ ہے لیکن وہ سمجھوتا اس قسم کا ہونا چاہیئے کہ سرمایہ دار ملک کی مزدور جماعت کے مفاد کو اس سے کوئی ضرر نہ پہنچے ایسی کوئی شکل نہ ہونی چاہیئے کہ سرمایہ دار ملک کی کمیونسٹ پارٹی ملک کی حکومت میں حصہ لینے اور تعاون کرنے پر مجبور ہو جائے۔ سوویٹ یونین فرانس سے سمجھوتا کر سکتا ہے لیکن اس کو فرانس کی کمیونسٹ جماعت کو اس پر مجبور نہ کرنا چاہیئے کہ فرانس کا فوجی بجٹ پاس کرانے میں حکومت فرانس کی مدد کرے۔

گولڈمین:۔ پارٹی سے نکالتے وقت آپ پر کیا الزام لگائے گئے تھے؟

ٹروٹسکی:۔ مجھ پر طرح طرح کے الزام تھے۔ مثلاً جب حکومتی طبقے نے بائیں پارٹی کے مضامین نشر کرنے سے انکار کر دیا تو پارٹی کے کسی نوجوان نے ان کو چھاپا مجھے معلوم نہیں کہ کب، کس طرح اور کہاں لیکن حکومتی طبقے نے یہ الزام لگایا کہ ہم نے رنگل (مخالف فوج کا چیف کمانڈر تھا) کی فوج کے کسی افسر کی مدد سے مضامین چھپوائے ہیں۔ بعد میں تحقیق پر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ روسی خفیہ پولیس کے ایک ایجنٹ نے ہماری پارٹی کے نوجوان کی مدد کر کے یہ سب کام کرایا تھا اور خفیہ پولیس میں ملازم ہونے سے قبل وہ رنگل کی فوج کا افسر تھا۔

گولڈمین:۔ کیا آپ کے اور حکومتی طبقے کے اصولی اختلافات بھی تھے؟

ٹروٹسکی:۔ جی ہاں۔ ہم استبدادیت کے خلاف تھے۔ کمیونسٹ پارٹی سوویٹوں اور ٹریڈ یونینوں میں سب جگہ ایک حکومتی طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو اپنے آپ کو عوام کا خادم نہیں بلکہ مخدوم خیال کرتا تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ عوام اس کے لئے ہیں وہ عوام کے لئے نہیں بائیں جماعت ان طبقوں کے سخت خلاف تھی اور اس کی یہ کوشش تھی کہ حکومتی طبقوں نے اپنے مفاد کے لئے خاص حقوق کی جو رسم نکال لی تھی اس کو ختم کر دے اور خاص حقوق سے حکومتی طبقہ کو جو فوائد ہو رہے تھے ان کو عام کر دیا جائے۔ دوسرا اہم اختلاف یہ تھا کہ ہمارا انقلابی تخیل بین الاقوامی تھا اور حکومتی طبقے کا ملکی اور قومی تھا۔ ان کی داخلی اور خارجی پالیسی بھی اسی تخیل کے ماتحت تھی

جب اصول ہی مختلف تھے تو ان اصولوں کے ماتحت جو عمل ہوتا تھا اس میں حکومتی طبقہ اور ہماری پارٹی میں جزوی اختلاف پیدا ہو جانا لازمی تھا ان اختلافات کی بنا پر مجھے ۱۹۲۷ء میں کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا۔

گولڈمین: جب آپ سے سوویٹ یونین کی رعایا ہونے کا حق چھینا گیا اس وقت آپ نے کیا کیا؟

ٹروٹسکی: میں نے مرکزی انتظامیہ کمیٹی کو ایک خط لکھا جس میں میں نے اُنھیں یہ مشورہ دیا کہ اسٹیلن کو جنرل سکرٹری کے عہدے سے الگ کر دیں اور یہ صرف میری ہی رائے نہیں تھی بلکہ لینن نے بھی اپنے ایک مضمون میں جو "صحیفہ" کے نام سے مشہور ہے اس خیال کا اظہار کر دیا تھا۔ لینن اور میں اس معاملے میں ہم خیال تھے لینن میری قوت فیصلہ پر بہت اعتبار رکھتا تھا ایک مرتبہ جب اسٹیلن وغیرہ نے باقاعدہ طور پر میری فوجی تدبیروں کی مخالفت شروع کی تو لینن نے مجھے پوری تختی کا ایک کاغذ دیا جس کے آخر میں یہ جملہ لال روشنائی سے لکھا ہوا تھا۔

"ساتھیو! مجھے ہر اعتبار سے ٹروٹسکی کے احکامات کے درست ہونے کا اتنا زیادہ یقین ہے کہ بلا کسی تردید کے خوف کے میں ٹروٹسکی کے ہر حکم کی تائید کرتا ہوں"

اس جملے کے نیچے لینن کے دستخط تھے۔ باقی کاغذ اس لئے کورا چھوڑ دیا گیا تھا کہ میں جو احکام چاہوں اس پر لکھ لوں۔

رو مل: حکومتی طبقے کے پیدا ہونے اور سوویٹ یونین پر مسلط ہو جانے کا خطرہ تو بہت پہلے دکھائی (ممبر کمیشن) دینے لگا ہوگا۔ ہونے والے واقعات اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ کیا اس خطرے کے متعلق مرکزی کمیٹی یا کنسترن کے اجلاس میں کبھی ذکر آیا؟

ٹروٹسکی: مرکزی کمیٹی میں اس خطرے کی بابت بہت بحث و مباحثہ رہا۔ لینن اور میرے درمیان بھی اس مسئلہ پر متعدد بار گفتگو آئی۔ لینن نے دوران گفتگو میں بارہا اس کا ذکر کیا کہ روس کی

اقتصادی اور تمدنی پستی کہیں مستقل حکومتی طبقہ نہ پیدا کر دے اور سوویٹ یونین کہیں نپولین کی حکومت نہ بن جائے۔ اس خطرے کی پیش بندی کے لئے لینن نے ایک ادارہ کنٹرول کمیشن جاری کیا۔ یہ معمولی مزدوروں کے ہاتھ میں تھا اس کا یہ مقصد تھا کہ مزدور حکومتی طبقہ پر آنکھ رکھیں اور اس کو یہ محسوس کراتے رہیں کہ اس کی زندگی مستعار ہے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد کنٹرول کمیشن خود حکومتی طبقے کے اثر میں آگیا اور حکومتی طبقہ پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ہو گیا اس ناکامیابی نے لینن کو یقین دلا دیا کہ جب تک روس کی تاریکی دور نہ ہو گی اس وقت تک حکومتی طبقے کے سر کچلنے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ عام اقتصادی اور تمدنی تاریکی ایک دن میں رفع نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ شکست کھا کر بیٹھ رہے۔ اگر ہمارے انقلاب کے ساتھ ساتھ جرمنی میں بھی انقلاب ہو جاتا تو سوویٹ یونین استبدادیت سے بچ جاتا۔

روہل:۔ آپ نے لینن کے زمانے میں حکومتی طبقے کا استیصال کرنے میں کیا حصہ لیا؟

ٹروٹسکی:۔ خانہ جنگی کے زمانے میں یہ ضروری تھا کہ کل طاقت کو ایک مرکز پر لایا جائے تاکہ عمل میں ایک نتیجہ خیز تیزی پیدا ہو اس وقتی ضرورت کی بنا پر طاقت اگرچہ چند ہاتھوں میں آگئی تھی اور میرے ہاتھ میں فوج تھی لیکن میدان جنگ میں بھی میں نے فوج کو یہ آزادی دے رکھی تھی کہ سپاہی مختلف فوجی مسائل پر بحث و مباحثہ کر سکتے تھے۔ میں خود معمولی معمولی سپاہیوں سے فوجی مسائل پر بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا اور ان سے رائے لیا کرتا تھا۔ خانہ جنگی ختم ہونے پر ہمیں بڑی امیدیں تھیں کہ سوویٹ یونین میں جمہوریت قائم ہو جائے گی لیکن دو رکاوٹیں پیدا ہو گئیں پہلی، روس کی ہر شعبہ زندگی میں تاریکی اور پستی جس نے حکومتی طبقہ پیدا کیا دوسری حکومتی طبقہ کی خودسری اور اپنے قیام کے لئے جد و جہد۔ عام تاریکی نے حکومتی طبقہ پیدا کیا۔ حکومتی طبقہ نے اپنے مفاد کے لئے جمہوریت کے قیام میں روڑے اٹکائے۔ حکومتی طبقے نے یونین میں اپنی جگہ بنا لی اب ہماری پارٹی اور حکومتی طبقے میں ایک طرح کی جماعتی لڑائی

شروع ہوگئی۔ یہ مخالفت کی ابتدا تھی کچھ عرصے تک حکومتی طبقے کے استیصال کا مسئلہ مرکزی کمیٹی میں زیر بحث رہا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ہماری اور حکومتی طبقے کی مخالفت بڑھتی گئی یہاں تک کہ اختلافات منظر عام پر آ گئے یہاں سے مخالفت دوسری منزل میں داخل ہوتی ہے اسی زمانہ میں لینن اور میں دونوں بیمار ہو گئے اور اسٹیلن۔ زینوویف اور کیمونیف رہ گئے۔ انتظامیہ کمیٹی ہی ہیں جس کا سکرٹری اسٹیلن تھا مرکزی کمیٹی اور سیاسی کمیٹی کا کام ہونے لگا کچھ عرصے میں ان تینوں نے کام سنبھال لیا اور یہ "مثلث" کہلانے لگے۔ جب لینن دوسری مرتبہ بیمار ہوا جس بیماری سے وہ پھر نہ اٹھا تو حکومتی طبقے نے "مثلث" کی سرکردگی میں اور بھی سر اٹھایا۔ اسی زمانہ میں ان تینوں نے انگریزی زبان میں میرے خلاف ایک رسالہ لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ تینوں ہی سوویٹ یونین کے بانی مبانی ہیں اور میں ہمیشہ عضو معطل رہا ہوں۔ جیسا میرے بیان سے ظاہر ہو گیا ہو گا "مثلث" لینن کی زندگی ہی میں پیدا ہو گیا لیکن لینن کی موجودگی میں وہ بہت محتاط تھے۔ باوجود اس کے کہ "مثلث" خفیہ کارروائی کرتا تھا۔ لینن کو سب علم تھا اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ ایک سب کمیشن بٹھاؤ تاکہ یونین کو حکومتی طبقے سے نجات دلائی جائے میں نے جواب دیا حکومت تو درکنار خود پارٹی کے اداروں میں حکومتی طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے کہا کہ تمھارا مطلب منتظمہ کمیٹی اور مرکزی کنٹرول کمیشن سے ہے۔ اچھا چند روز بعد اس مسئلہ پر غور کریں گے یہ لینن کی اور میری آخری گفتگو تھی۔ جب لینن دوسری مرتبہ بیمار ہوا اور سب کو یہ دکھائی دینے لگا کہ اب یہ کیا بچے گا تو یہ تینوں علانیہ کیمونسٹ پارٹی کی لیڈر شپ کے لئے سازشیں کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ آئینی طریق پر "مثلث" کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن عملی طریق پر وہ کیمونسٹ پارٹی کے لیڈر بن گئے۔

گولڈ مین: مسٹر ٹروٹسکی اب یہ بتائیے کہ کچھ عرصے بعد "مثلث" کا کیا حشر ہوا؟

ٹروٹسکی: کچھ عرصے بعد زینوویف اور کیمونیف مجھ سے آ ملے انھوں نے مجھے یہ راز بتایا کہ "مثلث"

کا یہ معاہدہ تھا کہ آپس میں اتفاق رکھیں گے اور تینوں ٹروٹسکی کی مخالفت کریں گے۔

گولڈمین: آپ کا اور زینوویف اور کیمونیف کا اتحاد کب تک رہا اور کیوں ختم ہوا؟

ٹروٹسکی: میرا اور ان کا اتحاد قریب دو سال رہ کر ۱۹۲۷ء میں ختم ہوگیا علیحدگی کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم نے حکومتی طبقے کی مخالفت شروع کی تو اس پر اور عوام پر جو رد عمل ہوا اس سے یہ معلوم ہوا کہ کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ حکومتی طبقہ اب تشدد پر اتر آیا اور ہمارے لئے دو صورتیں رہ گئیں ایک مخالفت ترک کرنا اور معافی مانگنا۔ دوسری پارٹی سے اخراج۔ زینوویف کی رائے تھی کہ پارٹی سے کسی شکل میں علیحدگی درست نہیں۔ میں یہ کہتا تھا کہ اصول پر اڑنا چاہئے اور اگر اخراج ہوتا ہے تو اس کو لبیک کہنا چاہئے۔ زینوویف اور اس کے ہم خیال لوگوں نے حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا لیکن اس پر بھی وہ چھ ماہ تک پارٹی سے خارج رہے دوبارہ معافی مانگنے پر ان کو پارٹی میں داخل کر لیا گیا۔ اس اختلاف کے بعد زینوویف اور کیمونیف سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی دوران گفتگو میں انھوں نے کہا کہ وہ پھر سیاسی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں میں نے جواب دیا کہ تم تو سیاسی نقطہ نگاہ سے مر چکے ہو جس نے سر تسلیم خم کر دیا اس کی سیاسی موت ہو گئی۔

گولڈمین: آپ کے اور اسٹیلن کے درمیان جو کشیدگی ہوئی اس کو اختصار سے بیان کیجئے۔

ٹروٹسکی: لینن جب دوسری مرتبہ بیمار ہوا اس وقت تک اسٹیلن کو یہ احساس نہیں تھا کہ وہ خود ڈکٹیٹر بن سکتا ہے۔ لیکن جب اس نے بین الاقوامی انقلاب اور مستقل انقلاب کے نظریوں کی مخالفت شروع کی اور حکومتی طبقے نے اس مخالفت کا خیر مقدم کیا اس وقت اسٹیلن کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ ڈکٹیٹر بن سکتا ہے۔ اسٹیلن نے ایک ملک میں انقلاب کا نظریہ پیش کر کے حکومتی طبقے کی دل کی سی بات کہہ دی۔ شاید وہ حکومتی طبقے کا طرز خیال تاڑ گیا تھا ہر طرف سے اس کی تائید ہونے لگی۔ حکومتی طبقہ نے کہا ہم برسر اقتدار ہیں اور اسٹیلن کے نظریئے کی تائید کرتے ہیں اب اسٹیلن کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ ملک میں ایک طاقت

ہے اور حکومتی طبقے نے اسٹیلن کی سرکردگی میں اپنے مفاد کا تانا بانا بنانا شروع کر دیا۔ بولشیوک کے جتنے بھی اصول تھے اُن کو ٹروٹسکی کے اصول بتا کر جھٹلا دیا۔ بولشیوک پروگرام کو بھی کہدیا کہ یہ ٹروٹسکی کا پروگرام ہے حکومتی طبقے نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسرے ملکوں کے مصنفوں کو رشوت دینی شروع کر دی جو اکثر ان کی بیویوں کو قیمتی تحائف کی شکل میں دی جاتی تھی اور دنیا میں اپنا پروپگنڈا کرنا شروع کر دیا جب یہ ہوتے دیکھا تو میں نے حکومت کے کاروبار میں ایمان داری سے کام کرنے پر زور دیا ۱۹۲۶ء میں مخالفت بہت بڑھ گئی اب ہم نے چاہا کہ حکومتی طبقے سے کچھ سمجھوتہ کرلیں اور آئینی طریق پر لڑائی جاری رکھیں اس وقت چین میں انقلاب شروع ہو گیا تھا اور اسٹیلن نے وہی غلطیاں کرنی شروع کر دیں تھیں جو آج کل اسپین میں کی جارہی ہیں ۱۹۲۷ء میں جب مرکزی کمیٹی نے بغیر مجھے اطلاع کئے، حالانکہ میں سیاسی کمیٹی کا ممبر تھا ایک تار چین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو کسان تحریک روکنے کے لئے بھیجدیا تو مجھے بہت تعجب ہوا۔ اسٹیلن نے چنگ کیائشک کے ساتھ بھی ویسا ہی اتحاد کرلیا تھا جیسا اس نے فرانس کے ساتھ کیا تھا چنگ کیائشک کی فوج کے افسر بڑے زمینداروں کے طبقے سے تھے۔ چینی غریب کسان کی انقلابی تحریک چینی زمیندار طبقے کے لئے مضر تھی اس لئے تحریک روک دی گئی۔ چین میں وہی ہوا جو آج کل اسپین میں ہو رہا ہے۔ اسٹیلن اس خوف سے کہ فرانس کا سرمایہ دار طبقہ ناراض نہ ہو جائے اسپین کے غریب کسان کی مدد نہیں کر رہا ہے۔ اسی طرح چنگ کیائشک کی دوستی پر چینی غریب کسان کو قربان کر دیا۔ چین کے معاملہ پر اسٹیلن اور ہم میں بہت ترشی پیدا ہو گئی اور ہم یہ سمجھ گئے کہ ہمارے اور اسٹیلن کے خیالات میں بہت بڑا اختلاف ہے جو بحث و مباحثہ سے نہیں جا سکتا اور یہ سب جزوی اختلافات اصولی اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

ترکی کی حربی اور سیاسی اہمیت

ترکی بحیرۂ روم میں ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ درہ دانیال اور باسفورس کی آبنائے کا مالک ہے اس کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں بحیرہ اسود کی کنجی ہے۔ بغداد ریلوے کا ایک بڑا علاقہ، جو ہندوستان کا خشکی کا راستہ ہے، اناطولیہ کے خطے میں واقع ہوا ہے، خود بحیرۂ روم کی ریاستوں میں اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ سمرنا اور دوسرے بندرگاہ تو اس کے قبضے میں ہیں ہی، ان کے علاوہ اسکندرونہ کی خوبصورت بندرگاہ بھی اسی کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ اس کی عسکری تنظیم ابھی نئے طریقوں پر ہوئی ہے اور ۱۹۲۲ء کی مہم کی کامیابی کی یاد اس کے دلوں میں تازہ ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر ترکی کی حکمتِ عملی ان تمام ریاستوں کے لئے جو بحیرہ اسود کے ساحل پر واقع ہیں، باعث تعلق و دلچسپی ہے اور مشرقی بحیرۂ روم میں جن ریاستوں کے مفاد وابستہ ہیں، ان کے لیے نہایت اہم۔ ان حقائق کے جواز میں یہ امر پیش کیا جا سکتا ہے کہ زمانۂ دراز سے لے کر آج تک قسطنطنیہ پر قبضہ و تصرف کے لیے مسلسل جنگوں اور سیاسی چالوں کا سلسلہ جاری رہا ہے۔

ہمارے لئے مفید ہوگا اگر ہم ان حالات اور ذرائع کا مختصر طور پر جائزہ لیں جنھوں نے ترکی کو —— وہی ترکی جسے جنگ عظیم میں شکست دے کر اتحادیوں نے بے دست و پا کر دیا تھا —— موجودہ درجے پر پہنچایا اور آج سیاسی اور حربی نقطۂ نظر سے اس کی غیر معمولی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ بالخصوص ان بحری راستوں کے تعلق سے جو درہ دانیال، بحر مارمورا اور باسفورس یا

آبنایوں کے نام سے موسوم ہیں

۲۔ مانٹرو کانفرنس تک آبنایوں پر قبضہ

۱۰ راگست ۱۹۲۰ء کے معاہدۂ سیوری کی رو سے جسکی تصدیق کی کبھی نوبت نہیں آئی، ان آبنایوں سے ہو کر جہازرانی ایک بین الاقوامی کمیشن کے زیرنگرانی تھی۔ یہ کمیشن اتحادیوں یعنی برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی تصنیف تھی اور یہی لوگ ان آبنایوں پر قبضہ رکھنے کے لئے مقررہ علاقوں میں مسلح فوجیں رکھنے کے مجاز تھے۔ مشرقی تھریس یونان کو ملا تھا اور اس طرح یونان بھی آبنایوں کے تصرف میں اتحادیوں کا شریک تھا۔ مصطفےٰ کمال پاشا کی فتوحات، اناطولیہ سے یونانیوں کا اخراج، اور سوویٹ یونین سے ترکوں کا سمجھوتہ، ایسے اسباب تھے جن کی بدولت معاہدہ سیوری تشنۂ تکمیل رہا۔ ۱۱ راکتوبر ۱۹۲۲ء میں صلح مدائن کے ساتھ ساتھ آبنایوں سے اتحادیوں کا متحدہ اقتدار ختم ہو گیا اور معاہدہ سیوری کو بدلنے کے لئے لوزان میں گفت و شنید کا آغاز ہوا۔ لوزان میں آبنایوں کے سلسلے میں ایک نیا سمجھوتہ ہوا اور اسے بھی معاہدۂ صلح میں شامل کرلیا گیا (۲۴ ر جولائی ۱۹۲۳ء) اس معاہدہ کی دفعات گو ترکی کے موافق تھیں مگر تاہم پورے دردانیال، مارمورا اور باسفورس کے علاقے کو غیر عسکری علاقہ قرار دیا گیا گو ترکی ایک مسلح میگزین اور ایک توپ خانہ اور استامبول میں بحری اڈا قائم کرنے کا مجاز ٹھہرایا گیا تھا۔ اس علاقے سے تمام اقوام کو امن کے زمانے میں اور جنگ کے زمانے میں بھی بشرطیکہ ترکی فریق جنگ نہ ہو، گذرنے کی اجازت تھی، البتہ جنگ کے زمانے میں ترکی کے فریق جنگ ہونے کی صورت میں صرف غیر جانب دار اقوام کو یہ حق حاصل تھا۔ اس معاہدے کی دفعات کی مناسب تعمیل کی نگرانی کے لئے جو بین الاقوامی کمیشن مقرر کیا گیا تھا،

ترکی کو اس کا صدر بنایا گیا اور شرکا معاہدہ نے اپنی طرف سے غیر فوجی علاقے کے تحفظ کی ضمانتیں کیں۔

معاہدے کی شرائط نے مغربی ریاستوں نیز جو آبنایوں میں مکمل آزادی کی طالب تھیں اور بحیرۂ اسود کی ریاستوں میں جو اپنے اہم مفادات کے پیش نظر خصوصی حقوق چاہتی تھیں، ایک آپس کے سمجھوتے پر اصرار کیا تھا جسے ترکی نے منظور کر لیا۔ مگر روس کا اس سے اطمینان نہیں ہوا اور روسی نمائندے ایم۔ شیشرن نے اختلافی نوٹ کے ساتھ اپنے دستخط کیے۔ اصل میں وہ اپنے گذشتہ تلخ تجربات کی بنا پر اندر آنے والے جہازوں پر کافی زیادہ پابندیاں عاید کئے جانے کا طالب تھا۔ چنانچہ مانترو کانفرنس میں آخر ساحلی ریاستوں کے خصوصی حقوق تسلیم کر لئے گئے۔ ڈاکٹر ٹوائن بی کا قول ہے کہ (ملاحظہ ہو Survey ۱۹۲۴ - صفحات ۹۰ - ۹۹) روم کی بحری کانفرنس منعقدہ فروری ۱۹۲۴ء کی ناکامی کا باعث سوویٹ کے نمائندے کی روش تھی۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ جب تک بحیرۂ اسود اور بحیرۂ بالٹک ساحلی ریاستوں کے علاوہ باقی دوسری تمام ریاستوں کے لئے بند نہ کر دیے جائیں، اس وقت تک اسے برطانیہ کے مجوزہ وزن سے چوگنے وزن کے جہازوں کی تعمیر کا حق ملنا چاہئے۔

۳۔ دوسری مختلف ریاستوں سے معاہدے

سوویٹ یونین اور ترکی کے درمیان گہرے تعاونی تعلقات سے روس کا وہ زخم مندمل ہو گیا جو اسے لوزان کی شکست سے پہنچا تھا اور اس کی تصدیق ۱۹۲۵ء کے باہمی معاہدے سے ہو گئی اور جس کی جولائی ۱۹۳۰ء میں پھر توسیع کی گئی۔ اسی اثنا میں ترکی نے برطانیہ سے بھی موصل کے معاملے میں جو

باہمی اختلافات تھے ان کو ختم کر کے صفائی کرلی، ان کے علاوہ اس نے اٹلی سے بھی مئی ۱۹۲۸ء میں معاہدہ کیا جو ڈوڈیکنیز کے جزیرہ پر قابض تھا اور اناطولیہ میں اپنے اثرات بڑھا رہا تھا، اور اس کی ان حرکتوں سے خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ پھر فروری ۱۹۳۰ء میں فرانس سے دوستی ہوئی جس نے شام کے مندوب میں اسکندرونہ کی بندرگاہ کو بھی ہضم کر لیا تھا۔ اور اکتوبر ۱۹۳۰ء میں اپنے حال کے دشمن یونان سے دوستی پیدا کی۔ صلحنامۂ بلقان کا اصل محرک بھی ترکی ہی تھا، جس کا وہ ایک فریق تھا اور زمانے کے اقتضاء سے اب اس کا لیڈر بن گیا ہے۔ علاوہ ازیں ۱۹۳۰ء کے بعد سے ترکی اس کوشش میں رہا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں سرحد کے مسائل اور دوسرے اہم امور کا نمٹارا کرکے اپنے پرانے ایرانی اور عربی پڑوسیوں سے از سر نو تعلقات قائم کرلے ایران اور عراق سے سرحدی مسائل کو حل کرنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں جنیوا میں ایک غیر جارحانہ اتحادِ ثلاثہ کے لئے گفت و شنید شروع ہوئی۔ اس گفت و شنید میں افغانستان نے بھی بعد کو شرکت کی۔ اس اتحاد کی ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کے میثاقِ سعد آباد کے ذریعہ از سر نو تصدیق ہوئی اور یہ اتحاد مضبوط ہو گیا۔ جس کی رو سے عراق، ایران، اور افغانستان سے نہایت گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اس طرح مشرقِ وسطیٰ میں ترکی کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس نے اندرونی ذرائع نقل و حمل کو فروغ دے کر اور اسلحہ بندی پر کافی رقم صرف کرکے اپنی دفاعی حیثیت بھی خوب مضبوط و مستحکم کرلی۔

۱۹۳۲ء میں جب ترکی مجلس اقوام کا رکن ہوا، تو ہمسایہ ریاستوں اور مغربی ریاستوں سے اس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ اسلحہ بندی کے انسداد کے لئے جو مجلس منعقد ہوئی تھی، اس میں اس نے ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو سب سے پہلے آبنائوں کی

ازسرنو قلعہ بندی کے مسئلہ کو پیش کیا۔ ۱۹۳۴ء میں ترکی نے مختلف قسم کے حالات سے خطرے کا احساس کیا بالخصوص اسے مسولینی کی ۱۸ مارچ ۱۹۳۴ء کی تقریر سے خطرہ پیدا ہوا جس میں اس نے کہا تھا کہ اٹلی کے تاریخی مفادات و مقاصد ایشیاء اور افریقہ سے وابستہ ہیں۔ حالانکہ اس پیش بندی کی بعد کو مسولینی نے یہ کہہ کر تردید کر دی کہ "میرا روئے سخن ترکی کی طرف نہیں ہے جسے میں ایک یورپی ریاست سمجھتا ہوں" ۱۹۳۵ء میں متعدد مواقع پر بالخصوص ۱۷ اپریل ۱۹۳۵ء کو جمعیۃ الاقوام کی مجلس عاملہ اور ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کی جمعیت کی مجلس عام کے جلسوں میں ترکی نے اعلان کئے کہ آبنایوں کے نظام عمل میں اس کے تحفظ کے لئے نظر ثانی ناگزیر ہے۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے دو واقعات نے حبش پر اٹلی کا غاصبانہ اقدام خاص طور پر اور رائن لینڈ پر جرمنی کا ازسرنو قبضہ، جو معاہدے کی سراسر خلاف ورزی تھی، مغربی ریاستوں کو ترکی کے مطالبات پر غور کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو حکومت ترکی نے ۱۹۲۳ء کے آبنایوں کے معاہدے کے فریقین، یوگوسلاویہ اور جمعیت اقوام کو یادداشت کے خطوط لکھے اور درخواست کی کہ ترکی کے دفاع کے لئے اب آبنایوں کے نظام عمل میں نظر ثانی ناگزیر ہو گئی ہے۔ اس کے لئے ازسرنو گفت و شنید کا آغاز کیا جائے۔ ترکی کی یہ درخواست بڑی خوشی سے سنی گئی اس لئے کہ اس زمانے میں دوسری ریاستیں بے کھٹکے معاہدوں کی خلاف ورزیاں کر رہی تھیں۔ صرف اٹلی نے مانٹرو کانفرنس کی شرکت کرنے سے جو مجوزہ نظر ثانی کے لئے ۲۲ جون ۱۹۳۶ء کو منعقد کی گئی تھی، انکار کیا۔ ۵ جولائی ۱۹۳۶ء کو اٹلی نے لکھا کہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں انگلستان اور بحیرۂ روم کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی طرف سے آپس کی بحری ضمانتوں کا جو سمجھوتہ ہوا تھا جب تک وہ برسر عمل ہے، اٹلی مانٹرو کانفرنس میں شرکت نہیں کر سکتا۔

۴- آبنائوں کے متعلق مانٹرو کا معاہدہ

مانٹرو کانفرنس میں جو ۲۲ جون ۱۹۳۶ء کو منعقد ہوئی تھی برطانیہ اور روس کے نقطۂ نظر کے حامیوں کے درمیان کسی قدر اختلاف رائے تھا۔ برطانیہ کی رائے یہ تھی کہ ادلے بدلے کے اصول کے مطابق آبنائوں کا دروازہ اگر بند کیا جائے تو تمام اقوام کے جہازوں کے لیئے اور اگر کھولا جائے تو تمام اقوام کے لیئے۔ اس کے برعکس روس کا مطالبہ یہ تھا کہ چونکہ روس بحیرۂ اسود کی سب سے بڑی ریاست ہے اور اس کے مفادات بحیرۂ اسود سے سب سے زیادہ وابستہ ہیں اس لئے اسے خصوصی حقوق ملنے چاہئیں۔

معاہدے کے فیصلے کسی قدر پیچیدہ ہیں۔ ان کے ماتحت بہت سے قاعدے بنائے گئے ہیں جو آبنائوں سے جنگی اور تجارتی جہازوں کے گذارنے کے متعلق ہیں، کہ جب امن کا زمانہ ہو تو کیا صورت ہوگی، لڑائی کا زمانہ ہو اور ترکی فریق جنگ ہو تو کیا صورت ہوگی۔ سب سے اہم فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ترکی آبنائوں کے علاقوں میں فوج رکھ سکتا ہے اور جو دستخط ہو جانے کے دن یعنی ۲۰ جولائی ۱۹۳۶ء سے عمل پذیر ہوگا۔ یہ فیصلہ معاہدے کی دستاویز میں تمہید کے طور پر منسلک ہے۔ دفعہ ۲۴ کے ماتحت بین الاقوامی کمیشن کے اختیارات جو لوزان کے معاہدے کے ماتحت قائم کیا گیا تھا، ترکی کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔ اگر ترکی فریق جنگ ہو، یا وہ خیال کرے کہ جنگ میں اس کا شریک ہونا یقینی حد تک اغلب ہے تو وہ آبنائوں کو جنگی جہازوں کے لیئے بند کر سکتا ہے یا اگر مناسب خیال کرے تو ان کو گذر جانے دے (دفعات ۲۰ اور ۲۱) اگر وہ غیر جانب دار رہے تو بھی جنگ میں شامل ہونے والی ریاستوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ سوائے چند مخصوص حالات کے ممنوع ہوگا۔

روس کا نقطۂ نظر ایک حد تک ایک قاعدہ بنا کر مان لیا گیا جس کی رو سے بحیرۂ اسود کی ریاستوں کے بڑے بڑے جہازوں کو گذر جانے کی اجازت دی گئی۔ لہذا سوائے اس امر کے کہ حکومت ترکی کسی کو واضح طور پر خود دعوت دے، زمانہ جنگ میں ساحلی ریاستوں کے علاوہ کسی دوسری ریاست کے بڑے بڑے جہازوں کو بحیرۂ اسود میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی مگر سوویٹ روس کے جنگی جہازوں کو بحیرۂ روم میں نکل جانے یا بحر اوقیانوس یا بحیرۂ بالٹک میں منتقل ہو جانے کی اجازت ہوگی اس کے برعکس بھی یعنی بحیرۂ اسود میں داخل ہونے کی اجازت بھی ہو گی۔ اس استثناء کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویٹ کے بحری تحفظ میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ زمانۂ جنگ یا جنگ کے امکانی زمانے میں ترکی سے دوستی پیدا کرنے کا سوال حکمت عملی کا ایک نہایت اہم جزو ہو گیا۔ اس معاہدے کی مزید تفصیل حسب ذیل ہے۔

تجارتی جہاز:۔ امن اور جنگ دونوں زمانوں میں تجارتی جہازوں کی جہاز رانی اور عبور کرنے کی آزادی کی از سر نو تصدیق کی گئی، حالانکہ جنگ کے زمانوں میں چند خاص شرائط کی تکمیل لازمی کر دی گئی اور اگر ترکی فریق جنگ ہو تو دشمن کے جہازوں کو آبنایوں سے گذرنے کا کوئی حق نہیں ہو گا۔

جنگی جہاز:۔ جنگی جہازوں کے مجموعی وزن (۱۵۰۰۰ ٹن) اور تعداد (۹) پر شدید قسم کی پابندیاں عاید کی گئیں جو آبنایوں سے گذر رہے ہوں گے۔ اور جن کے گذرنے کی پیشگی اطلاع دے دی گئی ہوگی۔ امن کے زمانے میں ہلکے جہازوں، چھوٹی اور ضمنی کشتیوں کے گذرنے پر عملی طور پر کوئی پابندی نہیں ہوگی سوا اس کے کہ وہ دن کے وقت سفر کریں اور اپنے ساتھ جو فضائی اسلحے رکھتے ہوں، ان کا استعمال نہ کریں۔ اوپر کی سطور میں جن

اقوام کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے جہازوں کے مجموعی وزن کا تعین بھاری جہازوں کی عبوری کی اجازت نہیں دیتا، مگر دفعہ ۱۱ کی رو سے بحیرۂ اسود کی ریاستوں کے اس قسم کے جہازوں کو گذرنے کی اجازت دی گئی ہے بشرطیکہ وہ ایک ایک کر کے گذریں اور دو سے زیادہ تباہ کن جہازوں کی معیت و حفاظت میں نہ ہوں۔ اس کے علاوہ صرف بحیرۂ اسود کی ریاستوں کو یہ حق ہوگا کہ ان کی آبدوز کشتیاں جو کسی بیرونی ملک کی فرمائش میں جا رہی ہوں یا بیرونی جہاز ساز کارخانوں میں مرمت کے لئے جا رہی ہوں، آبنایوں سے گذر سکیں، بشرطیکہ وہ دن کے وقت سفر کریں اور پانی کے اندر ہو کر نہ چلیں۔ مزید براں یہ معاہدہ بحیرۂ اسود کے علاوہ دوسرے اجنبی جہازوں کے وزن پر خواہ وہ مجموعی ہو یا انفرادی سخت پابندیاں عاید کرتا ہے جو کسی بھی وقت سے بحیرۂ اسود میں رہ گئے ہوں (اور یہ بھی معاہدے کی رعائتی دفعہ کی رو سے ہوگا کہ اگر یہ جہاز بحیرۂ اسود میں انسانی مقاصد کے پیش نظر بھیجے گئے ہوں) ان کے قیام کا زمانہ بھی ۲۱ دن محدود کر دیا گیا ہے۔ ان دفعات کا یہ اثر ہوگا کہ بحیرۂ اسود کے ملکوں کے بڑے جہازوں کے لئے تو آبنائے کھولی جائے گی مگر دوسرے ملکوں کے جہازوں کے لئے بند رکھی جائے گی۔

زمانہ جنگ میں جنگی جہازوں کی عبوری کے متعلق موثر اور کارگر دفعات ۱۹ سے ۲۱ تک ہیں۔ اگر ترکی غیر جانب دار رہے، تو غیر جانب دار ملکوں کے لئے صرف امن کے زمانے کی شرائط عاید ہوں گی، مگر جنگ میں شریک ہونے والے ملکوں کے جہاز اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ البتہ اگر وہ جمعیت اقوام کے ضابطۂ قوانین کی پابندی کرتے ہیں، یا وہ ایک ایسی

ریاست کی مدد کے لئے جا رہے ہیں جو ناجائز غصب کا شکار ہوئی ہے اور اس سے باہمی امداد کے معاہدے میں ترکی بھی شریک ہے، اور وہ معاہدہ جمعیت اقوام کے رشتۂ اتحاد سے متعلق ہے اور باضابطہ طور پر مصدقہ ہے، تو جنگ میں شریک والے ملک کا جہاز بھی گذر سکے گا اگر ترکی جنگ میں شریک ہے، یا وہ سمجھتا ہے کہ اسے جنگ کا نمایاں طور پر خطرہ ہے تو حسب مندرجہ بالا جنگی جہازوں کا داخلہ یا عبوری حکومت ترکی کے فیصلے کی پابند ہوگی۔ آبنائیوں میں کسی بھی وقت کسی جنگ میں شریک ہونے والے ملک کے جہازوں کے داخلہ کا حق کوئی حیثیت یا وزن نہیں رکھے گا

اٹلی حالانکہ مانٹرو کانفرنس میں شریک نہیں تھا، مگر اس کے بعد (۲ مئی ۱۹۳۸ء کو جب انگریزی اور اطالوی سمجھوتے پر دستخط ہو گئے) وہ بھی شریک ہو گیا۔ اس معاہدے پر تمام دستخط کرنے والے فریقوں کی طرف سے بہ استثنائے جاپان ۹ نومبر ۱۹۳۶ء کو تصدیق ہو گئی۔ جاپان کی تصدیق ۱۹ اپریل ۱۹۳۷ء کو ہوئی۔

معاہدہ بلقان:۔ ۱۹۲۰ء میں جو اتحاد صغیر (Little Entente) عمل میں آیا تھا، اس میں بلقان کی ریاستوں میں رومانیا، یوگوسلاویہ۔ اور چیکوسلاویکیہ شریک تھے۔ چیکوسلاویکیہ کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ ہنگری کی نظر ثانی (Revision-ism) کے مطالبے کا مقابلہ کرے۔ پھر ۱۶ فروری ۱۹۳۳ء میں اس اتحاد کو پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعے مضبوط کر دیا گیا، حالانکہ اس قانون کی رو سے باہمی فوجی امداد کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا، البتہ یہ استثنا رکھا گیا کہ اگر ہنگری ٹری نون کے صلحنامے کی نظر ثانی کا مطالبہ طاقت کے ذریعے کرے تو فوجی امداد بھی دی جائے گی۔ ستمبر ۱۹۳۳ء میں یونان اور ترکی میں تحفظ کی ضمانت اور باہمی امداد کے متعلق ایک معاہدہ

ہوا جس کا سب سے پہلا مقصد یہ تھا کہ اگر بلغاریہ یونان پر ہاتھ مارنے کا حوصلہ کرے جس کا امکان تھا تو ترکی اس کی امداد کو آئے۔ اسی اثناء میں ۳۲-۱۹۳۰ء میں غیر سرکاری طور پر بلقان کانفرنسوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس نے تمام بلقان کی ریاستوں کو باہم عملی اشتراک عمل کے لئے آمادہ کر دیا۔ مگر اس صورتِ حالات میں عارضی طور پر یوگوسلاویہ اور بلغاریہ کے آپس کے جھگڑے سے خلل آ گیا۔ یہ جھگڑا دونوں ملکوں میں مقدونیہ کے قبضے سے اٹھا تھا، مگر شکر ہے کہ انہی ایام میں دونوں ملکوں کے بادشاہوں کی ملاقات ہوئی۔ اور یہ جھگڑا نرم پڑ گیا۔ اب باوجودیکہ ترکی، یونان، یوگوسلاویہ اور رومانیا باہمی سمجھوتے کے لئے تیار ہو گئے تھے، مگر بلغاریہ اپنے نظرثانی والے مطالبے سے سر مو پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۹ فروری ۱۹۳۴ء کو ایتھنز میں باہمی صلح مشاورت کا معاہدہ طے ہو گیا اور اس سے بلغاریہ اور البانیہ کو مستثنیٰ کر دیا گیا جو پہلے ہی سے اٹلی کے اثر میں تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کی شرکت کے لئے دروازہ کھلا رکھا گیا کہ وہ چاہیں تو بعد کو بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ اس اتحاد کی رو سے آپس میں بلقانی سرحدات کی ضمانت کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا تھا کہ اگر ان کے مشترکہ مفاد پر کوئی آنچ آئی تو وہ اس کے حل کے لئے سب ملکر مشورہ کریں گے۔ اتحاد میں دو دیباچے مخفی رکھے گئے تھے۔ جن کا مضمون بعد کو شائع کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک کا مقصد یہ تھا کہ اگر کبھی کسی غیر بلقانی ریاست کی طرف سے کوئی جارحانہ اقدام ہو اور اس میں بلقان کی کوئی ریاست بھی شریک ہو تو اس کی امداد کی جائے گی۔ مگر درحقیقت اس فیصلے کا افادہ مشکوک تھا اور بعد کو خود ترکی اور یونان نے اعلان کر دیا کہ اتحاد کی ان دونوں افتتاحی دفعات میں سے کسی کی رو سے بھی وہ کسی بڑی طاقت کے ساتھ شرکت جنگ کے لئے مجبور نہیں ہوں گے۔ یہ اتحاد، جس کے فیصلے انگورہ میں اکتوبر، نومبر ۱۹۳۴ء میں

قانوناً تسلیم کئے گئے ، بنیادی طور پر باہمی امن و صلح کے لئے تھا۔ اس میں اس امر سے اور بھی پختگی آگئی کہ چاروں طاقتوں نے روس کے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا جس میں غاصب (Aggressor) کی تعریف و توضیح کی گئی تھی۔ جس کے نتیجے کے طور پر یہ امر مسلم ہو گیا کہ روس کی طرف سے کسی غاصبانہ اقدام کا خوف نہیں ہے ——— حتیٰ کہ بے سربیا کے معاملے میں بھی نہیں۔

اس اتحاد کے دوسرے ہی سال سے کچھ ایسے واقعات رونما ہو گئے کہ بلقان کا معاہدہ نہایت ضروری ہو گیا۔ کاونٹ چیانو کے برلن کے سفر کے بعد ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ایک بیان اخبار میں شائع ہوا کہ بہت سے معاملات کے سلسلے میں ایک معاہدہ طے پایا ہے جس میں جنوب مشرقی یورپ کا بھی ذکر تھا۔ یہ بیان تشویش ناک تھا۔ بلقان کی تمام ریاستیں روز بروز جرمنی کی تجارت کی محتاج اور پابند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اٹلی کے اس اعلان نے جو بار بار دہرایا جا رہا تھا کہ اس کے بنیادی مفادات بحیرۂ روم سے وابستہ ہیں، صورت حالات کو بہت نازک بنا دیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں آسٹریا پر جرمنی کے قبضے اور ۱۹۳۹ء میں البانیہ پر اٹلی کے تسلط نے یونان اور یوگوسلاویہ کی حربی حیثیت ختم کر دی تھی ایک طرف بلقانی تعاون کی ضرورت شدید ہو گئی تھی اور دوسری طرف یہ ضرورت، کہ محوری طاقتوں (Axis Powers) کو کسی نوع چھیڑا نہ جائے لمحہ بہ لمحہ ان کے دماغوں پر مسلط ہو رہی تھی یہ ضرورت اس خطرہ کے ماتحت تھی کہ جرمنی سے حسابات کی صفائی کے انتظامات کی شرائط ناقابل اطمینان تھیں اور وہ ایسا خریدار رہے جو اپنے قرضہ جات سوا اس کے کہ مقررہ برآمد کے ذریعے ادا کرے، کسی دوسری صورت میں ادا کرنے کے یا تو قابل نہیں، یا قصداً کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ ان کے سامنے سیاسی صورت حالات کی بے اطمینانی اور ان ممالک کا حشر تھا جنھوں نے ان طاقتوں کے مقابلے میں مدافعت

کی ہمت کی تھی۔ صرف ترکی کی پوزیشن مضبوط اور مستحکم تھی اس لئے کہ اس کا جغرافیائی محل وقوع دفاعی حیثیت سے قابل اطمینان ہے اور دوسری طرف سوویٹ یونین سے اس کے تعلقات سوائے ایک عارضی شکر رنجی کے جو مانسرو کانفرنس کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، بالعموم خوشگوار تھے۔ یہ امر ناگزیر تھا کہ ریاست ہائے بلقان کے درمیان جو بھی اتحاد ہوگا، اس کی قیادت ترکی کے ہاتھ میں ہو گی۔ وہ اس قابل بھی تھا کہ بلغاریہ پر بھی، اس کے مطالبات کے باوجود دوستانہ طور پر معاہدے کے لئے زور ڈالے۔ اس باب میں ایک قدم اور آگے اٹھا۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۳۷ء کو بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کے درمیان ایک دیرپا دوستانے کے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے کے نتیجے کے طور پر ۳۱ر جولائی ۱۹۳۸ء کو بلغاریہ نے سالونیکا کے مقام پر اتحاد بلقان کے چاروں شرکاء کے ساتھ غیر جارحانہ معاہدے پر دستخط کئے۔ بلغاریہ سے یہ تو نہیں کہا گیا کہ وہ موجودہ سرحدات کی ضمانت کرے، یعنی اس سے اس کے ان مطالبات سے، جو جنوبی دبروجا (Dobrouja) اور بحیرۂ ایجین میں داخلے کے لئے راستے کے متعلق تھے، دستبردار ہونے کے لئے نہیں کہا گیا مگر وہ خود اس بات پر راضی ہو گیا کہ طاقت سے کسی تبدیلی کی کوشش نہیں کرے گا۔ معاہدہ نیوئی کی فوجی دفعات منسوخ کردی گئیں اور بلغاریہ نے اپنی جو از سر نو اسلحہ بندی کی تھی، اسے قانوناً تسلیم کرلیا گیا۔ جب اٹلی نے البانیا کو فتح کرلیا تو بلغاریہ کے ان مطالبات پر پھر ایک مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی گئی۔ جو اس کے بلقانی پڑوسیوں کے متعلق تھے۔ بلغاریہ بحیرۂ اسود کی ایک ساحلی طاقت ہے۔ اور اسی حق کی بنا پر وہ ترکی سے تعلقات پیدا کرکے اپنا فائدہ کرنے کا متمنی ہے، جو آبنایوں کا کرتا دھرتا ہے۔ بلغاریہ کی تجارت پر جرمنی کا سولہ آنہ قبضہ ہے اور یہی وہ رکاوٹ ہے جو اسے اپنے ہمسایوں سے تعلقات پیدا کرنے کی راہ میں حائل ہوتی ہے

اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو شاید یہ رکاوٹ پیش نہ آتی۔

۱۹۳۹ء میں ترکی کی خارجی حکمت عملی کی رفتار:- ترکی نے بلغاریہ اور یونان کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ بحیرۂ ایجین سے لے کر بحیرۂ اسود تک سہ چند قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کرنا شروع کیا، مگر یہ احتیاطی تدابیر تھیں کسی امکانی بیرونی حملے کے مقابلے میں اپنے دفاع کی، نہ کہ بلقانی ہمسایوں کے خلاف۔ البانیہ کو جب اٹلی نے فتح کر لیا تو ۱۳ اپریل ۱۹۳۹ء کو مسٹر چمبرلین، وزیر اعظم برطانیہ نے دارالعوام میں ایک بیان دیا کہ بحیرۂ ایڈریاٹک بحیرہ روم ہی کا ایک حصہ ہے۔ اور وہاں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں برطانیہ ان کی طرف سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے یقین دلایا کہ اگر رومانیا اور یونان کی آزادی کو کسی طرف سے خطرہ ہوا اور انھوں نے خود اس خطرہ کے دفاع کا فیصلہ کیا تو برطانیہ ان کو اپنی طاقت بھر مدد دے گا۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ برطانیہ کے اس ارادے کی اطلاع ترکی کو بھی بھیج دی گئی ہے جس کے تعلقات یونان سے دیناجانتی ہے۔ طویل گفت و شنید کے بعد لندن اور انگورہ میں ایک ساتھ ایک مشترکہ اعلان شائع کیا گیا (۱۲ مئی ۱۹۳۹ء) کہ کسی مستقل معاہدے کے معاملے کو تو ابھی معلق رکھا گیا ہے لیکن اگر اس عرصے میں اگر کوئی ایسا غاصبانہ واقعہ پیش آئے جس کا نتیجہ بحیرۂ روم میں جنگ کی صورت میں رونما ہو تو حکومت برطانیہ اور حکومت ترکی دونوں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ اور اپنی طاقت بھر ایک دوسرے کی امداد کریں گے۔ ترکی اور فرانس کے درمیان بھی اسی موضوع کے مشترکہ اعلان پر ۲۴ جون کو دستخط ہوئے۔ جس کے لئے فرانس کی طرف سے اسکندرونہ کے علاقے سنجک کی واپسی سے میدان ہموار کر دیا گیا تھا۔ یہ یاد رہے کہ سنجک کا علاقہ اس سے پہلے شام کے مندوسا کے ساتھ ساتھ فرانس کے زیر حکومت تھا

اور جب سے وہ ترکی کو واپس کر دیا گیا ہے وہ ہاتے جمہوریہ کی صورت میں ہے۔

اس زمانے میں امید کی جارہی تھی کہ برطانیہ روس سے کوئی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگر یہ معاہدہ ہو جاتا تو ترکی کے لئے اور بھی آسانیاں فراہم ہو جاتیں۔

بہر صورت ان اعلانات کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مصالحت مونٹرو کے وقت بحیرۂ روم میں قزاقی کا مقابلہ کرنے کے لیئے مغربی ریاستیں اور ترکی ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ ۸ر جولائی ۱۹۳۹ء کو ترکی کے وزیر خارجہ ایم۔ سراج اوغلو نے ان اعلانات کی تشریح کے دوران میں کہا تھا کہ یہ اعلان ایک سلسلۂ واقعات یعنی جلش "تعزیری کارروائیاں" مانسرد کا معاہدہ، اور مصالحت مونٹرو کا نتیجہ ہے۔ ترکی نے اس بات کو بتاکید ذہن نشین کرانے میں بڑی محنت کی کہ "یہ نئے معاملات کسی نوع روس سے ہمارے تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوں گے" ۵ مئی ۱۹۳۹ء کو جب روس کے نمائندے ایم۔ پوٹیمکن نے اپنا انگورہ کا قیام ختم کیا تو ایک بیان شائع کرایا گیا کہ امن و تحفظ کے قیام کے لیئے دونوں حکومتیں یکساں طور پر کوشاں رہیں گی اور مشترکہ مفادات کے معاملے میں دونوں حکومتوں میں تبادلۂ خیال اور مشورے کی جو روایت قائم ہے وہ جاری رہے گی۔ جرمنی اور سوویٹ روس کا باہمی معاہدہ ترکی کے لیئے ایک کاری ضرب تھی، اس لئے کہ اس سے ترکی اور روس کے درمیان تعلقات کی جو خوشگواری تھی، اس پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔

جرمنی کے ساتھ بھی ترکی کے تعلقات مناسب تھے۔ وزیر اعظم نے ۱۲ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو کمیٹی (Kamutey) میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ "جرمنی سے ہمارے تعلقات بین الاقوامی قانون کے مطابق ہیں۔ ترکی اس سے براہ راست کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتا۔" بہر نوع، ۵ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو اعلان کیا گیا کہ جرمنی اور

ترکی کے درمیان جو تجارتی معاہدہ ہے، اس کی تجدید نہیں کی جائے گی۔

ترکی برطانیہ اور فرانس سے ایک طویل المدت سمجھوتے کے لئے گفت و شنید میں مصروف تھا، کہ مئی اور جون میں دونوں ریاستوں اور ترکی میں جو مشترکہ اعلانات شائع ہوئے تھے، وہ مستحکم اور وسیع ہو جائیں۔ اسی اثنار میں جرمنی اور روس کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا اور ۲۲ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو وزیر خارجہ ایم۔ سراج اوغلو نے ماسکو کا سفر کیا تاکہ سوویٹ گورنمنٹ سے اس نئی صورت حال کی وجہ سے جو مسئلہ پیدا ہو گیا ہے، اس پر غور و بحث کی جا سکے۔ یہ سفر بہت طویل تھا۔ اس لئے کہ اسی درمیان میں ماسکو میں ۲۷ر ستمبر ۳۹ء کو جرمنی کے وزیر خارجہ ہر فان ربن ٹراپ گفت و شنید کے لئے آ گئے۔ اور ایم۔ سراج اوغلو کو گفت و شنید ملتوی کرنی پڑی۔ اکتوبر میں جب گفت و شنید پھر سے چلی تو غیر متوقع مشکلات اٹھ کھڑی ہوئیں اس لئے کہ روسی حکومت نے چند نئی تجویزیں پیش کیں، جن کی نوعیت اس وقت تک صاف صاف ظاہر نہیں ہوئی۔ اس دوران میں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ سمجھوتے کی بات چیت مکمل ہو چکی تھی۔ صرف دستخط ہونا باقی رہ گئے تھے وہ اس لئے کہ ترکی اس امید میں تھا کہ اس قسم کا کوئی سمجھوتہ روس سے بھی ہو جائے گا جو جدید ترکی کا دیرینہ دوست تھا۔ یہ امید تو پوری نہ ہوئی مگر فرانس اور برطانیہ کے ساتھ اتحاد ثلاثہ پر ۱۹ر اکتوبر ۳۹ء کو دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے کے دیباچے میں یہ فیصلہ درج ہے کہ روس سے جنگ کی حالت میں ترکی کسی صورت میں بھی اس معاہدے کا پابند نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ اس امر کا شاہد ہے کہ ترکی ماسکو سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے کو اپنی بنیادی حکمت عملی تصور کرتا ہے۔ ماسکو سے انگورہ کو واپس آتے ہوئے ایم۔ سراج اوغلو نے استنبول میں اس بات کا اعادہ کیا کہ "ماسکو میں روسی مدبرین سے میرے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ

میرا سفر ترکی اور سوویٹ کے درمیان دوستانہ تعلقات کو قائم رکھنے کا سبب بنا ہے اور مجھے امید ہے کہ گفت و شنید آئندہ پھر کسی وقت شروع کی جا سکے گی۔"

سلطنت متحدہ اور فرانس کے ساتھ ترکی کا جو معاہدہ ہوا ہے، اس کی مدت پندرہ سال رکھی گئی ہے۔ اس معاہدے کے فیصلوں کے ماتحت اگر ترکی پر یورپ کی کوئی طاقت حملہ کرے۔ یا کسی طاقت کے غاصبانہ اقدام کی وجہ سے بحیرۂ روم کے علاقوں میں جنگ چھڑ جائے اور ترکی کو شریک ہونا پڑے تو یہ دونوں ریاستیں اس کی امداد کو آئیں گی۔ اسی طرح اگر کسی طاقت کے غاصبانہ اقدام کی وجہ سے بحیرۂ روم کے علاقوں میں جنگ چھڑ جائے اور اس جنگ میں برطانیہ اور فرانس کو شریک ہونا پڑے تو ترکی ان کی مدد کرے گا۔ ترکی مغربی ریاستوں کی اس صورت میں بھی امداد کرے گا اگر وہ رومانیہ اور یونان کے ضامن کی حیثیت سے کسی کے مقابلے پر جنگ میں شریک ہوں۔ اگر کسی وجہ سے معاہدے کی پہلی دو دفعات کا اطلاق ایسے کسی معاملے پر نہ ہوتا ہو، تو فوراً شرکاد معاہدہ کے درمیان مشاورت عمل میں آئے گی، اور ترکی بہرصورت مخلصانہ طور پر غیر جانب دار رہے گا۔ ایک عمومی دفعہ کے ماتحت یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اگر کوئی یورپ کی طاقت کسی ایسی یورپی ریاست پر غاصبانہ اقدام کرے جس نے شرکار معاہدہ میں سے کسی ایک سے یہ سمجھوتہ کیا ہے کہ اس (غاصبانہ اقدام کی) صورت میں اس کے بقاء آزادی کے لیے اس کی امداد کی جائے تو شرکار معاہدہ اس باب میں مشورہ کریں گے یا متحدہ طور پر کارروائی کریں گے۔ یا اگر ایسے غاصبانہ اقدام سے شرکار معاہدہ میں سے کسی کو خطرہ لاحق ہوتا ہو، تب بھی اس خطرے کے سلسلے میں متحدہ کارروائی یا باہمی مشورہ کیا جائے گا۔ معاہدہ دستخط ہو جانے کی تاریخ سے عمل پذیر ہوگا اور جمعیت اقوام میں اس کی رجسٹری ہوگی۔ (اس معاہدے کا پورا مضمون ایک قرطاس ابیض کی صورت میں شائع کیا گیا ہے جس کا نمبر مسودہ

۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو معاہدے کے دیباچے کا ذکر جس کے ماتحت یہ فیصلہ ہے کہ معاہدے کے فیصلوں کی روسے ترکی روس سے جنگ میں شریک ہونے کے لئے مجبور نہیں ہوگا۔ پہلے آچکا ہے انگورہ کے اس معاہدے کے فیصلوں کو مانٹرو کانفرنس کی ان پابندیوں کی روشنی میں جانچنا مفید ہوگا جو ترکی کے اوپر عاید ہوتی ہیں۔

اس معاہدے پر دستخط کے یہ معنے ہیں کہ بحیرۂ روم میں تحفظ اور دنیائے عرب میں امن و امان کی بدیہی ضمانت ہوگئی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اٹلی میں جو بیرونی ممالک کے اخبارات کے نمائندے ہیں، انھوں نے اس معاہدے کے متعلق لکھا کہ اٹلی کے سرکاری حلقوں میں اس معاہدے کو نہ تو اس حیثیت سے دیکھا جا رہا ہے کہ یہ اٹلی کے مفادات کے لئے خطرہ ثابت ہوگا اور نہ اس حیثیت سے کہ اٹلی بلقان کی ریاستوں کا جو ایک غیر جانب دار بلاک قائم کرنے کی فکر میں ہے (تاکہ جنگ کا بحیرۂ روم میں امکان جاتا رہے) اس میں کوئی مزاحمت ہوگی۔ (ملاحظہ ہو مانچسٹر گارجین بابتہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ٹائمیز بابتہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء ایک خاص مضمون)

یہ معاہدہ نہ صرف بحیرۂ روم کے تحفظ کا ایک شگون ہے، بلکہ مشرق وسطیٰ کے لئے بھی جہاں میثاق سعد آباد کے شرکا میں ترکی کی قائدانہ حیثیت ہے امن و امان کا ایک نیک فال ہے۔

جب ترکی میں سمجھوتہ ہوگیا تو عراق اور ایران میں تھوڑی سی تشویش پیدا ہو چلی تھی کہ کہیں ترکی دوسری سرحدوں کی بھی نظر ثانی کے لئے بضد نہ ہو جائے مگر ترکی کی طرف سے میثاق کے فیصلوں کی دیانتدارانہ پابندی نے اس تشویش کو دور کر دیا ہے اور جھگڑے کا امکان مٹ چکا ہے۔ مصر مشرق وسطیٰ کی ایک ریاست بھی ہے اور اسے بحیرۂ روم کی بھی طاقت کہا جا سکتا ہے۔ ترکی سے اس کے تعلقات ٹھوس نہیں تھے۔ مگر اگست میں ترکی کے نمائندوں کے سفر سے

اس سے بھی تعلقات قائم کئے گئے، مصر میثاق سعد آباد میں شریک نہیں تھا۔ پھر بھی یہ بات قابل توجہ ہے کہ برطانیہ، فرانس اور ترکی کے باہمی معاہدے کا قاہرہ میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ اور اخباروں نے اعلان کیا کہ اس معاہدہ کے ذریعے پورے کا پورا مشرق وسطیٰ اتحادیوں کی طرف آگیا ہے۔

(تلخیص)

کھیل اور تعلیم

(فضل الدین صاحب آثر - ایم اے)

اوسط درجے کے ہندوستانی گھروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بچے پیٹے جاتے ہیں اور اکثر کھیل کے پیچھے۔ کوئی دن ہی ایسا جاتا ہوگا جب کہ ماں یا باپ بچوں کو کھیل سے منحرف کرنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔ ان کے خیال میں بچوں کا کھیل میں زیادہ دلچسپی لینا مدرسے کے کام سے بے پروائی کا مرادف ہوگا یا آوارگی کا پیش خیمہ بنے گا یا ہوائی قلعے بنانا سکھائے گا۔ لیکن کاش ہمارے والدین کو بچے پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا کہ کھیل بچے کا وہ فطری حق اور اس کی زندگی کی وہ اہم شرط ہے جس کے خلاف جانا بچے کی ہستی کو مٹانا ہے۔ ستم یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں بالغ العمر لوگوں کے آرام و آسائش اور تفریح و دلبستگی کا ہر سامان مہیا ہوگا۔ لیکن کوئی ایک گوشہ بھی ایسا نہیں ہوتا جسے بچہ اپنا سمجھ سکے اور جس میں دو چار چیزیں اس کی دلچسپی کی موجود ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے ہنوز بچے کی شخصیت کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ اور ہم یہ بالکل بھولے ہوئے ہیں کہ کھیل بچے کی زندگی کا سب سے بڑا قانون اور اس کی روحانی اُپج اور بالیدگی کے اظہار کا واحد ذریعہ ہے۔ کھیل ہر ملک ہر قوم، ہر طبقے کے بچوں کے لئے یکساں دلچسپی رکھتا ہے۔ اگر امیروں کے بچے قیمتی کھلونوں میں اپنی کھوئی ہوئی جنت ڈھونڈھتے ہیں تو غریبوں کے بچے سڑک کے کنارے گھروندا بنا کر اپنا دل بہلا لیتے ہیں۔ اور اگر تہذیب یافتہ قوموں کے بچے چھوٹے چھوٹے ریڈیو سٹ بنا سکتے ہیں تو تہذیب کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والی قوموں کے بچے برسات کے پانی میں کاغذ کی ناؤ تیرا کر ہی خوش ہو لیتے ہیں۔

مسئلے کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ماہرین نفسیات نے کھیل کے متعلق چھان بین کرنے

میں کافی وقت صرف کیا ہے۔ اور یقیناً یہاں اُن کے مختلف نظریوں پر ہمارا ایک اجمالی تبصرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کھیل کے متعلق سب سے زیادہ قدیم اور مقبول نظریہ وہ ہے جو عموماً شلر اور اسپنسر کے نام سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ (حالانکہ یہ نظریہ شلر اور اسپنسر سے بہت پہلے قائم ہو چکا تھا) شلر کا خیال تھا کہ کھیل انسان یا حیوان کی اُن قوتوں کے اخراج کا ذریعہ ہے جو کام میں صرف ہونے سے بچ رہتی ہیں۔ چنانچہ کھیل میں مصروفیت ایک بے مقصد مصروفیت ہے۔ اسی گمان کے ماتحت شلر نے کھیل کو "فاضل قوت کا بے مقصد اخراج" کہا ہے۔

شلر کے اس نظریے پر دو اعتراضات ہیں۔ اوّل یہ کہ تمام کھیل کو ایک سعی لاحاصل سے تعبیر کرنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ چڑیوں کا تنہائی میں شاخ پر بیٹھے بیٹھے چہچہا اٹھنا یا تتلیوں کا ایک پھول سے دوسرے پھول پر جھکنا بھی بے مقصد نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زبان میں یہ ایک دعوت ہے، اپنے ہم جنسوں کے نام اور وہ دعوت جس پر ان کی نسل کی بقا کا انحصار ہے۔ دوم اگر شلر کے نظریے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہم ان بچوں کے کھیل میں دلچسپی لینے کی کوئی وجہ پیش نہیں کر سکتے جنھیں نہ پیٹ کے لئے روٹی میسر ہے اور نہ تن کے لئے کپڑا۔

اسی سلسلے میں بے جا نہ ہوگا اگر ہم کھیل اور آرٹ کے درمیان اس رشتے پر بھی غور کریں جو شلر نے قائم کیا تھا۔ شلر کا خیال تھا کہ کھیل اور آرٹ کے درمیان ایک رشتہ ہے، کیونکہ دونوں انسان کی بے ساختہ مسرتوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ اور اُس مقام پر بھی جہاں شاعر اپنے دل کا درد بیان کرتا ہے وہ اس مسرت سے بے خبر نہیں ہوتا کہ وہ کس کامیابی کے ساتھ اپنے تاثرات دوسروں تک پہنچا رہا ہے۔ پھر کھیل اور آرٹ دونوں میں ایک قسم کا ضابطہ اور متانت داخل ہے۔ اگر کوئی فسانہ نویس، آداب افسانہ نویسی کا پابند ہے تو کھیل میں حصّہ لینے والے بچے بھی کھیل کو بغیر سلیقہ اور شعور کے کامیاب نہیں بنا سکتے۔ شلر کی اسی بات سے انیسویں صدی کے مشہور و معروف شاعر ولیم مورس نے متاثر ہو کر کہا تھا۔

"زندگی بغیر محنت جرم ہے اور محنت بغیر خوبی کے گناہ"۔

اور یہی وہ تخئیل ہے جس نے ثابت کر دیا ہے کہ جمالیاتی حسن کوہ المپیا پر رہنے والے دیوتا اور دیویوں کی بخشش نہیں ہے کہ جسے مل گئی، مل گئی اور جسے نہ ملی، نہ ملی۔ بلکہ بڑی حد تک یہ ایک اکتسابی چیز ہے۔ چنانچہ بچوں کو کھیل ذریعے اپنی قوتوں کو اُجاگر کرنے دیجئے اور وہ ضرور ایک دن ان تمام چیزوں میں جو اُن کے حیطۂ تخلیق میں ہیں حسن کا شعور اور سلیقہ پیدا کر سکیں گے۔

اسپنسر کا نظریہ شلر کے نظریے سے مختلف ہے۔ حالانکہ اس کا نام بھی اس کے ساتھ وابستہ کیا جا چکا ہے۔ اسپنسر کے خیال میں بچے کے متعلق درڈز ورتھ کا یہ قول کہ

"اس کے تمام افعال و مشغولیت بے پایاں نقالی ہوتی ہے"۔

حرف بہ حرف صحیح ہے۔ چنانچہ بلی کے بچے کا لکڑی کے ٹکڑے کو اچھال اچھال کر پکڑنا چوہے پکڑنے کی نقل ہے۔ اور اسی طرح لڑکیوں کا گڑیوں سے کھیلنا امور خانہ داری کا آئینہ۔ کارل گروس کا نظریہ جو آگے چل کر پیش کیا جائے گا اسپنسر کے اس نظریے کی ایک ارتقائی صورت ہے۔

لارڈ کیمس کے نقطۂ نظر سے کھیل ایک محض تفریحی شغل ہے، جس کی نہ کوئی حقیقی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کوئی خاص مدعا بیسویں صدی کے ابتدائی دور تک جرمنی میں یہ نظریہ بہت مقبول تھا۔ اسی بنیاد پر پروفیسر لذارس نے ہمیں یہ مشورہ دیا ہے۔

"بے مصرف کاہلی سے بامصرف تفریحی کھیل کی طرف قدم اٹھاؤ"۔

پروفیسر لذارس کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ محنت کے دلچسپ مشغلے کو مکمل آرام پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لارڈ کیمس کا یہ نظریہ اپنی جگہ اٹل ہے لیکن اس کے باوجود اس میں کھیل کی کوئی مکمل توضیح پیش نہیں کی گئی ہے۔ فی الحقیقت یہ شلر اور اسپنسر کے فاضل قوت

والے نظریے کا متضاد پہلو ہے۔ اور ہم اسے اُسی وقت قابل قبول سمجھ سکتے ہیں جب کہ ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ مختلف کاموں میں مختلف اعضاء پر تکان کا اثر ہوتا ہے۔ بچے میں پڑھتے وقت وہ اعضاء تھک سکتے ہیں جو پڑھنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہوسکتی ہے مدرسے کے بچوں کے نئے جوش کے ساتھ بھاگ دوڑ میں شریک ہوسکنے کی۔

عہد حاضر کے ایک ماہر نفسیات مسٹر پیٹرک نے لارڈ کیمس ہی کی تخئیل پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ہماری نازک نازک رگوں اور چھوٹے سے چھوٹے اعصاب کا استعمال بڑھتا گیا ہے اور یہاں تک کہ اب زندگی مستقل دیدہ ریزی اور مسلسل دردِ سر بن کر رہ گئی ہے چونکہ ہم باریک قسم کے کام مثلاً لکھنا، پڑھنا اور چھوٹی چھوٹی مشینوں کا استعمال زیادہ دیر تک نہیں کرسکتے اس لئے اب مجبور ہیں کہ ہم نسل انسانی کے ان قدیم مشاغل کی طرف لوٹیں۔ جس میں ہمارے جسم کے بڑے بڑے اعضاء بھی استعمال ہوسکیں مثلاً شکار، پیرنا وغیرہ۔

مسٹر پیٹرک کے خیال میں بچے عمر رسیدہ لوگوں کے مقابلے میں اس لئے کھیل کا زیادہ شوق رکھتے ہیں کہ ان کے دماغ میں وہ مرکز ہنوز قائم نہیں ہونے پاتے جو انھیں باریک اور نازک قسم کے مشاغل میں حصہ لینے کے قابل بنادیں۔ اس لئے اگر ہماری دنیا سائنس کی تجربہ گاہوں کارخانوں اور بینکوں پر مشتمل ہے تو جنگل، دریا، چشمے، شکارگاہیں اور لڑائی کے میدان بچے کی دنیا ہیں۔

وقت کی رفتار پر نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیٹرک صاحب حقیقت تک پہنچ گئے ہیں لیکن اول تو یہ چیز محتاج ثبوت ہے کہ انسانی حافظہ بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ Hormic Process کے ماتحت ہمارے گذشتہ تجربے ہمارے موجودہ روش و کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ماضی کے تجربوں کی وہ انفرادیت یقیناً قائم نہیں رہتی جس کی جانب مسٹر پیٹرک نے اشارہ کیا ہے۔ پھر ہمارے پاس اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ عہد

قدیم میں انسان کے دماغ کے اعلیٰ حصوں کا نشوونما نہ ہو سکا تھا۔

کارل گروس نے اپنی دو تصنیفات "جانوروں کے کھیل" اور "انسان کے کھیل" میں ایک اور بھی زیادہ دلچسپ اور نیا نظریہ پیش کیا ہے۔

"جانور کھیلتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ نوخیز ہیں بلکہ اس لئے کہ انھیں کھیل کے لئے فطرت سے ایک مخصوص زمانہ ملتا ہے اور اسی زمانے میں انھیں زندگی میں شریک ہونے کی تیاری کرنی پڑتی ہے یعنی یہ بات اتنی صحیح نہیں ہے کہ جانور کھیلتے ہیں جب تک وہ چھوٹے رہتے ہیں جتنی کہ یہ بات کہ وہ جب تک چھوٹے رہتے ہیں اُن کے لئے کھیلنا ضروری ہے تاکہ وہ بڑے ہو کر زندگی کے اہم اور سنجیدہ کاموں کے لئے اپنے کو تیار کر سکیں۔"

گروس کا یہ کہنا کہ جانور کھیل کے ذریعے اپنی روزمرہ کی زندگی کو مکمل بناتے ہیں بجا ہے لیکن انسان کے کھیل کو اس زاویہ نظر سے دیکھنا زیادہ مناسب نہ ہوگا۔ اول تو بچوں کے بہت سے کھیل مثلاً آنکھ مچولی یا دھوپ چھاؤں ایسے ہیں جنھیں نہ بالغ العمر لوگوں کی زندگی کی نقل کہا جا سکتا ہے اور نہ اُن سے کسی قسم کی ذہنی یا جبلّی تربیت مقصود ہو سکتی ہے۔ اس باب میں گروس کا نظریہ صرف اسی حد تک قابل قبول ہے جہاں تک کھیل انسان کے جسمانی نشوونما میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ پھر بچّے کی جملہ حرکات و سکنات کو زندگی کے کاروبار کی نقل سمجھنا یہ ثابت کرنا ہے کہ بچّہ اپنی تمام عمر احمقوں کی جنت میں بسر کرتا ہے۔ حالانکہ بچّے کی زندگی اپنی جگہ خود ایک مکمل اور جامع زندگی ہے۔ بچہ نہ صرف اپنی جگہ ایک پوری شخصیت کا مالک ہوتا ہے بلکہ وہ انتہا درجے کا خوددار اور حساس بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اگر وہ ایسے کھیل کھیلتا بھی ہے جو نقل کہے جا سکتے ہیں۔ (مثلاً چور اور سپاہی یا حاکم اور مجرم کے کھیل)، تو اس کا منشا، یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اپنی کم مائیگی کا اظہار کرے بلکہ وہ تو یہ دکھانا چاہتا ہے کہ وہ اس چھوٹی عمر میں بھی بڑوں کی دنیا اور بڑوں کے کاروبار میں کس حد تک عقل رسائی اور ہمت سے کام کر کے دکھا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بچہ ہمیشہ کھیل میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ طاقتور ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اگر کسی کہانی کو ڈرامے

کی شکل میں پیش کیا جائے تو اکثر بچے ہیرو کا پارٹ اپنے لئے پسند کریں گے۔ ایک روز شام کو ٹہل کر واپس آتے وقت برٹرنڈ رسل نے اپنے بچے سے کہا کہ ممکن ہے ہماری غیر موجودگی میں ہمارے گھر پر ایک مسٹر ڈلی ونکس کا قبضہ ہو چکا ہو۔ اور اب وہ شاید ہمیں گھر میں داخل نہ ہونے دے، یہ بات محض مذاق کی تھی۔ لیکن دوسرے ہی دن شام کو برٹرنڈ رسل کے بچے نے رسل صاحب کے مکان کے دروازے پر کھڑے ہو کر غصے کی آواز میں کہا "...... جائیے اس گھر میں مسٹر ڈلی ونکس کا قبضہ ہو چکا ہے اب یہاں کوئی داخل نہیں ہو سکتا!" یہی نہیں بلکہ بچہ دانستہ طور پر خوفزدگی کے اثرات کو بھی پسند کرتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک بچہ شیر کی طرح دھاڑنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا اس سے خوف کے وہ ہی اثرات لیتا ہے جو اصل شیر کی موجودگی میں ہو سکتے ہیں۔

کارل گروس کے نظریے میں جہاں تک جبلتوں کے اُجاگر ہونے کا تعلق ہے میک ڈوگل نے ایک ترمیم پیش کی ہے ان کا فیصلہ ہے کہ کھیل میں ہر جبلت اسی طرح کام نہیں آتی جس طرح وہ زندگی میں حقیقی مواقع پر کام آتی ہے۔ مثلاً کھیل کھیل میں جب دو کتے کے بچے لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو زخمی کرنے کی کوشش نہیں کرتے حالانکہ جب وہ سچ مچ لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے ہیں۔

اسی قدر دلچسپ نظریہ اسٹینلی ہال کا ہے اُن کے نزدیک کھیل ہمارے جبلی اور وراثتی اثرات کا ترجمان ہے۔ ہم کھیل کے ذریعے ان تمام منازل سے گذرتے ہیں جن سے ہمارے آباو اجداد ترقی کی موجودہ منزل تک پہنچنے میں گذر چکے ہیں۔ چنانچہ بچوں کا پیڑ پر چڑھنا اس عہد کی یادگار ہے جب انسان درختوں پر رہتا تھا اور بچوں کا چڑیوں پر پتھر پھینکنا اس بات کی جب انسان پتھروں سے واقعی جانوروں کا شکار کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر گروس کا خیال تھا کہ کھیل سے جبلتوں میں بھلا پیدا ہوتی ہے تو ہال کے نزدیک جبلت کھیل میں تسلی پا چکنے کے بعد زندگی میں کم زور پڑ جاتی ہے چنانچہ وہ انسان جو کھیل کے سلسلے میں اپنی جبلتِ خود پسندی کا دل کھول کر اظہار کر چکا ہو روزمرہ کی زندگی میں زیادہ خود پسند بننے سے احتراز کرے گا۔

یہ سب کچھ بجا سہی لیکن ہم یہ کیوں کر تسلیم کریں کہ دنیا کی تمام قوموں کا ارتقاء ایک ہی معیار کے مطابق اور ایک ہی رفتار کے ساتھ ہوا ہے۔ پھر ویزمین بڑی حد تک یہ بات طے کر چکا ہے کہ اکتسابی خصوصیات وراثتی طور پر منتقل نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے کھیل کے دوران میں ہمارا ان منازل سے گذرنا جنھیں انسان ارتقا کے سلسلے میں نہ معلوم کب طے کر چکا ہے۔ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

حال کے نظریئے کے آخر الذکر پہلو کے ساتھ ساتھ ارسطو کی پیش کردہ "تزکیہ جذبات" کے نظریہ کا ذکر بھی لازمی ہے۔ اس نظریے کے مطابق کھیل ایک safety valve کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے انسان کے وہ جذبات جو سماج کے لئے ضرر رساں ہو سکتے ہیں صرف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کشتی، مکا بازی وغیرہ قسم کے کھیل انسان کو غصہ وغیرہ تکلیف دہ عادات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

گروس اور کلاپرید دونوں نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ کھیل میں جبلت کے استعمال کے بجائے وہ جذبہ صرف ہو جاتا ہے جو جبلت سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو غصے کی حالت میں کھانے کی پلیٹ توڑ کر یا کمرے کے دروازے کو زور سے بند کر کے باہر چلے جانے سے تسکین ہو جاتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے ایڈرینالین (وہ زہریلا مادہ جو ایڈرینالین غدود سے خارج ہوتا ہے اور غصّے کا محرک بنتا ہے) صرف ہو جاتا ہو اور انسان کو غصے کے خطرناک نتائج سے بچا لیتا ہو۔

مس اپلٹن نے بھی ۱۹۱۰ء میں کھیل کی ایک توضیح پیش کی تھی۔ یہ توضیح نئی ضرور ہے لیکن سقم سے خالی نہیں۔ اُن کے نزدیک کھیل بڑھتے ہوئے جسم کا ایک جائز تقاضا ہے۔ یہ نظریہ ممکن ہے بچوں کے کھیل کی کوئی مناسب تشریح ہو۔ لیکن بڑوں کے کھیل سے اس کا زیادہ لگاؤ نہیں ہو سکتا۔

یہ چند وہ نظریے تھے جو ماضی نے ہم تک پہنچائے ہیں۔ ہمارے لئے ان میں سے کوئی

ایک نظریہ بھی مکمل اور جامع نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ سب نظریے ایک دوسرے کی مدد سے کھیل کی پوری پوری نفسیاتی اہمیت کو واضح کرتے ہیں اور ان کے ذریعے ہم مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔

انسان بالطبع نشو و نما کی صلاحیت لے کر پیدا ہوا ہے اور حرکت اس کی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عمر اور جسمانی حالتوں کا اثر فعالی کی نوعیت پر ہمیشہ پڑا ہے اور پڑے گا۔ پھر کھیل کے ذریعے انسان اکثر اپنے ان خوابوں کو بامعنی بنالیتا ہے جو کبھی اس کے لئے بے تعبیر تھے۔ ممکن ہے وہ شخص جو شطرنج کے کھیل میں ہار جیت پر جان دیتا ہے کبھی زندگی میں فتح کا یقین رکھنے کے جواب میں شکست کھاچکا ہو یا حقیقی زندگی میں وہ اپنے آپ کو کسی کمزوری کے باعث دوسروں پر فتح یا قابو پانے کا اہل نہ پاتا ہو۔ ڈراموں اور ناولوں سے وابستگی پیدا ہو جانے کا راز ہی یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو کسی مفروضہ کردار میں دیکھنے لگتا ہے۔

کھیل کے متعلق اس قدر نفسیاتی تحقیق و انکشاف سامنے آچکنے کے بعد اس کی تعلیمی اہمیت کو تسلیم کرلینا لازمی ہے۔ کھیل کی سب سے بڑی اور عالم گیر خصوصیات خوشی اور آمد ہیں۔ چنانچہ ہمارا استاد اسی وقت کامیاب بن سکتا ہے جب وہ بچوں کے تعلیمی کام کو مشقت کی سطح سے بلند کر کے اس سطح پر لے جائے جہاں بچے اپنے کام میں اسی خوشی کے ساتھ حصہ لے سکیں جس خوشی کے ساتھ وہ کھیل میں شریک ہوتے ہیں۔ بچوں کی زندگی کا بیشتر حصہ کھیل میں گذرتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ کھیل کو اُن کی تعلیم کا مرکز نہ بنایا جائے۔ کھیل کو ایک مستقل طریقۂ تعلیم بنا کر روشناس کرانا فروبل کا کام تھا۔ اس کے یہ الفاظ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

"سبق جو کھیل سے اور کھیل کے ذریعے دیئے جائیں۔ جو زندگی سے اور زندگی کے ذریعے دیئے جائیں وہ بذات خود بھی سب سے زیادہ موثر، آسان، سہل الفہم اور ترقی بخش ہوتے ہیں اور طالب علم پر بھی واقعی اثر کرتے ہیں۔"

گڑیاں ہی لیجئے۔ چھوٹے بچوں کے لئے کھیل کا کھیل ہیں اور کام کا کام۔ پہلے گڑیاں بنیں گی پھر اُن کے لیے کپڑوں کی ضرورت محسوس ہوگی۔ پھر گڑیوں کے لئے گھر چاہیے اور گھر کے لئے چھوٹی چھوٹی میز کرسیاں اور کھانے کے چھوٹے چھوٹے برتن چاہئیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک گڑیا کی ضرورتیں ایک "گڑیا خاندان" کی ضرورتیں بن جاتی ہیں۔ اور اس طرح بچہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں سماجی حقوق سمجھنے لگتا ہے۔ گڑیوں کی تقریبیں ہوتی ہیں۔ گڑیاں بیمار پڑتی ہیں، گڑیاں مرتی ہیں، گڑیاں ایک دوسرے کے یہاں جاتی ہیں۔ گڑیاں سیر و تفریح کی غرض سے بچے کی دنیا میں دور دور مقامات کا سفر کرتی ہیں۔ یہ تمام مشاغل وہ ہیں جو چھوٹے بچوں کے لئے زبان، حساب، مقامی جغرافیہ، سائنس اور سماجی علوم کا مرکز بن سکتے ہیں "یہ گڑیا ہے"، "یہ گڑیا کا گھر ہے" وغیرہ قسم کے جملوں سے زبان کی ابتدا کریں گے۔ حساب کے سلسلے میں گنتی، جوڑ، گھٹانا۔ گڑیوں کے کپڑے۔ گڑیوں کے برتن، اور گڑیوں کی میز کرسیاں وغیرہ سب ذریعہ تعلیم بن سکتی ہیں گڑیوں کے گھر کے سلسلے میں انھیں بتایا جا سکتا ہے کہ گھر کی انسان کو ضرورت کیوں پیش آئی اور انسان گھر کے علاوہ موسم کے اثرات سے بچنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرتا ہے۔ گڑیاں وقت پر سوتی جاگتی ہیں اور وقت پر کھاتی پیتی ہیں۔ یہاں صحت کے اصول آجاتے ہیں۔ الغرض اسی طرح بچوں کا پورا ابتدائی نصاب اُن کے کھیل کے ذریعے انھیں سکھایا جا سکتا ہے۔ میڈم مانٹوسری کا طریقہ تعلیم بھی کھیل کے متعلق انھیں انکشافات پر مبنی ہے۔ بچہ اُستاد کی زیر نگرانی اپنا راستہ اپنے آپ تلاش کرتا ہے۔ اپنے ذوق کے مطابق چیزوں کو پسند کر کے خود ہی اُن کی اچھائیوں اور برائیوں کو محسوس کرتا ہے اور بالآخر عزّت نفس، خودداری، خود اعتمادی۔ الغرض رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ سب کچھ سیکھ جاتا ہے جو درجوں میں بیٹھ کر کتابیں رٹنے والے بچوں کو کبھی میسر نہیں آتا۔ ڈاکٹر مانٹوسری کے اس خیال سے نہ صرف پروفیسر نَن جیسی ہستیوں نے موافقت کی ہے بلکہ برٹنڈرسل نے خود اپنے بچے کی مثال پیش کر کے اس ضبط و تادیب پر حیرت ظاہر کی ہے جو اُن کے بچے میں اس طرح بغیر کسی دباؤ کے پیدا ہوگئی۔

ذرا اور بڑے بچوں کے کھیل مختلف ہوتے ہیں وہ تاریخ کے واقعات کو رٹنے کے بجائے ڈرامے کے ذریعے دلچسپ بنا کر اپنا لیتے ہیں۔ ان بڑے لوگوں کے لئے کھیل ہی کو مدنظر رکھتے ہوئے مسٹر آرم سٹورنگ نے انکشافی طریقہ تعلیم کی داغ بیل ڈالی تھی۔ طالب علم ایک محقق کی حیثیت سے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے تجربے کرے اور ان سے اپنے نتیجے نکالے۔

خود وردھا اسکیم کا سب سے زیادہ نیاپن اور باا ثر ہونا اس بات میں ہے کہ اس نے تعلیم کا وہ طریقہ تجویز کیا ہے جو بچے کے فطری تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ سات سال سے چودہ برس تک کی عمر کے بچوں میں فطری طور پر یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ کچھ چیزیں بنائیں اور کچھ چیزیں توڑیں۔ کھیل میں بچے کے اسی فطری ذوق وشوق کی پذیرائی ہوتی ہے۔ لیکن ہم اپنی اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے کھیل کو محض سعی لاحاصل بنانے کے بجائے ایک ایسے حرفے کی شکل دیتے ہیں جو ایک طرف اگر امیری اور غریبی کا فرق مٹا دے تو دوسری طرف تعلیم کو کسی حد تک خود پرور بنا دے۔ ملک میں آج بھی ایسے لوگ بے شمار ہیں جو کہتے ہیں کہ حرفہ بچوں سے ناروا مشقت لینے کا آلہ بن جائے گا۔ لیکن ایسا کہنے والے وہ لوگ ہیں جن کے پاس پہننے کو ضرورت سے زیادہ کپڑے اور کھانے کو ضرورت سے زیادہ کھانا موجود ہے اور جو آرام کرسی پر بیٹھ کر دنیا اور زندگی کو رنگین نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

کھیل کے ذریعے صرف نصاب کا پورا کرنا یا نہ کرنا ہی ناممکن نہیں ہے بلکہ کھیل اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا آلہ بھی بن سکتا ہے۔ یوں کوئی فراز محراب و منبر سے لاکھ پند و نصائح کی بارش کرے۔ لیکن نتیجہ کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا مصداق ہوگا۔ بوائے اسکاؤٹس کی تحریک کی اصلی بنیاد ہی یہ ہے۔ کھیل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بچے قانون کے اندر رہ کر آزاد رہنا سیکھتے ہیں اور مسٹر گارڈنر کے ان الفاظ کی حقیقت کو پہنچ جاتے ہیں۔

"آزادی محض ذاتی معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک سماجی معاہدہ ہے۔"

ڈیوی صاحب نے کھیل کے طریقہ تعلیم کے متعلق دو اندیشے ظاہر کیے ہیں۔ اول یہ کہ بچے

بڑوں کی نقل کرتے کرتے قدامت پسندی کی طرف مائل ہو سکتے ہیں اور دوئم اسی بنا پر ان میں غلط طریقوں اور غلط عادات کے پیدا ہو جانے کا بھی امکان ہے۔ لیکن یہاں ڈیوی صاحب استاد کے فرض کو نہ معلوم کیوں نظر انداز کر گئے ہیں بچہ کتنی ہی آزادی کے ساتھ اپنا کام کرے لیکن اس کا ماحول بہر طریق اُستاد کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مانٹوسری نے اُستاد کو ایک تماشائی کی حیثیت دی ہے لیکن ان کا یہ ہرگز مقصد نہیں تھا کہ اُستاد ایک غیر ذمہ دار تماشائی کی حیثیت اختیار کرلے بلکہ اسے بچے کے پاس مدد کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد جدید کے اُستاد کی ذمہ داریاں بڑھتی جارہی ہیں اور وہ بجائے ایک ملازم پیشہ چوکیدار کے "فلاسفر، رہبر، اور دوست"، والی حیثیت کا مالک ہو چلا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا یہ کہنا کہ اچھے استاد کی کتاب زندگی کا عنوان علم نہیں محبت ہے، اس حقیقت کی تائید میں ہے اور اس لئے ہمارا نصب العین ہی برنارڈ شا کے الفاظ میں اُس مدرسے کی تخلیق ہونا چاہیئے جہاں

"کام کھیل ہے اور کھیل زندگی، ایک میں تینوں اور تینوں میں ایک۔"

کسی کی کہانی چاندنی کی زبانی

(اختر انصاری صاحب بی اے آنرز)

یہ پچھلی رات کی سرگزشت ہے۔

میں نے اپنا طویل سفر شروع کیا۔ سنسان جنگلوں اور وسیع میدانوں میں نور کی بارش کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ میرے رُخِ انور کی ضیا پاشیوں سے زمین کا ذرہ ذرہ جگمگا اُٹھا۔ جہاں راتوں کو ہولناک تاریکیاں چھائی رہتی ہیں وہاں میں نے طور کے جلوے بکھیر دئے۔ جن فضاؤں پر قبرستان کا سناٹا طاری رہتا ہے اُن میں لطیف و نازک موسیقی کی لہریں دوڑا دیں۔ مہیب درختوں اور گھنی جھاڑیوں کے قدموں میں سیّال چاندی کے دریا بہا دیئے۔ میری چال اٹھلائی ہوئی تھی۔ میری ادائیں مستانہ تھیں۔ میرا نکھار نظر افروز تھا۔ مہینے کی چودھویں تاریخ تھی اور دنیا جانتی ہے کہ چودھویں رات کو میری سج دھج میری چمک دمک، اور میرے حسن کا بناؤ انتہائی دلفریبی اور پاکیزگی کا نمونہ پیش کرتا ہے خیر، جنگلوں اور میدانوں کو عبور کرتی ہوئی آگے بڑھی تو آم کے مہکتے ہوئے باغوں میں داخل ہوئی۔ سوئے ہوئے درخت جاگ اُٹھے اور پتے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ کوئل نے کوکنا شروع کیا۔ اس کا چوٹ کھایا ہوا دل میرے شباب کی بہار دیکھ کر تڑپ اُٹھا اور وہ بے قرار ہو ہو کر اپنا دکھ بھرا گیت الاپنے لگی۔ ساری فضا اُس کے نشتریں نغموں سے معمور ہو گئی۔ یہ میری موجودگی کا اثر تھا، ورنہ کوئل کی کوک میں یہ دلگداز کیفیت اور یہ نشتریت کہاں! خود میں نے کوئل کی فریاد سے کوئی اثر نہ لیا۔ معشوقانہ بے نیازی اور محبوبانہ بے التفاتی کے ساتھ اپنے سفر کو جاری رکھا۔ تھوڑی دیر جھیل کی سطح پر رقص کیا اور موجوں کی آغوش میں جھُولا جھُولا۔ پھر سرسوں کے لہلہاتے ہوئے

کھیتوں میں پہنچ گئی۔ بسنت پھولی ہوئی تھی اور دُور دُور تک پیلے پیلے پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے بازو پھیلا دیئے اور ان گلزاروں کو اپنی نور بھری آغوش میں لے لیا۔ میری سیمنیاں پھولوں کی رنگت میں پیوست ہوگئیں اور ایک عجیب دلکش سماں بندھ گیا۔ میں اپنے حُسن کو اسی طرح لٹاتی ہوئی چلی جارہی تھی کہ تمدن اور انسانی آبادی کے آثار نمودار ہوئے ـــــ مصنوعی نہریں، بجلی کے تار اور کھمبے، فیکٹریاں اور کارخانے، پھونس کے جھونپڑے، کچے پکے مکانات اور کہیں کہیں عالیشان کوٹھیاں! میں ان سب کو نور میں نہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اب میں شہر کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی۔ اٹھلاتی، جھومتی، مستی بکھیرتی اور نور چھلکاتی چلی جارہی تھی کہ سامنے درختوں کی آڑ میں مجھے اپنے پرستار شاعر کا دومنزلہ مکان دکھائی دیا۔ بالاخانے پر جو نظر پڑی تو دیکھا کہ کھڑکی کھُلی ہوئی ہے۔ دل اُچھل پڑا۔ چھاتی دھڑکنے لگی اور رُوح میں ارتعاشں پیدا ہوگیا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا، "چاندنی! آج تو تمھاری قسمت جاگ اُٹھی۔ کھڑکی کھُلی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمھارا شاعر واپس آگیا"

یہ کھڑکی تقریباً ایک سال سے بند تھی۔ میں ایک سال تک اپنے حسن کی مکمل آراستگی کے ساتھ آتی رہی اور یہاں سے ناکام لوٹتی رہی۔ میں نہایت اشتیاق کے ساتھ چھم چھم کرتی ہوئی آتی، درختوں میں سے جھانک کر کھڑکی کی طرف دیکھتی، اور جب اس کو بند پاتی تو افسردہ ہوجاتی اور اپنے سیمین ہاتھوں سے کھڑکی کی بلائیں لے کر ٹھنڈے سانس بھرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔

یہاں ایک شاعر رہا کرتا تھا۔ وہ میرا پرستار تھا۔ میری صباحتوں پر جان دیتا تھا۔ اس کو میرے جلوۂ سیمین کے ساتھ عشق تھا۔ جن راتوں کو میری آب وتاب معمول سے زیادہ ہوتی، خصوصاً چودھویں رات کو، میں کھڑکی کے راستے سے دبے پاؤں اُس کے

کمرے میں داخل ہو جاتی۔ وہ فرش پر بیٹھا ہوا مصروف مطالعہ نظر آتا۔ اس کے چاروں طرف کتابیں بے ترتیبی کے ساتھ پڑی ہوتیں۔ میں اندر پہنچ کر اپنی ساری آب و تاب اُس پر نچھاور کر دیتی اور خود اُس کے قدموں میں لوٹنے لگتی۔ وہ کتاب ہاتھ سے رکھ دیتا اور کمرے کی مصنوعی روشنی کو گُل کر دیتا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو جاتا۔ محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا۔ اس کے دل کی ساری بے چینی، اس کی روح کی ساری تڑپ اُس کے سارے شاعرانہ جذبات سمٹ کر اُس کی آنکھوں میں آ جاتے۔ کبھی وہ فرش پر دراز ہو جاتا، گویا مجھ سے ہم آغوش ہو جانا چاہتا ہے۔ کبھی گنگنانے لگتا۔ اور کبھی قدرے بلند آواز سے ایک سحر آفریں دھن میں گانے لگتا۔

فلک سے نور بھرے نغمے لنڈھا رہا ہے چاند — میں صبحِ خُلد نہ لوں ایسی رات کے بدلے

ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا — تجھ پر تو اِک قیامت عہدِ شباب لایا

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو — رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

وہ ان شعروں کو اس قدر سوز و گداز کے ساتھ گاتا کہ میں اپنی روح میں ایک تموّج اور ایک اہتزاز محسوس کرتی اور میرا سارا وجود مترنم ہو جاتا۔

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ وہ گاتے گاتے اپنی بیاض نکال لیتا اور اس میں سے وہ اشعار پڑھنے لگتا جو اس نے میرے حسن کی تعریف میں لکھے تھے۔ میری محبت شاید اس کی سرشت میں داخل تھی، کیونکہ اُس کی قوتِ شعری کا بڑا حصہ میرے لئے وقف تھا اور میں اس کے شاعرانہ نغموں کے بہترین اجزا پر قابض تھی۔ وہ میرے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار

کیا کرتا تھا۔

چاندنی ایک آگ ہے، پگھلی ہوئی، سرد، اور بھیگی ہوئی! یہ میری سلگتی ہوئی جوانی کی ٹھنڈک ہے کاش میں اس کو سمیٹ کر اپنے سینے میں رکھ سکتا!

اگر چاندنی کے سوا کائنات کی تمام دلفریبیاں ختم ہو جائیں تب بھی یہ دنیا حسین کہلانے کی مستحق ہو گی!

دن کی روشنی، مزدوروں اور سرمایہ داروں کے لئے ہے۔ اور چاندنی؟ یہ شاعروں افسانہ نویسوں عشق پسند اور خیال پرست لوگوں کے لئے خلق کی گئی ہے۔

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ کائنات عمر خیام کا ایک خواب معلوم ہوتی ہے۔ بدبخت ہی وہ انسان جو ایسی رات سو کر گزار دیتا ہے!

چاندنی ایک موسیقی ہے، سہانی، نرم اور معطر! یہ صرف درد مند لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے۔

چاندنی ایک شراب ہے، روپہلی، نورٖیں اور دمکتی ہوئی! کاش میں اس شراب سے اپنا جام بھر سکتا!

یہ اور اس قسم کے خیالات وہ میرے متعلق اپنے اشعار میں پیش کیا کرتا تھا۔ جب وہ ان اشعار کو گاتا تو میں مست ہو جاتی اور جھومنے لگتی۔ یہ اس کا نذرانۂ محبت تھا اور میں اس کو بصد شوق قبول کرتی۔

لیکن کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ اشعار گانے چھوڑ دیے۔ اب زیادہ تر ایسے شعر اس کے ورد زبان رہنے لگے جو ایک والہانہ شیفتگی اور ایک پرجوش جذبۂ عشق کے آئینہ دار ہوتے تھے مثلاً

شعر ہو، نغمہ ہو، بہار ہو تم　　　رشک کرتی ہے مجھ پہ اک دنیا

نظر گلرنگ، عارض لالہ گوں، زلفیں شمیم انگیز
خدا آباد رکھے اِس جوانی کے گلستاں کو

آئینۂ نگاہ میں عکسِ شباب ہے
دنیا سمجھ رہی ہے کہ آنکھوں میں خواب ہے

سرِ زانو پہ ہو اُس کے اور جان نکل جائے
مرنا تو مسلّم ہے، ارمان نکل جائے

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

صرف یہی نہیں کہ وہ ان اشعار کو گایا کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی تبدیلیاں مجھے اُس کے اندر نظر آئیں۔ اس کی جوانی کا روپ پہلے سے زیادہ نکھر گیا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوگئی — ایک لوچ، ایک رسیلا پن، ایک آرزومندانہ کیفیت! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح آنکھوں میں سے جھانک رہی ہے اور کسی کی پرستش کے لئے بے قرار ہے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اُس کو کسی سے محبت ہوگئی ہے، وہ کسی کا فرادا کی زلفِ سیاہ کا اسیر ہوگیا ہے، کسی ساحرہ کا جادو اُس پر چل گیا ہے۔

اور میرا یہ خیال غلط نہ تھا۔ کیونکہ ایک رات جب میں اُس کے کمرے میں گئی تو میں نے دیکھا کہ اُس کے قریب ایک چھوٹی سی گول میز پر ایک دوشیزہ کی تصویر رکھی ہوئی ہے۔ یہ تصویر ایک نہایت نازک اور خوبصورت فریم میں جڑی ہوئی تھی اور یقیناً حسنِ نسوانی کا ایک نادر نمونہ پیش کر رہی تھی۔ آنکھیں شباب کی مستی سے لبریز تھی اور اُن سے نشہ برس رہا تھا۔ گویا شراب کے دو خُم ہیں کہ لُنڈھائے جا رہے ہیں! ہونٹوں سے تبسم کا ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا جس سے سارا چہرہ شاداب تھا۔ تصویر کا ہے کو تھی لطافت اور رعنائی کا ایک دلآویز خواب تھی!

"تو واقعی شاعر محبت میں مبتلا ہے۔" میں نے اپنے دل میں کہا، "اور یہ ہے وہ زہرہ جمال جس نے اُس کے دل کو مسحور کیا ہے، جس کی یاد میں وہ مزے لے لے کر عشق بھرے شعر گایا کرتا ہے۔"

اتنے میں شاعر نے میز پر سے تصویر اُٹھائی اور اُسے ہاتھ میں لے کر اس طرح دیکھنا شروع کیا جس طرح کوئی آئینہ دیکھتا ہے۔ اُس وقت وہ اپنی آنکھوں سے صاف یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا، "مجھے تم سے محبت ہے! میں سراپا آرزو ہوں! میں اشتیاق کی دنیا ہوں"! اور جب آنکھیں محبت کا پیغام پہنچا چکیں تو اس نے یہ شعر گایا اور کچھ اس طرح تڑپ کر گایا کہ میں اپنی نیم مدہوشانہ حالت سے چونک پڑی اور فضا میں ایک بجلی سی کوند گئی:۔

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر نگاہِ شوق! اس مضمونِ رنگیں کو ادا کر دے

یہ نغمہ ابھی فضا میں گونج ہی رہا تھا کہ اُس نے بے اختیار اپنا منہ تصویر پر رکھ دیا۔

"چاندنی! تمھارا پرستار اس دوشیزہ کو دل و جان سے چاہتا ہے"، میں نے اپنے آپ سے کہا میں رشک و حسد جیسے انسانی جذبات سے عاری ہوں۔ اس لئے شاعر کی محبت کا راز معلوم کر کے میں بالکل رنجیدہ نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے مسرت کا ایک بے لوث جذبہ اپنی رگ و پے میں سرایت کرتا ہوا محسوس کیا۔ "میری خوشی تو اسی میں ہے کہ میرا پرستار خوش ہو گا میں نے اپنے دل میں خیال کیا،" پھر اگر وہ ایک دوشیزہ کے عشق میں راحت اور مسرت کا سامان پاتا ہے تو میرے نزدیک اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

چنانچہ جوں جوں شاعر کی فریفتگی بڑھتی گئی میری مسرت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ میں اُس کے کمرے میں جاتی۔ وہ محبت بھرے نغمے الاپتا۔ تصویر سے باتیں کرتا اور اس کو بار بار چومتا۔ میں یہ سب کچھ دیکھا کرتی اور اپنے ابدی سکون کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی طمانیت کے مزے لوٹا کرتی۔

ایک رات میں اُس کے کمرے میں پہنچی تو اس کو بہت افسردہ اور مغموم پایا۔ کمرے کی روشنی پہلے ہی سے گل تھی اور وہ تکیوں میں اپنا چہرہ چھپائے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ جب اُس کو میری موجودگی کا احساس ہوا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور بے معنی نگاہوں کے ساتھ کھڑکی کے باہر دور کسی چیز کو تکنے لگا پھر اُس کی نظریں میز پر رکھی ہوئی تصویر کے اوپر جم گئیں۔ آج وہ تصویر کو میز پر سے اُٹھاتے ہوئے

جھجھک رہا تھا۔ گویا کوئی چیز ہے جو دونوں کے درمیان حائل ہو گئی ہے۔ دور سے بیٹھا حسرت کے ساتھ اُس کو دیکھتا رہا اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا۔ اُس کی سرد آہوں سے میرے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی اور مری روح تھرتھرا اُٹھی۔ پھر اُس نے نہایت دردناک لے میں یہ شعر گایا:-

مرے دھڑکتے ہوئے دل پہ ہاتھ رکھ دے کوئی   کہ آج تھوڑی سی تسکین چاہتا ہوں میں

جتنی دیر میں وہاں رہی وہ اس شعر کو گاتا رہا اور سرد آہیں بھرتا رہا۔

اب جب بھی میں جاتی اُس کو اسی سوگوار کیفیت میں ڈوبا ہوا پاتی۔ وہ اشعار بھی جو کچھ دنوں سے اُس کی زبان پر رہتے تھے اور جن کے ذریعے وہ اپنے ولولۂ عشق کا اظہار کرتا تھا اُس نے گانے چھوڑ دیئے۔ اب اگر وہ کبھی گاتا بھی تو صرف ایسے شعر گاتا جن میں فراق کے صدموں کا ذکر ہوتا۔ مثلاً

کیا قہر ہی جدائی جب چاندنی کھلی ہو   آنکھوں سے رات پیہم ٹوٹا کیئے ستارے

جوانی اور ہنگاموں سے خالی   یہ جینا ہے، یہ کوئی زندگی ہے!

چاندنی اور اداس تنہائی!   تم ہو کس حال میں خدا جانے

ایک دن اس آخری شعر کو گاتے گاتے اُس کا دل بھر آیا اور آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ پھر وہ کچھ اس طرح بیتاب ہو کر رویا کہ آنسوؤں کے دریا بہہ گئے۔ گویا ایک چھائی ہوئی گھٹا تھی کہ یکایک برس پڑی۔

اُدھر چند دن سے جو اُداسی اور غمگینی اُس پر طاری تھی وہ میرے لئے ناقابلِ فہم نہ تھی۔ اور اس گریۂ بے اختیار کا سبب بھی میں سمجھ سکتی تھی۔ صورتِ حال سے صاف ظاہر تھا کہ اُس کو محبت کی ناکامیاں ستا رہی ہیں اور جدائی کے صدمے خون رُلا رہے ہیں۔ البتہ یہ سمجھنا میرے لئے مشکل تھا کہ یہ ناکامیاں کیوں ہیں اور اِن جدائی کے صدموں کا باعث کیا چیز ہے۔ یا تو دوشیزہ نے اُس کی

محبت کو ٹھکرا دیا تھا، اور یا خارجی حالات کے سبب سے محبت کے راستے میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہو گئی تھیں۔ بہر حال شاعر کی فراق زدگی ایک روح فرسا اور ناقابلِ انکار حقیقت تھی۔

اور اب جو میں نے اس کو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا تو میں بلبلا اٹھی۔ میرا دل اس کی تکلیف کے احساس سے پاش پاش ہو گیا۔ اگر خدا نے مجھے زبان دی ہوتی تو اُس وقت میں شاعر سے کہتی "میرے پرستار! میرے محبوب! تو دل تنگ نہ ہو۔ میں دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سفر کرتی ہوں۔ ہر جگہ جاتی ہوں اور ہر مقام کی سیر کرتی ہوں۔ دنیا کی کوئی مہ جبیں میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ دوشیزائیں بھی جو حرم کی چار دیواری میں مقید ہیں اور سورج کی روشنی سے پردہ کرتی ہیں، میرے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہیں۔ میں تیری محبوبہ کو کہیں نہ کہیں ڈھونڈ ہی لوں گی، کسی نہ کسی دن ضرور اس کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ اور جب وہ مجھے مل جائے گی تو اُس کو اپنی روپہلی چادر میں لپیٹ لوں گی، اس کے چاروں طرف اپنے نور کا جال بچھا دوں گی۔ اور تیری محبت کا پیغام اُس تک پہنچاؤں گی۔ تیری آہوں کا سوز، تیرے آنسوؤں کی موسیقی، تیرے اندوہناک نغموں کا گداز، تیری بے خواب راتوں کی بے چینیاں، تیرے دل کی جلن، تیری روح کی تپش، ان تمام چیزوں کو لے جا کر اُس کے قدموں میں ڈال دوں گی۔ وہ ضرور متاثر ہو گی۔ یقیناً تیری محبت کا جواب محبت سے دے گی۔ پھر یہ جدائی کے صدمے نہ رہیں گے یہ محرومیاں اور یہ الم نصیبیاں ختم ہو جائیں گی۔ میرے محبوب! تو دل تنگ نہ ہو!" یہ سب میں اُس سے کہتی اور اس طرح اُس کو تسکین دیتی۔ مگر افسوس میں منطق سے محروم ہوں۔ میرے مرمریں ہونٹوں پر سکوتِ دوام کی مہر ثبت کر دی گئی ہے۔ میں اُس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ بیکسی کے ساتھ اُس کو روتا ہوا دیکھتی رہی اور جب روانگی کا وقت آیا تو اسی حالت میں اُس کو چھوڑ کر چلی آئی۔

اگلے دن اُدھر سے میرا گذر ہوا تو کھڑکی بند تھی۔ میں دیر تک کواڑوں کا سہارا لئے کھڑی رہی لیکن کھڑکی نہ کھلی۔ آخر کار مایوس ہو کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔

اس طرح تقریباً ایک سال تک کھڑکی بند رہی۔ میں بدستور ماہ بماہ ادھر سے گزرتی رہی اور

برابر اس سوال پر غور کرتی رہی کہ شاعر یکایک کہاں چلا گیا اور کیوں چلا گیا۔ اس کے علاوہ یہ امید بھی برابر میرے دل میں رہی کہ ایک نہ ایک دن کھڑکی ضرور کھلے گی اور میں ضرور اپنے پرستار کو دیکھوں گی۔

چنانچہ گزشتہ رات جب میری نظر کھڑکی پر پڑی اور میں نے اُس کو کھلا ہوا پایا تو میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ میں اپنی اس وقت کی خوشی اور گھبراہٹ کو بیان نہیں کر سکتی۔ بہرکیف دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھی اور کھڑکی کے راستے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

شاعر موجود نہ تھا۔ لیکن وہ دودھ جیسا سفید فرش بدستور بچھا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ چھوٹی گول میز بھی اپنی جگہ پر تھی، اگرچہ اس پر سے وہ تصویر غائب تھی جو کبھی شاعر کے پرستارانہ جذبات کا مرکز تھی۔ کمرے کی ظاہری ہیئت تقریباً وہی تھی جس سے میں ایک سال پہلے تک واقف تھی۔ کوئی قابلِ ذکر تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ تاہم مجھے ماحول کے مختلف اجزا میں ایک خاص ترتیب اور خاص سلیقے کا احساس ہوا۔ کمرے کی آرائش میں ایک نسوانی ہاتھ کی کارفرمائی نظر آ رہی تھی۔ یہ شاعر کی سوگوار دنیا میں ایک خفیف مگر دلچسپ اضافہ تھا۔ میں اس پر غور کرتی ہوئی کمرے کے اندرونی حصے میں پہنچ گئی۔ یکایک میری نظر دوشیزہ پر پڑی جو ایک آرام دہ کرسی پر بے تکلفی کے ساتھ بیٹھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اس کمرے میں جہاں کبھی ایک تنہائی پسند شاعر کے سوا کسی دوسرے متنفس کو نہ دیکھا تھا، اس طرح ایک دوشیزہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میں اس تصادم کے لئے قطعی تیار نہ تھی۔ گھبرا سی گئی اور بدحواس ہو کر اُس کا منہ تکنے لگی۔ وہ میری موجودگی سے بالکل بے خبر تھی اور ایک دلربایانہ انداز میں مصروف مطالعہ تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور بسنت کے موسم کی لطیف ہوا کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ چہرہ کا سفید دمکتا ہوا رنگ نیلی ساڑی کی وجہ سے اور بھی دمک رہا تھا۔ گردن جیسے بلور کا ٹکڑا! عریاں سینہ جیسے آفتاب کی قاش، گوری کلائیاں جیسے سانچے میں ڈھلا ہوا نُور! اور پاؤں خدا کی پناہ! وہ اس قدر نازک

اور شفاف تھے کہ معلوم ہوتا تھا مرمر کو تراش کر بنائے گئے ہیں یا برف کے گالوں سے تیار کئے گئے ہیں۔

میں اس کے فردوس حسن کا نظارہ کر رہی تھی کہ مجھے اس کی آنکھوں میں اور ہونٹوں پر کسی ایسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا جس سے میں آشنا تھی۔ حافظے میں حشر سا برپا ہو گیا۔ گویا یاد کے پوشیدہ خزانے کھنگالے جا رہے ہیں اور نہاں خانۂ ماضی میں سے کوئی چیز کھود کر نکالی جا رہی ہے۔ لمحہ بھر یہ کاوش رہی۔ اور اس کے بعد گوہر مقصود ہاتھ آ گیا۔ میں اس حسن کی ملکہ کو پہچان گئی۔ اس کی آنکھوں کی مستی اور ہونٹوں کا تبسم، یہ دونوں چیزیں میں اس تصویر میں دیکھ چکی تھی جو ایک سال قبل تک شاعر کے سامنے میز پر رکھی رہتی تھی اور جس کو پوج کر وہ اپنے جذبہ پرستش کو آسودہ کیا کرتا تھا۔

میں خوشی کے مارے بیتاب ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "چاندنی! یہ شاعر کی محبوبہ ہے تمھارے محبوب کی محبوبہ! یہ وہی کافرہ ہے جس نے کبھی شاعر کے دل کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا، جو اُس کی زندگی کے پُرسکون دریا میں طوفان اور تلاطم بن کر آئی تھی۔ وہ اس کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ آخر کار اُس نے اس کو پا ہی لیا۔ کتنی حسین ہے یہ! اور شباب سے کس قدر بھرپور! یہ واقعی پرستش کے قابل ہے۔"

میں ان خوشگوار خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ شاعر کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اور آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے اُس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا اور اُس کے سامنے فرش پر لوٹنے لگی۔ ایک مرتبہ پھر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش خدا نے مجھے زبان دی ہوتی اور میں شاعر سے کہتی، "تم آ گئے؟ میرے پرستار! میرے محبوب! تم آ گئے؟ میں کتنی خوش ہوں! اور تم تنہا نہیں آئے بلکہ اپنی دل کی ٹھنڈک اور اپنی روح کے اُجالے کو بھی ساتھ لائے۔ تمھاری مراد بر آئی۔ تمھاری امیدوں کا دامن پھولوں سے بھر گیا۔ تمھاری آہیں اور تمھارے آنسو رائگاں نہ گئے۔ میں تمھیں مبارکباد دیتی ہوں۔ میں اپنی خوشی کا اظہار کرتی ہوں۔ آہ! میں کتنی خوش ہوں!"

میں اس کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی اور وہ خالی بے جان نظروں سے کھڑکی کے باہر دو

کسی چیز کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے کیف تھا اور جذبات سے عاری۔ آنکھوں میں وہ شرارے نہ تھے جو ایک سال پہلے تک پائے جاتے تھے۔ نہ ہونٹوں پر وہ تبسم کی بے قرار موجیں! وہ کسی الجھن میں مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یا شاید ان دنوں کو یاد کر رہا تھا جب اُس کی زندگی میں نہ محبت تھی نہ محبت کی تلخیاں اور شیرینیاں۔ بس ایک تڑپ تھی اور ایک بے چینی! اُس کا سرشار دل تھا اور چاندنی راتوں کی پُر رونق بہاریں!

دوشیزہ کرسی پر بیٹھی ہوئی مطالعے میں مصروف تھی۔ وہ شاعر کی موجودگی سے اسی قدر بے پروا تھی جس قدر میری موجودگی سے بے خبر۔ شاعر بھی اُس کی طرف کوئی توجہ نہ کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں کے تعلقات تکلف اور رسمیت کی تمام حدود کو توڑ چکے ہیں اور اُس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں التفاتِ باہمی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یکایک شاعر چونک سا پڑا۔ جیسے کسی خواب سے بیدار ہو گیا ہو۔ اس نے خشک لہجے میں دوشیزہ سے کہا "روشنی گل کر دو!" دوشیزہ نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا وہ اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھی ہے۔ بالآخر اس نے کہا "کیوں؟"

ایسا معلوم ہوا کہ کسی ساز کے ایک تار کو اتفاقاً مضراب چھو گئی۔ اور ایک ہلکا سا نغمہ فضا میں گونج کر رہ گیا۔ اُس کی آواز بے انتہا سریلی تھی۔

"اس لئے کہ میں کہتا ہوں" شاعر نے کڑک کر جواب دیا۔ آج میں نے اس کی آنکھوں میں ایک نیا شعلہ دیکھا ــــ غصے کی بھڑکتی ہوئی آگ! میں سوچنے لگی کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو ایک سال پیشتر اس عورت کی تصویر کو پوجتا تھا۔

دوشیزہ تقریباً ایک لمحہ بالکل ساکت رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھنجھلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے اور ہونٹ بے طرح کانپنے لگے۔ اس نے کتاب کو زور سے زمین پر دے مارا اور کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کا سارا بدن جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا۔

"اب تمھیں میرا پڑھنا بھی بُرا معلوم ہوتا ہے" اس نے کہا اور بے اختیار رو پڑی۔

"پڑھنا بھی بُرا معلوم ہوتا ہے۔" شاعر نے اُس کے لفظوں کو حقارت آمیز لہجے میں دہرایا۔ میں تمھیں پڑھنے کو کب منع کرتا ہوں! دوسرے کمرے میں جاکر نہیں پڑھ سکتیں؟"

"دوسرے کمرے میں!" دوشیزہ نے کہا، "اور اس کمرے میں کیا ہوا؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ مُجھے تیری صورت بُری معلوم ہوتی ہے۔"

شاعر نے جواب دیا" دیکھو مفت میں جھگڑا نہ کرو۔ میں اِس روز روز کی لڑائی سے تنگ آگیا ہوں۔ تم نے میری جان عذاب میں کردی۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ میری وجہ سے تمھاری جان عذاب میں آگئی ہے۔ تو پھر نکال باہر کرو نا! قصہ ختم ہو۔ تمھارا جی بھر گیا۔ اب کیا ضرورت ہے تمھیں میری!"

"پھر وہی! نکال باہر کرو! نکال باہر کرو! یہ کہنا خوب سیکھ لیا ہے۔ اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو کبھی کا کرچکا ہوتا۔ یہ جو سال بھر سے مصیبتیں جھیل رہا ہوں، اِدھر سے اُدھر مارا پھر رہا ہوں......"

"سال بھر سے مصیبتیں جھیل رہے ہو تو کیا میں نے تم سے کہا ہے کہ مصیبتیں جھیلو!"

"ہاں اور کیا! یہ سب تمھاری وجہ سے ہے۔ تم نے میری زندگی برباد کردی۔"

"اور میری زندگی برباد نہیں ہوئی؟ میں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑا۔ خاندان پر لات ماری۔ اپنی عزت گنوائی......" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کی آواز بھرّا گئی۔

"تم نے عزت گنوائی اور میں نے بڑی نیکنامی حاصل کی! میں نے سارے زمانے کی برائی مول نہیں لی؟ اپنے خاندان والوں کو دشمن نہیں بنایا؟ میں گھر سے بے گھر نہیں ہوگیا؟ سال بھر تک تمھیں سئے لئے پھرا۔ دنیا کی ٹھوکریں کھائیں......"

"اب اس سب کی ذمہ وار میں ہوں؟ میں نے اپنا سب کچھ اسی لئے قربان کیا تھا کہ جوتیاں کھاؤں! اے میرے اللہ! یہ میں نے کیا کیا!" یہ کہہ کر وہ کرسی پر گر پڑی اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

"روؤ! خوب روؤ! تمھیں اور آتا ہی کیا ہے!" شاعر نے کہا۔

"میرے اللہ! یہ میں نے کیا کیا! ــــ میرے اللہ یہ میں نے کیا کیا! ــــ" وہ یہ کہتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔

"اچھی طرح سے رولو۔ میں جاتا ہوں" شاعر نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر چلا گیا۔

دوشیزہ زور زور سے رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کمرے کی فضا میں نالوں سے ارتعاش پیدا ہو گیا۔

مجھ سے اس کا رونا نہ دیکھا گیا۔ میں اس کے گریۂ بے اختیار کی تاب نہ لا سکی۔ جس طرح دبے پاؤں کمرے میں گئی تھی اسی طرح دبے پاؤں چلی آئی۔

"میں اس کو صرف شاعر سمجھتی تھی۔ لیکن وہ پہلے مرد تھا اور بعد میں شاعر! آہ! یہ میں بھول گئی تھی،" میں یہ سوچتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

یہ پچھلی رات کی سرگزشت ہے!

ملک الشعراء ذوق

۳۔ قصائد

نور الحسن صاحب ہاشمی

ذوق کا نام در اصل ان کے قصائد کی وجہ سے زندہ ہے اور رہے گا۔ اس لئے نہیں کہ متوسطین میں سوائے ان کے اور کوئی ممتاز نظر نہیں آتا بلکہ اس لئے کہ ظفر شاہ کے دربار کے بگڑنے اور انگریزوں کے ساتھ واقعیت کی آمد نے گویا اس صنف ہی کو اڑا دیا ہے۔ اور اسی لئے ان کے قصائد کی تاریخی حیثیت ادب میں ہمیشہ اہم اور مسلم رہے گی۔

ذوق نے اپنے قصائد کی داغ بیل سودا کے قصائد پر ڈالی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ خود مختلف علوم میں دست گاہ رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ہی زبان پر قدرت۔ لیکن سودا کی سی پیچ اور آمد نہ تھی۔ سودا اساتذہ فارسی کے قصائد کا مطالعہ کر چکے تھے۔ ان کے قصیدوں پر قصیدے لکھ چکے تھے اس لئے اب ذوق کو دوبارہ اساتذہ فارسی کی تقلید کی ضرورت نہ تھی۔ لہذا سودا ذوق کے لئے اچھے دلی ہاتھ آئے۔ اس کے علاوہ اردو میں اس وقت تک دوسرے شعراء اس قدر اس صنف میں مشہور و معروف بھی نہ ہوئے تھے۔ دلی کے کوچہ و بازار سودا کے قصائد کی تعریف سے گونج رہے تھے۔ اسی لئے ذوق نے جو کچھ سیکھا اس میں زیادہ تر سودا کے تتبع سے سیکھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذوق سودا کے کئی معنوں میں شاگرد ہیں۔ حالانکہ سودا کا اشہب تخیل ذوق کے سمند تصور سے کہیں زیادہ بادپا ہے۔ وہ جتنی گہرائیوں میں جاتے ہیں، جتنی موشگافی

جوشِ زور اور نزاکتِ تخیّل دکھاتے ہیں وہ ذوقؔ سے بن نہیں پڑتی۔ کوشش کرتے ہیں اور بہت حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی وہ چھلاوہ پن وہ تیزی، طراری اور جولانی جو سوداؔ کے یہاں ہے ذوقؔ کو میسر نہیں آتی۔ ذوقؔ کے یہاں سوداؔ کی سی اپج بھی نہیں ملتی۔ برخلاف اس کے ترصیعی کام زیادہ ملتا ہے۔ سودا جگہ جگہ پر اجتہاد کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ برخلاف اس کے ذوقؔ صنائع و الفاظ کے پھیر میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔

مُقابلہ

تشبیہ و استعارہ

(سودا)

ہاتھی۔ کوئی کہتا ہے سمیٹے ہے کھڑی آپ کو رات | کوئی بولے ہے نہیں چہرے پہ دن کے ہے خال
برہمن اس کو تو گنیش دیوتا بولے | کہے ہے شیخ ہوا کعبہ رواں تعمیر
اس طرح دانتوں میں خرطوم ہے اس کے جیسے | موسم سردی کے ہوں کوتاہ دن اور رات دراز

(ذوق)

تیرے ہاتھی کی بلندی کی طرف کی جو نگاہ | سر پہ اندیشہ نے لی ہاتھ سے دستار سنبھال
کہکشاں کو وہ فلک پر سے زمیں پر پھینکے | نیشکر راہ میں مانگے اگر اس سے اطفال

"

تو جو محرابِ عماری میں ہوا جلوہ نما | اس کے دانتوں میں یہ خرطوم سے سوجھی تمثیل
خانۂ قوس میں خورشید جہاں تاب آیا | دن ہی کوتاہ ہوئے اور ہوئی رات طویل

(سودا)

تلوار۔ عرض میں سے دو طرف ہو کے لگے بہنے طول | پڑے سے دریا میں جو تفرقۂ انداز اُمل

ذوق

آب داری میں تری تیغ کہ ہے برق کی موج | کیا تماشا ہے کہ ہے آب سے آتشِ سیال

سودا

زلف یوں چہرے پہ بکھری ہوئی مانگے تھیں دل | جس طرح ایک کھلونے پہ ہیں دو بالک
ڈھیٹ وہ تیر کہ عالم میں نہیں جس کے پناہ | چشم وہ ترک کہ ہو قوم جنہوں کا ازبک
دونوں عارض گویا شیشے ہیں مے گلگوں کے | نہ نخ ان دونوں میں یوں جیسے نمکداں میں نمک
کمر اس کی میں نہ دیکھی کہ کروں اس کا وصف | تھی وہ اک آہوئے دل کیلئے چیتے کی لپک
بات اس لطف سے بکہے تھی دہن سو اس کے | بادہ جوں ساغرِ لبریز سے جاتا ہے چھلک
آگے تجھ بحرِ کرم کے صدفِ پرِ گوہر | مٹھی اس کی ہے جیسے نکلے بشدت چپک
تشبیب مجرہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک | دی دہیں آکے خوشی نے در دل پر دستک

ذوقؔ گلکاری زیادہ اچھی کرلیں گے لیکن سوداؔ کی سی مصوری نہیں کرسکتے اور غالباً یہ دونوں کے طبائع کا اثر ہے کہ ایک رند مشرب شخص ہے اور ایک عابد و زاہد ظاہر ہے کہ رند کی دنیا کس قدر لامحدود ہوتی ہے اور زاہد کی کس قدر محدود، اور یہ طبائع کا اثر ہر دو کے قصائد میں نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ سوداؔ کے یہاں جوش، جذبہ اور روانی ہے۔ ذوقؔ کے یہاں متانت، جزالت اور گرمیٔ تخیل کا میدان سوداؔ کا ہے لیکن مشق اور استادی

پوچھا میں کون ہو بولی کہ وہ میں ہوں غافل — نہ لگے شوق میں جس کے کبھو شائق کی پلک
ہے خوشی نام مرا میں ہوں عزیز دلہا — زندگانی کی حلاوت ہو جہاں میں جد تک
کھول آغوش دل اور لے مجھے جلدی نادان — پھر خدا جانے یہ دن کب تجھے دکھلائے فلک

گریز۔ بسنت خاں کی مدح میں ایک باغ کی تعریف کرتے ہوئے خود ہی سوال کرتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں۔

القصہ سن کے خوبی نے تاثیر سی کہا — جو مدعا ہو باغ سے کر اس کی گفتگو
بولی کہ مدعا تو یہی ہے کہ تا ابد — اس میں بسنت خان بہادر ہو اور تو

یا امام ضامن کے قصیدے کی تشبیب میں زمانے کی خراب حالت کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح گریز کرتے ہیں۔

نہیں ہے امن کہیں زیر آسمان ہرگز — بجز زمین خراساں کہ ہے وہ عرش آسا

یا امام کاظمین کی تعریف میں امراء و روساء کی نخوت کا بیان ہوتا ہے اور جب طبیعت کسی خان کی تعریف کرکے روزی کمانے کا ارادہ کرتی ہے تو پیر عقل طمانچہ مارتا ہے کہ

حیراں ہوں میں کہ شکل نگیں بہر نام غیر — اپنا تو رو سیاہ کرے گا کہاں تلک
رکھے قلم کو مدح میں ایسوں کے سرنگوں — سجدہ کرے ہیں جس کو زمین و زمان فلک

یا قصیدہ باب الجنت میں بہار کے ذکر میں کہتے ہیں کہ میرے شعر پھولوں سے اچھے ہیں کیونکہ

ہے مجھے فیض سخن اس کی ہی مدحی کا — ذات پر جس کے مبرہن کنیہ عزوجل

(ذوقؔ)

یوں کرسی زر پر ہے تری جلوہ نمائی — جس طرح کہ مصحف ہو سر رحل طلائی
پہنچا کمک لشکر بار اں سے ہے یہ زور — ہر نالے کی ہے وشت میں دریا پہ چڑھائی
زنجیر میں جو ہر کے رہے تیغ ہمیشہ — خونریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی

تشبیب

بعد شاہان سلف کے ہے تجھے یوں تفضیل — جیسے قرآں پس توریت و زبور و انجیل
گاہ خم میں ہے گہ شیشے میں کیا کیا پئے سیر — روح کرتی ہے کسی مست کی قالب تبدیل

دیگر۔ سحر جو گھر میں بشکل آئینہ تھا میں تنہا نزار و حیراں — تو اک پری چہرہ حور طلعت بشکل بلقیس ماہ کنعاں
پری کی صورت، چمن کی رنگت گر اس کا شیوہ تو اسکا جلوہ — زبان شیریں، بیان رنگیں، کلام رنداں، خرام مستاں
انیس خلوت، جلیس جلوت، حریف حکمت، ظریف صحبت — بہ بزم یاراں بدل بہاراں۔ بہ اہل عزلت گلے بداماں
جبیں بشکل مہ منور، عرق کے قطرے ہیں سیمیں اختر — ہلال ابرو، نگاہ جادو، خدنگ مژگاں و چشم فتاں

نے ذوق کو کافی اونچے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ذوقؔ کے زمانے میں چوں کہ زبان بھی متروک الفاظ سے کافی صاف ہو گئی تھی اس لئے بالکل موجودہ اردو معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کے قصائد میں فارسیت زیادہ ہے بہ نسبت بھاشاپن کے جو سوداؔ کے زمانے کی پہچان ہے۔ نیچرل سادگی بھی ذوقؔ کے قصائد میں سوداؔ کی سی نہیں اور اس کی بھی وجہ یہی کہ ان کی دنیا محدود تھی۔ ایک تنگ و تاریک مکان کی رہائش۔ خارجی فطرت کی صنّاعیاں کیسے بیان کرتے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوداؔ میں فطانت تھی اور ذوقؔ میں استعدادی قابلیت۔

طبعاً ذوق کو قصائد سے بہ نسبت غزل کے زیادہ مناسبت تھی۔ اس لئے کہ علوم متداولہ سے واقف، الفاظ اور ان کی نشست سے بخوبی آگاہ، سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قافیوں پر عبور، صنائع و بدائع و دیگر رعایات لفظی کے ماہر، مشق سخن نہایت بڑھی ہوئی اور یہی تمام چیزیں اس زمانے کی روایات تھیں ناممکن تھا کہ ذوقؔ قصیدہ کہتے اور وہ مقبول نہ ہوتا۔ ظفر حالانکہ بے بس بادشاہ تھا پھر بھی ذوقؔ کے لئے سنجر سے کم نہیں تھا۔

ذوق چوں کہ تقلید اچھی کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی خاص جدّت قصیدے میں نہیں کی اور اکثر بیشتر سوداؔ کے قصائد کے مضامین کا چربہ اتارتے رہے۔ لیکن الفاظ کی شان و شوکت، چمک دمک سے وہ آب و تاب پیدا کر دیتے تھے۔ جس سے قصیدے میں ایک عجیب شان پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے

بروئے رنگیں نگار لبناں، شگوفہ خنداں گرتہ خنداں
بوئی پیچاں سے عشق پیچاں جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں

وہ گوش پر زیب جگلاہی جو دیکھو بینی تو یاالٰہی
دہن میں غنچہ، لبوں میں گلبرگ روئے روشن میں ماہ تاباں

نگاہ ساغر کش تماشا، بیاض گردن صراحی آسا
وہ گول بازو، وہ گورے ساعد وہ پنجہ رنگیں بخون ارجاں

کمر نزاکت سے لچکی جائے کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے
اور اس پہ سو نور لہر کھائے بھرا سپہ ہیں دو قمر فروزاں

وہ ران روشن وہ ساق سیمیں وہ پائے نازک حنائیں رنگیں
وہ قد قیامت وہ فتنہ قامت دنوں پہ شامت جو ہو خراماں

جو نام پوچھا کہا خوشی ہوں جو وصف پوچھا تو دلبری ہوں
بہت جو پوچھا تو ہنس کے بولا کہ ذوقؔ تو بھی عجیب ہے ناداں

علاوہ علیت کی وجہ سے بھی ان کی تشبیب سودا سے اکثر ارفع اور جزیل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ان کے بیشتر قصائد ایسے ہیں جن پر ان کی نظر ثانی نہیں ہو سکی ہے پھر بھی وہ اردو ادب کے خزانے ہیں۔ خصوصاً مرصع تشبیبوں میں ذوق کی قدرت الفاظ دیکھ کر حیرت کا باعث ہوتی ہے۔ تشبیب دراصل ممدوح کو متوجہ کرنے کا ایک ذریعہ ہوا کرتی تھی جو مختصر جامع اور مناسب باتوں پر مشتمل ہوتی۔ لیکن ذوق کے زمانے تک وہ شاعر کے فن و ہنر کی نمائش کا ایک موقعہ بن گئی۔ اسی لئے ذوق کی تشبیب عموماً طویل ہوتی ہی خصوصاً ان قصائد میں جس کے بناتے وقت انھوں نے بہت دلچسپی لی ہے۔

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت
مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے
تھا تصور مرا ہر امر میں تصدیق صفت
ہو گیا علم حصولی تھا حضوری مجھ کو
تھا مرا ذہن نہ محتاج حصول صورت
کبھی بہت تھی مری قاعدہ صرف میں صرف
کبھی تھی نحو میں ہر نحو مجھے محویت
کبھی تعلیم و عقائد بکتاب و سنت
کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت
کبھی کرتا تھا قدم چرخ کا ثابت بجہاں
اور کبھی کرتا تھا باطل بسیار انتقت
کبھی انکار قیامت پہ میں لاتا تھا دلیل
کبھی تکرار و تناسخ پہ مجھے سوجھت

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر
عیاں ہو نامہ سے تحریر مثل جائے صریر
زباں سے ذکر اگر چھیڑیے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم و زیر
ہوا یہ باغ جہان میں شگفتگی کا جوش
کلید قفل دل تنگ خاطر دل گیر
کرے ہے وا لب غنچہ کو در ہزار سخن
چمن میں موج تبسم کی کھول کر زنجیر
کچھ انبساط ہوائے چمن سے دور نہیں
جو وا ہو غنچۂ منقار بلبل تصویر
اثر سے باد بہاری کے لہلہاتے ہیں
زمین پہ ہمسر سنبل ہی موج نقش حصیر
نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں
تو سبز فیض ہوا سے ہو وہ برنگ شعیر
زمیں پہ گرتے ہی لے آئے دانہ برگ و ثمر
جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحہ تزویر
ہوا یہ ڈورتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی
کرتا ہے ہلال ابروئے پرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی
ہے عکس فگن جام بلوریں سے مے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ بلکش کی حنائی

گریز کا موقعہ شاعر کو اپنی نزاکت تخئیل دکھانے کا موقعہ ہوتا ہے اور عموماً شعراء اسے خوب صورت بنانے کے لئے طرح طرح کی شاعرانہ نزاکتوں کو باندھنے کا اہتمام کرتے ہیں لیکن یہاں بھی ذوق نے کوئی نرالی ترکیب نہیں نکالی اور بیشتر وہی پرانے طریقے برقرار رکھے ہیں۔ ان کے یہاں تخلیص اسی لئے عموماً بالکل سیدھی سادی طور پر شروع ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اہتمام بہت ہوتا ہے لیکن وہ اہتمام یا تو پرانے طرز کا ہوتا ہے کہ گریز واقع ہونے سے پہلے ہی قیاس معلوم کر لیتا ہے کہ گریز کس موقعہ پر اور کس طرح ہوگا۔ اس لئے جب وہ واقع ہوتی ہے تو اس میں کوئی ندرت نہیں محسوس ہوتی یا تشبیب اور مدح کو جوڑنے کے لئے گریز کا جوڑ ایسا دفعتاً یا دلفریب نہیں ہوتا جو دل پر کھٹکے اور بے اختیار تحسین پر مجبور کر دے۔

مدح میں بھی وہی پرانا طریقہ برقرار رکھا ہے۔ یعنی کبھی بادشاہ کی شجاعت و دلیری کی، کبھی ان کے عدل و انصاف کی، کبھی اس کی عقل کی اور کبھی صورت و شکل کی، دشمنوں

بقیہ صفحہ
کوندھے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں	ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اڑائی
ہو قلزم عسال یہ لب جو متبسم	تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی
کرتی ہے صبا آ کے کبھی مشک فشانی	کرتی ہے نسیم آ کے کبھی نکہت سائی
ہے نرگس شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل	برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

---

۱ بہادر شاہ کی صحت یابی پر جو قصیدہ لکھا اس کی تشبیب میں تمام دنیا جہان کی تندرستی کا ذکر کرتے ہوئے آخر اس طرح گریز کرتے ہیں۔

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو	جب کہ ہو اس کی نوید غسل صحت جانفزا۔

یا "شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت" والے قصیدے میں "نوید بہجت" مجسم نظر آئی تو اس نے خواب راحت سے جگانا شروع کیا محض اس لئے کہ

فکر کر تہنیت عید کا اس شاہ کی تو	دور میں جس کے ہے ہر صبح صباح دولت
وہ شہنشاہ بہادر شہ کسریٰ انصاف	خسرو جم، حذم و داور و دارا حشمت

اس طرح "ایک خورشید لقا طرفہ جوان ارشق" ان کو اس طرح سمجھاتا ہے کہ

تو بھی کر تہنیت عید کا اس کی ساماں	کہ ہے وہ خسرو دیں حامی دین برحق

اور حاسدوں کی برائی، بادشاہ کی تلوار، ہاتھی اور گھوڑے کی تعریف. غرض یہی مقررہ طریقے تھے۔ تعریف میں اس قدر غلو کہ اعتدال تو اعتدال عقل و خیال بھی متحیر ہو جائے کہ کس طرح ناممکن باتیں ممکن بنا دی گئی ہیں۔

ذوق کی دعاؤں[۱] میں بھی کوئی خاص امتیاز نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ مناسب ہیں اور مقررہ قواعد و گذشتہ مثالوں کے بالکل مطابق۔ سوائے ایک قصیدہ[۲] سے

بقیہ صفحہ وہ بہادر شہ غازی کہ اگر تیغ اس کی … اپنی دکھلائے چمک چرخ پہ کٹ جائے ہلال

وہ نکو روئے، نکو خوئے، خجستہ منظر … وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ خال

وہ مسیحا دم یوسف رخ و داؤد الحاں … چشمہ فیض و ہنر کان عطا. بحر نوال

آسماں جاہ عطارد قلم و مہر علم … مشتری دانش و مہ بینش و مریخ جلال

خسرو جم حشم و دارا دکسریٰ انصاف … شاہ دارا دل و سلطان سکندر اقبال

چلے نہ اشرفی آفتاب عالم میں … خط شعاع سے اس پر جو نہ ہو تحریر

ابو الظفر شہ والا گہر بہادر شاہ … سراج دین نبی سایۂ خدائے قدیر

شہ بلند نگہ شہریار، والا جاہ … خدیو مہر کلہ خسرو و سپہر سریر

جہاں مسخر سو عالم مطیع و خلق مطاع … فلک مؤید و اختر معین بخت نصیر

زمیں ہو سبز جو تیرے سحاب بخشش سے … تو بوٹی بوٹی سے ہر خاک کی بنے اکسیر

الٰہی آب پہ ہوتا زمیں زمیں کو ثبات … زمیں پہ تا ہو فلک اور فلک کو ہو تدویر

فلک پہ چھوڑے نہ تا دامن مسیح حیات … زمیں پہ خضر کی ہو تا فنا نہ دامن گیر

عطا کرے تجھے عالم میں قادر قیوم … بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر

تن قوی و مزاج صحیح و عمر طویل … سپاہ وافر و ملک وسیع و گنج خطیر

تار ہو بخیۂ خورشید پہ ہر روز طلا … تا گرہ میں رکھے شب عقد ثریا گوہر

دانۂ انجم گردوں سے پروئے جب تک … رشتہ کاہکشاں میں شب یلدا گوہر

جب تلک جوش بہاراں سے ہوا دم صبح … ٹانکے شبنم سے سر دامن صحرا گوہر

ہر برس جشن ترا تجھ کو مبارک ہووے … برسیں نیسان کرم سے تری شاہا گوہر

دوستوں کو ہو ترے گنج گہر و زر نصیب … ہو نہ جز اشک سر دامن اعدا گوہر

مطلع[۲] سہرے: سریر آرائے گردوں جب تلک سلطان خاور ہو … قمر دستور اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو

عطارد میر منشی زہرا ناظر آسماں پر ہو … زحل میر عمارت تیرا گردوں میر لشکر ہو

سر ہفت آسماں جب تک کہ دور ہفت اختر ہو

الٰہی یہ بہادر شاہ شاہ ہفت کشور ہو

کے کہ سراسر دعائیہ ہے اور جو ذوق کے عام طرز میں ایک نئی بات ہے۔

زیادہ تر قصائد بہادر شاہ کی تعریف میں ہیں۔ اس لئے کہ ان کے استاد اور ملازم تھے اور ملازمت کی وجہ سے ہر اُس موقعہ کے متلاشی رہتے تھے جس پر وہ قصیدہ پیش کیا جا سکتا تھا غسل صحت کا موقعہ ہو یا عید کی خوشی نوروز ہو یا کسی کی شادی۔

سنگلاخ زمین اور مشکل ردیف و قافیے نصیر و سودا کے تتبع میں حاصل ہوئے اور اس کے علاوہ طغرائے امتیاز بھی تھا کہ مشکل ردیف و قافیے میں قصیدے سی طویل نظم سر کر کی جائے۔ لیکن ایسی دردسری اس میں شک نہیں کہ قصیدہ کی شان کو اکثر بڑھا دیتی ہے کیونکہ مشکل ردیف و قوافی کی وجہ سے غیر مانوس اور ادق الفاظ کا استعمال کرنا پڑتا ہے اور جن کی وجہ سے قصیدے میں خواہ مخواہ جزالت آجاتی ہے۔ حالانکہ قصیدے کے لئے نامانوس اور ادق لغات ضروری نہیں پھر بھی اگر روانی اور تناسب سے پر دئے گئے ہوں تو قصیدے کی شان کو بڑھاتے ہیں۔

ذوق کے قصائد کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ ان کی زبان پختہ اردو ہے۔ یعنی وہ زبان جو ولی نے شروع کی تھی اور میر و مرزا نے پروان چڑھائی۔ ذوق کے یہاں پہنچ کر بالکل منجھ کر صاف ہو گئی ہے۔ ایرانی قالینوں میں اب ٹاٹ کے پیوند نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فارسیت زیادہ ہو گئی ہے۔ مگر قصیدے میں اگر غور کیا جائے تو بغیر شان و شوکت کے گذارہ نہیں اور شان و شوکت کے لئے بغیر فارسی عربی الفاظ کے چارہ نہیں۔

سلیقے سے نگینہ کی طرح جڑے ہوئے الفاظ، شان و شوکت سے بھرپور، صنائع لفظی و معنوی سے مستحکم، علمیت کے زور سے بھاری اور جزیل۔ یہ تمام باتیں اگر دیکھنا ہو تو ذوق

۱؎
پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں — کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں
ہے آج جو یوں خوشنما نور سحر رنگ شفق — پرتو ہے کس خورشید کا نور سحر رنگ شفق
ایک خورشید لقا طرفہ جوان ارمنق — تاب رخسار قلق سرخی رخسار شفق
ہیں مرے آبلۂ دل کے تماشا گوہر — اک گہر ٹوٹے تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

کے قصائد کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہاں سادگی و سلاست کا مذکور نہیں۔ یہاں بذلہ سنجی، ہجو یا ظرافت کا گذر نہیں۔ جو چیز ملے گی وہ عالمانہ، جو کچھ نظر آئے گا وہ فاضلانہ حسن و جمال کی شعریت کا یہاں ٹھکانا نہیں۔ ہر شے متشرع ہے متین اور سنجیدہ۔ تشبیہ و استعارے بھی قواعد کے لحاظ سے پختہ نظر آئیں گے لیکن بیشتر ایسے پھول ہوں گے جن میں بو باس نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد کی زیادہ تقلید نہ ہو سکی۔ یوں تو زمانہ بھی بدل گیا تھا اور بدل رہا ہے لیکن پھر بھی ذوق کے بعد جن شعراء نے قصائد کہے وہ اس پائے کے نہ تھے۔ محض اس لئے کہ ان شعراء کو نہ تو الفاظ پر اتنی قدرت تھی۔ نہ خود میں اتنی جامعیت دوسرے یہ کہ غدر کے بعد جو دو ایک نوابین رہ گئے تھے وہ زیادہ فیاضی نہیں کر سکتے تھے اس لئے ان کے درباروں میں قصیدوں کے بجائے غزلوں کا زیادہ زور تھا۔

ہم عصر ہونے کی وجہ سے غالب کے بھی قصائد کا خیال آتا ہے۔ حالانکہ ذوق کے سامنے غالب کے قصیدے پوچھے نہ جاتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کے تھوڑے سے قصیدے اپنی بے ساختگی، روانی اور معنویت کے لحاظ سے ذوق

غالب کی تشبیب کا ڈھنگ

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار　　سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار
مستیٔ باد صبا سے ہے بعرض سبزہ　　ریزۂ شیشۂ مے جوہر تیغ کہسار
سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ　　تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار
کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوق بلبل　　راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
بے دلیہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق　　بے کسیہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم　　لغو ہے آئینۂ فرق جنون و تمکیں
نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت　　سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق و تحسیں
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم　　درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

صبح دم دروازۂ خاور کھلا　　مہر عالم تاب کا منظر کھلا

کے قصیدوں سے یقینی بلند ہیں اور لفظی نشست، دروبست اور ترصیعی اعتبار سے ذوق کے بہتر ہیں۔ لیکن یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے گلدستے سے کیا فائدہ جس میں خوشبو نہ ہو۔ اس کے علاوہ غالب کے قصیدوں میں جوروانی اور تسلسل ہے اسے پُرشکوہ الفاظ کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر ذوق کے قصائد کے پڑھنے سے سامعہ پر ایک پرجوش اور زوردار، پرشکوہ قسم کا احساس ہوتا ہے تو غالب کے قصائد سامعہ کو مدہوش کرکے اپنی ترتیل وترنم میں بہالے جانا چاہتے ہیں ۔ قصائد چونکہ سنانے کی چیز ہوتی تھی اس لئے سماعت پر اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

خسروِ انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
لاکے ساقی نے صبوحی کیلئے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اڑکے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاص خواص — حبذا اے نشاطِ عام عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہئے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امیدگاہِ انام الخ

غالب کا گریز کا ڈھنگ۔

نعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ — طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا — چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

قصیدوں میں شاندار الفاظ کی روایت دراصل بادشاہوں کے جنگی کارناموں کی مدح سرائی کی بدولت پیدا ہوئی۔ بعد میں یہ ہوگیا کہ جو شاندار الفاظ کو مرتب و منظوم کردے وہ قصیدہ گو ہوسکتا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے بھی شاعرانہ دل و دماغ کی ضرورت ہے اور اس میں وہی کامیاب ہو سکتے ہیں جنھیں فطری اُپج کے ساتھ الفاظ کو سلیقے سے بٹھانے کا ڈھنگ معلوم ہو۔ اردو میں فارسی کی طرح زیادہ قصیدہ گو پیدا نہیں ہوسکے کیوں کہ اردو خود شہنشاہیت کے آخری دور میں پیدا ہوئی۔ جمہوریت میں اس قسم کے موقعے اور پھر ایسے جن میں شاعروں کو منافع کی امید ہو

(بقیہ صفحہ)

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ — یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں
نقش لاحول لکھ اے خامہ ہزیاں تحریر — یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قریں

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ — اے پری چہرہ پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن — نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذو الجلال والاکرام

مدح و دعا کی مثال۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال — پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامہ نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — یاں عرض سے رتبہ جوہر کھلا
مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایت لشکر کھلا
بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوے پایۂ منبر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب آل سعیٔ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریب طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے — دفتر مدح جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستائش نا تمام — عجز اعجاز ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خط لوح ازل — تم پہ اے خاقان نام آور کھلا

تم کرو صاحب قرانی جب تلک
ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

شاد پیدا ہوتے ہیں ۔ اس لئے پیشہ ور شاعری کا زمانہ رخصت ہو رہا ہے
اب اگر کسی کی شان میں قصیدے کہے بھی گئے تو وہ واقعیت سے زیادہ
نزدیک ہوں گے ۔ دوسرے الفاظ میں کلاسیکل قسم کے قصیدوں کا زمانہ
ختم ہو گیا ۔ لیکن ذوق کے قصائد کی تاریخی حیثیت اردو ادب میں ہمیشہ
مسلم رہے گی ۔

پیامِ رُوح

(حضرت کشتہ سندیلوی)

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر　　　اے کہ تیرے دم سے روشن کوخ و کاخ و بام و در
اے کہ تیرے زیرِ فرماں باغ و راغ و کوہ و دشت　　　اے کہ تجھ سے بہرہ ور کاہ و گل و برگ و شجر
اے کہ تیرے شوق میں بیتاب و غلطاں مضطرب　　　اے کہ تیرا منتظر ہر ذرہ و نجم و گہر
اے کہ تیرے ذوق میں دریا بہ دریا یم بہ یم　　　اے کہ تیرے عشق میں صحرا بصحرا در بدر
اے کہ تیرے ہجر میں ہر چاک گل اک چاکِ دل　　　اے کہ تیرے غم میں شبنم قطرۂ خونِ جگر
اے کہ تیرا عکسِ رنگیں برگ برگ و شاخ شاخ　　　جلوہ افگن، جلوہ پیما، جلوہ فرما، جلوہ گر
اے کہ تو رونق فزائے عالمِ کون و مکاں　　　اے کہ تو زینت گرائے تحت و فوق و بحر و بر
اے کہ تیرا ذکر خود افسانہ و افسانہ خواں　　　اے کہ تیری یاد خود دیوانہ و دیوانہ گر
اے کہ تیری جستجو لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم　　　اے کہ تیری آرزو روز و شب و شام و سحر

حسرت اندر حسرتم اے جلوۂ وسعت نواز
دم بدم ذوقِ دگر بینم بہ اندازِ دگر

جہاں میں ہوں

(جناب سلام مچھلی شہری)

تغیر ہی مرا حسنِ طبیعت ہے جہاں میں ہوں
مرے ہاتھوں میں خود آئینِ قدرت ہے جہاں میں ہوں

حکومت سے نظامِ مذہبی سے۔ قصر والوں سے
جدھر دیکھو بغاوت ہی بغاوت ہے جہاں میں ہوں

فضائے آتشیں خونی مناظر شعلہ زا وادی
مری باغی نگاہوں کو یہ جنّت ہے جہاں میں ہوں

الوہیت بھی میری شوخیوں کی قدر کرتی ہے
مرے احکام کی تابع مشیّت ہے جہاں میں ہوں

وہاں تقدیر کو دلچسپیوں میں یاد کرتے ہیں
مقدّر زیرِ دامِ مردِ ہمّت ہے جہاں میں ہوں

نظر میں اس غلام آبادی سے کچھ پرے ہٹ کر
مرے خوابوں کی اک آزاد جنّت ہے جہاں میں ہوں

سلام! اب کچھ دنوں میں اک نیا دور آنے والا ہے
کہ لرزاں میرے نعروں سے حکومت ہے جہاں میں ہوں

بین الاقوامی سیاست
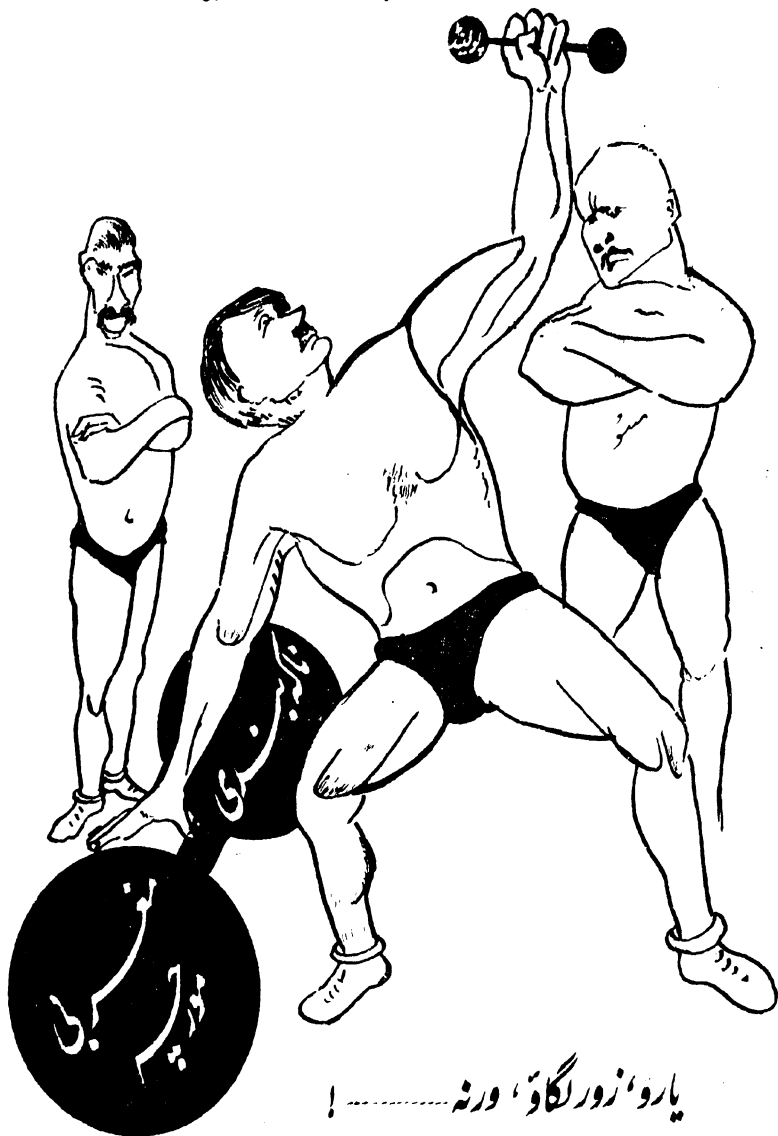
یارو، زور لگاؤ، ورنہ ------------ !

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

یادگارِ جگر

یہ بابو رنگ بہادر لعل جگر گورکھپوری مرحوم کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ ہے، جسے پانڈے سرسوتی پرشاد جی نے مرحوم کی وفات کے بعد ترتیب دیا ہے سب سے پہلے تاریخ وفات کے چند قطعے اور مرتب کا دیباچہ ہے اس کے بعد حضرت فراقؔ گورکھپوری، حضرت مجنوںؔ گورکھپوری اور متعدد حضرات کے تعارف اور مقدمے ہیں، آخر میں جگر مرحوم کا مجموعہ کلام ہے۔ حضرت فراقؔ اور اُن کے بعد حضرت مجنوںؔ اور دوسرے مقدمہ نگار حضرات نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ حضرت جگرؔ کی سیرت کو ہر پہلو سے اجاگر کیا جائے۔ یہ اپنی جگہ پر مستحسن ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اُن کے کلام کو ان کی سیرۃ کا محتاج بناکر پیش کرنا شاعر کا صحیح تعارف نہیں ہے۔

جہاں تک اصل کلام کا تعلق ہے، خوب ہے۔ حضرت جگرؔ متاخرین کی صف میں آتے ہیں انھیں حضرت وسیم خیر آبادی کا تلمّذ حاصل تھا جو حضرت امیر مینائی کے حلقۂ ارادت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں حضرت امیر مینائیؔ اور اُن کے ہمعصروں کا رنگ جھلکتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

قائل نہیں ہوں آپ کے قول و قرار کا　　اِک روگ ہو گیا ہے مجھے اعتبار کا

کس کام کا وہ دل جو نہ ہو اختیار کا　　دل لیجئے نہ آپ کسی بے قرار کا

اک دم سمندِ عمر کا جمتا نہیں قدم　　کیا جانئے نکالا ہے کس شہسوار کا

مدام اس کو جو رٹ ہے شراب کوثر کی　　ضرور چھپ کے کہیں شیخ جی نے پی ہوگی

نظر لگ جائے یہ دونوں متاعِ دل پہ نہیں — حیا و ناز میں اب جنگِ زرگری ہوگی
زبانِ شیشۂ مے پر صدائے حق حق ہے — یہ دخترِ رز کسی واعظ کے منھ لگی ہوگی

ہوئی اک عمر میرے خانۂ دل سے نہیں نکلی — کسی کی حسرتِ دیدار بھی پردہ نشیں نکلی
نکالے سے نکلتی ہی نہیں ہے اب تو سینے سے — تری تیغ نگاہِ ناز بھی کیا دلنشیں نکلی

اُس زمانے میں عموماً غزل الفاظ کا ایک رنگین طلسم ہوتی تھی، لکھنؤ کا اثر غالب تھا، خیالات الفاظ کے پری خانے میں گم ہو جاتے تھے۔ مگر حضرت جگرؔ کے کلام میں جہاں یہ رنگ ہے، وہاں خیالات کی بلندی اور پاکیزگی کا حصہ بھی کافی ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں رنگ تو وہی جلال و امیر کا ہے، مگر علوئے خیال کا لطف بھی موجود ہے اور یہی جگرؔ کی خصوصیت کلام ہے۔

اے جگر قطرۂ خوں دل ہے، مگر یہ قطرہ — جوش میں آکے جو بڑھتا تو سمندر ہوتا
کنشت و کعبہ دونوں ایک ہی منزل کے رستے ہیں — کوئی آیا کہیں ہو کر کوئی آیا کہیں ہو کر
کہنا کہ اہلِ دیر و حرم کو ہے انتظار — مل جائے میکشوں میں جو تم کو جگر کہیں
چل دیے سب کے سب سحر کے وقت — رنگ دیکھا گیا نہ مجلس کا
جب جفا پر ہی جان دیں لاکھوں — کس لئے پھر وفا کرے کوئی
یہ ٹکٹکی ہے سوئے بام و در جگر کیسی — ادھر تو دیکھئے، حضرت! اکدھر کو دیکھتے ہیں

غرض جگرؔ کے کلام میں ایک کیف ہے، جو ایک کہنہ مشق غزل گو کے کلام میں ہونا چاہئے۔ اگر جگرؔ کی عمر کچھ دن اور حقِ رفاقت ادا کرتی تو مرحوم کی ذات سے اردو شعر و ادب کی کافی خدمت ہوتی۔ اور ان کا مرتبہ اساتذۂ فن میں مسلم ہو جاتا۔

کتاب چھوٹے سائز کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے جس کا نصف حصہ تو مقدمات و تقاریظ پر مشتمل ہے، اور نصف اصل دیوان پر۔ کتاب ظاہری حسن کے اعتبار سے بھی خوب ہے، کتابت، طباعت کافی روشن اور کاغذ عمدہ ہے، جلد خوبصورت اور حروفِ زر سے مزین۔ قیمت درج نہیں ہے، مرتب جناب

پانڈے سرسوتی پرشاد، گورکھپور ہائی اسکول گورکھپور کے پتے سے مل سکے گی۔ (ب۔ع۔ف)

پطرس کے مضامین:۔

ازسید احمد شاہ بخاری ایم اے۔ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر، دہلی۔ قیمت عہ

حالی پبلشنگ ہاؤس نے حال ہی میں پطرس کے مضامین کا تیسرا اڈیشن تیار کیا ہے۔ پہلے اڈیشن ہی سے پطرس کی حیثیت بطور مزاحیہ نگار کے اردو ادب میں قائم ہو چکی ہے۔ اردو زبان کے مزاحیہ نگاروں میں محض پطرس ہی ایسے ہیں جن کا نصب العین محض تفریح کے اور کچھ نہیں زندگی کی معمولی سے معمولی چیزیں لیتے ہیں اور اُن میں تفریح کا سامان ڈھونڈھ لیتے ہیں، کتوں، کا اگر بیان کریں گے تو اس طرح گویا جیسے آپ انھیں بالکل پہلی دفعہ دیکھ رہے ہیں۔ اردو میں پیروڈی کو زیادہ تر سید صاحب ہی نے رواج دیا ہے۔ ذرا ذرا سے جملوں اور جملے کی ترکیبوں سے وسیع اور دلچسپ باتوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں سید صاحب سے ایک شکایت ہے وہ یہ کہ اب انھوں نے اس طرز نگارش کو قطعی طاق پر رکھدیا ہے حالی پبلشنگ ہاؤس والے صاحبان اردو ادب پر احسان کریں گے اگر سید صاحب سے کچھ اور بھی لکھوالیں۔ کتابت وطباعت بہت خوب ہے۔ اس اڈیشن میں ایک دلچسپ مضمون لاہور کا جغرافیہ اور شامل کیا گیا ہے۔

مرقع عالم:۔

مولفہ سید شرف الدین قادری۔ عبدالقادر اینڈ سنس، چارمینار حیدرآباد۔ دکن و مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی قیمت دو روپے آٹھ آنے $\frac{20 \times 30}{16}$ (یعنی کتابی سائز)

اردو میں ایک اچھے اٹیلس کی بہت بڑی کمی تھی۔ شرف الدین صاحب نے مرقع کو ترتیب دے کر ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ لیکن یہ مرقع عام اٹلسوں کی طرح نہیں ہے بلکہ تمام جغرافیائی نقشوں کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ کے نقشے بھی دیے ہیں۔ نقشوں کے علاوہ مختلف جغرافیائی معلومات مثلاً عجائبات خشکی، عجائبات تری۔ دنیا کا ہوائی سفر۔ دنیا کی نباتات، نسل انسانی، دنیا

کے کاروبار، دنیا کے قیمتی پتھر وغیرہ بہت سے مفید مضامین بھی پیش کئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سکندر اعظم کے زمانہ سے ۱۸۵۷ء کی غدر تک کی ہندوستان کی تاریخ بھی مختصراً بیان کردی ہے۔ یعنی اس صورت سے قادری صاحب نے یہ مرقع جغرافیہ اور تاریخ دونوں کے طلبا کے لئے ناگزیر بنا دیا ہے تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان اور دنیا کی مشہور ترین چیزوں کی تصویریں سہ رنگی اور فوٹو بلاک میں دیدی گئی ہیں۔ قادری صاحب نے یقیناً بڑی ہمت کی ہے۔ کتاب کی خوبصورت چھپائی۔ جلد اور ترتیب کو دیکھتے ہوئے اس کی قیمت بہت کم ہے۔

کلیات بحری:۔

مرتبۂ ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ قیمت تین روپیہ (سے/) ۳۱۲ صفحات

بحری بارھویں صدی کا ایک دکنی شاعر ہے۔ اس کی مثنوی من لگن مشہور ہے اور کئی دفعہ چھپ بھی چکی ہے لیکن بحری کی غزلیات ابھی تک عام پبلک کی دسترس سے باہر تھیں۔ حفیظ صاحب نے ان تمام غزلوں کو جن کی تعداد ایک سو تیرہ ہے چند چھوٹی چھوٹی نظموں اور " بنگ نامہ" کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مثنوی من لگن اس میں شائع نہیں کی ہے۔

بحری دراصل ایک صوفی منش شاعر تھا۔ اس کی مثنویاں، نظمیں اور غزلیں ہر ایک میں صوفیانہ خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ حفیظ صاحب چونکہ خود بھی صوفیانہ دل و دماغ رکھتے ہیں اس لئے بحری کے انتخاب کے لئے وہ بہت موزوں شخص ثابت ہوئے غزلیات میں حالانکہ بحری نے لفظی رعایات کا بہت خیال رکھا ہے پھر بھی ولی کی طرح بحری کی کلیات بھی اردو ادب کے ارتقا میں تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ حفیظ صاحب نے ایک بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔

اپنے دکن و پونا کے قیام کی وجہ سے حفیظ صاحب دکنی زبان سے بخوبی واقف ہوگئے تھے

اس لئے وہ ہر مشکل شعر کے معنی اور آخر میں پرانے متروک دکنی الفاظ کی ایک فہرست بھی دے سکے ہیں۔ بعض اشعار کی تشریح میں کہیں کہیں خامیاں رہ گئی ہیں لیکن وہ نظر ثانی میں درست ہو سکتی ہیں۔

ابتدا میں حفیظ صاحب نے ایک سو اکیس صفحے کا دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں بحری کے زمانے کی سیاسی تاریخ اور ادبی ماحول کا ایک پس منظر پیش کیا ہے تاکہ بحری کے کلام کا صحیح تاریخی اور ادبی ماحول کے تصور کے ساتھ مطالعہ کیا جا سکے۔ حالانکہ موصوف نے اس میں بہت سے غیر ضروری چیزیں شامل کر دی ہیں مثلاً بحری کے ہمعصروں کا مفصل بیان اور ان کا انتخاب یا ولی کے متعلق محض کلیات ولی سے استفادہ جو اب پرانی چیز ہو گئی ہے۔ اور یوم ولی کے مقالات اور موسیٰ کے ولی نمبر کے مضامین کے سامنے اس کی تحقیقات اب پرانی ہو گئی ہے وغیرہ لیکن یہ سب جزوی باتیں ہیں۔ حفیظ صاحب کی یہ سادی کوشش ایک ادبی احسان ہے جو ہر اردو ادب کے پرستار کو ماننا پڑے گا۔ موصوف کی یہ کاوش ہر قدیم اردو کے طالب علم کو رہنمائی کا کام دے گی۔

امیر العروض :۔

مرتبۂ بزمی انصاری صاحب۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز بکسیلرز کشمیری بازار لاہور قیمت ۱۲/

اردو میں عروض پر رسالوں کی بہتات ہے۔ اُن ہی میں یہ ایک اضافہ ہے۔ حالانکہ بزمی صاحب نے بہت محنت کی ہے لیکن کوئی خصوصیت پیدا ہونے نہیں پائی۔ اگر وہ "معارف" یا رسالہ "اردو" کے وہ پرانے مضامین بھی پڑھ لیتے جن میں عروض کو آسان کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ مبتدیوں کے لئے اور آسانی فراہم کر دیتے۔ آج کل تو نو مشقوں کا کیا ذکر بڑے بڑے ادیب عروض سے ناواقف ملتے ہیں اور اس کی وجہ محض یہی ہے کہ عروض ابھی تک بجز آسان صورت میں نہیں پیش کیا گیا ہے۔ اختصار تو مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی "قواعد اردو" میں کافی کر دیا ہے لیکن آسانی ابھی تک نہیں آ سکی ہے۔ بزمی صاحب نے ترتیب اور تمام قواعد شاعری کو فراہم و یکجا کرنے میں، اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت محنت اور کاوش سے کام لیا ہے اور عروض کے طالب علم

کے لئے تمام مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ لیکن مبتدیوں کے لئے یہ عروض اب بھی وہی چیستاں رہی جو پہلے تھی۔ حالانکہ یہ چیستاں ہی ایسی ہے کہ باوجود مفید ہونے کے ابھی تک آسان صورت میں پیش نہیں کی جاسکی اور ابھی تک اس کے جاننے والوں میں اختلاف آرا ہو جاتا ہے (اخبار حقیقت اا ر جولائی ۱۹۳۷ء واورنٹیل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۷ء) لیکن مسئلہ کے دقیق ہونے کی وجہ سے بزمی صاحب پر الزام اس کا نہیں آتا۔ ان کی محنت کی داد یقینی دیجائے گی کہ طالب علموں کے لئے ایسی مفید کتاب تیار کر دی۔ آئندہ اڈیشن میں بزمی صاحب ذرا اتنا اور خیال رکھیں کہ مسائل کو ذرا اور وضاحت سے بیان کریں اور اساتذہ کے اشعار مثال میں زیادہ دیں کیونکہ اساتذہ کے اشعار پہلے ہی سے زبانوں پر چڑھے ہوتے ہیں بہ نسبت آپ کے یا میرے شعروں کے۔

یورپ کے تاثرات :۔

مرتبہٗ بدر شکیب صاحب۔ سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب، چارمینار حیدرآباد دکن

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ؍)

بدر شکیب صاحب نے اس کتاب میں بیس مشہور ہندوستانی لوگوں کے تاثرات قلمبند کئے ہیں جو یورپ اور وہاں کی زندگی سے ان پر ہوئے تھے۔ اس فہرست میں علامہ عبداللہ یوسف علی، ڈاکٹر سید حسین۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی۔ ڈاکٹر زور وغیرہ حضرات شامل ہیں۔ بدر صاحب کا یہ خیال نہایت خوب رہا۔ ہمیں یورپ کی خوبیوں اور خرابیوں کی مکمل تصویر ان حضرات کے بیان سے مل جاتی ہے۔ کتاب بھی بڑی دلچسپ ہوگئی ہے لیکن اگر بدر صاحب ملک کے بڑے بڑے دیگر لیڈروں کو جو ریاست حیدرآباد سے باہر رہتے ہیں اس میں شامل کر لیتے تو اس کتاب کی دلچسپی میں معتدبہ اضافہ ہو جاتا۔ بہر حال کتاب بہت دلچسپ ہے اور پڑھنے کے قابل۔ سرورق بھی بڑی خصوصیت کا ہے۔

جوئبار:۔

از جناب بھیم سین صاحب ظفر تقطیع بڑی ضخامت ۹۶ صفحات کتابت وطباعت اوسط کاغذ بہتر قیمت ۱۲ ار مجلد عہ ملنے کا پتہ قیصر ادب ملتان چھاؤنی۔

جوئبار ایک ہونہار شاعر کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں۔ غزلیں بھی اور چند ہندی یا نیم ہندی گیت بھی۔ ان سب میں تخیل کی ایک خاص رفعت زندگی اور جان پائی جاتی ہے۔ اگر مشق سخن جاری رہی تو ہمیں امید ہے کہ ظفر صاحب اردو شاعروں میں نمایاں حیثیت حاصل کرلیں گے۔

رسید کتب

نئے مسائل۔ مصنفہ محمد مرغوب الدین بی اے۔ بی ٹی مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت ۸ر

خزینۂ رباعیات فارسی۔ مرتبہ سعید الرحمن خانصاحب شیروانی پرنٹنگ پریس علیگڈھ قیمت درج نہیں

شاعر کی دنیا (حصہ اول) مولفہ عظیم الدین صحبت بی اے (عثمانیہ) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن قیمت ۸ر

تفسیر سورہ والشمس۔ مؤلفہ مولانا حمید الدین فراہی مکتبہ حمیدیہ سرائے میر۔ اعظم گڈھ قیمت ۸ر

عصر نو (نظمیں) مصنفہ محمد صادق ضیا صاحب۔ مکتبہ قصر الادب دفتر "شاعر" آگرہ۔ قیمت ۴ر

تاریخ اخلاق اسلامی۔ دار المصنفین۔ اعظم گڈھ

دولت عثمانیہ " "

رسالہ جات:۔

نگار	نظیر نمبر	قیمت	عہ
ساقی	سالنامہ	"	عہ

اُردُو اِکادمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

اب سے چند ماہ قبل اردو اکادمی نے بارہ سیاسی اور معاشی مضامین کا اعلان کیا تھا اور ہر مضمون کے سب سے اچھے مقالے پر ڈھائی سو روپیہ کا انعام بھی متعین کر دیا تھا۔ اس اعلان کے بعد ۱۰۶ حضرات نے ہمیں مطلع کیا کہ وہ اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں اور اپنا مقالہ وقت مقررہ پر بھیج دیں گے۔ گو بعد کو مدت میں توسیع بھی کر دی گئی مگر افسوس ہے کہ تمام حضرات کے مقالے وصول نہ ہو سکے۔ زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ اکثر مقالے صرف قصے کہانیوں پر مشتمل تھے۔ بعض حضرات نے محنت کافی کی تھی مگر دوسرے نقائص کی وجہ سے ہمارے ججوں نے انھیں پسند نہیں کیا۔ صرف مندرجہ ذیل مقالے ججوں کے پاس آخری فیصلے کے لیے رہ گئے ہیں۔ امید ہے کہ ہم بہت جلد اُن حضرات کو نتیجوں سے مطلع کر سکیں گے جن کے مقالے پسند کیے جائیں گے:۔

جناب سلطانہ قاصفیہ صاحبہ
جناب شاہد حسین صاحب رزاقی
جناب پیارے لال صاحب بھلّہ
جناب گوپی ناتھ صاحب اَمن۔
جناب حیات اللہ صاحب انصاری
جناب بشیر احمد صاحب ڈار
جناب عبدالحکیم صاحب
جناب سری کرشن صاحب سنہا
جناب ساون رام صاحب پریتم
جناب ڈاکٹر بول چند و سید وزیر الحسن صاحبان
جناب محمد یونس صاحب
جناب عبدالرحمٰن صاحب ٹونکی
جناب سبط حسن صاحب
جناب عبدالسلام خورشید صاحب

جناب محمد صدیق خاں صاحب	جناب محمد قاسم صاحب
جناب عشرت صدیقی صاحب	جناب محمد مجیب صاحب
جناب خواجہ معین الدین صاحب	جناب شیخ عبدالوحید صاحب
جناب نسیم مرزا صاحب رزقی	جناب آفتاب احمد صاحب مختار

آخر میں ہم اُن تمام صاحبان کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اس مقالہ نویسی میں دلچسپی لی۔ ان حضرات کے نام ایک سال کے لیے رسالہ جامعہ مفت جاری کر دیا گیا ہے اور مکتبہ کی بہترین کتابوں میں سے ایک تحفۃً ارسال کر دی گئی ہے۔ امید ہے کہ ہماری یہ پیش کش قبول فرمائی جائے گی۔

سکریٹری

اُردو اکاڈمی جامعہ ملیہ، نئی دہلی

لیون ٹروٹسکی کا بیان

(۳)

جناب م، م جوہر صاحب میرٹھی

(گذشتہ سے پیوستہ)

ٹروٹسکی:۔ اصولی اختلاف وہی تھا کہ ہم پرولتاری بین الاقوامی انقلاب کے حامی تھے اور اسٹیلن کہتا تھا کہ ایک ملک میں انقلاب قائم رہ سکتا ہے۔ سوویٹ یونین میں اشتراکی انقلاب ہو گیا اس کو برقرار رکھنے کے لئے سرمایہ دار ملکوں اور نتیجتاً سرمایہ دار جماعتوں سے اتحاد رکھنا ضروری ہے اور اس اتحاد پر پرولتاریوں کو بھینٹ چڑھانے میں کوئی نقصان نہیں، ۱۹۲۴ء میں اسٹیلن خود یہ کہتا تھا کہ انقلاب ایک ملک میں زندہ نہیں رہ سکتا اس کو زندہ رکھنے کے لئے عالم گیر انقلاب کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصے بعد اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ روسی انقلاب واحد ملک کا انقلاب تھا۔ وہ مستقل طور پر ختم ہو گیا۔ اب کسی جدّ و جہد کی ضرورت نہیں حکومتی طبقے کے لئے اس نظریے کے یہ معنی تھے کہ کھاؤ، پیو اور چین کرو۔ ۱۹۲۷ء میں اسٹیلن نے ہماری پارٹی کو عہدوں سے برطرف کر دیا۔ لیکن اب بھی ہم اپنے آپ کو پارٹی کا ممبر ہی سمجھتے رہے ہم عہدہ دار نہیں رہے تھے لیکن پارٹی کے ممبر تھے اور پارٹی کے جلسوں میں اپنے اختلافات کی بابت بحث و مباحث کر سکتے تھے۔ لیکن جب ہٹلر کو یہ موقع دیا گیا کہ جرمنی کا مالک بن جائے اور جب سوویٹ یونین ہٹلر کی دوستی کا خواہاں ہوا۔ تو ہم نے کہہ دیا کہ کمنٹرن اب مردہ ہو چکی ہے۔ اب ہمیں ایک نیا سیاسی ادارہ قائم کرنا چاہیئے۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۳ء تک ہمارے اور اسٹیلن کے درمیان کافی اختلافات ہو گئے اور ہم سیاسی کمیٹی سے نکال دیے گئے۔ اب سیاسی کمیٹی کا حال یہ ہے کہ اس کے ممبروں میں سے ایک بھی کوئی غیر زبان نہیں جانتا۔ کمنٹرن کے ہاتھ میں مختلف ملکوں کے ساتھ اداروں کی باگ ڈور ہے اس لئے کتنا ضروری ہے کہ ممبر

دوسری زبانیں جانیں۔ دورانِ مخالفت میں یہ بھی ہوا کہ ہمارے جو مضامین حکومت کے خلاف ہوتے تھے اسٹیلن ان کو چھپنے سے روک دیتا تھا۔ سوویٹ یونین میں دوسری چیزوں کی طرح پریس بھی حکومتی طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ سیاسی کمیٹی کے جلسوں میں ایک اسٹینوگرافر ہوا کرتا تھا۔ وہ سب تقریریں قلم بند کیا کرتا تھا جو بعد میں چھپتی تھیں جب چین کے انقلاب کے متعلق کمیٹی بیٹھی اور بحث ہوئی تو یہ بہانہ کر کے کہ اس مجلس کی کارروائی کو عام کرنے سے بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ اسٹینوگرافر کو تقریریں قلم بند نہ کرنے دیں اور ہمارے مضامین نہ چھپنے دیے اس پر جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں چند نوجوانوں نے اُن کو چھاپا اس سلسلے میں سب سے پہلے ۱۹۲۷ء میں گرفتاریاں عمل میں آئیں اسی سال اکتوبر کے انقلاب کی یادگار منائی گئی اور سرکاری جلوس نکلے جس میں ہماری پارٹی کے لوگ بھی شریک تھے۔ لیکن ہمارے جھنڈوں پر مختلف نعرے ثبت تھے۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ مختلف پارٹیاں مختلف نعرے مقرر کرلیتی تھیں۔ ہماری پارٹی کے یہ نعرے تھے کہ کولک۔ حکومتی طبقہ اور نئی اقتصادی پروگرام کے خلاف جہاد کرو۔ خفیہ پولیس والوں نے ہماری پارٹی کے جھنڈے چھین کر تلف کر دیئے اور کچھ گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ لینن گریڈ میں ریڈک اور زینوویف کو جلوس نکلنے سے دو گھنٹے قبل ہی گرفتار کر لیا۔ اس واقعے کے بعد میرے نام زینوویف کا ایک خط آیا جس کا آخری جملہ یہ تھا "اسٹیلن ان واقعات کی بابت بہت ہی زہر آلود افسانے مشتہر کرے گا اس لئے عوام کو سچے واقعات سے آگاہ کرنے کا فوراً انتظام کرنا چاہیئے" اگرچہ عوام ہمارے ساتھ کافی ہمدردی رکھتے تھے لیکن کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اس سال حکومت نے جلوس کا انتظام فوجی طریق پر کیا تھا ہر دستے کے آگے خفیہ پولیس کے آدمی سادے کپڑوں میں تھے اور حکومتی طبقے کے لوگ خاص خاص مورچوں پر تھے۔ کارخانوں کے ڈائرکٹر اور سکریٹری وغیرہ بھی جلوس کے ہمراہ تھے اور مزدوروں پر نظر رکھتے تھے۔ حکومتی طبقے نے ہمارے خلاف کافی انتظام کر رکھا تھا۔ اس لئے جب خفیہ پولیس کے آدمیوں نے ہماری پارٹی کے جھنڈے توڑ ڈالے تو کوئی

مزدور نہ بول سکا۔ کیوں کہ ان بے چاروں کی روٹی کا سوال تھا۔ اگر کچھ مزدور ہمدردی ظاہر کرتے تو اگلے ہی دن سکریٹری کارخانے سے نکال دیتا جس کے یہ معنی ہوتے کہ مزدور بھوکے مرجاتے۔ کیونکہ سارے کارخانے حکومت کے ہیں اس لئے سوویٹ یونین میں اگر کسی غریب پر حکومت کی نظرِ عنایت نہ رہے توحکومت اس کو بھوکا مارسکتی ہے۔ اس لئے جلوس میں مزدور کا ہمارے ساتھ ہمدردی کرنا اس کے لئے حیات و موت کا سوال تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں معمولی انسان ڈر جاتا ہے جس ملک میں ایک استبدادی جماعت تمام طریقِ پیداوار پر قبضہ کرلے اور صرف حکومتی طبقے کا مفاد مدنظر رکھے وہاں پوری چنگیزی ہوجاتی ہے۔ اکتوبر کے انقلاب کی برسی پر ہماری پارٹی نے جو مظاہرے کئے ان کو اسٹیلن نے بغاوت کے نام سے پکارا اور بائیں جماعت کے ممبروں کو گرفتار کرنا شروع کردیا۔

فینرلٹی :۔ جلوس میں پانچ لاکھ کے قریب آدمی تھے۔ مسٹر ٹراٹسکی اس میں سے کتنے آپ کے ہم درد ہوں گے ؟

ٹراٹسکی :۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ اس جلوس میں وہ پرانے ممبر نہیں تھے جنھوں نے اکتوبر کے انقلاب میں حصہ لیا تھا بلکہ نئے ممبر تھے جو نئے قواعد کے مطابق ممبر بنائے گئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۴ء سے قبل وہ ممبر سب سے زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جس نے اکتوبر کے انقلاب میں حصہ لیا ہو لیکن سنہ ۱۹۲۴ء میں سب سے زیادہ قابل قدر ممبر وہ ہوگیا جس نے بیس پچیس سال تک ایک ہی فیکٹری میں کام کیا ہو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مزدور کی اہمیت بڑھ گئی اور ایک مزدور حکومت میں ایسی تبدیلی ہونی ہی چاہیئے تھی لیکن دراصل یہ قانون اور اغراض کے لئے بنایا گیا تھا اس قانون کے یہ معنی ہوئے کہ سنہ ۱۹۰۵ء سے جو مزدور ایک ہی فیکٹری میں کام کرتا رہا ہو وہی سب سے اہم ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ء اور اس کے بعد کا زمانہ وہ تھا جبکہ مزدور طبقہ انقلاب کے لئے تیار ہو رہا تھا اور آئے دن ہڑتالیں اور مزدوروں کی پکڑ دھکڑ ہوتی رہتی تھی۔ جو مزدور سیاسی حالات کو سمجھتے تھے اور انقلابی جدوجہد میں حصّہ لیتے تھے ان کو زار کی حکومت پکڑ کر سائبیریا بھجا دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو مزدور

فیکٹریوں میں باقی رہ جاتے تھے۔ وہ بہت ہی کمترین اور جی حضوری قسم کے انسان ہوتے تھے جب پارٹی کے ممبر ہونے کی یہ سب سے اہم شرط ٹھہری کہ مزدور بیس سال تک ایک ہی فیکٹری میں رہا ہو تو دوسرے الفاظ میں جو سب سے زیادہ نیازمند' فدوی اور "میں ہوں آپ کا تابعدار" قسم کا مزدور ہوا وہ ہی پارٹی کا سب سے اہم ممبر ٹھہرا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں پارٹی میں انقلابی قسم کے لوگ بہت کم ہوگئے تھے اور حکومت کے اشارے پر چلنے والے جی حضوری بہت زیادہ ہوگئے تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میرا خیال ہے کہ بیس تیس ہزار مزدور ہمارے ہم خیال تھے کیونکہ جب ہماری پارٹی کے لوگ جھنڈے لے کر نکلے تو اُن کے ساتھی بعض مزدوروں نے اُن کو منع نہیں کیا۔ بہت سے مزدوروں کی اخلاقی ہمدردی پارٹی کے ساتھ تھی لیکن ہمارے ساتھ مل کر وہ کوئی عملی جدوجہد کرنے کو تیار نہیں تھے اُن کا یہ رویّہ تھا" دیکھو وقت آئے گا تو دیکھیں گے"۔ ہماری پارٹی انقلاب کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ مظاہرہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اسٹیلن نے اس مظاہرے کو بغاوت کہنا شروع کردیا اور پندرھویں کانگریس کے بعد ایک قلیل عرصے میں تمام ملک سے گیارہ ہزار کے قریب آدمی سائبریا جلاوطن کردیے۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان ہماری پارٹی کے قریب ساٹھ ہزار مرد اور ایک لاکھ عورتیں اور بچے سائبریا میں جلاوطن تھے۔

گولڈمین:۔ (ٹروٹسکی کا وکیل)، اس کمیشن کے سامنے ٹروٹسکی کے بیانات دلوانے کا یہ مقصد ہے کہ اسٹیلن کی حکومت نے ٹروٹسکی پر جو الزامات لگائے ہیں ان کی تردید میں ثبوت پیش کئے جائیں کیرف کے قتل کے بعد سے سوویٹ یونین میں سات سیاسی مقدمے ہوچکے ہیں جن میں بالواسطہ ٹروٹسکی کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں جو مقدمے ہوئے ان میں براہِ راست ٹروٹسکی اور اس کے لڑکے کو ملزم ٹھہرایا گیا ہے اور سوویٹ یونین کی عدالت نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ یہ دونوں سوویٹ یونین میں جب بھی داخل ہوں فوراً گرفتار کرلئے جائیں

الزامات کی فہرست حسب ذیل ہے :-

(۱) سوویٹ یونین کے حکومتی طبقے کے سربرآوردہ لوگوں کے قتل کی سازشیں، خاص کر کیرف کا قتل۔

(۲) سوویٹ یونین میں کارخانوں۔ ریلوں وغیرہ کے تباہ کرنے کی عملی تدبیریں تاکہ اقتصادی نظام درہم برہم ہو جائے۔

(۳) سوویٹ یونین کے نظام کو تباہ کرنے کے لئے ایک جماعت کی تنظیم جس کا مقصد یہ ہو کہ مزدوروں اور فوجیوں کو قتل کیا جائے۔ سامانِ حرب بنانے کے کارخانوں کو تباہ کیا جائے تاکہ سوویٹ یونین کی فوجی طاقت کو صدمہ پہنچے۔

(۴) جرمنی اور جاپان سے خفیہ سازباز۔ تاکہ یہ دونوں ملک، سوویٹ یونین پر حملہ کریں اور یونین میں اندرونی بدامنی پیدا کرنا تاکہ ٹروٹسکی خود سوویٹ یونین کا حاکم بن جائے

(۵) سوویٹ یونین میں سوشلسٹ طریق پیداوار کا خاتمہ اور سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش۔

میں اس کمیشن کے روبرو ثبوت پیش کروں گا کہ مندرجہ بالا الزامات غلط ہیں اور جو افسوسناک واقعات یونین میں رونما ہو رہے ہیں ان کی تمام ذمہ داری وہاں کے حکومتی طبقے پر ہے۔

مسٹر ٹروٹسکی کیا آپ عام اطلاع کے لئے اپنی سوانح عمری مختصراً بیان کریں گے۔

ٹروٹسکی: میرا اصل نام لیون ہے۔ باپ کا نام برونسٹین تھا۔ آج کل میکسیکو کے ایک مقام کیوکن میں اپنی بیوی اور چار سکرٹیریوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا پیشہ تصنیف و تالیف ہے۔ تقریباً چالیس سال سے میں مارکس کے انقلابی تخیل کا حامی ہوں اور اس کی اشاعت میں سرگرم ہوں۔ میں نے سب سے پہلے روس میں ۱۸۹۷ء میں ایک غیر قانونی مزدور سبھا قائم کی تھی جس کی بنا پر مجھے گرفتار کر لیا گیا تھا اور ڈھائی سال تک جیل میں رکھا گیا تھا۔ پھر چار سال کے لئے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ وہاں بھی میں نے ایک غیر قانونی مزدور سبھا بنائی

صرف دو سال ہی گذرے تھے کہ میں سائبریا سے فرار ہو گیا۔ بھاگتے وقت پاس پورٹ پر میں نے اپنا نام ٹروٹسکی لکھا تھا اور اسی نام سے میں مشہور ہوں۔ سائبریا سے بھاگ کر میں لندن پہنچا اور اسکارا اخبار کے دفتر میں کام کرنے لگا۔ یہ لینن کا اخبار تھا جس کا یہ مقصد تھا کہ جو روسی نوجوان تعلیم کے لئے یورپ آئے تھے اُن میں مارکس کے فلسفے کی تبلیغ کی جائے۔ میں ۱۹۰۵ء میں خفیہ طریقے پر روس گیا اور ایک سال تک انقلابی تحریک پھیلاتا رہا۔ سال کے آخر میں پیٹر وگریڈ کے سوویٹ کا ممبر ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد اس کی انتظامیہ کمیٹی کا ممبر ہو گیا اور آخر کار سوویٹ کا صدر ہو گیا۔ اس وقت میری عمر قریب ۲۶ سال کے ہو گی۔ میں نے ۱۸ سال کی عمر سے انقلابی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اس لئے کچھ تعجب نہیں کہ میں ۲۶ سال کی عمر میں سوویٹ کے پہلے صدر کی گرفتاری پر صدر منتخب ہو گیا۔ اس وقت میں نہ صرف صدارت کا کام انجام دیتا تھا بلکہ دو اخباروں کا ایڈیٹر بھی تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب حکومت نے تشدد شروع کیا تو سوویٹ کے دوسرے ممبروں کے ساتھ میں بھی گرفتار ہو گیا اور ڈیڑھ سال جیل میں رہا اس کے بعد مجھے ساری عمر کے لئے جلاوطن کر کے سائبریا روانہ کر دیا گیا۔ لیکن وہاں میں آٹھ دن رہ کر پھر فرار ہو گیا اور آسٹریا پہنچا۔ وہاں سے ایک اخبار جاری کیا اور سات سال تک اس اخبار کے ذریعے روسی مزدوروں میں تبلیغی کام کرتا رہا۔ میں غیر قانونی طریقے پر روس میں اپنا اخبار داخل کرتا تھا۔ اور آسٹریا میں بھی مزدوروں کی تنظیم کا کام کرتا تھا جب ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور آسٹریا میں روسی گرفتار کئے جانے لگے تب میں سوئزر لینڈ چلا گیا اور وہاں مزدوروں کی تحریک میں حصہ لیتا رہا۔ سوئزر لینڈ کے دوران قیام میں ایک کتاب "جنگ اور انٹرنیشنل" لکھی جنگ کے دوران میں "دوسری انٹرنیشنل" کے ممبروں کی روش بدل گئی تھی۔ وہ بین الاقوامی نقطہ نگاہ چھوڑ کر قومیت پسند بن گئے تھے۔ میں ۱۹۱۴ء کے آخر میں فرانس گیا یہاں سے ڈھائی برس تک روسی زبان میں اخبار نکالا اور فرانس میں جنگ کے خلاف تبلیغ کرتا رہا۔ تبلیغ کرنا اس لئے ممکن ہوا کہ جنگ شروع ہونے کے دو سال بعد تک

فرانس میں اظہار خیال اور تحریر و تقریر کی کافی آزادی تھی۔ لیکن ۱۹۱۶ء کے آخر میں مجھے فرانس سے اسپین پہنچا دیا گیا۔ جہاں ایک ہفتے بعد مجھے حراست میں لے لیا گیا۔ اور کوئی ایک ماہ بعد امریکہ پہنچا دیا گیا۔ امریکہ پہنچ کر بھی میں جنگ کے خلاف تبلیغ کرتا رہا۔ اور وہاں کی سوشلسٹ پارٹی سے بحث و مباحثے میں سرگرم رہا۔ جب پیٹروگریڈ سے روسی انقلاب کی خبریں آئیں تو سب روسی وطن کی طرف روانہ ہو گئے جن میں میں بھی تھا۔ لیکن کناڈا پہنچنے پر انگریزی پولیس نے جرمن جاسوس ہونے کے الزام میں مجھے پکڑ لیا اور جرمن کیمپ میں بھیج دیا۔ انگریز خود یہ جانتے تھے کہ میں جرمن جاسوس نہیں ہوں۔ انگریزی سفیر نے خود مجھ سے کہا "ہم نے زار کی حکومت کے کہنے پر تم کو پکڑ لیا ہے"۔ زار روس کی حکومت ہمیشہ سے میرے خلاف تھی اور دراصل اس نے ہی مجھے فرانس سے نکلوایا تھا۔ فرانس کے وزیر اعظم پر زور ڈالا گیا کہ مجھے نکال دے۔ واقعہ یہ تھا کہ اسی زمانے میں ٹولن میں روسی سپاہیوں نے افسر کو قتل کر دیا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ فرانس کی آزاد فضا میں رہ کر روسی سپاہیوں نے روسی افسروں کے استبداد کو ختم کرنا چاہا تھا۔ لیکن روسی جاسوسوں نے میرا اخبار ان سپاہیوں میں بانٹ دیا اور یہ مشتہر کر دیا کہ میرا اخبار پڑھنے سے سپاہیوں کے خیالات فاسد ہو گئے اور انھوں نے افسر کے خلاف بغاوت کر دی۔ فرانس کے اعلیٰ افسر میرے پاس آئے اور کہنے لگے "روس سے ہماری دوستی ہے اور وہ حکومت آپ کے قیام فرانس کے خلاف ہے اس لئے آپ معاف کریں گے۔ اگر ہم آپ کو مہمان نہ رکھ سکیں"۔ ہاں! تو جب میں کناڈا کیمپ میں مقید تھا تو لینن نے میرے جرمن ایجنٹ ہونے کے متعلق ۱۹۱۷ء میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا پہلا جملہ یہ ہے:۔

"کیا ایک لمحے کے لئے بھی کوئی انسان یہ یقین کر سکتا ہے کہ ٹراٹسکی جیسا انسان جس کی عمر انقلاب کی خدمت میں گذری کبھی بھی جرمن حکومت کا گرگا ہو سکتا ہے۔ جو شخص اس کو جرمن جاسوس بتاتا ہے وہ ٹراٹسکی پر بہتان لگاتا ہے۔"

کچھ عرصے بعد پٹیرو گریڈ کے سوویٹ نے حکومت کناڈا پر زور ڈال کر مجھے رہائی دلوادی اور میں روس پہنچ گیا۔ میں شروع میں بولشیوک پارٹی کا ممبر نہ تھا بلکہ میری ایک الگ پارٹی تھی جس کے تین، چار ہزار ممبر تھے لیکن میری پارٹی اور بالشیوک پارٹی کا پروگرام ایک ہی تھا جب پروگرام ایک تھا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ دونوں کو ملا دیا جائے۔ اس کے متعلق لینن سے ذکر آیا اس کی بھی یہی رائے ہوئی چنانچہ کمیونسٹ پارٹی کانگریس میں اس اتحاد کا اعلان کر دیا گیا۔ مجھے دو چار ماہ ہی بالشیوک پارٹی میں ہوئے ہوں گے کہ کرنسکی کی سرکار نے تشدد شروع کر دیا لینن نے فن لینڈ میں پناہ لی لیکن مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ ہم دونوں پر یہ الزام تھا کہ ہم جرمن جاسوس ہیں۔ زینوویف اور کیمونیف پر بھی یہی الزام لگایا تھا۔ اسٹیلن چونکہ اس زمانے میں مشہور نہیں ہوا تھا اس لئے نظریں اس پر نہیں پڑیں کچھ عرصے بعد کورنیلف نے کرنسکی کے خلاف بغاوت کر دی۔ کرنسکی کو ہماری مدد کی ضرورت ہوئی۔ اس لئے ہمیں رہائی مل گئی۔ میں جیل سے سیدھا ونٹر پیلس پہنچا اور سرکاری نمایندوں کے ساتھ باتیں کیں۔ جب اکتوبر کا انقلاب ہوا تو میں نے اس میں بہت نمایاں حصہ لیا جس کا ذکر اسٹیلن یوں کرتا ہے:۔

"اکتوبر کے انقلاب کی کامیابی کا سہرا ٹروٹسکی کے سر ہے۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فوج کا سوویٹ کی موافقت کرنا اور انقلابی پارٹی کے عمل میں نتیجہ خیز تیزی پیدا کرنا ٹروٹسکی کا ہی کام تھا۔"

لیکن چھ سال بعد ۱۹۲۴ء میں اسٹیلن اپنی کتاب "ٹروٹسکی ازم اور لینن ازم" میں لکھتا ہے

"ٹروٹسکی نے اکتوبر کے انقلاب میں کوئی نمایاں حصہ نہ لیا اور در اصل لے بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ پارٹی میں نسبتاً نیا آدمی تھا۔"

جب بالشیوک پارٹی کے ہاتھ میں حکومت آگئی تو میں پیٹروگریڈ کے سوویٹ کا صدر رہو گیا اور فوجی کمیٹی کا سکریٹری بھی رہا۔ اس کے بعد وزیر خارجہ ہو گیا اور پھر وزیر فوج۔ میں تین برس تک روسی فوج کی تنظیم میں مشغول رہا۔ کام کی اتنی شدت تھی کہ تین سال تک ریل کے ڈبے

کو اپنا گھر بنانا پڑا۔ خانہ جنگی ختم ہونے پر میں ملک کی اقتصادی ترقی کی طرف متوجہ ہوا ۱۹۲۳ء تک میں وزیر جنگ رہا اور سیاسیہ کیٹی یعنی پولٹ برو جو کمیونسٹ پارٹی کا اہم ادارہ تھا اس کا ممبر رہا۔ مئی ۱۹۲۴ء میں مجھے وزارت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ میرے علیحدہ کرنے کی سازش میں اسٹیلن۔ رینوئیف اور کمیونیف شامل تھے۔ یہ تینوں اصحاب مثلث کہلاتے تھے اور ان کا یہ اتحاد میرے خلاف استعمال ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنا اثر ملک کے گوشے گوشے میں قائم کر لیا تھا اور تار کے خفیہ لفظ بنا لئے تھے۔ یہ سب میرے خلاف تھا میں نے کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم میں بہت اہم حصہ لیا تھا۔ پارٹی کے پروگرام اور اہم اعلانات میری بھی محنت کے مرہون منت ہیں۔ مجھے ۱۹۲۷ء میں پارٹی سے اس لئے نکال دیا گیا کہ سوویٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین میں سر برآوردہ لوگوں کی جو ذاتیں بن گئی تھیں میں اُن کی مخالفت کرتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ ان ذاتوں نے خاص حقوق کی جو رسم جاری کر لی ہے اس کو ختم کیا جائے تاکہ طریق پیداوار سے ملک کے تمام باشندوں کو یکساں فائدہ ہو۔ میرا بین الاقوامی نقطۂ نگاہ تھا اس اختلاف کی بنا پر مجھے پارٹی سے نکال دیا گیا اور وسط ایشیا کے ایک مقام الما آتا بھیج دیا گیا۔ وہاں میں تصنیف کا کام کرتا رہا اور دو کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں۔ "لینن کے بعد تیسری انٹرنیشنل" اور "مستقل انقلاب" روسی حکومت نے ان کو چھاپنے کی اجازت نہیں دی اس لئے وہ امریکہ میں چھپی ہیں الما آتا میں ایک روز روس کی خفیہ پولیس کا افسر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "آپ اپنی تصنیف کا کام بند کر دیں" مجھے غصہ آگیا اور میں نے اُسے سخت سست کہا۔ اس وقت تو وہ چلا گیا لیکن اگلے روز اُس نے آکر یہ اطلاع دی کہ مجھے کسی دوسرے ملک میں بھیجا جا رہا ہے۔ اب مجھے ترکی روانہ کر دیا گیا۔ جہاں میں ساڑھے چار سال رہا۔ وہاں سے میں نے ایک اخبار نکالا جو میرے خیالات کا آئینہ ہے۔ ترکی کے دوران قیام میں میں نے بہت سی کتابیں اور مضمون لکھے۔ ساڑھے چار سال میں صرف ایک ماہ کے لئے

ترکی سے باہر گیا وہ بھی اس لئے کہ کوپینگین کی یونیورسٹی کے لڑکوں نے مجھے انقلاب روس پر تقریر کرنے کو بلایا تھا۔ میں ۱۹۳۳ء میں فرانس چلا گیا وہاں قریب دو سال کے گذارے اور تصنیف میں مشغول رہا۔ لیکن جب ۱۹۳۵ء میں فرانس میں فسطائی شورش ہوئی اس وقت مخالفوں کو موقع مل گیا۔ گیوبل نے جرمن اخباروں میں ایک خیالی سازش میرے سر منڈھی اور فرانس کے اخباروں نے اس کو بڑی سرخیاں دے کر چھاپا۔ گیوبل نے مجھ پر یہ الزام لگایا تھا کہ فرانس میں فسطائی بغاوت میں نے کرائی ہے۔ اس وقت فرانس کی حکومت نے مجھ کو کہا کہ ملک کے اخباروں نے اس قدر شور مچا دیا ہے کہ ہم آپ کے خلاف کچھ کارروائی کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم آپ کو بظاہر تو فرانس سے اخراج کا حکم دیں گے مگر آپ خفیہ طریقے پر رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اعلان نکل گیا کہ ٹروٹسکی نکال دیا گیا ہے مگر میں اس اعلان کے سال بھر بعد تک فرانس میں موجود رہا۔ کچھ دن بعد ناروے کی حکومت تبدیل ہو گئی اور وہاں عنانِ حکومت مزدور جماعت کے ہاتھوں میں آگئی۔ اس وقت مجھے خیال ہوا کہ ناروے میں زیادہ آرام اور آزادی سے گذرے گی۔ چلو وہاں چلیں۔ مجھے ناروے میں داخلے کی اجازت مل گئی اور میں اوسلو میں مقیم ہو گیا۔ یہاں بھی وہی تصنیف کا کام کرتا رہا ۱۹۳۶ء میں زینوویف، کیمونیف کے مقدمے کے بعد ناروے کی حکومت نے مجھے پکڑ لیا اور یہ الزام لگایا کہ میں اُن کے ملک میں سیاسی ریشہ دوانیاں کر رہا ہوں۔ اور میرے ایک مضمون کو جو دراصل فرانس کے متعلق تھا اور امریکہ کے ایک اخبار نیشن میں چھپا تھا اس کو ریشہ دوانیوں کے ثبوت میں پیش کیا۔ لیکن میری گرفتاری کی اصل وجہ سوویٹ یونین کا دباؤ تھا یہ بات مجھے اس طرح معلوم ہے کہ ناروے میں میرے بارسوخ دوست ہیں۔ دوسرے ناروے چھوٹی سی جگہ ہے وہاں ہر بات فوراً معلوم ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ علم ہوا تھا کہ یونین کا سفیر ناروے کے وزیر خارجہ سے ملنے آیا تھا اور میری گرفتاری کی بابت کہتا تھا۔ کچھ روز بعد ناروے کی حکومت نے مجھے رکھنے سے انکار کر دیا۔ میرے فرانسیسی دوست

بڑے پریشان ہوئے۔ کیونکہ ناروے سے نکلنے کے یہ معنی تھے کہ روسی خفیہ پولیس گرفتار کرے گی۔ ۹ ردسمبر کو مجھے یہ معلوم ہوا کہ میکسیکو کی حکومت نے مجھے داخلے کی اجازت دے دی ہے۔ یہ آج تک نہ معلوم کرسکا کہ کس کی کوشش سے میں میکسیکو پہنچا یہ میری سیاسی زندگی کے خدوخال ہیں۔ میرے چار بچے تھے، دو لڑکے اور دو لڑکیاں ایک لڑکی نینا تھی۔ ۱۹۲۸ء میں اس کے خاوند کو روسی خفیہ پولیس نے گرفتار کرلیا۔ وہ دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ زندگی کی پریشانیاں بہت بڑھ گئیں۔ وہ تنہا اس کا مقابلہ نہ کرسکی۔ چنانچہ نہ خاک سوگئی۔ دوسری لڑکی زینا تھی وہ علاج کے لئے جرمنی آئی ہوئی تھی اس کا خاوند اور بچے روس ہی میں تھے۔ جرمنی کے دوران قیام میں اس نے سیاسی تحریکات میں حصہ نہیں لیا لیکن میرے ساتھ اس کا بھی روس میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ خاوند اور بچوں کی جدائی نے اس کی طبیعت پر گہرا اثر کیا اور اس نے خودکشی کرلی۔ میرا ایک بیٹا سرگی ہے وہ یونین میں کسی اسکول میں استاد تھا۔ وہ سیاست سے بے بہرہ تھا اور اسی لئے اس کو خیال تھا کہ روسی حکومت اس کو کچھ نہ کہے گی۔ میری جلاوطنی کے بعد بھی وہ روس میں رہتا تھا۔ لیکن کب تک۔ آخر اس پر بھی مزدوروں کو زہر دینے کا الزام لگایا گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اب وہ کہاں ہے۔ لیکن ہے وہ سوویٹ یونین میں۔ دوسرا بیٹا سیٹوف میرے ساتھ ہے۔ اس کو بھی سوویٹ یونین میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔

گولڈمین:۔ مسٹر ٹروٹسکی کیا آپ ریڈک وغیرہ کے اقرار جرم کے باوجود ماسکو کے مقدمے کو سوویٹ یونین کے حکومتی طبقے کی سازش سمجھتے ہیں۔ اگر ریڈک وغیرہ مجرم نہ ہوتے تو وہ کیوں کھلے اجلاس میں اقرار جرم کرتے۔

ٹروٹسکی:۔ مجھے معلوم ہے کہ ریڈک اور اس کے ساتھیوں کے اقرار جرم سے جو انھوں نے کھلے اجلاس میں دنیا کے پریس کے سامنے کیا عوام مغالطے میں پڑ گئے ہیں۔ عوام کا یہ خیال ہے کہ پریس کے نمائندوں کی موجودگی میں ریڈک وغیرہ جو کچھ بھی چاہتے کہہ سکتے تھے۔ وہاں ان

پر کوئی بیرونی دباؤ نہیں تھا جب انھوں نے خود اقرارِ جرم کر لیا تو شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی اور چونکہ اُن کے بیانات میں ٹروٹسکی اس سازش کا سرغنہ بنایا گیا ہے اس لئے یہ ضرور مجرم ہے۔"
میں اس خیال کی تردید میں بجائے خود کچھ عرض کرنے کے تاریخ کے مشہور پروفیسر چارلس اے بیرڈ کا خیال پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ پروفیسر موصوف نے اس تحقیقاتی کمیشن میں شرکت سے انکار کر دیا۔ لیکن انھوں نے ایک فاضلانہ تحریر لکھی ہے۔ جو پروفیسر صاحب کی علمیت کا اندازہ کرتے ہوئے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں "میں نے ماسکو کے مقدمے کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ٹروٹسکی کے خلاف جو کچھ بھی الزامات ہیں اُن کا ثبوت ریڈک اور اُس کے ساتھیوں کے بیان کے سوا کچھ نہیں۔ تاریخ عالم کا مطالعہ مجھے یہ بتاتا ہے کہ اقرارِ جرم خواہ وہ بغیر کسی بیرونی دباؤ کے ہی کیوں نہ ہو کسی جرم کا ثبوت نہیں ہو سکتا" اس جملے کے الفاظ "ہی کیوں نہ ہو" سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل پروفیسر بیرونی دباؤ کے مسئلے کو قابلِ بحث سمجھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے قرونِ وسطیٰ کی مذہبی عدالتوں اور توہمات کے تاریک زمانے سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ مجمع کے سامنے اقرار جرم ہوا۔ اگرچہ مجرم نے جرم نہیں کیا تھا۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک جب تک کسی کے خلاف خارجی شہادت نہ ہو اس وقت تک اس کو مجرم نہیں ٹھہرا سکتے۔ اس اصول پر اُن کا خیال ہے کہ جو شخص مجھ کو مجرم ٹھہرائے اس کو کوئی ایسی خارجی شہادت پیش کرنی چاہئے جس کا غلط اور صحیح ہونا جانچا جا سکے۔ اور اگر میرے خلاف کوئی ایسی شہادت دستیاب نہیں ہو سکتی جس کو ٹھونک بجا کر دیکھا جا سکے تو میں مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔ جب پروفیسر صاحب کا یہ خیال ہے کہ اقرار جرم کسی کو مجرم گرداننے کے لئے کافی شہادت نہیں ہے اور میں مجرم ثابت نہیں ہو سکتا تو جنھوں نے اقرار جرم کیا وہ بھی مجرم ثابت نہیں ہو سکتے۔ یہ مقدمہ سوویٹ یونین کی حکومتی طبقے کی میرے اور میری پارٹی کے خلاف ایک سازش ہے۔ اس مقدمے میں حکومتی طبقہ سوائے زبانی شہادتوں کے کوئی تحریری شہادت پیش نہ کر سکا اور جن شہادتوں کو خرادیہ

چڑھایا جاسکتا تھا۔ اُن کو میں نے غلط ثابت کر دیا۔ چند مجرموں نے یہ کہا کہ وہ مجھ سے فلاں
وقت فلاں جگہ ملے اور میں نے اُن کو ہدایات دیں۔ میں نے یہ ثابت کر دیا کہ میں اس وقت اس مقام پر
ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ماسکو کے مقدمے کی دو خصوصیات ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں مجرموں
کے خلاف کوئی ایسی شہادت پیش نہیں کی گئی جس کو ٹھونک بجا کر دیکھا جاسکے۔ دوسرے
اقرار جرم میں بھیڑ چال ہے۔ ہر مجرم قریب قریب ایک سے الفاظ میں اقرار جرم کرتا ہے۔
اور حکومت کا وکیل جو سوال کرتا ہے اس کا جواب 'جی ہاں' کے سوا اور کچھ نہیں دیتا۔
سب ملزموں کی یہ بھیڑ چال ایک سمجھ دار انسان کو یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ یہ
سب جعلی کارروائی ہے۔

گولڈمین:۔ مسٹر ٹروٹسکی۔ جلاوطنی سے قبل آپ کا سوویٹ یونین کی صنعت و حرفت کی بابت
کیا خیال تھا؟

ٹروٹسکی:۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک میں اس پر لڑا کہ صنعت و حرفت کو تیزی سے ترقی دینی چاہئے
میں نے ۱۹۲۵ء میں ایک کتاب "روس کا رخ سرمایہ داری کی سمت ہے یا سوشلزم کی سمت"
لکھی تھی جس میں یہ بتایا تھا کہ اشیاء کی پیداوار کو موجودہ مقدار سے بیس گنا یا اس سے بھی
زیادہ بڑھایا جاسکتا ہے۔ اس وقت اسٹالن اور اس کی پارٹی نے مجھے مخبوط الحواس کہا
اور صنعتی دیو کا لقب بطور طعن دیا۔ سوویٹ حکومت نے میرے ساتھیوں کو بھی صنعتی دیو کہنا
شروع کر دیا۔ لیکن واقعات نے یہ بتایا کہ میں مخبوط الحواس نہیں تھا۔ پیداوار میرے اندازے سے
بھی زیادہ تیزی سے بڑھی۔ جب میں ۱۹۲۷ء میں برقابی اسٹیشن کے بنوانے پر شدت
سے مُصر تھا تو مرکزی کمیٹی میں اسٹالن نے مجھے یہ جواب دیا تھا کہ ہمارے لئے کسی قسم کا
برقابی اسٹیشن بنانا ایسا ہی مضر ہے جیسے کسان کے لئے گائے خریدنے کی بجائے گراموفون
خریدنا۔ اسٹالن یہ سمجھا۔ یہی نہیں کہ ملک کی صنعتی حرفتی ترقی کے بغیر سوشلزم چل ہی نہیں سکتا
اور اس کی ترقی کے لئے بجلی کا انتظام ملک کے لئے از حد ضروری ہے۔

گولڈمین:۔ جب پنج سالہ پروگرام شروع ہوا تو آپ نے کیا اظہار خیال کیا تھا۔

ٹروٹسکی:۔ پنج سالہ پروگرام ۱۹۲۸ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۹۳۲ء میں ختم ہوا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں پروگرام کا خیال پیدا ہوا اور یہ اندازہ لگایا گیا کہ پروگرام کی بموجب کام کرنے سے پہلے سال اس وقت کی پیداوار سے نوگنی زیادہ پیداوار ہوگی۔ دوسرے سال گھٹ کر آٹھ گنی رہ جائے گی اور اسی طرح گھٹتی رہے گی۔ یہاں تک کہ آخری سال صرف چار گنی رہ جائے گی۔ اس اندازہ سے مجھے سخت اختلاف تھا۔ یہ اختلاف جب بڑھا تو گرما گرمی کی نوبت آگئی۔ میں نے اس پروگرام کا نام بطور طعن "تخریب صنعت" رکھا کیونکہ اس پروگرام سے پست خیالی اور کم ہمتی ٹپکتی تھی۔ اور جس قدر پیدا ہو سکتا تھا یہ پروگرام اس سے بہت کم پر اکتفا کرتا تھا۔ میری مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ پروگرام دوبارہ بنا جس کا ذکر میں نے اپنی کتاب "روس میں اصلی حالت" میں کیا ہے۔ دوسرے پروگرام میں یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ پانچوں سال نوگنی پیداوار رہے گی۔ میں اس پر بھی لڑا اور میں نے بتایا کہ پیداوار قریب ۲۰ گنی ترقی کرسکتی ہے۔ زار کے زمانے میں موجودہ مقدار سے ۶ گنی زیادہ مقدار تھی میں نے اس کو تگنا کر دیا۔ ہماری پارٹی نے کہا کہ جو کچھ ترقی ہو سکتی ہے اس سے ہمارا اندازہ کہیں کم ہے ۲۰ گنی ترقی سے بھی زیادہ ترقی ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پروگرام شروع ہونے کے پہلے ہی سال یہ ظاہر ہو گیا کہ ہم جو کچھ کہتے تھے وہ ٹھیک تھا۔ صنعت بہت تیزی سے بڑھی۔ چنانچہ پھر پروگرام کو تبدیل کرنا پڑا۔ اب حکومتی طبقے کو یہ سوجھی کہ پروگرام پانچ سال کی بجائے چار سال ہی میں پورا کر دینا چاہیئے۔ میں نے اپنے اخبار بولیٹن میں بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ جو عملی لوگ نہیں ہوتے ہیں اُن کی خاص خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کام شروع کرنے سے قبل وہ ترقی کے امکانات کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور جب خلاف توقع اچھے نتیجے نکلتے ہیں تو اندھا دھند ترقی کی کوشش کرتے ہیں میں حکومتی طبقے کی اس تیزی کے خلاف تھا۔ کیونکہ مجھے اس کے تباہ کن نتیجے کی خبر تھی۔ اس وقت میری

تردید میں یہ کہا گیا کہ ملک پر حملہ ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے اور جتنی جلدی ممکن ہو سکے ہمیں
روس کی اقتصادی حالت اس معیار پر پہنچا دینی چاہیئے جس پر دشمنوں کی ہے تاکہ مقابلہ ہو سکے
چنانچہ روس میں امریکن طرز کی فیکٹریاں بنا دی گئیں لیکن سڑکیں ندارد۔ رسل و رسائل کا انتظام
مفقود۔ فیکٹری کے مزدوروں کے لئے مکان نہیں بنے اور جہاں بنے وہاں صفائی کا کوئی
انتظام نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وبا پھیل گئی۔ مزدور مر گئے۔ فیکٹریاں بند ہو گئیں یا اُن کی پیداوار
گھٹ گئی۔ حکومت نے اپنی نالائقی کا الزام دوسروں کے سر منڈھا۔ فیکٹری کے کارکنوں پر
مقدمے چلا دیے کہ یہ ٹراٹسکی کے پیرو ہیں اور دیدہ دانستہ ملک کی اقتصادی ترقی کو روکنا
چاہتے ہیں۔ سرمایہ داری میں جنسوں کی کمی و بیشی کا اندازہ قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ سے ہوتا
ہے۔ لیکن اشتراکی نظام میں بازاری داموں کی غیر موجودگی کی وجہ سے خود حکومت کو باضابطہ
اعداد و شمار کی مدد سے جنس اور خریدار میں توازن قائم رکھنا ہوتا ہے یعنی یہ کہ ایک جنس کس
مقدار میں بنے کہ سماج کے لئے کافی ہو۔ لیکن یونین میں کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ کیا شے کس مقدار
میں بنانی چاہیئے اس لاعلمی کی بنا پر صنعت و حرفت میں بہت ہڑبونگ مچ گئی۔ میں نے اس
زمانے میں صاف طریقے پر یہ کہہ دیا تھا کہ ہم اپنے تاریک ماضی کو فراموش نہیں کر سکتے اور
یہ تیزی بجائے اقتصادی ترقی کے آشوب (Crisis) پیدا کر دے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا

گولڈمین :۔ اب آپ کو جو کچھ اخباروں کے ذریعے سے معلوم ہوتا رہتا ہے اس کی بنا پر یونین
کی صنعتی ترقی کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟

ٹراٹسکی :۔ یونین میں بہت ترقی ہو رہی ہے۔ ہمیشہ سے میرا یہ خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار
کی نسبت سوشلسٹ طریق پیداوار سے صنعت و حرفت بہت تیزی سے ترقی کر جاتی ہے
یونین میں جو ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ وہاں کا حکومتی طبقہ نہیں ہے بلکہ انفرادی ملکیت
کا ختم ہو جانا اور پروگرام سے کام کرنا ہے اگر روس میں جمہوریت ہوتی تو اس سے بھی
زیادہ ترقی ہوتی۔ میں سرمایہ دارانہ معترضین کے مقابلے میں یونین کے اقتصادی حالات کی

حمایت کرتا ہوں لیکن حکومتی طبقے کی پالیسی کے نقائص بھی بتاتا ہوں۔

گولڈمین:۔ کیا آپ مختصراً یہ بتائیں گے کہ اجتماعی طریق زراعت کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟

ٹراٹسکی:۔ زراعت میں بھی غیر معمولی عجلت سے کام لیا گیا۔ پہلا پروگرام اس خیال سے شروع کیا گیا تھا کہ جملہ مزروعہ آراضی کی ۲۰ یا ۲۲ فی صدی میں اجتماعی طریق زراعت جاری کیا جائے گا۔ لیکن پروگرام کے تیسرے سال ہی ۶۰ فی صدی کر دیا گیا۔ ہم نے مخالفت کی کہ مشین نہیں، کاریگر نہیں۔ ملک میں سڑکیں نہیں۔ رسل و رسائل کا سامان نہیں۔ اُن کی عدم موجودگی میں ساٹھ فی صدی اراضی میں اجتماعی طریق زراعت شروع کرنا تباہی کو دعوت دینا ہے۔ لیکن حکومتی طبقے نے نہیں مانا اور اس کے طریق کار نے پروگرام کو خاک میں ملا دیا زراعت میں ترقی تو کیا ہوتی تھی لیکن اس عجلت کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ لاکھوں کسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ میں اجتماعی طریق زراعت کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن جس طریق پر حکومتی طبقے نے اس کو شروع کیا اس کا مخالف ضرور ہوں۔ اجتماعی طریق پر کاشتکاری کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ کاشتکاروں میں اتحاد عمل کی عادت پیدا کی جاتی تاکہ کاشتکار خود اجتماعی طریق پیداوار کے حامی ہو جاتے۔ یہ ضروری تھا کہ کاشتکاروں کو اجتماعی طریق کے فوائد بتائے جاتے نہ کہ امیر کاشتکاروں (کولک) کو مار دیا جاتا۔ میں کولک سے ڈرتا نہیں۔ یہ دوسروں سے کام کراتے ہیں۔ میں سیاسی مصالح کی بنا پر کولک کو مارنے کا مخالف تھا۔ چنانچہ حکومتی طبقے نے جب کولک کو مارا تو بہت سے کسان خوف کے مارے یونین کے دشمنوں سے مل گئے۔ حکومتی طبقے کی حماقتوں کی وجہ سے عام تباہی ہونی لازمی تھی صنعت و حرفت اور زراعت سب میں کمی واقع ہوگئی۔ اب الزام سے بچنے کے لئے حکومتی طبقے نے لوگوں کو پکڑنا، مارنا، جلا وطن کرنا شروع کر دیا اور مجھ پر یہ الزام لگایا کہ اقتصادی زندگی کی بدحالی کا ٹراٹسکی ذمہ دار ہے۔ حکومت کا یہ کہنا کہ ٹراٹسکی دوسرے ملکوں میں بیٹھا ہوا یونین میں بدنظمی پیدا کر رہا ہے۔ اُن کی اپنی ناقابلیت کا اعتراف

کرتا ہے۔ کیا میں اتنا طاقت ور اور با رسوخ انسان ہوں کہ جلاوطنی کی حالت میں ایک غیر ملک
میں بیٹھا ہوا یونین کی فیکٹریاں اُڑوا رہا ہوں اور وہاں کی حکومت بے بس ہے۔ کوئی
صحیح الدماغ یہ باور نہیں کر سکتا۔ حکومتی طبقے نے اپنی حماقتوں کو چھپانے کے لئے اعداد وشمار
کے ماہروں کو غائب کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند کو سائبریا جلاوطن کر دیا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ
صنعتی پارٹی پر مقدمہ چلا دیا تھا اور پروگرام کے کمیشن میں جو ماہر ممبر تھے اُن کے خلاف مقدمہ
چلا دیا تھا تاکہ حکومت اپنی غلطیاں اُن کے سر منڈھ سکے۔ حکومت پہلے انجینیر سے اپنی
مرضی کے مطابق پروگرام بنواتی تھی اور جب وہ کامیاب نہیں ہوتے تو انجینیر پر مقدمہ
چلا دیا جاتا تھا۔ حالانکہ انجینیر کی اس میں کوئی ذمہ داری نہیں ہو سکتی تھی۔ سوکانٹ مورخ
گرومین ماہر اقتصادیات۔ بازارف جو پروگرام کے کمیشن کا ممبر تھا۔ پوپوف جو اعداد
وشمار کے محکمے کا افسر تھا ان سب کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں سما گئے۔ اُن کا جرم یہ تھا کہ انھوں
نے غلط اعداد وشمار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومتی
طبقے کے دیے ہوئے اعداد وشمار پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ دیدہ و دانستہ غلط
اعداد وشمار دینے کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ مثل مشہور ہے کہ جھوٹوں کا حافظہ نہیں
ہوتا اور کہیں نہ کہیں ان کی گرفت کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اسٹیلن نے پنج سالہ پروگرام کو جو ایک
سال قبل پورا ہو چکا تھا بہت کامیاب بتایا تھا اور یہ کہا تھا کہ آخر سال میں بیس گنی ترقی ہوئی
تھی لیکن مولوٹف نے اپنی ایک تقریر میں کہا "ہم پروگرام کے آخری سال میں صرف آٹھ
گنی پیداوار کر سکے" اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بیس گنے کے صرف آٹھ گنے رہ گئے
تو پانچ سال کا کام چار سال میں کس طرح ختم ہو گیا اور اس کی کیا وجہ کہ صرف آٹھ گنا ہو پایا۔
اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حکومتی طبقے نے طریق پیداوار کی مشکلات اور مختلف پہلوؤں
پر غور نہیں کیا اور کام شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف آٹھ گنی پیداوار ہو کر رہ گئی
میں نے اپنے اخبار میں حکومتی طبقے سے یہ سوال کیا تھا کہ اسٹیلن اور مولوٹف کے ان متضاد

بیانات کی کیا وجہ ہے لیکن بے سود۔ کوئی جواب نہ ملا۔ حکومتی طبقے نے اب یہ رویہ اختیار کر لیا ہے کہ جب کبھی عوام کی طرف سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ اقتصادی اور سیاسی نظام میں کچھ تبدیلی کی جائے حکومت فوراً یہ کہنے لگتی ہے کہ یہ بائیں جماعت کی ریشہ دوانیاں ہیں عوام بالکل مطمئن ہیں۔ حکومت طاقت سے ہر اصلاحی تحریک کو دبا دیتی ہے اس کا یہ نتیجہ یہ ہے کہ جس جماعت یعنی عوام کے بل پر سوشلزم کامیاب ہو سکتا ہے وہی گونگی ہو کر رہ گئی ہے

گولڈمین:۔ (کمیشن کے ممبروں سے مخاطب ہو کر) اب یہ بیان کیا جائے گا کہ مسٹر ٹروٹسکی کا انفرادی کشت و خون اور وہشت پھیلانے کی بابت کیا خیال ہے۔ ان کے خیالات واضح کرنے کے لئے ان کی تحریرات سے اقتباسات پیش کئے جائیں گے جس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ مسٹر ٹروٹسکی کبھی بھی کیرف کے قتل کی سازش میں شریک نہیں ہو سکتے تھے ۱۹۰۹ء میں ٹروٹسکی لکھتے ہیں "انفرادی کشت و خون کے لئے اس قدر توازن دماغی۔ دلیری اور راز داری کی ضرورت ہے کہ اس کو کبھی جماعتی شکل میں اختیار نہیں کیا جا سکتا مارکسٹ نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے ان کی پارٹی جماعتی تنظیم چھوڑ کر زار روس کے محل میں سرنگ لگانا حماقت سمجھتی ہے"۔ ٹروٹسکی ۱۹۰۹ء میں دوبارہ لکھتا ہے "انفرادی کشت و خون جہاں حکومت میں بے چینی اور گھبراہٹ پیدا کرتا ہے وہاں وہ انقلابی جماعت میں بھی خوف اور انتشار پیدا کر دیتا ہے۔ سرمایہ دار جماعت بھی پہلے سے زیادہ چوکنی اور مضبوط ہو جاتی ہے اور انقلابی جماعت کو کچل ڈالتی ہے، انفرادی کشت و خون اب روس میں تو ختم ہو گیا لیکن پنجاب اور بنگال میں رونما ہوتا رہتا ہے۔ یہ اس ملک کی سیاسی خامی کی علامت ہے۔ شاید مشرقی ممالک میں اس کا چرچہ کچھ عرصے رہے لیکن روس میں تو یہ ایک قصہ پارینہ بن گیا ہے۔ انفرادی غارت گری اگر اثر بھی کرتی ہے تو بہت غیر مستقل سرمایہ دار حکومت کسی خاص وزیر کے بل پر نہیں چلتی اگر کسی نے اس کو مار بھی دیا تو دوسرے

نے اس کی جگہ لے لی۔ اس قسم کے قتل سے سرمایہ دار نظام میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا وہ زندہ رہتا ہے اس کے برخلاف عوام میں ہراس اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا کرتا کہ کسی وزیر کو مار دینے سے کوئی نظام ختم ہو جایا کرتا تو مزدور جماعت کی تنظیم میں سالہا سال صرف کرنے کی کیا ضرورت تھی اگر چند خطاب یافتہ لوگوں کو بارود سے ڈرا دینے سے سرمایہ داری کی بنیادیں ہل جایا کرتیں تو پارٹی بنانے، جلسے کرنے، تبلیغ کرنے، الیکشن لڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کافی ہوتا کہ کسی طرح پارلیمنٹ کی گیلری میں چلے گئے اور تمام وزیروں کے گولی مار دی۔ ہمارے نزدیک انفرادی قتل و غارت مضر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے عوام سے خود اعتمادی جاتی رہتی ہے وہ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ کوئی دلیر آدمی انھیں مصیبت سے نجات دلائے گا۔" مسٹر ٹروٹسکی کیا آپ کیرف کے قتل کے اسباب و علل پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟

ٹروٹسکی:۔ اس قسم کی واردات اس وقت ہوتی ہے جب نوجوان طبقہ بالکل زچ ہو جاتا ہے۔ ہر نوجوان کی نمو کے لئے کھلی ہوئی سیاسی فضا ضروری ہے۔ آنے والی نسل موجودہ نسل کی ضرور مخالفت کرتی ہے اور اپنی راہیں خود پیدا کرنا چاہتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے۔ جب نوجوانوں پر سب طرف سے تخلیق کی راہیں بند ہو جاتی ہیں اس وقت اس قسم کے دھماکے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس خاص قتل کی بابت مجھے کوئی علم نہیں۔ بہت ممکن ہے اس قتل کی تہہ میں کوئی عورت ہو اور حکومتی طبقے نے کیرف کو بدنامی سے بچانے کے لئے یہ معاملہ دبا دیا ہو۔ کیرف کے قتل سے پہلے بھی میں یہ کہتا رہا ہوں کہ انفرادی قتل و غارت نقصان دہ ہیں۔

مسٹر ڈیوی (صدر کمیشن) مسٹر ٹروٹسکی یہ بتائیے کہ سوویٹ یونین کے باشندوں سے آپ کی خط کتابت نجی معاملات کی بابت ہے یا سازشی قسم کی ہے؟

ٹروٹسکی:۔ میں سوویٹ یونین کے باشندوں سے جو کچھ بھی خط کتابت کرتا ہوں اس کو اپنے اخبار میں چھاپ دیتا ہوں

میری خط و کتابت اس نوعیت کی نہیں ہوتی جس کو عام نہ کیا جاسکے۔ میری خط و کتابت میں یہی ہوتا ہے کہ ہمیں اپنا انقلابی فرض نہیں بھولنا چاہئے تاکہ جب ملک میں نئی لہر اُٹھے جس کا شروع ہونا لازمی ہے۔ تو ہم اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں۔

مسٹر ڈیوی:۔ تو آپ سازشی خط و کتابت سے انکار کرتے ہیں؟

ٹروٹسکی:۔ یہاں سازشی کا لفظ ذرا پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ معمولی عبارت جو کارڈ پر لکھی جاسکتی ہے وہ بھی سازشی قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ حکومت نے خط و کتابت کے خلاف سنسر لگا رکھا ہے۔ اگر میں کسی طرح سنسر سے بچاکر اپنا اخبار یونین میں پہنچادوں تو یہ بھی سازشی کارروائی کہلائے گی۔ لیکن ایسا میں ضرور کروں گا کیونکہ یہ میرے معتقدات کے خلاف نہیں ہے۔ یہ میرے اظہار خیال کا ایک طریقہ ہے میں اس کو ذرا اور واضح کر دوں۔ اکتوبر کے انقلاب سے قبل میرے لئے یہ ممکن تھا کہ مجھے پارٹی کے فیصلوں سے جب بھی اختلاف ہوتا تھا تو اپنے خیال کا اظہار علانیہ طریقے پر کرسکتا تھا کیونکہ ہماری پارٹی کی روایات جمہوری تھیں۔ لیکن اب جبکہ ہر جمہوری روایت استبدادیت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ حکومتی طبقے کی نظر میں ہر عمل سازشی ہوگیا ہے ہر وہ اختلاف جو دوسرے ملکوں میں سیاسی صحت کی علامت سمجھا جاتا ہے اس کو روس میں سازشی گردانا جاتا ہے۔ حکومت ہر اختلاف کو سازش شمار کرتی ہے میں جانتا ہوں کہ میں اور میرے دوست سوویٹ یونین، اٹلی، جرمنی میں سازشی طریقے پر اپنے خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں وہ صرف اس لئے کہ وہاں کسی دوسرے طریقے کی گنجائش ہی نہیں اگر ان ممالک میں جمہوریت ہوتی تو ہمیں خفیہ کارروائی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ہمارے خیالات سازشی نہیں ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ اسٹیلن کو مار ڈالو۔ فیکٹری کو اُڑادو۔ ہم روسی نوجوانوں سے یہی کہتے ہیں کہ اشتراکی طریق کاشت اور صنعت کو ترقی دینے میں بہت جلدی کی جارہی ہے اس عجلت سے جو خطرے پیدا ہوتے ہیں ان کا ضرور اعلان کرتے رہنا چاہیئے اگر ہمیں کوئی رجعت پسند کہتا ہے تو کہنے دو ڈرو نہیں قتل و غارت

مت کرو۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم میں سے بہترین نوجوان ضائع ہو جائیں گے بلکہ یہ کرو کہ چھوٹی چھوٹی ٹکریاں بنالو اور اُن میں تبلیغ کرو۔ پارٹی کی تاریخ پڑھو۔ اور مستقبل کے لئے تیاری کرو۔ اگر کوئی ان کو سازشی باتیں گردانتا ہے تو گردانے۔ جمہوری حکومتوں میں یہ سازشی خیالات شمار نہیں ہوتے۔ اب ہمیں جرمنی سے بھی خط کتابت کرنے میں بہت دقت ہوگئی ہے اگر ۱۹۳۳ء کی جرمنی کا آج کی حالت سے اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں سوشلسٹ کا اقتدار کتنا کم ہوگیا ہے۔ ہٹلر کے برسر اقتدار آنے پر اسٹیلن نے کہا تھا کہ یہ ایک وقتی تبدیلی ہے۔ کچھ دن کے بعد ہٹلر کو خود زوال ہو جائے گا۔ میں نے اس خیال کی سخت مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ اس سے زیادہ بے وقوفی کی بات کہنا مشکل ہے۔ ہٹلر کا عروج جرمن تاریخ میں پرولتاریوں کی سب سے زبردست شکست ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ جرمنی میں روز بروز ہمارا اثر کم ہو رہا ہے۔ سوویٹ یونین میں بھی ۱۹۲۳ء سے ردِ عمل ہو رہا ہے اس کو آج ۱۳ سال ہوگئے۔ زینو ویف اور کیمو ویف پر مقدمہ اور پارٹی سے میرے اخراج نے روسی پرولتاریوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہم لوگ پارٹی کے روح رواں تھے۔ سوویٹ یونین کے باشندوں اور نیز حکومتی طبقے میں دو مختلف قسم کے ردِ عمل ہو رہے ہیں۔ عوام میں اضمحلال کی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ وہ حیران ہیں کہ کیا کریں وہ اس طرح خیال کرنے لگے ہیں "جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا" لیکن حکومتی طبقے میں ردِ عمل مختلف قسم کا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اِس وقت موقع ہے پہنچے جالو۔ اب حکومتی طبقے نے اس کا کافی انتظام کر لیا ہے کہ ہماری خط کتابت بھی نہ ہونے پائے۔

گولڈمین :۔ کیا آپ کے خیال میں سوویٹ یونین میں جلد کوئی تبدیلی ہونی ممکن ہے۔ کیا جلد اسٹیلن کی حکومت ختم ہو سکتی ہے؟

ٹروسکی :۔ یا تو مزدوروں کی جمہوریت اس کو ختم کر دے گی اور عوام کی طاقت ہی ایسا کر سکتی ہے

یا فسطائی ردِ عمل اس کو ختم کردے گا۔ انفرادی تشدد سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

گولڈمین:۔ جب آپ مزدوروں کی طاقت کا ذکر کرتے ہیں تو کیا آپ کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کوئی مزدور اسٹیلن کے گولی مار دے گا؟

ٹروسکی:۔ ہرگز نہیں ۱۹۳۳ء میں میرا یہ یقین تھا کہ بلا کشت و خون کے حکومت میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ ہم سوویٹ یونین میں انقلاب نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اصلاح چاہتے تھے۔ جب ہٹلر کو فتح ہوگئی اور اسٹیلن اور کمنترن کے کان پر جوں تک نہ رینگی تب ہمیں یہ یقین ہوا کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل انقلابی نہیں رہی اور اس میں یہ قابلیت نہیں کہ ہماری سب سے زبردست شکست سے درست نتائج اخذ کرسکے۔ کمنترن کے مفلوج ہوجانے پر ہم نے ایک نئی پارٹی کی بنیاد رکھی اور اس کا نام "چوتھی انٹرنیشنل" رکھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ سوویٹ یونین میں ایک نئی انقلابی پارٹی بنائی جائے۔ اس عمل کا جواب اسٹیلن نے مرکزی کمیٹی کے ۱۹۲۷ء کے اجلاس میں یہ دیا "حکومتی طبقے کو سوائے خانہ جنگی کے اور کوئی چیز نہیں ہٹا سکتی"۔ ریڈک نے اس کا یہ جواب دیا "کہ یہ چنگیزی ہے"۔ ہمارا اب تک یہ خیال تھا کہ پارٹی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے عہدہ دار بدل دے لیکن اسٹیلن کے بیان سے یہ ظاہر ہوگیا کہ پارٹی کی طاقت سے اسٹیلن اور اس کے حکومتی طبقے کو برطرف کرنا ممکن نہیں ۱۹۳۳ء کے وسط تک ہمارا یہی خیال رہا کہ صلح اور صفائی سے کام ہونا ممکن ہے۔ لیکن جب ہٹلر کی فتح ہونے دی گئی اور ہم نے یہ دیکھا کہ کمیونسٹ پارٹی میں خاموشی ہے اس وقت ہم یہ سمجھے کہ اسٹیلن واقعی درست کہتا تھا کہ اس کو اور حکومتی طبقے کو برطرف کرنے کے لئے ایک سیاسی انقلاب کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ ضروری ہے کہ میں سیاسی اور سماجی انقلاب کا فرق بتادوں انقلاب فرانس کی مثال لیجئے وہ سماجی اور سیاسی دونوں قسم کا انقلاب تھا۔ سماجی انقلاب وہ اس معنی میں تھا کہ اس نے جاگیردارانہ طریق پیداوار اور ملکیت کو سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اور ملکیت میں بدل دیا تھا لیکن فرانس میں سیاسی انقلاب تین ہوئے۔ اسی

طرح روس میں اکتوبر کا انقلاب ایک سماجی انقلاب تھا یعنی اس نے سرمایہ دارانہ ملکیت کو تباہ کرکے اشتراکی ملکیت کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ یونین میں حکومت استبدادیت پسند ہے لیکن ملکیت کی شکل ہنوز اشتراکی ہے۔ لیکن حکومتی طبقے سے اشتراکی ملکیت کو ہر وقت خطرہ ہے اگر چند سال یہی حالت رہی تو حکومتی طبقہ پھر ملکیت کی نوعیت بدل دے گا فی الحال سوویٹ یونین میں صرف سیاسی انقلاب کی ضرورت ہے تاکہ اس قسم کی تبدیلی کی جائے کہ اشتراکی ملکیت کا فائدہ عوام کو ہو نہ کہ حکومتی طبقے کو۔ حال ہی میں چوتھی انٹرنیشنل کا اجلاس ہوا تھا وہاں یہ تجویز منظور ہوئی تھی :-

"سوویٹ یونین کی مزدور جماعت محسوس کرتی ہے کہ آزادی سے تبلیغ کرنے کے تمام دروازے اس پر مسدود کر دئے گئے ہیں اس لئے مجبوراً سوویٹ یونین کی حکومت کے خلاف انقلابی جنگ کرنی ہوگی۔ یہ جماعت مارکسسٹ ہونے کی بنا پر انفرادی کشت و خون کو برا کہتی ہے اور ہنگامی سعی کو بے کار خیال کرتی ہے حکومتی طبقے کو صرف ایک بیدار جماعت جو منزل مقصود کو سمجھتی ہو ختم کر سکتی ہے"

میں یہ بتا دوں ہمارا یہ طریقہ نہیں کہ فعل اور قول میں اختلاف ہو۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ انفرادی کشت و خون سے منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں تو میں اس کا برابر اعلان کرتا رہتا۔ میں نوجوانوں سے درخواست کرتا کہ اسٹیلن کے گولی مار دو۔ میں اسٹیلن اور اس کی پولیس سے ڈرتا نہیں۔ لیکن میں ایسا نہیں کہتا کیونکہ میں مارکسسٹ ہوں مجھے یقین ہے کہ انفرادی کشت و خون سے ہمارا ہی نقصان ہے۔ کیونکہ اس طرح بہترین نوجوان ضائع ہو جاتے ہیں۔

فینرٹی :- جب آپ انقلاب کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو کیا اس میں تشدد بھی شامل ہے ؟ میرا مطلب اجتماعی تشدد سے ہے۔

ٹروٹسکی :- اس کا بہت کچھ انحصار حکومت پر ہے اگر حکومت نے سیاسی دباؤ سے اپنا رویہ

نہ بدلا تو عوام کو تشدد استعمال کرنا پڑے گا۔ میں تشدد کو جائز خیال کرتا ہوں۔

فینزٹی:۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ اگر حکومت تشدد کے بل پر قائم رہنا چاہے گی تو عوام بھی اس کو ختم کرنے کے لئے تشدد کریں گے۔

ٹروٹسکی:۔ بالکل درست۔ میرا یہی خیال ہے۔

فینزٹی:۔ قطع نظر اس کے کہ انفرادی تشدد کی اخلاقی حیثیت کیا ہے۔ کیا آپ تشدد کو اس لئے برا خیال کرتے ہیں کہ اس سے مقصد حاصل نہیں ہو سکتا؟

ٹروٹسکی:۔ انفرادی تشدد کارگر ہتھیار نہیں ہے اور میرا یہ خیال تجربے کی بنا پر ہے ہماری انقلابی پارٹی میں اس معاملے پر بہت اختلاف رائے تھا۔ پارٹی کے کچھ ممبر کہتے تھے کہ انفرادی تشدد کارگر ہو سکتا ہے کچھ اس کے خلاف تھے۔ میں اس طریق کے خلاف تھا۔

فینزٹی:۔ آپ اس کو کارگر ہتھیار نہیں سمجھتے؟

ٹروٹسکی:۔ سیاسی، اقتصادی اور فوجی اعتبار سے میں اس کو مزدور جماعت کے مفاد کے بالکل خلاف سمجھتا ہوں۔

فینزٹی:۔ تو قطع نظر اس کے کہ تشدد اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اچھا ہے یا برا۔ کیا انفرادی تشدد کارگر نہیں ہوتا؟

ٹروٹسکی:۔ میں اپنا خیال اور واضح کر دوں۔ اگر عوام پر ازحد ظلم ہو رہا ہو۔ جیسا کہ چند ملکوں میں ہو رہا ہے تو ہر وہ عمل جس سے عوام کو حکومتی تشدد سے نجات مل سکے اخلاقی نقطۂ نگاہ سے جائز ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ آیا اس عمل سے عوام آزاد ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ میں جو تشدد کی مخالفت کرتا ہوں تو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے نہیں کرتا میں اخلاقی لحاظ سے اس کو برا نہیں سمجھتا بلکہ میری مخالفت صرف اس بنا پر ہے کہ انفرادی تشدد ایک ایسا ہتھیار ہے جو اچٹ کر اپنے ہی لگتا ہے

گولڈمین:۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بیل صاحب نے سوال کیا تھا کہ آپ سوویٹ یونین کے عوام کو

کس طرح اپنا موافق بنا سکتے ہیں۔ آپ نے اس کا جواب نہیں دیا۔

ٹروٹسکی:۔ میرا یہ خیال ہے کہ اب سوویٹ یونین کی قسمت کا فیصلہ یورپ کے حالات پر منحصر ہے اگر اسپین میں مزدور جماعت کو فتح ہو گئی اور فرانس میں مزدور زور پکڑ گئے تو سوویٹ یونین میں انقلاب ہوا رکھا ہے۔ یونین میں عوام ایک عجیب مخمصے میں پھنس گئے ہیں ان کے سامنے دو راستے ہیں یا اسٹیلن کی حکومت کو تسلیم کریں یا ہٹلر کی جب دو میں سے کسی ایک کو پسند کرنا لازمی ہو تو ظاہر ہے کہ اسٹیلن بہتر ہے۔ یورپ میں اگر ہماری موافقت میں فضا بدلی تو یونین میں عوام ضرور سر اٹھائیں گے۔ مجھے اس وقت کا انتظار ہے۔ اس وقت مجھ سے جو کچھ بھی خدمت ہو سکے گی میں کروں گا۔ انقلابی لیڈر کو صبر کی بہت ضرورت ہے۔ وہ دنیا کی نبض پر انگلی رکھے بیٹھا رہتا ہے۔ مجھ پر یہ الزام لگانا کہ میں اسٹیلن کو مارنا چاہتا ہوں اور خود ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہوں غلط ہے میں کبھی طاقت کا بھوکا نہیں ہوا۔ جس زمانے میں میرے ہاتھ میں طاقت تھی اس وقت بھی میں اپنے اس زمانے کو بہترین سمجھتا تھا جب میں تصنیف میں مشغول رہا کرتا تھا۔ آج کل مجھے گویا تعطیل ملی ہوئی ہے۔ میں تصنیف میں وقت گذارتا ہوں اور خوش ہوں ہاں اگر میرے خیال کے مطابق سوویٹ یونین میں انقلاب ہوا تو میں ذمہ داری لینے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

فلینرٹی:۔ مسٹر ٹروٹسکی کیا ہٹلر کی مدد سے اسٹیلن کو شکست دینے سے آپ کا کوئی فائدہ ممکن نہیں؟

ٹروٹسکی:۔ ہاں مجھ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں جاپان اور جرمنی سے ساز باز کر کے اسٹیلن سے طاقت چھیننا چاہتا ہوں۔ یہ میرے مخالفوں کا کتنا جاہلانہ خیال ہے۔ کیا روسی حکومت مجھ کو یہ بتا سکتی ہے کہ مجھے اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس سازش کی بدولت میں اپنے دوست اپنا مستقبل سب کھو دونگا اور اس کے بدلے میں مجھے کیا حاصل ہوگا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر میں ہٹلر سے ساز باز کر کے اسٹیلن کو شکست دے بھی دوں تو کیا ایک لمحے کے لئے بھی یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ہٹلر اپنی

فتح کے بعد مجھے ایک منٹ کے لئے بھی زندہ چھوڑے گا۔ کیا وہ یہ کہے گا کہ ٹروٹسکی ہم نے تمھارے لئے سوویٹ یونین فتح کر دیا۔ جاؤ حکومت کرو۔ اور کیا وہ میری حکومت ہوگی یا وہ تو ہٹلر کی حکومت ہوگی۔ میں سیاسی میدان میں بڈھا ہو گیا اور انقلاب میری گھٹی میں ہے۔ کیا میں یہ نہیں سمجھتا کہ جرمنی اور جاپان کے ساتھ ساز باز کرنے سے میری اپنی ہی تباہی ہے۔

فینرٹی:۔ مسٹر ٹروٹسکی کیا پہلے جاپان میں انقلاب ہوگا اور پھر اس کے بعد جرمنی میں؟

ٹروٹسکی:۔ بالکل درست۔ میرے خیال میں پہلے جاپان میں انقلاب ہوگا۔ کیوں کہ جاپان کی حالت اس وقت وہی ہے جو روس کی زار کے زمانے میں تھی۔ جاپان میں استبدادی حکومت ہے جس نے عوام کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کچھ عرصے میں وہاں کا سماجی اور اقتصادی تضاد رنگ لائے گا اور موجودہ سماجی اور اقتصادی نظام کے ایک ساتھ ہی ٹکڑے اُڑینگے اس کے بعد میرے خیال میں جرمنی میں انقلاب ہوگا۔ جرمنی اس وقت چند ہاتھوں میں ہے اور وہاں زندگی کا ہر پہلو اس قدر پوشیدہ ہے کہ اگر لڑائی چھڑ گئی تو وہاں انقلاب ہونا لازمی ہے جیسا جنگِ عظیم میں ہوا تھا۔ لیکن وہ سوشلسٹ انقلاب نہیں ہوگا جیسا کہ روسی حکومتی طبقے کا خیال ہے سماجی اور اقتصادی تضاد جرمنی میں پورا عمل کر رہا ہے۔ جب حکومتی طبقہ مجھ پر الزام لگاتا ہے کہ میں جرمنی اور جاپان کی موجودہ حکومتوں سے مل کر سوویٹ یونین کے خلاف سازش کرتا ہوں تو مجھے بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ حکومتیں ہیں جن کو میں چند دن کا مہمان سمجھتا ہوں کیا میں ان حکومتوں سے دوستی کروں گا جو خود فنا ہونے والی ہیں؟

امتحان

عبدالغفور صاحب ایم-اے مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم کی قوموں میں ایک سرکاری ممتحن ہوتا تھا جو بڑے سخت اور کڑے امتحان کے ذریعے لوگوں کے کردار کی جانچ کیا کرتا تھا۔ بعضوں کے خیال میں حضرت ایوب کے قصے میں اور دوسرے پیغمبران کرام کی آزمائشوں میں شیطان اس اہم فریضے کو انجام دیتا تھا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ ممتحن نے شیطان کی جگہ لے لی ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ جتنی عالم گیر شہرت شیطان نے اپنے مخصوص حلقے میں پائی ہے ممتحن بھی اس سے کچھ کم نہیں رہا۔

سنا ہے کہ پہلا ممتحن ایک چینی تھا اور پہلا امتحان سول سروس کا مقابلہ۔ شاید اسی لئے ہمارے سماج نے بھی سب امتحانوں میں سے سول سروس کے امتحان کو پہلی جگہ دی ہے شروع تعلیم سے ہی بچے کو سول سروس کی آسمانی بہشت دکھائی جاتی ہے۔ جس میں داخل ہوکر وہ مادی دنیا کی نفرت انگیز اور ذلیل کش مکش سے محفوظ ہوجائے گا اور ایک بلند کنارے سے انسانی زندگی کی گندی ندی کا دور سے نظارہ کرسکے گا جس میں ہزاروں فلاکت زدہ انسان ڈوبتے تیرتے ہاتھ پاؤں مارتے ڈبکیاں کھاتے چلے جاتے ہیں۔ کامیابی پر وہ اپنے قلب میں ایک خوش گوار گرماہٹ اپنے جسم میں ایک پھیلاؤ محسوس کرتا ہے۔ کیوں نہیں! وہ اس اعزاز کا پورا حق دار ہے۔ کیا وہ زندگی کی کش مکش میں مردانہ وار نہیں لڑا؟ اس نے تعلیمی زینے کے آخری چکر پر۔ منصبی مینار کے چوٹی کے پتھر پر پاؤں جمانے کی کس قدر جان توڑ کوشش کی کمبخت کس قدر پھسلن تھا کتنی بلندی اور کتنا اژدہام تھا! کیا دھکم دھکا! کس قدر کشتم کشتا۔ مگر آخرکار لڑتے بھڑتے۔ مارتے مرتے، گرتے گراتے اس نے اوپر کے پتھر پر قدم جما ہی لئے۔

اب کوئی اُدھر کا رُخ بھی تو کرے دیکھو کیسی پٹخنی دیتا ہوں۔ اور کروں بھی تو کیا؟ اس مینار کی چوٹی پر جگہ بھی تو ایک ہی کے لئے ہے"، یہ ہے زندگی کا مقابلہ جس کے لئے ہمارے امتحان ہمارے بچوں کو تیار کر رہے ہیں۔ ایک ذلیل مقابلہ جس کا تخیل حیوانی دنیا کی کش مکش حیات سے لیا گیا ہے۔ ہاں اس بہیمانہ کش مکش کی بے پناہ طاقتوں کو خود سماج کا شکار کرتے ہوئے دیکھ کر ہم کو ایک اطمینان ضرور ہوا ہماری تعلیم اب سائنس کی بہترین روایات پر گامزن ہے!! حیرانی کی بات ہے کہ وہ اخلاقی اقتصادی اور روحانی تعاون جو ہندوستان کے دیہی اور شہری برادریوں میں پایا جاتا ہے اس کا ہلکا سا عکس بھی ہم نہ تو نظام تعلیم کے تخیل میں پاتے ہیں اور نہ اس کی اس معراج کمال ہی میں جسے امتحان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

"ہم جس نقطۂ نگاہ سے تعلیم دیتے ہیں اس کا مقصد محض طلبار کو انعام کی گھوڑ دوڑ کے لئے تیار کرانا ہوتا ہے۔ امتحان کیا ہے اچھی خاصی انعامات کی ڈربی ہے۔ ہم ایک پبلک مظاہرے کے ذریعے سے طلبار کو محنت اور کوشش کی ترغیب دلاتے ہیں اور امتحانی فہرست میں ان طلبار کا نام مشتہر کرتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی ترکیب سے اپنی آن رکھ لی ہے؛ ان میں سے بعض شہ زور گھوڑے تو انعام لاتے ہیں ان پر روپیہ لگانے والے ہزاروں لاکھوں کے وارے نیارے کر لیتے ہیں۔ اور پیچھے رہ جانے والوں کو "طوق زریں" کی بجائے تانگوں، اکّوں بلکہ حیدرآبادی "جھٹکوں" یا کھٹکھٹوں میں جوت دیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس تعلیمی گھوڑ دوڑ کا نتیجہ۔ انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ جو پیچھے رہے وہ ہی جہنم میں جائے، عاقبت کی خبر تو اللہ میاں ہی جانتے ہیں۔ ہاں ہندوستان میں پیچھے رہنے والے تو جیتے جاگتے ہی جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔

امتحان کیا ہے؟ ایک نظام تعلیم میں اس کی کیا جگہ ہے؟ اس سوال کا جواب تو ماہرِ تعلیم ہی دے سکتے ہیں۔ ہمیں تو اس پر ایک بچپن کی پڑھی ہوئی کہانی یاد آجاتی ہے کہ ایک جادوگر نے ایک پتلا بنایا تھا اور جب اس میں جان پڑی تو وہ ایک ہیبت ناک دیو بن گیا اور بجائے غلام کے اس نے ایک آقا کی حیثیت اختیار کر لی۔ امتحان شروع میں اچھے خاصے بھلے قسم کے خادم

ہوں گے مگر آہستہ آہستہ اُنھوں نے ایسا زور باندھا کہ آقا کی جگہ پر متمکن ہوگئے، ایک ایسی عالم گیر مشین کی طرح جس کا کوئی لیور غلطی سے دب گیا ہو جو چلنے لگی تو رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ اگر اسی طرح چلتی رہی تو ایک دن سڑک کوٹنے والے انجن کی طرح پورے نظام تعلیم کی شان دار عمارت کو اینٹ اور چونے کا ڈھیر بنا کے رکھ دے گی۔ امتحان کا مقصد کیا ہے بقول ایک ممتحن "یہ ایک گستاخانہ کوشش ہے انسانی لاعلمی کی گہرائیوں کو ناپنے کی"۔ علمیت کی نہیں بلکہ لاعلمی کی۔ ممتحن اپنے امتحانی ساحل کو بچے کے ذہنی سمندر کی گہرائیوں میں ڈالتا ہے کہ اس کی تھاہ ہاتھ آجائے۔ بعض طلبا ر تو اس کی رفتار کو تہ تک پہنچنے سے میلوں بیشتر روکنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ساحل تہ پر پہنچ بھی چکتے ہیں لیکن جہل کی ثقالت کی وجہ سے پتہ بھی نہیں چلتا کہ تہ تک پہنچ چکے ہیں یا نہیں حقیقت یہ ہے کہ اس بحر ناپیدا کنار کے تجسس میں دھوکے باز قسمت ہمیشہ ممتحن کی ہی معاون نہیں رہتی اکثر طالب علم کا ساتھ بھی دیتی ہے۔ اس تفتیش میں جتنا قسمت اور اتفاق کا جزو شامل ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس کے خوفناک جال سے بمشکل ایک جان توڑ کوشش کے بعد نکلنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

ہمارے امتحان کیا جانچتے ہیں۔ کیا جانچنا چاہتے ہیں کیا وہ ان اقدار کے جانچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جنھیں وہ جانچنا چاہتے ہیں کیا ایک ممتحن مختلف کا پیاں جانچتا ہوا یکساں معیار قائم رکھ سکتا ہے؟ کیا ایک ہی کاپی کو مختلف اوقات پر جانچ کر وہ ایک ہی نمبر دے سکتا ہے؟ یہ ہیں چند سوالات جو بیرونی امتحانوں کے سلسلے میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں لیکن سماج تو ان سوالات کو بالکل درگذر کر جاتا ہے۔ اسے تو افراد کے اوپر سیدھے سادھے لیبل لگے ہوئے ملنا چاہئیں۔ اس کے لئے تو تعلیمی نتائج اتنے ہی علمی اتنے ہی متعین ہونا چاہئیں جیسے ریلوے کے محکمے میں اول درجہ، دوسرا درجہ اور تیسرا درجہ محض اتنا ہے کہ ممتحن لوگ ذرا دوسرے درجے میں زیادہ لوگ بھر دیتے ہیں تاکہ ان پر ریلوے والوں جیسا اعتراض نہ ہو کہ درجہ سوم میں بہت زیادہ دھکا پیل ہو جاتی ہے۔

ریلوے میں تین یا زیادہ سے زیادہ چار درجے ہوتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی یونیورسٹیوں کی جدّت اس بارے میں ضرور داد طلب ہے۔ ان میں سے ایک نے تو اس 'تعلیمی ریل' میں اتنے درجوں کا انتظام کردیا ہے جتنے امتحان کے انتہائی نمبر۔ اور ریل سے تو اسے تشبیہہ دینا ہی غلط ہے یہ ایک تعلیمی زینہ ہے جس میں سیڑھیاں ہی سیڑھیاں ہیں۔ منزل نہیں ہے۔ ہر کامیاب طالب علم دوسرے طالب علم کے سر پر قدم جمائے ہوئے ہے۔ اس کے سر پر دوسرا ہے اور علی الترتیب ایک کی دم دوسرے کے سر سے بندھی ہوئی چلی جاتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ اتنا تفصیلی انتظام کیسے کیا! اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ یونیورسٹی ہر طالب علم کے ڈویژن کا ہی اعلان نہیں کرتی بلکہ اس کے حاصل کردہ نمبروں کو بھی سماج کی اطلاع کے لئے مشتہر کردیتی ہے۔ ہر وہ طالبعلم جس نے ۸۰۰ میں سے ۳۶۰ نمبر حاصل کئے ایسے طالب علم سے ایک حسابی برتری محسوس کرتا ہے جس نے ۳۵۹ نمبر لئے اور یونیورسٹی طلبار کے نمبروں کا اعلان کرکے پہلے طالب علم کو ہر اُن اقدار کے لحاظ سے جو امتحان جانچ سکتا ہے دوسرے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فوقیت دے دیتی ہے اور ۳۶۰ والے کو ہر وقت یہ دل خوش کن احساس رہتا ہے کہ اس کے جوتوں کی ایڑیاں ۳۵۹ والے کے سر پر جمی ہوئی ہیں۔ مگر غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا ایک ممتحن ۸۰۰ نمبر والے امتحان میں اتنے معیار قائم رکھ سکتا ہے؟ اگر وہ ان طلبار کے ایک نمایندہ حصے کا اُستاد ہوتا تو کیا وہ اس جماعت میں، اتنے ہی درجے قائم کرسکتا جتنے طلبا ہیں۔ تجربی اور نفسیاتی لحاظ سے تو یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا امتحان کا تخیل میکانئی ہے۔ ہم نے طلبار اور اُن کے قویٰ کو اچھی خاصی مشینیں سمجھ لیا ہے جن کی اہلیت اور قابلیت کسر اعشاریہ سے کئی ہندسے نیچے تک صحیح جانچی جاسکتی ہے۔ دوسرے ہم طلبار کی قابلیت کو 'کُل' کے لحاظ سے نہیں بلکہ 'جزو' کے لحاظ سے پرکھتے ہیں اور پھر اجزار کی قیمت لگاکر سمجھ لیتے ہیں کہ کُل کا پتہ چل گیا۔ اجزار کے لحاظ سے آپ شاید ۸۰۰ نمبر والے امتحان میں اتنے ہی درجے قائم کرسکیں۔ مگر کُل کے لحاظ سے یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

اور جب کہ یہ امتحان قابلیت کو جانچنے کے ہوتے ہیں مقابلے کے نہیں ایسی صورت میں تو نمبروں

کا اعلان کرنا بے انصافی ہی نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے۔

مارچ اور اپریل کا مہینہ تخیل کے سامنے موسم بہار کے دل فریب نظارے پیش کرتا ہے بسنت کی سہانی رُت، ہولی کی رنگین پھوار۔ مگر مدارس میں انھیں مہینوں میں نئے رنگ کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ یہ ہے طلبا کے خون کی ہولی ان دنوں آپ اکثر اخباروں میں پڑھیں گے آج فلاں جگہ ایک دسویں جماعت کے طالب علم نے ریل کے نیچے سر رکھ دیا۔ کل دوسرے نے زہر کھاکر اقدام خودکشی کی۔ یہ تو وہ المیہ ڈرامے ہیں جن کا رنگ اکثر اخبار کی سُرخیوں میں جھلک جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں نہیں لاکھوں خودکشیاں ہوتی ہیں طفلانہ مسرتوں کی اُمنگ اور شوق کی، ولولہ اور جذبات کی، جو عوام کی نگاہوں کے سامنے نہیں آتیں۔ امتحان ایک شیر نہیں جو کھلے بندوں موت کا چیلنج دیتا ہو۔ یہ تپ دق کے جراثیم ہیں۔ جو نظام تعلیم کو اندر ہی اندر گھن لگائے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے بھیانک سائے سے جو دن بدن لمبا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چھوٹی جماعتوں کے بچے بھی محفوظ نہیں۔ ایک حساس اُستاد نے زمانہ ہوا ایک امتحان دینے والے بچے کے تاثرات کو اپنے روزنامچے میں محفوظ کر لیا تھا اس میں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"آج ریلو کا سالانہ امتحان تھا۔ اب تک تو سال بہ سال برابر کامیاب ہوتے چلے آ رہے تھے کامیابی کیا کہیں بس یہ سمجھئے کہ لڑھکتے ہوئے چلے آئے تھے۔ مگر پانچویں میں آکر رُک گئے اور ایک دفعہ رُکے تو بس رک ہی گئے۔ امتحان کیا تھا اچھی خاصی ہنڈن برگ کی لائن تھی سال بھر تو برابر مارک ٹائم کیا کرتے اور مارچ کے مہینے میں ایک جان توڑ یورش اور اس کے بعد با عزت نہیں بے عزت پسپائی۔ ایسے دو حملے ہو چکے تھے۔ اب کی تیسرا تھا۔

اور اس مرتبہ تو ریلو کی تیاری ہمہ گیر تھی ایک کارآزمودہ جرنیل کی طرح اور سچ پوچھئے تو اصل تجربہ شکستوں سے ہوتا ہے، فتوحات سے نہیں، انھوں نے اس مرتبہ محاذ کے سبھی رُخ گھیر لینے کی کوشش کی تھی۔ دینی اور دنیوی بصوری اور معنوی۔ روحانی اور جسمانی۔ یہ تیاری مہینوں سے ہو رہی تھی۔

اور کم بخت امتحان اس کا سایہ بھی تو دن اور مہینوں کے گذرنے کے ساتھ لمبا اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ ریلو کی شاہ راہِ زندگی اور شاہ راہ کیا یہ تو اچھی خاصی دَلدَلی پگڈنڈی تھی۔ اس پر قسمت کے شہزور ہاتھ نے امتحان کچھ ایسے ہی قرینے سے جڑ دئے تھے جیسے سڑک پر کے کھمبے سال سال کے فاصلے پر۔ فرق اتنا ہی تھا کہ بجلی کے قمقموں سے روشنی پھوٹتی ہے اور "امتحانی قمقموں" میں سے تاریکی۔ ہر ایک امتحان ایک نقطہ تھا جس سے ظلمت کے دھارے بہہ کر نکلتے تھے جن میں کہیں کہیں معصوم خوشیوں کا خون جھلکتا تھا اور بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ جہاں گذشتہ "قمقمے" کا اندھیرا ختم ہوا وہاں آیندہ کا بھیانک سایہ شروع ہو جاتا تھا۔

ریلو کو یاد رہے کہ پچھلے سال جب انھیں تپ محرقہ چڑھا تو اس کا مزا ہفتوں منہ سے نہ گیا امتحان کی تلخ کامی تو مہینوں چلتی۔ اور بھولیں بھی کیسے جب فیل ہونے کے دوسرے دن اسکول گئے تو ٹانگوں میں کچھ عجب سی سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ایک خفیف سی گھبراہٹ اور بے کلی کی لہر ہچکولے کھاتی ہوئی ٹانگوں سے اوپر چڑھتی گئی اور دل کے قریب آکر رُک گئی۔ اور نگاہ! پھر ریلو کی نگاہ ایسی جھکی کہ اُٹھائے نہیں اُٹھتی ایک زمانہ وہ بھی تھا جب جُھکاتے نہیں جھکتی تھی اب انھیں اپنے ماتھے اور رخساروں پر کچھ تکلیف دہ جلن سی محسوس ہوا کرتی تھی لوگوں کی نگاہیں نہ تھیں ہولی کے انار تھے جن کی چنگاریاں اُن کے بدن پر پڑ کر کبھی کبھی سوئیوں کی نوک کی طرح چبھ جایا کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ ہمت کر کے جو آنکھ اُٹھا کے دیکھا تو اُن کا پرانا ہمجولی حمدو کھڑا ہوا منہ چڑا رہا ہے۔ منہ کیا بلکہ مجسم 'چڑاہٹ' بنا ہوا ہے گویا کہہ رہا ہے دیکھا بچہ ہم نہ کہتے تھے کہ تم فیل ضرور ہوگے اس پر تو اُن کے ضبط کے بند ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے۔ اُن کے من کے مندر میں دراڑ نہیں آئی بلکہ ایک بجلی گر گئی جس نے مٹی اور چونے کے ڈھیر کے سوا کچھ باقی نہ چھوڑا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے شیشے کے جھاڑ فانوس میں کھینچ کر پتھر مار دیا ہو۔

دوسرے بچے تو اس واقعے کو بھول گئے مگر ریلو اس معاملے میں کچھ عجب حساس واقع

ہوئے تھے اور کیوں نہ ہوتے، تھی بھی تو اُن کی خودی کی شکست ۔ وہ خودی جسے گلی ڈنڈا کے
بیسیوں میچ بغیر ایک شکست کے جیت کر پروان چڑھایا گیا تھا وہ اکثر اسے بھلانے کی کوشش
کرتے تھے مگر کامیاب نہ ہوتے تھے اوراُن دنوں خواب بھی کیسے دکھائی دیتے! ارے رام۔ ایک
جھرجھری لے کر، ایک دفعہ تو سپنے میں دیکھا کہ دو بڑے دیو ریلو کو پکڑ کر ایک لوہے کے پھاٹک کے
اندر لے گئے۔ اندر ایک شخص لوہا گرم کر رہا تھا بڑی بڑی مونچھیں اور آنکھیں لال کبوتر کی طرح
ریلو کو دیکھ کر اس کی مونچھیں ذرا اوپر کو اٹھیں اور اس میں سے قہقہ کی عجب بھیانک سی آواز نکلی یہ
دیکھتے ہی ایک برف جیسی تیز سنسناہٹ ریلو کی ریڑھ کی ہڈی میں سے زن سے نکل گئی ارے
یہ تو ممتحن ہے۔ ریلو نے ایک مرتبہ تو دونوں ایڑیاں فرش میں جمادیں اور ایک طفلانہ جوش میں
اپنے جسم کو پیچھے کی طرف سے اس انداز سے پھینکا گویا ان کے عزم صمیم کی تاب دنیا کی کوئی طاقت
نہ لاسکے گی مگر ان دونوں نے ریلو کو زبردستی پکڑ کر آگے کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ممتحن کے ہاتھ
میں ایک سرخ دہکتا ہوا نعل کی شکل کا لوہا ہے جس کی شکل لفظ فیل کی طرح ہے یہ ہٹنے لگے تھے
کہ اس نے یہ دہکتا ہوا انگارہ اُن کے ماتھے پر رکھ دیا اس پر ریلو نے بھاگنے کی کوشش کی
تو ٹانگیں جواب دے گئیں۔ آواز دیتے ہیں تو گھگی بندھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ریلو نے دل
میں کہا عجب ماجرا ہے جان کی جان جا رہی ہے اور کوئی سنتا نہیں۔ اب مرے۔ اب جان گئی۔
اتنے میں ایک چیخ ماری اور آنکھ کھل گئی دیکھا تو اُن کا چھوٹا بھائی راموا اُن کے ماتھے پر زور
سے چٹکی لے رہا تھا۔

اس خواب کا اثر ان پر بہت دنوں رہا اکثر ان کا ہاتھ غیر شعوری انداز میں ماتھے پر پہنچ
جاتا تھا کہ کہیں رات کا خواب کوئی مستقل نشان تو نہیں چھوڑ گیا اکثر تنہائی میں اور ہجوم میں بھی
انھیں محسوس ہوتا تھا کہ فضا ایک حقارت بھرے قہقہے اور فیل کی صدا سے معمور ہے۔ فیل ہو کر
ریلو کچھ سنجیدہ مزاج سے ہو گئے تھے اب زندگی کو زیادہ اہم سمجھنے لگے تھے اگر پرانے
دوست جو اوپر کے درجوں میں پہنچ گئے تھے کبھی گلی ڈنڈے کی دعوت دیتے تو یہ کترا شرما کر علیحدہ

ہو جاتے تھے پرانی دوستیاں کچھ ختم سی ہوتی جا رہی تھیں اور نئی کے لئے ریلو ابھی کچھ ایسے تیار نہ تھے۔ روح کی خوفناک تنہائی! کیا کبھی انسان تنہا بھی ہو سکتا ہے؟ جسمانی نہیں معنوی لحاظ سے ریلو کو اس کا تجربہ نہ تھا مگر ناکامیابی کے بعد ہو گیا وہ اپنے آپ کو گھر میں اور گھر کے باہر گلی میں اور گلی کے باہر کچھ عجیب اجنبی سا۔ کچھ کھویا کھویا سا محسوس کرتے تھے دوست بھی ان کی اسی عادت کی وجہ سے اب ان سے بچ کر نکل جاتے تھے کہتے تھے کہ ازمنہ وسطیٰ میں ہر کوڑھی کے پاس ایک خاص قسم کی گھنٹی ہوتی تھی جونہی وہ آبادی کے قریب پہنچتا تھا تو اسے بجاتا تھا اس کی آواز سن کر لوگ راستہ چھوڑ کر الگ کھڑے ہو جاتے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو آنچل میں چھپا لیتی تھیں۔ شراب خانوں میں طوفان مچانے والے نوجوان دم بھر کے لئے ٹھٹک جاتے تھے تاکہ اُن کا منحوس سایہ کسی پر پڑ نہ جائے۔ ریلو کے پاس کوئی گھنٹی تو نہیں تھی ہاں اُن کے چہرے پر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا "اندر آنے کی اجازت نہیں" کا تختہ چڑھا ہوا ہے۔

ریلو کی حالت تو کچھ ایسی ہوتی جاتی تھی جیسے کسی ستّر بہتر برس کے بوڑھے کی ہوتی ہے جس کے سامنے سے ساتھ کے دوست اُٹھتے جاتے ہوں اور دن بدن اس کے اور نئی پود کے درمیان خلیج وسیع ہوتی جاتی ہو مگر بوڑھا تو مرے ہوئے دوستوں پر صبر کر لیتا ہے ریلو جیتے جاگتے کودتے پھاندتے دوستوں کی 'موت' پر کیسے صبر کر لیتے۔ آج کل وہ جماعت میں سب سے پیچھے بیٹھتے تھے ایک کونے میں 'ٹھسکے' دیے ہوئے۔ آگے بیٹھتے تو ماسٹر صاحب کی نگاہ پڑتی ورنہ ایسے ماسٹر صاحب کی نگاہ سب بچوں پر نہیں پڑ سکتی تھی ان کا عقیدہ تھا کہ کام وہ جو نگاہ کے نیچے رہے اور بچہ وہ جو ڈنڈے کے سایے تلے پھلے۔ ریلو سے خفا رہتے تھے کم بخت دیکھو بانس کی طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ریلو کا پڑھائی میں جی بھی نہیں لگتا تھا چبائے ہوئے کو چبانا اور اُگلے ہوئے کو نگلنا ریلو کے بس کا روگ نہ تھا ریلو میں جدت تھی اور انتہائی جدت اگر بازار ایک راستے سے گئے تو واپسی دوسرے سے ہوتی تھی اگر راستہ بھر ایک ٹانگ پر کودتے گئے تو لوٹتے میں دوسری پر۔ ایک مرتبہ تو وہ پھر اول

کے اسٹیشن تک پیدل بھیا کے ساتھ گئے تو تمام راستے ریل کی لائن پر دونوں پنجوں سے ایسی احتیاط سے چلتے رہے تھے گویا کسی سے شرط بندھ گئی ہو۔

اور اسکول! اسکول میں تو وہی دو برس کی پڑھی ہوئی کتابیں دہرائی جاتی تھیں اور تاریخ کے گھنٹے میں تو ماسٹر صاحب اپنی ۱۵ سال کی پرانی کاپی میں سے لکھوایا کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ یہ کاپی ماسٹر صاحب اسکول میں ملازم ہوتے وقت باہر سے اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے اس کا کاغذ بھی سالوں کے ساتھ ساتھ رنگ بدلتا گیا تھا اور اب ملگجا سا ہو گیا تھا اس کے استعمال کے لئے بھی بڑی احتیاط کی جاتی تھی۔ سنا ہے کہ ایک دفعہ ٹِقّو (ایک لڑکے کا نام ہے نے اس کا ایک ورق جلدی سے جو الٹا تو پورا کاغذ ایک گزک کے ٹکرے کی طرح چھوٹی چھوٹی پٹریوں میں بکھر گیا تھا۔ اور ماسٹر صاحب نے پھر ٹِقّو کو وہ ماری ہے کہ یاد ہی کرے گا اسی کاپی میں سے ماسٹر صاحب تاریخی کہانیاں لکھایا کرتے تھے کہانیاں سننے کا تو ریلو کو بہت شوق تھا۔ مگر سُنی ہوئی کہانی کو سننے سے انھیں چڑھ تھی اگر ان کی نانی اماں نے شام کے دھندلکے میں کبھی غلطی سے پہلے سنی ہوئی کہانی شروع بھی کر دی تو ریلو آنکھیں بند کر کے جھوٹ موٹ سونا شروع کر دیتے تھے مگر جماعت میں کیا کریں یہاں تو آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں اور اگر ستانہ بھی چاہو تو کان کھینچ کر سنوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اکثر پچھلی بنچوں کا گشت کرتے ہوئے ماسٹر صاحب ریلو کی طرف اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے۔ اُن کی انگلی اس وقت غصّے کے مارے ایک ہلکے سے دائرے میں گھوما کرتی تھی۔ 'بے حیا دیکھو تو' (انگلی کو آگے کی طرف زور سے بڑھاتے ہوئے گویا کوئی بھالا ہے) 'بے حیا بانس کی طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ بھینسا بنا ہوا ہے بھینسا۔ منہ پر ڈاڑھی آنے والی ہے اور ابھی اماں کے لال پانچویں جماعت ہی میں ہیں'

اس پر ریلو اپنے آپ کو سکوڑ کر ڈسک کے اندر گھس جانے کی ناکام کوشش کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی اُن کا گھٹنا ڈسک کے آگے کی لکڑی سے ٹکراتا تھا۔ ایک شدید درد ہلکی سی

کرا ہ، اور پھر خاموشی۔ مصیبت یہ تھی کہ اُن کے بدن میں ایک غضب کی لچک تھی کہ کم بخت ہر سال کیا ہر مہینے بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ اور ان کے ڈسک سے ان کو یہ ضد تھی کہ پچھلے تین سال میں ایک انچ بھی نہیں پھیلا مگر ڈسک کا بھی کیا قصور تھا؟ ہیڈ ماسٹر صاحب کا خیال تھا کہ اگر لڑکوں کو آرام دہ ڈسک دیئے جائیں تو کم بخت ان پر سو جاتے ہیں اور سبق نہیں سنتے اور ڈسک تو سبق سنوانے کے لئے بنائے جاتے ہیں نہ کہ اونگھوانے کے لئے۔

ہاں تو یہ ڈسک بیٹھنے کے کام تو آتے تھے مگر ریلو ان سے زیادہ مفید کام لیتے تھے اکثر بیٹھے ہوئے فیل اور پاس کا رمل ڈالا کرتے تھے ایک پرانے لنگوٹیئے یار سے جو اپنے تجربے کی بنا پر ماہٹر بن گیا تھا چاک کا ٹکڑا مل جاتا تھا جلدی جلدی ڈسک کے اوپر لکیریں ڈالتے تھے اور پھر دو دو کر کے کاٹتے جاتے جوں جوں آخری لکیروں پر پہنچتے تو ان کا ننھا سا دل دھڑکنے لگ جاتا تھا۔ دھک، دھک، دھک۔ اگر ایک باقی رہ جاتی تو رہ رہ کر چہرے پر مسکراہٹ پھوٹی پڑتی اور کہیں سب کٹ گئیں تو ایک جھجکتی ہوئی نگاہ اپنے ہم ڈسک رفقن پر ڈال کر ڈسک پر تھوک کا ترشح اور اس کے بعد اس زور سے لکیروں کو مٹاتے تھے گویا ڈسک کی لکڑی کا چورا چورا کر ڈالیں گے۔

مگر اس مرتبہ تو ان کی تیاری فال اور رمل سے کچھ بے نیاز معلوم ہوتی تھی اب کے تو پوری روحانی اور انسانی طاقتوں سے استمداد کی گئی تھی، امتحان سے کچھ دن پہلے اُن کی نانی اماں انھیں گوروجی کے استھان پر لے گئی تھیں گوروجی اس وقت بھنگ کی ترنگ میں بہک رہے تھے اصل گیان دھیان کی سادھی لگی ہوئی تھی۔ بھنگ کی تیز تیز مہک ریلو کو پسند تھی۔ سنا تھا کہ دیوتاؤں کو اس کی بو بہت پسند ہے گوروجی نے بھوج پتر پر لکھا ہوا ایک منتر دیا اس میں سے بھی ویسی ہی لپٹیں آرہی تھیں اور اشیرباد دیتے ہوئے کہا جا بچہ گھر سے نکلتے ہوئے اسے چٹیا میں باندھ لینا اور امتحان کے کمرے میں داخل ہوتے وقت تین بار اوم شانتی پڑھ لینا۔

ریلو کے دل میں خوشی کچھ بے طرح کلیلیں کر رہی تھی۔ اتنی کامیابی پہلے کبھی نہیں ہوئی جب گورو جی نے منتر دیا ہے تو ان کے چہرے پر کس قدر تیقن کس قدر تقدس، کتنی روحانیت تھی۔ ریلو نے منتر کو حفاظت سے مٹھی میں دبا لیا تھا۔ بار بار انگلیاں دباتے تھے۔ مٹھی بھینچ بھینچ کر، ایسا نہ ہو کہیں نکل بھاگے آخر روحانی چیز تو ہے ہی کیا اعتبار ہے اور پھر ان جیسے بدقسمت کو اتنا بڑا عطیہ۔ واہ پربھو تیرے دین کے ڈھنگ نیارے ہیں۔

آج امتحان کی صبح تھی۔ اُٹھتے ہی ریلو کے دل میں جذبات کا کچھ ابال سا آ رہا تھا پہلے تو اُس نے اُٹھتے ہی سب کو پرنام کیا پھر سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے مندر میں پہنچے اور ایک دیوی جو انھیں خاص طور پر پسند تھی اس کے ننھے سے پاؤں کے پاس ایک پھول رکھا۔ واپس آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کلیجہ اوپر کا نیچے ہو رہا ہے۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا اور ریلو اپنے انجانے ہوئے تاریک مستقبل کے سامنے ششدر کھڑے تھے بار بار دل سے سوال کرتے تھے آج مجھے کتنے نمبر ملیں گے؟ ناشتہ خاص طور پر دہی سے کیا گیا تھا۔ یہ تبرک غذا ویدک زمانے کے مقدس دنوں کی یادگار ہے۔ کیا اُن دنوں میں بھی امتحان ہوتے تھے رخصت ہوتے وقت اماں نے چار پیسے دیئے تھے راستے میں دو پیسے ایک فقیر کو دے دے سنتے ہیں غریبوں کی دعائیں بڑی برکت ہوتی ہے۔ ممکن ہے انھیں کے طفیل سے خدا اس کی کم لیاقتی سے چشم پوشی کرے۔ اس خیرات کے صدقے شاید حساب کے وہ لمبے لمبے سوال پرچے میں نہ آئیں جن میں بڑی بڑی رقمیں ہوتی ہیں۔

ریلو اسکول سے بہت دیر میں لوٹا۔ کوئی چار پانچ کے درمیان گھر میں داخل ہوا تو چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا کمزور چہرہ پہلے سے زیادہ اترا ہوا تھا اور اس کی سرخ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔

ریلو امتحان میں کیسے رہے؟ کتنے نمبر ملے؟ اماں نے پلنگ کے پاس آکر پوچھا۔ ریلو پہلے تو کچھ جھینپا پھر منہ بسورا کیا اور اس کے بعد تو آنسوؤں کی جھڑی لگا دی۔ اس کی ماں کے

چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ آپس میں بھینچ لئے اور کپڑا جو وہ سی رہی تھی اس کے ہاتھوں سے چھٹ گیا" تم رو کیوں رہے ہو۔ کیا تم فیل ہو گئے؟
(اوں اوں مجھے فیل کر دیا گیا)؟ 'ارے کم بخت خدا تجھے غارت کرے میں تو پہلے ہی سے یہ جانتی تھی۔ ہائے ہائے (دونوں ہاتھ ملتے ہوئے) تم نے آج مجھے کہیں کا نہ رکھا!'

اس پر ریلو کی آنکھوں سے ایک سیلاب بہہ نکلا (رو رو کر ہچکیاں لیتے ہوئے) 'ادہنہ، ادہنہ میں تو ساری ساری رات بھی کام کرتا رہا۔ مگر فائدہ کچھ نہ نکلا۔ اس ہفتے تو برابر ۲ بجے اٹھا کرتا تھا۔ ہائے میرے نصیب!'

'ارے نصیب تو میرے پھوٹ گئے۔ جو تمہارے جیسا کم بخت میری کوکھ سے نکلا۔ مصیبت تو مجھ پر ٹوٹی (ہاتھ ملتے ہوئے) ہے ہے تم نے میرا دل جلا کر کوئلہ کر دیا (ذرا سنبھل کر) اچھا ٹھہر تو سہی۔ کنج بہاری بابو (ریلو کے ماموں کو پکار کر) ذرا آ کر دیکھو تو سہی اس نامراد نے کیا غضب ڈھایا ہے'۔ بابو کنج بہاری نے کہیں دور دفتری فائلوں کے نیچے سے آواز دی، آتا ہوں۔

بابو کنج بہاری ریلو کے ماموں اور سرپرست، کلکٹری میں کلرک تھے دفتر سے واپسی پر کاغذات ساتھ لے آیا کرتے تھے اور گھر پر کام کیا کرتے تھے۔ ریلو کی ماں نے کچھ دیر تو انتظار کیا پھر خود اُٹھ کر اُن کے پاس گئی۔ "بھیا کچھ سنا بھی کیا ہوا ریلو اب کے پھر فیل ہو گیا" یہ کہہ کر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ 'دیکھو اب میرا سر نہ کھاؤ۔ ہم نے کتنی مرتبہ تم سے کہا کہ تمہارا یہ لاڈ پیار للا کو خراب کر دے گا مگر تم نے سب سنی اَن سنی کر دی۔ اب اپنے کرموں کا پھل کھاؤ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ریلو کو تو بیٹھے جوتا اور اُٹھتے لات ہونا چاہیئے۔ اس بدمعاش کے تو جوتے لگتے رہنا چاہئیں تھے جوتے۔ اور اس کے کیا۔ لگنے تو تمہارے چاہئیں'۔

" ہائے بھیا مجھ سے ہی غلطی ہوئی۔ تم نے تو بہت بہت کہا مگر میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے

اور بھلا تم نہ ماروگے تو کون مارے گا۔ مجھ میں سکت کہاں۔ اچھے بھیا ذرا چلو تو سہی۔ ایک دفعہ جی بھر کے مار تو لو میرے کلیجے کی بھڑاس نکل جائے۔"

اس پر بابو شیام بہاری نے ایک ہلکی سی آہ بھری اور کچھ دیر سوچنے لگے۔ ساتھ ساتھ میز پر انگلیاں بجاتے جاتے تھے۔ آخرکار ایک انگلی زور سے میز پر مار کر اُٹھ کھڑے ہوئے گویا انھوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا ہے۔

ریلو نے ماموں کو آتے دیکھا تو گویا سکتے میں آگیا اس کے چہرے پر اُس کسان کی مایوسی جھلک رہی تھی جس کی پکی ہوئی فصل پر اولے پڑ گئے ہوں اور جس کے لئے چڑھتی ہوئی گنگا کی طغیانی یا آندھیوں کے جھکڑ ایک سرسری سی سرسراہٹ ہو کر رہ گئے ہوں۔

"ارے ریلو تمھاری اماں کیا کہہ رہی ہیں۔ فیل ہو گئے؟"

ریلو نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ منہ بسور لیا۔

ماموں نے اس کی آنکھوں کو دیکھا جن میں آنسو جھلمل جھلمل کر رہے تھے، پھر ان گرد آلود رخساروں کو جہاں آنسوؤں نے بہہ بہہ کر آڑی ترچھی ندیاں بنا رکھی تھیں۔

"میں پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ کسی کام کا نہیں۔ اس کے دماغ میں تو بُھس بھرا ہوا ہے بُھس" (غصے میں سیدھی انگلی سے سر پر زور کا ٹھونگا لگاتے ہوئے گویا جانچ رہے ہیں کہ بھس ہے یا وہ بھی نہیں)

"دیکھو شیاما تم مفت میں اُس کے لئے ہلکان ہو رہی ہو (دوبارہ متوجہ ہو کر) ابے گدھے فیل ہو گئے؟ آخر بتاؤ تو کس مضمون میں؟ کیسے فیل ہوئے۔ کچھ پتہ بھی تو لگے بس فیل فیل کی رٹ لگا رکھی ہے"۔

ریلو نے کچھ رکتے ہوئے جواب دیا۔ "انگریزی میں۔ ماسٹر صاحب نے لاطینی کے اسم صفت پوچھے تھے........ مجھ سے cat کا پوچھا (ایک ہلکی سی دھاڑ مار کر) میں نے غلطی سے Feles بتادیا۔

'ارے تم سے بلی کا اسم صفت نہیں بتایا گیا' ولا رے میاں بتاؤں قصور کس کا ہے تمہارا نہیں۔ تمہارے ماسٹر صاحب کا ہے۔ آج کل کے استاد تو زنانے ہیں زنانے۔ ایک چھڑی اُٹھانے سے تو شاید ان کی کمر میں بل پڑ جائے۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کے زنخے نہ تھے۔ ہمارے مولوی صاحب کے پاس ایک ڈنڈا رہتا تھا (دونوں ہاتھوں سے دائرہ بنا کر) یہ موٹا اور یہی اسم صفت جو تم سے نہیں بتایا گیا ارے گدھے اسی ڈنڈے کے طفیل ہم نے ہزاروں ہی یاد کر ڈالے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے ہماری کتاب کے دائیں صفحے پر درمیان سے شروع ہوتے تھے۔ (ہاتھ بڑھا کر) یہ لمبی فہرست اگر اس وقت بھی مجھے پہلا حرف یاد آ جائے تو پوری کتاب سنا دوں پوری! (پوری پر معنی خیز دباؤ دیتے ہوئے) ارے تم بلی کا کہتے ہو۔ ہم نے گدھے، گھوڑے، کتے، کتے کیا کتے کے پلے کے بھی اسم صفت یاد کر لیئے تھے۔ اور انگریزی زبان میں اس کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے۔ خیر انگریزی میں تو ہمیں پتہ ہی تھا کہ تم کیا تیر مار لوگے۔ مگر تاریخ، جغرافیہ، حساب کیا سبھی میں دیوالہ نکل گیا ریلو ایک سسکی لے کر) اب کے تاریخ میں تو سب کچھ یاد کیا تھا۔ مگر کیا کروں۔ ماسٹر صاحب نے محمد تغلق کے دانت ٹوٹنے کی تاریخ دریافت کر لی۔ آہ، آہ بالکل دماغ سے ہی نکل گئی۔ اس کی بجائے ہمایوں کے گھٹنا ٹوٹنے کی تاریخ بتا گیا۔ پھر اس کے بعد کچھ پوچھا ہی نہیں۔ ہائے ہائے دوسروں سے کیسے کیسے سوال پوچھے ہیں مجھے سبھی یاد تھے۔'

'اور جغرافیہ؟'

'جغرافیے میں ایک شہر کے متعلق پوچھا تھا (جھنجھلا کر سوچنے کی کوشش کرتا ہے) "کومبا؟ (ماتھے کو انگلی سے سہلاتے ہوئے گہری سوچ میں) کومبا ٹور؟ نہیں نہیں! ہاں ٹمبکٹو...... آہ ...... آہ میرے ہائے سبھی بر اعظم یاد کر لئے تھے بس جنوبی امریکہ رہ گیا تھا۔ اسی میں سے سوال آ گیا)

"سوال آ گیا! بد معاش کہیں کا۔ پاجی نالائق ...." ریلو کے ماموں کچھ اچانک ہی برس پڑے۔ گالیوں کی بوچھار نہیں اولے یوں پڑ رہے تھے جیسے بھادوں کی بدلی کسی مسافر کو دفعتاً جنگل میں آ لیتی ہے۔

ارے ملعون تمھیں تعلیم دلائی جا رہی ہے۔ تمھیں زندگی میں کس قدر شاندار موقع دئے جا رہے ہیں......' شام بہاری بابو میں کمزوری یہ تھی کہ بہن کی طرح انھیں بھی غصہ کم آتا تھا منہ پھٹ غصہ تو آبھی جائے۔ منہ پھٹ بہت ہی کم۔ اس لئے اکثر انھیں غصہ لانے کے لئے گالیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ جب بہاری بھرکم گالیوں کی وجہ سے منہ کے پٹھے گرما جاتے تو اس کا متعدی اثر ہاتھوں پر بھی ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ لوگ تو کہا کرتے ہیں کہ کسی کی زبان چلے کسی کا ہاتھ چلے مگر اس وقت گالیوں کی برکت سے ان کی زبان بھی چلتی تھی اور ہاتھ بھی غصے کے اس طوفان کو طغیانی کے درجے پر برقرار رکھنے کے لئے برابر الفاظ کی رَو بہی چلی جاتی تھی۔ تیزی میں اور بھی جھلا جھلا کر چیختے تھے۔ شاید ڈر یہ تھا کہ اگر ایک دفعہ یہ الفاظ کا اُٹھایا ہوا طوفان دھیما پڑ گیا تو اسے دوبارہ اُٹھانا مشکل نہیں ناممکن ہوگا۔

ریلو کے ننھے سے جسم کو دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ کر۔ کان کھینچ کر............ زور سے دھپ لگاتے ہوئے 'بدمعاش میں تمھیں جان سے مار ڈالوں گا........ اگر پھر ایسی حرکت کی...... ..بسور کہیں کا.......' یہ کہہ کر اُسے ایک ہاتھ سے زور سے دھکیل کر اور جلدی سے اسے چھوڑ چھاڑ کر اپنے کمرے میں گھس گئے۔ اس غصے کا ان پر عجیب سا اثر ہوا دل سا بیٹھنے لگا اور وہ ایک کرسی پر کچھ بے طرح گر گئے۔ کمزوری کو چھپانے کی لاکھ کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوسکی مری ہوئی آواز میں ریلو کی ماں سے بولے۔

'دیکھو تمھاری خاطر ہم نے آج ریلو کو پیٹ دیا ہے۔ ہم دوبارہ ایسا کام ہرگز نہیں کریں گے۔ تم اسے اسکول سے اُٹھا کیوں نہیں لیتیں؟

احساسِ کمتری

(سید محمد اختر صاحب)

[اس مقالے میں احساس کمتری (Inferiority Complex) کے متعلق جس نقطۂ نگاہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ ڈاکٹر ایڈلر کی Individual Psychology کی روشنی میں ہے۔]

جدید نفسیات کی روشنی میں آج یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ کہ بچپن کے تجربات افراد کی زندگی پر ایک توصیفی اثر ڈالتے ہیں۔ اور یہ کہنا ایک صداقت ہے۔ کہ بچپن کے ذہنی اثرات ہماری آنے والی زندگی کی تشکیل میں ممد ہوتے ہیں، صحت، خرابی صحت، عقلِ سلیم یا بے عقلی انھیں اثرات کا نتیجہ ہیں۔

شیر خوارگی کے سالوں میں ہی بچے اپنی زندگی کا لائحہ تیار کر لیتے ہیں اور گہوارہ چھوڑنے سے قبل انسان بن یا بگڑ جاتا ہے۔ یہ مثل کہ ننھے درخت کی شاخ کو جس طرح چاہیں موڑا جا سکتا ہے بجنسہٖ انسانی دماغ پر صادق آتی ہے۔ طفولیت کے ابتدائی ایام ہی میں بچے کی جذباتی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ وہ یا تو پختگی اور عقل مندی کے ساتھ محبت کرنا سیکھ جاتا ہے اور یا اپنے اندر خام اور بگاڑنے والی محبت کا عنصر پیدا کر لیتا ہے۔ وہ سیکھتا ہے کہ اس کا ماحول موافق ہے یا مخالف۔ اور کیا وہ اپنے ماحول پر شور مچا کر یا رو کر چھا سکتا ہے ؟ یا کوئی ایسا شخص ہے۔ جو حالات پر قابو رکھتا ہے اور اس کی منشا، کو سمجھتا ہے۔ یہ تمام واقعات اور اسی قسم کی اور کئی حقیقتیں نوخیز دماغ پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں یہ تمام تاثرات جو بچپن سے دماغ قبول کرتا ہے۔ اَن مٹ ہوتے ہیں اور اُن کے اثرات لڑکپن اور جوانی میں نمایاں ہوتے ہیں۔

فروتری کے احساسات کم سنی میں ہی پیدا ہونے لگتے ہیں حالات کی ناموافقت یا تربیت

کی ذراسی فروگذاشت احساس کو پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے اس مقالے میں ہم ان اسباب پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے جو بلوغت کے بعد ہم میں شعور کمتری پیدا کرنے کے اصل موجب ہیں
بے چارگی طفولیت کا بنیادی خیال ہے۔ بچہ فطرتاً اپنی خوراک، عافیت، حفاظت اور رفاقت کے لئے دوسروں کا محتاج ہے اور اپنی اس محتاجی کی حالت میں اسے اپنی بے چارگی کا علم بھی ہو جاتا ہے وہ اپنے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ دوسرے ہی اس کی ہر ایک ضرورت کو پورا کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کے اثر پذیر دماغ میں اپنی کوتاہی اور دوسروں پر انحصار کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

بچہ بڑھنے میں جتنا عرصہ زیادہ لے گا۔ اسی قدر بے چارگی کا احساس زیادہ راسخ ہوتا جائے گا۔ انسانی بچہ دوسروں کی محتاجی سے نکلنے میں دوسری جنسوں سے زیادہ وقت لیتا ہے دوسری انواع کے نوزائیدہ بچے چند ہی ماہ میں پختگی حاصل کر لیتے ہیں۔ بطور مثال بلی کا بچہ کتے کا پلا چند ہی ماہ میں خود اعتمادی حاصل کر لیتا، اور اپنی خوراک اور حفاظت کا سامان خود کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف انسانی بچہ کئی سالوں کے بعد اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو اور اپنی احتیاط کو خود پورا کرے۔ اکثر حالات میں تو یہی خواہش ہوتی ہے۔ کہ یہ زمانہ اور بھی دراز ہوتا جائے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ بہت سے بچے جب تک سن بلوغت سے آگے نہیں بڑھتے۔ دوسروں کی محتاجی سے باہر نہیں نکلتے۔ دراصل دست نگری کا یہ احساس ہی ایک قسم کی اقتصادی اور سماجی فروتری ہے۔ جو اُن کے فکری اور جذباتی پس منظر پر چھا جاتی ہے۔

بہت سے ترقی پسند ادیبوں کا خیال ہے۔ کہ ہمارے موجودہ زمانے کی نصف سے زیادہ برائیاں اس بات کا نتیجہ ہیں کہ مرد اور عورتیں دیر سے جوان ہوتے ہیں اور انھیں خود مختارانہ کام کی طاقت حاصل نہیں ہوتی۔ اور چونکہ انھیں بھیڑوں کا ایک گلہ بنا دیا جاتا ہے اسی لئے ہر ملک میں آمر پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر بچوں کے سن بلوغت تک پہنچنے میں رکاوٹیں عمل

اور اُن کے پرورش پانے اور اپنے فرائض کے احساس میں کمی رہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ بچے زندگی اور اس کے مختلف مسائل کو زیادہ اہمیت نہ دیں گے اور وہ سماجی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ زندگی کے متعلق ان کے اس رویئے کا نتیجہ ہی اخبار میں سنسنی خیز واقعات ہیں۔ فلمی اور ناٹکی ناموروں اور کھلاڑیوں کی "پرستش" طلاقوں کی کثرت یہ سب حالات جذباتی اور اخلاقی تلوّن ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارے اس دورِ تمدن میں سماجی اور اجتماعی ذمہ داری کی ناکامی کا نتیجہ ہی آمروں کی پیدا وار ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ جمہوریت کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی آمریت کا باعث ہوئی ہے۔

آج جنگ کے شعلے اُفق یورپ پر نہایت خوفناک طور پر بلند ہو چکے ہیں اگر نفسیاتی طور پر اس کا تجزیہ کیا جائے۔ تو ہمیں اس جنگ کی محبت ۔ توپوں سے پیار اور جنگی جہازوں سے الفت کی تہہ میں بچپن کی ساری حرکات نظر آئیں گی ۔ بچے کھلونا بندوق سے کھیل کر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن یورپین قومیں اپنی بڑی بڑی توپوں اور جنگی قوت پر نازاں ہیں۔ اس میں انھیں ایک خیالی اطمینان حاصل ہوتا ہے اور یہ اُن کے لئے قومی افتخار ہے۔ ہزارہا بے گناہ انسانوں کو توپ کے ایک گولے سے نیست و نابود کر کے وہ اپنے گولے کی قوت تخریب پر فخر کرتے ہیں لاشوں اور اجسام کے ٹکڑوں میں انسانی المیہ کا منظر بھول کر انسان اپنے تباہ کن کھلونوں کی طاقت پر فخر کرنے لگتے ہیں۔ مگر جب ہمارے لوگ صحیح معنوں میں جوان ہوں گے اور ان میں اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گا تو وہ حیرت انگیز مشینوں سے زیادہ انسانی ٹریجڈی کو ملحوظ رکھیں گے۔

بچپن کا طویل زمانہ ہی صرف احساس کمتری کا باعث نہیں ہوتا کہ اس زمانے میں وہ دوسروں کے دستِ نگر ہوتے ہیں بلکہ تربیتِ اولاد کا ایک گہرا اور ضروری اثر بچوں پر ہوتا ہے اور اسی اثر سے بچے آئندہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ تین قسم کے بچے آئندہ زندگی میں کمتری کے احساس سے متاثر ہو کر اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ پہلی قسم میں ہم ایسے بچوں کو

رکھیں گے۔ جن میں جسمانی یا عضوی طور پر کوئی نقص ہو۔ اس میں ہر اس قسم کا نقص آجاتا ہے۔ جس سے بچوں کو اپنے نقائص کا احساس ہو۔ یا جسے دوسرے بچے دیکھکر ان کا تمسخر اڑائیں۔ ایسے نقائص بچوں میں فرد تری کا احساس پیدا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ہیران دولف مشہور نفسیاتی طبیب نے جسمانی یا عضویاتی نقائص میں ذیل کی علامات لکھی ہیں۔

موٹاپا یا بالکل دبلا پن۔ پیدائشی داغ یا نشانات۔ سرخ بال یا جسم پر بھورے پن کی کیفیت۔ جسم پر زیادہ بالوں کا ہونا۔ غیر معمولی لمبی ناک۔ آنکھوں کی مختلف رنگت باہر نکلے ہوئے دانت۔ مڑی ہوئی ٹھوڑی۔ حد سے زیادہ پتلی یا موٹی گردن۔ ٹیڑھے بازو۔ چوڑے یا بھدّے کولھے۔ لمبی، چھوٹی، ٹیڑھی یا خمیدہ ٹانگیں۔ لمبے یا چھوٹے پاؤں۔ گنجہ سر۔ مردوں کا نسوانی چہرہ۔ اور عورتوں کا مردانہ چہرہ۔ اور اس قسم کے اور بہت سے عضویاتی نقائص احساس فرد تری کے بنیادی باعث بنتے ہیں۔ اور اس سے آپس میں مردم بیزاری۔ تنہا پسندی اور خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

ان جذبات کا پیدا ہونا طبعی لحاظ سے زیادہ سماجی حیثیت کی اہمیت رکھتا ہے۔

ذرا آپ چند بچوں کو کھیلتے دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ کمزور بچہ سب کا گھوڑا بنا سواری کے کام آرہا ہے۔ توانا بچے کمزور بچوں پر غالب نظر آتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے۔ صرف اس لئے کہ کمزور بچہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا۔ وہ بیچارا اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔ کہ اپنی عزت کو بالائے طاق رکھ دے۔ بچپن کی یہ کمزوری اور اس کا احساس اس کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ذلت کا یہ احساس اس کے لئے زندگی دو بھر کر دیتا ہے۔ اور اس سے بہت سی دماغی تکالیف پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے یہ ضرر رساں جذبہ جلد از جلد دل سے نکال دینا چاہیے اگر اسے دور نہ کیا گیا تو یہ تحت الشعور میں اپنا تسلط جمالے گا۔ اور قوت عمل پر

ایک دباؤ سا پڑ جائے گا۔ جو دماغی قوائے کو معطل کر دے گا۔

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ کہ اس جذبے کو دل سے نکال دینا چاہیئے۔ اس کا مطلب جدید نفسیات کی روشنی میں یہ ہے۔ کہ ہم بچے کے ذہن نشین کرائیں۔ کہ اس کا یہ جذبہ یا خوف بے معنی ہے۔ اور اس کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ بچوں سے ان کے استاد، دوست یا والدین خوب کھل کر باتیں کریں۔ اور بچہ اپنے دل کا حال ان سے کہتے نہ رکے۔ توانا بچے تو اپنے جذبے پر قابو پا سکتے ہیں۔ اُن کے لئے کھیلوں کا سخت مقابلہ یا مکہ بازی موزوں ترین علاج ہے۔

کالج کے ایک پروفیسر کا تجزیہ کیا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ ان کا احساس کمتری اس وقت سے پیدا ہوا تھا۔ جب وہ ابھی بالکل بچے ہی تھے۔ وہ اپنے ہمجولیوں میں ذرا لمبے تھے۔ اور یہی اصل وجہ تھی۔ ان کے اس جذبے کی۔ سب لڑکوں میں وہ نظر آجاتے تھے۔ جماعت میں اگر کوئی شرارت کرتا تو وہ فوراً پکڑے جاتے۔ اور انھیں خصوصیت سے سزا دی جاتی۔ گو یا سزا استاد کے نقطہ خیال سے جماعت کے انتظام کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتی تھی۔ مگر بچے کو محسوس ہونے لگا۔ کہ اس سے یہ سلوک جان بوجھ کر کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک کس مپرسی کی حالت میں پانے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب کچھ اس کے لمبے قد کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اسی طرح اسی کالج کے ایک لڑکے کے تجزیہ نفس سے معلوم ہوا کہ اس کا چھوٹا قد احساس فرد تری کا باعث بنا۔ اور بچپن سے ہی اس کی وجہ سے وہ نکو بنا رہا۔ اس احساس کی وجہ سے وہ دوسرے لڑکوں سے دور رہتا۔ کھیلوں میں حصہ نہ لے سکتا۔ اور پیشہ کے اختیار کرنے میں بھی یہی جذبہ اثر انداز ہوا۔

دوسری قسم میں لاڈلے بچے آتے ہیں۔ جنھیں زیادہ پیار نے خراب کر دیا ہو شاید یہ جملہ آپ کو حیران کر دے۔ مگر موجودہ سوسائٹی میں ایسے بچے ایک نہایت المناک

حقیقت ہیں۔ بیسویں صدی خود اعتمادی اور جرأت کی روح چاہتی ہے۔ ان صفات کے بغیر آپ موجودہ زمانہ کے چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ زمانہ کشمکش اور تگ و دو کا زمانہ ہے۔ اس میں بقا کے لئے یہی دو صفات ضروری ہیں۔ مگر لاڈلے بچے میں یہ صفات کہاں۔ وہ تو بچپن سے ہی اپنی ناز برداری کرانا چاہتا ہے وہ تو یہی چاہتا ہے کہ اس کی ہر ایک بات کو پورا کیا جائے۔ اپنے گھر میں وہ ایک راجہ اور نواب ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک حکومت کا صدر اور ایک ملک کا امیر یا ایک ہی وقت میں تینوں۔ مشکلات، مخالفت، اس کی خلاف مرضی کام، تکلیف یا سختی۔ وہ ان باتوں سے ناآشنا ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ عملی زندگی میں جب ناموافق حالات پیدا ہو جاتے ہیں، تو وہ جذباتی طور پر بالکل ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور اس کی زندگی ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔

لاڈلے بچے کے متعلق ہم دو مثالیں دینا چاہتے ہیں۔ جس سے آپ پر مندرجہ بالا بیان کی تصدیق ہو سکے گی۔ پہلی مثال ایسے بچے کی پیدائش ہے جس گھرانے میں ایک ہی بچہ ہو۔ وہاں وہی سب کا لاڈلا اور پیارا ہوگا۔ ایسے گھر میں دوسرے بچہ کی پیدائش ایک نفسیاتی خطرہ ہوتا ہے۔ اگر بچے کو اس آنے والے خطرے سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نہایت احتیاط سے پہلے ہی سے تیار نہ کیا جائے، تو ڈر ہوتا ہے۔ کہ شاید اس صدمے کو برداشت بھی نہ کر سکے۔ اسے تو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ وہ خاندان کی مملکت کا واحد حکمران ہے۔ لیکن دوسرے بچے کی آمد نے اس خیال کو تہ و بالا کر دیا۔ اس کی سلطنت کا صرف دعویدار ہی پیدا نہ ہوا بلکہ اسے تخت سے دست بردار ہو کر اپنی جگہ آنے والے کو دینی پڑی۔ نیا تجربہ اس پر ثابت کر دے گا کہ اب اس کی پوزیشن پہلی سی نہیں رہی۔ بلکہ گھر والوں کی توجہ کا مرکز دوسرا بچہ بن چکا ہے۔ وہ اب اپنے آپ کو "تخت سے اتارا ہوا" محسوس کرنے لگے گا۔

ان نئے حالات میں اسے کیا کرنا چاہیئے۔ بچہ نہیں جانتا۔ اس لئے وہ خود بخود مایوسی کے جذبات کو اپنے دل میں دبائے رکھتا ہے ایسے بچے دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بعض دفعہ رات کو بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ ہکلا کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یا اندھیرے میں شور مچاتے ہیں۔ لیکن ان کے یہ افعال عارضی ہوتے ہیں۔ اور ان کا چنداں فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ دبا ہوا جذبہ اور بچپن میں ان کی تذلیل ملکر ان کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جوانی میں بہت سی دماغی پریشانیوں کا باعث بچپن کے یہی تاثرات ہوتے ہیں

دوسری مثال لاڈلے بچے کی وہ حالت ہے جب وہ جوان ہو کر حقائق میں قدم رکھتا ہے۔ زندگی کی کشمکش میں داخل ہوتا ہے. اگر وہ خوش قسمت ہے اور اسے اپنے پیٹ کے لئے تگ و دو کرنی نہیں پڑتی۔ وہ بہت کھاتے پیتے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ تو پھر اس کے لئے کوئی نفسیاتی مشکل پیدا ہونے کا سوال نہیں رہتا۔ لیکن اگر حالات اس کے مخالف ہوں۔ تو ایسے نوجوان ایک بہت بڑی روک اپنی راہ میں حائل محسوس کریں گے۔ وہ اس نئی دنیا میں بھی انہیں رعایات کے طالب ہوں گے۔ جو بچپن میں انھیں میسّر تھیں۔ لیکن ایسے حالات کا پیدا ہونا قریباً ناممکن سا ہی ہوتا ہے حالات کی ناموافقت انھیں دل برداشتہ کر دیتی ہے اور وہ پھر اپنے اردگرد کے ماحول سے ایسے متاثر ہوتے ہیں۔ کہ انھیں سارا زمانہ اپنے خلاف جنگ پر آمادہ نظر آتا ہے۔

بدقسمتی سے اگر لاڈلے بچے کو اپنی زندگی آپ بنانے پر حالات مجبور کر دیں اور اس کے لئے جرأت اور سرگرمیٔ عمل کی ضرورت ہو تو اکثر نوجوان ایسے حالات میں شکستہ دل اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں ایسے حالات کے لئے تیار ہی نہیں کیا گیا۔ جس دنیا کے وہ باشندے تھے وہ دنیا اس کشمکش کی دنیا سے

بالکل الگ تھلگ تھی ۔ چونکہ وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ ہتھیار ڈال دیں ۔ زمانہ کے چیلنج کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتے ۔ چند ناکام کوششوں کے بعد وہ اپنے آپ کو اس مایوس گروہ کا ایک فرد سمجھنے لگتے ہیں جو ہمارے سماجی نظام میں بہت سی مشکلات کا موجب بن چکا ہے ۔ سماجی طفیلی ۔ دغاباز اور رازافشا کرنے والے ۔ ڈاکو ۔ جواری ۔ فحاش ۔ مسکرات کی ناجائز فروخت کرنے والے وغیرہ وغیرہ سب اسی گروہ کے افراد ہوتے ہیں ۔ زندگی کا یہ لائحہ عمل ایک آسان راستہ ہے اور زندگی کی حقیقتوں سے بھاگے ہوئے نوجوان مرد اور عورتیں اسی راستہ پر چلنا اپنے لئے بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ سماجی زندگی میں تو انھیں اخلاقی قوت سے کام لینا پڑتا ہے ۔ بحیثیت ایک رکن ہونے کے سوسائٹی ان سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنی بقا کے لئے جرأت اور ہمت سے کام لیں ۔ اور یہی جوہر ان میں مفقود ہوتے ہیں ۔ ذرا قمار خانوں اور بدمعاشی کے اڈوں پر جاکر وہاں کے آنے جانے والوں کا نفسیاتی تجزیہ کیجئے آپ کو وہاں شریفوں اور نجیبوں کے نور نظر اور چشم و چراغ ملیں گے ۔ جنھیں لاڈ نے تباہ و برباد کر دیا ۔ جو زندگی کے میدان سے اس لئے بھاگ نکلے کہ وہ مصائب اور مشکلات کا مقابلہ نہ کر سکے ۔ اب وہ آرام سے بیٹھے زندگی بسر کر رہے ہیں

آپ نے بعض تندرست و توانا نوجوانوں کو ایسے ذلیل پیشے سے روٹی کماتے دیکھا ہوگا ۔ جس سے حیرانی ہوتی ہے ۔ حالانکہ اگر وہ اسی قدر سرگرمیٔ عمل اور قوت کا استعمال کسی شریف پیشے میں کرتے ، تو ان کی زندگی نہایت کامیاب ہوتی ۔ ایسے لوگوں کو شکایت ہوتی ہے ۔ کہ اس قدر محنت کے باوجود انھیں دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں آسکتی ، اور دنیا میں ان کا کوئی دوست نہیں ۔ حالانکہ اس کی تہ میں بھی بچپن کا لاڈ کارفرما نظر آئے گا ۔ زندگی ان کے لئے ایک مصیبت اور عذاب کا نام ہے ۔ ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے لئے ایسے اسباب پیدا ہو جائیں کہ وہ بچپن کی طرح دوسروں کے

دست نگر بن کر زندگی بسر کر سکیں۔ ان لوگوں کی حالت بالکل اس پودے کی سی ہے جو حرارت خانہ (Hot House) میں پیدا ہو۔ باہر کی ذرا سی سرد ہوا اس کو مرجھا دے گی۔ یہی حال اُن لوگوں کا ہے وہ زندگی کی سرد ہوا کو برداشت نہیں کر سکتے زندگی کا مقابلہ اور بقا کے لئے جہد، اس کا تصور ان کے رونگٹے کھڑے کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

مکروہ، قابل نفرت، اور فالتو بچوں سے جو سلوک کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی کمتری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے واقعات اور اخبارات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے۔ کہ کس قسم کے بچے مکروہ ہیں۔ اور کن بچوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آج بیرحمی حیوانات کو روکنے کے لئے تو قانون موجود ہے۔ اور اس کے لئے سخت سے سخت سزائیں دی جاتی ہیں لیکن افسوس کہ اس متمدن زمانے میں اولاد سے بے رحمانہ سلوک کرنے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ہندوستان کی جہالت زبان حال سے پکار پکار کر اس کا ماتم کر رہی ہے۔

یہ بیرحمانہ سلوک جس کا ذکر مذکورہ بالا سطور میں کیا گیا ہے ضروری نہیں کہ بدنی سزا یا جسمانی عذاب کی صورت میں ہو۔ گو یہ بدنی سزا بھی ایک وحشیانہ فعل سے کم نہیں۔ اور موجودہ تحقیقات بتاتی ہے۔ کہ بچوں کو جسمانی سزا دینا ایک ظلم عظیم ہے۔ اس سلوک کا المیہ پہلو تو وہ صدمہ ہے جس کا اثر دماغ اور روح کو پہنچتا ہے۔ ایسے ماحول میں پروردہ بچے اور پھر جن سے اس طرح برا سلوک کیا جائے جوان ہو کر بالکل بیکار ہو جاتے ہیں۔ وہ زندگی کو ایسے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ بس سوسائٹی کے دشمن بن کر رہ جاتے ہیں۔ نفرت سماج کی ضد ہے۔ اور محبت زندگی کا ایک مضبوط رشتہ اور انسانی برادری کی تخلیقی تحریک۔ ایسا بچہ جسے یہ محسوس کرایا گیا ہو کہ وہ مکروہ ہے۔ اور اس کی سوسائٹی کو کوئی ضرورت نہیں کیا خیال کرے گا؟ یہی کہ

دوسرے سب لوگ اس کے دشمن ہیں۔ اور سماج میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ یقین اور خیال ہی وہ بنیاد ہے۔ جس پر باغی۔ مجرم اور طفیلی اپنی زندگی کی عمارت تیار کرتے ہیں۔

بار بار کا جبری تجربہ بھی اسی قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے۔ ایک ہوشیار بچہ اپنے ہم جماعتوں کے حسد کا نشانہ بن جائے اور ایک عرصہ تک وہ اس سے قطع تعلق کر لیں تو اس سے بھی اس بچے میں کمتری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ یہ بچہ گو مکروہ نہیں اور نہ وہ فالتو ہی بچہ ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک ذلت محسوس کرتا ہے کہ اسے اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں شرم اور ناراضگی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اور وہ کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا یہ جذبہ اس کے سینے میں ہی دب کر رہ جائے گا۔ اسی طرح مذہبی تعلیم میں اگر زیادہ سختی کو روا رکھا جائے اور بچے کی ذرا ذرا سی لغزش کو مذہبی توہین قرار دے کر اسے سزا دی جانے لگی تو نتیجہ بالکل ایسا ہی نکلے گا۔ جبریہ تجربات خواہ اس کا باعث گھر، مدرسہ یا سوسائٹی کچھ ہی کیوں نہ ہو شخصیت کو مسخ کرنے یا اسے بگاڑنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ کیونکہ تجربات جو شخصیت کے نشو و نما اور اس کے سوسائٹی کے لئے مفید بننے میں مد ہوتے کوئی تخلیقی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔ بلکہ جبر کی تلخی میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ دور حاضر کے ایک مشہور و معروف نفسی ڈاکٹر میکڈوگل لکھتے ہیں کہ بچوں کو ان کی خود اعتمادی میں بغیر کسی استثنا کے حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے انھیں بات بات پر ٹوکنا برا ہے۔ بہت سے ہونہار بچوں کی فطری استعدادیں محض حوصلہ افزائی کے فقدان کے باعث دب کر رہ گئیں۔ اور بعض دفعہ ایک ہی جملہ ان کو کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے۔ بچوں کو بات بات پر جھڑکی بتانا اور سزا دینا ہی اصل سبب ہے لاکھوں ناخوش انسانوں اور اعصابی بیماریوں کی تکالیف کا۔ بچپن کے یہ تاثرات آئندہ زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔ زندگی جو زندہ دلی کا نام ہونا چاہیئے۔ مایوسی

اور ذہنی پریشانی کا ایک گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے۔

ادنیٰ گھرانوں کے بعض بچے جن کے والدین ان کی پرورش نہایت عمدگی سے کرتے ہیں بچپن میں تو خوب خوش و خرم رہتے ہیں۔ اور اس قسم کا انھیں کوئی تجربہ نہیں ہوتا، جو ان کے دماغ میں احساس کمتری پیدا کر سکے۔ مگر جوں جوں وہ بڑھتے ہیں اور ان کا شعور بیدار ہوتا ہے، تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو سماجی لحاظ سے بہت کمتر درجہ کا ہے۔ انھیں اس احساس سے تکلیف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بڑے آدمی اپنے حسب و نسب بتانے سے ذرا گھبراتے ہیں۔ یا کسی عہدہ پر متمکن ہو کر وہ غریب رشتہ داروں سے دور بھاگتے ہیں انھیں ان سے اپنا تعلق بتاتے عار معلوم ہوتی ہے اس کا باعث یہی احساس کمتری کا جذبہ ہے

کون کس وقت اپنے آپ کو فرو تر محسوس کرتا ہے؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ مثلاً جس شخص کا منتہائے نظر دولت پیدا کرنا ہو۔ وہ جب اپنے سے زیادہ دولت مند آدمی سے ملے گا، تو وہ اپنے تئیں کمتر خیال کرے گا۔ لیکن جونہی وہ ایسے لوگوں سے ملاقی ہوگا جو اس سے کم درجے کے ہیں تو اپنے آپ کو برتر سمجھے گا۔ اسی طرح ایک عالم جب اپنے سے زیادہ عالم فاضل کو دیکھے گا تو اس کا احساس فرد تری بیدار ہو گا۔ ایسا شخص جو سوسائٹی میں ایک نمایاں حیثیت کا طالب ہو، جب کسی اعلیٰ رکن سلطنت اور اس کی جاہ و حشمت کو دیکھتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو ایک حقیر انسان سمجھتا ہے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اسی طرح ہوتا ہے۔ یہ احساسات کمتری دراصل بالکل معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ محض وقتی بات ہوتی ہے۔ لیکن اگر انھیں معمولی باتوں کو نشوونما دی جائے تو اس سے زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ ان دماغی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے عقل سلیم اور فطری ہمدردی تریاق کا اثر رکھتی ہے۔

تیسری اور آخری قسم میں ایسے لوگ آتے ہیں جن میں ذلت اور رسوائی کا خیال

جڑپکڑ چکا ہے اور اس خیال کا باعث شاید کوئی مخفی راز یا کوئی ناقابل عفو قصور ہو محبت میں ناکامی، سوسائٹی کی نگاہ میں گر جانا۔ دولت کا ضائع ہو جانا۔ کوئی ایسا خفیہ گناہ یا غلطی جو ان کے دل و دماغ پر ہر وقت حاوی رہے۔ اس قسم کے خیالات سے انسان میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ اور جڑ پکڑتا ہے اگر کسی فرد کو ذاتی قدر و قیمت کا بہت زیادہ احساس ہے تو اس کو یا اس کے انا (EGO) کو ذرا سی ٹھیس لگنا اس کے جذبات کو بڑی طرح مجروح کر دیتا ہے جس کا اندمال بہت مشکل ہوتا ہے۔ دراصل بات یہ ہوتی ہے کہ ایسا شخص جو کسی قسم کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اگر اس کی راہ میں ذرا سی تحقیر آمیز یا کسی قسم کی معمولی بات حائل ہو جائے۔ تو وہ اس کو اپنی حد سے زیادہ تذلیل سمجھتا ہے اس کے برخلاف ایسا فرد جو ایک مذہبی ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ جب کسی ترغیب سے مرعوب ہو کر کسی کمزوری کا اظہار کر دیتا ہے تو ایسے شخص کا ضمیر گناہ کی طرف زیادہ راغب ہونے لگتا ہے۔ ضمیر جتنا زیادہ گنہگار ہوتا جائے گا۔ اسی قدر اس کا احساس دماغ پر ہوگا۔ اور وہ شخص اپنے آپکو کمتر سمجھنے لگے گا۔ آج ہم مذہبی آدمیوں کے افعال دیکھکر حیران ہوتے ہیں۔ اور ہمیں اس سے زیادہ یہ بات حیرت میں ڈالتی ہے کہ یہ لوگ کیوں قعر مذلت میں کود پڑے ہیں ان کی اس حالت کو دیکھ کر عوام اس سے بہت برا اثر لیتے ہیں۔ اور موجودہ سوسائٹی میں بیشتر برائیاں انھیں مذہبی لوگوں کے باعث رونما ہوتی ہیں۔ اسی لئے بعض نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ موجودہ تہذیب کے لئے مذہب ایک سم قاتل ہے۔ لیکن ان کا یہ نظریہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اگر ہم مذہب کو چھوڑ دیں۔ تو بھی ضمیر سچائی اور ہمدردی بنی نوع انسان کے جذبات جو دراصل مذہب کے بنیادی اصول ہیں ان کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ مذہب کو تباہ کرنے سے ہم مذہبی لوگوں کی برائیاں دور نہیں کر سکتے۔ مگر ہمیں چاہئے کہ ان اندرونی خرابیوں کو دور کر کے ہم مذہب کو

اصلی رنگ میں پیش کریں۔ تاکہ دنیا میں امن و امان کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم آسکیں

کمتری کی خصوصیات صغریٰ | فرد تری کی خصوصیات کو ہم دو شقوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک صغریٰ اور دوسری کبریٰ۔ ذرا زیادہ تفصیل سے اگر دیکھا جائے۔ تو شق صغریٰ میں وہ احساسات آتے ہیں۔ جو بچپن کی غلط تربیت کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن کبریٰ کے تحت خاص قسم کی برائیاں، جبری جذباتی تجربات وغیرہ آتے ہیں۔

علامات صغریٰ کو ہم مندرجہ سرخیوں کے تحت تقیم کریں گے

۱۔ زیرکانہ مقصد کے بغیر اضطرابی سرگرمی۔

۲۔ سماجی حجاب اور دوسروں سے پہلو تہی۔

۳۔ حد سے زیادہ سریع الحس ہونا اور کسر نفسی کرنا۔

۴۔ سطحی پن

۵۔ کم گوئی اور بسیار گوئی

۶۔ ایک خشک مزاج خردہ گیرانہ رویہ

اضطرابی سرگرمی ہمیشہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے۔ کہ وہ شخص اپنے کو کمتر محسوس کرتا ہے کہ اسے کچھ اور زیادہ کام کرنا چاہیئے تھا۔ اگر اس کے دل میں یہ احساس نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی بے قرار نہ ہوتا۔ اس قسم کی بے سوچے سمجھے سرگرمیاں تجربات اور جدوجہد اس صداقت کی تصدیق کرتے ہیں۔ بے خوابی کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے۔ اگر بے خواب شخص کے دماغ میں سکون پیدا ہو جائے۔ تو وہ فوراً سو جائے گا۔ مگر تحت الشعور کی بے چینی اسے دن یا رات کو آرام سے بیٹھنے یا سونے نہ دے گی۔

یہ بے چینی ایک مخفی خوف سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی شخص کا کاروبار میں ناکام ہونا یا آئندہ زندگی میں نامراد رہنا بے چین بنا دیتا ہے۔ اپنی صحت یا کسی دوست کا فکر اس

کے تحت الشعور میں ایک خوف پیدا کر دے گا۔ کسی قصور کا عیاں ہو جانے کا خدشہ بھی یہ حالت پیدا کر دے گا۔ اس کا سبب جو کچھ بھی ہو۔ مگر اس آدمی کی حالت بالکل اسی طرح ہو گی۔ جیسے کوئی بھول بھلیوں میں پھنس کر اپنا راستہ کھو بیٹھے۔ ایسی حالت میں اس پر خوف اور تشویش کے آثار نمایاں ہوں گے۔ جب ہم اپنے گھر میں اپنے ہی ماحول میں ہوں تو اس وقت ہمارے دماغ میں کسی قسم کی بے چینی، بے قراری یا بے سوچے سمجھے کام کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ اور جہاں ایسی حرکات کسی کی سرزد ہونے لگیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ فرد نفسیاتی طور پر کسی نقص یا خوف کو محسوس کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خوف کسی قریب الوقوع واقعہ کا سبب نہ ہو۔ اور اس کا باعث کوئی ایسا جذبہ ہو جسے ہمارا شعور مطلق بھول چکا ہو۔ مگر وہ جذبہ دماغ میں محفوظ رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ خوف۔ اضطراب۔ بے خوابی۔ بغیر مقصد سرگرمی ہوتا ہے۔ یہ بات احساس کمتری کی ہر ایک خصوصیت پر صادر آتی ہے۔

سماجی ڈر اور اس کے ساتھ شرمیلا پن اور جھجک یہ احساس کمتری کی ایک اور علامت ہے۔ اور یہ نتیجہ ہوتی ہے۔ اس بات کا کہ دوسرے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اور اسے فضول جان کر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ خواہ بچپن میں ایسا کیا جائے یا جوانی میں کسی کو حقیر نظر سے دیکھا جائے۔

سماجی ڈر اور دوسروں سے پہلو تہی کرنا اس کا مطلب صرف یہی ہوتا ہے۔ کہ ایسا کرنے والے شخص کو کسی مجلس میں کوئی تلخ تجربہ ہوا ہو گا۔ اور مجلسی تذلیل کا ہی یہ اثر ہے۔ کہ اب وہ مجلس میں آنے سے گھبراتا ہے۔ اس کی خود اعتمادی کو ایک دفعہ چونکہ ٹھیس لگ چکی ہے۔ اس لئے وہ دوسرے کے سامنے بالخصوص جہاں اجنبی لوگ ہوں جانے سے گھبراتا ہے۔ ایسی مجلس میں اس کا تحت الشعور اسے جانے سے روکتا ہے۔ جب کسی شخص میں ایسی جھجک پائی جائے تو اس کا مطلب نفسیات کی روشنی میں یہ ہو گا۔ کہ اسے اپنے

دوستوں یا اجنبیوں سے کوئی ایسا تجربہ ہوا جس کے نتیجہ کے طور پر ایک جذباتی اندرونی جبر رونما ہوا۔ اور یہ جبر اب احساس کمتری کی صورت میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

سماجی ڈر کا تعلق ذکی الحس ہونے اور کسر نفسی سے بھی ہے۔ بھلا کوئی کیوں ذکی الحس ہو اور کسی کو خواہ مخواہ کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہیچمدان سمجھتا رہے؟ ان باتوں کو معلوم کرنے کے لئے آپ ذرا ان حالات کے پس منظر کا مطالعہ کیجیے جن کا نتیجہ یہ خیالات ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ضرور ان سے کوئی ایسا قصور سرزد ہوا ہوگا۔ جس کا اثر اُن کے دماغ پر رہے یا کسی نے ان سے نفرت کا اظہار کیا ہوگا یا اس قسم کا کوئی اور ذلت آمیز صدمہ پہنچا ہوگا۔ جس کے باعث وہ ذکی الحس ہیں۔ یا کسر نفسی کرتے ہیں جب ایک بار کسی کے ذہن میں اپنے متعلق حقارت کے خیالات بیٹھ جائیں تو پھر جونہی وہ شخص کسی غیر کے سامنے جائے گا تو تحت الشعور فوراً غیر شعوری طور پر گذشتہ یاد کو تازہ کر دے گا۔ اور وہ دوسروں کی موجودگی میں اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگے گا۔

مردوں میں تقریباً لباس۔ جوتا اور خوراک کے معاملے میں بہت زیادہ احساس ہوتا ہے لیکن عورتیں زیبائش، ہاتھوں، انگلیوں اور ناخنوں کا حد سے زیادہ خیال رکھتی ہیں ان میں ایک دوسری پر نکتہ چینی کرنے کی بری عادت ہوتی ہے دراصل انھیں خود اپنی فروتری کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس احساس کو دور کرنے کے لئے وہ دوسروں پر نکتہ چینی کرتی ہیں۔ اور اس طرح دل کو طفل تسلی دے لیتی ہیں۔

سطحی پن بھی احساس کمتری کی ایک علامت ہے۔ یہ علامت ایسے شخص میں پائی جاتی ہے جس کا دل ہر وقت اچاٹ سا رہے۔ اس کے نزدیک کوئی چیز بھی اہم نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ہر چیز کو ایک مصیبت خیال کرتا ہے دنیا اس کے لئے مصائب کا گھر ہے۔ وہ ہر ایک شے کو سطحی نظر سے دیکھتا ہے۔

آپ نے بعض لوگ دیکھے ہوں گے۔ جو ایک وقت میں تو نہایت ادراس مشاہدہ

نفس میں محو اور افسردہ خاطر نظر آئیں گے لیکن دوسرے وقت ان کی حالت اس کے برعکس ہو گی۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس رہے ہوں گے اور ساری مجلس کو وہ سر پر اٹھائے ہوں گے جلد جلد مزاج کا متضاد حالتوں میں بدلنا جذباتی بے قراری کو عیاں کرتا ہے۔ جو احساس فرد تری کو ظاہر کرنے کا ایک اور ذریعہ ہے۔ اگر کوئی فرد جذباتی طور پر ایک حالت پر رہے تو وہ کبھی بھی ان وقتی اثرات کا مظاہرہ نہ کریگا۔ کیوں کہ ایسا کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی روح کسی جذباتی تجزیہ کی وجہ سے رک سی گئی ہے اور جو اس کے خیالات کو احساسات کے ساتھ ساتھ جانے نہیں دیتی۔

ایک خشک مزاج خردہ گیرانہ رویہ بھی احساس کمتری کا ایک اور نشان ہے۔ تنگ مزاج آدمی بھی کچھ وہمی سا ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح خردہ گیر بھی، جو شخص اپنے آپ کو سوسائٹی کا ایک فرد سمجھتا ہے یا اپنے آپ کو سوسائٹی کے قابل بناتا ہے، ایسا شخص ہرگز ہرگز خشک مزاجی سے کام نہ لے گا۔ اور نہ تنقید کو تنقید کی حد سے بڑھنے دے گا

تنقید، حق بات کو ظاہر کرنے کے لئے اور باطل کو مٹانے کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ لیکن صحیح تنقید ہمیشہ تخلیقی پہلو لئے ہوتی ہے اور اسے ہمیشہ ذاتیات سے بالاتر ہونا چاہیئے وہ تنقید جو تخریبی ہو۔ ہمیشہ منفی ہوتی ہے۔ اور ایسی تنقید احساسِ کمتری کا نتیجہ ہوتی ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب افعال بے فائدہ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا نتیجہ کوئی نہیں نکلتا ہے اور ان سے دماغ ہمیشہ بری طرف مائل ہوتا ہے۔

لیکن احساس فرد تری کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ جسے مثبت پہلو کہا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنے آپ کو کمتر محسوس کرتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو برتر بنانے کے لئے کام کرتا ہے۔ یہ جو کچھ کام کرتا ہے۔ اسے اگر "بدل" کہ لیا جائے تو موزوں ہوگا۔ لیکن یہ "بدل" دراصل محض ایک دکھاوے کی چیز ہو گی۔ کیونکہ سماجی طور پر یہ ایک بے فائدہ چیز ہوتی ہے یہ "بدل" محض اندرونی کمتری کو چھپانے کے لئے ہوتا ہے ورنہ درحقیقت یہ بھی احساسِ کمتری

کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔ اس قسم کی علامات کو ہم ذیل کی شقوں میں تقسیم کرتے ہیں

۱۔ چھوٹے قد کا آدمی جو تن کر چلے۔

۲۔ کوئی شخص تکلف سے گفتگو کرے۔

۳۔ افراد جو زیادہ شاندار لباس پہنیں۔

۴۔ عورت جو مردوں کی طرح پیش آئے یا مرد جس میں زنانہ پن نمایاں ہو۔

۵۔ کوئی آدمی اپنے آپ کو یکتا خیال کرے۔

۶۔ غنڈہ پن اور جبر

"ٹھنگنا آدمی فتنہ ہوتا ہے" یہ ایک ضرب المثل ہے۔ اس کا تن کر چلنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسے اپنی جسمانی کمزوری کا احساس ہے اس کا تحت الشعور اپنا چھوٹا پن محسوس کرتا ہے۔ اس کمی کو محسوس کرنے کے لئے وہ تن کر چلتا ہے۔ اگر اشخاص نفی کی طرف راغب ہو جاتے۔ تو ان کا احساس کمتری انھیں دنیا سے الگ تھلگ رہنے پر مجبور کرتا۔ اور وہ کسی تاریک کنج میں پڑے دن کاٹتے یعنی وہ زندگی کی کشمکش میں ایک طرف پھینک دیئے جاتے۔ حفاظت خود اختیاری کا ملکہ قدرت نے ہر ایک کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔ اس لئے چھوٹے قد کا آدمی اپنے ماحول پر چھانے کے لئے تن کر چلتا ہے۔ تاکہ دوسرے اس کی شخصیت کو محسوس کریں۔ لیکن یہ حالت بھی خطرے سے خالی نہیں۔ کیوں کہ یہ "بڑا بننا" محض ایک دکھاوے کی چیز ہے۔ جب تک کہ صحیح معنوں میں اس آدمی میں کوئی جوہر نہ ہو نقالی سے حقیقت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا آدمی جو اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے تن کر چلتا ہے یا بڑی باتیں بناتا ہے۔ کسی ایسے ماحول میں چلا جائے۔ جہاں لوگ اس کی ان حرکات کا تمسخر اڑانے لگیں تو اس کا نتیجہ خطرناک ہو گا۔ اس کے ہوائی قلعے یکدم گر جائیں گے۔ وہ فوراً ہمت ہار کر پریشان ہو جائے گا۔ اس کی خود نمائشی کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ اور وہ اپنے آپ کو کمتری اور مایوسی کے سمندر میں غوطے کھاتا ہوا پائے گا۔ اصلی بڑائی وہ ہے جو انسان میں اپنی لیاقت

قابلیت، شرافت کے ذریعہ پیدا ہو محض بڑا بننے سے آدمی بڑا نہیں بن سکتا۔ بڑا وہ ہے جسے دوسرے لوگ بڑا سمجھیں۔ اور اس کی موجودگی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھیں۔ ایسی حالت میں قد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہی دراصل بڑائی کی پہچان ہے۔

جو شخص تکلف سے باتیں کرتا ہے وہ گویا ذاتی کمتری کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ علامت چھوٹے طبقہ کے لوگوں میں یا کم علم رکھنے والوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی ذاتی کمتری کو چھپانے کے لئے اور سامعین پر اپنا رعب ڈالنے کے لئے تکلف سے باتیں کرتے ہیں۔ بڑے بڑے الفاظ اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ انھیں ذی علم خیال کریں یا عام باتوں میں مشکل الفاظ بولتے ہیں۔ اردو میں بات کرتے کرتے فارسی، انگریزی یا عربی کے ایسے اشعار سنا جاتے ہیں جنہیں دوسرے نہ سمجھتے ہوں وہ دوسروں پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ وہ عام لوگوں سے بلند اور علمی طبقے سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

لباس کے معاملہ میں زیادہ تکلف کرنا بھی اپنی کمزوری اور کمتری کو چھپانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ زیادہ باتیں کرنا اور لباس کے متعلق زیادہ تکلف کرنا ایک ہی نوع کی دو مختلف تصویریں ہیں اور دونوں ہی فرد تری کے احساس کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض عورتیں قدرت کی ستم ظریفی کا نمونہ ہوتی ہیں لیکن وہ زیبائش اور آرام کے ذریعہ اپنی بدصورتی کو چھپانا چاہتی ہیں۔ یہ بالکل وہی بات ہے جیسے لاڈلا بچہ، دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے روتا ہے۔

ہماری تہذیب کے نقصانات میں سے ایک نقصان یہ بھی ہے۔ کہ اکثر عورتیں اپنے آپ کو حقیر خیال کرتی ہیں۔ خاص کر ان کے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ طبقہ نسوان کمتر مخلوق میں سے ہے۔ مردوں کی بڑیں کہ وہ اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر عورتوں کے ذلیل بنانے میں ہماری صدیوں کی تہذیب کی کارفرمائی ان دونوں باتوں نے عورتوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ کمتر طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے عورتوں میں احساس فرد تری زیادہ ہوتا ہے۔ اس

کا ردِ عمل آج نظر آرہا ہے۔ طبقہ نسواں نے سماج کے قوانین کے خلاف جو مردوں کے بنائے ہوئے ہیں علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے۔ ذرا مہذب ممالک کے اخبارات اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آئے دن نئی نئی تحریکیں عورتوں کی طرف سے جاری ہو رہی ہیں۔ دونوں جنسوں کے ٹکراؤ نے ایک نفسیاتی کشمکش پیدا کر دی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں بہت سے عمرانی اور جنسیاتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

اگر ایک خاتون مردانہ لباس میں نظر آجائے تو کیا یہ اس کے احساس فرد تری کی بین دلیل نہیں ہے؟ وہ عورت ہوتے ہوئے مردوں کی نقل اتارتی ہے اور ویسی ہی عادات اور حرکات کرتی ہے۔ بعض مرد بھی اپنی بعض جسمانی کمزوریوں کے باعث ایسا محسوس کرتے ہیں گویا وہ محض عورتیں ہیں۔ ان کے لباس میں مردانگی کے اظہار کی جگہ نسوانیت ٹپکتی ہے۔ ان کی طرز گفتگو اور حرکات صنفِ نازک سے ملتی جلتی ہیں۔

اگر مرد اور عورتوں کے دماغ پوری طرح نشوونما پائیں تو پھر دونوں میں احساس فرد تری یا برتری کا نام تک نہ رہے۔ یہ جنسی فرق محض قوار کو مکمل کرنے اور اس کے پورا کرنے کے لئے ہے۔ اس فرق سے یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں

بعض لوگ اپنے آپ کو یکتا خیال کرتے ہیں۔ یہ بھی احساس کمتری کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ لاڈلے بچوں کے معاملہ میں یہ بات خاص کر عیاں ہوتی ہے۔ ایسے بگڑے ہوئے بچے یا بچیاں یہ یقین لے کر بڑھتی ہیں کہ وہ یکتا ہیں۔ جب بچہ جسمانی طور پر بڑھتا ہے۔ تو بعض اوقات وہ جذباتی طور پر کوئی ترقی نہیں کرتا اور دنیا کے متعلق اس کا نظریہ بالکل وہی ہوتا ہے، جو وہ اپنی پیاری ماں کے متعلق سوچتا ہے۔ یعنی سب سے وہ ماں کی طرح خراج تحسین وصول کرے گا اسی لئے آپ قوموں میں ایسے افراد دیکھیں گے جو ہمیشہ نمایاں حالت میں رہنا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا وہ کوئی اور پوزیشن برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ سر نئے فیشن میں پیش پیش نظر آئیں گے۔ ان کی شخصیت سینکڑوں میں ایک دکھائی دے گی۔ وہ ایک

مخصوص کردار کے مالک ہوں گے۔ وہ عام لوگوں سے الگ تھلگ رہیں گے۔ اور اپنے آپ کو سب سے برتر ثابت کریں گے۔ نفسیاتی طور پر ان لوگوں کی حالت بڑی قابل رحم ہوتی ہے اگر سوسائٹی میں ذرا سی بات ان کی خلاف مرضی ہو جائے، تو وہ اسے اپنی ہتک خیال کریں گے۔ ذرا سی ہتک ان کی عزت کو برباد کردے گی ایسے لوگ معمولی حادثہ پر مشتعل ہو کر خودکشی تک کرلیں گے۔ اگر ان کے خیال کے مطابق ان کی عزت نہ کی جائے تو وہ آپے سے باہر ہو جائیں گے۔ یقین جانئے، جو فعل یا خیال انسان کو انسان سے دور رکھے۔ وہ فعل احساس کمتری کا نتیجہ ہوگا کیونکہ قدرت نے مرد اور عورت کو پیدا اس لئے کیا ہے کہ انسان ملکر ایک سماج ایک سوسائٹی بنائیں۔ اسی ہمدردی اور رفاقت سے دنیا جنت بن سکتی ہے۔

اپنے آپ کو یکتا (UNIQUE) جاننا اور جنسی تفریق یہ دونوں موجودہ تہذیب کی لعنتیں ہیں۔ اسی سے طبقوں (CLASSES) کی تقسیم شروع ہوئی۔ آج جرمن قوم کی جو حالت بنی ہوئی ہے۔ وہ یہی یکتا ہونے کا خیال ہے۔ یکتائیت کا نظریہ احساس فرد تری کا دوسرا نام ہے۔ اسی کا شکار ہو کر جرمن قوم میں سے ہٹلر ایسا ڈکٹیٹر پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ جرمن قوم کے دلوں میں دوسری یورپین اقوام کے خلاف بیحد نفرت اور حقارت کے جذبات مشتعل ہیں۔ اور موجودہ جنگ جس نے امن عالم کو مخدوش کر دیا ہے اسی نفرت کا نتیجہ ہے۔ دوسروں سے نفرت کرنا دراصل احساس کمتری کو دور کرنے کا ایک خیال ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک صحیح الدماغ انسان اپنے آپ میں اور اپنے سے کم مرتبہ لوگوں میں فرق نہیں دیکھتا۔ اور یہی بات انسانیت کی معراج ہے

سب سے آخری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جن میں غنڈا پن ظلم اور زیادتی کرنا ہو۔ اگر مالک اپنے نوکروں کو ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ بتاتا رہے۔ انھیں بات بات پر گالی دے۔ تو اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس کے دل میں ایک خوف ہے کہ خاموش رہنے سے کہیں اس کے رعب میں فرق نہ پڑ جائے۔ وہ جبلی طور پر محسوس کرتا ہے۔ کہ اس کی ذاتی قوتیں منفی ہیں۔ اس احساس کو دور کرنے کے لئے وہ گالی گلوچ سے کام لے کر نوکروں پر رعب ڈالتا ہے۔ یہی حال اس

خاوند کا ہے۔ جو اپنی بیوی ــــ رفیقہ حیات ــــ پر تشدد کرتا ہے۔ یا باپ جو اپنے بچوں کو ذرا ذرا سی بات پر سزا دینے لگتا ہے۔ تشدد۔ لڑنا جھگڑنا۔ تکبر۔ قسم کھانا۔ اور ہر بات کا ادعا کرنا۔ یہ علامتیں جہاں نظر آئیں، سمجھ لینا چاہئے کہ اس شخص میں خود اعتمادی مفقود ہے

احساس فروتری کی جڑ کو معلوم کرنے کے لئے آپ خود بھی اپنا تجزیہ کریں۔ یا کسی ماہر نفسیات سے مشورہ لیں۔ لیکن اگر آپ خود اپنے دماغ پر زور دے کر اپنے بچپن کے حالات کو یاد کریں۔ کہ وہ کون سے تلخ تجربات تھے جن کا نتیجہ آپ کا احساس فروتری ہے۔ مثال کے طور پر! کیا آپ لاڈلے بچے تھے۔ کیا آپ سے نفرت کی جاتی تھی کیا آپ کو ایک "فالتو" بچہ سمجھا جاتا تھا، کیا آپ جسمانی طور پر کمزور تھے۔ وغیرہ وغیرہ......... تو آپ کو اس احساس کی اصل وجہ معلوم ہو جائے گی۔

(باقی آئندہ)

نفسیات شباب

نگار کا نظیر نمبر اور

موجودہ طرزِ تنقید

(از سید اختر علی تلہری صاحب جوبلی کالج، لکھنؤ)

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کا "نگار لکھنؤ" نظیر نمبر کے لباس میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مختلف ارباب ذوق نے نظیر اکبر آبادی کی شاعرانہ خصوصیتوں کو اُبھارا ہے اور اس کی کوشش کی ہے کہ اس "مشرقی بدمذاقی" کی اصلاح کر دی جائے جس نے نظیر کے شاعرانہ کمالات کو کبھی سنجیدہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا۔ اس سلسلے میں جو مضامین لکھے گئے ہیں ان میں جناب مجنوں گورکھپوری، جناب محمود اکبر آبادی، جناب اختر اُرینوی اور جناب پروفیسر احتشام حسین رضوی کے مقالات خاص طور سے قابل غور ہیں ان صاحبان قلم نے نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے متعلق جو عنوان نظر اختیار کیا ہے اس پر بیشتر مارکس کے خیالات کی مہریں لگی ہوئی ہیں دوسرے لفظوں میں یہ تمام مقالے نوجوان ادیبوں کی اصطلاح میں "ترقی پسندانہ طرز بحث" کے ترجمان ہیں۔ البتہ جہاں تک پروفیسر احتشام حسین صاحب کا تعلق ہے گو اُن کا اسلوب نظر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے تاہم انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کافی منطقیانہ احتیاط کے ساتھ تنقید کے جدید "اشتراکی مذاق" کے راستے پر وہ بھی چلے ہیں مگر اپنے دوسرے ہم سفروں کی طرح یہ نہیں کیا ہے کہ نظیر کے ماسوا دوسرے تمام شعراء کے خیالات و افکار کے شاداب پھولوں کو جاگیردارانہ نظام (فیوڈل سسٹم) کی پیداوار قرار دے کر "سبزہ بیگانہ" کی طرح روندتے چلے جائیں انھوں نے بھی "اشتراکی مذاق" کے ماتحت نظیر کے بہت سے ٹیڑھے بیڑھے بدہیئت خذف ریزوں کو لعل و گہر سمجھ لیا ہے لیکن ذرا بچ بچ کر۔ تحسین و ستائش کے ساتھ نظیر کی شاعری کے بعض نمایاں نقائص کی طرف بھی اشارہ کرتے چلے گئے ہیں۔ جناب مجنوں اور جناب اختر اُرینوی مگر "اشتراکی نظریات" کی رو میں اتنا تیز بہتے چلے گئے ہیں کہ انھیں اس کا بھی خیال نہیں رہا کہ زیرِ نظر مقالات کا مقصد نظیر کی اہمیت بحیثیت ایک شاعر کے واضح کرنا ہے بحیثیت ایک "جمہوریت پسند اشتراکی" کے نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ نظیر اکبر آبادی ایک پر گو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ انھیں تصویر کشی میں خاص ملکہ ہے۔ چنانچہ مختلف مناظر اور مختلف اشیا کی بڑی اچھی اچھی تصویریں انھوں نے لفظوں کے ذریعے سے کھینچی ہیں مگر جناب مجنوں کا یہ ارشاد کہ "ایسی مرقع نگاری میرحسن اور میر انیس کے بھی بس کی بات نہیں تھی" حسن ظن کی افراط ہے اگر مرقع نگاری اس کا نام ہے کہ خوب صورت "سمدھن" کے ایک ایک عضو کا بے پردہ جائزہ لے ڈالا جائے "کسبیوں" کے سینے۔ اُن کی ٹھِک مٹک اُن کے "ازار بند" وغیرہ سے نظر نہ ہٹائی جائے۔ چوہوں کے اچار کا نقشہ اُتارا جائے۔ رقاصہ کے بازاری حسن میں مختلف گوشوں سے رنگ بھرا جائے تو پھر واقعتاً انیس کے بس کی یہ "مرقع نگاری" نہیں تھی۔ انھوں نے شاعری کا جو موضوع قرار دیا تھا اس میں ان مرقعوں کی کہیں سے کھپت نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی طرح اختر اورینوی کا یہ خیال کہ "یہ سوز، درد، سودا وغیرہ بجا انفرادیت کی بھول بھلیوں میں چکر کھاتے رہے اور نظیر اجتماعی زندگی کے وسیع سبزہ زار میں کلیلیں کرتا پھرا۔ نظیر کی شاعری کے مطالعے سے زندگی کے ممکنات پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ نظیر کی شاعری اس عہد کی منفیانہ شاعری کے ریگستان میں ایک شاداب گلستاں ہے" خوش عقیدگی کی وہ حد ہے جہاں دعوے دلیل کے روپ میں نظر آتے ہیں۔

اس مقام پر ضمناً یہ امر واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ جناب مجنوں نے اپنے مضمون میں یا اختر اورینوی نے اپنے مقالے میں جو اس پر زور صرف کیا ہے کہ نظیر کی شاعری کا رخ "جمہوریت" کی طرف ہے۔ اس میں پرولتاری (عوامی) رجحانات پائے جاتے ہیں واقعے کی صحیح تصویر کشی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل جو مفہوم "جمہوریت" نے اختیار کر لیا ہے۔ پرولتاری (عوامی) ادب کا جو منشا سمجھا جا رہا ہے نظیر کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے ان کے دماغ میں ان چیزوں کا کوئی تخیل موجود نہیں تھا پھر وہ ان سے متاثر ہو کر کس طرح لکھ سکتے تھے؟ روٹی، ہولی، دیوالی وغیرہ پر جو انھوں نے طبع آزمائی کی ہے وہ "موضوعاتِ شعر" کے انتخاب میں اُن کی اس بے باکی بے احتیاطی کا نتیجہ ہے جس نے اُن سے "کھٹمل، مچھر، پستو" جیسی جیسی چیزوں پر نظمیں لکھوائی

ہیں یہ بے احتیاطی اس وقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جب وہ مرقع نگاری میں فحش الفاظ کا استعمال کرتے ہیں یا انسانی، عضار کے متعلق ادنی جزئیات کی تصویر کھینچتے ہیں جنھیں دیکھ کر "شائستہ ادبی ذوق" کی جبیں پر عرق انفعال نمودار ہو جاتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر احتشام حسین صاحب نے اپنے اشتراکی رجحانات کے باوجود الفاظ کے استعمال میں اس بے احتیاطی کے خطرے کو سمجھ لیا اور یہ لکھ کر کہ "عوام کے لفظ سے ایک غلط فہمی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے ضمناً اسے بھی واضح ہو جانا چاہئے کہ بیسویں صدی میں عوام کے لفظ نے مفہوم کے اعتبار سے جو وسعت اختیار کر لی ہے اور سیاسی اصطلاح میں جن بیدار اور سیاسی شعور رکھنے والوں کی طرف اس لفظ کا اشارہ ہوتا ہے وہ نظیر یا اس وقت کے کسی شاعر یا ادیب کے ذہن میں نہیں ہو سکتا۔ نظیر کے یہاں عوام سے مراد عام لوگ ہیں، چاہے وہ پیشہ ور ہوں یا کوئی اور" اپنے کو اس مغالطے سے بچا لیا۔

مجنوں گورکھ پوری اور اختر رینوی کے گراں قدر مقالوں کی بنیاد چونکہ جمہوریت اور پرولتاری ادب" کے اس غلط مفہوم پر ہے اس لئے علمی حیثیت سے اُن کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ مگر مجھے صرف اتنا ہی نہیں کہنا ہے۔ مجھے براہ راست اس موجودہ تنقیدی اصول کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے جو مارکس کے نظریے کے سانچے میں ڈھل کر شاعری کے خرمن کے لئے برقِ بلا بنا ہوا ہے۔

آج کل یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ متقدمین کے مایۂ ناز "شعری سرمایہ" کو جاگیردارانہ نظام (فیوڈل سسٹم) کی پیداوار قرار دے کر حقیر اور ناقابل التفات بتایا جائے۔ اور اس ادب کو جو اشتراکی خیالات کے سایے میں پرورش پائے بلا امتیاز سراہا جائے اور اس طرح ہماری متاع غزل اور اس سے ملتے جلتے دوسرے اصناف پر خط نسخ کھینچ دیا جائے۔ لیکن کیا یہ اسلوب تنقید علمی حیثیت سے مفکرین کی نگاہ میں سزاوار تحسین و آفریں ہو سکتا ہے؟ یا میرا جواب نفی میں ہے؟

نظر انصاف جب شاعری کا علمی حیثیت سے جائزہ لیتی ہے تو اسے یہی فیصلہ دینا پڑتا ہے کہ شاعری کی بلند مقامی ان "اقتصادی نظامات" کی پابند نہیں ہو سکتی اس کے پر و بال ذاتی حیثیت سے جس پاکیزہ اور مستقل فضا میں پرواز کے عادی ہیں اس کا مقتضا یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ عارضی چیزوں سے انہیں وابستہ کر دیا جائے۔

اگر شاعری کو ان اقتصادی نظاموں سے مقید کرایا جائے گا اور اس کے حسن و قبح کا معیار صرف یہ بنایا جائے گا کہ اس میں کہاں کسی اقتصادی نظریے کی ترجمانی ملتی ہے؟ یا ان خیالات کی جو جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہیں یا اشتراکی نظام کے یا پھر "نازی" اور "فاشی" نظامات کے؟ اور جس شاعری میں ان نظریات کی ترجمانی مل جائے جنھیں ہم اختیار کر چکے ہیں تو اسے اچھا بتایا جائے اور جو شاعری اُن کی ترجمان نہ دکھائی دے اُسے سرے سے مذموم قرار دے دیا جائے تو یہ طریقہ "ادب و شعر" کے حق میں کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ ان پابندیوں کے بعد وہ کبھی بین الاقوامی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ اقتصادی نظام غیر مستقل عارضی چیزیں ہیں۔ ہمہ گیری کی صفت سے انھیں کبھی متصف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے جہاں یہ نظامات فنا ہوئے ایسی شاعری کے متعلق جو اُن سے پورے طور سے وابستہ رہی ہے نقطۂ نظر بھی بدل جائے گا یا جن اقوام میں ان نظامات کو مقبولیت حاصل نہیں ہے، وہ ایسی شاعری کو پسند ہی نہیں کر سکتے جس نے ان نظامات کی ہی محدود فضامیں پرواز کو منتہائے نظر قرار دے لیا تھا۔

اصل میں ہماری شاعری کی بنیاد ہی ان چیزوں پر ہے اور ہونا بھی چاہیے جنھیں مستقل حیثیت حاصل ہے اور جو ہمہ گیری کی صفت سے موصوف ہیں ایک حقیقی شاعر خواہ وہ کسی اقتصادی نظام کے ماحول میں سانس لے رہا ہو اپنے اردگرد سے ایسی چیزیں منتخب کر لیتا ہے جو ہمہ گیری کی صفت رکھتی ہیں اور جن میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ جغرافیائی و قومی امتیازات سے قطع نظر کرتے ہوئے انسانیت کو متاثر کر سکیں۔ اس سلسلے میں محبت رنج و الم شادی و مسرت وغیرہ کے وہ بنیادی جذبات آتے ہیں جن سے انسان بلا تفریق متاثر ہوتا ہے اور یہاں اس

سلسلے سے طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان کے ان اساسی طریقوں (تشبیہہ و استعارہ تمثیل و کنایہ وغیرہ) کو بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جن میں تمام قومیں مشترک ہیں۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ شاعری کے اسلوبِ نظر کو فلسفے کے اندازِ فکر سے کوئی واسطہ نہیں ہے اگرچہ دونوں خیالات و افکار کا ذخیرہ خارجی حقائق سے حاصل کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک شاعر کا عنوانِ نظر فلسفی و حکیم کے طرزِ غور سے بالکل علیحدہ ہوتا ہے ممکن ہے کہ ایک ذات میں فلسفیت و شعریت جمع ہو جائیں اور وہ دونوں کو ایک جگہ سمو کر اپنے شاہکار تیار کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک وہ جامع الحیثیتین ذات فلسفیت برتے گی اس کا کلام بھی نظم کی صورت رکھے گا۔ اس میں شعریت نہ ہو گی۔ اور جہاں اس نے شعریت اختیار کی فلسفیت رخصت ہو جائے گی۔ فلسفی کا کام حقائق کی چیر پھاڑ ہے۔ وہ اصلیت و واقعیت کو بالکل برہنہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جہاں حقائق کی اس بے رحمانہ تشریح سے علیحدگی کی گئی اور تمثیل و تشبیہہ اور رمز و دلیلوں سے کام لیا گیا فلسفیت ختم ہو گئی اور شعریت آ گئی۔ اقبال کو فلسفی شاعر کہا جاتا ہے اس کے کلام کا تجزیہ کر لیا جائے تو یہی حقیقت نظر آئے گی کہ جہاں خالص فلسفہ ہے وہ شعریت کی لطافتوں سے محروم ہے اور جہاں شاعرانہ لطافتیں ہیں وہاں نظر کا رخ بدلا ہوا ہے۔ ان لطافتوں کی تہہ میں کوئی اچھوتا اندازِ بیان، کوئی نادر تشبیہہ یا پھر کوئی لطیف استعارہ کار فرما ہے۔

جوش ملیح آبادی "ترقی پسند ناقدین" کی آنکھوں کا تارا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ شاعرانہ عظمت کے بہت اونچے درجے پر فائز ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ عظمت ان نظریات سے وابستہ نہیں ہے جن کی اس نے ترجمانی کی ہے۔ بلکہ یہ عظمت ان نظریات سے ہٹ کر "معانی و بیان و بدیع" کے آفاق گیر راستوں سے آئی ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو ان نظریات سے اختلاف ہے وہ بھی اس کے شاعرانہ کمالات کے معترف ہیں۔

جوش کی "عورت" کے متعلق ایک مشہور نظم ہے اس میں باکمال شاعر نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ عورت کو موجودہ تعلیم نہیں دینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے :-

چاندنی۔ قوسِ قزح۔ عورت، شگوفہ، لالہ زار — علم کا کب اُن کے شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار
روشنائی میں کہیں گھلتی ہے موجِ آفتاب — کیا کوئی اوراقِ گُل پر طبع کرتا ہے کتاب
میرے عالم میں نہیں اس بدمذاقی کا شعار — کاکلِ افسانہ ہو دوشِ حقیقت سے دوچار
حسن کا آغوشِ رنگیں دلفریب و دل ربا — علم سے بن جائے اقلیدس کا صرف اک دائرہ
مصحفِ روئے کتابی روکشِ نازِ گلاب — اور بن جائے لغت یا دفترِ علم حساب
نغمۂ شیریں کے دامن میں ہو شورِ کائنات — بزم کا دش میں جلے شمعِ شبستانِ حیات

ظاہر ہے کہ ان دلائل کو سن کر فلسفیت مسکرا دے گی کیونکہ عورت کو چاندنی قوسِ قزح، شگوفہ، لالہ زار وغیرہ کے مثل قرار دے کر اس کے شانوں کو علم کے بار کے متحمل نہ ہو سکنے کا نتیجہ نکالنا حکیمانہ استدلال سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا۔ عورت کو چاندنی وغیرہ کے قبیل کی چیز سمجھنا ایک فلسفی کے نزدیک قیاس مع الفارق ہی ہوگا لیکن اس کے باوجود کہ متذکرہ بالا نظم کا طرزِ استدلال حکمت و فلسفے کے دربار میں ذرا سے احترام کا بھی مستحق نہیں ہے تاہم اس کی شاعرانہ دلفریبیوں اور دلربائیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسے پڑھ کر ذوقِ سلیم پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور انھیں غیر حکیمانہ دلائل کو مصحفِ شاعری کی آیاتِ کمال قرار دینا ہوتا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ شعریت کا سرچشمہ یہ پیچ در پیچ اقتصادی نظامات نہیں ہیں کیونکہ یہ حکمت و فلسفے کی چیزیں ہیں؟ البتہ ایک حقیقی شاعر کو ان حقائق سے اتنا تعلق ہو سکتا ہے کہ وہ شاعری کے ایوان کی تعمیر کے لئے ان سے ایسی چیزیں اخذ کرے جن کا تخاطب ہمہ گیر ہو اور "جو زمان و مکاں" کی قیدوں میں اُلجھ کر اپنی اپیل کی عمومیت زائل نہ کر دیں۔

ان چیزوں کے واقعی طور پر ذہن نشین کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ شعر کا مفہوم اور اس کے اصلی حدود پیشِ نظر رہیں اگرچہ "ذوقی مفہومات" کی منطقی تحدید و تعیین نہایت دشوار ہے تاہم اگر "قانونِ استقرار" سے مدد لی جائے اور یہ طریقہ نہ اختیار کیا جائے کہ بالکل ہی نیا مفہوم واقعاتی حقیقتوں سے بیگانہ ہو کر اپنی طرف سے پیش کر دیا جائے جس میں "شاعر" کو

"انسان کامل" بنانے کی خواہش مضمر ہے تو اس مرحلے کے طے کرنے میں بہت کچھ آسانی ہو سکتی ہے۔

قانونِ استقرا، پر عمل کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ان تمام افراد کے جواہر سخن پر تحلیل و تجزیے کی نظر کی جائے جنھیں مختلف زمانوں کا منجھا ہوا "ادبی ذوق" شاعریت کی سند عطا کر چکا ہے۔ اس تول اور پرکھ کے نتیجے میں ہمیں ایسی چیزیں مل سکیں گی جن سے شعر کی حدیں متعین ہو سکیں۔ ذوقِ سلیم کے معیار پر پورے اترنے والے اشعار میں جو چیزیں مشترک ملیں گی وہی "شعریت" کے کالبد کے لئے عناصر کی حیثیت رکھیں گی۔ مقبول و مستند شعراء کی ادبی کائنات کے اس "استقرائی تحلیل و تجزیہ" کے بعد شعر کی ماہیت کی تعیین کے سلسلے میں یہ کہنا شاید حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ مختلف واقعات و کیفیات و حالات و مناظر سے اثر پذیر ہوکر جو ڈھلے ہوئے موزوں و خوش گوار آفاق گیر نغمے وجود میں آتے ہیں وہ شاعری ہیں۔ حالات و مناظر سے تاثر کے بعد والی منزلیں تخئیل و قوت و بیان کی مدد سے طے ہوتی ہیں۔ جذبات و واردات کے کون سے پہلو اُجاگر کئے جائیں اور کون سے تاریک رکھے جائیں۔ ان کی تصویر کھینچنے میں کن لفظوں سے کام لیا جائے اور کن لفظوں سے نہیں۔ تشبیہہ و استعارے تمثیل و کنائے میں سے موقع کی مناسبت سے کون سا اسلوب بیان اختیار کیا جائے اور کون سا نہیں؟ انھیں امور کا صحیح فیصلہ مذکورہ بالا صفات سے متصف نغموں یا دوسرے لفظوں میں شاعر کی تکوین کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر کی اس ہیئت کو براہ راست "ذاتی حیثیت سے" "افادیت" یا کسی مخصوص اقتصادی و سیاسی نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس مقام پر ضمناً جناب اختر ارینوی کی ایک فروگذاشت کی طرف اشارہ کر دینا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ جناب ارینوی نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے "کہ میتھو آرنالڈ کے اصول "شاعری تنقیدِ حیات ہے" کے مطابق نظیر کی شاعری کا مقام بہت اونچا ہوتا ہے" میتھو آرنالڈ نے شاعری کو "تنقیدِ حیات" نہیں قرار دیا ہے وہ خود اپنے اس مضمون میں جو اس نے بائرن پر لکھا ہے کہتا ہے کہ میری طرف یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ میں شعر کی تعریف "تنقیدِ حیات"

سے کرتا ہوں مگر یہ واقعہ نہیں ہے میں نے یہ تعریف لٹریچر کی کی ہے"

یہ سچ ہے کہ شعر لٹریچر کی ایک شاخ ہونے کی وجہ سے آرنالڈ کے نزدیک تنقیدِ حیات سے لازماً متصف ہوگا۔ لیکن شعر کے لئے صرف اس صفت کا پایا جانا کافی نہیں ہوگا۔ شعر خاص ہے اور لٹریچر عام جو اپنے تحت میں بہت سے دوسرے افراد جو شعر سے متمائز ہیں رکھتا ہے اس لئے شعر میں آرنالڈ کے نزدیک بھی "تنقیدِ حیات" کے علاوہ کچھ اور ایسی مزید چیزیں ہونا چاہئیں جو اسے لٹریچر کے دوسرے افراد سے علیحدہ کردیں۔ اس گذارش کا منشا یہ ہے کہ اگر بالفرض نظیر کی شاعری میں تنقید حیات کافی طور سے موجود ہو تب بھی میتھو آرنالڈ کے اصول کے مطابق اس کی شاعری کا مقام بہت اونچا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تنقیدِ حیات کے علاوہ ان چیزوں میں جو شاعری کو لٹریچر کی دوسری قسموں سے الگ کرتی ہیں۔ نظیر کی بلند پائگی نہ ثابت کر دی جائے۔

یہ صحیح ہے کہ جب ان جدید خیالات کے علمبرداروں سے یہ مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے تو وہ یہ فرماتے ہیں کہ ہم بھی شاعری کو "اشتراکی نظام" سے وابستہ نہیں کرنا چاہتے ہم بھی اُسے ان قیود سے بالاتر رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن دقت یہ ہے کہ اُن کے طرزِ تنقید ان کے اندازِ بحث اور اُن کے اسلوب نظر سے اس قول کی تصدیق نہیں ہوتی۔

وہ جب کسی شاعر کا کلام پرکھنے کے لئے بیٹھتے ہیں تو اُن کے تیوروں سے اس کا صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ اقتصادی نظام کے سانچے میں شاعری کو ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب تک کہ شعر کے چہرے پر "اشتراکیت" کا آب و رنگ نہ ہو۔ اُن کی پسندیدگی کا جذبہ حرکت میں نہیں آتا جو شاعر "اشتراکی ڈھرے" سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے انھیں اس کے کلام میں جاگیردارانہ نظام کے مہلک جراثیم رینگتے نظر آتے ہیں۔ خود زیرِ بحث مضامین سے بھی ان کی اسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے آٹے دال کا بیان۔ مفلسی، پیسہ، چپاتیاں وغیرہ وغیرہ پر خصوصیت سے اُن کی پسندیدگی کی نظروں کا جم جانا اسی دل کے بھید کو بتاتا ہے۔

ہر چیز کو "اشتراکی رنگ" میں شرابور دیکھنے کی خواہش ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ میر و غالب و

انیس جیسے اساتین شعر و ادب کی شاعرانہ حیثیت کو مشتبہ دکھایا جاتا ہے اور ہر اُس پوچ گو کو جو اُن کے خیال میں اُن کی "جنتا" کے خیالات و جذبات سے ہم آہنگ ہو کر لکھتا ہے۔ اس کی مدح میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے جاتے ہیں اور بار بار یہ آواز دنیا کو سنائی جاتی ہے کہ فلاں شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ہے گویا میر و غالب و انیس وغیرہ کی شاعری کو زندگی کی تہوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے کہ زندگی وہی ہے جسے "اشتراکی فلسفہ" زندگی بتائے۔

ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کے انھیں شیوہائے نقد و بحث پر نظر کرتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ زبان سے وہ کچھ کہیں لیکن حقیقت دوسری ہے۔ شعر سے متعلق اُن کی پسند اور عدم پسند کی تہہ میں ان کی ایک خاص "اقتصادی نظام" سے والہانہ وابستگی پنہاں ہے۔ ممکن ہے انھیں اس کا احساس نہ ہو۔ لیکن ان کی یہ تنقیدی روش نتیجہ ہے اس غیر شعوری بہاؤ کا جو شاعر کو اشتراکیت سے ہم آہنگ سمجھ لینے سے ظہور میں آتا ہے۔ اس بنیادی غلطی کے بعد ان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس شاعری کو پسند کر سکیں جس میں تصوف آموز محبت یا قناعت یا دنیا کی بے ثباتی کے نقشے دلفریب عنوان سے اُتارے گئے ہیں۔ انھیں اپنے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے یہ کہنا ہی چاہئے ؎

ساتھ آٹے دال کے ہے حشمت و فوج و سپاہ ؛ جابجا گڑھ کوٹ سے لڑتے ہوئے پھرتے ہیں شاہ

یا پھر قحط والی وہ نظم جس میں "ازار بند" اور "سوراخ دار بند" آج کل کی اصطلاح کے مطابق۔ حیرت خیز واقعاتی انداز میں (جسے میں اپنے دوستوں معافی مانگتے ہوئے بھیانک قسم کی عریانی سے تعبیر کروں گا) نظم کئے گئے ہیں۔ شاعری کے بہترین معجزے ہیں اور اُن کے مقابلے میں یہ شعر

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند   فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

یا پھر غالب کا وہ قطعہ جس کا عنوان یہ ہے:۔

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل ؛ زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے

اور خاتمہ یہ ہے :-

داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی ؛ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

روکھا پھیکا بدمزہ اور سیٹھا ہے۔

شائد معارضے میں کہا جائے کہ ہمارا متقدمین کے شعری سرمایے پر سر دھننا اُن کے اشعار کو "در شہوار کی لڑیاں" بھی سمجھنا نتیجہ ہے ہماری جاگیر دارانہ نظام سے وابستگی کا۔ ہم چونکہ جاگیردارانہ نظام کی آغوش میں پڑھے پلے ہیں اس لئے اُس کی سب چیزیں ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں اس کی صناعیاں ہمیں پسند آتی ہیں اُن کے شعر و ادب کو ہم آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں اس کے جواب میں عرض کیا جائے گا کہ ہمیں بھی ان اقتصادی نظاموں سے بلند ہو کر شعر و ادب کا جائزہ لینا اور ان سیاسی و غیر سیاسی رجحانات سے اپنے دامن کو بچانا ضروری ہے۔ صحیح نقد کے لئے ہمیں اپنے "ذہن" کی تجدید کی بعینہٖ اُسی طرح ضرورت ہے جس طرح ترقی پسند ادیبوں کو۔ یہ سوال کہ آیا یہ علیحدگی ممکن بھی ہے یا نہیں ؟ اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ جہاں تک اُس کے امکان کا تعلق ہے اس میں کوئی استحالہ نظر نہیں آتا انسانی ذہن اس قسم کی تجدید پر اسی طرح قادر ہے جس طرح وہ فرائض تنقید ادا کرتے وقت ملکی و قومی و مذہبی تعصبات سے اپنے کو علیحدہ کرنے پر۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی تجدید دشوار ہے لیکن ناممکن نہیں ہے اگر دماغ کو "تنقیدی ورزش" میں ان امور کے ملحوظ رکھنے کا عادی بنایا جائے تو کچھ دنوں کے بعد نمایاں کامیابی ہو سکتی ہے اور اگر فی الحقیقت یہ تجدید اور علیحدگی ذہن کے لئے ممکن ہی نہیں ہے تو بھی میں عرض کروں گا کہ تنقید کا فرض صحیح طور پر ادا کرنا بھی ناممکن ہے اور اس صورت میں ہمیں ایک مشکک کی حیثیت اختیار کر کے اس فرض کی بجا آوری سے بالکل ہی دست کش ہو جانا چاہیے۔

شعر و ادب کو اشتراکی نقطۂ نظر سے دیکھے جانے کے متعلق جو اوپر مخالفانہ اظہار کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ قطعی نہیں ہے کہ متقدمین کے تمام ادبی سرمائے کو قابل احترام قرار

دے دیا جائے یا یہ کہا جائے کہ اُن کی شاعری کا جو دھارا تھا اُسے دوسرے جدید راستے اختیار ہی نہیں کرنے چاہئیں ۔ یقیناً اُن کی شاعری کے خزانے میں بہت سے کھوٹے سکے بھی ہیں جنھیں رد کرنا ہی پڑے گا۔ مگر بحث جو ہے وہ اتنی کہ اُن کی ادبی پونجی کو مسترد یا قبول کرتے وقت ہمیں اس جذبے سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے کہ چونکہ وہ اوپری طبقہ یا متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے خیالات وافکار کی آفریدہ ہے اس لئے اُسے مردود ٹھہرانا ناگزیر ہے یا اس کا پسند کرنا لازمی ہے ۔ ان کی ادبی متاع کو منظور یا نامنظور کرنے کے لئے دوسرے معیاروں کی ضرورت ہے جو بہرحال ان اقتصادی وسیاسی نظامات کی پابندیوں سے بے نیاز ہوسکیں

ہمارے پرانے واجب الاحترام شعرا کے متعلق آج کل یہ بہت کہا جارہا ہے کہ اُن کی دنیائے عشق و محبت میں "تخئیل محض" کی بلند پروازیاں ہوتی ہیں" واقعیت وصلیت" سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس نے کو ترقی پسند مصنفین و ناقدین نے بہت ابھار رکھا ہے ۔ چنانچہ نظیر نمبر میں بھی مختلف مقالہ نگاروں کے زبان قلم سے یہ اعتراض کنایتاً ہی سہی ادا ہوا ہے ۔

میری سمجھ میں یہ بات قطعاً نہیں آئی کہ نظیر کی شاعری تو زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ہے اور ہمارے دوسرے بلند پایہ شاعروں کے کلام کی جڑیں زندگی کی تہوں میں نہیں پھیلی ہوئی ہیں؟

آئیے ذرا اس پر غور کریں کہ آخر واقعیت وحقیقت کا مطلب کیا ہے ؟ کیا "واقعیت" اسی وقت میں پیدا ہوسکتی ہے جبکہ "عوام" کی "طرز معاشرت" ہی کی تفسیریں ہوں ۔ انھیں کے حرکات وسکنات کے مرقعے کھینچے جائیں ۔ انھیں کے لہجے میں بات کی جائے اور انھیں کے درد و الم کے افسانے سنائے جائیں ۔ انسان کا وہ طبقہ جو "اوپری درجے" پر خواہ اپنے دل ودماغ کی قوتوں کے بل بوتے پر یا پھر اپنی ظالمانہ لوٹ کھسوٹ کی مدد سے پہنچ گیا ہے اور اس نے اپنے ہی لئے علم وادب کے چشموں سے سیراب ہونے کے راستے مخصوص کرلئے ہیں

انھیں انسانوں کا جزو ہے اور انسانی زندگی کی وسعتوں کو بڑھا رہا ہے یہ طبقہ بھی جذبات واحساسات رکھتا ہے۔ اس کے جذبات و احساسات کی پیدائش کا سرچشمہ بھی مادی ہی چیزیں ہیں ایسی صورت میں ان جذبات و احساسات کو اور اُن کی گوناگوں کیفیتوں کو "واقعیت اور اصلیت و حقیقت" سے کیونکر علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی سوسائٹی کی تصویریں۔ اُن کی معاشرت کے نقشے "واقعیت" کے خلاف بغاوت کیونکر ہے؟ اُن کے جذبات واحساسات میں اگر تخئیل تصرف کرکے دلفریبی کا رنگ اعتدال کے ساتھ بھرتی ہے اور اُنھیں شعر کے غالب میں ڈھالتی ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اصلیت نہیں رہی بلکہ "تخئیلِ محض کی بھیانک بلند پروازی" کے قدم درمیان میں آگئے اور ان نغموں کی جڑیں زندگی کی تہوں سے الگ ہو گئیں۔

اب یہ دوسری بات ہے کہ "اقتصادی رجحانات" کے ماتحت زندگی صرف اسی کو قرار دے لیا جائے جو بدقسمتی سے "جنتا" کے حصے میں آئی ہے مگر یہ وہی گڑھا ہے جس سے ایک منطقیانہ مذاق رکھنے والا نقاد بچنا چاہتا ہے وہ اپنی نظر سے زندگی کے مختلف رخوں کو اوجھل نہیں کر سکتا۔

یہ مانا جا سکتا ہے کہ اوپری طبقے کی تہذیب نے جو تیور اختیار کر لئے ہیں وہ ان تیوروں سے مختلف ہیں جن کا وجود آغازِ فطرت کی "ٹھیٹھ بدوی تہذیب" میں ہوتا ہے مگر یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ تہذیب و شائستگی کا دیا جن محفلوں میں جلتا ہے اُن کی ہیئت اُن محفلوں سے جنھیں "فطری بربریت" کے ہاتھ آراستہ کرتے ہیں۔ بہت فرق رکھتی ہے۔ ہمارے ترقی پسند مصنفین اور ناقدین تہذیب کی اس نشو و نما یافتہ کیفیت وصورت پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتے کیونکہ وہ مشینری کی برکتوں کے قائل ہیں جو فطرت سے بہرحال دور کرنے والی چیز ہے۔ آخر نیچر کی برہنگی کو انسان نے طرح طرح کے لباس پہنائے ہی دئے ہیں اور جھونپڑوں کو عالی شان محلوں میں تبدیل کر ہی دیا ہے۔

اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ صدیوں کی ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد ہمارا ایک طبقہ ہی سہی جس تہذیب و شائستگی تک پہنچا ہے اسے تہس نہس کر دینا دانش مندانہ فعل نہیں ہو سکتا

البتہ یہ ضرور ہے کہ اُس کو اور عروج دینے اور اس کے محدود دائرے کو اتنا پھیلا دینے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ اس میں تمام انسانی طبقے سما جائیں۔ ظاہر ہے کہ اشتراکیت کا نقطہ نظر نہیں ہے کہ سرے سے تہذیب و شائستگی ہی کا گلا گھونٹ دیا جائے انسانی بدبختیوں اور مصیبتوں کو زیادہ عام کرایا جائے اور ہماری انسانیت کو "حجری دور" کی طرف عود کرنے کی دعوت دی جائے۔ اشتراکیت کا مقصد تو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تہذیب و شائستگی کے دائرے کو وسیع کرے تمام انسانوں کو اس کی نعمتوں سے مالا مال کرے۔ اشتراکیت موجودہ معاشرت کے نظام پر آخر آٹھ آٹھ آنسو کیوں رو رہی ہے؟ اس کی وجہ یہی تو ظاہر کی جاتی ہے کہ موجودہ سوسائٹی کے نظام نے جسم و دماغ کی آسائشوں کو چند افراد کا حصہ بنا دیا ہے تمام افراد اس کے تحت میں جانوروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں گویا اس طرح عوام کی زندگی کے معیار کی پستی اور ان کی تہذیب و شائستگی سے تہی دامنی تسلیم کی جا رہی ہے۔ اس جگہ اس امر پر بھی غور کر لینے کی ضرورت ہے کہ وہ ادب جس کی داغ بیل اس غیر شائستہ زمین پر پڑے گی کیونکر پائداری حاصل کر سکتا ہے اور وہ برگ و بار کیونکر قابل التفات ہو سکتے ہیں جو اس طرح پیدا ہوں گے؟

پروفیسر احتشام حسین صاحب نے فرمایا ہے اور صحیح فرمایا ہے کہ "نظیر کی شاعری تراش خراش کے لحاظ سے بہت ناممکل ہے۔ ان کے اسلوب میں بے حد ناہمواری ہے۔ ان کے تفکرات میں گہرائی کا نام نہیں۔ ان کے احساسات اور تجربات میں ایک دہقان کی بھونڈی سادگی اور بھدی بے ساختگی ہے۔" میں اس میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں نظیر کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جو شعرا جذبات و احساسات اور زبان و اسالیب بیان کے لحاظ سے اپنے کو عوام کی سطح پر لے آسکے اُن کے ادب و شاعری میں یہ نقائص ناگزیر طور پر پیدا ہوں گے اس سے وہی شاعر محفوظ رہ سکیں گے جو اس معاملے میں "باہمہ" ہونے کے ساتھ "بے ہمہ" بھی رہیں۔ اگر وہ اس پر قادر نہیں ہیں تو پھر انھیں "مادر و پدر" کو تکیہ کلام بھی بنانا ہوگا۔ کیچڑ اور گوبر میں تخئیل کے ہاتھ

بھی تمیز نا ہوں گے۔ اور یہی نہیں نہ معلوم کیا کیا کرنا ہوگا کیونکہ "ٹھیٹھ واقعیت نگاری" کا فرض اُن کے مذاق میں اس طرح ادا ہو سکے گا۔ عوام اس طریقے سے ان کی باتیں سمجھ سکیں گے کیونکہ وہ اپنے ثقافتی معیار (Cultural standard) کی پستی کی وجہ سے اُن افکار و خیالات کو سمجھ ہی نہیں سکتے جو صاف ستھرے اور اُجلے ہیں۔ پرانی شاعری پر فلسفہ و حکمت کی باتوں کو تو جانے ہی دیجئے وہ جاگیر دارانہ نظام کی پیداوار ہیں مگر سوال یہ ہے کہ عوام اشتراکیت کے پیچیدہ خیالات ہی کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ کارل مارکس اور انجیلز کے نظریات کی ہمنوائی کا شرف بھی تو صحیح معنوں میں انھیں چند مخصوص افراد کو حاصل ہو سکتا ہے جو "ثقافت" کے اعلیٰ درجے طے کر چکے ہیں۔ اشتراکی فلسفہ بھی تو "متاعِ ہر دکان" نہیں بن سکتا۔ جوش ملیح آبادی بھی تو موجودہ سوسائٹی کا رنگ بدل دینے کے بلند بانگ نقیب ہیں۔ لیکن کیا اُن کے عوام اُن کی شاعری کی عظمت کا واقعی احساس کر سکتے ہیں؟ پھر کیا "پرولتاری مذاق" پر اُن کی شاعری پر خطِ نسخ کھینچا جا سکے گا؟ شائستہ مذاق کی تسلی کا سامان آخر کس منطق کی بنا پر دریا بُرد کئے جانے کا مستحق قرار پا سکتا ہے؟

یہاں اس امر کا واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ میرا مدعا یہ قطعی نہیں ہے کہ وہ تدبیریں نہ اختیار کی جائیں جن سے عوام کی بہبود کی صورتیں نکل سکیں یا ان کی تہذیب کا گھنونا پن، نظافت و پاکیزگی میں تبدیل ہو سکے۔ اس سلسلے میں ادب و شاعری سے بھی قطعاً کام لیا جا سکتا ہے اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو اپنے ادب و شعر کے بڑے حصے کو وقتی ضرورت کے ماتحت اُن کے مذاق کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے مگر اُسے "ناگزیر برائی" (Necessary evil) سمجھتے رہنا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شاعری کی وہی حیثیت ہوگی جو پروپیگنڈا کی خاطر والی شاعری کی یعنی "تبلیغی شاعری" کی ہو سکتی ہے۔ یہ کبھی نکھ سکھ سے درست نہیں ہو سکتی۔ اس کی ہر ادا میں بد قوارہ پن پایا جائے گا۔ جس طرح مہذب قومیں جب کسی ملک کے وحشی باشندوں کو رام کرنا چاہتی ہیں تو انھیں بھدے کھلونے دے کر اپنی طرف ملتفت کرتی ہیں اور ان میں شائستگی

پیدا کرنے کے لئے زمین ہموار کرتی ہیں اسی طرح ادب و شاعری کے یہ بھدے کھلونے دے کر عوام کو اپنی طرف رجھایا جاسکتا اور تہذیب و شائستگی کی برکتیں قبول کرنے کے لئے انھیں آمادہ کیا جاسکتا ہے۔

اس "تبلیغی شاعری" کی "وقتی افادیت" کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت کے وقت بہت سی ناکردنی باتیں کی جاتی ہیں۔ جب کسی عام بلا کا نزول ہوتا ہے تو اس وقت عام توجہ ان خطروں کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جن میں انسان اپنے کو گھیرا ہوا پاتا ہے اور اُن کے دفعیہ کے لئے ہاتھوں، پیروں کو اچھے بُرے ہر عنوان سے حرکت دیتا ہے۔ اس وقت "فن کاری" کی لطافتوں کی طرف التفات نہیں ہوتا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس عام دارو گیر اور چپقلش میں وقتی ضرورتوں کے ماتحت جو باتیں ہم سے سرزد ہوں اُنھیں لطیف المذاقیوں کا سرمایہ دار سمجھ لیں۔

مسئلے کا اس پہلو کو دیکھتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ "وقتی افادیت" کے پیمانے سے شاعری کی حقیقی عظمت و رفعت کو ناپنا شوخ ادائی ہو تو ہو لیکن دانش مندی نہیں ہے۔ "تبلیغی شاعری" یعنی شاعری برائے پروپیگنڈا قطعی طور سے اُس درجے میں نہیں رکھی جا سکتی جو "شعر عالی" کے لئے مخصوص ہے۔

غزل

(جناب رگھوپتی سہائے صاحب فراقؔ گورکھپوری)

یہ تو نہیں کہ عشق پر جورِ بتاں گراں نہیں — ہاں مگر اب علاجِ غم آہ نہیں فغاں نہیں

آہ وہ شدتِ حیات جو نہ عمل میں جگمگائے — کیفِ نشاط و کیفِ غم عشق کے ترجماں نہیں

جلوہ گہِ جمالِ یار ، سجدہ گہِ سرِ نیاز — "دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں"

آج کچھ اِس طرح کھلا رازِ سکونِ دائمی — عشق کو بھی خوشی نہیں حسن بھی شادماں نہیں

دیر و حرم ہیں گردِ راہ نقشِ قدم ہیں مہر و ماہ — ان میں کوئی بھی عشق کی منزلِ کارواں نہیں

نظمِ جہاں بدل نہ جائے۔ اہلِ جہاں سکوں پا گئے — عشق سے یہ یقیں نہیں حسن سے یہ گماں نہیں

کس نے صدائے درد دی کس کی نگاہ اٹھ گئی — اب وہ عدم عدم نہیں اب وہ جہاں جہاں نہیں

عشق نہ مٹ سکا تو پھر کس لئے خونِ آرزو — اب مجھے اور درد دے یہ کوئی امتحاں نہیں

مردہ دلوں سے کیا سنیں شرح و بیانِ زندگی — سینے میں بجلیاں نہیں جلتی ہوئی زباں نہیں

عشق حیاتِ محض کی لرزشِ بے قرار ہے — دردِ نہاں کی رازدار سازشِ جسم و جاں نہیں

کان پڑی صدا بھی آج گم ہے سکوتِ یاس میں — نغمۂ سازِ زندگی غلغلۂ جہاں نہیں

بارِ سکوں نہ اُٹھ سکا ہستیِ بے قرار سے — روزِ ازل سے دوش پر کوہِ الم گراں نہیں

گرد و غبار سے ہے صاف غم کی فضائے بیکراں — اب تو فنا و عشق کے موت بھی درمیاں نہیں

اہلِ وفا گذر گئے تیغ بکف ، کفن بدوش — مقتلِ نازِ حسن بھی منزلِ جاوداں نہیں

خونِ شہیدِ عشق کا آج ہے زیبِ داستاں — نعرۂ انقلاب ہے ماتمِ رفتگاں نہیں

وقتِ بیانِ غم کچھ آج کھوئے گئے ہیں ہم فراقؔ
کون سنے کہ خود ہمیں مائلِ داستاں نہیں

علوم جدید کا مآل

محمود اسرائیلی صاحب

ہم نے تو یہ سُنا تھا علومِ جدید سے
مٹ جاتے ہیں نقوشِ جہالت دماغ سے

یورپ کے رہنے والے مہذب ہیں اُڈ انھیں
علم و ہنر سے انس ہے نفرت فراغ سے

لیکن اس علم و فن نے یہ کیا گل کھلائے ہیں
چنگاریاں نکلتی ہیں یورپ کے باغ سے

ان خوشنوائیوں کا مگر راز اب کھلا
بلبل کے نغمے سنتے ہیں منقارِ زاغ سے

تہذیبِ مغربی کے وہ گلہائے دل فریب
دیکھا جو غور سے تو نظر آئے داغ سے

اس کی صراحیوں میں ہلاہل تھا مے نہ تھی
دنیا ہلاک ہو گئی دَورِ ایاغ سے

اب اپنے جامِ زہر کا یہ خود شکار ہے
"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

بین الاقوامی سیاست

اب کہو..........؟

بین الاقوامی سیاست

نقشہ جنگ

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

بہاراں :-

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اردو غزل کے موجودہ دور میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں کئی برس ہوئے ان کا ایک مجموعہ کلام "اثرستان" کے نام سے شائع ہوکر اردو کے ادبی حلقوں میں شہرت و قبول حاصل کرچکا ہے۔ ایک دوسرا مجموعہ کلام "بہاراں" کے نام سے نظامی پریس لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ کتاب بانگ درا کی تقطیع پر تقریباً پانچسو صفحوں پر مشتمل ہے۔ شروع کے ۲۲۵ صفحوں پر نئی غزلیں ہیں۔ ۲۵ صفحوں میں متفرق اشعار ہیں اور باقی حصے میں "اثرستان" کا انتخاب ہے۔ دیوان کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے نہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب میں زمانے کا لحاظ رکھا گیا ہے تاکہ شاعر کے ذہنی ارتقاء کا اندازہ ہوسکے۔ حالانکہ یہ بالکل غیرضروری تھا۔ اس لئے کہ جہاں تک کہنہ مشق غزل گویوں کا تعلق ہے ان کی غزلوں کے انداز میں زمانہ کوئی خاص تبدیلی نہیں کرتا۔

بہاراں کی غزلیں شروع سے آخر تک تقریباً ایک ہی رنگ کی ہیں اور دیوان کو کوئی کسی جگہ سے پڑھنا شروع کردے اسے اثر کا خاص رنگ جھلکتا نظر آئے گا۔ زبانوں کی شادابی الفاظ کا شاعرانہ اور فنی استعمال، بحروں کا ترنم اور موسیقی اور ایک خاص قسم کی شگفتگی۔

اثر میر کے بے حد معتقد ہیں اور وہ اس ناخدائے سخن کے رنگ میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ جا بجا میر کا جلوہ نظر آتا ہے۔ خصوصاً بحروں کے انتخاب میں۔ چھوٹی اور بڑی اکثر بحریں ایسی ہیں جن کے ترنم میں میر کی روح جلوہ گر ہے۔

مثال کے لئے کچھ شعر سنئے ؎

میں اس سے کہوں دکھ درد ترا بس میرؔ تو اپنا دل تو بہ ہے　　سب آئی گئی مجھ پر ہو گی کمبخت ترا کیا جائے گا

جب سے ان سے آنکھ لڑی ہے، آنکھوں میں اپنی خواب نہیں　　اس پر یہ مصیبت ہے ہمدم، صبر کی دل کو تاب نہیں

تری زلف کیوں ہے شکن شکن کہ نثار بادِ صبا نہ ہو　　ترا حسن کیوں ہے چمن چمن کہ بہار آکے فدا نہ ہو

دل کا ہے رونا کھیل نہیں ہے، منھ کو کلیجہ آنے دو　　تھمتے تھمتے اشک تھمیں گے، ناصح کو سمجھانے دو

رک رک کے چلا چل چل کے رکا، ساقی کی نگہ پھر جانے سے　　کیا کیا نہ ابھار شیشے نے نکلی نہ جھجک پیمانے سے

کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو، روتے پھرنا راتوں کو　　جو ہیں غافل وہ کیا سمجھیں، عشق و جنوں کی باتوں کو

یا چھوٹی بحروں میں ؎

جس نے غم نوش کیا　　غم کو طرب جوش کیا

حسرتیں دل کی پوچھنے والے　　تیرے طرزِ سوال نے مارا

ایک دوسرے طریقہ سے اثرؔ کے کلام پر میرؔ کا اثر بے حد نمایاں ہے۔ میرؔ کے اکثر مضامین کو اثرؔ نے اپنے خاص انداز میں ایک شاعرانہ حسن کے ساتھ نظم کیا ہے۔ میرؔ کا شعر ہے ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے　　دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اثرؔ نے کہا ہے ؎

اے جنوں بات پہنچ جائے جگر یا دل تک　　روزِ تجدید کہاں تک ہو گریبانوں کی

شاید یہ میرؔ ہی کا اثر ہو کہ اثرؔ کے یہاں "بہار" اور "دل" کے اشعار بہت اچھے ہیں۔ موجودہ

دور میں اردو کا کوئی غزل گو شاعر ان دونوں مضامین کو اتنے اتنے طریقوں سے نظم نہیں کرتا جیسے اثرؔ۔ اس مضمون کو انہوں نے بالکل اپنا بنا لیا ہے۔ یوں تو سارے دیوان میں سیکڑوں شعر ایسے ہیں لیکن اندازہ کے لئے کچھ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

یہ اتفاق تو دیکھو، بہار جب آئی　　ہمارے جوش جنوں کا وہی زمانہ تھا

یاد دلواؤ اسیروں کو نہ بھولی ہوئی بات　　ہم صفیرو! نہ کہو فصل بہار آئی ہے

بہتر نہیں دل سے کوئی رہبر　　بڑھ کر نہیں دل سے کوئی رہزن

سچ ہے کوئی نہیں ہے برے وقت کا شریک　　دل سا رفیق بھی اسی دشمن سے جا ملا

اثرؔ کے کلام میں جو ترنم ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی تقریباً ساری کی ساری زمینیں بہت شاداب ہیں اس لئے ان میں شگفتگی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ الفاظ کا استعمال بہت اچھا کرتے ہیں۔ خاص کر فارسی کی ترکیبوں سے اپنے شعروں میں ایک خاص طرح کی روانی اور موسیقی پیدا کر لینا اثرؔ کی خصوصیت ہے۔ مثال کے لئے ایک غزل کے کچھ شعر سنئے ؎

نرگسِ مست خواب آلودہ　　لب لعلیں شراب آلودہ
دوش پر زلف عنبریں بکھری　　اور گریباں گلاب آلودہ
پھول ڈوبا ہوا گلاب میں تھا　　اف وہ چہرہ حجاب آلودہ
مجھکو دیکھا تو دیکھئے قسمت　　تھی جبیں پیچ و تاب آلودہ
یاد ہے یاد ہے اثرؔ اب تک　　وہ نگاہ عتاب آلودہ

ایک دوسری غزل کے کچھ شعر سنئے ؎

چشم خونناب لبستہ کے مانند | دل بھی ہے عہد خستہ کے مانند
بے ثباتی کا آئینہ ہوں میں | نقش بر خاک بستہ کے مانند
آہ گلچین بھی مجھ کو بھول گیا | گلِ بیرون دستہ کے مانند

لکھنؤ کی شاعری کے ایک دور میں، جنازہ، ماتم، بالیں، بستر مرگ، مزار وغیرہ کے ذکر سے جو درد اور اثر پیدا کرنے کی ناکامیاب کوشش کی جاتی تھی اس کا عزیز پر بہت گہرا اثر تھا۔ ان کی قنوطیت کے اسی خاص انداز نے ان کی غزلوں میں تڑپ پیدا نہیں ہونے دی۔ اثر عزیز کے شاگرد ہونے کے باوجود بھی اس خاص قسم کی قنوطیت سے بالکل الگ ہیں اور اسی لئے ان کے یہاں لطیف تغزل، اس میں ہلکی سی شوخی اور طنز اور اس کے ساتھ ساتھ کیف و سرمستی بہت زیادہ ہے۔ مثال کے لئے کچھ شعر سنئے ؂

اچھا نہیں ہوتا کبھی بیمارِ محبت | اچھا ہے کہ تم فکر دوا نہیں کرتے

مومن کی شوخی طنز کا لطف ہے ؂

ترا وسوسہ ہی غلط ضرور اسے تو نہ وعدہ خلاف کہہ | مری آس توڑ نہ ہمنشیں اسے یاد وعدہ رہا نہو

تیرے کرم و لطف کا چرچا نہ کریں گے | ایسے ہی تو ہیں غیر کہ ایسا نہ کریں گے
معلوم نہیں سن کے وہ حال دل بیمار | کچھ فکر کریں گے کہ اثر یا نہ کریں گے

بہاراں کی کتابت، طباعت، کاغذ اور ظاہری شکل و صورت سب چیزیں اچھی ہیں۔ کپڑے کی مضبوط جلد ہے۔ قیمت ے رہے اور غالباً نظامی پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

(و ع)

رسید کتب و رسائل

۱ ۔ انجمن ترقی اردو کی کہانی	انجمن ترقی اردو دریا گنج دہلی
۲ ۔ خمسۂ کیفی	" " " " " " " "
۳ ۔ اصطلاحات پیشہ وراں	" " " " " " " "
۴ ۔ حیات جاوید (نیا ایڈیشن)	" " " " " " "
۵ ۔ تاریخ ادبیات جدید ایران	" " " " " " "
۶ ۔ تقویم ہجری و عیسوی	" " " " " "
۷ ۔ اسلام کا نظام سیاسی	از محمد اسحاق صدیقی، اشفاق منزل، قصبہ سندیلہ ضلع ہردوئی قیمت ۴ر
۸ ۔ رسالہ ادبی دنیا (سالنامہ)	لاہور
۹ ۔ رسالہ دیہاتی کسان	سری نگر
۱۰ ۔ مفردات القرآن	سرائے میر اعظم گڈھ (یوپی)
۱۱ ۔ رسالہ نور التعلیم (باغبان نمبر)	گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ (پنجاب)

"مسلمان کیا کریں"

(از قلم "ضیا" صاحب)

اکتوبر ۱۹۳۸ء میں "مسلمان کیا کریں" کے عنوان سے اخبار "مدینہ" بجنور میں ایک بحث چھڑی تھی اور تقریباً سات ماہ تک اس کا سلسلہ جاری رہا، خوش قسمتی سے ہر خیال کے مسلمان ارباب فکر نے اس بحث میں حصہ لیا اور نہایت سنجیدگی اور خلوص سے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اب اخبار کی طرف سے اس طویل بحث کا حاصل ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کی اصلی قیمت گو عہ ہے لیکن عام استفادے کی غرض سے ایک مدت کے لئے کتاب ۱۲؍ میں مل سکتی ہے۔

کتاب "مسلمان کیا کریں" میں کل ۵۳ مضمون ہیں، آخر میں "مدینہ" کی اپنی رائے بھی شامل ہے مضامین کی ترتیب یہ ہے کہ شروع میں کوئی ۲۱ مضمون ہیں جو مسلم لیگ یا "اس قسم کی کوئی تنظیم" کی حمایت میں ہیں، اس کے بعد کانگریس کی تائید کے مضامین ہیں جن کے لکھنے والے سرد و گرم دونوں قسم کے کانگریسی حضرات ہیں، جمعیت العلماء اور مجلس احرار کے مسلک کی وضاحت میں چھ مضامین ہیں اور کم و بیش اتنے ہی "پاکستان" کی حمایت میں ہوں گے، تمام مضامین کی زبان اور اُن کا انداز بیان نہایت صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ اور بحیثیت مجموعی یہ کتاب بہت دلچسپ ہے، اور پڑھنے والا اکتائے بغیر اسی کو شروع سے آخر تک شوق سے پڑھ سکتا ہے، اتفاق سے یہ وصف اس قسم کی کتابوں میں بہت کم پایا جاتا ہے، مضامین کا معیار بھی بلند ہے اور لیگ اور کانگریس کے عملی مظاہروں اور موجودہ چپقلش کا اثر اس "قلمی چپقلش" میں سرے سے نہیں، ہر فریق نے ٹھنڈے دل و دماغ سے اپنی اپنی بات کہی ہے ورنہ اس قسم کی بحثوں سے عموماً بحث کرانے والے صرف "گرم بازاری" چاہتے ہیں، جب کاروبار مندا ہو، اور بازار میں دوسروں کے مقابلہ

میں اپنی دکان کا قدم اُکھڑتا نظر آئے تو اخبار اس قسم کا ڈھونگ رچا کر نئے سر سے اپنی ساکھ قائم کر لیا کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان "قلمی جنگوں" سے سوائے اخبار کے مالکوں کے اور کسی کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا، البتہ کچھ عرصہ کے لئے پڑھے لکھوں کو سامانِ تفریح البتہ مل جاتا ہے اور بس، بدقسمتی سے ہماری اسلامی صحافت کا کم و بیش یہی چلن ہو رہا ہے، اور علم و ادب تو ایک طرف وہ قوم و ملت کے اہم اور اشد ضروری مسائل کے ساتھ بھی یہ سلوک کرنے سے نہیں جھجکتے، خدا کا شکر ہے کہ اس کے برعکس مضامین کے اس مجموعہ کو پڑھ کر "مدینہ" کی صحیح تعمیری اور اصلاح کن معیاری صحافت کی داد دینی پڑتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں ۵ مضامین خود ایڈیٹر صاحب کے بھی ہیں، اُن کے مطالعہ سے تو "مدینہ" کے خلوص اور حق کوشی کا اور بھی یقین ہوتا ہے۔ اور مخالف سے مخالف بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ واقعی اس قلمی جنگ سے "مدینہ" کا مقصد محض تجارتی منفعت نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ اس کتاب کو محض ایک تجارتی "شگوفہ" نہ سمجھا جائے اور ذرا تفصیل اور تحقیق سے اس کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے، اور اگر ہو سکے تو اس کی اشاعت وسیع پیمانہ پر کی جائے تاکہ مسلم لیگ، جمعیت العلماء اور احرار و پاکستان تحریکوں کے سُورما حرب و ضرب کے میدانوں میں دادِ شجاعت دینے سے پہلے یہ جان لیں کہ آخر وہ لڑتے کس لئے ہیں، اور اس لڑائی سے اُنھیں کیا ملے گا۔ ممکن ہے مسلم لیگ کی حمایت کے خیالات کانگریسی مسلمان کو ذرا بھی متاثر نہ کریں اور پاکستانی اہل قلم کی تمام دلیلیں متحدہ ہندوستانی قومیت والے کو کچھ بھی قائل نہ کریں لیکن اس مجموعہ کے مطالعہ سے یہ ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگی اپنے مخالف کانگریسی کو دین و ایمان سے خارج، فہم و دانش سے معرّا اور ہندوؤں کے چند ٹکوں پر لکھنے والا سمجھنا چھوڑ دے یا اپنے خیال میں ذرا سی تبدیلی کرنا گوارا کرلے، اور اسی طرح کانگریسی لیگی کو انگریز کا پٹھو، اور سرکاری نوکری پر وطن و ایمان بیچنے والا نہ سمجھے، بہرحال یہ کتاب مسلمانوں کی موجودہ سیاست کا آئینہ ہے۔ اور اس آئینہ کی خوبی یہ ہے کہ پسندِ عام و خاص کے مذاق کے خلاف اس میں شکلیں بگاڑ کر دکھانے کی کوشش نہیں کی گئی

کتاب کے مباحث میں پہلی بحث مسلم لیگ یا اسی قسم کی کسی اسلامی تنظیم کے حامیوں کی ہے

مسلم لیگ کی حمایت کرنے والے ایک تو وہ لوگ ہیں جو کبھی کانگریس میں تھے۔ اور عمر کا بیشتر حصہ اس جماعت میں گزرا، اور اس کے لئے انھوں نے قربانیاں بھی کیں۔ لیکن اب وہ کانگریس سے بیزار ہیں، انھیں کانگریس کے نصب العین سے اختلاف نہیں، اگر اختلاف ہوتا تو وہ کانگریس میں جاتے کیوں؟ اور اس کے لئے قربانیاں کیوں کرتے؟ اُن کو شکایت کانگریس کے ہندو لیڈروں اور کارکنوں سے ہے، جو بظاہر وطن پرستی کا دم بھرتے ہیں لیکن دل میں سخت فرقہ پرست اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، پہلے تو اُن کے یہ خیالات دلوں تک رہتے تھے یا کبھی کبھی خلوت کی مجلسوں میں زبانوں پر آجایا کرتے لیکن کانگریسی حکومت کے زمانہ میں ان خیالات نے عملی شکل اختیار کی اور کانگریسی ہندوؤں کا ظاہر و باطن روزِ روشن کی طرح ہر عامی اور خاص مسلمان کے سامنے بے نقاب ہوگیا، جو باتیں پہلے خاص مسلمان دبی زبان سے بڑے بڑے ہندو لیڈروں کے خلاف کہتے تھے وہ اب عوام مسلمانوں نے صبح و شام دن ڈھارے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتی دیکھیں، ہندو کانگریسیوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں مسلمان کی ہر دُکھتی رگ کو چھیڑا، اور جب وہ شدتِ الم سے بے تاب ہو کر جھلاتا، اور جھلانے کے بعد اپنے آپ کو بے بضاعت اور مجبور جان کر خون کے آنسو پی کر چپ ہو جاتا تو ہندو کانگریسی ہمدردی کرنے کی بجائے مجبور مسلمان کے اس "رقصِ بسمل" کو سامان نشاط بناتے، اور اُس کے اخبار اس "رقص" کی تصویر کشی سے اپنے ظرافت کے کالموں کو دیدہ زیب بنانے کا کام لیتے،

مولانا محمد علی مرحوم ۲۸ء، ۲۹ء، ۳۰ء میں جب کانگریس سے روٹھے تھے تو کانگریس کا بھرم اُس وقت تک قائم تھا۔ خواص کے سوا عوام ابھی ہندو لیڈروں کے منصوبوں سے ناواقف تھے۔ اس لئے جہاں کانگریس کے خلاف عام جلسوں میں تقریریں ہو سکتی تھی، کم از کم کانگریس کی حمایت میں بھی کچھ کہنا مشکل نہ تھا، اور عوام اتنی عقیدت سے کانگریس کے مخالف مسلمان زعماء کے حلقہ اثر میں نہ آجاتے تھے، لیکن اب معاملہ بالکل بدل گیا ہے، ایک مسلمان رہنما جس کی تمام زندگی اپنی قوم کی خدمت میں گزری ہو، اور جس کے نامۂ اعمال میں ایک حرف کیا ایک شوشہ بھی ایسا نہ ہو جس پر کسی قسم کی حرف گیری کی جا سکے، جوں ہی اُس کی کسی بات سے یہ مترشح ہو جائے کہ وہ

کانگریس کے اثر میں ہے، فوراً وہ ایمان فروش اور اسلام دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ اور اس نقارخانے میں اس کی برأت اور صفائی کی آواز تک کوئی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں وہ لیڈر جو دس برس پہلے کسی اسلامی مجمع میں آتے ڈرتے تھے، اور ان کی "اچھی باتیں" بھی عامۃ الناس سننے سے گریز کرتے تھے، اور آج بھی اُن کی تمام سرگرمیاں منفیانہ حیثیت سے زیادہ نہیں لیکن یہی لیڈر جب کسی اسٹیج سے کانگریس کے خلاف کچھ کہہ دیتے ہیں مجمع اُن کو اپنے دلوں میں جگہ دیتا ہے، اور جو کانگریس کو سب سے زیادہ سخت سست سنائے وہ سب سے بڑا قائد سمجھا جاتا ہے۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ تم نے اب تک کون سا کام کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ تمھیں واقعی اس بدنصیب قوم سے کوئی تعلق ہے اور تمھاری بات اس قابل ہے کہ اُس پر کان دھرا جائے۔ تعجب یہ ہے کہ سرکاری ملازم تک بھی جن پر پہلے عوام کی طرف سے ہمیشہ دھتکار پڑتی تھی آج اُنھوں نے یہ زور باندھ رکھا ہے کہ اُن کی بارگاہِ قلم سے نت نئے فتوے جاری ہوتے ہیں جن کی رُو سے کبھی مولانا ابوالکلام آزاد بے راہ رو قرار پاتے ہیں، اور کبھی ڈاکٹر ذاکر حسین گمراہ۔ اور لوگ ہیں کہ ان فتووں پر سر دُھنتے ہیں، اور ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھتی، اور ہر طرف آمنّا وصدقنا کی گونج سنائی دیتی ہے۔

ان حالات میں کانگریس میں شرکت کی طرف مسلمانوں کو بلانا نہ مصلحت وقت ہے، اور نہ قوم کے مفاد کے لئے مفید، اپنوں سے بگاڑ کر ہندوؤں سے ربط ضبط کرنے سے کیا حاصل؟ اس طرزِ عمل سے مولانا محمد علی مرحوم کو کیا ملا، انھوں نے ہندو مسلم کشمکش میں شروع ہی سے حق گوئی سے کام لیا، ہندو تو اُن سے کیا خوش ہوتے، اُلٹا مسلمان اُن سے بگڑ گئے، اور جب وہ اپنی اس حق گوئی کی پاداش میں مسلمانوں میں "غیر ہر دلعزیز" ہو گئے تو کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمد علی کے ساتھ مسلمان کہاں ہیں، اور یہ جو مطالبات مسلمانوں کی طرف سے پیش کر رہے ہیں ان کی حیثیت ہی کیا ہے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے   یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اسلامی قیادت کا فرض ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کی ذہنیت کو سمجھے اور نیز ہندوؤں کے خیالات وافکار کا بھی جائزہ لے، ورنہ ڈر یہ ہے کہ ملت چند خودغرض اور جاہ پرست رہنماؤں کے ستم قیادت کا تختۂ مشق بن کر رہ جائے گی اور اس بے سمجھی اور بے تدبیری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمان بحیثیت قوم کے مٹ جائے گا، گو اس کے افراد کی تعداد نو کروڑ سے بارہ کروڑ تک بھی پہنچ جائے،

مسلم لیگ کے حامیوں یا نئی اسلامی تنظیم کے مبلغوں کا کہنا یہ ہے کہ اگر بقول کانگریسی مسلمان رہنماؤں کے، سب کے سب مسلمان کانگریس میں شریک بھی ہو جائیں پھر بھی مسلمان تو اقلیت میں رہیں گے، اور جب کانگریس کی ہندو اکثریت کا حال یہ ہو کہ قوم پروری کی باتیں تو بہت بڑھ بڑھ کرے لیکن کام وہی کرے جو ڈاکٹر مونجے اور ساورکر چاہتے ہیں تو سب مسلمانوں کے کانگریسی بننے کا کیا فائدہ ہوگا وہی جواب ہو رہا ہے۔ اس وقت تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اور ہماری نمائندگی کا اُن کو کوئی حق نہیں، پھر تو ہم یہ کہنے کے بھی مجاز نہ ہوں گے، الغرض کانگریس کی شرکت کسی لحاظ سے بھی سود مند نہیں ہو سکتی، اور علیحدہ تنظیم کی ضرورت ہر حال میں باقی رہتی ہے!

سوشلسٹ یہ کہتے ہیں کہ اس وقت کانگریس پر سرمایہ دار ذہنیت کے ہندو قابض ہیں اور اردو، ہندی کے جھگڑے مذہب و کلچر کے افسانے، پرانی روایات اور بھارت ورش کے قصے، جن سے مسلمان بدکتا ہے اور کانگریس کو آزادی وطن کی بجائے رام راج یا مونجے راج قائم کرنے کا الزام دیتا ہے، یہ سب اسی طبقے کے مشغلے ہیں ان کے خلاف ہندوستان میں مزدور اور غریب کاشتکار برابر بیدار ہو رہا ہے، سرمایہ دار ہند ولاکھ کوشش کرے اور گاندھی جی لاکھ "اصلی اشترا کی" بنیں بالآخر مزدور اور کاشتکار کانگریس پر قابض ہو کر رہے گا، پس بہتر یہ ہے کہ مسلمان جن کی ۹۰ فی صدی آبادی اس محنت کش طبقے سے تعلق رکھتی ہے آگے بڑھیں اور اپنے ہم پیشہ ہندو طبقوں کے ساتھ مل کر کانگریس کو موجودہ قیادت سے نکالیں، اور سامراج اور سرمایہ داری دونوں کو ختم کرکے آزاد، فارغ البال اور متحدہ ہندوستان کی بنیاد رکھیں، جہاں نہ اردو ہندی کے جھگڑے ہوں گے

اور نہ مذہب و کلچر کی کش مکش، کیونکہ محنت کش جماعتوں کو ان مسائل سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔
سوشلسٹ کی یہ دلیل کافی قوی ہے اور شاید منطق کے زور سے اس کو آسانی سے رد بھی نہ کیا
جا سکے لیکن دقت یہ ہے کہ اس وقت تک جو ہندو سوشلسٹ عملی میدان میں بھی آئے ہیں اُن کے تمام
کارنامے مسلمان سوشلسٹوں کے ان نظریوں کی تغلیط ہی میں ہیں، اور وہ سوشلسٹ بننے کے باوجود
سخت قسم کے کٹر ہندو ہی رہے ممکن ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح کے چند گنتی کے افراد اس سے
مستثنیٰ بھی ہوں عموماً وہ باتیں خواہ کتنی بھی اچھی کریں لیکن مذہب و کلچر کی سیاست میں اُن کا پورا
تعاون غیر سوشلسٹوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے، چنانچہ اُن کی اس پالیسی پر یورپ کے سامراجیوں
اور مشنریوں کی مثال صادق آتی ہے کہ اول الذکر کا کام لوٹ کھسوٹ ہے، اور آخر الذکر پریم اور محبت
کا نام لے لے کر ان لوٹے کھسوٹے ہوؤں کو تسلی دیتا رہتا ہے تاکہ یہ غم و غصہ اور یاس و نامرادی کی
وجہ سے موت کو زندگی پر ترجیح نہ دینے لگیں۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ سوشلزم اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اور اسلام کے نزدیک طبقاتی جنگ
جائز نہیں، اسلام محبت سکھاتا ہے اور سوشلسزم نفرت اور بغض، اور اس قسم کے اور بہت سے
دل خوش کن دعوے جن کی بنیاد بیشتر خوش اعتقادی پر ہوتی ہے اور بڑی آسانی سے ان کا مُسکت
جواب بھی دیا جا سکتا ہے، مثلاً اگر ترک اپنی قومی زندگی کو بالکل نئے قالب میں ڈھال کر بھی مسلمان
رہ سکتا ہے اور مصر و شام، اور عراق و فلسطین نئے حالات سے مجبور ہو کر پُرانا چولا اُتار کر نیا لباس
زیب بدن کر سکتے ہیں، اور ہمیں اُن کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تو کیا یہ قرین
قیاس نہیں کہ ہم یہاں بجائے قومیت اور اسلامیت میں پیوند لگانے کے اشتراکیت اور اسلامیت
میں کوئی لازمی سمجھوتہ نہ کریں، لیکن ڈر یہ ہے کہ اگر ہم نے یہ قدم اُٹھا بھی لیا تو کیا پھر ہندو اکثریت
کے ساتھ تعاون عمل ہو سکے گا، مسلم لیگ کے حامی یا علیحدہ اسلامی تنظیم کے دعوے دار اس کو
قطعاً محال سمجھتے ہیں، اور ہندو قوم کی موجودہ اُٹھان اور زندگی کے جن سرچشموں سے مدتوں سے
اس اُٹھان کی آبیاری ہو رہی ہے، اور اب تک اس اُٹھان نے جو شگوفے کھلائے ہیں،

اُن سب کو دیکھتے ہوئے اُن کے نزدیک اس تلخ حقیقت کا انکار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کا خیال پیش کرنے والے اس معاملہ میں سب متفق ہیں کہ ہندو اکثریت سے انصاف اور رواداری کی توقع رکھنا عبث ہے۔ یہ قوم ہندوستان میں صرف اپنا راج قائم کرنا چاہتی ہے، اُن کے پیشِ نظر جو ہندوستان کا نقشہ ہے اُس میں مسلمان کے لئے بحیثیت مسلمان کے کوئی کونہ نہیں، یہ ہندوستان کی تاریخ میں سے مسلمانوں کے عہد حکومت کے آٹھ سو سال محو کر دینا چاہتے ہیں اور نئے ہندوستان کو ویدک ہند کی بنیادوں پر اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور اس کارِ خیر میں مہاسبھائی، کانگریسی، سوشلسٹ اور اپنے مذہب سے بیزار ہندو سب ایک ہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ گاندھی جی جو اس وقت کانگریس کے تمام کرتا دھرتا ہیں، اور سوشلسٹ لیڈر تک بھی جن سے ہمارے کانگریسی مسلمانوں کو بڑی بڑی امیدیں ہیں وہ سب کے سب اُن کی قیادت کو دل و جان سے مانتے ہیں، اور ان کی ہر رجعت پسند تمدنی تحریک اور ہر مسلمان دشمن اصلاحی تحریک میں ممد و معاون ہیں اس لئے کانگریس میں شریک ہو کر متحدہ قومیت ہند کی تشکیل کرنا قومی جرم ہے۔ اس لئے ایک فریق تو یہ تجویز کرتا ہے کہ مسلم لیگ کو مضبوط کیا جائے اور دوسرا فریق اس کے خلاف آزادی پسند اور ترقی خواہ مسلمانوں کی ایک نئی جماعت منظم کرنے کی دعوت دیتا ہے اور جمعیت العلماء اور احرار سے متوقع ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اس نئی جماعت کی قیادت کریں، اُن کی رائے میں، اس قسم کی سیاسی تنظیم لیگ کی رجعت پسندی سے بھی بچ سکتی ہے اور کانگریس کے ساتھ مل کر ملک کو آزاد کرا سکتی اور آزاد ہندوستان میں اسلام کے سیاسی وجود کو ہندویت کے بڑے وجود میں مدغم ہونے سے بھی بچا سکتی ہے۔

لیگ کے حامیوں کو اس بات کے ماننے میں تو تامل نہیں کہ لیگ کی موجودہ قیادت خود ساختہ لیڈروں کے ہاتھ میں ہے اور یہ تمام تر جمہور کے مفاد سے بے پروا ہیں، اُن کا خیال ہے کہ اگر لیگ میں جمہور کے صحیح نمائندے شریک ہوں گے، تو بالضرور لیگ کی موجودہ قیادت کو ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کی طرح گوشۂ عزلت میں پناہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ اس لئے وہ نہایت شد و مد سے لیگ کی شرکت

پر زور دیتے ہیں اور مخالفین کے خلاف جو اس موٹی سی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے ہر قسم کا حربہ استعمال کرنے کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی نئی سیاسی تنظیم والے کہتے ہیں کہ لیگ کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کا سب تانا بانا رجعت پسندی کے عنصر سے بنا ہے۔ اس کے قواعد وضوابط ایسے ہیں کہ خان بہادروں اور سروں کے سوا دوسرے کا یہاں یار نہیں، اور اگر جمہور کے نمائندے اس قصرِ رجعت پسندی میں بار پا بھی لیں، تو مجلس عاملہ میں اُن کو گھسنے نہیں دیا جاتا۔ لیگ کی موجودہ قیادت کی ہوشیاری یہ ہے کہ اُس نے ہندوؤں کو گالیاں دے دے کر اور کانگریسی مسلمانوں کو بُرا بھلا کہہ کر ملک میں ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ جو لیگ کو جمہوری جماعت بنانے کا ذمہ اُٹھائے اُس کو کانگریسی ہندوؤں کا ایجنٹ کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے، مسلمانوں میں یوں بھی صحیح سیاسی شعور کی کمی ہے، دوسرے ہمارا پریس بھی جمہور کی نمائندگی نہیں کرتا۔ اس لئے لیگ کے سروں اور خان بہادروں کے سحر کا کاٹ کیسے ہو، بدقسمتی سے ہندوؤں کی متعصبانہ روش نے مسلمانوں کو ہندو مسلم معاملہ میں بڑا زود حس بنا دیا ہی اس لئے خداوندان لیگ بدستور یہ راگ الاپتے چلے جائیں گے اور خدا کے فضل سے جمہور کے کانوں تک لیگ کی اصلاح کے خیالات کبھی بھی پہنچنے نہیں دیں گے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس جوئے شیر لانے کی سعی کو چھوڑ دیا جائے اور آزادی خواہ مسلمان جماعتوں کو ایک سیاسی وحدت میں جمع کیا جائے؛

یہ دلائل ہیں جو کانگریس کے مخالف خواہ وہ لیگ کے حامی ہوں یا ایک علیحدہ سیاسی تنظیم کے موئد، بڑے جوش وخروش سے پیش کرتے ہیں۔ اِن دنوں ہندو کی دشمنی نے مسلمانوں کو نیم پاگل سا کر دیا ہے اور وہ انتہا پسندی کا جواب اپنی انتہا پسندی سے دینا مناسب سمجھتے ہیں اس لئے لیگ مسلمانوں میں زیادہ مقبول ہے کیونکہ وہ اس معاملہ میں اعتدال کو ناروا سمجھتی ہے اور دوسری جماعت کی بات مشکل ہی سے کوئی سنتا ہے۔

مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کے خلاف کانگریسی مسلمان ہیں۔ ان میں بعض تو اعتدال پسند

کانگریسی ہیں اور بعض انتہا پسند یعنی سوشلسٹ، اعتدال پسند کانگریسی مسلمان ہندوؤں کے موجودہ رویہ کو بیشک قابل الزام قرار دیتا ہے لیکن اس کا خیال یہ ہے کہ جب مسلمان کثیر تعداد میں کانگریس میں شریک ہو جائیں گے اور ہندو عوام کی طرح مسلمان عوام بھی اپنی جماعت کی قوت کا احساس کرنے لگیں گے تو پھر کسی بڑی سی بڑی قوت کے لئے ان مسلمانوں کو دبانا ناممکن ہوگا، علیحدہ سیاسی تنظیم کی قباحت یہ ہے کہ مسلمان نہ ادھر کے رہ جائیں گے نہ اُدھر کے، اگر وہ آزادی خواہ ہوں گے تو بالضرور انھیں کانگریس کے نقش قدم پر چلنا ہوگا، اور احرار اور جمعیت العلماء کی طرح کانگریس ہی کی قرار دادوں کو اپنے الفاظ پر منظور کر کے اپنے اور پر دوسروں کو ہنسوانے کا موقعہ دینا ہوگا اور اگر وہ کانگریس کے خلاف سیاسی تنظیم کریں گے تو طبعاً انھیں کانگریس کے ہر مسلک کے برعکس اپنی راہ نکالنی ہوگی، اور اس سے تیسری طاقت یعنی انگریز فائدہ اٹھائیں گے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ مسلمان اپنی علیحدہ تنظیم نہ کریں، کیونکہ ہندو مسلمان کی سیاست الگ الگ نہیں۔ ملک کی سیاسی ضروریات ایک سی ہیں، اور ان کو ایک ہندوستانی کی نظر سے ہی دیکھنا ہوگا، اور جب آپ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو کی سیاست الگ ہو، اور مسلمان کی الگ، اور نہ دو مستقل اور با اختیار جماعتیں بنانے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ظاہر ہے اس نفسی نفسی میں ہندو مسلمان آپس میں الجھیں گے اور وطن کی کوئی متحدہ سیاست نہ ہوگی،

کانگریس والوں کی اس دلیل کی تائید میں احرار کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ لیگی احرار سے خفا ہیں کہ وہ کانگریس کے حاشیہ بردار ہیں، اور کانگریسی احرار سے بیزار ہیں کہ وہ اپنا مستقل سیاسی وجود ثابت کرنے کے لئے کانگریس کی ہر بات میں اپنی پخچر لگا دیتے ہیں، اسی سے وہ خود بھی تباہ ہوتے ہیں اور کانگریس کو بھی بار آور ہونے نہیں دیتے، پنجاب کی سیاسی زندگی کا موجودہ انتشار بہت حد تک اسی علیحدہ سیاسی تنظیم کا ثمرہ ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی اور تمدنی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اعتدال پسند کانگریسی مسلمان تو یہ مشورہ دیتا ہے کہ مسلمان بلا کھٹکے تہذیبی، تمدنی، تعلیمی اور لسانی انجمنیں بنا سکتے

ہیں۔ یہ انجمنیں گو غیر سیاسی ہوں گی لیکن زندگی تو ایک وحدت ہے جب اس کے ایک کونے میں حرکت ہوگی تو اس کے اثرات باقی حصوں میں ضرور پہنچیں گے، تعلیمی اور تمدنی حیثیت سے اگر مسلمانوں نے اپنے آپ کو باہم ایک جماعتی زندگی میں منسلک کر لیا تو ان کا تمدنی وجود ہندوستان کی قومیت میں کبھی مدغم نہیں ہو سکے گا۔ یہ حضرات اسلام کے اعلیٰ اصولوں کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ مسلمان تو مسلمان ہندو بھی ان اعلیٰ اصولوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں گے اور اسی طرح مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود کانگریس کو اسلامی رنگ میں رنگنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ مسلمانوں کا انتہا پسند کانگریسی، سوشلسٹ افکار کا حامل ہے، اس کے نزدیک تہذیب، تمدن اور مذہب کی موجودہ چیخ و پکار ایک خاص طبقے کی پیدا کی ہوئی ہے، ان کے لئے لڑنا غیر تاریخی اور جلد مٹ جانے والے معاملات میں اپنی جان کھونا ہے۔ اصل چیز تو ملت کے موجودہ تقاضوں اور محرکات و سوالات کا سمجھنا ہے، اور ان کے مطابق مسلمانوں کے لئے لائحہ عمل تیار کرنا، اس لئے ہماری جدوجہد میں بنیادی خیال یہ ہونا چاہئے کہ نوے فی صدی غریب مسلمان کیا چاہتے ہیں ظاہر ہے ان کا مسئلہ بیشتر معاشی ہے۔ اور معاشی ہونے کی وجہ سے بہت حد تک سیاسی، کیونکہ سیاسی آزادی کے بغیر معاشی فلاح ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ سوشلسٹ گروہ مسلم لیگ کے "خالص اسلامی" دعوؤں اور احرار اور جمعیت العلماء کی نیم سیاسی اور نیم مذہبی نعروں کو بیکار سمجھتا ہے، ان کے خیال میں یہ کہنا کہ "مسلمان مذہب اور فرقہ پرستی کے نام ہی سے ابھر سکتے ہیں" اسی کا نتیجہ ہے کہ گذشتہ ۲۰ سال میں ہماری اسلامی تحریکات خالصاً جذباتی اور ہنگامہ پرست رہی ہیں اور انھوں نے مسلمانوں کا خمیر ہنگامہ پسند اور مرثیہ خواں بلکہ اعجاز طلب بنا دیا ہے، سوشلسٹ کا یہ خیال بہت حد تک صحیح ہے، آج ہر مسلمان کی زبان پر یہ دعویٰ ہے کہ ہم ہندوستان میں خلافت راشدہ کی سی حکومت چاہتے ہیں، اور آپ یقین کیجئے کہ ان میں سے ایک بھی خلافت راشدہ کی حکومت کو صحیح معنوں میں جانتا بھی نہیں ہوتا، اسی طرح سوشلزم کے مقابلہ میں عام و خاص اسلام کے اصولوں کو پیش کرتے ہیں لیکن جو اصول وہ پیش

کرتے ہیں، اکثر اُن کی اپنی تخلیق ہوتے ہیں، اور تاریخ اسلام سے اُن کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان حالات میں سوشلسٹ کہتا ہی کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ "ان ارزان اور فرقہ پسندی کے غیر تاریخی محرکات کو چھوڑ کر صحیح سیاسی اور اقتصادی بنیادوں پر کام شروع کیا جائے"؟

یہ خیال رہے کہ یہ جماعت غیر سیاسی تنظیم کی مخالف نہیں، اُن میں سے ایک کا کہنا یہ ہے۔

"لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیا میں سیاسی تنظیم کے علاوہ ملت کے لئے اور کوئی شیرازہ بندی درکار نہیں ہے یا مسلمانوں میں کوئی اصلاحی کام نہ کرنا چاہیے، واقعہ یہ ہے کہ قوموں کی سیاسی صلاحیت بڑی حد تک اُن کی معاشرتی شیرازہ بندی کا نتیجہ ہوتی ہے"

اُن کے نزدیک کانگریس کو تو ایک واحد سیاسی جماعت مان لیا جائے اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کی جماعتی اصلاح کا بھی کام جاری رہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ سیاست کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ ایک فرد کے شخصی عقائد بھی سیاست کی داد و ستد سے نہیں بچ سکتے، سیاسی اور غیر سیاسی معاملات کی حدود کیسے قائم ہوں گی اور کون قائم کرے گا۔

جمعیت العلماء اور احرار کی تائید میں تو دلیلوں کی بجائے اُن کے پچھلے مناقب اور موجودہ حریت پروری، جان سپاری اور صرف دینداری پیش کی گئی ہے، ظاہر ہے اس سے ان دو مجلسوں کے عالی قدر زعماء کی تو سرافرازی ہو سکتی ہے لیکن نفس تحریک کی افادیت کیسے ثابت کی جا سکتی ہے، ایک ممتاز احراری لیڈر کی زبان میں مجلس احرار کا شعار سیاست یہ ہے۔

"احرار مسلمانوں کے کانگریس میں ادغام کلّی اور مسلم لیگ سے اجتناب کلّی کے دو انتہائی نظریوں کے درمیان اعتدال کی راہ ہے"

یہ کلیہ بحیثیت کلیہ کے بہت دلکش ہے لیکن اُس کی عملی شکل جو پندرہ برس میں احرار نے پنجاب میں پیش کی ہے اُس کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ شاعرانہ کلیہ اُن کلیات میں سے ہے جو عمل کے بار کا تحمل نہیں ہو سکتا، اور جب تک نظری دُنیا میں رہے بہت بھلا لگتا ہے۔

دراصل احرار نے ہندوؤں کے خلاف لیگ کی بعض شکایات اور لیگ کے خلاف

کانگریس کے بعض مناسب شکووں کا خیال کرتے ہوئے بیچ کی راہ اختیار کی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ معاملہ صرف ہندو اور مسلمان کا نہیں، بلکہ بیچ میں انگریز بھی ہے اس لئے ہمارا ہر اختلاف انگریز کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک نئی تحریک کا تعارف ہوتا ہے، ایک صاحب جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے "بے باک" کے نام سے پاکستان کے عنوان سے پانچ مضمون سپرد قلم فرمائے ہیں، چند برسوں سے یہ تحریک بعض دماغوں میں پرورش پا رہی ہے اس تحریک کا جنین تو علامہ محمد اقبال مرحوم کے کچھ افکار سے معرض وجود میں آیا جو آپ نے لیگ کے ایک اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران میں ظاہر فرمائے تھے، پاکستان کا نام کیمبرج کے ایک نونہال طالب علم نے تجویز فرمایا لیکن ابھی ولادت مسعود کی مبارک گھڑی شاید نہیں آئی۔ ایک رسالہ میں تحریک مذکور کے نوجوان صدر اور سیکرٹری کی تصاویر چھپی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے رُوح رواں کیمبرج سے ہندوستان تشریف لے آئے ہیں، خدا کرے اس مبارک تحریک کی داغ بیل جلد سے جلد پڑ جائے تاکہ ہم "پاکستانی" صاحب کے دعاوی کا عملی نمونہ بھی دیکھ سکیں، ورنہ دل خوش کن دعووں کی نہ کانگرس کے یہاں کمی ہے اور نہ اشتراکی اس معاملہ میں کسی سے ہیٹے ہیں، اور مسلم سوشلسٹ اور احرار اور لیگ کا تو کیا کہنا، سچ یہ ہے کہ یہ جماعتیں اپنے اپنے خیال سے جس مستقبل کی تصویر کھینچتی ہیں وہ اتنا رنگین و دلفریب اور جاذب نظر ہے کہ آدمی مسحور رہ جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اُس روشن مستقبل تک پہنچنا ممکن بھی ہے یا نہیں،

"پاکستان" پر لکھنے والے نے واقعی خوب دادِ سخن دی ہے، انھوں نے جس انداز سے اپنے خیالات قلمبند فرمائے ہیں، اُن کی تردید کرنا اتنا آسان نہیں، اُن کی تحریر میں شگفتگی، اُن کی دلیل میں پختگی اور خیالات میں وسعت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا تعارف اس سے بہتر طریق سے شاید ہی کوئی کرا سکے، لیکن ایک بات کا خیال رہے اُن کی ساری قلمی کاوش منفیانہ حیثیت رکھتی ہے، اُنھوں نے دوسری تحریکوں پر رائے زنی فرمائی ہے اور چن چن کر اُن کی کمزوریاں گنائی

ہیں لیکن یہ امر کہ پاکستان کی تحریک کن بنیادوں پر اٹھ سکتی ہے، اور کون سا طبقہ اس تحریک کا حامل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کی بالکل وضاحت نہیں کی۔

آپ فرماتے ہیں کہ ہندو اپنے قدیم کلچر کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ ہندو قوم کا یہ تقاضہ طبعی ہے، کوئی طاقت اس میں مانع نہیں ہو سکتی۔ اگر ہندو اس حقیقت کو نہیں مانتا تو وہ جھوٹ کہتا ہے اور آج یا کل اُس کا عمل اُس کے زبانی دعوؤں کی کھلم کھلا مخالفت کرے گا، اس معاملہ میں سب ہندو یکساں ہیں، آریہ سماجی ہو یا سناتنی، کانگرسی ہو یا مہا سبھائی۔ کانگرسی مسلمان جواب کانگریس کی ہندو ذہنیت پر سیخ پا ہیں سادہ لوح تھے ورنہ اُن کو پہلے ہی دن آج کے روز بد کا علم ہونا چاہیئے تھا۔

جمعیت العلماء والے نیک سہی لیکن وہ نئی دنیا کے تقاضوں کو کیا سمجھیں، مذہب میں وہ پہلوں کے اندھے مقلد، خیالات میں صدیوں پیچھے، سیاسی تعلیم سے یکسر عاری، اُن سے مسلمانوں کی صحیح قیادت کیسے ہو، اب سیاست نام ہے ایک پیچ در پیچ علم کا جس کی حدیں زندگی کے تمام شعبوں سے ملی ہوئی ہیں۔ موصوف کے نزدیک علماء کا اقتدار ایک لعنت ہے جس کا ختم کرنا بے حد ضروری ہے، یہ لوگ سیاست نہیں جانتے اور سیاسی رہنمائی کے مدعی ہیں۔

ہندو اکثریت اور مسلم اقلیت کو ماننے سے لازم آتا ہے کہ اقلیت اکثریت کا تمدن اختیار کرے تمدنی، تہذیبی اور لسانی خود مختاری سیاسی محکومیت میں پنپ نہیں سکتی۔ ہندو اکثریت میں سیاسی لحاظ سے مدغم ہو کر آپ اپنی مستقل تمدنی شخصیت باقی نہیں رکھ سکتے اس لئے مضمون نگار کے الفاظ میں اس کا حل یہ ہے!

"ہندوستان کے شمال مغرب (یعنی پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان) اور شمال مشرق (یعنی مشرقی بنگال اور جنوبی آسام) میں مسلمان ستّر فی صدی سے زیادہ بستے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب مسئلہ صاف ہے، ان علاقوں میں خالص مسلم قوم کی حکومت کر دیجئے۔ بقیہ علاقوں میں ہندو قوم سے کہئے کہ وہ اپنی حکومت قائم کرلے۔ اب رہ گئی مسلم حکومت کی ہندو اقلیت اور ہندو حکومت کی مسلم اقلیت سو اس کے لئے معقول تحفظات طے کر لئے جائیں گے۔"

ہندوستان ہی میں ایک الگ خالص مسلم قوم کی حکومت کی تائید میں صاحب مضمون نے یورپ کی موجودہ سیاسی تحریکوں سے بہت مثالیں دی ہیں، لیکن شاید اپنی بات کی پچ میں وہ یہ بھول گئے کہ جن تحریکوں کی مثالیں دے کر وہ اپنی بات کو منوانا چاہتے ہیں اُن کی وجہ سے یورپ والوں کی زندگی اُن کے لئے عذاب جان بن گئی ہے۔ اور اب تو اس سیاسی اور معاشی طوائف الملوکی سے تنگ آکر بڑے بڑے ملک ایک ہی سیاسی وحدت میں منسلک ہونے کی تجویزیں سوچ رہے ہیں، بہرحال اپنی رائے کی تقویت میں ان مثالوں سے مدد لینا محض "صحافتی حربہ" ہے ورنہ صرف ایک الگ سیاسی وحدت کا تصور مشکل ہی سے ہمارے درد کا درمان ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس آزاد سیاسی وحدت کو حاصل کرنے کے بعد بھی ہم دوسروں کے معاشی اور سیاسی غلام رہیں،

مانا کہ ہم نے مضمون نگار صاحب کے مشورہ کے مطابق، خالص مسلم قوم کی حکومت قائم کر لی، اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس مسلم حکومت کی زندگی کے سرچشمے کہاں سے پھوٹیں گے کیونکہ صاحب موصوف کی رائے ہے !

"ہندوستان کا جھگڑا، امیری اور غریبی کا نہیں بلکہ دو معاشرتوں، دو کلچروں اور دو عقیدوں کا جھگڑا ہے، قومی عزت اور قومی بھرم کا سوال ہے۔ اس سوال پر انسان پیٹ کو قربان کر سکتا ہے ..... مسلمانوں کو یہ بتا دیجئے کہ ان کی ساری ترقیاں صرف اُن کے اپنے سرچشمے سے پھوٹیں گی ....."

علماء تو پہلے ہی اس خالص مسلم قوم کی حکومت سے خارج البلد ہو گئے، رہا ہندو، اُس سے ہم نے کلی قطع تعلق کر لیا، اب بتائیے کہ یہ چشمے کون سے ہیں جن کو آپ مسلمانوں کی تمام ترقیوں کا مصدر بنانا چاہتے ہیں؟

"پاکستان یعنی دوسرے لفظوں میں اسلامستان" بنانا ایسا آسان نہیں، اور میرا خیال تو یہ ہے کہ جب ہم کبھی یہ "اسلامستان" بنالیں گے تو ہمیں افسوس ہوگا کہ کیوں ہم صرف "اس نعمت" کے لئے ہندوستان کے اتنے بڑے براعظم کے ان گنت سیاسی، معاشی اور دوسرے فوائد سے محروم

ہو گئے۔ ترکی، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک کو نئے حالات کے ساتھ اپنی زندگی کو تطابق دینے میں جو جو مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں اور ایک صدی گزرنے کے بعد بھی وہ ہنوز اس میں پورے کامیاب نہیں ہوئے، ان ملکوں سے ہمیں اپنے "اسلامستان" کی تشکیل کا اندازہ لگانا چاہیئے، اور اگر صاف گوئی معاف کی جائے تو حجاز کے "اسلامستان" سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ معاشی محرکات کو بے اثر سمجھنا کتنی بڑی نادانی ہے، سوال محض عقیدہ اور کلچر کا نہیں ہوتا، اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشی مصلحتوں کا جائزہ لینا بھی بے حد ضروری ہوتا ہے،

کوئی تحریک محض نظری حیثیت سے ایک شعر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اعلیٰ سے اعلیٰ تحریک اگر نااہلوں کے ہاتھ پڑ جائے تو وہ اسفل ترین بن جاتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ یہ خالص مسلم حکومت کی تحریک کن بازؤں سے قوت حاصل کرے گی، مضمون نگار کا فرض تھا کہ وہ ہمیں بتائے کہ مسلمانوں کے طبقے کے جذباتی، مذہبی، سیاسی اور معاشی تقاضے اس نئی حکومت کے متقاضی ہیں پھر بحث خالص علمی ہو سکتی تھی، ورنہ دعاوی کی بلند آہنگی سے آدمی لاکھ مرعوب ہو جائے لیکن اس سے افراد اور جماعتوں کے فطری تقاضے تو نہیں بدلا کرتے،

آخر میں ایک سوال اور ہے، یہ خالص مسلم حکومت کا پروانہ کس کی بارگاہ سے مرحمت ہو گا، ہندو تو اس کے لئے شاید ہی تیار ہو، اور انگریز اپنا نفع نقصان جانچ کر اس کے حق میں یا اس کے مخالف فیصلہ دے گا۔ اب اگر انگریز کے ہاتھ سے خالص مسلم حکومت کی نیو رکھی جائے گی تو اس کی شکل وصورت اور "مسلم" ہونے کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں، اس قسم کی "مسلم حکومتیں" خدا کے فضل سے اندرون ہند اور خارج میں بیسیوں ہیں، لیکن اگر ہندو سے لڑ کر یہ حکومت حاصل کرنی ہے تو جب ہم ہندو سے اپنا یہ حق منوا سکتے ہیں تو ہندوستان کی سیاسی وحدت کا ایک جزو رہ کر بھی ہم ہندو کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ یہ مان لے کہ ہندوستان صرف ہندو کا وطن نہیں بلکہ مسلمان کا بھی وطن ہے

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ وہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو۔ ہندوستان کو آزاد تو ضرور دیکھنا چاہتا ہے، لیکن وہ اس بات کے لئے بھی تیار نہیں کہ ہندی مسلمانوں

کا تہذیبی، تمدنی اور جماعتی وجود مفقود ہو جائے ؎

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

اُس کے نزدیک اپنا ملی وجود کھو کر آزادی حاصل کرنا بیکار اور مضر ہے کیونکہ اس سے چھ کروڑ اچھوتوں میں نو کروڑ اور اچھوتوں کا اضافہ ہو جائے گا، ایک فریق ہندو اکثریت کے تعصب کو دیکھ کر یہ حکم لگاتا ہے کہ تمدن کی حفاظت سیاسی قوت سے ہوتی ہے اور سیاسی قوت کے لئے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم از بس ضروری ہے اُس کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک "اسلامستان" ہو، دوسرا فریق کہتا ہے کہ اس وقت تمدن کی حفاظت کا سوال مقدم نہیں، معاشی اور سیاسی آزادی اہم ہے۔ اور اس کے لئے غیر مسلم استعمار دشمن اور آزادی خواہ جماعتوں کا ساتھ دینا چاہئے۔

کتاب "مسلمان کیا کریں" کے مرتب نے آخر میں یہ حل بتایا ہے کہ تہذیبی تقسیم کا اس وقت سوال اُٹھانا انگریزوں کی مدد کرنے کے مرادف ہے۔ ہم اپنے تہذیبی امتیاز کو اس طرح باقی رکھ سکتے ہیں کہ غیر ہندوستانی مخالف اور وطن دشمن طاقتوں کے خلاف ہم ہندو مسلمان ایک متحد قوم ہوں، اور اندرون ملک میں ہماری حکمت عملی مسلم قومیت کے اعتبار سے ہو،

بہر حال اصل سوال مسلمانوں کے تہذیبی امتیاز کا ہے۔ اور اس امتیاز کے طفیل ہم ہندو سے سیاسی اور معاشی تعاون کھوتے ہوئے بھی اپنے قومی وجود کو برقرار رکھ سکتے ہیں، لیکن اسی کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ یہ تہذیبی امتیاز اس قابل بھی ہو کہ وہ کل کے آزاد مسلمان کی توجہ اور اُس کی عقیدت کو اپنی طرف کھینچ سکے؛ ورنہ ڈر یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ نئے افکار اور انقلابی رجحانات کی یورش دنیا کی کایا پلٹ کر رہی ہے کہیں مسلمان خود اپنے اس تمدن سے بیزار نہ ہو جائیں، اور یہ نہ ہو کہ جس تمدن کی خاطر آج ہم ہندو سے برسر پیکار ہیں اور اُس کی حفاظت کے لئے "پاکستان" بنانے کے منصوبے کر رہے ہیں آگے چل کر خود ہم مسلمان ہی اُس تمدن سے ہاتھ کھینچ لیں،

تمدن کی حفاظت کاغذی عہد و پیمان سے نہیں ہوتی اور نہ محض سیاسی قوت سے، بلکہ تمدن کی اصل افادیت اور برتریت ہی اُس کی پائداری کی کفیل ہے۔ مصطفیٰ کمال خلافت کے نام سے لڑا،

لیکن غالب آنے پر سب سے پہلی ضرب خود خلافت کے قصر عالی پر لگائی، بہتر یہ ہے کہ اب اس سوال کو معرض بحث میں لایا جائے کہ "مسلمانوں کا تمدن کیا ہے؟" تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ واقعی اس تمدن میں اتنی سکت ہے کہ وہ موجودہ معاشی، سیاسی انقلابات اور ذہنی اور فکری بغاوتوں میں جاں بر ہو سکتا ہے؟ اور کل کے آزاد ہندوستان میں ہم اس کو برقرار رکھ سکتے ہیں ؟

شاید یہ بحث "مسلمان کیا کریں" سے کم دلچسپ اور مفید نہ ہو،

نوٹ

رسالہ جامعہ کے اوراق ہمیشہ اُن اہل قلم حضرات کے لئے حاضر ہیں جو ان مسائل پر بجائے جذبات کے غور و تفکر سے کام لے کر مسلمانوں کے مفاد کے خاطر کچھ لکھنا پسند فرمائیں۔ مدیر

احساس کمتری

(شیر محمد اختر صاحب)

(۲)

احساس فروتری کی خصوصیات کبریٰ

خصوصیات صغریٰ کے متعلق ہم اوپر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اب ہم خصوصیات کبریٰ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرینگے

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے۔ کہ احساس فروتری ایک غلط جذباتی تکلیف کا نام ہے۔ جو ایک شخصیت کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ وہم آخر کیا ہے؟ چند جذبات کی مخصوص شکل —— جو شخصیت سے الگ ایک چیز ہونے کے باوجود شخصیت سے ملحق ہوتی ہے —— وہم کو ہم پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ جذباتی رنگ میں نقصان کا باعث ہوتا ہے یہی جذباتی خیالات۔ تفکرات اور محسوسات شاید کئی ایسی حالتوں کا نتیجہ ہوں۔ جن میں سے افراد گزرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ جس شخص کو کوئی ایسا تجربہ ہوا وہ بجائے ان خیالات کو دل سے نکالنے کے انھیں دل و دماغ میں محفوظ کر لیتا ہے۔ اور اس کا احساس اس کی شخصیت کے لئے تکلیف اور دکھ کا باعث بنتا ہے۔ اگر وہ شخص اپنے اس تجربہ کے احساس کا دل سے بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کسی دوست یا آشنا سے باتیں کرنے لگے۔ اور یہاں تک باتیں کرے کہ وہ سب کچھ کہہ ڈالے۔ یا اُسے اس سے کسی قسم کی ذہنی تکلیف۔ شرم یا بے عزتی کا احساس نہ ہو۔ تو ان دونوں حالتوں میں اس کا دماغ بالکل محفوظ رہے گا۔ اور وہ ذہنی طور پر کسی قسم کا دکھ محسوس نہ کرے گا۔ یعنی اس کے دل و دماغ میں کوئی ایسا خیال پرورش نہ پا سکے گا جو اس کی شخصیت کا حصہ نہ ہو۔ لیکن ناراضگی غم و غصہ۔ شرم اور ذلت کا احساس، گو یہ ہماری شخصیت کا حصہ نہیں ہیں۔ مگر جب یہ جذبات دل و دماغ پر قابو پا جائیں۔ تو پھر ان کا قابو میں رکھنا یا انھیں دل میں دبانا ناممکن سی بات ہے۔ ایسا کرنے والا انسان بعض دفعہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے —— جذبات ابھرتے ہیں۔ اور افراد انھیں دبانا چاہتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ذیل کی خصوصیات ہیں۔

۱۔ خوف، ابتدا میں تو یہ محض احساس کمتری کی ایک معمولی نفی کی حالت ہوتی ہے۔ لیکن بڑھتے بڑھتے یہ ضعفِ اعصاب اور اعصاب کو کام کرنے سے قطعی انکار کر دینے کی حالت تک پہنچا دیتا ہے۔

۲۔ زندگی کا تعطل، مسکرات کا زیادہ استعمال۔ بدمستی اور دوسروں پر انحصار۔

۳۔ عشق و محبت میں ناکامی۔

۴۔ قوت واہمہ کی پرواز۔

جذباتی تکلیف کی یقینی علامت یہ ہے کہ انسان بہت دکھ تکان اور تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ اس تکلیف میں آج کل بہت سے لوگ مبتلا نظر آتے ہیں۔ اور اخباروں کے اشتہاری کالم دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دماغ کی تکان اور تھکاوٹ کو دور کرنے والی دواؤں کے اشتہارات کس بہتات سے شائع ہوتے ہیں۔ ہمارے نیم حکیم دماغی تکان کو جسمانی مرض خیال کرتے ہیں۔ اور عوام چونکہ علم سے بہرہ ور نہیں ہوتے وہ بھی اُن کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔ اور نتیجہ معلوم۔ حالانکہ دماغی تکان کا مریض جسمانی لحاظ سے خوب مضبوط اور توانا ہو سکتا ہے۔ اور جہاں ایسا مریض ہو وہاں یہ یقین کر لینا چاہیئے۔ کہ اُسے دماغی عارضہ ہی ہے۔ اور اس کا علاج نفسیات کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ وہ شخص کسی جذباتی کش مکش کا شکار ہے۔ اور اس کا دماغ بغیر کسی مقصد کے سرگرم عمل ہے جس کی وجہ سے دماغ تکان محسوس کرتا ہے۔

ایسے دماغ کی مثال اُس موٹر کار کی سی ہے۔ جس کا انجن سٹارٹ کر دیا گیا ہو لیکن پہیوں میں بریک لگا دیئے جائیں یہ بریک پہیوں پر ایک مسلسل دباؤ ڈالتی ہیں جس سے صرف موٹر کی رفتار ہی سست نہیں ہوتی۔ بلکہ پٹرول کا بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اور مشین اور نظام مشین بھی جلد خراب ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی حال اس دماغ کا ہوتا ہے جس میں دماغی کش مکش جاری ہو۔ یہ کش مکش انسانی شخصیت کے لئے ایک بریک کا کام کرتی ہے۔ اعصابی قوت کا زیادہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور اس سے جسمانی طاقت زائل ہوتی ہے۔ بریک کو ہٹا دیجئے موٹر اور دماغ فوراً اپنا کام نہایت آسانی سے کرنے لگیں گے۔

جب یہ دماغی کش مکش اور دباؤ زیادہ طول کھینچ لے۔ تو معمولی تکان اور تھکاوٹ بڑھتے بڑھتے

اس حد تک پہنچ جائے گی جسے ہم ضعف اعصاب کہتے ہیں۔ ضعف اعصاب کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ ہمارے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں۔ بلکہ دراصل یہ دماغی کش مکش اور دباؤ کے اثر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ بیماری جسمانی نہیں۔ بلکہ ایک روحانی تکلیف ہے۔ اس کے علاج کے لئے آپ لاکھ طبیبوں سے مقوی الدماغ دوائیں کھائیے۔ تبدیلی آب وہوا کے لئے پہاڑوں پر گھومیئے۔ لیکن دماغی تھکاوٹ اور تھکن دور نہ ہوگی شاید عارضی طور پر ماحول کی تبدیلی کچھ اثر کرے۔ لیکن جب تک دماغی کش مکش اور جذباتی دباؤ کو دور نہ کیا جائے تھکان دور نہ ہوگی۔

ضعف اعصاب کی آخری حد یہ ہے۔ کہ اعصاب کام کرنے سے جواب دے جاتے ہیں۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے جب یہ ذہنی کش مکش اس قدر بڑھ جاتی ہے۔ کہ اعصابی اور جسمانی نظام بالکل بیکار ہو کر معطل ہو جاتا ہے۔ مریض جب اس حالت کو پہنچنے لگتا ہے تو اس سے قبل عجیب و غریب قسم کا خوف اور توہم اس میں پیدا ہو جاتا ہے مریض بلندی سے خوف کھاتا ہے۔ موٹروں سے وہ لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ انسانوں کا ہجوم دیکھ کر وہ گھبرا جاتا ہے۔ ایک موہوم سا خطرہ ہر وقت اس کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ موت کا نام سن کر ایسا آدمی اکثر بیہوش ہو جاتا ہے غرض اسی نوع کے ہزارہا خدشے اس کے دل و دماغ پر مسلط رہتے ہیں۔ اور دماغ ہر وقت انھیں خدشات کے سوچنے میں مصروفِ کار رہتا ہے۔ اس کا اثر جسم پر بھی ہونے لگتا ہے۔ اس کی علامت تشنجی حرکات۔ بھوک کا کم لگنا۔ بے خوابی۔ موت کا ڈر اور کمزوری ہے۔ اگر ان سب علامتوں کا تجزیہ کیا جائے۔ تو ہم کو اُن کی تہ میں ایک گہرا خوف نظر آئے گا جس کی ابتدا شاید بچپن سے ہو۔ یا وہ کسی حال کے واقعہ کا اثر ہو۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ خوف کیسا ہوتا ہے۔ کیونکہ خوف کی نوعیت فرد پر منحصر ہوتی ہے۔ بعض اوقات آپ کسی بات کو اپنی بے عزتی خیال کرتے ہیں اور اس سے آپ کے دل میں ناراضگی اور رنج ہوتا ہے۔ اس طرح دوبارہ بے عزتی ہو جانا بھی ایک خوف ہے۔ کئی دفعہ کسی ناکامی یا ذاتی وجاہت کا زائل ہو جانا بھی ایک گہرا خوف دل میں پیدا کر دیتا ہے۔ یا کسی کو یہ احساس ہو جائے۔ کہ وہ سوسائٹی میں غیر ضروری اور فالتو عنصر ہے۔ یا کسی ناکامی کے راز کا افشا ہو جانا۔ جسے وہ فرد مخفی رکھنا چاہتا ہے۔ ان باتوں کا اثر بھی خوف کی صورت میں رونما ہو جاتا ہے۔ ان تمام حالتوں یا اسی نوع کی اور بہت سی

سی حالتوں میں جو خوف پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنا تسلط دماغ پر جمالیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ شخص مسخ شدہ تخیل کے بے ترتیب جذبات کے سامنے جھکنے لگتا ہے۔ جب یہ حالت پہنچ جائے۔ تو ایسی حالت میں اس شخص پر کسی اعصابی مرض کا دورہ کوئی بعید بات نہیں۔

چند سالوں کا ذکر ہے۔ کہ انگلستان کے ایک بڑے جج نے خودکشی کرلی۔ اخبارات میں اس کا بہت چرچا رہا کیونکہ خودکشی کا ارتکاب کسی سماجی۔ اخلاقی یا اقتصادی وجہ سے نہ ہوا تھا۔ اُن کے ایک دوست نے جو انھیں اچھی طرح جانتا تھا اور اچھی طرح اُن کے ذاتی حالات سے واقف تھا ایک ماہر نفسیات کو بتایا۔ کہ جج کی بعض تقاریر پر جو اُنھوں نے دوران مقدمات میں کی تھی بڑی زبردست تنقید کی گئی۔ جسے وہ اپنی توہین سمجھے۔ چونکہ اُن کی طبیعت ذرا بہت زیادہ حساس تھی اس لئے اُنھوں نے خودکشی کرلی۔ اس بات کو سُن کر وہ ماہر نفسیات لکھتا ہے کہ "جج کو محسوس ہوا کہ وہ غلط جگہ پر ہے۔ کیونکہ اُس کی اعلیٰ قابلیت، دماغی بلندی اور ضمیر کی صاف گوئی کی راہ میں اس کی موجودہ پوزیشن حائل ہو رہی تھی۔ جو بات وہ کہتا تھا۔ وہ اس کی اسامی کی روایات کے خلاف تھی۔ اُسے جج کی روایات کو بہر حال برقرار رکھنا چاہیئے تھا۔ اس کے دل و دماغ کے اندر ایک خوفناک کش مکش ہونے لگی۔ اس پر دوبار شدید بیماریوں کے حملے ہو چکے تھے ان کے اثر اور کش مکش نے مل کر ایک نہایت ہی دردناک ٹریجڈی کی صورت اختیار کرلی"۔

ایک شخص خواہ وہ جج ہو یا ڈاکٹر، وزیر ہو یا معمولی انسان ہی ہر ایک اپنے لئے اپنے ذہن میں ایک خاص معیار اپنی زندگی اور حلقہ اثر کے متعلق قائم کرلیتا ہے۔ اور اس کا برقرار رکھنا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ محسوس کرلیتا ہے کہ اس کی خواب کی دنیا تباہ ہو رہی ہے۔ یا وہ اپنا اثر کم ہوتا دیکھتا ہے۔ تو اس تذلیل اور اپنی شکست کا احساس اس کے اندر ایک جذباتی کش مکش پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ اعصاب کی کمزوری اور جسمانی طاقت کا زائل ہونا ہے۔ بعض حالات میں یہ کش مکش اس قدر خطرناک صورت اختیار کرلیتی ہے کہ وہ شخص زندگی کی حقیقت سے خوفزدہ ہو کر دیوانہ ہو جاتا ہے۔ یا خودکشی کر کے ہی مخلصی پا سکتا ہے۔

زندگی کا تعطل دوسری خصوصیت ہے۔ جس سے ہم بحث کریں گے۔ یہ بات تو ہر ایک آدمی جانتا

ہے۔ کہ ہماری موجودہ سوسائٹی میں بہت سی ایسی جماعتیں ہیں۔ جن کا وجود بہت سی سماجی دشواریوں کا باعث بنتا ہے۔ لیکن ہم میں سے بہت تھوڑے لوگ یہ جانتے ہوں گے۔ کہ یہ جماعتیں کیوں پیدا ہوتی ہیں۔ اور پھر اس کثرت سے کوئی فردِ بشر خواہ وہ مرد ہو یا عورت جان بوجھ کر شراب خوری۔ نشہ آور چیزوں کا استعمال۔ نکما رہنا۔ دوسروں پر بوجھ بننا۔ اور پھر افشائے راز ایسے کمینہ حرکات کا مرتکب ہونا۔ ان عادات میں پڑ کر اپنی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ ایسے افراد کے بے پناہ لشکر میں آپ کو وہ لوگ ہی نظر آئیں گے۔ جن کے دل پژمردہ ہو گئے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اپنی طرزِ زندگی سے ظاہر کرتے ہیں۔ کہ انھیں اپنے آپ پر بالکل یقین نہیں رہا۔ گو زبانی وہ شاید اس نظریہ کے خلاف ایک طویل تقریر کر دیں۔ وہ شخص جسے اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ اور جو اپنی قابلیت کی قدر و قیمت کو خوب جانتا ہے۔ کبھی زندگی سے مایوس نہیں ہوگا اور جو ایسا کرتے ہیں انھیں یقیناً کسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جس کی وہ تاب نہ لا سکے۔ اس مشکل سے بچنے کے لئے انھیں یہی ایک آسان راستہ نظر آیا۔ اور اسی لئے ایک گونہ بیخودی کے لئے مے سے غرض وابستہ کر لی۔

مایوسی کیسے پیدا ہوئی؟ ممکن ہے۔ کہ وہ ایک ایسا بچہ رہا ہو جسے والدین کے حد سے زیادہ پیار نے خراب کر دیا۔ اب وہ اپنی قیمت بہت زیادہ سمجھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ زمانہ بھی اس سے وہی سلوک کرے۔ جو گھر میں اس سے ہوتا رہا ہے۔ مگر جب "بازار" میں اُسے اپنی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو وہ فوراً مایوس ہو جاتا ہے۔ یا پھر ایک بچہ جو ایسے ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ جہاں سختی اور سزا کا دور دورہ ہو یا بچے کو نہایت حقارت سے دیکھا جاتا ہے وہ ذلیل سمجھا جاتا ہو اس کا نتیجہ بھی زندگی سے مایوسی کے رنگ میں ہی ہوگا۔ محبت اور کاروبار میں ناکامی بھی آپ کو مایوس کر دے گی۔ بہر حال حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ لوگ جو سماج کے لئے ایک "مسئلہ" بن چکے ہیں دراصل اُن کے دل میں مخفی احساس ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بالکل بے فائدہ ہیں۔ اور اس احساس سے وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ عشق و محبت میں ناکامی پر ہمارے شعراء نے دیوانوں کے دیوان لکھ ڈالے ہیں۔ یہ وہی احساسِ فروتری کا نتیجہ ہے۔ اور ہماری موجودہ پیچیدہ۔ مصنوعی اور بناوٹی تہذیب میں ایسے ناکامی کے واقعات تو اور بھی زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔

اکثر لوگ جو اپنے آپ کو ذرا روشن خیال سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک شادی اور محبت، قدامت پرستی ہے

ہم اس قسم کے لوگوں کو ذیل کی شقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ ایسی عورتیں جو اپنی صنف کو مردوں سے کمتر سمجھتی ہیں۔

۲۔ ایسی عورتیں جنھیں بچپن سے ایسی تربیت دی گئی ہے۔ کہ وہ مردوں سے نفرت کریں۔

۳۔ ایسے مرد جن میں زنانہ پن ہو۔

۴۔ ایسے مرد جنھیں عورتوں کو حقیر سمجھنے کی تعلیم دی گئی ہو۔

۵۔ ایسے مرد جو اپنی خباثت یا بچپن کے کسی تجربے کے باعث جس کا اثر اُن کے دماغ پر ہو، عورتوں سے ڈرتے ہیں۔

مندرجہ بالا قسم کے لوگ حسب معمول محبت سے بے اعتنائی دکھاتے ہیں۔ اس بے اعتنائی کی تہ میں احساس فروتری کا مخفی جذبہ کارفرما ہوتا ہے گو یہ لوگ ظاہرداری کے طور پر یا اپنی لفاظی کے زور سے یہ ثابت کرنے کی لاکھ کوشش کریں، کہ وہ عام لوگوں سے بہت زیادہ علم رکھتے ہیں۔ اور وہ بڑے آزاد خیال واقع ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی فروتری کے باعث وہ محبت کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اگر اُن میں جرأت ہوتی تو وہ انسانی زندگی کا مقصد پورا کرنے کے لئے رفیق زندگی کی تلاش کرتے۔ اور پھر دونوں مل کر سماج کی ضرورت کو پورا کرتے۔ اور یوں نسل کے محافظ بنتے۔ زندگی فطری طور پر اپنی بقا چاہتی ہے جن لوگوں میں بقائے نسل کے خیال سے نفرت پیدا ہوتی ہو ان میں ضرور کسی نہ کسی فروتری کے جذبے کا احساس ہوتا ہے۔

آخری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں۔ جن کی قوت واہمہ اُن کی زندگی پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ توہّم پرستی دراصل زندگی کی حقیقتوں، مشکلات اور رنجوں سے نجات حاصل کرنے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ ہندوستان میں اس توہم پرستی کے وہ دردناک نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ اُن سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ تعویذ، گنڈا، جھاڑ، دم یہ سب اسی توہم پرستی کا نتیجہ ہیں۔ زندگی کی مشکلات کے حل کے لئے ہم عمل کی جگہ قبروں پر دعا مانگنے کو حل مشکلات سمجھتے ہیں۔ زندگی کی کشمکش میں جو کام ایک آدمی کو اپنی بقا کے لئے کرنا تھا۔ وہ کام ایک تعویذ کر دے گا۔ ہر قسم کی خیال پرستیاں دراصل توہم پرستی کی اقسام ہیں۔ جن کے ذریعہ ہم زندگی کی حقیقتوں سے راہ مفر تلاش کرتے ہیں۔

موجودہ تہذیب اور اقتصادی مشکلات نے حوا کی بیٹیوں کو گھر سے نکال کر فیکٹریوں اور دفتروں میں کام کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہندوستان میں تو اس حالت کا ابھی آغاز ہی ہے مگر مغربی ممالک میں تو یہ عام چیز ہے۔ دن بھر کی تھکی ماندہ لڑکی اس زندگی سے بھاگنا چاہتی ہے۔ اور اُسے اگر کہیں اماں ملتی ہے تو وہ واہمہ کی پرواز میں ہی میسر آسکتی ہے۔ اس لئے اکثر ایسی لڑکیاں فلم کے ہیرو کی پرستش کرنے لگتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ گویا وہ بھی ہیروئین ہیں مشکلات اور مصائب میں گھری ہوئیں۔ اور اُن کا ہیرو اُن کی مدد کے لئے پہنچتا ہے۔ ان کی توہم پرستی انہیں حقیقت سے افسانوی دنیا میں لے جاتی ہے۔ اسی لحاظ سے آج کل سنیما، تھیٹر اور ادب لطیف ایک نفسیاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ جب کوئی مرد یا عورت اس توہم پرستی کا شکار ہو جائے تو وہ بھول جاتا ہے کہ حقیقت کی دنیا میں سرگرمیٔ عمل اور جرأت دو ضروری عناصر ہیں۔ وہ تو دن رات عالم خواب میں رہتا ہے۔ حقیقت سے بھاگنے کی عادت دماغ میں پختہ ہو جاتی ہے تو اس کا نتیجہ بعض اوقات نہایت خوفناک ہوتا ہے۔ بڑی بڑی صاحبِ قوت و جبروت ہستیاں بھی اس واہمہ میں پڑ کر تباہ و برباد ہو گئی ہیں۔

احساس کمتری کا تجزیہ اور اس کا علاج

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا فردِ بشر ہو جس میں احساس کمتری نہ ہو۔ اور شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جسے کبھی نہ کبھی یہ احساس نہ ہوا ہو۔ عصمت انونو کان سے ذرا بہرے ہیں لیکن اس جسمانی کمزوری کی اُنھوں نے پرواہ نہ کرتے ہوئے ترکی کو بچا لیا۔ اور آج وہ ترکی قوم کے نجات دہندوں میں سے ایک ہیں۔ مہاتما گاندھی کتنے کمزور بدن کے انسان ہیں۔ لیکن اُنھوں نے اس احساس کمزوری کے باوجود ایسا کام کیا کہ ہندوستان کی تاریخ کو بدل دیا ہے۔ صدر جمہوریت امریکہ روز ویلٹ بچپن میں منحنی جسم کے انسان تھے۔ جس کا اثر ان کی ابتدائی زندگی اور شخصیت پر نمایاں رہا۔ لیکن اُنھوں نے طاقت حاصل کرنے کے لئے میدانِ عمل میں وہ سرگرمی دکھائی ہے جس کا نتیجہ آج اُن کی شخصیت اور خود اعتمادی کے رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔

صرف احساسِ کمتری کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی چیز ہے۔ تو وہ ہمارا اس احساس کے متعلق رویہ ہے کہ اس سے ہم کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان احساسات کا مقابلہ ذرا جرأت سے کیا جائے تو اس سے انسان اعلیٰ بلندی پر پہنچ سکتا ہے۔ لیکن جب یہ احساس کمتری شخصیت پر تسلط جمالے تو پھر اس کا اثر ہمارے کردار پر بہت بُرا ہوگا۔ اور صحت بھی خراب ہوتی جائے گی۔

فروتری کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب عضویاتی معذوری ہے۔ حساس بچے میں جسمانی نقص یا کمزوری، ممکن ہے اس قدر نشو ونما پا جائے کہ وہ خوفناک حالت اختیار کرلے۔ اور بعض اوقات ایسے حالات میں کم عمر بچے کیا بالغ اور نوجوان تک بھی زندگی سے بیزار ہوجاتے ہیں۔ اس پر تفصیل سے ہم سطور بالا میں عرض کر چکے ہیں۔

ایسا بچہ یا جوان جس میں کوئی جسمانی نقص ہو۔ اُسے بتانا چاہیئے کہ وہ اس نقص کا ازالہ کرنا سیکھے۔ مثلاً ایک شخص میں کوئی جسمانی نقص یا کمزوری ہے۔ تو اُسے سکھایا جائے کہ وہ اپنے اندر ایسا جوہر یا قابلیت پیدا کرلے جو اس کی کمزوری کو چھپالے۔ اور کسی کی نگاہ اس نقص کی طرف اُٹھ بھی نہ سکے اور وہ اپنے حلقہ اثر میں مقبول ہوجائے۔

لیکن اگر یہ ممکن نہیں کہ کسی صورت اس نقص کا ازالہ ہوسکے تو پھر اس کا مقابلہ ڈٹ کر مردانہ وار کیجیئے۔ کوئی آپ پر ہنستا ہے تو اُسے ہنسنے دیجیئے۔ آخر اس میں آپ کا قصور کیا؟ قدرت کا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔ جسمانی نقص کو پیدا کرنے والی قدرت ہے۔ اور اکثر لوگ تو آپ کے نقص کی طرف توجہ بھی نہ کریں گے اُن کی نگاہ میں آپ کی عزت کم کرنے کا باعث نہ ہوگی۔ ایک خدمت خلق کرنے والا اگر لنگڑا ہے یا اس کی ایک آنکھ خراب ہے تو لوگ اس کی قدر کرنی اس لئے نہ چھوڑ دیں گے کہ وہ کانا ہے یا لنگڑا ہے۔ ایک آدمی کی اصلی خوبی اس کا ذاتی کمال اور کریکٹر ہے۔ ایک شخص اس لئے عزت کا مستحق نہیں سمجھا جاتا کہ وہ (مرد یا عورت) جسمانی لحاظ سے خوب مضبوط ہے بلکہ باعزت بنانے والی چیز اس کا سوسائٹی کے لئے مفید ہونا ہے۔ کوئی شخص جتنا زیادہ فائدہ مند ہوگا اسی قدر زیادہ سماج میں اس کی عزت ہوگی۔

انسان سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جو چیز انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اُن کی انفرادیت، ذاتی جوہر، صلاحیت اور استعداد ہے۔ اور یہی چیزیں انھیں ایک دوسرے سے مختلف کرتی ہیں لیکن انسانی لغزشیں، معذوری عام کمزوریاں اور پریشانی یہ ایسی باتیں ہیں جن میں سب انسان ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ اور یہ قدر مشترک کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لئے آپ دوسروں کی کمزوریوں پر ہنسنے کی بجائے انھیں انسانی برادری کا ایک رشتہ سمجھئے جو ہم سب کو ملاتا ہے۔

دوسری قسم میں لاڈلا بچہ آتا ہے۔ اس کی دنیا تو اس کا گھر ہی ہوتا ہے۔ اور وہاں سب کی توجہ اس پر مرکوز رہتی ہے۔ لیکن جب وہ یہ نظریہ لے کر دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ تو اسے محسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ محض اس کی غلط فہمی تھی۔ اور اس کا نتیجہ آپ جانتے ہی ہیں۔ اکثر لوگ ایسے جوان بچے کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنی ذاتی رائے اور ذاتی وقار کو مقدم سمجھتے ہوئے اس کی ذات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کا جو کچھ حشر ہوتا ہے۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

اب ذرا ہم ایک دو مثالیں دے کر اس کا علاج پیش کرتے ہیں۔ ایک انگریز پروفیسر مکنزی لکھتا ہے کہ ایک انڈر گریجویٹ اچانک تعلیم سے دل چرانے لگا۔ اور اُسے اعصابی ضعف کا دورہ ہونے لگا۔ تجزیہ نفس سے معلوم ہوا کہ اسکول میں یہ بچہ بڑا ہوشیار تھا اور اساتذہ کا منظور نظر تھا۔ لیکن جب ذرا اسکول کی زندگی کے متعلق اور کریدا گیا تو معلوم ہوا کہ اسکول میں وہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے محنت کرتا تھا در اصل اسے تعلیم سے اتنی رغبت نہ تھی جتنی اپنی نمائش سے۔ اور وہ جن مضامین میں اچھا تھا محض اسی لئے تھا کہ وہ کوشش کرتا تھا کہ دوسرے لڑکوں پر وہ اپنے آپ کو ممتاز ثابت کر سکے اس سے ذرا آگے بڑھ کر پروفیسر مکنزی نے اس کے گھر کے ماحول کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔ وہ دوسری شادی سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد نے یہ شادی آخری عمر میں کی تھی اس لئے وہ گھر میں بوڑھے باپ اور جوان ماں کی تمام تر توجہ کا مرکز بن گیا۔ سوتیلے بہن بھائیوں کے مقابلے میں قدرتی طور پر ماں باپ اس کی زیادہ ناز برداری کرتے۔ اس لئے جماعت میں بھی وہ سب سے اول جگہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اساتذہ نے اِسے نہ سمجھا بلکہ اس کو لڑکے کی طبیعت کی اُفتاد خیال کیا اور اس کی مدد

کی۔ لیکن کالج کا ماحول بالکل اور ہوتا ہے۔ وہاں ذاتی محنت اور قابلیت پر ترقی کا انحصار ہے۔ جب اسے یہ محسوس ہوا کہ اُس کی قابلیت بالکل سطحی تھی تو اُس کا اثر اُس کے دماغ پر ہونے لگا۔ پروفیسر کلنری لکھتے ہیں کہ میں نے اس لڑکے سے بار بار ملاقاتیں کیں اور آہستہ آہستہ اس کے دماغ سے فروتری کے اُن احساسات کو نکال دیا جو اُس کی زندگی پر تسلط جمائے ہوئے تھے اور آخر کار وہ لڑکا تعلیم میں دلچسپی لینے لگا اور اس کی صحت بھی برقرار ہو گئی۔ اب وہ لڑکا کالج میں خوب اچھے نمبروں پر پاس ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک اور لڑکا اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اس کی دودھ پیتے بچوں کی طرح حد درجہ ناز برداری کی جاتی تھی۔ چاہیئے تھا کہ اس کی تربیت ایسے رنگ میں کی جاتی کہ وہ اپنی مصنوعی عزت اور توقیر بھول جاتا۔ برخلاف اس کے اُس کے والدین نے علانیہ اُس کی تعریف و توصیف کے پُل باندھنے شروع کر دیئے۔ اور اس کو ہر جگہ خوبصورت قوی اور بہادر بیان کیا جاتا۔ یہی تعریفات اس کے دل کو بھاتی رہیں اور اُسے خود پرست بناتی رہیں۔ اس کے والدین اس کی ہر ایک ضرورت اور چھوٹے سے چھوٹے وہم کو نا واجب طور پر پورا کرتے رہے۔ جب وہ کالج میں گیا۔ تو وہ کچھ اچھی طرح وہاں چل نہ سکا۔ اس کے ہم جماعت طلبہ نے اس کی طرف چنداں توجہ نہ کی۔ وہ اپنے دل میں دنیا بھر کی تمام محاسن کا مجموعہ اور خوبصورت اور پیاری چیزوں کا مجسمہ بنا ہوا تھا اُسے طلبہ کی یہ بے رُخی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے کئی کالج تبدیل کرنے پڑے اور بڑی مدت کے بعد وہ گریجویٹ ہو سکا۔ اس قدر تلخ تجربات کے باوجود اس کے دل سے اپنے متعلق غلط فہمی دور نہ ہوئی۔ وہ ایک صنعتی کارخانے میں بطور کیمسٹ ملازم ہوا۔ اس سے توقع کی گئی کہ وہ کم تنخواہ پر زیادہ سے زیادہ کام کرے۔ وہ اب ایسے ماحول میں تھا جہاں ملازم کو اپنے فرائض کی بجا آوری پر اتنا سراہا نہیں جاتا جتنا اُسے اس کی لغزشوں پر ڈانٹا جاتا ہے۔ اس کے دماغ میں تو یہ تھا کہ وہ تمام کارخانے میں ایک نمایاں اور یکتا شخصیت ہو گا۔ اس کا علیحدہ دفتر ہو گا۔ لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ اُس جیسے کئی اور کیمسٹ سالہا سال سے اس کارخانے میں ملازم ہیں اور ان کی حالت نہایت خستہ ہے

تو وہ گھبرایا. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا. اب وہ نوجوان بیکار گھر میں پڑا رہتا ہے کہ دنیا میں قدر دانی کرنے والا کوئی نہیں رہا.

ایک بگڑا ہوا بچہ جب وہ جوان ہو جائے تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کوئی بے نظیر ہستی نہیں اور اسے یہ امید نہ رکھنی چاہیئے کہ دوسرے لوگ بھی اس کی طرف ویسی ہی توجہ اور انہماک کا اظہار کریں گے جو اس کے والدین کرتے تھے. اُسے چاہیئے کہ ہمت، دلیری، اور عزم صمیم کے ساتھ زندگی کے پیش آنے والے واقعات کا مقابلہ کرے اور اپنی قابلیت اور اشتراک عمل سے اپنے آپ کو نسل انسانی کی عظیم الشان برادری کا ایک تندرست فرد بنائے. صرف یہی ایک رستہ ہے جس سے وہ اپنے آپ کو دماغی کش مکش، اور ذاتی تکالیف سے بچا سکتا ہے.

یہی حالت ان بچوں کی ہے جنھیں بچپن میں فالتو سمجھا گیا. یا جن سے دوسرے لوگ نفرت کرتے تھے. ذی عقل لوگ اس بات کی چنداں پرواہ نہیں کرتے. کہ کوئی کہاں پیدا ہوا. اور اس کے والدین کون تھے؟ وہ تو صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ کس کام کے قابل ہے؟ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟ جو شخص امداد باہمی کی روح لے کر دنیا میں قدم رکھتا ہے. اور خدمتِ خلق اپنا نصب العین بناتا ہے تو وہ دیکھے گا کہ ہر کوئی اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا اور اس کی مدد کرنا اپنا فرض خیال کرے گا.

گو مندرجہ بالا مشورہ کتنا ہی صحیح اور اچھا کیوں نہ ہو لیکن بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں (جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں) جن کے لئے بچپن کے کسی بڑے تجربہ کے زیر اثر ایسا کرنا مشکل ہوتا ہے. اور وہ احساس فروتری کے گہرے اثر کو زائل نہیں کر سکتے.

ایک آدمی کا ذکر ہے. کہ وہ بیچارا چالیس برس کی عمر تک کہیں مستقل طور پر کام نہ کر سکا. کئی جگہ ملازم ہوا اور پھر نکال دیا گیا آخر وہ ایک بہت بڑے شہر میں پہنچا جہاں ایک اچھی اور معقول اسامی خالی تھی لیکن جب وہ منیجر سے انٹرویو کرنے کے لئے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کانپ رہا تھا حالانکہ اس اسامی کے لئے جس قدر صفات کی ضرورت تھی وہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں. جب اُس سے

سوال کیا گیا۔ تو اس کی زبان رُک گئی۔ وہ "ہاں" کی جگہ "نہ" اور "نہ" کی جگہ "ہاں" میں جواب دینے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ بیچارہ وہاں سے مایوس ہو کر لوٹا۔ ایک اور جگہ خالی تھی وہاں وہ پہنچا نیجر کے سامنے آتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا سبب اُسے خود بھی معلوم نہ تھا لیکن اس کا تجزیہ نفس کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ اس کی پیدائش محض ایک "حادثہ" تھی۔ والدین کو اس کی پیدائش سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس کی تعلیم میں کوئی دلچسپی نہ لی گئی اور اس کی موجودگی میں اس کے دوسرے بھائی بہنوں کی تو تعریف کی جاتی لیکن اُسے اس کا باپ ہمیشہ یہی کہا کرتا۔ کہ "خدا جانے تم زندگی میں کیا کرو گے تم تو محض نکمے ہو۔ تمھیں تو کوئی ایک پیسہ کی ملازمت بھی نہ دے گا"۔ چنانچہ لڑکپن میں ہی ایک رات گھر کے لوگوں نے اُسے اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے سسکیاں بھرتے دیکھا۔ کسی نے پوچھا "لڑکے روتے کیوں ہو؟" تو اس نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ مجھے کوئی نہیں چاہتا۔ مجھ سے کوئی پیار سے بات نہیں کرتا"۔ گھر والوں نے اسے مکاری پر محمول کیا۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آہستہ آہستہ اُسے خود اپنے آپ پر بھی اعتماد نہ رہا۔

فالتو اور مکروہ بچے کی ٹریجڈی کا یہ صرف ایک واقعہ ہے۔ ایسے بچوں کے دماغ میں احساس کمتری پیدا ہو کر بڑھتا رہتا ہے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی نشوونما پاتا ہے۔ اور آخر کار وہ ایسے شخص کو دنیا میں رہنے کے ناقابل بنا دیتا ہے۔ کیونکہ جرأت، امید اور تعاون کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل ہے۔ اور یہی جوہر ایسے شخص میں مفقود ہوتے ہیں۔ فالتو اور مکروہ بچے تو یہ یقین لے کر جوان ہوتے ہیں کہ سوسائٹی کو اُن کی ضرورت نہیں۔ اس لئے دنیا میں انھیں رہنے کا حق بھی نہیں۔

ایسے بدقسمت لوگوں کا علاج یہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں خود ایسی صفات پیدا کریں۔ کہ دوسرے اُن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ اُن کی عزت ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اُن میں عزتِ نفس کا جذبہ ترقی پائے گا۔ اگر بچپن میں انھیں ایک بیکار چیز سمجھا گیا تو جوانی میں وہ "باکار" بن کر دکھائیں

اور یہ اُسی صورت میں ہو سکے گا کہ وہ خود زندگی کا مقابلہ جرأت، استقلال اور سعی بلیغ سے کریں۔ گو ایسا کرنے میں اُنھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن آخر کار ان کی محنت اور خدمت رنگ لائیگی۔ وہ پھر سماج میں ایک مفید اور قابل عزت فرد کی حیثیت سے دیکھے جائیں گے۔ ہمارے بزرگوں کا مشہور مقولہ ہے۔ کہ اپنے آپ کو کھو کر ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں۔

احساس کمتری کو دور کرنے کے لئے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ہماری طبیعت کا رجحان کس طرف ہے اور ہم نے اپنے ذہن میں آئندہ کے لئے کیا سوچ رکھا ہے۔ کیا ہمارا تخیل قابل عمل ہے کیا وہ ممکن ہے؟ کیا یہ محض خود غرضانہ ناموری کے لئے ہے؟ کیا ہماری کامیاب زندگی سے سماج اور سوسائٹی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ کیا ہماری فطری ودیعتوں اور صلاحیتوں کے پیش نظر ہمارا نقطہ نظر درست بھی ہے۔ اور یہ کچھ ہماری زندگی کے لئے مفید ہوگا یا غیر مفید؟

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ کہ بعض افراد ناممکن الحصول نظریات زندگی مقرر کر لیتے ہیں۔ اور بعض خود غرضانہ باتوں کے لئے سعیٔ لا حاصل کرتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ سوائے مایوسی کے انھیں اور کچھ نہیں ملتا۔ اور یہ مایوسی اُنھیں زندگی سے بیزار کر دیتی ہے۔ لیکن جب کسی اعلیٰ اور صحیح مقصد کے لئے کوشش کی جائے۔ تو اس کوشش میں ایک راحت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ کوشش ہی آپ اپنا صلہ ہوتی ہے خواہ اصل مقصد حاصل نہ بھی ہو سکے۔ لیکن اس کے برخلاف جو سعی محض ذاتی نمائش اور بے فائدہ باتوں کے لئے کی جائے اس کا نتیجہ آخر کار ناامیدی ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ شخص چڑچڑا، مایوس اور صحت میں کمزور ہو جاتا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کوئی شخص جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ زندگی کو غلط زاویہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا لیکن اب کسی اچھے اور صحت مند ماحول کو محسوس کرتے ہوئے اپنا نقطہ نگاہ تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کا احساس کمتری بھی کم ہوتا جاتا ہے۔ دماغی صحت کے دو دشمنوں۔ یعنی خود غرضی اور جہالت ــــ کو ضرور مغلوب کرنا چاہیئے۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتے ہیں کہ ہم دوسروں کی متعلق زیادہ سوچیں اور اپنے آپ کو پہچانیں۔ تجزیہ نفس کے لئے ہم ذیل میں چند موٹی موٹی باتیں

لکھ رہے ہیں۔ آپ انھیں کاغذ پر لکھ دیجئے۔ اور ان کے آگے ان کے جوابات بھی لکھئے۔

اعصابی نقص :۔

کیا میں اپنے جسمانی نقص کو بہت زیادہ محسوس کرتا ہوں ؟

کیا میں دوسرے لوگوں کی رائے پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہوں ؟

کیا میں نے اپنے نقص کے بدل کے طور پر کوئی اچھا جوہر اپنے اندر پیدا کر لیا ہے ؟

بگڑا ہوا بچہ :۔

کیا میں ابھی تک بچپن کے جذبات اور محسوسات میں ہی زندگی بسر کر رہا ہوں ؟

کیا دوسرے لوگوں سے بھی ویسے ہی سلوک کی توقع رکھتا ہوں۔ جو والدین مجھ سے روا رکھتے تھے ؟

کیا میں اپنے تئیں یکتا، ارفع سمجھتا ہوں۔ اور دوسروں سے خودغرضانہ مطالبات تو نہیں کرتا ؟

کیا جب لوگ میری طرف متوجہ نہیں ہوتے یا میری عزت نہیں کرتے تو مجھے مایوسی تو نہیں ہوتی ؟

کیا میری برتری کا منتہائے نظر صحیح اور سماجی طور پر مفید ہے ؟

میں کس شخص پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہوں اور کیوں ؟

کیا میں زندگی کا مقابلہ جرأت اور امید سے کر رہا ہوں ؟

مکروہ اور فالتو بچے :۔

کیا میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ مجھے لوگ غریب سمجھتے ہیں ؟

میں اپنے تئیں کس سے کمتر محسوس کرتا ہوں اور کیوں ؟

کیا بچپن کے تجربات نے مجھے دوسروں سے نفرت کرنا سکھایا ہے ؟

کیا میں سماجی طور پر بزدل ہوں ؟

کیا میں زندگی سے بھاگتا ہوں ؟

کیا میں ڈر کی وجہ سے اپنی جذباتی زندگی کو دبا رہا ہوں ؟

عام :۔

کیا میں کسی کی موت کا متمنی ہوں ؟

کیا میں اپنی بیوی۔ یا اپنے خاوند سے نفرت کرتا ہوں — یا نفرت کرتی ہوں ؟

کیا زندگی کے متعلق میرا نظریہ صحت مندانہ ہے ؟

میں کس شخص کو گرا کر اپنے برابر لانا چاہتا ہوں ؟

جب آپ مندرجہ بالا سوالات کے جوابات لکھ لیں گے۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کیا ہیں۔ اپنی زندگی کا تاریک پہلو آپ کے سامنے آجائے گا۔ پھر آپ روشن پہلوؤں پر بھی نظر ڈال سکیں گے۔ ہر ایک انسان میں بعض ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جو دوسروں میں نہیں ہوتیں اور وہ بعض ایسے کام کر سکتا ہے جو دوسرے نہیں کر سکتے۔ جس شخص میں احساس کمتری ہو، اُسے چاہیے، کہ وہ خاموشی سے زندگی کے روشن پہلو پر زیادہ نظر رکھے اور زندگی کی عمارت کی بنیاد اسی پر استوار کرے۔ ایسے تمام نقائص جن سے آپ میں احساس کمتری پیدا ہو اُن کو دور کیجیے اور اپنی استعداد کے مطابق — خواہ وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو اپنی صلاحیت اور قابلیت کو زیادہ کرنے کی کوشش کیجیے۔

ایک ڈاکٹر چند نرسوں کو لیکچر دے رہا تھا لیکچر ختم کرنے کے بعد اس نے چند سوال کرنے شروع کر دیئے۔ پہلی نرس نے نامکمل سا جواب دیا۔ دوسری نرس کے جواب پر ڈاکٹر ذرا جھنجھلایا اور تیسری نرس کا جواب بھی کچھ یونہی سا تھا اس پر ڈاکٹر نے اس کا مذاق اڑایا۔ ان تینوں کے جوابات اور ڈاکٹر کے رویے نے چوتھی نرس پر جسے اپنی فروتری کا زیادہ احساس تھا بہت بُرا اثر کیا جب اُس کی باری آئی تو وہ اتنی گھبرائی کہ وہ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکی۔

اس واقعہ نے اس نرس کو ناخوش بنا دیا اور اُسے اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا۔ رات بھر وہ بستر پر لیٹے ہوئے بھی یہی سوچتی رہی۔ کہ وہ کس طرح اپنی اس کمزوری کو دور کر سکتی ہے۔ اچانک اُسے یاد آیا۔ کہ چند دن پہلے اُس نے ایک مضمون لکھا تھا۔ جس پر اسی ڈاکٹر نے لکھا تھا" پُراز معلومات

اور نہایت اچھا" اسے خیال آیا کہ اگر وہ اتنا اچھا مضمون لکھ سکتی ہے تو یقیناً اس کا دماغ بہت اچھا ہے۔ اس لئے اس روشن پہلو پر زیادہ توجہ کرنی شروع کر دی اور آہستہ آہستہ احساس کمتری کم ہوتا گیا۔ اسی طرح ہم میں سے ہر ایک میں فروتری کا احساس کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مثبت احساسات بھی ہوتے ہیں۔ ان کو اگر ہم اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے ساتھ ملا کر کام میں لائیں اور روشن پہلو پر زندگی کے نظریات اور تصورات کی بنیاد رکھیں اور ان صفات کی نشو و نما کرتے رہیں تو ہم میں احساس کمتری کی جگہ جد و جہد اور عزتِ نفس کا مبارک جذبہ پیدا ہوتا جائے گا۔

اشتمالیت

(ترجمہ برکت علی صاحب فراق)

یہ مسٹر جوڈ کی کتاب MODERN POLITICAL THEORY کے ترجمے کا ایک باب ہے اس کے ایک باب "اشتراکیت" کا ترجمہ نومبر ۱۹۳۹ء کے پرچے میں چھپ چکا ہے۔ اس کی مقبولیت کے باعث یہ باب بھی ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ مدیر

لفظ "اشتمالیت" کے بے شمار مختلف معنی لئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اس سے ابتدائی عیسائیوں کے نظریئے کی طرح جماعت کا وہ نظریہ مراد ہوتا ہے جس کی رو سے تمام ملکیت مشترک ہو اور بعض اوقات اشتراکیت کے ہم معنی لفظ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہی نام ایک ایسے نظام کو بھی دیا جاتا ہے جس کے ماتحت خوراک، کپڑا، طبی امداد، اور زندگی کی دوسری ضروریات کا حسب حاجت کسی خارجی اثر سے آزاد ہو کر انتظام کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس باب میں ہم لفظ اشتمالیت کے اُس خاص مفہوم سے بحث کریں گے جو مارکس اور اینجلز کی تصنیف "اعلان اشتمالی" مطبوعہ ۱۸۸۷ء میں ادا کیا گیا ہے اس لئے کہ اس لفظ کا صرف یہی وہ مفہوم ہے جو اشتمالیت کو اشتراکیت کے دوسرے مذاہب سے بہ اعتبار ایک خاص سیاسی نظریئے کے جدا اور ممتاز کرتا ہے۔

نظر

اس مفہوم کے اعتبار سے اشتمالیت اصل میں طریقۂ کار کا ایک نظریہ ہے۔ اس کا منتہائے ایسے اصول متعین کرنا ہے جن پر عمل کر کے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکی نظام کی تکمیل کی جائے گی۔ اس کے دو بنیادی نظریئے ہیں طبقاتی جنگ اور انقلابی ـــــ یعنی تشدد آمیز ـــــ ذرائع سے طاقت کو سرمایہ داروں سے لے کر محروم الملک یعنی پرولتاری طبقے کے ہاتھ میں دے دینا۔

(الف) مارکسی اشتمالیت :۔ مارکس کا خیال تھا کہ سرمایہ داری کا خاتمہ اُن تضادات کے نتیجے کے طور پر ہو گا جو اس نظام کی سرشت میں داخل ہیں۔ ان تضادات میں سب سے زیادہ

اہم ایک تو یہ ہے کہ سرمایہ داری، قدرِ زاید کے حصول کے پیش نظر جو اس کی زندگی کا راز ہے، مجبور ہے کہ ایک غریب اور فاقہ زدہ طبقے کو پیدا کرے اور اُسے منظم اور طاقتور ہونے کا موقع دے۔ یہ طبقہ جماعت میں طبقہ وارانہ امتیازات کی وجہ سے کچھ اس طرح بیدار اور منظم ہو گا کہ آخر کار سرمایہ داری ہی کو ختم کر دے گا جس نے اُسے پیدا کیا تھا۔ دوسرا اہم تضاد یہ ہے کہ جب پیدائش اشیاء کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو گی تو عوام کا بیشتر حصہ ملکیت سے محروم ہو گا اور جب تک سرمایہ داری زندہ رہے گی، یہی حالت رہے گی۔

محروم الملک طبقہ کے لوگ چونکہ اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ صنعتی نظام کی اضافہ پذیر مصنوعات کو خرید کر اپنے کام میں لا سکیں، اس لئے سرمایہ دار طبقہ پیدائش اشیاء اور ان کے داخلی صرف کی غیر معمولی عدم مساوات سے مجبور ہو کر بیرونی منڈیوں کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بڑی بڑی کمپنیوں سے اتحاد کرتا ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو فنا کر دیتی ہیں اور متعلقہ اشیاء تجارت کا اجارہ حاصل کر لیتی ہیں۔ جوں جوں پیدائش اشیاء میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، بیرونی منڈیوں کے معاملے میں باہمی مقابلہ شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ غیر ترقی یافتہ علاقوں سے استفادہ اور نفع حاصل کرنے کی غرض سے یہ طبقہ ہر طرف سے ٹوٹ پڑتا ہے اور سرمایہ داری سامراجیت کی منزل سے گذر کر اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

موجودہ دور میں حالات کا جو رُخ ہے، اُسے جدید حامیانِ اشتمالیت مارکس کی پیشینگوئیوں کی صحت کے لئے موزوں ترین ثبوت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ موجودہ حالات کی وہ جو تفسیر کرتے ہیں، اُن کی بنیاد مندرجہ ذیل طریقوں پر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "جنگ عظیم کی ابتدا معاشی تھی۔ پیدائشِ اشیاء کے محرکات اور موجودہ سماجی تنظیم میں کوئی ہم آہنگی باقی نہیں رہ گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشیاء کی پیدائش کچھ اس رفتار سے ہونے لگی کہ ان کے صرف کی تنظیم جماعت کے بس سے باہر ہو گئی۔ محروم الملک مزدوروں کی دنیا میں کاہل الوجود امیروں کے کمینہ پن اور خود نمائیوں کے ہنگامے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ نئی نئی منڈیوں کے لئے مقابلے

ہونے لگے۔ مقابلے کی اس افراتفری کا ناگزیر نتیجہ یہ ہونا تھا اور ہوا کہ سامراج کے بھیس میں آپس میں ایک ہیبت ناک جنگ پھوٹ پڑی"۔ مثال کے طور پر لینن کو لیجئے۔ وہ سامراجیت کی تعریف یوں کرتا ہے کہ "یہ سرمایہ داری کی وہ منزل ارتقا ہے جس میں اجارے اور ساہوکارے کے سرمائے کا زبردست اثر قائم ہو جاتا ہے، سرمائے کی برآمد کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، بین الاقوامی کمپنیاں دنیا کا بٹوارہ شروع کر دیتی ہیں، اور بڑی بڑی سرمایہ دار مملکتیں پورے کرۂ ارض کو باہم تقسیم کر لیتی ہیں"۔ اس منزل پر آ کر سرمایہ داری نظام کے اندر جو فطری تضادات ہیں، وہ اس کی فنا کا باعث بنتے ہیں۔ محروم الملک طبقہ کی طاقت جو سرمایہ داری نظام کی پیداوار ہے، اپنے پیدا کرنے والے کو ختم کر دیتی ہے۔ اس کی تعداد میں دن پر دن اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کے مطالبات کا اصرار شدید تر اور آخر کار قطعی طور پر طے کر لیتا ہے کہ اُسے کوئی چیز مطمئن نہیں کر سکتی تا آنکہ سرمایہ داروں کا خاتمہ ہو جائے، جائداد پر جو اب تک ذاتی ملکیت سمجھی جاتی تھی، سماج کا قبضہ ہو جائے، اور طاقت سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے نکل کر جنگ آزما مزدوروں کے ہاتھوں میں آ جائے۔

محروم الملک طبقے کی یہ اُٹھان تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں اُس طبقے کا جسے جماعت میں اقتدار حاصل ہوا، یہی حشر ہوا ہے۔ اس کے اقتدار ہی کے ماتحت ایسے حالات پیدا ہو گئے جن کے نتیجے کے طور پر ایک ایسا ہی مظلوم ومقہور طبقہ پیدا ہو گیا اور آخر اس نے اس مقتدر طبقے کو فنا کر دیا مثلاً۔ اسی طریق پر جاگیر داری نظام کی پیداوار سرمایہ داروں کا طبقہ تھا مگر اسی نے صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دے کر اس نظام کو ختم کر دیا۔ ہر چند مزدور طبقے کی اس قسم کی بیداری کی متوازی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں، مگر مزدوروں کی یہ بیداری ایک طرح سے نئی ہے۔ ازمنۂ گذشتہ میں جتنے انقلابات ہوئے ان کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک طبقے کے ہاتھوں ایک طبقہ فنا کر دیا گیا، طاقت ایک اقلیت کے ہاتھ سے نکل کر دوسری اقلیت کے ہاتھ میں آ گئی۔ مگر مزدور طبقے کی فتح سے انسانیت کی نجات وابستہ ہے۔ اس انقلاب کی تکمیل ہے تو طبقاتی بنیاد پر، مگر انقلاب کے بعد جماعت کی جو نوعیت ہو گی اُس کی بنیاد خود طبقات کی تنسیخ پر ہو گی۔ ان اصولوں کی بنا پر

اشتمالیوں کا یہ نظریہ ہے کہ باوجودیکہ سرمایہ دار طبقہ سے اُن کی جنگ ایک محروم الملک طبقے کی طرف سے ہے مگر درحقیقت یہ جنگ تمام بنی نوعِ انسان کی نجات کے لئے ہے۔ اور یہی وہ ایمان ہے ــــ اور چونکہ یہ ایک بالکل بے غرضانہ تخیل ہے اس لئے اس ایمان میں پختگی بہت ہے ــــ جو اس کے بظاہر خشک اور بے کیف خیالی پروگرام کی تکمیل کے لئے ایثار و عقیدت کی توفیق پیدا کرتا ہے۔

اگرچہ انسانیت کی نجات اور طبقات کے وجود کی تنسیخ ایک اشتمالی کا مقصد اساسی ہے، مگر اس کی رائے میں اس مقصد کی تکمیل زمانۂ دراز تک نہیں ہو سکتی۔ مزدوروں کا انقلاب اس خیالی مقصد کے لئے راستہ ضرور ہموار کر دے گا۔ مگر تاہم یہ انقلاب یکایک اُس کی تشکیل نہیں کریگا۔ یہاں ہمارا ذہن زمانۂ انقلاب کی دوگانہ تقسیم کے تخیل کی طرف جاتا ہے۔ یہی تخیل مارکس نے پیش کیا تھا اور اشتمالی اُسی کی پابندی کرتے ہیں۔

۱۔ زمانۂ انقلاب کی عبوری منزل جس میں ریاست کو اقتدار حاصل ہوگا اور خود ریاست پر مزدوروں کا تسلط ہوگا۔

۲۔ وہ منزل جس میں طبقات کا وجود نہیں ہوگا اور جماعت خالص اشتمالی اصولوں پر مبنی ہوگی۔ اس منزل میں ریاست بہ حیثیتِ حاملِ قوت و اختیار کے مفقود ہو جائے گی۔ انقلاب کی ان دونوں منزلوں کا الگ الگ مطالعہ ہمارے لئے سہولت بخش ہوگا۔

(۱) انقلابی یا عبوری منزل حامئین اشتمالیت ارتقائی اشتراکیت کے نظریوں سے خاص طور سے اختلاف کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جب تک ریاست میں اہم تبدیلیاں نہ کر دی جائیں جماعت کے ڈھچر میں کوئی بنیادی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔ ماضی کے تجربات اور خاص طور پر ۱۸۷۱ء کے پیرس کمیون[1] کی ناکامی سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مزدور پیشہ طبقے کا صرف موجودہ سرمایہ دارانہ ریاست

---

[1] انقلاب فرانس کے عہد ہیبت کی وہ مزدور جماعت جو ۱۸۷۱ء میں برسرِ اقتدار تھی۔

کی مشینری پر قابض ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا اس لئے کہ اس صورت میں وہ اُسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال نہیں کرسکتا۔ ریاست کی موجودہ ساخت انقلابی مقاصد کے لئے نہایت ناموزوں ہے۔ اس کے عمال بھروسے کے آدمی نہیں ہوتے۔ اس کا ضابطۂ عمل بے اثر ہوتا ہے اور اس کی نطرت اس قابل نہیں ہوتی کہ صرف اس کے چلانے والوں کے بدل جانے سے وہ خود بھی بدل جائے مزدوروں کی ایک جماعت کو اگر سیاسی اقتدار حاصل ہو جائے تو وہ اقتدار اس وقت تک بالکل بے حقیقت ثابت ہوتا ہے جب تک سرمایہ دار طبقہ ذرائع دولت آفرینی پر قابض ہے۔ اس قبضے کی بدولت سرمایہ دار ہمیشہ اس کوشش میں کامیاب رہے گا کہ پارلیمنٹ جس پر دستوری مزدور پارٹی قابض ہے، ایسے ہی قوانین نافذ کرے، جن سے اس کی صنعتی طاقت پر آنچ نہ آسکے۔ اور اگر ایسی پارٹی کبھی ایسے قوانین نافذ کرنے کی کوشش بھی کرے جو سرمایہ داروں کو بے دخل کرکے ملکیت کو جماعت کے قبضے میں منتقل کرنے والے ہوں، تو بھی وہ ان قوانین کی زد سے بچ کر نکل جانا چاہیں گے یا پھر، آخر کار، اپنے حقوق کے لئے حکومت سے بغاوت کریں گے۔ برطانیہ عظمیٰ میں مزدور پارٹی کو طاقت حاصل ہوئی مگر اس طاقت کے زمانے میں وہ سرمایہ داروں کے اقتدار پر کسی قسم کا اثر نہ ڈال سکی اور اس باب میں اُسے نسبتاً زیادہ ناکامی ہوئی۔ اشتمالیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حقیقت ...... ارتقائی اشتراکیت کے متعلق ان کے نظریئے کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

ان حقائق کی بنا پر یہ نظریہ قائم کیا جاتا ہے کہ دستوری ذرائع ترک کر دینے چاہئیں، موجودہ ریاست کی مشینری کو بدل دینا چاہیئے، اور محروم الملک طبقے کی آمریت قائم کرنی چاہیئے۔ جدید اشتمالی تو یہاں تک کہنے میں تامل نہیں کرتے کہ انقلابی جدوجہد میں تشدّد اور درشتی بھی جائز ہے جو سرمایہ دار طبقے کی فنا کا باعث ہوگی۔ مزدوروں کے طبقے کا مسلح تشدّد نہ صرف سرمایہ داروں کو بے دخل کرنے کے لئے ضروری ہوگا بلکہ اشتمالی انقلاب کے جواب میں سرمایہ داری کے احیاء کے لئے جو انقلاب برپا کیا جائے گا، اسے دبانے کے لئے بھی ضروری ہے۔

اینجلز کا قول ہے "انقلاب میں جو جماعت فتحیاب ہوتی ہے، وہ ضرورت کے تقاضے سے

مجبور ہوتی ہے کہ اپنے اقتدار کو اُس خوف کے ذریعے قائم رکھے جو رجعت پسندوں کے دلوں میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔ اگر پیرس کا کمیون اپنی حاکمیت کی بنیاد مسلح عوام پر نہ رکھتا جو سرمایہ داروں کے مقابلے پر تھے تو کیا اس کی عمر ۴۸ گھنٹے سے زیادہ ہوتی؟"

اس سلسلے میں یہ امر پیش نظر رہنا چاہئے کہ سرمایہ دار طبقے کو اعلیٰ تعلیم، نظم و ضبط، اور فوجی مہارت جیسے ذرائع کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ سامانِ جنگ اُن کے تصرف میں ہوتا ہے اور اُسے ہر طرح سے آراستہ کرنے کے لئے روپیہ ان کے جیب میں۔ اس لئے ان سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ اگر یکایک کسی انقلابی ہنگامے میں وہ بے دخل بھی ہو جائیں تو ان فوائد کے استعمال سے باز آ جائیں گے۔

لینن کہتا ہے "کوئی سنجیدہ سے سنجیدہ اور شدید سے شدید انقلاب کیوں نہ ہو، سرمایہ داروں کی مدافعت میں ایک طویل، دیرپا، اور شدید جد و جہد ہی فتحیاب جماعت کے تسلّط و اقتدار کی ضمانت کر سکتی ہے۔ اس طبقے کو انقلاب کے بعد بھی برسوں مظلوم طبقے کے مقابلے میں غیر معمولی فوائد حاصل رہیں گے۔ یہ طبقہ مظلوم اکثریت کے کسی فیصلے کے سامنے بغیر اپنے سابقہ فوائد کو ایک فیصلہ کن جنگ یا ایک سلسلۂ جنگ کی صورت میں استعمال کئے، ہرگز نہیں جھکے گا۔" ان حقائق کے پیش نظر سرمایہ داری نظام کے بعد اشتمالی نظام کے قیام سے پہلے ایک عبوری زمانہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے تاریخ کا ایک مستقل باب بنے گا۔"

اس دور میں بہ قول لینن مزدوروں کی ایک "دکھاوے کی ریاست" سرمایہ دارانہ ریاست کی جگہ لے گی۔ یہ ریاست بہ اقتضائے ضرورت ایک طبقاتی تنظیم کی حیثیت رکھے گی، اگر اس کے فرائض منصبی انقلابی مزدوروں کی ایک نمائندہ جماعت متعین کرے گی۔

مارکس کا قول ہے کہ "سرمایہ داروں کی دفاعی جد و جہد کو شکست دینے کے لئے مزدور ریاست کو ایک عارضی اور انقلابی رنگ میں رنگ دیں گے۔" اس قول سے یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ اس دور میں ریاست سخت گیر اور چند شخصیتوں کی ایک جماعت کا نام ہو گا۔ اُسے جابرانہ اختیارات

حاصل ہوں گے اور اس کا دستور العمل خالص جمہوری نہیں ہوگا۔ یعنی اس کے اجزائے ترکیبی میں ہر جماعت کا دخل نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس یہ صرف ایک جماعت کی نمایندگی کرے گی اور بس۔ وہ جماعت محروم الملک طبقے کی ہوگی۔ اور صرف سرمایہ داروں کا خاتمہ کرنے کے لئے ریاست کے اختیارات کو استعمال کرے گی۔

انجیلز ایک جگہ لکھتا ہے، "چونکہ ریاست ایک عارضی ادارہ ہوگا، اور اس کا استعمال زمانہ انقلاب میں طاقت کے زور سے مخالفین کو دبانے کے لئے ہوگا اس لئے اس زمانے میں ایک آزاد اور مقبول ریاست کا چرچا کرنا سراسر مہمل ہے۔ محروم الملک طبقے کو ریاست کی ضرورت تو ہوگی —— وہ ضرورت جب تک بھی باقی رہے —— مگر اس لئے نہیں کہ آزادی کے مفاد کا تحفظ ہو، بلکہ اس لئے کہ اس کے مخالفین کا خاتمہ ہو جائے۔ اور جب آزادی کے چرچے کا امکان پیدا ہو جائے گا، تو ریاست کی یہ موجودہ نوعیت مفقود ہو جائے گی۔"

ان اقتباسات کو دینے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ یہ مسئلہ کہ اشتمالی تحریک کس حد تک جمہوری تحریک ہے، کافی بحث طلب ہوگیا ہے جس کی طرف ہم آگے چل کر متوجہ ہوں گے، اس موقع پر اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ جہاں تک عبوری زمانے کا تعلق ہے، جمہوریت کو —— اس مفہوم میں جو بالعموم اس لفظ سے ادا ہوتا ہے —— نہ تو قابلِ عمل تصور کیا جاتا ہے اور نہ اُس کی پسندیدگی تسلیم کی جاتی ہے۔

۲۔ انقلابی زمانے کے بعد کی منزل | سرمایہ داروں کی سرکوبی کے سلسلے میں ریاست خود اپنے زوال کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے کہ جس حد تک وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوتی ہے اسی تناسب سے اس کا وجود تدفاضل ہوتا جاتا ہے۔ چونکہ اس کی بنا رتعمیر طبقاتی ہوتی ہے، اور اس کا مقصد طبقاتی مفادات کی توسیع و تبلیغ، اس لئے جب طبقاتی امتیاز کو مٹا چکتی ہے تو اسی کے ساتھ اس کا مقصدِ وجود بھی فوت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ریاست بقول لینن "پژمردہ" ہو جائے گی اور اس کی جگہ رضاکارانہ پنچایتوں سے مرکب ایک سماج لے لے گا جو امور عامہ کے

اہتمام والنصرام کے لئے قائم ہوں گی پہلی جماعت کا یہی وہ منتہائے نظر ہے جس کا آغاز اس بات کی دلیل ہوگا کہ اب انقلابی دور ختم ہوگیا ہے۔ اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے بھی اب یہ وہ جماعت ہوگی جس میں مکمل آزادی حاصل ہوگی، اور جس کے قیام کے لئے نراجی بھی جدوجہد کرتے ہیں۔

نظریہ اشتمالیت میں جدید رجحانات سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ مارکس کے نظریئے کے اُن پہلوؤں کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جن پر جدید اشتمالی زور دیتے ہیں اور جن کی اُنھوں نے تحقیق و تفسیر کی ہے۔ مارکس کی تصانیف میں ایک بالکل مختلف تاویل کی بھی گنجائش ہے اور اُس کی بنیاد پر ایک بالکل مختلف فلسفۂ طریق کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔ حال کے واقعات اور خصوصاً ۱۹۱۷ء کی روسی انقلاب سے جس کی بدولت اشتمالیت کی عملی حیثیت بھی نہایت اہم ہوگئی، اس کے نظری پہلو میں بہت سے نئے رجحانات پیدا ہوگئے ہیں اور یہ چیز قدرتی طور پر ہونی بھی تھی۔ یہ رجحانات اس شکل میں رونما نہیں ہوئے ہیں کہ مارکس کی تعلیم سے دست برداری کا اعلان کر دیا گیا ہو، بلکہ اس شکل میں کہ اس کے بعض پہلوؤں پر دوسرے عناصر کو قربان کر کے بے انتہا زور دیا جانے لگا ہے۔ روسی اشتمالیت نے مارکس کی تصانیف میں اس کی روح کو بدلے بغیر ایک ذرا تغیر کیا ہے۔ اس تغیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ حامئین اشتمالیت اِدھر جمہوریت کے مسئلے پر غیر معمولی زور دینے لگے ہیں، اس سے پہلے اُنھوں نے کبھی اس مسئلے پر اتنا زور نہیں دیا تھا۔ لینن کی بیشتر تصانیف اور خاص طور پر اُس کی وہ مشہور و معروف تصنیف جو کارل کاٹسکی[1] کے اعتراضات کے جواب میں ہے اس مسئلے کی تحلیل و تشریح کے لئے وقف ہے کہ اشتمالیت کس حد تک اور کس مفہوم میں جمہوری النوع ہے۔

---

[1] کاٹسکی نے ۱۹۱۹ء میں وائنا میں "مزدوروں کی آمریت" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا۔ اس کتابچے میں اس نے اشتمالیت کے ان اصولوں اور طریقوں پر نہایت سخت تنقید کی تھی جو روس میں عمل پیرا تھے۔ اس کی تنقیدوں کی بنیادِ استدلال یہ تھی کہ یہ اصول و طریق مارکس کے نظریئے سے مختلف اور غیر ہم آہنگ ہیں۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس مسئلے کو کس طرح اتنی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس غرض کے لئے ہمیں گذشتہ صدی کے نصفِ آخر پر نظر ڈالنی چاہیئے اور اشتمالی تحریک کی اُس عہد کی تاریخ کا سرسری مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اشتمالئین کی دوسری بین الاقوامی انجمن جو ۱۸۸۹ء میں قائم ہوئی تھی، وہ مسلک کے اعتبار سے خالصتہ مارکس کے اصولوں پر مبنی تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ طاقت اور جنگ جوئی کے لحاظ سے ان تمام جماعتوں کے مقابلے میں جنھوں نے مارکس کے اصول اختیار کئے، سب سے کمزور اور بودی تھی۔ یہ تو صحیح ہے کہ پہلی بین الاقوامی انجمن کے زمانے میں مزدوروں کی تنظیم کا جو معیار تھا اُس سے کہیں زیادہ اعلیٰ معیار اس (دوسری بین الاقوامی) مجلس کے دستور میں تجویز کیا گیا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری تیس سال اور بیسویں صدی کے پہلے بیس سال میں مزدوروں کی انجمنوں میں تعداد اور طاقت دونوں لحاظ سے زبردست اضافہ ہوگیا تھا۔

مگر تنظیم کے اضافے کے ساتھ ساتھ انقلابی روح میں پژمردگی پیدا ہوتی گئی۔ یہ زمانہ امن کا تھا۔ صنعت و حرفت میں زبردست وسعت، اور اشیاء دولت میں پہلے سے نسبتاً بہت زیادہ فراوانی ہوگئی تھی۔ اس خوشحالی اور امن کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کے لئے متعدد مراعات اس آسانی سے حاصل کر لی گئیں جن کی بدولت مارکس کی پیشین گوئیوں کے متعلق اس خیال کے قائم ہونے کا امکان ہو چلا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ ناامیدی کا نتیجہ ہیں۔ اور اب یہ امید کی جانے لگی تھی کہ جماعت اشتراکی نظام میں منتقل تو بلاشبہ بتدریج ہوگی مگر بامن طریق پر اور حلقہ ہائے انتخاب میں مزدوروں کی طاقت کے استعمال کے ذریعے سے۔ مگر یہ امیدیں فریب ثابت ہوئیں۔

جنگِ عظیم سے پہلے انجمنوں کی جو بغاوت ہوئی تھی، وہ بھی مارکس کے اصولوں کی جنگ جویانہ تعبیر پر مبنی تھی اور خود جنگِ عظیم نے دنیا کے سامنے انقلابی بین الاقوامی اشتراکیت کو ایک مرتبہ پھر ایک سرگرم اور ارتقا پذیر طاقت کی حیثیت سے پیش کیا۔ جنگ جویانہ مذہبِ اشتراکیت کو جنگِ عظیم سے مختلف پہلوؤں سے امداد ملی۔ مگر سب سے بڑی اور نمایاں امداد یہ ملی کہ اس نے انقلابی اور ارتقائی اشتراکیوں کے درمیان ایسی گانٹھ ڈال دی کہ اب اس امر میں بھی شبہ ہے

کہ اشتراکیت کے یہ بازو پھر کبھی ایک ہی تحریک کے دو مختلف حصے کہے جا سکیں گے یا نہیں۔ جنگ کی وجہ سے لوگ مجبور ہو گئے کہ دو باتوں میں سے ایک بات پسند کر لیں یعنی یا تو مزدوروں کے طبقے کے طرف دار بن جائیں یا پوری قوم سے رشتۂ اتحاد جوڑیں۔ پھر واقعات نے کچھ ایسا رنگ اختیار کیا کہ ان کے لئے ایک مرتبہ فیصلہ کرنے کے بعد پھر اُس پر نظرِ ثانی کرنا دشوار سے دشوار تر ہو گیا۔

جو لوگ قومی جوش کی رو میں بہہ گئے تھے، ملکوں کی قومی حکومتوں سے ان کے نہایت گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ اس کے خلاف اُن کا اشتراکی اصول اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ ان حکومتوں سے ترکِ تعلق ہی نہیں، ترکِ اعتماد کا بھی اظہار کریں۔ پھر تو ان لوگوں نے اپنے ملک کے مزدوروں کو اس مقصد کے لئے بھرتی ہونے پر آمادہ کرنا شروع کیا کہ دوسرے ملکوں کے مزدور موت کے گھاٹ اتارے جائیں، حالانکہ بین الاقوامی مجلس نے ان کو یہ سبق پڑھایا تھا کہ کہیں کے بھی مزدور ہوں، وہ انھیں اپنا بھائی سمجھیں۔ بہت سے اشتراکی تو اپنے ملک کی سرمایہ دار حکومتوں میں عہدوں پر مامور بھی تھے۔

جن لوگوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا، وہ بھی واقعات کے تقاضے سے پہلے گروہ سے بالکل مختلف سمت پر چلنے پر مجبور ہو گئے۔ قومی حکومتیں ان سے کہتی تھیں کہ اس جنگ کے زمانے میں قوم دوسروں کے گستاخانہ حملے کا شکار ہو رہی ہے اور خواہ اور کچھ نہ ہو، اس حیثیت سے سب کی نمائندہ ہے۔ سب کو مل کر اس کے تحفظ کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مگر یہ گروہ قوموں کی اس اپیل سے روگردانی کرتا تھا، جس کے خمیازے میں ان کو موت اور قید کی سزائیں بھگتنی پڑتی تھیں۔ اس طرزِ عمل سے تنگ آ کر اُنھوں نے سرے سے ریاست کے تخیّل ہی سے صاف صاف انکار کرنا شروع کر دیا۔ جنگ کے زمانے میں ایک شہری اپنی ریاست کے تحفظ کے لئے کوشش کرنے سے صرف اس بنا پر گریز کر سکتا ہے ـــــ اور اس کا یہ فعل منطقی حیثیت سے غلط نہیں ہو گا ـــــ کہ ریاست کے دعویٰ حاکمیت سے اُسے انکار ہے۔ یا کم سے کم یہ کہ اُس کی حاکمیت کی بہ نسبت وہ کسی دوسرے ادارے کی حاکمیت کو مقدم سمجھتا ہے۔ اور درحقیقت یہی راہ عمل تھی جسے انقلابی اشتراکیوں نے اختیار کیا۔

انھوں نے دیکھا کہ جنگ عظیم کی صورت میں مارکس کی پیشین گوئیوں کی تکمیل ہو رہی ہے، یہ دیکھ کر انھوں نے جنگ آزما مزدوروں کی تحریک سے اپنی وفاداری کے رشتے کا اعلان کیا، قومی نقطۂ نظر کے مطابق دنیا کی تقسیم سے انکار کیا، اور تیسری بین الاقوامی مجلس کی طرف تیزی سے رجوع کرنے لگے۔ یہ مجلس ۱۹۱۹ء میں مارکس کے ان فتحیاب پیرووں نے ماسکو میں قائم کی جنھیں ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب میں طاقت حاصل ہو چکی تھی۔ اس مجلس کے پروگرام میں سب سے اہم کام ایک جامع اعلان کی تصنیف واشاعت تھی جس میں انقلابی اشتمالیت کے اصولوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔ اس اعلان میں جو اصول بیان کئے گئے ہیں، وہ اپنی اصل کے اعتبار سے سب وہی ہیں جنھیں مارکس اور اینجلز نے قائم کئے تھے۔ اور جنھیں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ البتہ اس کا ایک نیا پہلو یہ ہے کہ جمہوریت کے معمولی تخیل اور جنگ جویانہ اشتمالیت کے درمیان جو بیّن فرق ہے، اُس پر اس اعلان میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

اشتمالیت اور جمہوریت | اس سوال پر غور کرتے وقت ہمیں اُن امتیازات کو ذہن میں رکھنا چاہیے جو سرمایہ دارانہ نظام جماعت عبوری دور کی انقلابی ریاست، اور اس انقلابی دور کے بعد اس کی جگہ لینے والے نظام جماعت کے درمیان قائم کئے گئے ہیں۔ سرمایہ دارانہ جماعتی نظام کے بارے میں اشتمالئین کا جو کچھ طرزِ عمل ہے، اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھیں موجودہ نوع کی جمہوریت سے بداعتمادی ہے، یا انھیں اکثریت کی حکومت کی طرف سے تنفر ہے بلکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ حالات میں جمہوریت کی نہ کوئی اصلیت ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ جب تک عوام کی اکثریت ملکیت سے محروم ہے، اُس وقت تک انفرادی آزادی کا چرچا کرنا اور یہ کہنا کہ اپنی جماعت کے نظام کا تعیّن انسان کے اپنے بس کی چیز ہے ایک مہمل سی بات ہے۔ ایک فرد جس کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ وہ اپنی محنت سب سے زیادہ بولی دینے والے کے ہاتھ بیچ دے آزادی کی نعمت سے محروم رہتا ہے، اس لئے کہ جس قسم کی وہ زندگی گذارنا چاہتا ہے، اُسے حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی موثر ذریعہ موجود نہیں ہے۔ جہاں تک حکومت کے ڈھچر کا تعلق ہے، حکومت خواہ شکل کے اعتبار سے کتنی ہی جمہوری النوع کیوں نہ ہو، جماعت میں اقتدار کی عنان، حکومت کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ

ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی جن کے پاس ذرائع دولت آفرینی پر قبضہ رکھنے کی بدولت اقتصادی طاقت موجود ہے۔

ایک عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اب مزدوروں کو تعلیم کا موقع دیا جارہا ہے یہ چیز بجائے اس کے کہ ان کو اُن کے آقاؤں کے مساوی درجے پر پہنچادے۔ معاملے کو اور زیادہ خراب کر دیتی ہے۔ مزدوروں کا نیم تعلیم یافتہ ہونا سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں اُن کی غلامی کی زنجیر کو اور مضبوط کر دے گا۔ نظامِ تعلیم، پریس اور پلیٹ فارم سب کے سب چونکہ سرمایہ داروں کے اثر و اقتدار میں ہوتے ہیں اس لئے وہ ان ذریعوں سے نیم تعلیم یافتہ مزدوروں کے دماغوں کو ماؤف کر دیں گے اور چونکہ ان کی تھوڑی بہت تعلیم ہو چکی ہوگی، اس لئے اُن کے دماغ سرمایہ داروں کے اثر و اقتدار کو بلد تر قبول کرلیں گے۔ لہٰذا جب تک تبلیغ و اشاعت کے تمام ذرائع دوسروں کے ہاتھ میں ہیں، مزدوروں کے پورے طبقے کو اپنا ہم خیال بنانے کی توقع بے معنی ہوگی۔ یہی صورتِ حال ایک عرصے تک جاری رہے گی پھر ایک وہ موقع آئے گا (جیسا جنگ کی وجہ سے روس میں آیا تھا) کہ طبقہ وارانہ شعور اتنا بڑھ جائے گا کہ حکمراں اقلیت یہ محسوس کرنے لگے گی کہ وہ کوئی کام اسی وقت کر سکتی ہے جب اکثریت اس کی تائید پر ہو۔ اور اشتمالئین ایسے ہی موقع کے انتظار میں ہیں کہ اس کے آتے ہی سرمایہ داری کے عہد کو ختم کر دیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس دوران میں سرمایہ دارانہ جمہوریت سے ...... ایسی جمہوریت جو جان بوجھ کر ایسے ہی تخیلات کی حامل ہوتی ہے جو سرمایہ داروں کے طبقے کے حسب حال ہوں۔ یہ توقع رکھنا کہ وہ سرمایہ داروں کے طبقے کے خاتمے کا ارادہ کرنے میں کامیاب ہوگی۔ سے نتیجہ ہوگا۔

جہاں تک عبوری منزل کا تعلق ہے، جس میں مزدوروں کے طبقے کی آمریت ہوگی، معاملہ کسی قدر مختلف ہے۔ یہ منزل صرف اس معنی میں جمہور النوع ہوگی اور اُسی وقت تک عمل پذیر رہے گی جب تک مزدوروں کا طبقہ اس کے وجود اور عمل پذیری کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ یہ اس معنی میں جمہوری النوع نہیں ہوگی کہ اُسے پوری آبادی کی مجموعی تائید حاصل ہے۔ ظالموں کی جمہوریت میں مظلوموں کے حقیقی ارادے کی جس قدر جھلک ہو سکتی ہے، مظلوموں کی جمہوریت

میں ظالموں کے حقیقی ارادے کی اس سے زیادہ جھلک نہیں ہو سکتی۔

غرض انقلابی دور سے پہلے صحیح جمہوریت کی عمل پیرائی مفقود ہے اور انقلابی دور میں اس کا ناقابلِ عمل ہونا مسلم ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف جنگ میں اشتمالئین ایک عالمگیر تائید کے امکان پر اتنا زیادہ بھروسہ نہیں کرتے جتنا چند افراد کی پختگیٔ ارادہ اور مجاہدانہ عزم پر رکھتے ہیں۔ یہ خیال بہت سی لوگوں کے نزدیک یاس انگیز اور تاریک ہوگا اور یہ تو واقعہ ہے کہ اشتمالئین بہت سے دوسرے اشتراکیوں سے اس عقیدے میں اختلاف رکھتے ہیں کہ سرمایہ داری کے خلاف جنگ ناگزیر ہے، اور یہ جنگ تشدد پر مبنی ہوگی اور طویل ہوگی۔ وہ بہرحال اس الزام سے انکار کرتے ہیں کہ ان کی پالیسی قطعی طور پر مایوسی کی پالیسی ہے۔ اس کے برعکس ان کا یہ خیال ہے کہ ایک ایسی دنیا میں جس کا دیوالہ نکل چکا ہے، اگر امید کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی انقلابی اشتراکیت۔ جب تک سرمایہ داری کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکا جائے، اس کی کوششیں دنیا کی تہذیب کو متزلزل کردیں گی۔ جب تک جماعت لے عنان سرمایہ داری کی تہ تک نہیں پہنچ جاتی، جنگ پر جنگ ہوتی رہے گی اور وبا اور قحط کا دور دورہ رہے گا۔ باامن اشتراکیت اور آزادی خواہ محرکات کی بدولت جو تھوڑا بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے، وہ ہر نئی جنگ کے ہاتھوں سوخت ہو جاتا ہے۔ خطرے کے لمحات میں ان کو نظر انداز کردیا جاتا ہے اور عریاں اور شرمناک قسم کی رجعت پسندی ان کی جگہ لے لیتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تہذیب جماعت کے سلسلۂ ارتقا میں اپنا کام پورا کرچکی بلکہ اپنی طبیعی عمر سے زیادہ حیات پا چکی ہے۔ اور اب اگر اس کی لعنتوں سے دنیا کو محفوظ رکھنا ہے، تو پھر اس کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ ایک مضبوط اور راسخ العزم انقلابی جماعت جو وقت آنے پر سرمایہ داری کو ختم کرنے کا پختہ ارادہ رکھتی ہو اور اس کی جگہ پر قائم کرنے کے لئے ایک مرتب و منظم نظام کا تصوّر۔

اشتراکیت کی فلسفیانہ بنیادوں پر ایک تنقیدی نگاہ

از محمد مظہر الدین صدیقی، بی۔ اے

تحریک اشتراکیت اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے غیر متوازی نظام سرمایہ داری کا ردعمل تھی۔ ابتدا میں اس کی حیثیت محض سلبی تھی یعنی اس کا دارومدار تمام تر ایک جذبہ مخالفت پر تھا اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ سرمایہ داری نظام کو بیخ وبن سے اُکھاڑ پھینکا جائے اور دنیا کو دولت مندوں کی حرص وآز اور سرمایہ داروں کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی جائے لیکن جیسا جیسا زمانہ گذرتا گیا اشتراکیت کی بنیادیں ٹھوس ہوتی گئیں اور اس کا اثباتی پہلو زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ پہلے یہ ایک خالص معاشی تحریک تھی مگر رفتہ رفتہ اس نے ایک ہمہ گیر تحریک کی شکل اختیار کرلی اور اس کا دائرۂ نظر زندگی کے غیر معاشی پہلوؤں پر بھی حاوی ہوگیا۔ اشتراکیت کی اس ہمہ گیریت کی اس شخص نے بنیاد رکھی وہ کارل مارکس تھا جس نے اس خالص معاشی تحریک کو اس کا مخصوص فلسفہ عطا کیا اور اس کو اُن مذاہب کے ہم پلہ بنا دیا جو زندگی کے ایک مخصوص نقطۂ نظر اور موجودات کے ایک خاص نظریے کے حامل ہیں۔

مارکس کے نظریات اور افکار میں جس چیز نے اشتراکیت کو دیرپا استحکام بخشا اور فکر و نظر کی دنیا میں اس کا مرتبہ بلند تر کردیا وہ اس کا مخصوص فلسفۂ تاریخ تھا۔ اس مضمون میں ہم زیادہ تر اسی نظریۂ تاریخ سے بحث کریں گے۔ کیونکہ یہی نظریہ اشتراکیت کی حقیقی فلسفیانہ بنیاد ہے۔ یہ نظریہ جسے تاریخ کی مادی تعبیر سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو اشتراکی تحریک کے لئے بمنزلہ روح کے ہے، مختصراً یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں جتنے عظیم الشان انقلابات واقع ہوئے ہیں اور قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں جس قدر تغیرات رونما ہوئے ہیں ان سب کا حقیقی سبب ذرائع پیداوار کی تبدیلیاں اور معاشی زندگی کے ناگزیر تقاضے تھے۔

کارل مارکس کے نزدیک انسانی تاریخ کے انقلابات اور سماجی زندگی کے تغیرات کے پس پشت کسی قسم کے اخلاقی تصورات کارفرما نہ تھے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی اعمال کے محرکات میں معاشی محرک ہی فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے اور دوسرے تمام محرکات اسی کے تابع ہیں۔ مارکس کے نظریے کی رو سے اخلاقی یا نکوکاری کا کوئی ابدی اور کلی معیار نہیں ہے۔ حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ اخلاق کا مفہوم بھی بدلتا رہتا ہے۔ لیکن چونکہ حالات کی تبدیلی کا باعث دراصل معاشی زندگی کے تقاضے ہوتے ہیں۔ اس لئے بطور نتیجہ اخلاقی تصورات بھی حقیقت میں معاشی حالات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں جن اخلاقی نظریات و افکار نے انسانی سیرت و کردار کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ وہ حقیقتاً اس معاشی تنظیم کا معلول و نتیجہ تھے جس پر اس دور کی سماجی زندگی کی بنیاد قائم تھی۔

ہم یہاں اس نظریے کے ان نتائج و اثرات سے بحث نہیں کریں گے جو فی الجملہ وہ انسان کی اخلاقی زندگی پر پیدا کرتا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم علمی معیار سے اس کی صداقت پر غور کریں۔

مارکس کے نظریے سے جیسا کہ اوپر اس کی تشریح کی گئی ہے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انسانی زندگی میں اور تمام محرکات عمل کو ضمنی یا طبعی قرار دیتا ہے اور معاشی مفاد کے تخیل کو انسان کے تمام اعمال کا مرکز و محور قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک محرکات عمل میں غالب محرک یہی تخیل ہے اور جب کبھی دوسرے محرکات الگ الگ یا مل کر اس کے مقابل یا حریف ہوتے ہیں تو بالآخر فتح معاشی محرک ہی کو ہوتی ہے اس لئے مارکس کے خیال میں تہذیب و تمدن کے تمام مظاہر حکومت و سیاست کی جملہ اشکال اور انسانی روابط و تعلقات کی گوناگوں صورتوں کی تہ میں ہمیشہ سے معاشی اسباب کارفرما ہیں اور انھی اسباب کی تبدیلی سے زندگی کے تمام مظاہر بدلتے رہتے ہیں۔

ہم بے شک اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں تک انسان کی ابتدائی ضروریات

کا جن کے بغیر بقائے حیات ناممکن ہو تعلق ہے۔ انسانی اعمال معاشی اسباب کے معلول ہوتے ہیں اور معاشی مفاد کا تخیل ہی اس کے افعال و کردار کا محور ہوتا ہے۔ لیکن کیا اس دائرے سے متجاوز ہونے کے بعد بھی یہی محرک انسانی اعمال کو متعین کرتا ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ تہذیب و تمدن کے جملہ مظاہر اسی وقت عالم وجود میں آتے ہیں جب کہ انسان کی ادنیٰ ترین ضروریات تکمیل پا چکتی ہیں۔ کیونکہ تہذیب و تمدن نام ہے حیاتِ برتر کا اور حیات برتر کا تخیل ہی اس وقت تک وجود پذیر نہیں ہو سکتا ہے جب تک حیاتِ محض کے قیام و بقا کی ضمانت نہ موجود ہو۔ لیکن کیا ادنیٰ ترین ضروریات کی سطح سے بلند ہونے کے بعد بھی یہ محرک ویسا ہی قوی رہتا ہے یا اور محرکات عمل اس کی جگہ لے لیتے ہیں؟ اس کو شخصی زندگی کی ایک مثال سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے زید ایک انسان ہے جو اس سطح پر زندگی بسر کر رہا ہے جہاں ادنیٰ ترین ضروریات کی بھی تکمیل نہیں ہو سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر اس کو ایک وقت کی روٹی بھی بمشکل میسر آتی ہے۔ بکر اور عمر بھی اسی حالت میں مبتلا ہیں اور قوتِ لایموت کے محتاج ہیں۔ کیا یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس حالت میں جو سب کے لئے یکساں ہے ان سب کا عمل بھی یکساں ہوگا؟ اس کی کیا ضمانت ہے کہ اگر زید اس حالت سے مجبور ہو کر چوری کرنے پر آمادہ ہو جائے تو عمر اور بکر بھی اسی جرم کے مرتکب ہوں گے۔ یہ بھی فرض کر لیجئے کہ عمر، بکر اور زید تینوں کی جسمانی حالت یکساں ہے اور جہاں تک جسم و ذہن کا تعلق ہے اِن تینوں کی قوت برداشت مساوی ہے۔ اس تمام یکسانی کے بعد بھی ممکن ہے کہ زید کے مقابلے میں عمر اس حالت کے برداشت کرنے میں زیادہ مستقل مزاج ثابت ہو اور چندے اس مصیبت پر صبر کر لیا جائے بجائے اس کے کہ وہ ایک ایسے فعل کا ارتکاب کرے جس کو وہ بُرا خیال کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں جو چیز اس کو ارتکابِ جرم سے باز رکھتی اور صبر و استقامت پر آمادہ کرتی ہے وہ کسی فائدے کا تصور یا کسی ہونے والے نفع کی توقع نہیں ہے۔ ممکن ہے اس حالت پر عمر زیادہ مدت تک صبر نہ کر سکے اور بالآخر زید کی طرح چوری کرنے پر آمادہ ہو جائے برخلاف

اس کے برعکس جن کی جسمانی حالت عمر اور زید سے کسی طرح بہتر نہیں ہے آخری لمحۂ زندگی تک اس فعل شنیع کے ارتکاب پر آمادہ نہ ہو اور اپنی جان دے دینا گوارا کرے۔

اب ان تینوں کے کردار کے اختلاف کی توجیہہ کیوں کر کی جا سکتی ہے؟ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ مثال زیر بحث زندگی کے عام حالات سے کسی طرح الگ نہیں ہے روز مرہ کی زندگی میں ایسی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں۔ پھر اس کی توجیہہ کیوں کر کی جا سکتی ہے کہ تین اشخاص نے جن کی جسمی حالت یکساں تھی یکساں حالات میں مختلف طرز عمل اختیار کیا۔ معاشی محرکات ان کے طرز عمل کی تشریح کے لئے بالکل ناکافی ہیں۔ کیا بالآخر ہمیں تسلیم نہیں کرنا پڑتا ہے کہ مثال زیر بحث میں اخلاقی تصورات ہی کا اختلاف زید، عمر اور بکر کے کردار پر موثر ہوا اور وہی نتائج کے اس عظیم الشان فرق کا باعث ہوا؟ اس سے تو اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ ادنیٰ ترین ضروریات کی سطح پر بھی اعمال و کردار پر جو چیز فیصلہ کن طریقے پر موثر ہوتی ہے وہ حس اخلاقی ہے نہ کہ معاشی زندگی کے ناگزیر تقاضے۔ اسی مثال میں اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیں کہ زید، عمر اور بکر کو اس صبر آزما حالت سے نجات مل جائے اور ان کے لئے ایسے اسباب و وسائل مہیا کر دئے جائیں کہ اُن کی زندگی کی معمولی ضروریات پوری ہو جائیں تو پھر کیا ان کی روش اور کردار میں نمایاں فرق نہ پیدا ہو جائے گا؟ ممکن ہے کہ زید معمولی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے سامان فراہم ہو چکنے کے بعد بھی قانع نہ ہو بلکہ زیادہ سے زیادہ آسائش اور بہتر سے بہتر ساز و سامان کا طالب ہو۔ درآں حالیکہ عمر اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہے اور اس کے بعد اس کی سعی و طلب کا مرکز ثقل بدل جاتا ہے اور اب وہ اپنے خاندان اور اپنے عیال کے لئے سامان زندگی کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ بکر ان دونوں سے الگ اب صرف ملک و قوم کی خدمت گذاری میں مصروف ہے اور اسی جذبے میں زندگی کی تمام راحتیں اور ذہن و قلب کی تمام مسرتیں حاصل کر لیتا ہے تو کیا ان تینوں کے کردار کا محرک اب بھی معاشی مفاد کا تخیل ہے؟ اس کو تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس قسم کی مثالیں عام طور پر ہمیں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب ان تینوں

اشخاص کے اعمال و روش پر معاشی زاویہ نگاہ نہیں بلکہ اخلاقی تصورات اثر انداز ہو رہے ہیں پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کی اس سطح پر جہاں زندگی کی معمولی ضروریات کی تکمیل کا سامان مہیا ہو معاشی زاویہ نگاہ ویسے ہی قوی اثرات رکھتا ہے جیسے کہ اس حالت میں جبکہ انسان اپنی ادنیٰ ترین ضروریات بھی پوری نہ کر سکتا ہو پھر چونکہ تہذیب و تمدن کا تعلق اسی سطح زندگی سے ہے جہاں انسان کی اول ترین ضروریات پوری ہو چکی ہوں تو یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ معاشی محرک ہی بالآخر تمام محرکات پر غالب آتا ہے یا یہ کہ یہی محرک انسانی اعمال کا سرچشمہ ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہر بڑا آدمی اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے حالات سے کم و بیش ضرور متاثر ہوتا ہے۔ مارکس اس عہدِ ظلمت کی پیداوار تھا جب سرمایہ داری کا نظام اپنے تمام مظالم و مفاسد کے ساتھ مغربی دنیا پر مسلط ہو چکا تھا اور مغربی اقوام خالص مادہ پرستانہ زاویہ نگاہ سے ہر شے کی قدر و قیمت متعین کرنے لگی تھیں۔ زندگی کے ہر پہلو پر معاشی مفاد کا خیال غالب تھا اور معاشی محرک کے علاوہ اور کسی محرک کی گرفت افعال انسانی پر اتنی مضبوط نہ تھی۔ ایسی فضا اور ماحول میں آنکھ کھولنے کا اثر یہ ہوا کہ مارکس نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے حالات کو ایک قائم و دائم چیز خیال کر لیا اور ان حالات کے پیدا کردہ معیاروں اور قدروں کو دائمی اور ابدی متصور کیا۔

کیا تاریخی حیثیت سے یہ صحیح ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے انقلابات اور تاریخ کے اہم واقعات معاشی اسباب کے معلول تھے؟ کیا یونان کے تہذیب و تمدن، روما کی سطوت و جبروت اور پھر عیسائیت کے عروج و ارتقا میں یہی ایک محرک کارفرما تھا؟ حالانکہ یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ عیسائیت کی ساری کامیابی کا راز یہ تھا کہ اس نے انسان کے غیر معاشی اور خالص اخلاقی محرکاتِ عمل کو ابھارا اور اپنا پیغام نفسِ بشری کی ان گہرائیوں تک پہنچایا جہاں معاشی مفاد کے خیال کا گذر نہ تھا اگر انسان واقعی ایک معاشی جانور ہوتا

تو عیسائیت کی اخلاقی فتوحات اور سیاسی کامیابیاں کبھی معرض ظہور میں نہ آسکتیں۔ کیونکہ عیسائیت نے سب سے پہلے معاشی مفاد کے خیال کو تزکیۂ نفس کی سند قرار دیا بلکہ اس نے تو معاشی زاویہ نگاہ رکھنے والے اشخاص پر اپنی جنت کے دروازے ہی بند کر دیئے۔

کیا قوموں کے عروج تہذیب کے فروغ اور جماعتی زندگی کے ارتقاء میں شخصی عزائم کی کوئی قوت، قومی بلند حوصلگی کا کوئی منظر اور اجتماعی مقاصد اور اخلاقی تصوّرات کا کوئی جلوہ ہمیں نظر نہیں آتا ہے۔ جس کی بنا پر اس امر سے انکار کیا جا سکے کہ ان سب کے عقب میں ذرائع پیداوار کی تبدیلیاں اور معاشی محرکات کی قوت ہی کارفرما تھی؟ آخر وہ کیا معاشی محرکات تھے جنھوں نے چھٹی صدی عیسوی میں صحرائے عرب میں وہ عظیم الشان انقلاب برپا کیا جس نے ہمیشہ کے لئے انسانی افکار و اعمال کا رُخ بدل دیا؟ ممکن ہے اس کا جواب یہ دیا جائے کہ یہ سب گذرے ہوئے واقعات ہیں لیکن اب موجودہ متمدّن دنیا میں معاشی اسباب ہی حالات و واقعات کا رُخ متعین کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان حالات و اسباب کو دائمی کس بنا پر متصور کر لیا گیا؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ موجودہ دور زندگی ایک عبوری دور ہے جس میں معاشی محرکات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے؟ کیا اس کے باور کرنے کے کافی وجوہ نہیں ہیں کہ انسانی معاملات میں یہ دُکان دارانہ ذہنیت اور انسانی روابط کی یہ تجارتی بنیادیں غرضیکہ زندگی پر معاشی زاویہ نگاہ کا تسلّط بہت عرصے تک باقی رہنے والا نہیں ہے؟ انسانی معاملات کی یہ شکل جو صنعتی انقلاب کے بعد سے شروع ہوئی ہے اس درجہ ناپائدار، اتنی ناقص اور پر از مفاسد ہے کہ ابھی دو سو سال کا عرصہ بھی نہیں گذرا ہے اور تہذیب و تمدّن کا یہ سر بفلک ایوان متزلزل نظر آرہا ہے جو لوگ اس کے نقش و نگار، اس کی ظاہری آب و تاب سے مرعوب ہو گئے ہیں وہ تو بیشک اس کو پائدار اور مستحکم خیال کرتے ہیں لیکن جن لوگوں کی نگاہ بنیاد پر ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کے انہدام کا وقت قریب ہے۔

کارل مارکس کے نظریہ تاریخ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالئے تو ایک امر اور قابل غور نظر آتا ہے۔ انسانی زندگی کے واقعات کا سبب معلوم کرتے ہیں مارکس نے شخصی اثرات اور افراد کی اہمیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ غیر شخصی اثرات اور ان میں بھی صرف معاشی ضروریات کو واقعات کی اصل وجہ قرار دینا اور افراد کے ارادوں اور مقاصد کو ماضی حال اور مستقبل کی تعمیر میں بے اثر سمجھنا درحقیقت اس عقیدے پر ایمان رکھنے کے مترادف ہے کہ انسان کا جماعتی ارتقار اندھی قوتوں کی کش مکش کا نتیجہ ہے جو بلا کسی مقصد و غایت کے انسانی زندگی کو بناتی یا بگاڑتی رہتی ہیں۔ درحقیقت یہ زندگی کے متعلق وہی نقطۂ نظر ہے جس کو ڈارون نے اس کامیابی کے ساتھ مغربی فلسفۂ حیات کی اساس و بنیاد بنا دیا ہے۔ یہ کائنات کا وہی تصوّر ہے جس میں ارتقار حیات کو کسی مقصد کا پابند نہیں قرار دیا جاتا ہے اور اس میں کسی ذی فہم ارادہ کی کارفرمائی تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ زندگی کے بڑے بڑے انقلابات اور تاریخ کے فیصلہ کن واقعات اس وقت صورت پذیر نہیں ہوتے ہیں جب تک کوئی بڑی شخصیت ان واقعات کے لئے وسیلہ یا واسطہ کا کام نہ انجام دے؟ کیا تاریخی واقعات میں شخصی اسباب کا کھوج لگانا بے سود ہے؟ کارلائل اور اس کے ہم خیال تو فوراً یہ جواب دیں گے کہ تاریخ کی تعبیر صرف بڑی بڑی شخصیتوں کی زندگی ہی سے ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اس حد تک کارلائل کے ہم خیال نہیں ہیں ان کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شخصی اثرات کو بالکل نظر انداز کر دینے کے بعد تاریخی واقعات کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ بڑے بڑے رہنماؤں، فاتحوں، فلسفیوں اور مفکّروں نے اکثر اوقات واقعات و حالات کی رفتار پر فیصلہ کن اثرات چھوڑے ہیں؟ کیا ہمارا گرد و پیش ہمارا ماحول اور ہمارے تمام علوم و فنون جن پر ہمارے تمدن کا دارومدار ہے، یہ سب اسی حالت اور اسی شکل میں آج موجود ہوتے اگر تاریخ کے اسٹیج پر سقراط و فلاطون، سکندر و دارا، رومی و غزالی اور لوتھر اور مارکس جیسے اشخاص ظاہر نہ ہوتے؟

پھر ان لوگوں نے اور ان کی جیسی بے شمار ہستیوں نے اقوام و ملل کی زندگی پر جو دیرپا اور امِٹ اثرات چھوڑے ہیں کیا ان میں شخصی حوصلوں اور تمناؤں، ذاتی خیالات و افکار کا کوئی دخل نہ تھا؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ شخصی اسباب بھی واقعات کا رُخ متعین کرنے میں اور زندگی کو ارتقاء کی راہوں پر لگانے میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ پھر چونکہ معاشی اسباب، غیر شخصی اسباب کا ایک جزو ہیں اس لئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ واقعات و حالات کی آفرینش میں معاشی اسباب اور ضروریات بہت تھوڑا حصّہ رکھتے ہیں حالانکہ مارکس نے انھی کو مرکزی حیثیت دی ہے۔

اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ ارتقارِ حیات میں شخصی اثرات کو بھی وہی اہمیت حاصل ہے جو غیر شخصی اثرات کو ہے، اور قوموں اور جماعتوں کی قسمت کے فیصلے کرنے میں اعلیٰ شخصیتوں اور بلند مرتبہ انسانوں کو بھی اتنا ہی دخل ہے جتنا معاشی زندگی کے ناگزیر تقاضوں کو، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِن بڑی بڑی شخصیتوں کے اعمال کے کیا محرکات تھے؟ مارکس کے نظریے کے مطابق تو ان کے حرکت و عمل کو ہیجان میں لانے والی شے کے پیچھے معاشی ضروریات کا دباؤ اور معاشی مفاد کا تخیل ہونا چاہئے لیکن اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان غیر معمولی ہستیوں میں جنھوں نے انسانی زندگی کے بہاؤ کو ایک جانب سے دوسری جانب پھیر دیا اگر کوئی چیز مشترکہ نظر آتی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب معاشی محرک کے اثر سے آزاد تھے اور یہی ان کی عظمت اور ان کے غیر معمولی اثر کا راز تھا کہ انھوں نے خود اپنی انفرادی زندگی میں معاشی مفاد کو اپنے افعال کا محور نہیں بنایا بلکہ اُن کی ساری زندگیاں اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ ہمیشہ غیر معاشی محرکاتِ عمل سے متاثر ہوئے اور معاشی مفاد کے تخیل کو اپنی راہ میں نہ آنے دیا۔ انھوں نے اسی محرک کو سب سے زیادہ پس پشت ڈالا اور اس چیز کو سب سے زیادہ حقیر سمجھا جو مارکس کے خیال میں انسان کے تمام اعمال کا محور و مرکز ہے۔ کیا اُن کی عظمت اور اثر آفرینی، ان کی بزرگی اور برتری، ایک لمحہ کے لئے بھی قائم رہتی

اگر وہ معاشی مفاد کو ہر وقت پیش نظر رکھتے؟ کیا مہاتما بدھ، سقراط، گلیلیو، لینن، ٹالسٹائی اور خود مارکس کے اعمال کا محرک وہی معاشی زندگی کے ناگزیر تقاضے تھے جو مارکس کے نزدیک انسانی افعال و کردار کی بنیادی اساس ہیں؟

کیا ان لوگوں نے زندگی بھر معاشی مفاد کو نہیں ٹھکرایا اور دولت و ثروت کی آرزوؤں اور عیش و راحت کی تمناؤں سے منہ نہیں موڑا، حالانکہ مارکس کے نظریے کی رو سے یہی چیزیں تمام انقلابات و تغیرات کا اصل سبب اور تمام اعمال کی حقیقی وجہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے کسی شخص کو مجالِ انکار نہیں ہو سکتی ہے کہ شخصی عظمت اور اس کی اثر فرمائیاں معاشی مفاد کے تخیل کے ساتھ نہیں جمع ہو سکتی ہیں۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ان بلند شخصیتوں کی عظمت و برتری اور ان کی اثر آفرینی اس میں مضمر تھی کہ بالآخر اُن کی قربانیوں نے ان کی جماعت یا قوم کی خوش حالی میں اضافہ کیا اور اس کی معاشی زندگی کو بہتر بنایا تو یہ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہوگا کہ غیر معاشی محرکات ہی بالآخر معاشی فلاح اور مادی خوش حالی کا موجب ہوتے ہیں۔

پھر اگر یہ مان لیا جائے اور متذکرہ بالا دلائل کے بعد اس کا ماننا ناگزیر ہو جاتا ہے تو مارکس کا پورا فلسفہ بالکل بے بنیاد اور اس کے قائم کردہ اصول بالکل شکست ہو جاتے ہیں۔ اگر غیر معاشی محرکات جو مسلمہ طور سے تاریخ کی بڑی بڑی شخصیتوں کے اعمال کا سبب تھے اپنے آخری اور بعید نتائج کے لحاظ سے مادی خوش حالی اور معاشی فراوانی پیدا کر سکتے ہیں تو پھر اشتراکیت اور سرمایہ داری کی آویزش کو فوراً ختم ہو جانا چاہیئے جب کہ اس لحاظ سے دونوں کوئی حقیقی بنیاد نہیں رکھتی ہیں۔ کیونکہ دونوں میں معاشی محرکات ہی کو اعمال و افکار کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے اور دونوں یکساں طور سے معاشی محرک ہی کو اپیل کرتے ہیں۔ پھر جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے اگر غیر معاشی محرکات معاشرتی فلاح اور جماعتی خوش حالی پیدا کرنے میں زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں تو زندگی کے وہ تمام نظامات جو اشتراکیت کی طرح معاشی مفاد پر مبنی ہیں اور معاشی مفاد ہی کو اپنے فلسفے کا سنگِ بنیاد قرار

قرار دیتے ہیں اپنے مقصد کے لحاظ سے بالکل ناکام ہیں اور اپنے اندر ایک ایسا گہرا منطقی تضاد رکھتے ہیں جو کسی صاحب فہم کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا ہے۔

ترکی پر ایک نظر

موجودہ جنگ میں ترکی کا معاملہ بڑا اہم اور سخت نازک ہے، برطانیہ اور فرانس چاہتے ہیں کہ وہ ان دونوں کا فعّال حلیف بنے، روس اور جرمنی اُسے اپنی طرف کھینچتے ہیں، ملک کی جغرافی حیثیت کچھ ایسی ہے کہ وہ دونوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ اپنے بچاؤ کے لئے اسے ایک نہ ایک فریق کا کچھ نہ کچھ ساتھ دینا ہوگا۔ ترکوں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ وہ اس جنگ کی آگ سے اپنا دامن بچالیں، نئی ترکی کو امن کی بہت سخت ضرورت ہے۔ ان کی قومی اور انفرادی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جہاں اس وقت تعمیر اور ترمیم کا کام زوروں پر نہ ہو رہا ہو۔ دوسری طرف پچھلے دنوں زلزلے کی تباہ کاریوں نے ملک کے بہت بڑے حصّہ کو برباد کر دیا ہے۔ ترکوں کو لڑائی سے الگ رہنا چاہیئے، لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں، اُن کو کسی سے کوئی بیر نہیں، وہ دولت عثمانیہ کے وسیع رقبوں سے اپنی مرضی سے ہاتھ کھینچ چکے، انھیں اپنی رہی سہی پونجی پر قناعت ہے اور اس کو ٹھیک کرنا اور مفید بنانا ان کی سیاست کا سب سے بڑا مقصد ہے، لیکن ارد گرد کے حالات میں ان کا کیا قابو!

ترکی جمہوریت سے پہلے دولت عثمانیہ پر چاروں طرف سے دشمنوں کا نرغہ رہتا تھا۔ مصطفےٰ کمال نے ترکی ملّت کی کمزوری کے خیال سے جھگڑے کی جتنی چیزیں تھیں ان سب کو الگ کر دیا۔ نئی ترکی کی خارجی سیاست کا اصلِ اصول امن دوستی رہا ہے، اُنھوں نے ۱۹۲۲ء سے اب تک "جنگ جو" حکومتوں کے مقابلہ میں "امن دوست" سلطنتوں کا ساتھ دیا، لیکن اب دنیا کا نقشہ کچھ اس طرح بدلا ہے اور حریفوں اور حلیفوں کی نئی ٹولیاں اس قسم کی بنی ہیں کہ ترکی کو اپنے لئے نئی راہ بنانی ضروری ہوگی۔

فرانس اور برطانیہ کو دولتِ عثمانیہ سے پرخاش رہا کرتی تھی، ترکی جمہوریت نے عربی ملکوں کو اُن کے حوالے کرکے ان سے اپنی جان چھڑائی۔ بلقان کی عیسائی ریاستیں ترکوں کو اپنا دشمن سمجھتی

تھیں، مصطفےٰ کمال نے تمام نزاعی مسائل کو اس خوش اسلوبی سے طے کیا کہ ترکی کی شمولیت میں بلقانی اتحاد قائم ہو گیا، یونان سے ترکی جمہوریت کی بے شک سخت جنگ ہوئی تھی لیکن یونانیوں کی شکست کے بعد فاتح ترکوں نے پرانے کینوں کو دل میں جگہ نہیں دی، اور سیاسی مصلحتیں جذبات پر غالب آئیں، ترکی اور یونان میں نہ صرف سمجھوتہ ہوا بلکہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ ہٹلر سے پہلے جرمنی اپنے خانگی مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ ترکوں کو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، اس لئے ملک کے تعمیری کاموں میں انھوں نے جرمنوں سے کھلے دل سے مدد لی۔ البتہ مسولینی سے ترکوں کا دل صاف نہ تھا، اور حبش پر قبضے کے بعد تو ترکوں کو اٹلی سے خطرہ ہونے لگا۔

جرمنی میں ہٹلر کے برسرِ اقتدار آتے ہی بین الاقوامی سیاست کا توازن بگڑ گیا، آسٹریا، زیکوسلاویکیہ کے بعد نازی سیلاب ظاہر ہے بلقان کی طرف رخ کرتا۔ مسولینی اقتدار کے لئے عرصہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا، اسی زمانہ میں اس نے آگے بڑھ کر البانیہ کو دبا لیا، اب ان دونوں کی زد ترکی پر پڑتی تھی، دوسری طرف روس بھی نازی خطرہ سے مطمئن نہ تھا، اور برطانیہ اور فرانس الگ پریشان تھے، ان حالات میں برطانیہ فرانس اور روس کا امن پسند محاذ بنانے کی سعی کرنا ایک فطری تقاضہ تھا، اور ترکوں کا اس محاذ میں شامل ہونا لازم روس اور ترکی کی دشمنی صدیوں سے چلی آتی ہے، حسن اتفاق تھا کہ روس میں اشتراکی انقلاب کامیاب ہو گیا، زار کے ساتھ روسی، برطانی اور فرانسیسی اتحاد اور آپس کا سمجھوتہ بھی رخصت ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں ترکوں نے ہار مان لی، برطانی اور فرانسیسی فوجیں آبنائے باسفورس پر قابض ہو گئیں، اور اشتراکی روس کو اپنی جان بچانی مشکل نظر آنے لگی، آبنائے باسفورس ترکوں کے پاس رہتی تو روس ادھر سے مامون تو تھا لیکن ان پر یورپ کی دو زبردست سلطنتوں کا قابض ہو جانا جو اشتراکی روس کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتی تھیں خود روس کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن گیا، ان اسباب کا یہ نتیجہ تھا کہ اشتراکی روس اور کمالی ترکی آپس میں ایک دوسرے سے قریب آ گئے، اور صدیوں کی دشمنی اور کشت و خون کے بعد ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء میں ماسکو کے مقام پر دونوں کا دوستانہ معاہدہ ہوا،

روس کی مدد ہی سے ترک آسانی سے یونانیوں کو اپنے ملک سے نکال سکے اور اسی وجہ سے

برطانی اور فرانسیسی فوجیں اور جنگی بیڑے آبنائے باسفورس سے لوٹ جانے پر مجبور ہوئیں اور روس ہی نے سب سے پہلے انگورہ کی کمالی حکومت کو تسلیم کیا، اشتراکی روس کا خیال تھا کہ ان باتوں سے ترک روس کے اثر میں کلیتہً آ جائیں گے اور اس طرح سے آبنائے باسفورس پر براہ راست نہیں تو بالواسطہ روس کا اقتدار قائم ہو سکے گا، لیکن ۱۹۲۳ء میں جب لوزان میں صلح کی گفتگو ہوئی تو ترکوں نے روس کی مرضی کے خلاف اور اس سے پوچھے بغیر یورپی سلطنتوں کے ساتھ آبنائے باسفورس کے متعلق باہم سمجھوتہ کر لیا، روس نے اس کے خلاف احتجاج کیا لیکن ترکوں نے ایک نہ سنی، کچھ عرصہ تک آپس میں شکر رنجی رہی لیکن آخر روس نے اس سمجھوتہ پر بادل نخواستہ مہر تصدیق ثبت ہی کر دی، موصل کے مسئلہ پر ترکوں اور برطانیہ میں اَن بَن ہوئی اور جمعیت الاقوام کے فیصلہ کے مطابق دسمبر ۱۹۲۵ء سے ترک یورپی سلطنتوں سے بددل سے ہو گئے، تو روس اور ترکی نے پھر آپس میں سر جوڑ نا مناسب سمجھا، اور دونوں حکومتوں کی خارجی سیاست باہمی مشورے سے طے پانے لگی، اور باہر کی دنیا کو یقین آ گیا کہ روس اور ترکی دونوں حلیف اور ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں۔

گذشتہ سال اگست کے مہینے میں سیاسی دنیا میں بھونچال سا آ گیا، اشتراکی روس اور ان کے پرانے دشمن نازی جرمنی میں سمجھوتہ ہو گیا۔ اس پر زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ ہٹلر کی فوجیں پولینڈ پر سیلاب کی طرح پھیل گئیں، روس نے موقع پا کر چپکے سے پولینڈ کے ایک حصہ کو دبا لیا، اور بالٹکی ریاستوں کے وزیروں کو ماسکو بلا بھیجا کہ روس کے مطالبہ کو مانو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، ترکی کے وزیر خارجہ بھی ماسکو پہنچے، نئے حالات پر بحث ہوئی اور آخر ان کو روس کے مطالبوں کو رد کرنا پڑا، اور اس کے خلاف برطانیہ اور فرانس سے عہد و پیمان ہو گئے، اب ترکی آہستہ آہستہ روس سے دور کھنچ رہی ہے اور برطانیہ اور فرانس سے تعلقات استوار ہو رہے ہیں، ابھی پچھلے دنوں برطانی وزیر اعظم نے دار العوام میں یہ بیان دیا ہے کہ اگر ترکی پر حملہ ہوا تو اتحادی اس کی مدد کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ترکی اور روس کا یہ اختلاف بظاہر ہوا سا بن گیا ہے۔ لیکن یہ اختلاف کسی فوری حادثہ کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی تہ میں مستقل محرکات اور اسباب کام کر رہے ہیں، ترکی کا انقلاب روس کے اشتراکی انقلاب

سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا، کمال انقلابیوں کا قبلہ مقصود ماسکو نہیں بلکہ پیرس تھا، وہ اپنے ہاں اشتراکی نظام بنانے کے کبھی بھی روادار نہیں تھے، وہ شروع ہی سے اپنے لئے یورپی طرز کی جمہوریت اور یورپی رنگ کا کلچر منتخب کر چکے تھے، اور اس کی آب یاری یورپی فلسفہ زندگی اور یورپ ہی کے افکار سے کرنے کے داعی تھے، سیاسی حالات سے مجبور ہو کر وہ اشتراکی روس کے دوست بنے تھے، اور اشتراکی روس بھی یورپی سلطنتوں کے خوف سے ترکوں کا شریک تھا، سیاسی ہمرنگی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دو تین قوتیں باہم شیر و شکر ہو گئیں غلط تھا، دونوں نے ایک دوسرے کا نقطۂ نظر خوب سمجھ لیا تھا اور دونوں سیاسی مصلحتوں کے تقاضے سے واقف تھے، چنانچہ آپس کی دوستی کے باوجود ترکی میں اشتراکیت کا پرچار قانوناً جرم ہی رہا، اور اشتراکی خواہ وہ روس کا باشندہ ہو یا ترکی کا، ملکی قانون اسے ملزم گردانتا رہا۔ ترکی نے اپنے پنج سالہ پروگرام کے سلسلہ میں روس سے بڑی مدد لی، اپنے ہاں سے کاریگر اور انجنیر روس بھیجے، اور زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ترکی کے سابق وزیر اعظم اور موجودہ صدر جمہوریت ماسکو گئے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اشتراکی افکار اور روسی تمدن ترکی قانون میں زیر گرفت رہا۔

ترکی اور روس کی آپس میں اتنی دوستی اور پھر اتنی بدگمانی! اس کو سمجھنے کے لئے دونوں قوموں کی پچھلی تاریخ اور جغرافی محل وقوع کو پیش نظر رکھنا چاہیئے، ماسکو کے تخت پر کٹر عیسائی زار نہ ہوا بے دین سٹالین ہو گیا لیکن ملک کی ضرورتیں تو بدلا نہیں جایا کرتیں، اور اقتدار کا جذبہ تو فنا نہیں ہوا کرتا، روس اور ترکی کی تو یہ مثال ہے کہ گھر تو ایک شخص کے قبضہ میں ہو، اور دروازے پر کسی دوسرے کا پہرہ ہو، گھر کے مالک اور پہرہ دار کی صرف اس وقت تک نبھ سکتی ہے کہ دونوں کو کسی تیسرے مشترکہ دشمن کا خوف دامن گیر رہے، سٹالین، ہٹلر اور مسولینی کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کی روک تھام کے لئے ترکی کو ہر قسم کی مدد دے سکتا ہے لیکن اگر وہ ان دونوں سے محفوظ ہو جائے تو پھر وہ ترکی کو آبنائے باسفورس کا واحد مالک دیکھنا کیسے گوارا کر سکتا ہے، روس بحیرہ اسود میں بند رہنے کے لئے تیار نہیں وہ بحیرہ روم تک پہنچنے کی گزرگاہ پر اپنا اقتدار چاہتا ہے، ادھر فرانس اور برطانیہ روس کی اس پیش قدمی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے، اور ترکی کو اپنا ساتھی بنانے پر مصر ہیں، تاکہ روس کو آبنائے باسفورس سے ادھر ہی رکھا جائے کہ کہیں روسی ریچھ

کے پنجے بحیرہ روم کو بھی اپنی پیٹ میں نہ لے لیں۔

ترکی کی حالت بہت نازک ہے، روس سے بگاڑتا ہے تو اسے اپنی خیر نظر نہیں آتی خشکی اور تری دونوں طرف سے اس پر روسی حملہ ہو سکتا ہے، اگر روس کی مان کر برطانیہ اور فرانس سے رشتہ نہ جوڑے تو ان دو زبردست سلطنتوں کا بحری بیڑہ اور فوجیں دوسری طرف سے چڑھ دوڑیں گی، بہر حال وہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں گرفتار ہے، روس کا مطالبہ یہ ہے کہ آبنائے باسفورس میں ہمارے جہازوں کو تو گزرنے کی اجازت ہو لیکن برطانیہ اور فرانس کے جہاز اِدھر نہ آسکیں، اس طرح سے روس باطمینان خاطر رومانیا کو نگل سکتا ہے، اور کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

اب تک تو ترکی نے روس پر برطانیہ اور فرانس ہی کو ترجیح دی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ دونوں کی جنگی کارروائیوں سے اپنے آپ کو بالکل بے تعلق رکھنے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ اس حکمت سے ایک طرف تو اُسے تمام اسلامی اور عربی ممالک کی ہمدردی حاصل ہو گئی، اور دوسرے وہ روس کی پیشقدمی سے بھی ایک حد تک محفوظ ہو گیا ہے، لیکن اگر روس اور جرمنی نے مل کر بلقان کا رخ کیا تو پھر ترکی کا جنگ سے بچنا مشکل ہو جائیگا، اور اسے اس آگ میں کودنا ہی پڑے گا۔ اور شاید اسی لئے برطانیہ اور فرانس مصر اور شام میں بے شمار فوجیں جمع کر رہے ہیں تاکہ بوقت ضرورت روس کے خلاف فوری کارروائی کی جا سکے۔

ترکی اور برطانیہ اور فرانس میں تو جنگ کا کوئی امکان نہیں، ترکی کو خدشہ اگر ہے تو روس کی طرف سے ہے، اور اس سلسلہ میں افواہوں کا بھی بڑا زور ہے۔ کبھی ایران کی طرف سے حملہ کی خبر پھیلتی ہے، اور کبھی کاکیشیا، اور بلغاریہ کی سمت سے، بہر حال یہ یاد رہے کہ روس کے لئے ترکی پر حملہ کرنا آسان نہیں، برطانیہ اور فرانس اس کی مدد کو فوراً پہنچ جائیں گے، کیونکہ ترکی کی فوری مدد پر ان دونوں کی سلامتی ہے۔

"س"

غزل

(جناب رگھوپتی سہائے صاحب فراقؔ)

مبارک ہو دُکھتے دلوں کو ستانا | تمھاری جوانی تمھارا زمانا

محبت تو کرتی ہے دنیا زمانا | محبت کو تو نے نہ جانا نہ مانا

بدلتا ہے جس طرح پہلو زمانا | یونہی بھول جانا یونہی یاد آنا

لگا کر کہیں آگ سی بھول جانا | شرارت شرارت بہانا بہانا

ہر اک کا سہارا ہر اک کا ٹھکانا | ترا آستانا، ترا آستانا

عجب صحبتیں ہیں محبت زدوں کی | نہ بیگانہ کوئی، نہ کوئی یگانا

فسوں پھونک رکھا ہے ایسا کسی نے | بدلتا چلا جا رہا ہے زمانا

اُدھر خود نما حُسن رشکِ قیامت | اِدھر چھپ ر بن کر دلوں میں سمانا

تبسم بھی شبنم سے ہو نرم جس کا | قیامت ہے اس آنکھ کا ڈبڈبانا

یہ کر کے بھی تو عشق ناشاد سا ہے | کرم یاد رکھنا ستم بھول جانا

کئی بجلیاں بے گرے گر پڑی ہیں | اُن آنکھوں کو اب آگیا مُسکرانا

وہ پنہاں خلش کون تھی جس کی خاطر | عدم کو پڑا نازِ ہستی اُٹھانا

جوانی کی راتیں محبت کی باتیں | کہانی کہانی. فسانا فسانا

وہی تم وہی ہم وہی درد لیکن | محبت محبت! زمانا زمانا

ترے گم شدوں کو وہ منزل ملی ہے | نہ چلنا نہ پھرنا نہ آنا نہ جانا

بنا جا رہا ہے، ہوا جا رہا ہے — خوشی کا زمانہ بھی غم کا زمانا
حقیقت بھی تجھ پر کبھی کھل رہے گی — تجھے خیر آ جائے دھوکا ہی کھانا
سب چلے جا رہے ہیں چلے جانے والے — نہ کوئی سہارا نہ کوئی ٹھکانا
یہ دردِ نہاں کیا، یہ عشقِ بتاں کیا — محبت کا دھوکا نظر کا بہانا
الم کیا خوشی کیا کہ دیکھا ہے ہم نے — الم کا ہنسانا، خوشی کا رلانا
غنیمت ہے اے عشق تھوڑے دنوں تک — یہ ہنسنا ہنسانا یہ رونا رلانا
یہ کہہ کر میں کرتا ہوں عرضِ تمنا — نگاہِ محبت سے دھوکے نہ کھانا
بدلنے کا تیرے پتہ دے رہا ہے — تجھے آج پا کر تری یاد آنا
غمِ ہجر سہتا ہوں اور سوچتا ہوں — تری مہربانی ہے تیرا نہ آنا
اِسی دل کی قسمت میں تنہائیاں تھیں — کبھی جس نے اپنا پرایا نہ جانا

فراق آن نگاہوں کو رسوا کریگا
یہ انگڑائی پر آج انگڑائی آنا

مارچ کے رسالہ جامعہ میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ براہِ مہربانی انھیں درست کر لیجئے۔

صفحہ	سطر			
صفحہ ۲۳۳	سطر ۲	جامع الجبثیق	بجائے	جامع الحقیقتین
″ ۲۳۵	″ ۱۴ و ۱۵	شاعری)	″	شاعر و ماہیت بجائے ہیئت
″ ۲۳۷	″ ۱	اساطین	″	اساتین
″ ۲۳۸	″ ۱	بساطِ ہوائے دل	″	ہوائے بساطِ دل
″	″ ۱۱	تجرید	″	تجدید
نام مضمون نگار (احساسِ کمتری)		تسیر محمد اختر صاحب	″	سیّد محمد اختر صاحب

بین الاقوامی سیاست

فرق صرف اتنا ہے

نیا افق؟
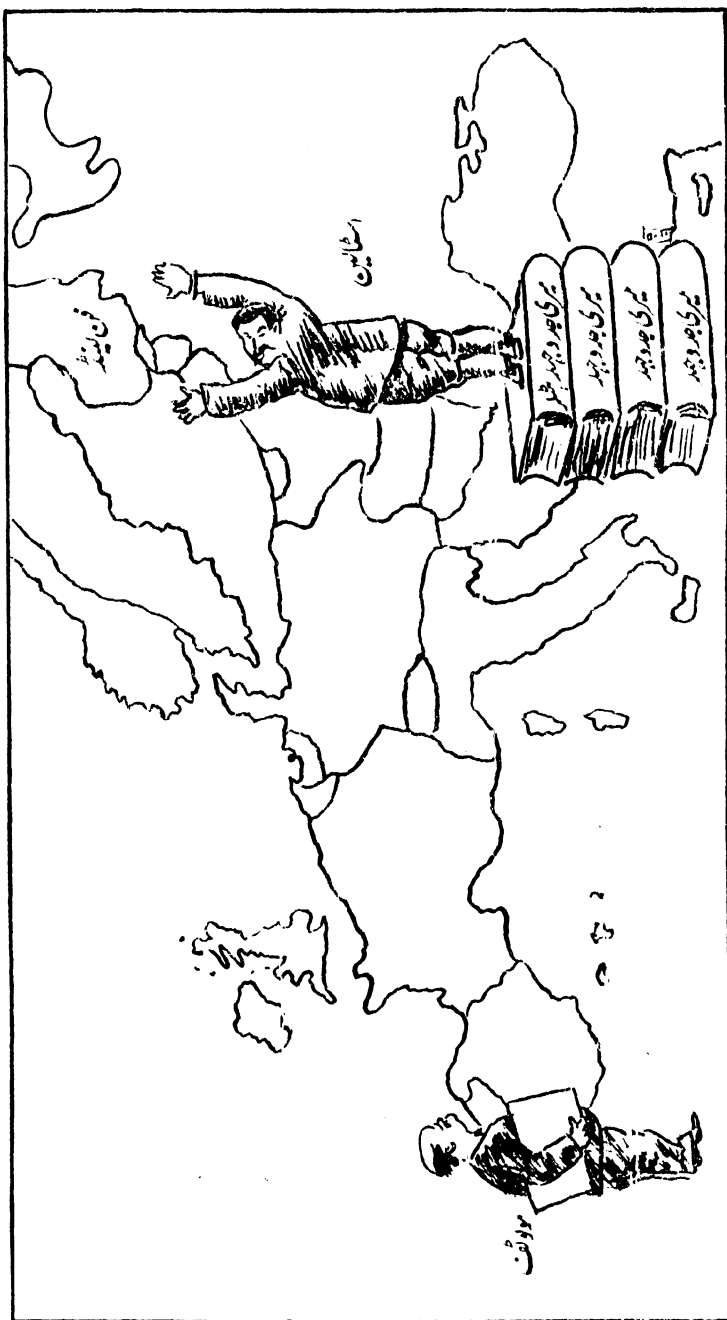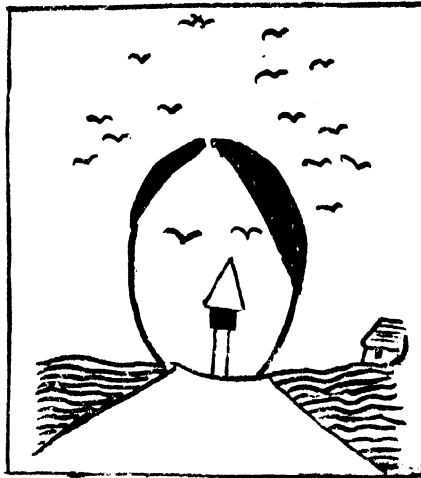
دنیائے ادب

نئی کتابیں | انگریزی :- دنیا کبھی ایک سی نہیں رہتی۔ جو کل تھی وہ آج نہیں اور جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگی انھیں نت نئی تبدیلیوں کا نام زندگی ہے۔ روز نئی تبدیلیاں ہوتی ہیں، دنیا اپنے آپ کو ان تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرتی رہتی ہے۔ اور جتنی جلدی یہ ہم آہنگی ظہور میں آتی ہے، اتنی ہی تیزی سے دُنیا نئی تبدیلیوں کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی آگے کو چلتی رہتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کی چلت پھرت بند ہو جائے، زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کی تعلیم میں مشرق میں اقبالؔ اور مغرب میں ایچ۔ جی ولز سے زیادہ کسی اور نے نہیں کی۔

ولز کی قریب قریب ساری تصانیف کی روح یہی ایک خیال ہے۔ اپنی تاریخی، اجتماعی اور ادبی سب کتابوں میں ولز نے اسی خیال کی تبلیغ کی ہے۔ اُس کے ناول ہمیں بتاتے ہیں کہ سائنس کی جدید ترقی اور مشینوں کے پھیلے ہوئے جال نے ہماری اجتماعی زندگی میں کتنی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اس سے ہماری اخلاقی قدروں میں کیسا انقلاب پیدا ہو گیا ہے، ہمارے طرزِ تخیل نے کیا انداز اختیار کر لیا ہے اُس کی تاریخی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ انسان نے کس طرح ترقی کرتے کرتے تہذیب کی لاتعداد منزلیں طے کر کے موجودہ حیثیت اختیار کی ہے۔ یہی خیالات ہیں جن کی بنا پر اپنی ہر تصنیف میں اشارتًا، کنایتًا اور کبھی کبھی صاف صاف لفظوں میں ولز نے اس بات پر زور دیا ہے کہ نئی ضرورتوں کے پیشِ نظر ہمیں برابر اپنی اجتماعی اور سماجی زندگی کے نظام میں باقاعدگی اور تنظیم پیدا کرنی چاہیئے۔

ولز کی ان متعدد تصانیف کی تازہ ترین کڑی اُس کی کتاب "دنیا کا نیا نظام" ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ سے ولز نے دنیا کے ہر حصے کو ایک عالمگیر اور پُرامن نظام کی تحت میں لانے کی تجویز پیش کی ہے ولز کا خیال ہے کہ دنیا اب ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی ہے، جہاں اُس میں ایک زبردست انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ تبدیلی ظہور میں نہ آئی تو انسان کی پُرامن زندگی ایک زبردست خطرے میں

پڑجائے گی۔ انسان کو فطرت کی طرف سے کچھ حقوق ملے ہیں، حکومت کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اِن حقوق کی حفاظت کرے۔ موجودہ حکومتوں کی پالیسی انسان کے ان فطری حقوق کو پامال کر رہی ہے۔ اس لئے ولز کے نزدیک ایسے شدید انقلاب کی ضرورت ہے جو حکومتوں کے موجودہ انفرادی طریقوں کو بدل کر دُنیا میں ایک متحدہ نظام پیدا کر سکے۔ ولز کی سمجھ میں خود نہیں آیا کہ یہ نظام کیا ہوگا، اور یہ نظام جس قسم کے انقلاب کا نتیجہ ہوگا، اُس کی نوعیت کیا ہوگی۔ اسی لئے اُنھوں نے اس خیال کو ایک بحث کی شکل دے دی ہے۔ دد دنیا کے تمام مفکرین کو دعوت دی ہے کہ وہ اس بحث میں شریک ہوکر اپنے مشورے دیں۔ اور سب مل کر کوئی ایسا نظام مرتب کریں جس سے انسان کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ دُنیا اب سے زیادہ پُرامن اور پُرسکون بن جائے۔ اور نسل انسانی جس خونریزی، تباہی اور بربادی کا شکار ہو رہی ہے اُس سے بچ سکے۔

وِلز کی اس بحث میں اب تک یورپ کے بہت سے مفکرین نے حصہ لیا ہے جس میں برنارڈ شا جارج لینس بری، جے۔ بی۔ پرلیٹلی، پروفیسر ہالڈین وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان مفکّرین نے ولز کی پیش کی ہوئی تجویزوں کو جس نظر سے دیکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن میں بہت زیادہ ترمیموں کی گنجائش ہے اور اس کے بعد بھی یہ یقین نہیں کہ یہ بحث کوئی مفید عملی پہلو اختیار کر سکے۔

گجراتی:۔ (۱) بھارت نو تنکر (ہندوستان کی آواز)

اے۔ ایف۔ خبردار گجراتی زبان کے بہت مشہور شاعر ہیں اور آن کا شمار ہندوستان کے بہت اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب آپ کی قومی نظموں کا مجموعہ ہے، پہلا اڈیشن یورپ کی لڑائی سے کچھ پہلے شائع ہوا تھا اب دوسرا اڈیشن چھپا ہے۔ نظموں میں شاعر نے قربانی اور ایثار کی تعلیم دی ہے اور کہا ہے کہ ہمیں مادرِ وطن کے قدموں پر اپنا تن، من، دھن سب کچھ تج دینا چاہئے آزادی کی فضا کے موجودہ دور میں اس طرح کی نظمیں ملک اور قوم کے لئے بے حد مفید ہیں۔ اگر اس قسم کی نظموں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی شائع ہو سکے تو یہ ایک بڑی قومی خدمت ہو۔

(۲) جیون آنند، گجراتی کے مشہور مصنف شری کالیلکر کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ موصوف

گجراتی زبان کے سنجیدہ اور شگفتہ لکھنے والے ہیں۔ انھیں زبان پر فنّی قدرت حاصل ہے۔ اور اس لئے ہر قسم کے مضامین کو دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس کی خوشیوں میں ڈوب کر لکھتے ہیں اور دوسروں کو اس کی لذتوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا کی جمالیاتی دلکشیوں کا احساس حد سے زیادہ ہے، چاہتے ہیں دوسرے بھی سرورِ سرمدی سے محروم نہ رہیں۔

ہماری زبان میں اس طرح کے مضامین لکھنے کا رواج کچھ تو شروع ہی سے بہت کم تھا اور اب تو بالکل ہی نہیں رہا۔ اس لئے ایسے ادارے جو اردو کے خزانے نئے موتیوں سے بھرنا چاہتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ایسی کتابوں کے ترجمے اردو میں کرائیں۔

کناری:۔ ہتو ورشا، کناری زبان کے مشہور مصنّف شری اجی۔ پی راجارتنام کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ راجارتنام کو کرناٹک والے اپنی زبان کا عمر خیّام سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ یہ مصنّف کے تمام ادبی کارناموں کے بہت اچھے پس منظر کا کام دے سکتی ہے۔ ہمارے ادب نے بہت زیادہ ترقی کرلی ہے پھر بھی اس میں اب تک خود نوشتہ سوانح عمریوں کا رواج نہیں ہوا۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارے مشاہیر اہلِ قلم حالات نویسی کی ذمہ داری دوسروں پر چھوڑنے کے بجائے اسے اپنے سر لیں۔ اور سوانح نگاری میں اکثر اوقات جو نقوش بے آب و رنگ رہ جاتے ہیں انھیں خود ابھارنے کی کوشش کریں۔

مالایالم:۔ ڈاکٹر جانسن کا ناول ریسلاز (RASSELAS) انگریزی ادب میں بعض لحاظ سے بہت مشہور کتاب ہے اس کا ترجمہ اب سے کوئی ایک سال پہلے مالایالم کے مشہور مصنّف ٹی۔ کنارن نے کیا تھا۔ اب وہی کتاب دوبارہ نئی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

دوسری خبریں | ڈاکٹر مادھو سٹریک پٹ وردھن مرہٹی زبان کے بہت بڑے شاعر اور ادیب تھے۔ ان کا انتقال ۲۹ نومبر ۱۹۳۹ء کو پونا میں ہوگیا۔ مہاراشٹر کے لوگ عام طور پر ایسے ادیب کی قبل از وقت موت کا جتنا ماتم کریں تھوڑا ہے۔ لیکن وہ تمام ادبی حلقے جن میں علوم مشرقی کا چرچا ہے ایسے ادیب کی موت کو ملک اور قوم کا بڑا نقصان خیال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر پٹ وردھن ۱۸۹۳ء میں بڑودہ میں پیدا ہوئے اور تعلیم حاصل کرنے بعد ۱۹۱۶ء میں ان کا تقرر فرگسن کالج میں انگریزی اور فارسی کے پروفیسری پر ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں راجارام کالج، کولھاپور میں ملازمت کرلی اور آخر تک وہیں رہے۔

ڈاکٹر پٹ وردھن نے اپنی شاعری کے ذریعہ سب سے پہلے مرہٹی میں فارسی کی بحریں داخل کیں اور مرہٹی کو فارسی کے تخیل سے روشناس کرایا۔ پٹ وردھن کے متعلق نقادوں کا خیال ہے کہ بعض حیثیتوں سے ان کی شاعری کا تخیل کالیداس سے بھی بلند ہے۔ پٹ وردھن نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ مرہٹی نظم میں کیا ہے۔

پٹ وردھن کا ایک اور بڑا علمی کارنامہ انکی فارسی، عربی، مرہٹی ڈکشنری ہے، جو دیوناگری رسم الخط میں چھپ چکی ہے۔ لیکن ان کا ادبی شاہکار حقیقت میں ان کی وہ شاعری ہے جو انھوں نے مرہٹی زبان میں کی ہے۔ اور یہ ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی اگر پٹ وردھن کی شاعری کو کوئی صاحب ذوق اردو میں منتقل کر سکے۔

تامل اور تلگو زبانوں کا نام سن کر اب تک بھی ہمارا تصور کسی ایسی زبان کی طرف جاتا ہے جس نے ابھی اپنے گہوارہ سے بھی پاؤں نہیں نکالے، چہ جائے کہ اس کا ادبی تصور۔ لیکن تامل اور تلگو میں جس قسم کی کتابیں شائع ہوتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کے ادب نے بھی اچھی خاصی ادبی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ تامل میں ابھی حال ہی میں بنکم چندر چٹرجی کے ناول رادھارانی کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اور تلگو میں بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ۔

جنگ کی وجہ سے کتابوں کے بازار بھی کافی متاثر ہوئے۔ انگریزی میں ۱۹۳۸ء میں جتنی کتابیں شائع ہوئی تھیں، ۱۹۳۹ء میں ان سے ۱۳۱۵ کتابیں کم شائع ہوئیں۔ پھر بھی صرف ناول جو شائع شدہ کتابوں کے ۲۸ فی صدی ہیں، ۲۲۲۴ شائع ہوئے۔ سیاسی کتابیں پچھلے سال ۸۰۳ چھپی تھیں۔ اور اس سال ۷۰۴، اس کے علاوہ باقی ہر قسم کی کتابوں کا بازار سرد رہا۔ (و ـ ع)

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تاریخ اسلام (حصہ اوّل): مرتبہ شاہ معین الدین صاحب ندوی دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ قیمت سے ر

ابھی حال میں دارالمصنفین نے "ایک مکمل اور مفصل تاریخ اسلام" کی تالیف کا کام شروع کیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ تاریخ اسلام کا یہ پورا سلسلہ دس بارہ حصوں میں پورا اور مسلمانوں کی علمی و عملی تاریخ کا ذریعہ ہوگا"۔

زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، اس کے مصنف دارالمصنفین کے قابل اور مشہور رفیق جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی ہیں۔ کتاب کے سرورق پر لکھا ہے کہ یہ آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ ہے۔

کتاب کا دیباچہ قبلہ سید سلیمان صاحب ندوی نے لکھا ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے صاحب موصوف فرماتے ہیں، کہ

> "یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اس قسم کی کتابیں یورپ کی زبانوں میں تو موجود ہوں مگر خود آٹھ کرور مسلمانوں کی زبان میں نہ ہوں، گو اس قسم کی تاریخ اس لحاظ سے نہایت آسان ہے کہ کسی عربی، فارسی پرانی تاریخ کا ترجمہ کر دیا جائے۔ مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ زمانہ کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ مذاق نو کا تقاضہ کچھ اور ہے، تمدنی اور علمی حالات جو اُس زمانہ میں بہت کم لکھے جاتے تھے، اب اُن کے بغیر کسی دور کی تاریخ، تاریخ نہیں کہی جا سکتی"۔

سید صاحب سے زیادہ نئے زمانے کے تقاضوں سے کون واقف ہو سکتا ہے۔ مغربی طرز کی تعلیم گاہوں کے فارغ التحصیل مسلمان، نوجوان بادشاہوں کے افسانوں اور دل خوش کرنے والے قصوں سے جسے عرف عام میں مسلمان تاریخ کہتے چلے آئے ہیں دل برداشتہ ہو چکے ہیں۔ روایات کے

انبار میں سے اپنے مطلب کی باتیں نکال لینا اور پھر ان کو جاذبِ نظر عنوانوں کے تحت ترتیب دے کر کتاب لکھ ڈالنا ممکن ہے عقیدت مند حلقوں کے لئے باعث تسکین ہو لیکن نوجوان جن کے ہاتھ میں کل قوم کی زمام قیادت ہوگی ان "علمی کاوشوں" سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔

جنگ عظیم کے بعد تو ذہنی ہیجان اور فکری اضطراب اور بھی بڑھ گیا ہے اور اشتراکی خیالات کا چرچا کچھ اس رغبت سے ہندوستان کے نوجوانوں میں ہو رہا ہے کہ ڈر یہ ہے اگر مسلمان اہل قلم اپنے عہد ماضی کی داستانیں اس اندھی عقیدت کے نشہ میں سرمست ہو کر لکھتے چلے گئے تو ہماری تاریخ کا وہ حصہ جو واقعی زندہ جاوید ہے اور انسانیت کے لئے رہتی دنیا تک باعث فخر ہے، وہ بھی نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اور خدانخواستہ اسلام کے کارنامے جو سرتاسر سلاطین اسلام کے کارنامے ہو کر رہ گئے ہیں، قومی تاریخ سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے۔

سید صاحب قبلہ اس نازک صورت حال کا احساس رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس دیباچہ میں آپ لکھتے ہیں

> "پھر ہندوستان میں مسلمان جس راستہ پر چل رہے ہیں اور محفل کا رنگ جس طرح بدل رہا ہے۔ اسے دیکھ کر یہ امید بھی نہیں ہوتی کہ آئندہ مسلمان قوم اپنی تاریخ کو پڑھ کر اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرے گی، بہر حال جن کے دلوں میں احساس ہے وہ اس کے لئے بے تاب ہیں کہ مسلمانوں کے سامنے اُن کی تاریخ کا ایک ایسا آئینہ رکھ دیا جائے جس میں ان کے چہرے کا ہر خد و خال نمایاں ہو جائے"۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ بے راہ روی محض سیاسی نہیں بلکہ اس کی تہ میں جو اصل سبب کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کا سارا دار و مدار مذہب پر ہے۔ اپنی ہر ضرورت میں جو انھیں پیش آتی ہے وہ مذہب کی سند کے متقاضی رہتے ہیں۔ اگر وہ مذہب کو سمجھتے تو یہ بے حد مفید تھا۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ انھیں مذہب سے عقیدت ضرور ہے لیکن اس کی اصل روح کو سمجھنے سے وہ کوسوں دور ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ مذہبی روایات سے کہیں اشتراکیت ثابت ہو رہی ہے اور کہیں بادشاہت، کہیں کانگریس میں شرکت کا جواز ثابت ہوتا ہے اور کہیں لیگ میں شمولیت کا فرض عین ہونا۔ جب

تک ہم اپنے مذہب کو صحیح طور پر سمجھ کر اس کے حقیقی اصولوں اور اس کی اصل روح کو اپنی زندگی کی موجودہ کشمکش میں مشعل راہ نہ بنائیں گے ہماری سیاسی گمراہی اور جماعتی پراگندگی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔

ضرورت تھی کہ ہم اپنی تیرہ سو سال کی تاریخ کی مدد سے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور دیکھتے کہ عروج و زوال اور اقبال و نکبت کے اُس اتار چڑھاؤ میں کہاں تک مذہبی اصولوں سے دوری اور ان کے اتباع کا دخل ہے تاریخ نگاری کا یہ مذاق ہے جو ہر نوع کے انسانوں کو خواہ وہ "مغرب زدہ" ہی کیوں نہ ہوں مطمئن کر سکتا ہے، ورنہ اگر "اہل بصیرت علماء" کے نزدیک "مغرب زدگی" قابل گردن زدنی ہے، تو "مشرق زدگی" بھی کچھ کم جرم نہیں ہے۔ اور اس "مشرق زدگی" کی سزا زمانہ کے ہاتھوں جو مل چکی ہے وہ اب بھی مل رہی ہے ذرا سی سمجھ رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔

اگر تاریخ اسلام اُس ڈھنگ سے لکھی جاتی رہی جس کی شکایت خود قبلہ سید صاحب کو ہے اور جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ ایسی کتابوں کی اردو زبان میں کمی نہیں ہے تو ظاہر ہے اس آئینہ میں "اسلام کے چہرہ کے خد و خال" جو اُجاگر ہوں گے وہ عشق پیشگی کے مدعیوں کو تو حسین نظر آئیں گے لیکن قدرے عقل و خرد سے کام لینے والوں کو ان سے نعوذ باللہ تسلی نہ ہوگی۔

زیر نظر کتاب میں تاریخ اسلام پر دوسری کتابوں کے مقابلہ میں ہمیں کوئی خاص امتیاز نظر نہیں آیا۔ یہ بھی اسی طرز کی کتاب ہے جو اس سے پہلے اردو میں بہت کافی لکھی گئی ہیں، زمانہ کے بدلے ہوئے رنگ کا اس میں کہیں بھی خیال نہیں رکھا گیا، اور نہ مذاق نو کے تقاضوں کو کہیں بار پانے کی اجازت ملی ہے۔ روایات کے انبار میں سے مصنف کو جو اپنے مطلب کی بات ملی ہے وہ زبان قلم سے کہدی ہے اور بس۔ روایات میں درایت کا کیا کام، اور اگر درایت مقصود بھی ہو تو بڑی بڑی کتابوں کے حوالوں سے اس تشنگی کی تسکین ہو جاتی ہے۔ اور پڑھنے والا اتنے بڑے بڑے ناموں کے سامنے ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اور اگرچہ قائل نہ ہو لیکن مرعوب ضرور ہو جاتا ہے۔

رونا تو یہ ہے، کہ یورپ والے اسلام کی تاریخ پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہ پہلے ہی سے مسلمانوں کو اچھے رجحانات سے معرّا قرار دے لیتے ہیں اور پھر ہر واقعے کی تشریح انسانی خود غرضی اور ہوس رانی

کی نظر سے کرتے ہیں، اس طرح ان کی تاریخ عقل و منطق کی پیاس تو ضرور بجھا دیتی ہے لیکن اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اور پڑھنے والوں کی نظر میں اسلام اور مسلمانوں کی وقعت گر جاتی ہے، دوسری طرف ہمارے "اسلاف پرستوں" کا گروہ ہے کہ وہ روایات کے دفتر تو ضرور کھنگال ڈالتے ہیں لیکن بیس روایات میں جس روایت کو ترجیح دیتے ہیں اس میں کبھی اس امر کی کوشش نہیں کرتے کہ ہمیں یہ بتائیں کہ اس وقت کے معاشی، سیاسی اور جماعتی ماحول میں باقی انیس راویتوں کا جاننا خلاف عقل اور مہمل ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کبھی یہ بدر کی جنگ کو دفاعی ثابت کرتے ہیں اور جب ضرورت پڑتی ہے تو اس کو جارحانہ قرار دے لیتے ہیں۔ اگر تاریخ نویسی کا یہی حال رہا اور ہمارے ارباب بصیرت علما بھی اس لکیر کو پیٹتے رہے تو وہ یقین رکھیں کہ ان کا یہ شک کہ "آئندہ مسلمان قوم اپنی تاریخ کو پڑھ کر اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش نہ کرے" ٹھیک ثابت ہو کر رہے گا۔

مصنف سے دوسری شکایت ہمیں یہ ہے کہ کتاب کی زبان تاریخ کی زبان نہیں، جن یورپ میں لکھی ہوئی کتابوں کے مقابلے میں یہ کتاب پیش کی گئی ہے اگر ان کے طرز بیان اور ترتیب واقعات کو مطالعہ کرنے کی زحمت کیجائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ نوجوان کیوں "مغرب زدگی" کا شکار ہو رہے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا کی حالت کو بیان کرنے میں جس انشا پردازی کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ ایک ادیب کا شاہکار ہو سکتا ہے لیکن تاریخ کے ٹھوس حقائق کا خواہشمند کسی اور چیز کا طالب ہے۔ وہ یہ جاننا ہے کہ اسے بتایا جائے کہ ایران اور روم کی سلطنتیں کیوں اسلام کی ٹکر سے چشم زدن میں زیر و زبر ہو گئیں، ان کا جماعتی نظام، ان کے دینی عقائد، ان کی قومی عصبیتیں کیوں اس سیلاب میں بہہ گئیں، اسی طرح اسلام سے قبل عرب کی حالت، اسلام کا ظہور، رسول اکرم صلعم کی سیرت کے واقعات، ارتداد کے اسباب اور پھر حضرت عمرؓ کے بعد خانہ جنگیوں کا زور، اور خلافت راشدہ کا صرف ایک مختصر عرصہ تک قائم رہنا، اِن کے ذکر میں طبعی حالات کے اثرات کو یک قلم نظر انداز کر دیا ہے، کہیں کہیں مصنف سے تاریخی واقعات کے ذکر میں بھی فرد گزاشتیں ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی پہلی کتابوں کے انداز میں جو ظاہر ہے صرف روایتی حیثیت

رکھتی ہیں یہ نئی کتاب لکھی ہے جو تاریخی ہے اور مذاق نو کی تشنگی دور کرنے کی مدعی۔

دارالمصنفین کے علمی کارناموں سے کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ اس ادارہ نے اسلام اور اس کے علوم کے متعلق جو ذخیرۂ معلومات اب تک صرف عربی میں تھا اس سے ہماری زبان کو مالا مال کر دیا ہے۔ اور اب عربی نہ پڑھا ہوا مسلمان بھی اپنے مذہب اور اس کے علوم کے بارے میں پوری معلومات اردو سے حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اب یہ ادارہ نئے میدان میں قدم رکھ رہا ہے اور مذاق نو کی خود ہی تشخیص کرتا ہے اور خود ہی اس کا علاج پیش کرتا ہے۔ ہم نیاز مندوں کی صرف یہ عرض ہے کہ نہ تو مذاق نو کی یہ تشخیص صحیح ہے، اور نہ اس کا علاج ہی ٹھیک ہے، اس کا جواب اگر ہمیں یہ دیا جائے کہ یہ "تفریح" ہے اور "مغرب زدگی" تو ہم عرض کریں گے کہ ہماری نظر میں "تشرق" اور "مشرق زدگی" بھی قابل تعریف نہیں، اور ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ "للہ المشرق والمغرب"

مصنف نے حضرت عثمان اور حضرت علی کے دور کی خانہ جنگیوں کو بیان کرتے ہوئے بعض ایسی روایات بھی نقل کی ہیں جن میں بعد میں ہونے والے واقعات کی پیشین گوئیاں ہیں جو رسول اللہ صلعم نے کی تھیں، مصنف لکھنے کو تو لکھ گئے لیکن اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے سوچتے کہ ان پیشینگوئیوں سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں تو شاید جس طرح انھوں نے معجزات اور کرامات کی روایتوں کو اس کتاب میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی وہ ان کو بھی مرفوع القلم قرار دیتے "علم غیب" کا حصہ اگر "کتب مناقب" تک رہے تو زیادہ حرج نہیں لیکن تاریخ کی کتابوں میں جو مذاق نو کا لحاظ رکھتے ہوئے لکھی جائیں اس قسم کی روایات کا اندراج شاید بڑھتے ہوئے زمانے کے پسند خاطر نہ ہو۔

خانہ جنگیوں کے ذکر میں مصنف نے اس امر کا ضرور التزام کیا ہے کہ معرکہ کشت و خون میں اپنے ہاتھ رنگین کرنے والوں میں سے کسی کو بھی آنچ نہ آنے پائے۔ صفین کی جنگ میں بقول مصنف ۷۰ ہزار مسلمان شہید ہوئے لیکن انھوں نے اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ہمیں بتاتے کہ یہ "خون دو عالم" کس کی گردن پر رہا۔ تاکہ یہ واقعہ ہمارے لئے عبرت کا سامان بنتا۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ واقعات جن کا ذکر ہو رہا ہے ہونے ہی تھے، رسول اللہ صلعم کی پیشینگوئیاں موجود تھیں، مسلمانوں

کو آپس میں لڑنا تھا، وہ لڑے، نہ امیر معاویہ قصور وار تھے اور نہ حضرت علی۔ ان پر بحث فضول ہے، اگر تاریخ نویسی کا یہ نمونہ ہے تو آئندہ نسلیں اس سے فائدہ اٹھا چکیں،   (ضیاء)

دولت عثمانیہ:۔ مرتبہ مولوی محمد عزیر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ، قیمت ۔ ے ر

دار المصنفین کے "ایک مکمل اور مفصل تاریخ اسلام" کے سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے، جو ناظم دار المصنفین قبلہ سید صاحب کے الفاظ میں

> "جس کو ہمارے رفیق مولوی محمد عزیر صاحب ایم۔ اے نے تقریباً سات برس کے مطالعہ اور محنت کے بعد لکھا ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کی یہ پہلی تاریخ ہے جو اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اس سے پہلے ہماری زبان میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض یورپین مصنفوں کے تراجم اور خیالات تھے"

اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک دولت عثمانیہ پر جو کچھ سرمایہ اردو میں ہے وہ نقل و ترجمہ و ترتیب سے آگے نہیں بڑھا، ہندوستان کے مسلمانوں کو غدر کے بعد سے ترکوں سے بے حد شغف رہا، بلکہ یہ شغف اکثر تو عشق کی حد تک پہنچ گیا۔ سر سید کے زمانہ میں ہم نے ترکوں سے اپنا "اسلامی لباس" لیا، پھر علامہ شبلی کے سفر نامہ سے ترکوں کا تعارف ہوا، اور آخر میں تو طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے ہم ہندی مسلمانوں کو "فنا فی الترک" ہی کر دیا، اور ہماری وطنی سیاست بھی ترکوں کی سیاست کا دم چھلا ہو کر رہ گئی، یعنی ملک انگریز نے لے لیا، دھن دولت ہندو نے ہتھیایا اور دل و دماغ ترکوں کی نظر ہوا، اب جبکہ ترکوں کی "لادینی سیاست" سے ہماری آنکھیں کھلیں اور ہمیں مصطفٰے کمال اور ان کی جماعت کی دنیاداری کا تلخ تجربہ ہوا، اور خود ترکی زعماء سے ہمیں یہ سننا پڑا کہ تم ہمارے معاملات میں کیوں دخیل ہوتے ہو، پہلے خود تو آزاد ہو لو۔ اس وقت بقول غالب ہماری یہ حالت ہے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ترکوں سے محبت ہمارا فرض تھا۔ وہ ہمارے دینی بھائی تھے۔ ان کے دکھ میں شرکت ہمارے مسلمان ہونے کی ایک نشانی تھی، لیکن اس تمام عرصہ میں ترکوں کو جو کچھ ہم نے سمجھا، اور جس طرح ہماری کتابوں رسالوں اور جرائد نے ہندی مسلمانوں کو سمجھایا وہ ایک مغالطہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ہم نہایت خلوص سے اس مغالطے کے شکار ہوئے اور اس سے ہندوستان کی اسلامی سیاست کو وہ زخم کاری لگا جس کا گھاؤ ابھی تک نہیں بھر سکا، ہماری اس "فریب زدگی" کی وجہ یہ تھی کہ ترکوں کے متعلق ہمارا تمام سرمایۂ علم سید صاحب قبلہ کے الفاظ میں "محض یورپین مصنفوں کے تراجم اور خیالات تھے" شکر ہے کہ دارالمصنفین کے ایک قابل رفیق نے "تقریباً سات برس کے مطالعہ اور محنت کے بعد" ترکوں کی ایک ایسی تاریخ لکھنے کی ہمت کی جو بقول سید صاحب کے سات برس کے مطالعہ اور محنت کا نتیجہ کہی جا سکتی ہے۔

ہم نے بڑے شوق سے اس کتاب کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھا، اور اتفاق سے اس دور کی دو تین انگریزی کتابیں اور ایک آدھ عربی اور اردو کی کتاب بھی نظر سے گزر چکی تھی اس لئے زیر نظر کتاب کے حسن و قبح کے اندازہ کرنے میں قدرے آسانی ہوئی، اس میں شک نہیں کہ دولت عثمانیہ میں اس سے جامع کتاب شاید ہی اردو میں ہو، ہمیں اس کتاب کی جامعیت سے تو انکار نہیں، لیکن یہ جامعیت محض واقعات کی تفصیل تک ہے۔ واقعات کے اسباب و نتائج کی بحث کا پہلو اس کتاب میں بھی تشنہ ہی ہے۔ ہاں تاریخ اسلام جلد اوّل کے مقابلہ میں "دولت عثمانیہ" میں یہ خصوصیت ضرور ہے کہ زبان سادہ ہے، واقعات کی ترتیب بھی مناسب ہے، اور کہیں کہیں نظام سلطنت پر بھی تبصرہ کر دیا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اوّل الذکر کتاب کے مصنف کو تو صرف روایات کی کتابوں سے مدد مل سکتی تھی لیکن دولت عثمانیہ کے مصنف نے یورپی زبان کی تاریخوں سے بھی استفادہ فرمایا۔

ممکن ہے، ہمارے اس اعتراض کے جواب میں کہا جائے کہ ابھی کتاب ختم کہاں ہوئی، کتاب کے آخر میں یہ سب باتیں زیر بحث آئیں گی، ہمیں اس طرز بیان سے اختلاف ہے جو ایک شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، پہلے اس کے حالات زندگی بیان کر دیئے جاتے ہیں، اور پھر اس کے محاسن و مناقب، اب تک اردو کے سوانح نگار اور تاریخ نویس اس ڈھرے پر چل رہے ہیں،

یہ طریقہ توصیفی اور تجیدی ضرور ہے لیکن تنقیدی اور تاریخی نہیں؛

دولت عثمانیہ کے مصنف نے "شاہوں کی" تاریخ لکھی ہے لیکن عثمانیوں کی نہیں لکھی، ..۵ صفحے کی کتاب سلاطین عظام کی اولوالعزمیوں اور ان کی بے راہ رویوں سے بھری ہوئی ہے۔ مصنف جنگوں کے ذکر میں بیسیوں مقامات کے نام گناتے چلے گئے ہیں جو ممکن ہے، یورپین مصنف کی کتاب کا پڑھنے والا بآسانی سمجھ جائے لیکن ہمارے لئے وہ صفحات گورکھ دھندا بن کر رہ گئے ہیں، مصنف نے واقعات تو کم و بیش یورپی کتابوں سے لئے ہیں لیکن جہاں یورپی اہل قلم عیوب کے بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں دولت عثمانیہ کے مصنف نے ان سے اپنا پہلو بچایا ہے۔

مثلاً پہلے باب کا عنوان "ترک" ہے۔ ترکوں کا عالم اسلام پر غلبہ چند عباسی خلفاء کی "ترک نوازی" کا نتیجہ ثابت کیا ہے، مصنف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تاریخ کے اہم واقعات کو معدودے چند اشخاص کی خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں مرضی و پسند کا نتیجہ قرار دینا ٹھیک نہیں رہا۔ مامون اور معتصم اتنے بے عقل نہ تھے کہ وہ "ترک نوازی" کے انجام کو نہ سمجھ سکتے جسے آج ہم اتنی آسانی سے جان لیتے ہیں بات یہ ہے کہ عرب قوم اپنی سپاہیانہ حیثیت کھو چکی تھی، ایرانی سپاہی نہ تھے منتظم اور مدبر اور وزیر ضرور تھے۔ عباسی سلطنت کو جس کے ڈانڈے سندھ اور مراکش سے ملے ہوئے تھے شمشیر زن بازوں کی ضرورت تھی اور اس کی کمی ترکوں نے پوری کی۔ اس طرح عثمان کے بے خانماں خاندان کے چند افراد کا بڑھتے بڑھتے دنیا کے سب براعظموں میں پھیل جانا، اور تین چار سو برس تک نہایت شان و شوکت سے اتنی بڑی دنیا کو قبضہ میں رکھنا بیان تو ضرور کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سے اسباب تھے کہ عثمانؑ اور غازی اور مراد اوّل اپنے ترکی حریفوں، اور بازنطینی اور بلقانی دشمنوں کے مقابلہ میں جمے رہے، اور چند ہزار افراد نے لاکھوں کو اپنا لیا۔ اور عثمانی قومیت کا دائرہ برابر وسیع ہوتا رہا۔ الغرض تمام کتاب میں اس قسم کی بحثوں کی سخت ضرورت تھی جو افسوس ہے کہ نہیں ہیں۔

"دولت عثمانیہ" صرف سلاطین عثمانیہ کی تاریخ ہے جس کا بانی عثمان خاں ۱۲۸۸ء میں تخت پر بیٹھتا ہے اور ۱۸۰۸ء میں سلطان مصطفٰے معزول ہوتا ہے زیر کتاب کے ..۵ صفحے کم و بیش اس

۵۵۰ سال کی تاریخ کا آئینہ ہے۔ اس میں مصنف نے جس خد وخال کے دکھانے کی کوشش کی ہے، کیا اس قسم کے خد وخال دکھانا اس "مکمل اور مفصل تاریخ اسلام" کا کام ہے، اور کیا اسلام کے یہی احسانات ہیں جن کو نمایاں کرکے آپ دنیا کو بتا سکتے ہیں کہ "مسلمانوں نے علم وفن کی کیا خدمت کی اور انسانی تہذیب وتمدن کا قدم کہاں سے کہاں پہنچایا"؛

اس کتاب کو توپڑھ کر دل میں خواہ مخواہ یہ خیال اُٹھتا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ یہ دولت ختم ہوگئی، اس کے ہاتھ سے نہ اپنوں کو اطمینان نصیب تھا اور نہ ہمسائیوں کو امن۔ دوسروں پر لاکھوں کی تعداد میں چڑھ دوڑنا ان کا کام تھا۔ اور آس پاس کے ملکوں کی آزادی چھیننا اور آزادی پر جان دینے والوں کی لاشوں پر استبداد اور جور وجفا کی بساط بچھانا ان کا شیوہ۔ (”ضیاء“)

تاریخ اخلاق اسلامی (حصہ اول)؛ - مرتبہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی دارالمصنفین اعظم گڈھ قیمت عہ

تاریخ اخلاق اسلامی کے مصنف جناب عبدالسلام صاحب ندوی ہیں، سرورق پر کتاب کا تعارف نامہ ہے، جس میں درج ہے:

> "اولاً بعثت نبوی سے پہلے اہل عرب کے اخلاق کی تفصیل کی گئی ہے اس کے بعد دورِ نبوت میں اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، ان کے اسباب ومحرکات، ان کے انواع واصناف اور ان کی عملی تشکیل وتکمیل کے تمام مظاہر قرآن وحدیث سے اخذ کرکے بیان کئے گئے ہیں"؛

زیر نظر کتاب میں بعثت نبوی سے پہلے اہل عرب کے اخلاق کی تفصیل توضرور ہے اور دور نبوت میں جن نئے اخلاق کو رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ بھی ایک حد تک قرآن وحدیث سے اخذ کرکے مرتب کر دیئے گئے ہیں، لیکن تعارف نامہ کے اس دعوے "اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، ان کے اسباب ومحرکات، ان کے انواع واصناف اور ان کی عملی تشکیل وتکمیل کے تمام مظاہر" کا جواب ہمیں کتاب میں نظر نہیں آیا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کتاب کا نام

تاریخ اخلاق اسلامی کیوں رکھا گیا ہے؟

جاہل عربوں کے کسی شاعر کے ایک آدھ شعر سے عربوں کے اخلاق کا استدلال، اور آیات اور احادیث کے جزوی ٹکڑوں سے "اسلامی اخلاق کے اسباب و محرکات اور ان کے انواع و اصناف اور ان کی عملی تکمیل و تشکیل" کا نقشہ تیار کرنا اخلاق اسلام کی تاریخ نہیں کہلا سکتی، مصنف نے بعثت نبوی سے پہلے اہل عرب کے جو اخلاق بیان کئے ہیں، اور اشعار کو ان کی تائید میں پیش کیا ہے، ان اخلاق کے بالکل برعکس اخلاق دوسرے اشعار سے پیش کئے جا سکتے ہیں، مصنف علّام کو معلوم ہے کہ عباسی دور میں عرب دشمن (شعوبیت) تحریک کے حامی جاہل شعراء کے شعروں سے عربوں کی کتنی بھیانک تصویریں کھینچتے تھے اور آج مستشرقین انہی شعراء کے کلام سے عرب جاہلیت کو اخلاق انسانی کا نمونہ کمال دکھاتے ہیں، اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام نے عربوں کو پستی سے بلند نہیں کیا بلکہ بلندی سے نیچے گرایا۔

اسی طرح اسلامی روایات سے عجیب و غریب چیزیں ثابت کی جا سکتی ہیں ضرورت اس کی ہے کہ ہم اخلاق کو انفرادی شکل میں نہ لیں، اور عبداللہ بن عمر اور ابو ذر غفاری جیسے نیکوکاروں یا ان کے خلاف دوسرے لوگوں کے واقعات سے متاثر ہو کر اس عہد کے سب لوگوں کو اس رنگ میں رنگ نہ دیں۔

اگر اخلاق اسلامی کی تاریخ لکھنا مقصود ہو تو ہمیں افراد کے شعوری و غیر شعوری رجحانات جماعتوں کی حسیات اور تاثرات، طبعی ماحول کے اثرات اور تاریخی حوادث کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ اور اس تجزیہ کے عمل میں آیات و احادیث اور تاریخ کے ذخیروں سے مدد لے کر ہم صحیح معنوں میں تاریخ اخلاق اسلامی لکھ سکتے ہیں۔ ورنہ سچ پوچھئے تو زیر نظر کتاب کسی طرح بھی تاریخ نہیں کہلا سکتی، اسباب و... اور اثرات اور تاثرات کے عالمگیر قانون سے الگ ہو کر کسی قوم کے اخلاق کا صحیح تجزیہ نہیں ہو سکتا۔

"تاریخ اخلاق اسلامی" کا مواد بتمام دار المصنفین کی اور متعدد کتابوں میں موجود ہے۔ تعجب ہے کہ اس نئے نام سے اسی مواد کو پیش کرنے کی کیا خاص ضرورت پیش آئی۔ (ضیاء)

تاریخ جنوبی ہند:۔ مصنف، محمود خاں صاحب محمودؔ، سائز ۱۸×۲۲/۱۶ ضخامت ۴۲۰ صفحات قیمت سے ر
ملنے کا پتہ:۔ محمد سراج الدین، بک سیلر ڈکنسن روڈ، بنگلور

محمود خاں صاحب محمودؔ اس سے پہلے "تاریخ سلطنت خداداد" جیسی قابل قدر تصنیف شائع کر کے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کی تاریخ دانی اور اس فن میں ان کا شغف کامل اور ان کا ذوق صحیح مسلم ہے۔ اب انھوں نے تاریخ کے طلبہ کے لئے یہ جدید کارنامہ پیش کیا ہے۔ اسے بھی اُسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ جناب محمودؔ نے اسے بڑی عرق ریزی اور کاوش سے مرتب کیا ہے، اردو تو اردو جنوبی ہند پر انگریزی میں بھی کم کتابیں ایسی مفصل و مبسوط معتبر و مربوط ملیں گی۔ علیحدہ علیحدہ حصص ملک پر تاریخوں کی ترتیب ازبس ضروری ہے خصوصاً جنوبی ہند پر۔ خوشی کی بات ہے کہ جناب مصنف نے اِس قرض کو پوری دیانت و احتیاط اور خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے، ہم سب کی طرف سے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مصنف نے بڑی چھان بین سے تمام داخلی و خارجی اسناد و کاغذات سے مواد مرتب کر کے یکجا کیا ہے۔ اردو، فارسی، اور انگریزی کی تیس مستند کتابوں کو کھنگالنے کے بعد یہ تحفہ تیار ہو سکا ہے۔ مختلف ماخذوں سے مختلف واقعات انتخاب کر کے یکجا کر دینے کے بعد مصنف نے ان پر ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے۔ نتائج پیدا کئے ہیں اور ان کی روشنی میں صحیح واقعات پیش کئے ہیں۔

شروع میں جغرافیائی حالت پھر جنوبی ہند کی معاشرتی اور تمدنی حالت، زبان اور ایرین اور ڈریویڈین قوموں کے اتصال پر نظر ڈالی ہے۔ پھر وہاں کے قدیم طرز حکومت، مسلمانوں کی آمد اور ان کے طرز حکومت پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ سلاطین بہمنی و خاندان وجیا نگر کے حالات اور یورپین اقوام کی آمد سے لے کر موجودہ دور تک کے واقعات پر معتبر شہادتوں کے حوالے سے سیر حاصل تنقید کی ہے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی قابل قدر اور عام طور پر توجہ کے لائق ہے کہ اس میں اس دور کے ہندو مسلم تعلقات پر بہت سی کام کی چیزیں ملتی ہیں۔ آج بھی ان دونوں قوموں میں جو

افسوس ناک کشمکش اور اختلاف ہے وہ ملک کی آزادی میں سنگِ راہ بنا ہوا ہے۔ یقین ہے کہ اربابِ نظر کو اس کی روشنی میں اس کٹھن مسئلہ کے حل سوچنے کی راہیں بکثرت ملیں گی۔
جگہ جگہ تشریحی نقشے اور فوٹو بلاک کی بکثرت تصویریں دی گئی ہیں۔ زبان صاف اور ستھری ہے۔

(ا ـــ م)

فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں:۔ مولفہ مولوی ظفر الرحمان صاحب دہلوی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی۔ قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب انجمن ترقی اردو نے بہت مفید شائع کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل زمانہ مشین اور سائنس کا ماہر ہے۔ ہمارے یہاں انجنیروں کی زبان پر عموماً انگریزی اصطلاحات چڑھے ہوتے ہیں، اور وہی اصطلاحات مسخ شدہ حالات میں معمولی مزدوروں کی زبان پر بھی چڑھتے لگے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مختلف فنون جن میں ہندوستانی کسی قوم سے پیچھے نہیں تھے اب دوسروں کے الفاظ و ہنر کے پابند ہو گئے ہیں۔

اصطلاحات کے مرتب کرنے میں مولوی ظفر الرحمان صاحب نے واقعی بڑی محنت اٹھائی ہے۔ حصہ اول میں بخاری، سنگ تراشی، معماری، چھپر بندی وغیرہ یعنی تیاری مکانات، اور پھر تہذیب و آرائش عمارات کے سلسلے میں دوسرے پیشے مثلاً رنگ کاری، گھڑی سازی، آرائش سازی، وغیرہ کی اصطلاحات جمع کی ہیں۔ دوسرے حصے میں دیگر فنون کی اصطلاحات جمع کیجائیں گی۔
اگر اس سلسلے میں دہلی و آگرہ، جے پور کے ساتھ لکھنؤ اور لاہور کے کاریگروں سے بھی مشورہ لیا جاتا تو میرے خیال میں ظفر صاحب کو اور آسانی ہوتی۔

حیاتِ جاوید:۔ مولفہ مولانا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم (نیا اڈیشن)۔ ۴۹۵ صفحات، ضمیمہ جات ۸۵ صفحات قیمت درج نہیں، مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی۔

انجمن ترقی اردو نے ابھی حال میں حیات جاوید کا یہ نیا اڈیشن شائع کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حیات جاوید کمیاب ہوگئی تھی اور جتنے پرانے نسخے تھے وہ بھی بوسیدہ ہو چلے تھے۔ لیکن مانگ برابر جاری تھی۔ نیز اس لحاظ سے بھی اس کی اشاعت ضروری تھی کہ اردو کی سوانح عمریوں میں اس کا پایہ بہت بلند ہے گو بعضوں کی نگاہوں میں یہ "مدلل مداحی" یا "کتاب المناقب" ہی ٹھہرے لیکن اس کی مزید اشاعت کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مفید ضمیمہ جات، مثلاً سرسید کا نسب نامہ، سرسید کی تصانیف کی فہرست، رسالہ اسباب بغاوت ہند، حالی کا مضمون متعلق بہ تفسیر القرآن، بھی اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں، شروع میں سرسید کی تصویر بھی ہے اور آخر میں انڈکس دیکر کتاب کو مکمل کر دیا ہے۔ کتابت اور طباعت بہت خوب ہے۔

تاریخ ادبیات ایران:- در عہد جدید (۱۵۰۰ء ۔ ۱۹۲۴ء) مصنفہ پروفیسر ایڈورڈ۔ جی۔ براؤن مترجمہ سید وہاج الدین احمد کنتوری۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔ قیمت درج نہیں،

انجمن ترقی اردو اس سے پیشتر براؤن کی مشہور تصنیف ادبیات ایران کی دیگر جلدوں کا ترجمہ کروا چکی ہے۔ یہ ترجمہ اس کی آخری جلد کا ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر مرحوم نے ایران کی آخری چار صدیوں کی ادبیات کا تذکرہ کیا ہے اور عہدِ جدید تک اسے مکمل کر دیا ہے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے برا نہیں ہے۔ اور اُن طلبا فارسی کے لئے یہ جلد بیحد مفید ہوگی جنھیں انگریزی کا دست نگر ہونا پڑتا تھا۔ نیز یوں بھی بہت خوشی کی بات ہے کہ ایسی مفید کتاب اردو داں حضرات کی آسانی کے لئے خود انھیں کی زبان میں منتقل ہوگئی۔ ہندوستان میں ابھی تک ادبیات ایران سے کافی دلچسپی باقی ہے۔ یقین ہے کہ فارسی سے ذوق رکھنے والے حضرات اپنی تشنگی اس جلد سے کما حقہٗ بجھا سکیں گے۔

خمسہ کیفی: مصنفہ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو قیمت ۱۲/
یہ کیفی صاحب کی دو نظموں اور تین مضمونوں کا مجموعہ ہے۔ دو مضمون اردو لسانیات سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات سے۔
کیفی صاحب نے یہ مقالے حالانکہ مختصر لکھے ہیں لیکن بہت جامع ہیں۔ آج کل اردو ہندی کے متعلق جو تنازعات چل رہے ہیں اس میں یہ مختصر مضامین لسانیاتی حیثیت سے نہایت مفید ثابت ہوں گے۔ کیفی صاحب محترم خود ہندو مسلم کلچر کے خوشگوار اتحاد کا نمونہ ہیں، ان سے بہتر کوئی اس موضوع پر کم لکھ سکتا تھا۔
یہ مقالے اردو لسانیات کے طلبا کے لئے بھی کچھ کم مفید نہیں۔

تقویم ہجری و عیسوی: مرتبہ ابو النصر محمد خالدی صاحب، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، قیمت درج نہیں۔
اس تقویم کو چھاپ کر انجمن ترقی اردو نے ایک بڑے دشوار مرحلے کو حل کر دیا ہے۔ عموماً ہجری سے عیسوی اور عیسوی سے ہجری سنین کا حساب لگانا ناظرین کیلئے نہ صرف دقت طلب بلکہ مفت کا دردسر ثابت ہوتا تھا۔ دیگر یورپین زبانوں میں تو اس قسم کی تقویمیں موجود تھیں جن سے ہجری سے عیسوی سنین کا حساب آسانی سے ملجاتا تھا۔ لیکن اردو میں کوئی اس قسم کی تقویم موجود نہ تھی۔ اردو داں پبلک کی یہ خوش نصیبی ہے کہ ایسی تقویم اردو میں منتقل ہوگئی۔
اس تقویم میں سنہ ۱ھ سے لے کر سنہ ۱۵۰۰ھ تک ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت دکھائی گئی ہے۔

انجمن ترقی اردو کی کہانی: مرتبہ مولوی غلام ربانی صاحب، مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔ قیمت ۱۲/
یہ رسالہ مولوی غلام ربانی صاحب نے انجمن ترقی اردو کی بست و پنجسالہ کارگذاریوں کے متعلق مرتب کیا ہے۔
انجمن ترقی اردو کی ضرورت کے متعلق کس کو شبہ ہو سکتا ہے اور اس کے کارناموں سے

کس کو انکار۔ اب تک جو کچھ اور جتنا کچھ اس نے کیا ہے یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان و ادب پر بڑا احسان ہے اور ہر ہندوستانی خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو، انجمن کے ان گراں قدر احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا، خصوصاً جب سے مولوی عبدالحق صاحب کی جان سپار آتندہی اس کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے تب سے اس انجمن میں جس شد و مد سے کام ہوتا رہا ہے وہ واقعی اردو کی تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ قائم رہے گا۔ مولوی صاحب کی اس جاں سپاری پر کسی قدرداں شاعر نے خوب کہا ہے کہ مولوی صاحب کا ایک تخلص ہے جو باوجود تخلص ہونے کے نظم نہیں ہو سکتا یعنی "انجمن ترقی اردو"

انجمن کا کام اب تک جیسا ہوتا رہا ہے وہ واقعی بے حد کامیاب رہا ہے۔ اور ہماری تہ دل سے دعا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو خدا ابھی بہت دنوں تک زندہ رکھے تاکہ ملک میں جو روڑے اردو کی راہ میں اٹکائے جا رہے ان کا مولوی صاحب قطعی طور پر سدباب کر کے اٹھیں اور ہماری دعا ہے کہ انجمن ہمیشہ ان ہی جیسے بے غرض اور جاں سپار اردو کے عاشقوں کے سپرد رہے، جو انجمن اور انجمن کے ساتھ اردو کی بقا کے لئے مجنوں نہیں بلکہ فرہاد ثابت ہوں۔ ورنہ اگر انجمن ایسے ہاتھوں میں چلی گئی جن میں یہ خوبیاں نہیں ہیں تو ہمیں ڈر ہے کہ یہ واقعہ قوم کے لئے باعث ماتم ہوگا اور اردو کے لئے ایک رجعت قہقہری۔

رسید کتب:-

۱۔ ہندو ادیب — مرتبہ ناظر کاکوردی، مطبوعہ انوار بکڈپو لکھنؤ، قیمت عہ

۲۔ طوطی نامہ — مرتبہ میر سعادت علی رضوی ایم۔ اے قیمت ۸ سب درس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدرآباد دکن،

۳۔ پھول بن — مرتبہ عبدالقادر سروری۔ قیمت سے ر

سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدرآباد دکن،

۴۔ سیف الملوک و بدیع الجمال	مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔ قیمت ۱۲/
۵۔ قصۂ بے نظیر	مرتبہ عبد القادر سروری۔ قیمت ۱۲/
	سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدرآباد دکن،
۶۔ کلام الملوک	مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔ قیمت ۳/
	سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدرآباد دکن،
۷۔ مجاہد الخلفا یعنی مناقب خلفائے راشدین	مرتبہ حافظ اخلاق احمد صدیقی و سجاد حسین صدیقی۔ قیمت ۶/ مجلد ۸/
	اشاعت گاہ۔ مکتبہ قصر الادب۔ آگرہ

رسالہ جات:-

سیاست۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی ادارت میں حیدرآباد دکن سے یہ مفید رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو میں اس قسم کے رسالوں کی بڑی قلت ہے۔ سوائے رسالہ جامعہ کے اور کوئی ایسا رسالہ نظر نہیں آتا جو سیاسی و معاشی مسائل سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہو۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کمی کو محسوس کیا اور حیدرآباد سے اس نئے رسالے کو جاری فرمایا۔

زیر نظر نمبر ۶ ۵ صفحات کا ہے۔ اس میں برطانوی دستور کی خصوصیات، جنگ یورپ، ترکی اور ممالک بلقان کا نیا محاذ، ہندوستان کا سیاسی مستقبل وغیرہ بہت اہم اور مفید مضامین ہیں۔ امید ہے اردو داں طبقہ اس رسالہ کی ضرور قدر کرے گا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب سے درخواست ہے کہ اگر اسے ماہوار کر دیں تو ملک کے لئے اور بھی زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔ چندہ سالانہ صہ رہے۔

البیان:۔ اقبال نمبر، قیمت ۸ر، منیجر "البیان" امرت سر

موقر رسالہ البیان نے ابھی حال میں ایک اقبال نمبر شائع کیا ہے حالانکہ صفحات کے لحاظ سے یہ مختصر ہے لیکن مضامین کے لحاظ سے اقبال سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے ناگزیر ہے، مضامین حالانکہ کم ہیں لیکن بعض بہت پر از معلومات اور مفید ہیں۔ علامہ اقبال کی صحبت میں، مکتوبات اقبال، یاد ماضی، اقبال اور صنف لطیف، اقبال اور قرآن، یہ سب مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اقبالیات میں یہ نمبر ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

یہودی

(۲)

از پروفیسر بنواری لال ایم۔اے جالندھر

(اس مضمون کی پہلی قسط رسالہ جامعہ ماہ نومبر ۱۹۳۹ء میں نکل چکی ہے)

ایک جرمن، یہودیوں کی سود خواری کے متعلق یوں لکھتا ہے " بھیگے ہوئے اسفنج کو بھینچا جاوے اس میں سے جو پانی نکلتا ہے۔ یہ وہی پانی ہے جو اس نے پہلے کہیں سے چوسا تھا، یہودی بھی ایسے ہی اسفنج ہیں، جو کچھ بھی وہ عیسائیوں کو دیتے ہیں، سود خواری کے ذریعے اُن ہی سے لیا ہوا ہوتا ہے۔" "مکڑی اپنے جالے میں مکھیوں کو پھنساتی ہے اور رس چوس لینے کے بعد اُن کے ارد گرد پھر جالا تان دیتی ہے۔ اور اُن کو حفاظت سے رکھتی ہے۔ وہ مردہ مکھیاں ایسے ہی جالے میں لٹکتی رہتی ہیں، یہودی بعینہ ایسی مکڑیاں ہیں، اور عیسائی مکھیاں، جو روپیہ یہودی دکھاوے کے لئے رفاہِ عام میں دیتے ہیں، عیسائیوں ہی کا چوسا ہوا خون ہوتا ہے، اسی روپیہ سے یہودی مکڑی رفاہِ عام کا جالا تنتی ہے۔ جس میں بے خبر عیسائی مردہ مکھیوں کی طرح جھولا جھولتے ہیں" یہ الفاظ اگرچہ سخت ہیں مگر اتنی بات ضرور ظاہر کرتے ہیں۔ کہ جرمن بھی بُری طرح یہودیوں کے دام میں پھنس گئے تھے۔ اور وہاں بھی وہی جال تھا جو کبھی ٹوڈیلا، قسطنطنیہ و فارس میں تھا۔

پیشتر ازیں بنی اسرائیل کو اجازت تھی کہ جرمنی میں جہاں دل چاہے چلے جائیں اور آباد ہو جائیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کو جرمنوں کے برابر حقوق حاصل تھے۔ اُن پر صرف یہودی عدالتوں میں مقدمات چل سکتے تھے، سب سے پرانی دستاویز جو یہ ظاہر کرتی ہے، کہ یہ حقوق اُن کو پرانے وقتوں سے حاصل تھے ۱۲۳۸ء کی ہے، کوئی عیسائی جب تک کہ اس کے

پاس کم از کم ایک یہودی گواہ نہ ہو کسی یہودی پر مقدمہ نہیں چلا سکتا تھا۔ یہودی عدالتوں کے اجلاس، یہودیوں کی مجلس میں ہوتے تھے، حتیٰ کہ اگر کوئی تنازعہ ہوتا تھا تو رومن کیتھولک پادریوں کو بھی یہودیوں کی ہی عدالت میں جانا پڑتا تھا، مگر یہاں بھی یہودیوں نے پرانی قومی عادت کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں ایسی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جرمنی میں بھی وہ سود، لین دین، اور صرافی کا کام وسیع پیمانے پر کرتے تھے، اگر کسی یہودی کے پاس چوری کا مال نکل آتا، اور وہ قسم کھا کر کہہ دیتا کہ میں نے یہ مال ایمانداری سے خریدا ہے تو حکم تھا کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ اصلی مالک کو اپنی شے واپس لینے کے لئے یہودی کو منہ مانگی قیمت ادا کرنی پڑتی، قانون گوسلر کی رُو سے صرف یہودیوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ دیدہ دانستہ چوری کے مال کو گروی رکھ سکتے تھے، اگر کسی جرمن کے پاس کوئی ایسی شے ہوتی جس کو ایک یہودی کہہ دیتا کہ میری ہے، چاہے دراصل وہ اُس کی نہ بھی ہو، تو جرمن کو وہ چیز صحیح سلامت واپس کرنی پڑتی تھی، یا اُس کی قیمت ادا کرنی ہوتی تھی، یہودیوں کا مقصد ہمیشہ سے یہ تھا کہ جس طرح بھی ہو اپنا ساہوکارہ قائم رکھا جائے۔ قانون کی رو سے شرح سود ۳۳ فی صدی سے لے کر ایک سو بیس فی صدی تک مقرر تھی، مگر حقیقت میں یہودی اس سے بھی زیادہ سود لیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہ و گدا، شہری و دیہاتی سب کی جان یہودیوں کی مٹھی میں رہتی تھی، تحریرات کے ڈھیروں کے ڈھیر اس کے ثبوت میں موجود ہیں، ذوائی برکن کا ایک نواب والرم سترہ یہودیوں کا مقروض تھا، او بروینرل جیسے چھوٹے سے قصبے میں یہودیوں کے ۲۱ اشخاص مقروض تھے، اٹنگن کے جاگیردار نے اُن کے پاس اپنا تاج بھی رہن رکھ دیا تھا، اسی طرح بالتھازر فریدرک اور دِلہلم وغیرہ تعلقہ دار یہودیوں کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے، ایک یہودی اسحٰق نامی میونک سے بھاگ نکلا جب پکڑا گیا تو اس کے قبضہ سے شہریوں کی زینت و آرائش کی چیزیں، جاگیرداروں اور رئیسوں کے جواہرات و زیورات اور شاہی خاندان کے

آلات سیم وزر بر آمد ہوئے، اسی ساہوکارے کے طفیل یہودی بادشاہوں اور اسقفوں کے دربار میں پہنچے، اور مشیرانِ مالیات و اجارہ دارانِ محصولات بن گئے، یہودی افسروں کو ایک ایک محرر ملا تھا، جو اپنا حساب کتاب عبرانی زبان میں رکھتا تھا، چنانچہ صرف یہودی ہی اُس کے حسابات کی جانچ پڑتال کر سکتے تھے، جس نسبت سے یہودیوں کی طاقت دن بدن بڑھتی گئی، اسی نسبت سے لوگوں کی مصیبتوں اور بیچارگیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں کے خلاف فسادات رونما ہونے لگے۔ بنی اسرائیل اور سودخواری، اس زمانے میں ہم معنی الفاظ ہو گئے تھے، اور اس پیشے کے لئے لوگوں کے دلوں میں جو نفرت تھی حق بجانب تھی، ایک پرانے گیت کا ترجمہ ہے " یہودیوں سے کبھی محبت نہ کرو، نہ ان پر اعتماد کرو، وہ تمہاری روح کے چور ہیں، اور تمہاری عورتوں کی بے عزتی کرنے والے ہیں" یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ان کے ساتھ ہمیشہ بدسلوکی ہوتی رہی، ایک دفعہ ایک یہودی نے مریم معصومہ کا منہ چڑایا۔ تو اُس کو محض دس گوآر جرمانہ کر کے چھوڑ دیا گیا، ۱۹۲۷ء میں ریگنس برگ کے مقام پر ایک پادری کو دو یہودیوں کے خوف سے بھاگ کر جان بچانی پڑی۔ کیونکہ وہ اُس کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ جب بنی اسرائیل کی مجلس نے ملزمان کو سزا دینے سے انکار کیا، تو عیسائیوں نے ان سے مقاطعہ کیا، وہ بھی عارضی اور نامکمل طور پر، اور اسی پر اکتفا کی۔ اشترآس برگ کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی اسرائیلی کے لئے باعث آزار ہوتا تھا تو اُس کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ اسرائیلیوں کے ساتھ وہی سلوک ہوتا تھا جو عیسائیوں کے ساتھ، اشترآس برگ میں بھی یہودی پرانے زمانے سے ساہوکارہ کرتے چلے آتے تھے، بلدیہ اور حکومت کو قرض دیتے تھے، ایسی مقتدر قوم کے خلاف تو لوگ اسی صورت میں آمادۂ فساد ہو سکتے ہیں جب کہ ان کے لئے اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے۔ قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ جہاں جہاں یہودیوں کا اقبال ہوا لوگوں میں ادبار پھیلا۔ اور جہاں جہاں سے یہودی خارج کئے گئے لوگ اقبال مند ہو گئے۔ دوسری صلیبی جنگ کے بعد جب

کہ "مرگ اسود" سے بہت تباہی پھیلی (یعنی چودھویں صدی کے وسط میں) اور جرمنی کی حالت نہایت ابتر ہوگئی پے در پے مصائب کی وجہ سے تو اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا، اور اُس نے اِن خون آشام اسرائیلیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ارادہ کیا، لوگوں نے بھی غم و غصہ میں مظاہرے کئے مگر اس سے کیا بنتا تھا، کچھ برس بعد پھر وہی حالت ہوگئی، شرح سود اور بھی تیز ہوگئی، جنگ کی وجہ سے ملک تباہ ہوا تب بھی یہودیوں نے اپنے ہاتھ رنگے۔ آج کل کی طرح اُس زمانے میں بھی یہ حالت تھی کہ "سارے کمیشن ایجنٹ یہودی تھے اور سارے یہودی کمیشن ایجنٹ" ان کا اصول صرف ایک تھا اور وہ تھا جھوٹ اور فریب، لیبے کہتا ہے، "ہم دیکھتے ہیں کہ ابتری کے زمانوں میں جب کہ ملک کی مالی حالت نہایت خستہ ہوگئی ہو بے رحم و دولت پرست لوگ بہت خوش رہتے ہیں کیونکہ ایسے زمانوں میں اُن کی بے ایمانی کا بازار خوب رونق پر ہوتا ہے" اس سلسلہ میں جو فسادات ہوئے، اُن کو مستثنیات میں سے شمار کرنا چاہئے۔ کیونکہ کسی زمانے کی خصوصیات اُس کی معمولی، روزمرہ زندگی سے معلوم ہوتی ہیں، مگر اس دَور کی روزمرہ زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ یہودی مورخ ان فسادات کو "قتلِ یہود" وغیرہ مبالغہ آمیز ناموں سے موسوم کرتے ہیں دراصل دیکھنے کی بات یہ ہے۔ کہ ایک فساد اور دوسرے فساد کے درمیان کتنا عرصہ گذرا اور اس عرصہ میں بنی اسرائیل نے کتنے خانماں برباد کیے؟ لوگوں کی حالت کیا تھی؟ فساد کی وجوہات کیا تھیں؟ ان ہی گاہِ گاہی فسادات کی وجہ سے رفتہ رفتہ عوام کے دل میں بنی اسرائیل کے خلاف نفرت جاگزیں ہوگئی۔ وہ پیشے اور کام جن سے بنی اسرائیل کو تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں عار تھا، اب قانوناً ان کے لئے بند کردیئے گئے۔ پہلے وہ عوام میں مل جل کے رہنا پسند نہیں کرتے تھے، اب اُن کو اصولاً اور مصلحتاً علیحدہ "غیتو" میں رہنا پڑا۔ ڈاکٹر آرتھر رین کہتا ہے "پہلے تو یہودی ہر جگہ اپنی مرضی سے علیحدہ رہتے تھے پھر اُن کو حکماً علیحدہ رہنا پڑا" اور اُن کی نشانی مقرر کردی گئی ~~ایک نوکدار~~ ٹوپی اور ایک خاص زرد رنگ کا رومال، پھر رفتہ رفتہ ان کے ساتھ

عدم تعاون بھی ہونے لگا ان ساری باتوں کے باوجود یہودیوں کے علیحدہ کرنے میں کوئی سختی یا ظلم مد نظر نہیں ہوتا تھا، مگر مصلحتاً یہ ضروری تھا۔ یہودی طبقے اراذل میں شمار نہیں ہوتے تھے، بلکہ فرانک فرٹ کی ایک دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں کو بھی دیگر عوام کی طرح خطابات کے ذریعے سے امتیاز بخشا جاتا تھا، ایبٹ ٹرت ہائیم ۱۵۱۶ء میں لکھتا ہے "چھوٹے بڑے۔ پڑھے لکھے اَن پڑھ سب کے دل میں ان سودخوار یہودی ساہوکاروں کے خلاف نفرت کا جذبہ جاگزیں ہو چکا ہے، عوام کو ان کے پنجے سے بچانے کے لئے قوانین بننے چاہئیں ورنہ ایک اجنبی قوم، زور و حوصلہ مندی اور دیگر خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ محض دولتمندی کی وجہ سے ہم پر حکمراں ہو جائے گی۔ لوٹ مار اور تہدید و تخویف تو ہم کو اُن کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتے، اس کا طریقہ تو بس یہ ہے کہ ان کو جبراً سودخواری اور ہیر پھیر سے باز رکھا جائے اور اُن کو ایماندارانہ پیشوں میں، کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے لئے بھیجا جائے" مگر ان قراردادوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ تاریخ نورن برگ اُٹھا کر اس سوال کا جواب دیکھئے کہ لوگوں نے ۱۴۹۹ء میں نورن برگ سے یہودیوں کو نکال دینے کی کوشش کیوں کی۔ لکھا ہے "نورن برگ میں آباد اور جاگزیں یہودی اس کے سزاوار تھے۔ وہ بہت مغرور اور سرکش ہو گئے تھے، ان کی حد سے بڑھی ہوئی شرح سود، اُن کی ناقابلِ تسکین طمع، اور عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے قرضے نے بلدیہ کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ وہ اس قسم کے خون آشام مہمانوں کو جن کی کرتوتیں تجارت کے لئے باعثِ شرم ہیں شہر میں زیادہ دیر پناہ نہ دے" پہلے بھی مختلف اوقات پر انھیں اقتصادی اور مذہبی جھگڑوں کی بنا پر فسادات برپا ہوئے تھے حکومت نے دیکھا کہ اس طرح سے تو یہ مسائل حل نہیں ہوتے، اس لئے انھوں نے فوج کی پناہ میں (تاکہ کسی قسم کا نقصان وغیرہ نہ ہو) ان کو ۱۴۹۹ء میں شہر سے خارج کر دیا۔" اس شہر میں وہ مدت سے آباد ہونے کی وجہ سے بہت امیر ہو گئے تھے۔" ۱۳۱۰ء میں قیصر ہائنرک ہفتم نے اہالیانِ شہر نورن برگ کو ایک رعایت دی تھی اور وہ رعایت یہ تھی کہ اس جگہ

یہودیوں کو، اہالیان شہر سے ۱/۲ ۴۳ فی صدی فی ہفتہ سے زیادہ، اور اجنبیوں سے ۵۵ فی صدی فی ہفتہ سے زیادہ سود لینے سے منع کر دیا تھا"، سارے جرمنی میں یہی حال تھا جہاں کہیں سے یہودیوں کو خارج کیا جاتا تھا، لوگوں کی جان میں جان پڑ جاتی تھی۔ آؤگز برگ سے یہودیوں کے اخراج کے موقع پر پادری ہارتّ مان کرائیدلیس کہتا ہے "یہ شہر والوں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہودیوں کو نکالا جا رہا ہے کیونکہ وہ سود و ساہوکارے اور دیگر بیوپار وغیرہ سے غریب عیسائیوں کا خون چوستے تھے، بہت سے لوگ روٹی روٹی کے لئے محتاج ہو چکے تھے۔ کئی شہری بیوی بچوں سمیت تباہ ہوکر گداگر بن گئے تھے وغیرہ" غرضیکہ ہر جگہ یہی حال تھا، ۱۵۳۹ء میں سارے جرمنی میں اعلان کیا گیا جس کی رو سے یہودیوں کو ساہوکارے سے روک دیا گیا۔ اور اُن کو دستکاری میں لگایا گیا تاکہ اپنا عرقِ جبیں بہائیں تو ان کو پتہ لگے کہ عیسائی روزی کس طرح کماتے ہیں۔ مگر یہ بھی بے سود رہا۔ ازمنہ وسطیٰ کے حالات پڑھے جائیں تو یہودیوں کی تجارتی فریب کاریاں اور عجیب و غریب چالاکیاں حیران کر دیتی ہیں داؤ پھیر میں روپیہ مارنا، مال رکھ کر دیوالہ نکال دینا۔ ناتجربہ کار لوگوں، اور امیروں کے بچوں کو گمراہ کرنا۔ انھیں فضول خرچی اور عیاشی سکھانا، جھوٹی دستاویزیں بنالینا جو عبرانی زبان میں لکھی ہوں، جن پر اعتبار کرکے روپیہ ادا کر دیا جاتا مگر جب ترجمہ کروایا جاتا تو انھیں سوائے چند ایک لغو فقرات کے اور کچھ نہ حاصل ہوتا۔ خرید و فروخت میں اشیا رکا ادل بدل کر دینا کہ بجائے اشیائے خریدہ کے گھر جاکر خریدار کے بنڈل میں سے پتھر یا گھاس پھوس برآمد ہو وغیرہ اس قسم کی جعل سازیاں ان میں عام تھیں اس زمانے کا ایک مصنف ظریفانہ انداز میں لکھتا ہے " وہ حکمران جو اپنی رعایا میں یہودیوں کو بساتا ہے۔ اُس شخص کی طرح ہے جو اپنے جوہڑ میں افزائش نسل کے لئے ننھی ننھی مچھلیاں چھوڑتا ہے، اور اُن کے ساتھ ہی چند بڑے بڑے ماہی خور جانوروں کو بھی چھوڑ دیتا ہے، جو گھنٹے بھر میں سب کو چٹ کر جائیں" " ایک مینڈھے کو باغ کا مالی کون بناتا ہے؟" کسی نے بطخوں اور مرغیوں کی رکھوالی کے

لئے بلیوں اور لومڑیوں کو بھی رکھا ہے؟" اے حکمرانو! اگر تمھیں اپنی رعایا کو سزا دینی ہے، تو ان میں چند یہودی لاکر بسا دو" وغیرہ قصہ مختصر یہ کہ جس جس جگہ یہودی آباد ہوئے ایک ہی قسم کے نتائج ظہور پذیر ہوئے لوگ ہر جگہ ان کی سود خواری سے تنگ آکر داد و فریاد کرنے لگے عیسائیوں میں بھی چوروں مکاروں اور دغا بازوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر یہودی تو معلوم ہوتا ہے ان فنوں کے اجارہ دار ہیں۔

۲- یہودیوں کی عادات و رسوم و رواج | یہودیوں کے نزدیک نیکی وہ ہے جو یہودیوں کے ساتھ کی جائے، اور بدی یہ کہ جو غیر یہودیوں سے نیکی کی جائے، حالانکہ وہ خود تو اپنے آپ کو شرافت و انسانیت کے مجسمے خیال کرتے ہیں، اس سلسلہ میں سب سے بڑی غلطی جو ہم سے سرزد ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم بنی اسرائیل کے ماضی کو بھی اسی اخلاقی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں، جس سے کہ دیگر اقوام کے ماضی کو۔ اس وجہ سے ہمارے اذہان میں ہر وقت چند ایسی صفات کا خیال موجود ہوتا ہے، جن کو ہم دیگر اقوام کی طرح یہودیوں سے بھی منسوب کر دیتے ہیں حالانکہ یہودی ان صفات سے قطعاً محروم ہیں، مثلاً جب ہم "احباب" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہر قوم و مذہب کا شخص مراد لے لیتے ہیں، مگر یہودی اس لفظ سے صرف "یہودی" ہی مراد لے گا، عہد نامہ قدیم میں چند احکام ہیں جو ہمیں تالمود کے ریگستان میں بھی نخلستانوں کی طرح نظر آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، مگر یہودی اور غیر یہودی کے امتیاز کی وجہ سے ان کا بھی ذائقہ تلخ ہو گیا ہے۔ بابا کما کے مقالے صفحہ ۱۱۳ ب پر لکھا ہے "جز ۲۲ : ۳ کے مطابق 'تیرے سارے' بے وطن" بھائیوں کو ایک بات بتائی جائے گی، واجب ہے کہ تو اس کا ذکر اپنے بھائیوں سے ہی کرے اور دوسروں سے نہ کرے"، ربی خانینا نے کہا ہے یہ جو لوائٹ ۲۵ : ۱۷ میں لکھا ہے، اپنے احباب کو دھوکا مت دو، اس کا کیا مطلب ہے؟ جواب ـــــ احباب، کا مطلب ہے وہ لوگ جن کے ساتھ شرح یہود نے تجھ سے ملایا، ایسے احباب کو دھوکا مت دو" ایک مقام پر چوری کے

خلاف جو ممانعت ہے اس کی یوں تشریح کی گئی ہے "یہ چوری سے جو روکا گیا ہے، تو وہ یہودیوں کو ایک دوسرے کی چوری سے روکا گیا ہے، یا یہ امتناعی حکم محض آدمی کی چوری (بردہ فروشی) سے روکتا ہے" تالمود میں یعقوب اور راخل کا مکالمہ یوں درج ہے "یعقوب نے راخل سے کہا" کیا تم میرے ساتھ شادی کرو گی؟" اس نے جواب دیا "ہاں" مگر میرا باپ ایک دھوکا باز شخص ہے۔ تمھاری اور اس کی طبیعت نہیں ملے گی" یعقوب نے کہا "دھوکا بازی میں میں بھی اس کا بھائی ہی ہوں" راخل نے پوچھا "کیا اس بات کی اجازت ہے، کہ کوئی ایماندار شخص دھوکا بازی بھی کرلے؟" یعقوب نے جواب دیا "کیوں نہیں، پاک دامنوں کے ساتھ پاک دامن رہو اور بے ایمانوں کے ساتھ بے ایمان، دیکھو گیت" نمبر ۱، ۲" بنی اسرائیل کو اپنے بزرگ کے اس مقولے میں تعجب کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، وہ اس کی کئی کئی تاویلیں کرکے حسب منشار اور حسب ضرورت مطلب نکال لیتے ہیں، دوسرے لوگوں کی طرح ان کا ضمیر کچھ بہت ذکی الحس نہیں جب ہیپاآن مارد و خائی سے کہتا ہے "کسی کو دشمن کے زوال یا نقصان پر خوش نہیں ہونا چاہیئے تو وہ جواب دیتا ہے" ہاں یہ تو صرف اسرائیلی دشمنوں کے متعلق ہے، تیرے متعلق تو صاف لکھا ہے" ان کو بلندیوں سے نیچے گرادو" اسرائیلی قوم کی شرعی و اخلاقی ذہنیت مندرجہ بالا بیانات وعقائد سے ایسی اچھی طرح واضح نہیں ہوتی جیسے کہ مندرجہ ذیل ٹھوس واقعہ سے، جس کو صریحاً بڑے فخر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے" ربی شیلا نے ایک شخص سے کسی مصری عورت کے ساتھ زناکاری کرنے کے جرم میں، آئندہ کے لئے ضمانت نیک چلنی طلب کی، وہ شخص بادشاہ مصر کے دربار میں جاکر ربی شیلا کے خلاف فریادی ہوا کہ حضور یہودیوں میں ایک شخص ہے، جو بغیر شاہی اجازت کے سزائیں دیتا ہے" بادشاہ نے فوراً کسی کو بھیجا کہ اسے بلا لائے۔ جب وہ حاضر ہوا تو منصفوں نے کہا "تم نے اس شخص کو سزا کس لئے دی" ربی نے جواب دیا "کیونکہ اس نے ایک گدھی کے ساتھ مباشرت کی ہے" انھوں نے پوچھا "کیا تمھارے پاس کوئی شہادت ہے" جواب دیا "ہاں جناب" پھر ایلیا انسان کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس نے

شہادت دی، قاضیوں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو وہ گردن مارنے کے لائق ہے" ربّی نے کہا حضور جس روز سے ہم "آوارۂ وطن" ہوئے ہیں، ہمیں کسی کو مارنے کا اختیار نہیں ہے" آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں" قاضی ابھی اس معاملہ پر غور ہی کر رہے تھے کہ ربّی نے یوں بولنا شروع کیا "اے یہوواہ (خدائے یہود) سب بزرگی اور طاقت تیری ہے" قاضیوں نے اس سے پوچھا "کیا کہا؟" اُس نے جواب دیا "مبارک ہے وہ ارحم الراحمین، جس نے دنیا و آسمان پر اپنی بادشاہت قائم کی اور تمھیں اپنا عادل اور رحم دل نائب مقرر کیا" قاضیوں نے سوچا کہ یہ شخص تو سلطنت کی آن و عزت کا حامی و محافظ معلوم ہوتا ہے، اس لئے انھوں نے اسے ایک سونٹا دیتے ہوئے کہا "یہ لو، تم ٹھیک کہتے ہو"

جب ربّی شِلا باہر نکلا تو مجرم نے اُس سے کہا "کیا خدائے رحم دل جھوٹوں کی حمایت کرتا ہے؟ حیرت ہے!" ربّی نے کہا "بدذات! کیا مصری لوگوں کو گدھے نہیں کہتے؟ عزاخیل ۲۳ : ۲۰ میں صاف لکھا ہے کہ ان کی کھال گدھوں کی کھال کی طرح ہے" جب یہ سن کر اس شخص نے چاہا کہ پھر اندر جا کر کہے کہ ربّی، تم مصر کے لوگوں کو گدھا کہتا ہے، تو ربّی نے یہ سوچ کر کہ یہ شخص "ناحق ستانے والا ہے" اور مجھے ضرور برباد کر کے چھوڑے گا۔ لہٰذا اب تو اس کو مار دینا چاہیئے" اُس نے سونٹا لیا اور اُس شخص کو وہیں مار دیا اور کہا "کتابِ مقدس کی ایک آیت نے آج معجزہ دکھایا، میں پھر کہتا ہوں "اے یہوواہ ساری بزرگی اور طاقت تیری ہے" یہ چھوٹا سا نہایت سہل الفہم واقعہ کسی شرح کا محتاج نہیں، اسرائیلیوں کی غیر اسرائیلیوں سے بے وجہ نفرت، ایلیا نبی کی حمایتِ کذب وافترا، تالمود میں قتلِ ناحق کی اجازت، اسی میں سب کچھ موجود ہے، اور اگر ہم ۵۔ کتاب موسیٰ ۲۳ : ۲۰ کا مقولہ "تم غیر اسرائیلیوں سے سود لو۔ مگر اپنے بھائیوں سے نہ لو" بھی اس کے ضمن میں یاد رکھیں تو سب کچھ صاف ہو جاتا ہے،

تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں کے پُر آشوب زمانے میں، جب کہ ایران پر ارغون خان کی حکومت تھی، یہودیوں کو بہت اقتدار حاصل تھا شاہ موصوف کی حکومت کے آخری

حصہ میں ایک یہودی سعدالدولہ وزیر تھا۔ اس کو اس قدر طاقت اور اقتدار حاصل تھا کہ جو چاہتا سو کرتا، جس کو چاہتا اُٹھاتا جس کو چاہتا بٹھا دیتا تھا۔ مسلمان اس سے نفرت کرتے تھے۔ مگر چونکہ ارغون خان اس پر بہت مہربان تھا اس لئے اس کا بگاڑ کچھ نہیں سکتے تھے۔ یہ شخص طبیب بھی تھا۔ اور ساہوکار بھی۔ ساری سلطنت کے مالی نظم و نسق کا واحد اجارہ دار بے حد طمّاع و ممسک ہونے کی وجہ سے نت نئی تدبیریں خزانوں کو بھرنے کی، نکالتا تھا۔ اس وجہ سے ایلخان اس پر بہت خوش تھا۔ اس زمانہ کے کسی شاعر نے لکھا ہے۔

یهود هذا الزمان قد بلغوا　　مرتبةً لاینا لها فلك

الملك فيهم والمال عندهم　　ومنهم المستشار والملك

يامعشر الناس قد نصحت لكم　　تهوّدوا قد تهوّد الفلك

بالآخر اس افسون طراز یہودی نے ارغون کو کچھ ایسا بدھو بنایا۔ کہ مسلمانوں کو تمام ملکی و مالی و فوجی عہدوں سے برطرف کروا دیا۔ اور یہاں تک کوشش کی کہ ان کے مذہب کو ہی صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اس نے ارغون کو اس بات کا یقین دلایا کہ نبوت عربوں کے بعد اب مغلوں میں آگئی ہے۔ اور خدا نے انھیں محمدؐ کے گمراہ پیرووں کو سزا دینے کے لئے بھیجا ہے اس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ خانۂ کعبہ کو پھر سے بت کدہ بنا دیا جائے۔ بغداد کے مقام پر اس شخص نے ایک بحری بیڑا تیار کرایا تاکہ بحیرہ قلزم میں سے جاکر مکہ پر حملہ آور ہو۔ خواجہ نجیب الدین کحال کو جو اس کا ہم مذہب تھا اس نے خراساں بھیجا اور اس کو قریبًا ۲۰۰ برگزیدہ مسلمانوں کی فہرست دی کہ ان کو تباہ کر دیا جائے۔ اسی طرح شیراز میں بھی اس نے کسی کو ایسی فہرست دے کر بھیجا۔ مورخ کہتے ہیں کہ ارغون خان پہلے بہت رحم دل تھا اور خونریزی سے بہت پرہیز کرتا تھا۔ سعداللہ کی صحبت بد اور پیہم انگیخت کی وجہ سے بالآخر یہی بادشاہ اس قدر ظالم اور سنگ دل ہوگیا کہ ذرا سے شبہ پر بڑے سے بڑے عہدہ دار کو قتل کر دیتا تھا۔ مگر پیشتر اس سے کہ اس وزیر کی ظالمانہ تدبیریں تکمیل کو پہنچیں۔ ارغون بیمار ہوگیا۔ اور لوگوں نے بادشاہ کی وفات

سے چند روز پہلے ہی اسے مار دیا۔ حوالہ جات بڑھانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں، اس لئے ایک مسلمہ قابلیت کے یہود دوست 'مفکر' کے الفاظ پر کفایت کی جاتی ہے "جب یہودی ربی، عیسائیوں کے سامنے اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم یہودی تمام انسانوں کو ایک سا خیال کرتے ہیں، اور اُن کے ساتھ ایک سا اخلاقی رشتہ رکھتے ہیں، اور ہمارا مذہب دوسروں سے محبت کرنا سکھاتا ہے، تو اس سے زیادہ صریح جھوٹ اور کیا ہو سکتا ہے" مندرجہ بالا حقائق سے نہایت اہم نتائج نکلتے ہیں، یوروپین عیسائی چاہے کتنا بھی گمراہ ہو جائے، چاہے یہودیوں سے بھی گر جائے، اس کے اخلاق میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور باقی رہتی ہے جو اس کو نیکی کی طرف راغب کرے، یورپ کے سماج کے تحریری یا غیر تحریری روائتی اخلاقی معیار ایسے ہیں کہ اسے بہت حد تک چوری اور دغا فریب سے باز رکھتے ہیں۔ انسان کا جو خود غرضی اور خود پرستی کی طرف فطری رجحان ہے ان اخلاقی روائتوں کی وجہ سے رُکا رہتا ہے برعکس اس کے یہودی کی فطری خود غرضی کو اس کے عقائد و اخلاق سے تقویت پہونچتی ہے، اُس کے تعصب اور نسلی میلانات جن کا آئندہ ذکر کیا جائے گا اسے اور بھی قوی بنا دیتے ہیں۔

یہودی، غیر یہودی کی جائداد کو پیدائشی طور پر اپنا حق تصور کرتا ہے، غیر یہودیوں کی مِلک ان کے نزدیک کسی کی مِلک نہیں، جو یہودی اس پر قبضہ کر لے اس کا جائز مالک ہے، غیر یہودی کے ساتھ ایفائے عہد و پیمان ضروری نہیں، غیر یہودیوں کا اپنی جائز بیویوں پر بھی کوئی حق نہیں ہے، وہ درحقیقت ان کی بیویاں ہی نہیں ہیں، اس طرح ہر غیر اسرائیلی قوم کو لوٹنا ان کا گویا جائز حق ہے، یہود کی طرف سے اقوام عالم پر جو جو فریب کئے گئے ہیں جس جس طرح سود کے ذریعے سے ان کا خون نچوڑا گیا ہے، ان کو ہم اخلاقی لغزشیں خیال نہیں کر سکتے۔ برعکس اس کے وہ تو شریعتِ یہود اور احکامِ تالمود کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ لُوتھر نے اسی تلخ حقیقت کے خلاف آواز اُٹھائی تھی، گوئٹے نے بھی اعتذار کے طور پر کہا تھا "ان سب کا عقیدہ یہ ہے کہ غیر یہودیوں کو لوٹا جائے" اور اسی وجہ سے فختے نے ناامید ہو کر کہا "یہودی چاہے عیسیٰ پر ایمان نہ بھی لائے

سزا

(عبدالغفور صاحب۔ ایم اے)

آپ نے دریا میں اکثر بھنور پڑتے دیکھے ہوں گے۔ بھنور کے اندر چھوٹے بھنور یا بھنوریاں بھی ہوتی ہیں۔ ہندو کے عقیدے کے مطابق پوری کائنات آواگون کے بھنور میں پھنس کر رہ گئی ہے سزا اور جزا۔ جزا اور سزا، کبھی جزا کبھی سزا۔ اگر غور سے دیکھیں تو یہ بھنور ہی نہیں اس میں بھنوریاں بھی ہیں۔ یہ ایک جنجال ہی نہیں اس میں چھوٹے جال بھی ہیں۔ آواگون کا چکر بڑھاپے کے خاتمے پر شروع ہوتا ہے اور مدرسے کا چکر شیر خوارگی کی موت کے بعد۔ آواگون میں پچھلے جنم کے کشٹوں کا بدلہ اگلے جنم میں ملتا ہے مگر اسکولی کائنات میں اسی جنم کا بدلہ اسی میں ملتا ہے۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ جہاں تک سزا کا تعلق ہے یہ سودا تو لفظاً اور معناً ہاتھوں ہاتھ ہی جاتا ہے۔ استادوں نے یہ تحفہ اپنے استادوں سے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہاتھوں ہاتھ نئی پود کو پہنچا دیا۔ جنہوں نے تعلیم کی تعریف یہ کی کہ تعلیم، تمدنی اور معاشی ورثہ کو ایک نسل سے دوسری میں منتقل کرنا ہے اُنھوں نے اس انتقال کے سزائی پہلو کو بالکل فروگزاشت کر دیا اور اس حد تک ان کی تعریف جامع قرار نہیں دی جا سکتی۔

بہر حال اگر ہمارا آواگون پر اٹل اعتقاد ہو تو مدرسے میں سزا کا مسئلہ یوں صاف ہو جاتا ہے جیسے کسی پیر روشن ضمیر کا ڈنڈا پڑنے سے مرید پر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں جب ماں باپ یہ کہہ کر بچے کو استاد کے ساتھ سونپ دیتے ہیں کہ "ہڈی ہماری اور ماس تمہارا" تو اس کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں ہوتا کہ گوروجی بچوں کا ماس کھاتے ہیں اور ہڈیاں چچوڑ چچوڑ کر الگ پھینکتے جاتے ہیں، والدین کو تو خواب میں بھی خیال نہیں آ سکتا کہ گوروجی کا کسی مردم خور نسل سے کبھی دور کا بھی رشتہ رہا ہوگا۔ ایسا شبہ تو کسی ماہر معاشریات یا نفسیات کو ہی گزر سکتا ہے،

عقیدت مند والدین کا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ گوروجی کے فیضانِ روحانی سے بچے کی مادی کثافتیں یوں پگھل جائیں گی جیسے سردیوں کے سورج کے سامنے پانی کے اوپر جما ہوا پالا۔ مگر اس عمل کو پورا کرنے میں گوروجی بھی ایک حد تک خارجی ذرائع کی امداد لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

مادی کثافتوں کو دور کرنے سے پہلے جسمانی ثقالتوں کو کم کرنا بھی تو ضروری ہے۔ اور بعض بچوں کی ثقالت تو الہٰی توبہ! کسی کی کھال اتنی دبیز ہوتی ہے۔ کسی کے دماغ پر اتنی چربی چڑھی ہوتی ہے کہ گوروجی کی نگاہِ تیز تو کیا ایکسرے کو بھی اس میں سے گزرنے میں ایک مرتبہ تو کشمکش کرنا ہوگی اور پہنچنا بھی تو ہڈیوں تک ہوتا ہے۔ اسی لئے انہیں اس دشوار گزار راستے کو طے کرنے کے لئے ضرور مقدس تیج پھل کے ڈنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور پھر اسی مسئلہ کا ایک آواگونی پہلو بھی ہے۔ جب گوروجی کسی چیلے کو مرغا بنا کر اس کی پشت پر ایک پانی کا مٹکا رکھانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس وقت خدانخواستہ اس سے کوئی ذاتی انتقام نہیں لیتے اس وقت وہ اس آواگونی تیند وا کی ایک تانت ہیں جس نے اس غریب چیلے کو اپنے عالمگیر ریشوں میں جکڑ لیا ہے۔ وہ تو محض آلۂ انتقام ہیں ان گناہوں کے جو اس نے کسی پہلے جنم میں کئے ہوں گے جب وہ کسی ودیارتھی کے کان اینٹھتے ہیں تو انہیں کس قدر روحانی مسرت ہوتی ہوگی۔ "ہے پربھو تیری لیلا نیاری ہے تو نے گوروجی کو اپنا خاص جمدوت بنایا"

گوروجی نے یہ کام ہزاروں سال سے جاری رکھا ہے اس لئے ان کا سزا کا نظریہ تو اچھا خاصہ فلسفہ بن گیا۔ مگر مولوی صاحب بھی ان سے کچھ پیچھے نہیں رہے۔ "گو گردِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں" آخر قبر میں بھی تو فرشتے گرز لے کر پہنچیں گے ہی۔ کیوں نہ بچے کو ابھی سے ایسی سزا کے لئے تیار کیا جائے۔

ہمارے اکثر گیت۔ ہمارا مذہبی ادب ایک غمگینی لئے ہوئے ہے۔ یہ ادب بالغوں کا ادب ہے یہ ادب ان زندگیوں کا ادب ہے جن پر مصیبتوں کے سائے گہرا ہونا شروع ہو گئے ہیں یہ ادب صبح کے سہانے وقت کی راگنی نہیں۔ یہ جھٹپٹے کے درد بھرے الاپ ہیں۔ مجھے ابھی

تک دوپہر کے وہ جھکڑ یاد ہیں جب باہر دوزخ کا منہ کھلا ہوتا تھا۔ گرم لوئیں دنیا کو بھسم کرنے پر تلی معلوم ہوتی تھیں اور ہم بند دروازوں کے اندر اماں جان کے پاس لیٹے ہوتے تھے دوپہر کی روشنی چھنتی ہوئی کانپتی ہوئی اندر آیا کرتی تھی اس جھٹپٹے کے عالم میں اماں جان ایک گیت گایا کرتی تھیں۔

چھپ جا چھپ جا تو میری جان اب گرزوں والے آئے ری

ہم بچے اکثر آپس میں بیٹھ کر عذاب قبر اور منکر نکیر کے گہرے مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے زندگی کی ابھی ابھی پھوٹتی ہوئی دھارا میں عجب تلخی سی ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس کے بعد مدرسے کی مار دھاڑ! ضرور یہ ایک تربیت تھی اسی آنے والے عذاب کے لئے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے تعلیمی ضبط اور روحانی تربیت کا تو بنیادی اصول ہی ازلی گناہ کا عقیدہ تھا۔ حضرت آدم نے پہلے گناہ کا خمیازہ خود تو بھگتا ہی تھا مگر اس کا بار اولاد آدم پر بھی پڑا۔ ان کے شانوں پر نہیں بلکہ اسکولی زبان میں بچوں کی ہتھیلیوں پر، اور مکوں کی شکل میں پشت پر۔ اس عقیدے کے مطابق انسان میں ابھی تک شیطان حلول کئے ہوئے ہے۔ اس زمانے کے راہب استادوں کا منطق کچھ اس قسم کا تھا اور یہ یاد رہے کہ ان کی منطقیانہ روایات بالواسطہ ارسطوئے یونان کے منطق سے وابستہ تھیں اس لئے اس میں زیادہ شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ مار کے آگے بھوت بھی ناچتا ہے۔ شیطان بھوت پریت کی برادری کا شاہکار ہے اس لئے شیطان مار کے آگے ضرور ناچے گا۔ اس لئے اگر بچے کو پٹائی کے ایک باقاعدہ کورس سے گزار دیا جائے۔ ایک روحانی منضج و مسہل کے مکمل نظام سے۔ تو اس پر سے اس ازلی دھبّے کا نشان مٹ سکے گا۔ اس عقیدے کے سب سے بڑے حامی سینٹ آگسٹین کی سب سے پہلی دعا مدرسے میں پٹائی کے متعلق ہے اپنے اعترافات میں لکھتا ہے "خدایا۔ تو ہی میرا مددگار اور محافظ ہے۔ تجھی سے میں نے بچپن میں دعائیں مانگی ہیں۔ اور ایسی گڑگڑا کر دعائیں مانگی ہیں کہ ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کہیں زبان کے ریشے تانت کی طرح ٹوٹ نہ جائیں۔ ابھی میں بہت چھوٹا سا تھا جب میں نے بڑی ہی الحاح وزاری

سے دعا مانگی تھی کہ خدایا مجھے مدرسے کی مار سے بچانا۔" "اور جب تو نے میری التجاؤں اور میری گریہ وزاری کو نہ سنا تو میری پٹائی پر جو میرے لئے دنیا بھر کی سب مصیبتوں سے بڑھ کر تھی۔ میرے بزرگ میری ہنسی اُڑایا کرتے تھے۔ ہاں۔ ہاں۔ میرے ماں باپ بھی مذاق کرتے تھے"

ہاں تو ان عیسائی ولیوں کو استادوں نے جی بھر کر پیٹا ہے۔ اور ممکن ہے اسی پٹائی کی وجہ سے ہی وہ اتنے اونچے روحانی درجے طے کر گئے۔ مگر تھے قسمت کے ولی۔ مار سبھی نے ایک جیسی کھائی۔ معمولی بچے اسکولی درجوں میں مارک ٹائم کرتے رہے اور یہ لوگ ولایت کے درجے طے کر گئے۔

البتہ بعض ولیوں کو یہ سودا کافی مہنگا پڑا۔ ایک ولی کو اُستاد روزانہ پیٹتا تھا قصور ہو نہ ہو سزا روزانہ ملتی تھی۔ بچہ پٹائی کے لحاظ سے اچھا خاصہ سرمایہ دار ہوتا جا رہا تھا خرچ نہ ہو تو روزانہ کی آمدنی پونجی میں شامل ہوتی رہتی تھی۔ اس طرح بے قصور سزا اکٹھا ہوتی رہتی تھی جب کبھی ضرورت پڑی تو حساب اس میں سے چکا دیا۔ اُدھر استاد بھی کل کی سزا کے فرض سے آج ہی سبکدوش ہو جاتا تھا اسے کہتے ہیں معاملے کی صفائی۔ اور ولیوں کے ساتھ تو معاملے ایسے ہی صاف ہونا چاہیئے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اگرچہ یہ فلسفہ ازلی گناہ کے بلند پایہ عقیدہ پر استوار کیا گیا تھا تاہم بعض ولیوں کے دل بچپن کی کمزوری کی وجہ سے اکثر اس عقیدے سے ڈگمگا جاتے تھے۔ آگسٹین لکھتا ہے "خداوندا۔ بچپن میں تیرے فضل و کرم سے مجھ میں قوت حافظہ یا ذکاوت کی کوئی کمی نہ تھی۔ تو نے میری بساط کے موافق مجھے یہ نعمت فراوانی سے عطا کی تھی۔ مگر ہم بچوں کے دل تو بالکل کھیل پر لگے رہتے تھے۔ اس قصور پر ہمیں وہ استاد مارتے تھے جو خود بھی کھیل کم پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ بالغوں کی بیکاری بھی مصروفیت ہی اور جب بچے ان کی پیروی کرتے ہیں تو وہی بالغ اُنھیں پیٹتے ہیں۔ خدایا ان بچوں کے لئے کسی کے دل میں رحم نہیں آتا۔ اور نہ ان لوگوں ہی پر جن کی ایسی ذہنیت ہی"

بہر حال یہ تو تعلیم کے مذہبی نظریہ کے شاخسانے ہیں۔ ان کا مقصد بچے کو آخرت کے لئے تیار کرنا ہے اس کے عذاب و ثواب کے لئے روحانی اور جسمانی طور پر تربیت دینا اس لحاظ سے اسکولی سزا و جزا ایک ٹکڑا ہے اس عالمگیر فلم کا جو کائنات کے اسٹیج پر کھیلی جا رہی ہے۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ تعلیم کا یہ نظریہ ہمیشہ ہر زمانہ اور ہر دور میں ہر ملک ہر قوم میں مقبول نہیں رہا۔ اور پچھلی صدی سے تو پرانے قسم کی تعلیم کی بنیادوں میں پانی مر رہا ہے۔ نئے مقاصد، نئے طریق ایجاد ہو رہے ہیں۔ مگر ایک حد تک ہمارے مدرسوں میں ابھی تک خوف اور استبداد۔ جبر و اکراہ کا دور دورہ رہا ہے۔ اور ہے۔ ہمارے ناتجربہ کار نئے بھرتی ہوئے استاد جنھوں نے ابھی تعلیمی کوڈ میں سزا کے متعلق احکامات نہیں پڑھے، ہاتھ کے ڈر میں یقین رکھتے ہیں اور تجربہ کار استاد آنکھ کے ڈر پر ایمان لا چکے ہیں۔ اور کچھ غور و فکر کرنے والے لوگ تو استاد کے پورے جسم کو ایک گھومتی گھماتی۔ چلتی پھرتی، مجسم آنکھ، دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُستاد کہیں ہو مگر بچے کو ہمیشہ احساس ہونا چاہیئے کہ استاد کی آنکھ اسی پر ہے۔ اگر بچے کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے تو اُستاد کی بوٹی بوٹی دیکھتی ہے یا دیکھ سکتی ہے یہ تجویز ضرور اُستادوں کے کسی بالغ نگاہ پیر و مرشد نے پیش کی ہے یہ صفت اُستاد کو روحانی طاقتوں کے کتنا قریب لے جاتی ہے!

اس وحشت پسندی اور خوف کی وجہ کیا ہے! شاید ہم بچے کو ایسی سماج کے لئے تیار کرنا چاہتے ہیں جہاں ایسی اقدار کا ہی راج ہے۔ جہاں کا نظام فاتح اور مفتوح۔ ظالم اور مظلوم۔ ضارب اور مضروب کی طبقاتی تقسیم پر مبنی ہے۔ تو گویا اسکولی زندگی زندگی نہ ہوئی زندگی کے لئے تیاری ہوئی۔ اس کا بچپن کا زمانہ اپج اور اُٹھان کا زمانہ ہے۔ خوشی اور مسرت کا زمانہ ہے۔ ہم اسے آئندہ زندگی کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ ایک کلولیں کرنے والے معصوم کو کالی دیوی کے مندر پر قربان کر رہے ہیں کیا آئندہ زندگی اتنی مسرت انگیز ہے کہ اس کے لئے بچپن کے عزیز لمحوں کو تلخ کر دیا

جائے۔ ہم زندگی کے اُبلتے ہوئے شیریں چشمے میں زہر گھول رہے ہیں۔ ہم زندگی کے دلفریب ساز کے تاروں کو برابر کسے جا رہے ہیں۔ اس امید پر کہ کبھی یہ بس تریاق بن جائے گا۔ اور کبھی ان تاروں سے ایک روح بخش نغمہ نکلے گا۔ مگر کیا کبھی زہر بھی تریاق بنا ہے؟ کیا کبھی ٹوٹے ہوئے تاروں سے بھی راگنیاں نکلی ہیں؟ ایک سخت گیر زمیندار کی طرح جو کسان کے بھرے ہوئے کھلیان کو آگ دیدے اور اسے بے دخل کر کے ادسر زمینوں کی طرف دھکیل دے۔ ہم نے بچپن کے لہلہاتے باغ کو اجاڑ دیا اور اس کے بعد بچے کو اس سماجی صحرا کا راستہ دکھا دیا جو اسے گھیرے ہوئے ہے۔ ہم موجودہ مسرتوں کو آئندہ منفعتوں کے لئے سستے داموں بیچ رہے ہیں۔ اور اگر اس بچے کے لئے کوئی آئندہ ہی نہ ہو۔ اگر وہ کل اللہ کو پیارا ہو جائے (آپ کو تو شاید پیارا نہیں) تو آپ کی اس دور اندیشی کا کیا نتیجہ ہوا۔ آپ نے ایک موہوم اُدھار کی امید میں ہاتھ کی نقدی کو بھی کھو دیا۔ آپ نے موجودہ حقیقتوں کو مستقبل کے خواب پر نچھاور کر دیا۔

تشدد اور سخت گیری کا یہ دور ہمارے ہاں ہی نہیں اور ملکوں میں بھی خاص طور پر ولایت کے اسکولوں میں جاری تھا اور اب بھی ہے۔ ولایت میں تو ابھی پچھلی صدی میں ہر جماعت کے انچارج دو استاد ہوتے تھے۔ ایک پڑھاتا تھا اور دوسرا بید لئے پچھلی طرف تعلیمی پہرا دیا کرتا تھا گویا بچے کوئی مجرم تھے جو اس تعلیمی عدالت میں جبراً پیش کئے گئے تھے۔ آج کل تو استادوں میں مداری کی سی چابک دستی آگئی ہے، بہ یک وقت ہانک بھی سکتے ہیں اور چارہ بھی کھلاتے جاتے ہیں۔ اُن دنوں یہ کام آسان نہ تھا۔ صنعتی انقلاب ابھی ابھی ہوا تھا۔ مشین کی برکات۔ میکانکی پیداوار۔ کارخانہ داری، حساب سے پیداوار، میں عقیدہ زور پکڑ رہا تھا۔ انفرادی طور پر پیداوار خلاف سائنس تھی لہٰذا انفرادی طریق پر تعلیم بھی خلاف اصول قرار دی گئی۔ بچوں کی تعلیمی پیداوار بھی میکانکی پیمانہ پر ہونا چاہیے اس لئے یہ بھیڑوں کا گلہ یعنی جماعت کے سکشن کئی کئی سو کے ہوتے تھے۔ اور آپ خوب

جانتے ہیں کہ جب مال کی کھپت کارخانہ داری کے اصول پر تیار کی جاتی ہے تو تقسیم کار کا اصول لازمی نہیں لابدی ہو جاتا ہے لیکن میکانکی نظام کے بد نتائج یہاں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ جوں جوں "تعلیمی مقدار" بڑھتی گئی معیار گھٹتا گیا۔ سزائیں زیادہ ہوتی گئیں اور ضبط کم ہوتا گیا۔

یہ تو نئی طرز کے ابتدائی مدارس کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ ولایت کے مشہور و معروف پبلک اسکول ہیں۔ ان کی تعلیمی دھاک تو شاید ساری دنیا میں نہ بیٹھی ہو لیکن ان کی مار کی دھاک ولایتی طلبار کی پیٹھ پر کیا ایک دنیا کی پیٹھ پر بیٹھی ہوئی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جب ایک کھلنڈرے بچے نے شرارت کی تو ایک ولایت کے پڑھے ہوئے اُستاد نے آنکھیں نکال کر کہا تھا کہ میں تمھیں عین ولایتی پبلک اسکول کی شاندار پُرانی روایات کے مطابق بید لگاؤں گا۔ ہمیں یقین ہے کہ ولایتی اور شاندار کی جھنکار سُن کر بچے نے ہنر ورِ پشتِ تسلیم ایک دفعہ تو خم کر دی ہو گی۔

ان ہی شاندار ولایتی روایات کے مطابق آرنلڈ رگبی کا مشہور ہیڈ ماسٹر اپنے طلبار کو سزا دیا کرتا تھا۔ اور ان میں عیسائیت کے ایک سچے پیرو کا عجز اور انکساری ٹھونک ٹھونک کر بھرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ بقول برٹرنڈ رسل ایسے روحانی لحاظ سے تربیت یافتہ طلبار جب فوج یا سول سروس میں بھرتی ہو کر ہندوستان آئے تھے تو پبلک اسکول کی شاندار روایات کے مطابق ہندوستانیوں کے بھی بید لگاتے تھے۔ آرنلڈ کے عمل کا ردِ عمل پنجاب میں نہایت کامیابی سے کیا گیا۔ اسی لئے شاید وہاں کے چند قائدین نے پچھلے سال ولایتی پبلک اسکولوں کے نمونے پر چند ادارے کھولنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

سچ پوچھئے تو آرنلڈ کے شاگردوں کا ایسا کچھ قصور بھی نہ تھا۔ وہ اپنے دبیلے ہوئے اور مجروح رجحانات کا اس طرح کھلے بندوں مظاہرہ کرتے تھے۔ سچ ہے پانی

رجحان کی طرف مڑتا ہے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچتی ہے۔ اور کمہار کا جب کمہاری پر زور نہیں چلتا تو گدھے کے کان اینٹھنے لگتا ہے اور بالخصوص جب گدھا ایسا ہو کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں اور کوئی دولتی بھی نہ جھاڑ سکتا ہو۔ آپ اخلاقی طور پر لاکھ اس کی مذمت کریں عالم نفسیات جس سے بڑا فیلسوف شاید ہی آج تک دنیا نے پیدا کیا ہو فوراً اس کے دلائل و براہین دینے کی کوشش کرے گا کہ صاحب یہ تو اس کے دبے ہوئے رجحانات کا مظاہرہ ہے۔ یہ اس کے کاٹنے چیرنے پھاڑنے کی فطری جبلت کا کرشمہ ہے (اور پھر ذرا غور سے گدھے کے کانوں کو بہ نظر غائر مطالعہ کرکے اور اپنی دو انگلیوں کی پوروں سے چھو کر اور پھر گھن کھا کر چھوڑ دینے پر) مجھے تو اس میں رجحان صاف نظر آتا ہے یعنی مار کھانے کا رجحان۔ مثلاً اس کے کان تو دیکھو۔ ارتقائی لحاظ سے ان کو صریحاً کھینچنے کے لئے بنایا گیا ہے اور پیٹھ تو دیکھو کس قدر چوڑی چکلی۔ یہ ہے ہی لٹھ جمانے کے واسطے۔ گدھا کیا ہے مار کھانے کی نشانی ہے۔ بس اب تو معاملہ خوب صاف ہو گیا۔ ایک طرف فطرت کا ودیعت کیا ہوا رجحان ہے مارنے کا اور دوسرے میں مار کھانے کا بھئی جب دونوں راضی تو تم بیچ میں قاضی بننے والے کون۔ لیکن اگر کوئی گدھے کے دل سے پوچھے اور دل تو شاید اس کا بھی ہوتا ہوگا۔ شاید اس ڈراما میں وہ اپنا پارٹ بدل لینا چاہے۔ اگر آقا کو ہاتھ پاؤں باندھ کر میدان میں پھینک دیا جائے اور گدھے کو کھلے بندوں اجازت ہو تب؟ بہت سے اساتذہ سزا کے اسی نظریہ پر ایمان رکھتے ہیں

اگرچہ یہ نفسیاتی موشگافیاں اسی صدی سے شروع ہوئی ہیں اور خدا جانے اس نے دنیائے تعلیم میں کتنی شر انگیزیاں کی ہوں گی۔ مگر شکر ہے کہ ہنوز ہندوستانی اساتذہ کے کانوں تک یہ بات نہیں پہنچی کہ مغربی علماء نے ان کے جذبات اور رجحانات پر صاد کر دیا ہے ویسے عملی طور پر تو وہ ایک زمانے سے اس استاد کے دل کو لگنے والے اور بچے کے دل کو آگ لگانے والے نظریئے پر ایمان لاتے چلے آئے ہیں۔

مطالعۂ لغت

(از جناب لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی)

اگر کہا جائے کہ کتاب کا مطالعۂ مفید اور دلچسپ مشغلہ ہے تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا بلکہ شاید یہ کہا جائے کہ اس میں بتانے کی کونسی بات تھی سبھی جانتے ہیں، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ لغت کا مطالعہ بہت زیادہ مفید اور بہت زیادہ دلچسپ مصروفیت ہے، تو اسے کم سے کم ایک مذاق ضرور سمجھا جائے گا، مگر اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی کہ لغت کا مطالعہ ایک نہایت ہی مفید اور بے حد دلچسپ شغل ہے اور تصنیف و تالیف سے لگاؤ رکھنے والے کے لئے تو ناگزیر ہے۔

سوچئے گا تو دنیا کی سب سے پہلی تصنیف لغت ہی کو قرار دینا پڑے گا۔ آدم جس طرح سب سے پہلے انسان تھے اسی طرح سب سے پہلے لغت نویس بھی تھے، تورات میں مذکور ہے کہ آدم جب جنت سے دنیا میں پھینکے گئے تو سب سے پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ جانوروں کے نام رکھنا تھا، قرآن میں آیا ہے کہ ہم نے آدم کو اسمار کا علم دیا۔ لیکن آدم کی لغت نویسی کو اپنے طریقۂ تحریر پر قیاس نہ فرمائیے، یہ طریقہ تو فنون کے وجود میں آچکنے کے بعد کی چیز ہے۔

الفاظ کا استعمال ہر شخص کرتا ہے، لیکن جو شخص الفاظ سے جتنا واقف ہوتا ہے، اُن سے اتنا ہی کام لے سکتا ہے۔ ہر زبان میں ایک مفہوم کے لئے متعدد الفاظ اور مختلف اسلوب ہوتے ہیں، لیکن کوئی شخص اگر موقع پر موقعے کا لفظ نہیں بولتا تو اپنا مطلب فوت کر سکتا ہے، ایک وکیل مقدمہ ہار سکتا ہے، ایک دوکاندار گاہک کھو سکتا ہے اور ایک لیڈر کی تجویز گر سکتی ہے، وغیرہ۔ چنانچہ میرا عقیدہ ہے کہ لفظوں کو صحیح طور پر جاننا ہر خاص و عام کی زندگی کی اہم ضرورت ہے۔

رسکن نے کہا ہے کہ تم الفاظ کے صحیح استعمال پر اسوقت تک قادر نہیں ہوسکتے جب تک تم ان کی رُوح سے آشنا نہ ہو۔ بنابریں الفاظ کو جاننا ایک بات ہے اور انکی روح سے آشنا ہونا دوسری۔ اور ایک انشا کے باب میں میرا خیال ہے کہ الفاظ کے صحیح استعمال پر قادر ہونا گویا لفظوں سے محبت کرنا ہے۔

کتاب کے الفاظ کو ہم ان کی محدود حیثیت میں جان سکتے ہیں کیونکہ کتاب کے اندر لفظ پوشش ولباس میں لپٹا ہوتا ہے، الفاظ کی روح سے آشنا ہونے کے لئے لغت کا مطالعہ ازبس ضروری ہے، لغت کے اندر الفاظ کے جملہ معانی اور اُسکے مفہوم کے تمام پہلو ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور ہم ان کی روح معانی کو عریاں دیکھ سکتے ہیں

لغت کے اندر جتنے لفظ درج ہوتے ہیں تمام اچھے اور برے، وہ سب محبت کئے جانے کی چیز ہیں۔ بالخصوص کوئی اہل قلم اور صاحب مطالعہ ان سے الفت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ذخیرۂ الفاظ سے اسے جتنی کم محبت ہوگی وہ اسی قدر اپنی زبان وادب کی روح سے بیگانہ رہے گا، اور اسی طرح اپنے مقصد انشا رکے ساتھ اتنا ہی غیر مخلص۔

ایک طالبعلم کے اسکول سے غوطہ لگا جانے کی طرح اگر ہم کبھی کبھی تھوڑا سا وقت نکال کر کتب لغت کا مطالعہ کریں تو اس تھوڑے سے وقفے میں بھی ہم بڑے بڑے طلسمات کی سیر کرسکتے ہیں، اپنی فرہنگ کا مطالعہ طلسم ہوشربا کے مطالعہ سے زیادہ دلچسپ تمدن عرب کے مطالعہ سے زیادہ سبق آموز، فلسفۂ جذبات کے مطالعہ سے زیادہ علم آفریں ہوسکتا ہے، جواہر کی یہ ردیف دار فرہنگ ایک متحرک کردینے والا ارمان ہوتا جیسے معدنی اشیاء کی میوزیم کی فہرست کسی سفرنامے سے بہتر معلم ثابت ہوتی ہے۔

لغت کو اگر دیکھئے تو ایک ردیف دار کائنات کے سوا کیا ہے؟ تمام کتابوں سے اعلیٰ اور بڑی کتاب ہے کہ پچھلی تمام کتابیں، اسی میں سے نکلیں اور آئندہ کی بے شمار کتابیں بھی اسی کے اندر سے نکالی جائیں گی۔ لغت میں مندرج ردیف وار الفاظ حقیقت میں گویا

زندگی و ذہنیت کی وہ تصویر ہے جیسی کہ ڈاکٹروں کے مطب میں انسانی بدن کی تشریحی تصویر یا ڈھانچہ ٹنگا رہتا ہے۔ لغت میں درج الفاظ کے اندر اس زبان کو بولنے والی قوم، اسلاف واخلاف کی اور ایک حد تک دوسر قوموں کی بھی، ذکاوت ذہانت اور طبیعت و فطرت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ لغت میں پوری قوم کی نسلوں کے عہدے اور مشقیں، رنج اور راحتیں محفوظ ہوتی ہیں، کسی زبان کی لغت اس زبان کو بولنے والی قوم کی اجتماعی اور انفرادی ذطانت (جینیس) کا خزانہ کہا گیا ہے۔

لغت کا مطالعہ دو جہت سے کیا جا سکتا ہے، ایک تو الفاظ کے اندر معنی ومفہوم پیدا ہونے کی طلسم آفرینی کے پہلو سے دوسرے اس کے غیر محدود علمی وتاریخی افادے کے رُخ سے، ایک میں ہم کھو جا سکتے ہیں اور دوسرے سے بے اندازہ مستفید ہو سکتے ہیں۔

ہماری زبان کی عمر زبان کی حیثیت سے زیادہ نہیں، اور اسی لئے ہماری فرہنگ بھی مختصر ہے، اور جس قوم کی فرہنگ مختصر ہو وہ مسلمہ طور پر حصول علم میں پیچھے رہتی ہے، اور معاملات زندگی میں اسی حد تک سوچ سکتی ہے جس حد تک اس کی لغت کے الفاظ ساتھ دے سکتے ہیں، مگر یہ بھی ایک قدرتی طریقہ ہے کہ کم مایہ زبانیں کسی دوسری متمول زبان سے استفادہ کرکے متمول بنتی رہتی ہیں، جس طرح آج انگریزی سے استفادہ کرکے ہندوستانی زبانیں متمول بن رہی ہیں اور گذشتہ عہد میں فارسی سے مستفید ہو چکی ہیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اس وقت ہم علمی فنی اور سیاسی مسائل میں جو کچھ سوچ رہے ہیں اسے ہمارا قومی ذہن دراصل انگریزی میں سوچتا ہے۔ ہم نے اگر انگریزی حاصل نہ کی ہوتی تو یقیناً غور و فکر بھی اس سطح پر نہ ہوتے جہاں آج نظر آرہے ہیں۔

لیکن کم مایہ زبان کی لغت میں بھی اس کی بولنے والی قوم کی زندگی زندہ ہوتی ہے، اور کہیں کہیں دوسری مرز و بوم کی زندگی بھی بولتی چالتی دکھائی دیجاتی ہے۔

جس وقت ہم اپنی زبان کی لغت کا مطالعہ کرنے بیٹھیں گے تو نظر آئے گا کہ ہر لفظ

کسی عندیئے یا خیال کی تصویر یا کسی احساس کا نقش ہے، ایک ایسے احساس کا جو پہلے ایک عندیہ تھا اور پھر بے شمار انسانوں کا احساس بن گیا اور اب تک بنا ہوا ہے۔ عندیات اور احساس کا یہ خزانہ ہمارے اسلاف کے اور ہمارے جسم و جان، بلکہ کسی حد تک انسانیت کے جسم و جان کی مشقتوں کا ماحصل اور عطر ہے۔ اپنی لغت کے اندر ہم اس زندگی کے پورے سلسلے کو زندہ دیکھ سکتے ہیں جو ہمارے مقدس وطن کی پاک ہوا میں سانس لے چکی ہے اور لے رہی ہے۔

دوسری قوموں اور مرز و بوم کی زندگی ایک زبان کے اندر کس طرح جھلکتی ہے اس کا نقشہ دیکھنے کے لئے ان دو لفظوں کی حقیقت پر توجہ کرنا کافی ہوگا۔

ہماری زبان میں ایک لفظ ہے "شاخسانہ" یہ فارسی زبان کا لفظ ہے، صحیح "ساخسانہ" تھا مگر ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہی "شاخسانہ" بن چکا تھا۔ ایران میں اس کے معنی دھونس دے کر وصول کرنے والا اور دھونس دے کر وصول کرنا تھے۔ اس لفظ کے وجہ تسمیہ بننے کی وجہ یہ ہوئی کہ ایران میں فقیروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کے ہاتوں میں شاخ یعنی سینگ اور شانے کی ہڈی ہوتی تھی اور بھیک لئے بغیر ٹلتے نہ تھے۔ اس گروہ کا مثنیٰ ہمارے یہاں بھی چیپڑوں کی جماعت ہے۔ اب یہ لفظ جب ہماری زبان میں آیا تو نہ معلوم کس پراسرار طریق پر خواہ مخواہ اس کا مفہوم عیب، خرابی، اور تکرار وغیرہ ہو گیا۔

دوسرا لفظ کوتوال ہے۔ یہ خالص ہندی لفظ ہے اور کوتہ یعنی وہ جگہ جہاں سپاہی بند وقلیں اکٹھا کر دیتے ہیں اور روال، دو لفظوں سے مرکب ہے۔ بعض کے نزدیک کوتہ نہیں بلکہ کوٹ بمعنی حصار یا قلعہ ہے۔ وال کے ہندی معنی صاحب کے معلوم ہی ہیں۔ بہر حال یہ ہندی لفظ ایران جا پہنچا اور اس کے وہاں پہنچ جانے کا راستہ و طریق بھی یقیناً دلچسپ ہوگا

مقامات کے نام اپنے اندر ایک پوری تاریخ لئے ہوتے ہیں جس سے بہت سے معاشری حقائق کا استنباط کیا جاتا ہے اور ایک اچھے لغت میں یہ خزانہ ہمارے سامنے

بکھرا ہوتا ہے۔ چند ناموں کی وجہ تسمیہ پر غور فرمائیے۔

گیا اگر آپ نے دیکھا نہیں تو نام ضرور سنا ہوگا کہ صوبہ بہار میں ایک قدیم شہر ہے جو بودھ مت والوں کی نظر میں بہت مقدس جگہ ہے اور ہندوؤں کا بھی بڑا تیرتھ ہے، صرف ہندو نقطۂ نظر سے گیا کی وجہ تسمیہ کے متعلق دو روائتیں ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ راج رشی گوی نے یوگ کرکے بہت سی گائیں برہمنوں کو پن کیں، اور اس سے دیوتا خوش ہوئے تو گیا کا اُن کے نام سے منسوب ہونا مقدر کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس شہر کو گیا شر سے نسبت ہے جو وشنو بھگوان کے بہت بڑے بھگت گزرے ہیں۔ یما یعنے موت کے دیوتا نے وشنو بھگوان کو گیا شر سے اتنا خوش دیکھا تو اس خیال سے کہ گیا شر کی روح قبض کرنا دشوار ہوگا، وشنو بھگوان کو توجہ دلائی، اور وشنو بھگوان نے ایک چٹان پھینک کر گیا شر کو ختم کر دیا۔ مگر چونکہ گیا شر کی بھگتی زبردست تھی اس کی بنا پر وشنو بھگوان نے گیا کو تمام دیوتاؤں کا استھان قرار دے دیا۔ اور اس مقام کو یہ فوقیت بخشی جو شخص وہاں تیرتھ کو آئے گا اور شرادھ یا پنڈ دان کرے گا اس کے اسلاف کی آتما کو وشنو پد میں جگہ ملے گی۔ بعد میں اہلیا بائی نے گیا میں وشنو پد کا مشہور مندر تعمیر کرایا۔

خاندیس کا نام سن کر آپ کا خیال اس طرف ضرور جائے گا کہ یہ پٹھانوں کی یا ان کی بسائی ہوئی بستی ہوگی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ایک بڑا اور بھیلوں کا علاقہ ہے۔ جسے بھیلوں کے ایک قبیلے سے جس کا نام کھاندتھا نسبت ہے، ظاہر ہے کہ یہ قبیلہ بھیل قوم میں مقتدر اور با اثر ہوگا کہ اس کے نام سے سارا علاقہ موسوم ہوا۔ بعد میں تلفظ کی آسانی کے خیال سے مسلمانوں نے اُسے خاندیس کہا اور اب اسی نام سے معروف ہے۔

پنجاب کا پرانا نام برھماورت ہے، کیونکہ شروع میں آریا نسل کے پروہت یعنی برہمن وہیں رہے تھے اور ہندوستان کا پرانا نام آریاورت ہے، اس لئے کہ آریا نسل سارے شمالی ہند میں پھیل گئی۔ اس کے بعد پورا ہندوستان بھارت ورش کہلایا، کیونکہ بھرت بہت

مشہور راجہ گزرا ہے جس کا راج بہت بڑا تھا۔ اب پرانا نام زیادہ لوگوں کو یاد ہے
اب چند ایسے الفاظ پر بھی نظر ڈالئے، جن کو ہماری تاریخ معاشرت سے تعلق ہے
اور جن کے مفہوم سے ہندوستانی کی دو بڑی جماعتوں کے باہمی میل جول اور تعلقات
پر روشنی پڑجاتی ہے۔

کتھک سے ہماری مراد مرد ناچنے والے سے ہوتی ہے جو اپنے فن میں کامل سمجھا جاتا
ہے اس لفظ میں یہ مفہوم کس طرح پیدا ہوا۔ دیکھنے کی چیز ہے۔ ہندی میں ایک لفظ ہے کتھا
جس کے معنی وعظ و بیان کے ہیں۔ ہندی زبان میں مغل کے ساتھ حرف کاف بڑھا دینے سے
اسم فاعل بن جاتا ہے۔ چنانچہ کتھک کے اصل معنی ہیں کتھا کہنے والا، مدح کرنے والا۔
اب چونکہ فن وعقل کا مقصود اظہار ہے، اور ہندو مذہب میں شوالوں کی مورتیوں کے سامنے
رقص کے ذریعے بندگی وعبودیت کے جذبات کا اظہار و بیان ہوتا ہے، اس لئے رقاص
کو کتھک کہا گیا۔ لیکن اب اس لفظ میں بندگی وعبودیت کے اظہار کا مفہوم نہیں رہا۔ اب ہم
صرف ناچنے والے مرد کو کتھک کہتے ہیں، حالانکہ رقص عبودیت مندروں میں اب بھی برابر
ہوتا اور کتھک آج بھی رقص کرتا ہے۔

آپ اکثر بولتے اور سنتے ہیں "میاں ہٹاؤ اس کھٹراگ کو" اور "کہاں کا کھٹراگ لے
آئے"۔ یہ لفظ کھٹراگ ہر ایسی بات کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس سے ہمیں الجھن ہوتی
ہو، جو ہماری سمجھ میں نہ آئے، جو اصل معاملے سے متعلق نہ ہو وغیرہ۔ اصل لفظ غور کیجئے تو
معلوم ہوگا کہ کھٹ سنسکرت میں چھے کے عدد کو کہتے ہیں اور راگ کے معنی معلوم ہیں۔
یعنی چھے راگ۔ کھٹراگ ایک راگ کا نام تھا جو چھے راگوں یعنی بھیروں، مالکوس، سری
میگھ، ہنڈول اور دیپک کو ملا کر گایا جاتا تھا۔ پھر بعد میں سری راگ کے پانچویں پتر کو
کو بھی یہی نام دیا گیا اب معلوم نہیں کہ بہادر شاہ ظفر اس مخلوط راگ کے شیدا تھے، یا سری راگ
کے پانچویں پتر کے، یا یہ دونوں اصل میں ایک ہی تھے۔ مگر ظفر کے شوق کو دیکھ کر کہا جاسکتا

ہے کہ یہ راگ بہت اعلیٰ و پسندیدہ تھا۔ ظفر کا مصرعہ ہے" نیک سن کر ہی تیرا کھڑا گ آئے ہم تو ہیں"۔ اس لفظ میں جھنجھٹ اور جھمیلے کا مفہوم پیدا ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ علم موسیقی میں اعلیٰ مہارت نہ رکھنے والوں کے لئے ایک ملے جلے راگ کی قدر کرنا مشکل تھا، اس لئے ان کم فہموں نے مذاق یا طنز کے طور پر ہر ایسی بات کو کھڑ راگ کہنا شروع کر دیا۔ پھر اس میں بکھیڑے اور تکرار کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا اور وہ بھی کئی محاورے بن گئے، راگ کی حیثیت سے تو اس کا اب نام بھی نہیں سنا جاتا، گانا تو رہا ایک طرف، مگر یہ لفظ عام و خاص کی زبان پر ہے۔

ہم میں بہت ایسے ہوں گے جنھوں نے خاص کر دوالی کے تہوار پر صابونی نام کی ایک مٹھائی کھائی یا دیکھی ہوگی، اس مٹھائی کا سفید رنگ اور گول شکل دیکھ لامحالہ صابن کی طرف خیال جاتا ہے، کیونکہ ابھی تھوڑا عرصہ پہلے تک کپڑے دھونے کا صابن گول اور سفید ہی بنتا تھا، اس نام پر توجہ کیجئے گا تو یہ چیز ضرور سامنے آئے گی کہ صابن مسلمانوں کے ساتھ آیا، جیسا اس کے نام سے ثابت ہے۔ اس لئے یہ مٹھائی مسلم عہد کی یادگار ہے، اگرچہ بنتی ایک ہندو تہوار پر ہے۔ پھر شاید ہمارا ذہن خود صابن کے متعلق سوچنے لگے گا کہ صابن سے ہم نہانے کا کام نہ لیتے تھے اس کام کے لئے ہم ابٹن استعمال کرتے تھے اس کا یہ استعمال انگریزی عہد کی چیز ہے، اور اس کا غسل میں استعمال ہونا اس کی شکل اور رنگ و بو میں نفاست پیدا ہونے کا ذمہ دار ہے۔

لفظ کوتوال پر آپ اوپر نظر ڈال آئے ہیں۔ کوتوال کی نسبت سے کوتوالی بنا اور اور کوتوالی کے ساتھ چبوترے کا لفظ شامل ہوا، اور پھر چبوترہ خود کوتوالی کے معنی میں مستعمل ہو کر چبوترہ چڑھنا محاورہ بن گیا۔ جس کا مفہوم رپٹ رپٹی ہے، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ پچھلے زمانے میں کوتوالی کی عمارت میں چبوترہ خاص چیز تھا۔ شاید کوتوال چبوترے پر بیٹھ کر ہی فرض منصبی ادا کرتا ہو۔ اس لئے لفظ چبوترہ اور انصاف یعنی پولیس کا انتظام

مترادف لفظ ہو گئے تھے۔ میز کرسی آجانے اور نئی عمارتیں بن جانے سے یہ چبوترہ غائب ہو رہا ہے، لیکن پرانے تھانوں میں خاصکر مفصلات میں دیوان جی آج بھی چبوترے پر اپنا ڈیکس لے کر بیٹھتے ہیں۔

"کھرا کھیل فرخ آبادی" ایسا جملہ نہیں جو کسی نے نہ سنا ہو۔ اس کی ترکیب پر نظر کر کے یہی سمجھا جائے گا کہ کھرا کھیل فرخ آباد میں کھیلا جاتا ہوگا۔ لیکن ہم اس جملے کو جس مفہوم میں سنتے بولتے آئے ہیں اس میں کھیل کا کوئی مفہوم نہیں، بلکہ اس سے خوش معاملگی مراد لیتے ہیں۔ اب دیکھئے کس مخفی طریق پر اس کے اندر "اس ہات دے اس ہات لے" کا مفہوم آیا کسی زمانے میں فرخ آباد میں ٹکسال تھی اور وہاں کا سکہ سب سے زیادہ کھرا سمجھا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے آج انگلستان میں "ہال مارک" چاندی سب سے زیادہ کھری سمجھی جاتی ہے۔ اور ہر کھری چیز کے لئے یہ لفظ بولا سکتا ہے۔

شاہنشاہ اورنگ زیب دکن پر فوج کشی کرتا ہے اور اس کی مدت غیر معمولی طور پر طویل ہو جاتی ہے۔ جس کے سبب سے فوج میں ایک بیماری رونما ہو جاتی ہے۔ اکثر لوگوں کے ایک پھوڑا نکلتا ہے۔ اس کا نام اورنگ زیبی پھوڑا پڑجاتا ہے۔ یہ لفظ آپ کے سامنے اس سارے واقعے کی تاریخ دہرا دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ ذرا غور سے دیکھیں گے تو یہ نفسیاتی حقیقت ظاہر ہوگی کہ اورنگ زیب کی اس فوج کشی میں عرصے تک گھر اور وطن سے دور رہنے کے باعث لوگ عام طور پر بادشاہ سے بددل ہو گئے تھے، اور اس بیماری کو لوگوں نے اورنگ زیب کی عنایت باور کر کے اُس سے منسوب کر دیا۔

محمد شاہ کے عہد میں کوئی داؤد خاں صاحب حج کو جاتے اور وہاں سے مصری گیہوں بطور سوغات لاتے ہیں، اس بیج سے یہاں زراعت ہوتی اور بڑھتی ہے، وہ گیہوں دؤاد خانی نام پاتا ہے

لفظ کناگت پر غور کیجئے تو نظر آتا ہے کہ صحیح کرناگت تھا، اور کرن اور گت سے مرکب

ہے، کرن نام کا ایک راجہ گزرا ہے اور راگت کے معنی ہیں سامنے آنا۔ شرادھ کی رسم کسی خصوصیت کے ساتھ ادا کرنے کے باعث اُسے راجہ کرن سے منسوب کیا گیا اور کثرت استعمال سے کناگت بن گیا

لغت کے اندر آپ کی نظر لفظ سابقہ پر بھی پڑے گی۔ یہ عربی لفظ ہے اور اس کے عربی معنی ہیں پہلا یعنی اگلے زمانے کا۔ اردو میں اس کا مفہوم ہوا اگلی جان پہچان اور اس سے نکلا واسطہ و معاملہ، پھر سابقہ پڑنا وجود میں آگیا۔ اب دیکھئے اس مفہوم کو اصل معنے سے کیا مناسبت رہی۔

عورتوں کی زبان کا ایک محاورہ ہے "شہر شملہ" اسے دیکھ کر ہمارا ذہن فوراً اس پہاڑ کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ جہاں وائسرائے گرمیاں بسر کرنے جاتے ہیں اور ان کے جلو میں ہمارے بہت سے غمگساروں کو بھی مجبوراً چڑھنا پڑتا ہے۔ مگر اس سے مراد وہ مقام ہے، جہاں "مروت و محبت" مفقود ہو۔ اب آپ اس جستجو پر مجبور ہیں کہ آیا شملے کے لوگ بے مروت ہوتے ہیں یا یہ ایک استعارہ ہے وہاں کی سردی اور برف سے۔

زبان کا زبان کی طرح مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ عام زبان اور اس کی لغت و قواعد سے باہر مقامی طور پر کچھ الفاظ، محاورے، اور مثلیں ہر جگہ کے لئے مخصوص ہوتی ہیں، اور اس سے بھی ناواقف نہیں کہ جو الفاظ ادب کے اندر داخل ہو جاتے ہیں وہ پھیل بھی جاتے ہیں۔ ہماری زبان میں مقامی تاریخیں اور سوانح عمریاں بہت کم لکھی گئی گئیں اس لئے یہ مقامی سرمایہ لغت و زبان زبان کا جزو نہ بن سکا، حالانکہ اس کے اندر ہماری تاریخ و معاشرت کے بہت سے نکتے محفوظ تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری لغت نویسی افراد کی توجہ کا نتیجہ ہے جن کی نظر نہ تو سارے ادبی ذخیرے پر محیط ہو سکتی ہے اور نہ ان کو اتنے ذرایئے حاصل ہوتے ہیں۔ لغت نویسی کے لئے دو چیزیں نہایت ضروری ہیں۔ ایک تو بہت سے لوگوں کا تعاون اور امداد دوسرے پلان یا نقشہ

مثالاً دو لفظ پیش کرتا ہوں۔

"مفتی تحریک" کا لفظ حافظ رحمت خاں کی سوانح عمری میں چند سطروں کے ایک بیان میں آیا ہے: یہ تحریک حکومت کے خلاف ایک سیاسی تحریک تھی، اور پرانے اثرات اور اس وقت کے ماحول کا نتیجہ تھی۔ مگر حیلہ ہاؤس ٹیکس کی مخالفت بن گیا۔ یہ تحریک اپنوں کے ہات سے ٹھنڈی بھی ہو گئی۔

دوسرا لفظ "ولسن گردی" ہے جو ابھی تک کسی حوالے میں بھی نہیں آیا۔ اس لفظ کے وجود میں آنے کی داستان عجیب ہے، مدراس علاقے کے کسی نواب خاندان کے فرد دلاور جنگ احمد اللہ امارت ترک کر کے سیاحت کے لئے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ حج کرتے اور رستے رماتے گوالیار پہنچتے ہیں۔ وہاں محراب شاہ صاحب سے بیعت کرتے ہیں۔ ڈنکا شاہ لقب ملتا اور خرقۂ خلافت سے ممتاز ہوتے ہیں۔ جہاد کی تحریک لے کر آگرے آتے ہیں اور تمام عمائد شہر معتقد ہو جاتے ہیں، اس وقت ہائیکورٹ آگرے میں تھا اور صدر نظامت میں مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ وکلار کے طبقے میں بھی مسلمان مقتدر رہتے۔ مسٹر ولسن جج تھے حکومت بدظن ہو گئی اور شاہ صاحب کے چلے جانے کے بعد تمام مسلمان حکام، وکلار اور عمائد شہر رشوت ستانی کے مقدمے میں ماخوذ ہوتے ہیں اس کا نام "ولسن گردی" پڑتا ہے۔ یہ سب لوگ بالآخر بری ہو گئے۔ لیکن یہ لفظ ایک مدت تک آگرے میں جاری رہا۔

ان چند مثالوں کے مطالعے میں آپ نے اپنی زندگی کی صراحت کے بعض دلچسپ مرقعے دیکھے، اپنی تاریخ کے بعض نکتوں کو ایک ایک لفظ میں محفوظ پایا اور الفاظ کے طلسم زار معانی کی بھی خاصی سیر کر لی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ مطالعۂ لغت کے سلسلے میں علم الحروف کا ایک دلچسپ پہلو بھی دیکھ لیں

ہائے مخلوط یا دوچشمی (ھ) دراصل ہم نے ہندی سے لی ہے جو اپنی ذات سے کالعدم ہے۔ مگر دوسرے حروف کے ساتھ مل کر آواز دیتی ہے۔ یہ ہائے مخلوط (یعنی ہا ह) کی مفرد

آواز) سنسکرت میں یا تو وزن کی خاطر زائد آتا ہے یا کبھی ندا یا ظہور کے معنی دیتا ہے۔ اور اس کے ترکیبی معنی آواز کو پرگھٹ یعنی ظاہر کرنے والا یا گانے والے کی آواز کو جانے کے ہو گئے۔

یہ ہائے مخلوط جب حرف گاف کے ساتھ ملتی ہے تو اس کی آواز گھ घ ہوتی ہے جو ناگری حروف میں چوتھا حرف صحیح ہے۔ سنسکرت لغت حرف گھر کا پہلا مفہوم اس آواز سے ہے جو "گھر گھر" کی طرح ہو۔ اور "گھڑ گھڑاہٹ" (مطلق آواز) کے معنے جس کے اندر گھنٹے کی آواز کا پہلو بھی ہے اسی سے نکلے۔ اس کے دوسرے معنی گھٹ یعنی لبطون کے ہیں، جس سے "گھڑا" اور پھر دور" کی مناسبت سے "گاگرا" وغیرہ بنے۔ گ ग اور ہا ह یہ دو آوازیں مل کر گہ घ کی آوازیں دیتی ہیں۔ گہ کے لغوی معنی گانا اور جانا یعنی روانی کے ہیں۔ پھر اسی سے اصلاحی مفہوم گانے والا یا دیوتاؤں کے گیت گانیوالا پیدا ہو گیا۔ اسی طرح چلیے اس کے لغوی معنی کی مناسبت سے بیسیوں مفہوم معجزے کی طرح وجود میں آ گئے۔ گمن، گم، گونا، جانا، جاترا، وغیرہ کی اصل یہی حرکت ہے، کیونکہ گاف اور جیم ہر زبان میں ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں۔ مصدر جانا سے گیا ماضی مطلق کا صیغہ اسی قاعدے سے بنا ہے۔ دریا کا چڑھنا اترنا گانے کے اتار چڑھاؤ کا مفہوم اور بال اڑھانا یا اجڑ جانا کے معنی بھی اسی حرف کا اعجاز ہے۔ گنگا کی اصل بھی یہی حرف مانا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں روانی ہے اور گرہ یا گانٹھ سے سلسلہ جڑ جانے کے مفہوم کا ذمہ دار بھی یہی حرف ہے، اس لئے کہ اس میں تسلسل و روانی پائی جاتی ہے۔

بنابریں، حرف گاف سے جتنے لفظ بنیں اور ان میں روانی یا سُر کی کیفیت کا مفہوم ہو تو وہ اسی اصل پر تصور کئے جائیں گے اور اس سے بنے ہوئے تمام الفاظ میں اصل معنی مفہوم سے نسبت باقی رہے گی۔ مثلاً گج (ہاتھی) گجر، گدگدی، گرنا، گڑنا، گنڈاسا وغیرہ میں حرکت و روانی موجود ہے؛ اور گیت، گنگری، گرجنا، گڑگڑاہٹ وغیرہ میں صدا یا

گانے کی مناسبت باقی ہے، اور دریا کے بہنے میں چونکہ تری کا مفہوم ہے اس لئے گیلا، گارا وغیرہ بھی اصل سے جدا نہیں ہیں۔

گر اور گھ معزد و مرکب حرف کے لغوی معنی کی یہ مثالیں اور تصریح یقیناً غیر دلچسپ نہ تھی اب صوتیات کے اس کے مخرج پر بھی غور فرمائیے۔

سنسکرت مخارج کے اعتبار سے یہ دونوں آوازیں کنٹھی یعنی حلقی حروف ہیں لیکن عساً دیکھئے تو گ کے مقابلے میں گھ گھاٹی میں پڑا محسوس ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے جتنے لفظ بنے یا محاورے پیدا ہوئے ان کے اندر معناً اس حرکت کے خاصے کا مفہوم موجود ہے۔ مثلاً گہرائی نشیب اور ڈھلاؤ کا مفہوم جیسے گھاٹ، گھاٹی، گھاؤ، گھائل گھالنا، اور گھائی وغیرہ میں یا چکر، گولائی اور دور کا مفہوم جیسے گھونگا، گھونگھٹ، گھیر گھنڈی، گھنگرو، گھماؤ، گھونٹنا، گھونسا وغیرہ میں۔ یا گھر گھر (خراٹوں کی آواز) گھڑگھڑ (مطلق آواز) کا مفہوم جیسے گھٹنا، گھگی وغیرہ میں، یا رگڑ اور خراش کا مفہوم جیسے گھسنا گھسیٹنا، گھسیلا وغیرہ میں، یا زیادتی اور بہتات کا مفہوم جیسے گھنا، گھمسان، گھان، گھنجگر، گھنگھور وغیرہ میں، یا قلت و تنگی کا مفہوم جیسے گھاٹا، گھڑی وغیرہ میں۔ یا بستگی و غفلت کا مفہوم جیسے (دل اور دم) گھٹنا گھمس، گھورا گھن، گھونٹ وغیرہ۔ یا تحدید و انحصار کا مفہوم جیسے گھر، گھٹنا وغیرہ میں۔ یا اخفا، و نہانی کا مفہوم جیسے گھٹ، گھات، گھن، گھنّا وغیرہ میں۔ یا میل اور آمیزش کا مفہوم جیسے گھولنا، گھولوا، گھچ پچ وغیرہ میں یا ضرب اور چوٹ لگانے کا مفہوم جیسے گھڑنا، گھڑیا وغیرہ میں۔

مثالیں اس کی بے حد ہیں، اور اگر آپ غور اور توجہ سے دیکھیں گے تو اس حرف سے بنے ہوئے ہر لفظ سے واضح ہوگا کہ ایک حرف اپنی اصل اور مادے اور لغوی مفہوم سے کسی وقت جدا نہیں ہوتا اور اپنی ہیئت اولی برابر ظاہر کرتا رہتا ہے اسی ایک حرف کا طلسم معانی اوپر دی ہوئی مثالوں سے پورا کھل جاتا ہے مثالیں ابھی کثرت

سے ہیں۔ مگر ان مثالوں کے علاوہ ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر سوچئے گا کہ انسانی ذہن و خیال میں یہ حرف آیا کیونکر تو قیاس کیجئے گا کہ یا تو جانور کو ذبح کرتے وقت یا جنگ میں کٹے ہوئے گلے کی گھر گھر کی آواز سُن کر آیا، یا آبشار کے گرنے اور اس کی آواز نے سمجھایا یا نرغے میں گھر جانے کے باعث خیال نے اُسے ایجاد کیا کیونکہ اس کے مفہوم میں یہ تینوں پہلو پائے جاتے ہیں۔

میرا یہ مدعا کہ لغت کا مطالعہ نہایت دلچسپ مشغلہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان مثالوں سے واضح اور روشن ہو گیا ہوگا۔ ہر چند استفادے کا پہلو ان مثالوں میں بھی موجود ہے لیکن واقعی علمی افادے کے اعتبار سے مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری کتب لغت بہت مایوس کن ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ علم کی انتہا نہیں، اور حصول علم کے لئے ایک انسانی عمر نا کافی ہے۔ ہم سب یہ بھی جانتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کی آرزو ہمیشہ جوان رہتی بلکہ جوان تر ہوتی رہتی ہے۔ پھر یہ کہ اس زمانے میں علوم و فنون کے اندر جس تیزی سے ترقیاں اور تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ہم اس سے بھی بے خبر نہیں۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ علمی معلومات کو عام اور آسان کرنے کے لئے یورپ کی قومیں کس مستعدی سے دقت کا سامنا کر رہی ہیں اور وہاں کی ہر زبان میں لغت نویسی کا کام برابر اور کثرت سے ہوتا رہتا ہے اور نئے نئے نقشوں پر لغت لکھی جا رہی ہیں، انگلستان کا سب سے بڑا مفکر ایچ جی ویلس اب ایک آفاقی علوم کی انسائیکلوپیڈیا کی تیاری پر آمادہ ہے، ان حالات کے مقابلے میں ہماری لغت نویسی کی ناگفتہ بہ حالت پر اظہار خیال فضول سی بات ہوگی، ہماری لغات واقعی علمی معلومات بہم پہنچانے سے قاصر ہیں۔

پچیس سال پہلے جب کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں جن کو ہم بے حقیقت سمجھتے ہیں، انسائیکلوپیڈیا وجود میں آگئی تو ہمیں بھی توجہ ہوئی تھی، لیکن وہ خیال آج تک خیال ہی کی صورت میں ہے۔ حال میں انجمن ترقی اردو نے اسٹنڈرڈ ڈکشنری شائع کر کے بہت

بڑا کام اور ایک اہم ضرورت ہی پوری نہیں کی بلکہ اردو زبان کو بہت آگے بڑھا دیا ہے اور اس سے زیادہ بڑا اور قابل قدر کام ایک مکمل لغت کی تیاری ہے جس میں انجمن اس وقت مصروف ہے۔ اس موقع پر میں ارباب انجمن کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی لغت کی اسکیم میں مختلف علوم پر غیر فنی زبان کے چھوٹے چھوٹے مقالے ترجمے کے ذریعے سے شامل کر دیں؛ اور اس طرح اس لغت کو لغت اور انسائیکلوپیڈیا کے درمیان کی کڑی بنا دیں۔

ہماری قومی زبان کی موجودہ ضرورت یہی ہے کہ ہمارے سامنے ایسے علمی مضامین آ جائیں کہ قبل تاریخ کے آثاریات اور نوسلیات کو پڑھے بغیر ہم یہ جان لیں کہ انسان کی ابتدا کتنی حقیر تھی اور اس کے ارتقا رد و بُرد میں کتنا زمانہ لگا ہے۔ ہم سمجھ لیں کہ علم زبان مکمل ہو کر کس طرح علوم فطرت سے متعلق ہو گیا اور اس کے اندر علوم فطرت ہی کی سی قطعیت آ گئی ہے۔ ہمیں معلوم ہو سکے تاریخ نویسی کے اصول اور طریقے کس نہج سے مستحکم ہو سکے ہیں اور علم الاعضاء کی ترقی نے جراحی کے بیرحمانہ فن کو کس طرح راحت آفریں بنا دیا ہے۔ ہم دیکھ سکیں کہ اعصاب کا علم اعجاز کی حد تک کیونکر مرتب و منظم ہوا ہے۔ ہم واقف ہو جائیں کہ صنعت و حرفت یعنی مشینی ترقی نے انسان کی زندگی میں کتنی اور کیسی عجیب تبدیلیاں کر دی ہیں ہم باخبر ہوں کہ موٹر، موٹر کشتی، اور ہوائی جہاز کی تیز رانی کس حد تک پہنچ گئی اور کس نے پہنچائی ہے۔ ہماری معلومات میں یہ بھی ہو کہ مختلف زبانوں کے مشہور مصنف کون تھے اور کس کی کونسی کتاب اعلیٰ اور مستند ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ عام علمی معلومات بڑھانے اور الفاظ کی تہ تک پہنچنے کے لئے لغت کا مطالعہ بے حد دلچسپ اور مفید مشغلہ ہے۔ اور ہماری کتب لغت میں جو کمی ہے ہمارا قومی و علمی فرض ہے کہ اس کمی کو جلد سے جلد پورا کر دیں تاکہ اس طرح افراد قوم میں علم کی اشاعت ہو اور علم کا ذوق بڑھے۔

تعلیم اور مسئلہ معاش

(سلامت اللہ صاحب ایم اے بی ٹی علیگ)

آج کل مختلف پلیٹ فارموں سے یہ آواز بلند کی جا رہی ہے کہ موجودہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ یونیورسٹیوں کے کنووکیشن اڈریس، کالجوں اور اسکولوں کے سالانہ جلسوں کی رپورٹیں ہی نہیں بلکہ خالص سیاسی انجمنوں کے سالانہ جلسوں کی رودادیں بھی اس بات کو پُر زور طریقے سے پیش کرتی ہیں کہ موجودہ نظام تعلیم بالکل ناکارہ اور نکمے افراد پیدا کرتا ہے۔ اس بدحالی کی شاید سب سے بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہماری تعلیم محض نظری ہے، جسے تعلیمی اصطلاح میں لبرل تعلیم کہا جاتا ہے اور اسے مسئلہ معاش سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ صرف ایسے اشخاص پیدا کرتی ہے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد کوئی عملی کام نہیں کر سکتے اور بے روزگار اِدھر اُدھر مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اس کے بجائے یہ کہنا کچھ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نام نہاد لبرل تعلیم تنگ معنوں میں محض معاشی تعلیم ہے۔ کیونکہ تعلیم پاتے کے بعد ہر شخص ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ تعلیم ملازمت کے علاوہ اور کسی کام کے کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ ہر تعلیم یافتہ کو ملازمت نہیں ملتی کیونکہ ملازمتوں کا میدان محدود ہے اور امیدواروں کی تعداد دن بدن بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے تعلیم یافتہ بے روزگار رہتے ہیں اور بڑی مصیبت میں اپنی زندگی گزارتے ہیں۔

اس کا ردعمل یہ ہوا ہے کہ اب کچھ لوگ بڑی شدت سے یہ تجویز پیش کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ بچوں کو صرف وہ تعلیم دینی چاہیئے جو اُنھیں بعد ازاں براہ راست روزی کمانے میں مدد دے۔ نظری اور کتابی تعلیم کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ صنعت و حرفت کے مدرسے قائم کئے جائیں

اور اُن میں لکھنا، پڑھنا اور حساب محض اس قدر سکھایا جائے جتنا کہ اُس کام کے کرنے اور سیکھنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن یہ تجویز تنگ نظری پر مبنی ہے۔ تعلیم کے مقصد کو روٹی کمانے تک محدود کر دینا اعلیٰ تعلیم کے مقصد کو گرانا ہے۔

روزی یا پیشہ کے لئے تیاری بحیثیت تعلیمی مقصد کے بہت ناقص نظریہ ہے۔ اس کے کئی ایک سبب ہیں اولاً جمہوری حکومت میں کسی بچے کو پہلے ہی سے کسی خاص پیشہ کے لئے تیار کرنا نہ صرف اس بچے کے حق میں بڑی ناانصافی ہے بلکہ اُس سے قومی کارکردگی کو بھی بہت بڑا صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ ایسا نظام تعلیم کبھی موجد، محقق، یا نئے راستے نکالنے والے لوگ پیدا نہیں کر سکتا۔ کوئی کام جو میکانکی طریقے سے کیا جاتا ہے، کرنے والے کی شخصیت کے اظہار اور اُبھارنے کے لئے نہ صرف ناموزوں ہے بلکہ مضر ہے۔ لہذا یہ طریقہ کار انفرادی اور سماجی دونوں اعتبار سے خراب ہے۔ دوم یہ ضرب المثل ہے کہ "بچہ صرف زمانہ حال میں رہتا ہے" اُس کی تمام تر دلچسپیاں "حال" سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اُس کے نزدیک "مستقبل" محض مستقبل کی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لہذا اُس کے سر کوئی ایسا کام منڈھ دینا جس کا تعلق صرف مستقبل سے ہے بڑا ظلم ہے۔ چاہئے یہ کہ بچے کی موجودہ ضرورتوں کے مطابق اُسے تعلیم دی جائے۔ اگر آپ حال کا خیال رکھیں تو مستقبل خود بخود اپنا خیال رکھے گا، اس لئے وسیع معنوں میں یہ تعلیم بھی آئندہ آنے والی زندگی کے لئے تیار کرتی ہے۔ سوم یہ کہ انسان محض کھانے کے لئے زندہ نہیں ہے بلکہ وہ زندگی قائم رکھنے کے لئے کھاتا ہے۔ اُس کی زندگی کا مقصد بہت اعلیٰ ہے دنیا کی موجودہ تہذیب و تمدن سب اُس کی کوششوں کا نتیجہ ہیں جسے قائم رکھنا اور ترقی دینا اُس کا عین فرض ہے۔ لہذا تعلیم کے مقصد کو روزی کمانے تک محدود کر دینا انسانیت کے حق میں بڑا گناہ ہے۔

اب جمہوری خیالات کے پرچار کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ان دونوں راستوں کے بین بین ایک تیسرا راستہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ تعلیم کے لبرل اور معاشی مقاصد میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس سے ایک نہایت مضحکہ خیز نظام تعلیم عالم وجود میں آگیا ہے جس میں

دونوں قسم کے مضامین۔کلچرل اور افادی ایک اٹل جوڑ کی شکل میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔اس میں نہ تو اول الذکر قوت تخیل اور عقل کے سوتے جاری کرتے ہیں، اور نہ موخر الذکر سماجی اعتبار سے کارآمد ہیں۔اس کی وضاحت کے لئے یہ مثال کافی ہوگی ـــ زبان اور علم ادب کو نصاب تعلیم میں کلچرل نقطۂ نظر سے داخل کیا گیا ہے لیکن اُن سے کلچرل مقصد حل نہیں ہوتا۔ ہاں وہ افادیت کے نقطۂ نظر سے البتہ کسی حد تک مفید ثابت ہوتے ہیں یعنی یہ کہ زبان سیکھ کر ہم ایک دوسرے پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں اور بس۔اس کا کلچرل پہلو عمل میں قریب قریب نظر انداز سا کر دیا گیا ہے۔سائنس کی تعلیم افادی مقصد سے شروع کی گئی ہے یعنی یہ کہ اس کے ذریعہ تجربات کرنے کی عادت پڑے گی اور اُس کی معلومات سے ہم اپنی روزانہ کی زندگی میں عملی فائدہ اُٹھائیں گے کیونکہ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں، وہ اب سائنس کی دنیا بن گئی ہے۔لیکن نتائج اس بات کے شاہد ہیں کہ سائنس کی تعلیم سے یہ مقصد بالکل پورا نہیں ہوا۔کسی سائنس کے گریجویٹ کو لے لیجئے وہ ضرورت پڑنے پر اپنے کمرہ میں فیوز وائر نہیں لگا سکتا، گھر کے پنکھے کے معمولی نقص کو خود درست نہیں کر سکتا، اپنے ہیٹر کی ذراسی خرابی کو خود ٹھیک نہیں کر سکتا وغیرہ، اگرچہ وہ بجلی کی حرکت کے متعلق جتنے نظریے پیش کئے گئے ہیں سب سے بخوبی واقف ہے اور ضرورت پڑنے پر بجلی کے کسی موضوع پر ایک اچھی خاصی تقریر کر سکتا ہے۔لیکن اس سے متعلق معمولی عملی کام خود انجام نہیں دے سکتا۔اس کے لئے وہ بجلی کے عملی ماہر کا ہمیشہ دست نگر رہتا ہے۔پس سائنس کی تعلیم سے کوئی عملی فائدہ مشکل سے ہوا ہے۔ہاں اگر کوئی ہوا ہے تو تنگ معنوں میں اسی کلچرل کہا جا سکتا ہے کہ چند معلومات زیور کی طرح ذہنی زندگی کو زینت دے رہے ہیں۔اس بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہمارے مقصد اور حاصل میں بین تضاد ہے۔

پھر ایک بات اور بھی ہے ـــ اور وہ بڑی اہم ہے ـــ کہ مختلف مضامین میں اس قسم کی تفریق اور امتیاز مصنوعی ہے۔جس طرح انسان کی زندگی ایک منظم وحدت ہے اسی طرح تمام انسانی معلومات ایک مربوط کل ہے۔لہذا مختلف مضامین کی طرف مختلف خواص منسوب

کرنا سخت غلطی ہے۔ ہر مضمون میں کم وبیش دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ افادی اور کلچرل۔ جن میں سے کسی ایک کو کلیتہً نظر انداز کر دینا "وحدت" کے منتشر کر دینے کے مرادف ہے۔

مضامین کے اس باہمی فرق کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کے تاریخی پس منظر کو دیکھنا چاہیئے۔

یہ بین تضاد جو خالص نظری اور عملی مضامین میں پایا جاتا ہے اُس سماجی حالت کی پیداوار ہے جو قدیم یونان میں تھی۔ یونان کے مختلف شہروں میں رسم ورواج اور روایات جداگانہ تھے۔ اگرچہ وہ تجربہ کی بنا پر قائم ہونے کی وجہ سے محض داخلی حیثیت رکھتے تھے لیکن ان کو معیار سمجھ کر افراد اور جماعتوں کے کردار جانچے جاتے تھے۔ اس بے اصولی اور استبدادیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماج میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ اور سمجھدار لوگ اس ضرورت کو محسوس کرنے لگے کہ کوئی ایسا خارجی معیار قائم کیا جائے جو ہر چیز کی قدر کو صحیح طور سے معلوم کر سکے۔ ایتھینس کے فلسفیوں نے ان معیاروں پر شدت سے نکتہ چینی کی۔ انھوں نے آخر کار یہ بات طے کی کہ صرف عقل ہی تمام عقائد اور کاموں میں ہماری صحیح رہنمائی کر سکتی ہے۔ لہذا عقل کو تجربہ پر فوقیت دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقلی مضامین کو عملی مضامین پر ترجیح دی جانے لگی۔ ہر وہ کام جو ہاتھ سے کیا جاتا ہے ذلیل اور ہیچ سمجھا جانے لگا۔ یہاں تک کہ فنون لطیفہ اور صنائع — موسیقی، مصوّری، علم طب وغیرہ — کو بھی نظری علوم فلسفہ، منطق، ریاضی وغیرہ سے کم گردانا جانے لگا، محض اس وجہ سے کہ اول الذکر علوم عملی ہونے کی وجہ سے جسمانی اعضا کے استعمال سے متعلق ہیں اگرچہ ان میں بھی معمولی عقل سے کام نہیں چل سکتا۔ افلاطون کا یہ قول کہ فلسفی کو بادشاہ ہونا چاہیئے، یعنی امور حکومت فلسفی کے ذمہ ہونے چاہیئے، صاف طور سے اس رجحان کا اظہار کرتا ہے۔

لیکن نئی تعلیم کے بہتر طریقوں نے ثابت کر دیا ہے کہ نظری اور عملی مشاغل بجائے ایک دوسرے کے مخالف ہونے کے معاون ہیں یعنی یہ کہ عملی کام کے ذریعہ نظری مضامین کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور عملی کام میں عقلی طریقے استعمال کرکے اُس کے حُسن اور زینت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ارسطو کا قول ہے "کوئی کام، فن یا مضمون میکانکی کہلانے کا مستحق ہے، اگر وہ آزاد

انسان کے جسم، روح یا عقل کو اپنے کام میں حُسن پیدا کرنے میں مانع ہے" اس لئے ہر عملی کام کی سائنٹفک بنیاد کا جاننا اور اس کے کرنے کے عقلی طریقے سے واقف ہونا از حد ضروری ہے۔

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے مختلف مضامین کے مقاصد میں بُعد اور فرق سماجی حالات کا رہین منت ہے۔ اگر روزی کمانے، اور فرصت کے اوقات کو مہذبانہ انداز میں استعمال کرنے کے مواقع سماج کے مختلف افراد میں برابر برابر تقسیم ہوتے، تو یہ بات کسی کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی کہ تعلیمی وسائل اور مقاصد کے درمیان کوئی تصادم یا کش مکش ہوسکتی ہے۔ اگر ایک مزدور اور حکومت کے ایک رُکن کے درمیان ریاست کی طرف سے، جہاں تک کہ اُن کے بنیادی حقوق کا تعلق ہے، کوئی امتیاز نہ ہو، تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مزدور کے کام کو ذلیل اور حاکم کے عہدہ کو باعظمت سمجھا جائے کیونکہ اس قسم کے نظام حکومت میں ہر فرد کے کام کی اہمیت ہے۔ یہاں ریاست ایک انجن کے مانند ہے جس کے تمام پُرزے۔ چھوٹے اور بڑے۔ ایک دوسرے کے اشتراک عمل سے چلتے ہیں۔ اگر چھوٹا پرزہ اپنا کام ٹھیک طرح سے کرنا بند کردے تو بڑا پرزہ بھی بیکار ہو جائے گا اور انجن کی زندگی ختم ہو جائے گی۔

تعلیم کی کسی جمہوری اسکیم میں وہ مواد جو تعلیم کے ایک پہلو کو اُجاگر کرتا ہے، اُسے بالواسطہ دوسرے پہلو کو بھی ترقی دینا چاہئے۔ توقع کی جاتی ہے کہ موجودہ مشین کے دور میں مزدور کے پاس بھی فرصت کا کافی وقت ہوگا کیونکہ مزدور جو کام کئی دن میں کرے گا وہ مشین چند گھنٹوں میں کردے گی۔ لہذا فرصت کے اس وقت کے صحیح استعمال کا سوال پیدا ہوتا ہے تاکہ سماجی کارکردگی کو نقصان نہ پہونچے۔ اس لئے ہمیں اپنے افراد کو نہ صرف کام کرنے کے عمدہ طریقے بتانے ہیں بلکہ فرصت کے اوقات کا صحیح استعمال بھی سکھانا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کے دونوں پہلوؤں۔ کلچرل اور افادی۔ پر برابر توجہ دی جائے۔ بعض ممالک میں اس سلسلہ میں عملی جدوجہد کی گئی ہے اور اُس کے نتائج بہت ہمت افزا ثابت ہوئے ہیں۔ روس میں جہاں اس قسم کی کوشش بڑے پیمانے پر کی گئی ہے، ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ ایک معمولی

مزدور کچھ عرصے بعد ایک قابل انجنیر، یا نیورسٹی کا پروفیسر بن گیا۔

ہاں تو اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم میں معاشی مسئلہ کا کیا حال ہونا چاہیئے؟ ظاہر ہے اس کا حل موجودہ معاشرہ کے مطالعہ کے بغیر سوچنا بے معنی ہے۔ اب ذہنی اور سماجی حالات میں بڑی تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔ اب ہر صنعت اور پیشہ کی وہ چیزیں جو محض میکانیکی حیثیت رکھتی ہیں دوسرے درجہ کی تصور کی جاتی ہیں۔ اب ہر کام سائنٹفک طریقوں کے ماتحت انجام دیا جاتا ہے کیونکہ اس طرح وقت اور طاقت کی بچت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات کس قدر افسوسناک ہے کہ صنعت کے عقلی امکانات میں غیر معمولی اضافہ ہو جانے کے باوجود صنعتی حالات اس قدر مایوس کن ہیں کہ عوام کے لئے صنعت میں بہ مقابلہ قدیم زمانہ کے تعلیمی امکانات بہت کم رہ گئے ہیں۔ قدیم زمانہ میں جب کہ ہاتھ سے کام ہوتا تھا کاریگر اور عوام دستکاری کی ماہیت سے واقف ہوتے تھے۔ اُن کی بنائی ہوئی چیزوں میں ان کی اپنی شخصیت کا رنگ وروپ موجود ہوتا تھا۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ صنعتوں کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے ہیں جہاں تمام کام مشینوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جس شخص کے ذمہ مشین چلانے کا کام ہوتا ہے اُسے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ مشین کیونکر چلتی ہے۔ وہ محض اتنا جانتا ہے کہ فلاں بٹن کے دبانے یا فلاں پرزے کو حرکت دینے سے مشین چلنے لگتی ہے اور بس۔ گویا کہ وہ خود بھی مشین کے ایک پرزے کی طرح کام کرتا ہے۔ اس صورت میں بھلا اُس کی شخصیت کا مظاہرہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ لہذا۔ اُس کام کے ذریعہ وہ فقط اپنی روزی کماتا ہے، کامیاب زندگی بسر نہیں کرتا۔ اُس کے کام میں اُس کی شخصیت کی جھلک نہیں ہوتی۔ لہذا اُس کی نشو ونما کے لئے یہ اُس کا کام محض بیکار رہا۔

اب ذرا تعلیم کی طرف آئیے۔ قدیم زمانے میں بچہ اپنے گھر اور باہر کی زندگی سے متعلق تمام چیزوں سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے گھر میں روشنی کیونکر ہوتی ہے؟ چراغ کس چیز سے بنتا ہے؟ اُسے کون بناتا ہے؟ اُس میں کیا جلتا ہے؟ تیل کہاں سے آتا ہے؟ کیسے بنتا ہے وغیرہ۔ موجودہ زمانہ کا نام نہاد متمدن بچہ جو بجلی کی روشنی میں پڑھتا ہے،

اُس کے متعلق صرف اس قدر جانتا ہے ۔۔ اور لوگوں کا خیال ہے کہ اتنا جاننا کافی ہے! ۔ کہ وہ بٹن دباتا ہے اور لیمپ روشن ہو جاتا ہے ۔۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں تک زندگی کا تعلق ہے زمانہ قدیم کا بچہ موجودہ زمانہ کے بچے سے کہیں زیادہ سمجھ بوجھ کر زندگی بسر کرتا تھا۔

اس صورتِ حال میں مدرسہ کا فرض ہے کہ "وہ مشاغل کے معاشرتی اور علمی نتائج اور اثرات سے آگاہ کرائے اور تمام لوگوں کی کاروباری زندگی کے تنگ اور محدود کرنے والے اثرات کو دور کرنے کے لئے طلبا کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کی وسیع تر اہمیت سے آگاہ کر کے انھیں اُن کی نظر میں معنی خیز بنائے۔ اُنھیں اُن کی عظمت سے روشناس کرائے"! اُن کے دِل میں موچی کی وقعت اس لئے ہونی چاہئے کہ اگر وہ اپنا کام انجام نہ دے تو بڑے سے بڑا آدمی ننگے پیر چلنے پر مجبور ہو گا۔ نہیں بچوں میں یہ بات بھی پیدا کرنی چاہئے کہ " وہ پیشہ کی زندگی میں بھی اعلیٰ مقاصد اور عین پسندی کو ہاتھ سے نہ دیں " اور محض مشین بن کر نہ رہ جائیں۔

ہماری تعلیم نے ہمیں معاشی نظام سے بالکل ناواقف رکھا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے سماج کے مختلف طبقوں میں منافرت پھیلی ہوئی ہے جو سماج کی ترقی کے لئے مُضر ہے۔ مدرسے اس سلسلہ میں بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ وہ نہ صرف اس باہمی منافرت کی بیخ کنی کر سکتے ہیں بلکہ ان مستقل طبقوں کی وجہ سے جو عام جمود طاری ہے اُسے بھی ختم کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔

معاشی تعلیم کی کوئی اسکیم جو موجودہ صنعتی دور کے خواص کو نظر انداز کر کے بنائی جائے گی وہ موجودہ تفرقات اور کمزوریوں کو قائم رکھے گی اور اس طرح سماجی قضا و قدر کے جاگیری تحکم کو مسلط رکھنے کی آلہ کار بنے گی۔ یعنی یہ کہ سماج کے مختلف طبقے اپنے تمام برباد کُن اثرات کے ساتھ موجود رہیں گے اور سماجی توازن کبھی قائم نہ ہو سکے گا۔

اس مختصر مقالہ سے یہ بات واضح ہے کہ تعلیم کے معاشی اور لبرل مقاصد میں کوئی لازمی تناقص نہیں ہے۔ مدرسہ میں معاشرے کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی ہونی چاہئے۔ لیکن اُسے

کارخانہ یا صنعتی مدرسہ میں تبدیل کر دینا بڑی غلطی ہوگی۔ یہاں کسی مخصوص پیشہ کی تعلیم کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ابتدائی مدارس میں دستکاری اور عملی مشاغل کی غرض بچوں کی آرزوئے تخلیق اور خواہش عمل کی تشفی ہونی چاہیئے۔ ہندوستان میں "بنیادی تعلیم" کا اجرا بھی اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اس میں بنیادی حرفہ کی نہ صرف یہ اہمیت ہے کہ وہ بچوں میں جسمانی یا دستی کام کی عظمت پیدا کرے گا بلکہ وہ سیکھنے کا ایک دلچسپ اور عملی طریقہ بھی پیش کرتا ہے۔ حرفہ کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہم بچوں کو کاریگر یا مزدور بنانا چاہتے ہیں بلکہ اس کے ذریعہ بچہ کی شخصیت کی ہم آہنگ نشوونما مقصد ہے۔ لہذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہم کسی لڑکے کو جلاہا، بڑھئی یا مالی بنانا چاہتے ہیں ہاں یہ بات اور ہے کہ وہ تعلیم ختم کرنے کے بعد مدرسے کے سیکھے ہوئے حرفوں میں سے کسی ایک کو اپنی زندگی کا مشغلہ قرار دے لے اور یہ کوئی بُری بات بھی نہیں ہے۔

ثانوی مدرسوں میں مختلف پیشوں کی عام تعلیم ہونی چاہیئے جس کی غرض بچوں کو اظہار خودی کا موقع دینا ہو نہ کہ کسی مخصوص پیشہ کے لئے تیاری۔ اس طرح سے وہ معاشی نظام سے واقف ہوجائیں گے نیز ہمارے سماج میں جو "مزدوری" اور "فرصت" کی دوعملی ہے وہ بڑی حد تک ختم ہوجائے گی۔

ثانوی تعلیم کے آخری دو ایک سال کسی ایک پیشہ میں خاص تعلیم کے لئے وقف کئے جاسکتے ہیں۔ پیشہ بچے کے طبعی رجحانات اور صلاحیتوں کے مطابق منتخب کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں "معاشی جانچ"، جس کی بنیاد سائنٹفک اصول پر ہے بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ کام بہت اہم بھی ہے، اس لئے کہ موجودہ زمانہ میں شاید انسان کو غربت و افلاس سے اس قدر تکلیف نہیں پہونچتی ہے جس قدر اس بات سے کہ بہت سے لوگ مجبوراً وہ پیشے اختیار کرتے ہیں جن میں اُن کے لئے کوئی اپیل نہیں ہوتی بجز اس کے کہ اُن سے پیٹ بھرنے کے لئے روٹی ملتی ہے۔

اُردو کا ایک جوانمرگ شاعر

(از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم۔ اے)

کیا عجیب بات ہے کہ جو شاعر جوانی میں ہی دنیائے ناپائیدار کو الوداع کہہ کر آخرت کو سدھار جاتا ہے، اس کے کلام میں ایک عجیب طرح کا جوش۔ امنگ اور ولولہ پایا جاتا ہے ان خصوصیات کلام کی وجہ سے جریدۂ عالم پر اس کی شہرت کا نقش اس طرح مرتسم کیا ہوجاتا ہے کہ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعروں کو وہ بات نصیب نہیں ہوتی، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس طرح کے شاعروں کا حد سے زیادہ ذکی الحس، سریع الانفعال۔ اور جذبات پر در ہونا ہی ان کی جوانمرگی کا باعث ہوتا ہے تو شاید ناموزوں نہ ہوگا۔ عربی کے مشہور شاعر ابو تمام کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مجلس میں اس نے اپنا ایک قصیدہ پڑھا تو سامعین پر ایک حیرت انگیز کیفیت وجد و رقص طاری ہوگئی محفل ابھی جاری تھی کہ ایک تجربہ کار سن رسیدہ شاعر نے پیشن گوئی کی کہ یہ نوجوان جلد مرجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ابو تمام ابھی تیس برس کا ہی تھا کہ موت کے بے رحم ہاتھ نے اس کے ساز زندگی کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ اسی نوع کا ایک واقعہ مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں ایک نوعمر لڑکے کا لکھا ہے، جس نے مشاعرہ میں اپنی غزل کا یہ شعر

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینہ کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

سُنا کر کہنہ مشق استاد انِ سخن کو بھی بے ساختہ داد پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اسی شعر کو سن کر وقت کے ایک بڑے استاد نے اس لڑکے کی جوانمرگی کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

عربی میں طرفہ اور ابو تمام، فارسی میں عرفی۔ انگریزی میں کیٹس اور اردو میں

چکبست اسی قبیل کے حسرت نصیب شاعر تھے۔ سجاد انصاری بھی اسی قسم کے تھے۔ ان شاعروں کی ترنم ریزیوں نے شہرت و مقبولیت عام کے دربار میں خصوصی شرف باریابی حاصل کیا ہی تھا کہ دست اجل نے ان کے جسم و روح کے اتصال کو یکایک توڑ دیا اور وہ ایک گوشہ قبر میں پہنچکر آسودۂ سکون ہو گئے۔ ان کا وجود گویا شبنم کی طرح تھا جو رات کے تاریک پردوں میں گلشن کی جاں فزا آب و ہوا میں سانس لیتی رہتی ہے اور صبح ہونے پر خورشید کی ایک نظر عنایت کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے، بہ قول مرزا غالب :-

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

سطور ذیل میں اردو کے جس جوانمرگ شاعر سے میں آپ کو روشناس کرانا چاہتا ہوں وہ بھی اسی صف کا ایک فرد تھا۔ بدنصیبی سے اس کو ایسے مواقع میسر نہ آئے کہ چکبست وغیرہ کی طرح اسکی شہرت عام ہوتی، لیکن نمونۂ کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ اس شاعر کی سرشت حیات میں حسن فکر، صفائی کلام، بلندی تخیل، اور رموز دنیت طبع کے ایسے جوہر پنہاں تھے کہ اگر اس کو کچھ دنوں اور مشق تمرین کے دامن سے ہوا کھانے کا موقع مل جاتا تو یقیناً آج وہ شعراء عصر کی صف اول میں ایک نمایاں مقام کا مالک ہوتا۔

نام و نسب اور خاندانی حالات | ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ دیوبند جس طرح اپنی مرکزی تعلیم و دینی درسگاہ کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور رہے، اسی طرح اس قصبہ کا عثمانی خاندان بھی اپنے علم و فضل، شعر و ادب اور ذہانت و فطانت کے لحاظ سے تمام ضلعوں کا نہایت ممتاز خاندان ہے۔ مولانا حبیب الرحمن عثمانی مرحوم سابق مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن، اور حضرت مولانا عزیز الرحمن عثمانیؒ مفتی اعظم ہند اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور آج کل مولانا شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم دار العلوم دیوبند و پرنسپل جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اور مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی اسی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں۔ مرحوم شاعر کا نام جمیل الرحمن تھا۔ جمیل تخلص کرتے تھے اور اسی عثمانی خاندان سے

تعلق رکھتے تھے، ان کے والد کا نام مولوی خلیل الرحمٰن تھا جو حضرت مولانا عزیز الرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن کے حقیقی بھائی تھے، جنوری ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ایک علمی گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے شعر و ادب کا مذاق بچپن سے ہی تھا۔ ابتدائی فارسی کی تعلیم مدرسہ دیوبند میں پائی۔ اس کے بعد مولوی خلیل الرحمٰن صاحب چونکہ ایک سرکاری عہدہ دار تھے، اس لئے انھوں نے جمیل کو عربی تعلیم دینے کے بجائے انگریزی تعلیم دلائی۔ مرحوم نہایت ذہین اور طباع تھے تمام انگریزی امتحانات نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس کرتے چلے گئے۔ اور آخیر میں بی۔ اے کا امتحان آگرہ کالج آگرہ سے پاس کیا۔

اخلاق و عادات | مرحوم بچپن سے ہی نہایت ذہین ہونے کے باوجود متین اور سنجیدہ تھے۔ بزرگوں کا ادب، چھوٹوں سے محبت، اور دوستوں کے لئے فداکاری ان کی طبیعت کا خاص جوہر تھا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ضلع سہارنپور میں نائب تحصیلدار ہو گئے تھے ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی جوں توں کر کے اسی میں گذر بسر کرتے تھے، رشوت ستانی سے انتہا درجہ نفرت تھی۔ شطرنج کے بڑے دھنی تھے، بعض اوقات کامل ایک ایک دن ہو جاتا تھا کہ معمولی ضروریات کے لئے اُٹھ گئے اور پھر کھیل میں مشغول ہو گئے۔

شادی | شادی ان کی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی تھی دونوں میں دلی تعلق تھا۔ بیوی شوہر کی دماغی قابلیتوں اور صلاحیتوں کی قدر کرتی تھیں، صد افسوس کہ یہ تعلق زیادہ پائدار ثابت نہ ہو سکا، مرحوم دق میں دو سال مبتلا رہنے کے بعد جنوری ۱۹۲۱ء میں تیس سال کی عمر میں نوجوان و قدر دان بیوی کو داغ مفارقت دے کر عالم باقی کو سدھار گئے۔ اور اس طرح ازدواجی زندگی کے پُر مسرت و ابتہاج قہقہے ایک نالۂ غم اور رنج و الم کی ایک درد بھری کراہ میں تبدیل ہو گئے، مرحوم کے والد متمول تھے، فرزند کے علاج پر ہزاروں روپے بے دریغ اٹھا دیئے۔ لیکن جب مشیت الٰہی نہ ہو تو دوا دارو اور علاج معالجے اُلٹے اثر دکھاتے ہیں۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور ایک بیٹا اور ایک

بیٹی چھوڑے، لڑکا بہت ہونہار تھا۔ تین سال ہوئے اس کا بھی انتقال ہو گیا، اب صرف ایک دختر مرحوم کی جسمانی یادگار اور ایک ماتم گسار بیوہ حیات ہیں، خدا ان کو صحت و عافیت کے ساتھ رکھے۔

شعر ادب | شعر و ادب کا مذاق بالکل فطری تھا۔ اردو تو خیر ان کی مادری زبان تھی۔ وہ انگریزی میں بھی بے تکلف شعر کہتے تھے۔ سہارنپور کے کلکٹر کی مداح میں انھوں نے ایک انگریزی نظم لکھکر پیش کی تو کلکٹر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔

ان کی شاعری کی خصوصیات | عموماً دیکھا گیا ہے جن شاعروں کی تقدیر میں جوانمرگی لکھی ہوتی ہے ان کے کلام میں حزن و یاس، رنج و غم اور محرومی و ناکامی کے مضامین کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جمیل مرحوم بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہ تھے، ان کے مقطعے تو بسا اوقات اپنے موت کے ذکر سے پُر ہوتے تھے۔ مثلاً

کیا بات ہے کہ بزم حسیناں ہے بے نمک　　شاید جمیلؔ سوختہ ساماں نہیں رہا

ایک غزل کے مقطع میں لکھتے ہیں۔

شاید خبر جمیلؔ کے مرنے کی چھپ گئی　　کچھ چپ سے ہو گئے ہیں وہ اخبار دیکھ کر

زبان کی سادگی اور صفائی اور حزنیہ مضامین کی بھرمار کے اعتبار سے ان کا کلام میرؔ کے ڈھنگ پر ہے، اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیے۔

کب تجھ کو شوق قتل غریباں نہیں رہا　　جلاد کب تو جان کا خواہاں نہیں رہا

اک میرے دم کی روک تھی بندش تھی ٹوک تھی　　اب اُن کے در پہ دیکھئے درباں نہیں رہا

دست جنوں نے ہوش کے ٹکڑے اُڑا دیئے　　اب کوئی دستگیر گریباں نہیں رہا

سودائے سر بجیرا کہ سر پہ کلہ نہیں　　عمر جنوں دراز کہ داماں نہیں رہا

دل میں خلش تو ہے دلے کچھ بدمزہ سی ہے　　کیا دل میں تیر رہ گیا پیکاں نہیں رہا؟

اپنے زمانے کے عام انداز شاعری کے مطابق جمیلؔ نے کثرت سے غزلیں بھی لکھی ہیں مسدس

اور مخمس اور بعض ترکیب بند بھی لکھے ہیں مگر کم، اور اس عہد کے عام رجحان خاطر کے تتبع میں ان کے کلام میں لفظی صنائع بدائع کا بھی اہتمام پایا جاتا ہے۔ مثلاً اشعار ذیل میں۔

بری کے پر جلیں تو ان کا پانی گرم ہوتا ہے ۔۔۔ کھلی پڑتی ہے ان کے سر میں روئے حور کی تل کی
غروب ہونیکو ہے شاید ہمارا آفتاب دل ۔۔۔ شفق سب جانہیں پھولی ہوئی قاتل کے گالوں میں
روتے جاتے ہیں جمیل باوفا کی یاد میں ۔۔۔ چن رہے ہیں پھول تربت پر چڑھانے کے لئے

ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں۔

الفتِ چاہ ذقن میں ہوئے بدنام جمیل ۔۔۔ آبرو ڈوب گئی مشفقِ من پانی میں

اسی لفظی صناعی کے شوق میں انھوں نے بعض بعض غزلیں اول سے آخر تک صنعت ترجیع میں لکھی ہیں۔ مثلاً حمد میں کہتے ہیں۔

باغ جہاں کا مالی مولا تو سب کا رکھوالی ۔۔۔ تیری تنا سے کب خالی بوٹہ بوٹہ ڈالی ڈالی
تونے چمن میں اے باری کیسی کیسی کی گلکاری ۔۔۔ نرگس کو دی بیداری لالہ میں پیدا کی لالی
مالک تو ہے تو مختار، عاصی ہم ہیں تو غفار ۔۔۔ سب کے عیبوں کا ستار سب کا وارث سب کا والی
دونوں جہاں کا تو خلاق۔ جن و بشر کا تو رزاق ۔۔۔ جلوۂ قدرت کل آفاق۔ ذات ہے تیری سب سے عالی

لیکن لفظی آرائش و زیبائش کے باوجود زبان کی صفائی اور بے ساختگی کا برابر خیال رکھتے تھے۔ نامانوس ترکیبوں اور ثقیل لفظوں سے حتی الامکان اجتناب کرتے تھے، زبان کی صفائی اور بے ساختگی کے لئے ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ہاتھ سینہ پہ جو رکھو تو قرار آجائے ۔۔۔ دم نہ نکلے ملک الموت ہزار آجائے
پھر تو پھولا نہ سماؤں جو میرے پھولوں میں ۔۔۔ گلبدن پہنے ہوئے پھولوں کا ہار آجائے

کروٹیں لیتے ہی گذری کبھی راحت نہ ملی ۔۔۔ کسی پہلو مجھے کل دل کی بدولت نہ ملی
ضبط کرنے سے تڑپنے کا مزہ کب ملتا ۔۔۔ یہ بھی اچھا ہے مجھے صبر کی عادت نہ ملی
بعد مردن مجھے اس طرح زمیں نے پیسا ۔۔۔ آسماں ڈھونڈھنے نکلا مری تربت نہ ملی

بدیہہ گوئی | جمیل فطری شاعر تھے۔ اس لئے جب چاہتے فی البدیہہ اشعار کہہ دیتے تھے۔ مرضِ دق میں دو سال سے مبتلا ہونے کی وجہ سے تمام بدن نحیف و زار ہو گیا تھا، گوشت برائے نام باقی تھا، اسی حالت میں وفات سے چند روز پیشتر انھیں معلوم ہوا کہ دیوبند میں ایک مشاعرہ ہو رہا ہے جس کا مصرعہ طرح یہ ہے۔

مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ہرن پانی میں

مصرع کو سنتے ہی اپنے ایک عزیز سے کہا قلم دوات لے کر بیٹھ جاؤ اور اسی وقت ایک طویل غزل لکھا دی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

پھنکے جاتے ہیں ترے سوختہ تن پانی میں ۔۔۔ ڈر ہے مجھ کو کہ نہ پیدا ہو جلن پانی میں
تیری چوٹی کی جو موباف ہے گنگا جمنی ۔۔۔ شرم سے ڈوب گئی گنگ و جمن پانی میں
زلف لہرائی جو ہنگام شنا سب سمجھے ۔۔۔ سانپ جاتا ہے اٹھائے ہوئے پھن پانی میں
اشکِ گلگوں تہِ دریا میں جمے پھولے پھلے ۔۔۔ آؤ دکھلائیں تمھیں تازہ چمن پانی میں
منتظر بحر کی رہتی ہے سدا چشمِ حباب ۔۔۔ اس سے ظاہر ہوا ہے شوق وطن پانی میں
مچھلیاں لینے کو سورج کی شعاعیں آئیں ۔۔۔ جب کہ عریاں ہوا وہ سیم بدن پانی میں
فکر سے چھوٹ گئے جا کے وہ فن کے ڈوبے ۔۔۔ چادر آب میں کائی ہے کفن پانی میں

تضمین | مرحوم کو تضمین میں خاص کمال تھا جس شاعر کی غزل یا نظم پر تضمین کرتے تھے اسے بالکل اپنا لیتے تھے، غازی آباد کے پرانے استاد سخن حضرت بدر کی غزل پر تضمین کی ہے، نمونتہً اس کے چند بند درج ذیل ہیں اس مخمس کے تین مصرعے تضمین کے اور آخر کے دو مصرعے جناب بدر کے ہیں۔ کہتے ہیں۔

نگاہِ ناز یونہی فتنہ زا پھر سرمگیں ہوتی ۔۔۔ غضب ہی ہو گیا تھا گر یہ آمادہ کہیں ہوتی
حیا آڑے ہوئی ورنہ قیامت بالیقیں ہوتی ۔۔۔ تری نیچی نظر اونچی جو اے شوخ حسیں ہوتی

فلک زیر و زبر ہوتا تہ و بالا زمیں ہوتی

پسِ مردن جفا ہوتی تو خوش روح حزیں ہوتی — میسر پھر دہی آشفتگی زیرِ زمیں ہوتی
دلِ ایذا طلب کو موت سے تسکین نہیں ہوتی — بھلا اتنی تو گردش تیری اے چرخ بریں ہوتی
مرا لاشہ کہیں ہوتا مری تربت کہیں ہوتی

کوئی کس طرح سینہ چیر کر اب ان کو دکھلائے — خبر ہمدم کو ہے لیکن وہ ہی کیا خاک سمجھائے
خبر آمد کی سنتے ہی جو رنگ رخ نکھر آئے — شب فرقت تڑپنے کا انہیں کیونکر یقین آئے
وہ جب تشریف لاتے ہیں تو بیتابی نہیں ہوتی

ترجمہ | تضمین کے علاوہ متعدد فارسی غزلوں کا اردو غزل میں کامیاب ترجمہ بھی کیا ہے، امیر خسرو علیہ الرحمتہ کی مشہور غزل ہے۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

جمیلؔ مرحوم نے اس کا کس قدر بے ساختہ اور عمدہ ترجمہ کیا ہے کہتے ہیں۔

عشق نے کافر کیا اسلام ہو درکار کیا — میری رگ رگ تار ہے پھر حاجتِ زنار کیا
ہم غریبوں کو تماشائے چمن درکار کیا — داغ سینہ سے ہمارے بڑھ کے ہے گلزار کیا!
چارہ گر نادان ہوا ہے اٹھ مری بالیں سے جا — عشق کے بیمار کی دارو بجز دیدار کیا
شاد ہو اے عاشق غمگیں کہ کل محشر کے دن — قتل کا وعدہ تو ہے پھر وعدۂ دیدار کیا
ناخدا کشتی میں اپنی گر نہیں ہے تو نہ ہو — ہم خدا رکھتے ہیں ہم کو ناخدا درکار کیا
لوگ کہتے ہیں کہ خسرو ہو گیا کافر جمیل — خیر جی یوں ہی سہی دنیا سے ہم کو کار کیا

فارسی کے مشہور شاعر مرزا قتیل کی مشہور غزل ہے جس کا ایک مصرع ہے۔

مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت

جمیلؔ نے اس غزل کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے، کہتے ہیں۔

مارا ادا سے اور قضا کا بہانہ ہے — خود تو نظر بچائی حیا کا بہانہ ہے
مسجد گیا کہ دیکھ لوں جلوہ مگر وہاں — ہاتھوں سے منہ چھپا کے دعا کا بہانہ ہے

رکھتا ہے ہاتھ پیار سے دوشِ رقیب پر | دیکھا ہمیں تو لغزشِ پا کا بہانہ ہے
آواز میری سن کے وہ گھر سے نکل پڑے | ٹکڑا ہے ہاتھ میں کہ گدا کا بہانہ ہے
زاہد کو تاب تھی نہ حسینوں کے دید کی | کونے میں چھپ کے یادِ خدا کا بہانہ ہے

ہاتھوں میں خوں ملا ہے قتیلِ غریب کا
پھر اس پر اے جمیلؔ حنا کا بہانہ ہے

فارسی شاعری | زیادہ تو نہیں۔ لیکن کبھی کبھی انھوں نے فارسی میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ جن کو زبان کے اعتبار سے اگرچہ کچھ زیادہ بلند نہیں کہا جا سکتا، لیکن شاعر کے فارسی ذوقِ شعری کی خوبی پر اس سے استدلال ہو سکتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

یادا یامیکہ اندر سرہوائے داشتیم | در دل خود عشق آں کافر ادائے داشتیم
گرچہ حالا چاک وامانیم اے دستِ جنوں | بادا باد آں روز کاندر بر قبائے داشتیم
از نگاہ زہر آگیں و ز لبِ جاں بخش تو | گہ فنائے داشتیم و گہ بقائے داشتیم

ایک غزل فارسی متصوفانہ رنگ میں لکھی ہے اس میں کیا خوب فرماتے ہیں

شنیدے اقرب دگا ہے لن ترانی | عجب ایں ناز معشوقانہ دیدم
عبث کردم تلاش در تہ دریا | بہ صدر خویش ایں دردانہ دیدم
چو افگندی بہ من وز دیدہ نظرے | بہ سوئے سینہ بیتابانہ دیدم
حسینانِ جہاں را در مجالس | بہ شمع روئے تو پروانہ دیدم

ہزلیات | جمیل فطرتاً بڑے متین اور سنجیدہ تھے۔ لیکن ہزل گوئی شاید کمال شاعری کے خاصہ میں ہے کہ حضرت شیخ سعدی اور حضرت امیر خسرو ایسے ثقاتِ شعرا اس سے نہیں بچے۔

جمیلؔ نے بھی بعض بعض غزلوں میں ایسے شعر کہے ہیں جن سے ان کی شوخیِ طبع کی بو آتی ہے۔ مثلاً

حیرت ہے مجھ کو دیکھ کے پستان یار کو
کہتے ہیں لوگ سرو پہ آتا ثمر نہیں

مائل ہوا نہ وصل پہ وہ شوخ حیلہ گر
دل نے کہا کہ حیلہ سے سامان وصل کر

دیکھا پلنگ پر پڑا سوتا ہے بے خبر
بیخود سمجھ کے ہاتھ بڑھایا تھا یار پر

غش آگیا مجھے اسے ہشیار دیکھ کر

لیکن اس نوع کے شعر خال خال ہی ہیں جو شاعر کی سلامت روی کی دلیل ہے۔

کلام پر تبصرہ جمیل کے کلام کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ قدرت نے ان میں وہ تمام صلاحتیں ودیعت رکھی تھیں جو ایک شاعر کے لئے ضروری ہیں، ان کا دل عشق و محبت کے جذبات میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر عشق بھی بوالہوسانہ نہیں بلکہ روحانی و لطیف تھا۔ احساسات تیز تھے۔ اور بجائے پرامید شگفتہ اور ارمان انگیز ہونے کے یاس و حرماں سے پر اور غم واندوہ سے مانوس تھے۔ ان کو انگریزی تعلیم کی گوناگوں مصروفیتوں اور کالج کی چند در چند مشغولیتوں پھر ملازمت کے فرائض کے باعث آزادانہ مشق سخن کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اس لئے ان کے کلام میں کہنہ مشق استاد ان سخن کی سی صفائی، روانی اور سلاست نہیں ہے، پھر ان کی شاعری کا انداز یکسر قدیمانہ ہے، حالانکہ ان کا عہد شاعری وہ تھا جبکہ اقبال کی نواسنجیوں اور حالی و آزاد کی پیدا کی ہوئی فضا نے اردو شاعری کا رُخ گل و بلبل اور رخسارہ و کاکل سے ہٹا کر قومی یا نیچرل شاعری کی طرف پھیر دیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کہتے تھے اس میں تصنع اور بناوٹ کو دخل نہیں تھا بلکہ اپنے ذاتی مشاہدات و محسوسات عشق کو بیان کرتے تھے، تاہم عجب نہیں کہ اگر زمانہ ان کی پُر امید و ارمان جوانی پر رحم کھا کر انھیں اس عالم آب و گل میں چند برس اور رہوا کھانے کا موقع دیتا تو وہ بھی افسانہ گل

بلبل کی کوچہ نوردی کے بعد مولانا حالی کی طرح قومی شاعری کے چمن زار میں آجاتے۔
شعر گوئی کے ملکہ کے ساتھ قدرت نے ان کو حسن آواز کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔
جس کسی مشاعرہ میں غزل پڑھتے تھے سننے والوں پر محویت واستغراق کی شراب برسا دیتے تھے اور مشاعرہ انھیں کے ہاتھ رہتا تھا۔ آہ افسوس! کہ اب نہ وہ عندلیب کی زمزمہ پیرائیاں ہیں اور نہ وہ مرغ خوش الحاں کی ترنم ریزیاں۔ تمام افسانۂ شعر و شباب کا حاصل ایک غم انگیز یادماضی میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

بیادِ عہدِ ٹیپو

(از محوی، صدیقی)

گذشتہ سال جنوری ۱۹۳۹ء کے آخری ایام میں حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کا عرس تھا۔ جو سالانہ گورنمنٹ میسور کے زیر اہتمام شان و شوکت سے ہوتا ہے۔ اور چونکہ جنوبی ہند کے مسلمان خصوصیت کے ساتھ سلطان شہیدؒ سے خاص عقیدت رکھتے ہیں اس وجہ سے بہ کثرت دور دور سے لوگ آکر شریک ہوتے اور گویا اپنا ایک اہم مذہبی فریضہ ادا کرتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر بجید قلق ہوتا ہے کہ اس مرد مجاہد کے عرس کے موقع پر مزار کے قریب وہ سب کچھ بیہودگیاں بھی ہوتی ہیں، جو ہندوستان میں بزرگان دین کے مزاروں پر عرسوں میں عام ہیں۔ خصوصاً جُوا بہت ہوتا ہے، افسوس ہے کہ حکومت یا مسلمان نمایندوں نے اب تک اس کے روکنے کا کوئی معقول اہتمام نہ کیا، خدا ہی جانے کہ مسلمانوں کی غیرت کہاں جاکر سو گئی ہے!

گزشتہ سال میسور ریاست کی مسلم لیگ نے کچھ اپنی کارگزاری دکھانا چاہی اور ایک مشاعرہ بھی رکھا۔ جس کی صدارت کا قرعہ اتفاق سے مجھ غم نصیب کے نام نکلا۔ میں نے یہ طرحی مصرع تجویز کیا۔ "اسی چمن میں ہمارا بھی آشیانہ تھا"

علاقہ میسور کے تقریبًا تمام شعرار نے حصہ لیا، اور اچھی اچھی غزلیں سنائیں راقم آثم نے صدارتی حیثیت سے ایک خمسہ پیش کیا جو درج ذیل ہے۔ شاید ناظرین جامعہ بھی اثر اندوز ہوں۔ محوی

عجب وہ شوکتِ مسلم کا کارخانہ تھا — عجب وہ ہمت بیباک کا زمانہ تھا
عجیب عشرتِ ماضی کا وہ فسانہ تھا — فلک بھی معترفِ سطوتِ شہانہ تھا

سرِ غرور تھا، مسلم کا آستانہ تھا

ہمارے ہاتھ میں بھی چنگ اور چغانہ تھا ہمارے در پہ بھی اک روز شادیانہ تھا
ہمارے پاس بھی دولت کا اک خزانہ تھا ہمارا ٹھاٹ بھی اک روز فاتحانہ تھا
ہمارا رعب بھی دشمن کو تازیانہ تھا

عجب وہ دور تھا عزم و عمل کا دورِ شباب کہ دل تھے شاد، گلستانِ زندگی شاداب
ہجوم رزم میں ملتا تھا لطف بزم شراب وہ کارواں ہے مگر محوِ خواب و خانہ خراب
جو سوئے منزلِ رفعت کبھی روانہ تھا

خوشا وہ دور کہ گردش میں تھا عمل کا جام بغل میں شاہد آرام، اور دل خوش کام
ہر ایک موردِ الطافِ ساقی گنجام[1] تجھے بھی یاد ہے اے دورِ گردشِ ایام
زبانِ دہر پہ ٹیپو کا جب ترانہ تھا

چمن تھا ہند کا آزادِ خطرۂ صیاد مجال تھی کہ کسی پر کوئی کرے بیداد
محال تھا کہ کوئی لب ہو مائلِ فریاد کمال یہ کہ ہر اک شاد، بستیاں آباد
ہر اک غریب کا گھر اک نگار خانہ تھا

سمجھ کے غیر ہمیں دکھ نہ دو چمن والو (۲) ہنسو نہ ہم پہ گل و لالہ و سمن والو
قفس سے چھوٹ کے ہم آئے ہیں انجمن والو کٹی ہے عمر اسیری میں گو وطن والو!
”اسی چمن میں ہمارا بھی آشیانہ تھا“

گئے وہ دن کہ سراپا شباب تھی دنیا کہاں وہ رات کہ دلچسپ خواب تھی دنیا
کہاں وہ دور کہ جامِ شراب تھی دنیا کسی حسین کا رُخ بے نقاب تھی دنیا
نصیبِ اہلِ وفا، عیشِ جاودانہ تھا

---

[1] سلطان شہیدؒ کا پایہ تخت، صحیح: گنجِ عام۔ آج کل ویرانہ سا ہے۔

تمھیں خبر بھی ہے کیا چیز داغ فرقت ہے   ہنسو نہ ہم پہ خدارا جو غیر حالت ہے
ہمارا سینہ سراپا چراغِ عبرت ہے   زبانِ گنبدِ ٹیپو پہ یہ عبارت ہے
کبھی ہمارے موافق بھی یہ زمانہ نہ تھا

بٹھایا ہم کو غلامی کا حلقہ کیوں تونے؟   دکھایا رنج و مصائب کا جلوہ کیوں تونے؟
مٹایا آرزوؤں کا وہ نقشہ کیوں تونے؟   بڑھایا حوصلۂ ذوقِ سجدہ کیوں تونے؟
سرِ نیاز اگر ننگِ آستانہ نہ تھا

اُسی کے ذکر سے ہے آج گرمیٔ محفل   اسی کے ہجر میں ہیں آج اہلِ دل بسمل
اُسی کی یاد میں روتے ہیں نازنیں قاتل   اسی کی قبر زیارت گہہ جہاں ہے جو دل
ہلاکِ شیوۂ ناقدریِ زمانہ نہ تھا

تجھے خبر بھی ہے اے محوِ خواب تودۂ خاک (۳)   کہ تیرے سوگ میں کتنوں کی آنکھ ہے نمناک
ہوئے ہیں تیری جدائی میں کتنے سینے چاک   کہاں ہے آج ترا جوش و ہمت بیباک
وہ جوش، پشت عمل کو جو تازیانہ نہ تھا

وفا کی راہ میں خود کو مٹا دیا تونے   جہاد و سعی کا رستہ بتا دیا تونے
فلک کے عزم کو نیچا دکھا دیا تونے   زمیں کو زور قدم سے ہلا دیا تونے
خدا گواہ ترا جوشش بیکرانہ نہ تھا

بجا ہے یہ کہ ہمیں پھر جگا دیا تونے   دلوں میں جوشش تمنا بڑھا دیا تونے
پڑا تھا آنکھ پہ پردہ، اُٹھا دیا تونے   بتانِ خوف و تغافل کو ڈھا دیا تونے
جو عزم تھا ترا، عزم مجاہدانہ نہ تھا

سلام تجھ پہ ہو اے روحِ تاجدارِ دکن   سلام تجھ پہ ہو اے حاصلِ بہارِ چمن
سلام تجھ پہ ہو اے نازشِ کنارِ وطن   سلام تجھ پہ ہو اے حاملِ وقارِ کہن
خدا کے قہر کا مٹنا ترا بہانہ نہ تھا

غزل

(حضرت فراقؔ گورکھپوری)

برقِ جہندہ حُسنِ خراماں — فتنۂ دوراں زلزلہ ساماں

حسنِ گلستاں حیراں حیراں — غنچہ غنچہ سر بگریباں

ہستیٔ عالم لرزاں لرزاں — ساعقہ ساماں حسن خراماں

دل میں اُٹھا کے رکھ لے گلستاں — کر لے علاجِ تنگیٔ داماں

شبنم و شعلہ حسن گلستاں — پُرنم پُرنم سوزاں سوزاں

ظلمت و نور ہی عشق کی ہستی — تیرہ تیرہ تاباں تاباں

رنگِ شباب اثراتِ محبت — نکھرا نکھرا پنہاں پنہاں

ڈھونڈھ لے مجھکو گلشن گلشن — صحرا صحرا زنداں زنداں

آئے گنہگارانِ محبت — نادم نادم نازاں نازاں

دل کی کھٹک ہی دل کی خلش ہی — ناوک ناوک پیکاں پیکاں

اب ہیں دلِ بے حس کے عناصر — حسرت حسرت ارماں ارماں

کب تک عقدۂ عشق رہی گا — مشکل مشکل آساں آساں

یہ بھی فسانہ وہ بھی کہانی — کیا شب وصل اور کیا شبِ ہجراں

بختِ سیہ اور گیسوئے پُرخم — یہ بھی شبستاں وہ بھی شبستاں

گونج اُٹھی ہے رہتی دنیا — بول اُٹھا ہے شہرِ خموشاں

ذرّہ ذرّہ تارا تارا — ششدر ششدر حیراں حیراں

داغِ محبت رازِ محبت — کم کم پیدا کم کم پنہاں

بزم چراغاں بھی تاریکی — تاریکی بھی بزم چراغاں
بیداری ہے اپنے سہارے — نیند کا جھونکا گردشِ دوراں
آنچ قفس والوں تک آئی — "اب کے بہت ہی شورِ بہاراں"
حسن اور عشق میں کیونکر کہیے — کون ہے پنہاں کون نمایاں
اس کا پانا ہے وہ کرشمہ — سوچ تو مشکل دیکھ تو آساں
ہر نظارہ برق فنا ہے — دیکھ سکو گے حسنِ بہاراں؟
کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا — کون ہے صبحِ ازل سے خراماں
حسن ہوا چالاکِ زمانہ — عشق ہے اب تک ناداں ناداں
بے خبری ہے اہلِ جہاں کی — کون ہے گریاں کون ہے خنداں
کم نگہی بھی صدقے ہو گی — دیکھ تو میرا شوقِ فراواں
کس نے موت کی نیند اُڑا دی — جاگ اُٹھی ہے خلقِ شہیداں
کُھلتی چلی ہے عشق کی قیمت — حُسن بھی ہے اب ارزاں ارزاں
اور نظریئے بھی ہیں ممکن — ناداں عشق ہے درد نہ درماں
تھمی تھمی سی صبحِ قیامت — رُکی رُکی سی گردشِ دوراں
کس کی تمکیں وحشت زا ہے — کس کا سکوں ہے سلسلہ جُنباں
دُنیا کو دنیا کرنا ہے — یہ منصوبے ساز نہ ساماں

یوں ہی فراقؔ نے عمر بسر کی
کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں

رفتارِ عالم

ہمارے زمانے میں بہت سی نئی ایجادیں ہوئی ہیں، اور اِن کے ساتھ فنِ جنگ کی بھی ایک نئی ایجاد ہوئی ہے جس کی اہمیت آہستہ آہستہ محسوس ہو رہی ہے۔ یہ جنگ کا وہ طریقہ ہے جسے جرمن زبان میں Blitzkrieg کہتے ہیں، اس کے معنی ہیں وہ جنگ جو بجلی کی طرح ہو یعنی اتنی سمتوں اتنی طاقت کے ساتھ اور ایسا اچانک حملہ کیا جائے کہ وہ بالکل بے بس ہو جائے اور اس میں مقابلہ کی طاقت نہ رہے۔ یہ فن جنگ کے جرمن ماہروں کی ایجاد ہے اور اس کو اب تک آسٹریا اور چیکوسلواکیا میں آزمایا جا چکا ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ آسٹریا اور چیکوسلواکیا میں جرمن فوجوں کا مقابلہ کیا ہی نہ جا سکا۔ پولینڈ میں مقابلہ تو ہوا لیکن اسی Blitzkrieg نے پولینڈ کی ریاست کی ہڈیاں اس طرح توڑ دیں کہ مخالفت سے وہ اپنے ہی کو نقصان پہنچا سکتی تھی، اسی طرح نئے اصول کے مطابق ۹ اپریل کو ڈینمارک اور ناروے پر حملہ کیا گیا، ڈینمارک بارہ گھنٹہ میں فتح ہو گیا، اور ناروے میں اگرچہ مخالفت ابھی تک جاری ہے لیکن اس کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ اتحادی اپنی فوجیں وہاں اتنی تعداد میں اتنے مختلف محاذوں پر پہنچا دیں کہ وہ جرمنی کی فوج پر حاوی ہو جاویں۔

اس کا اندازہ کرنا بھی بہت مشکل ہے کہ ہر ہٹلر نے ناروے پر حملہ کس خاص مصلحت سے کیا، یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ناروے سے مختلف قسم کا خام مال اور خاص طور سے کچا لوہا جو کہ جنگ کا سامان تیار کرنے میں بہت کام آتا ہے اس لئے اس کا جرمنی پہنچتے رہنا بہت ضروری تھا۔ اتحادی اس میں بہت سی رکاوٹیں ڈال رہے تھے اور آخر میں انگریزوں نے ناروے کے ساحل پر تین جگہ بحری بم کے گولے اس طرح بچھا دیئے تھے کہ کوئی جہاز اس تین میل کی حد کو جو ناروے کے ملک میں شامل سمجھی جاتی ہے چھوڑ کر بغیر شمال سے جنوب یا جنوب سے شمال کی جانب نہیں جا سکتا تھا، اور جیسے ہی وہ اِس

تین میل کی حد سے نکلتا برطانوی جہاز اس کی تلاشی لیتے اور مناسب سمجھتے تو اس کا مال ضبط کر لیتے۔ غالباً اِسی کارروائی کے عمل میں آنے سے پہلے ہی جرمنی کو برطانیہ کے ارادے کی خبر ہوگئی تھی اور اس کو غالباً یقین ہوگیا تھا کہ ناروے کی غیر جانبداری کی وہ حیثیت نہ رہیگی جواب تک تھی۔ اس وجہ سے جرمن حکومت نے یہ دعوےٰ کر کے کہ ناروے میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ صحیح معنوں میں غیر جانب دار رہ سکے اس پر حملہ کر دینا مناسب سمجھا۔ حملے کے لئے بہت پہلے سے تیاری کی جا چکی تھی ہر تفصیل پر غور کر لیا گیا تھا، اور اب بھی معلوم ہوتا ہے کہ جرمن حکومت کو سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوتی ہے کہ اس کا سارا کام پروگرام کے مطابق ہوا۔

ناروے پر حملہ تو بے شک اچانک ہوا، لیکن ہر ہٹلر اپنی طرف سے کئی بار اس کا اعلان کر چکے ہیں کہ وہ یوروپ کی نئی تقسیم کریں گے اور روس و اٹلی کو ان کا حق دیکر اپنا حق بھی وصول کریں گے۔ روس کو اس کا حق لیتھونیا، لیتویا، استھونیا اور جنوبی فن لینڈ دیا جا چکا ہے اور اسے بحر بالٹک کی طرف سے اب کسی حملہ کا اندیشہ نہیں ہے۔ آدھا پولینڈ بھی اسے مل گیا ہے جس کی آبادی روسی یا اکرائنی ہے۔ پولینڈ کا بقیہ حصہ ہر ہٹلر جرمنی کے لئے حاصل کر چکے ہیں، شمالی یوروپ میں اُنہوں نے ڈینمارک، ناروے اور سویڈن کو اپنا حصہ سمجھا تھا اب اسے حاصل کر رہے ہیں۔ وہ اس میں ہرگز کامیاب نہ ہوتے اگر روس ان کے ساتھ نہ ہوتا، جیسے روس کامیاب نہ ہوتا اگر جرمنی کی سیاست اس کی پشت پر نہ ہوتی۔

اس زمانہ میں جو کہ تہذیبی عروج کا زمانہ ہے سیاست کی ایسی بیباکی جو قوتوں اور ملکوں کو آپس میں اس طرح تقسیم کرے جیسے زمیندار زمین اور مویشی کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں بہت ہی حیرت انگیز ہے، لیکن اس پر بحث کرنا بالکل بیکار ہے۔ غور تو اس پر کرنا چاہیئے تھا کہ اس نئی بیباک سیاست کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے اور یہی اتحادیوں نے نہیں کیا۔ آسٹریا پر ۱۹۳۸ء پر حملہ ہوا تو وہ اس کی سیاسی مخالفت پر تیار نہ تھے چیکوسلواکیا کے سڈٹین علاقے مسٹر چیمبرلین نے خود ہر ہٹلر کو دیدیئے۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں جب ہر ہٹلر نے چیکوسلواکیا کی ریاست کو بالکل ختم کر دیا

تب کہیں جاکر برطانیہ نے مخالفت شروع کی اور وہ بھی ایسی کہ جس سے جرمنی کی بیباک سیاست کو شکایت کا ایک اور موقع مِل گیا، یعنی اس کی بیباکی اپنی اصلی صورت میں نظر نہ آئی بلکہ مظلومیت کی چادر اوڑھ کر۔ اس وقت اگرچہ ہر ہٹلر اپنے سیاسی ارادوں کو کئی موقعوں پر ظاہر کر چکے تھے، لیکن پہلے کی طرح یہی سمجھا گیا کہ وہ شیخی مار رہے ہیں یا دھمکی دے رہے ہیں۔ اتحادی مُدبّروں کو اس کا خیال نہ ہوا کہ جیسے ہر ہٹلر اپنے پہلے ارادے پورے کر چکے ہیں ویسے ہی اس مرتبہ بھی کریں گے یا تو بلقان پر ان کا حملہ ہوگا یا ڈینمارک، ناروے اور سویڈن پر۔ اتحادی جن اصولوں کے لئے لڑ رہے ہیں ان کی قدر دنیا سے مٹ گئی تو تہذیب اخلاق اور جمہوری حکومت کا بھی نام نہ رہیگا، لیکن جو طریقہ اِن بیش بہا چیزوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے اس کے کارآمد ہونے میں اگر کوئی شک کرے تو بیجا نہ ہوگا۔

جرمنی نے ڈینمارک اور ناروے پر ۹ر اپریل کو حملہ کیا تھا، ڈینمارک نے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے بارہ گھنٹہ کے اندر جرمنی کی ماتحتی قبول کرلی اور اتحادی بھی اس کو بچانے کی طرف سے ایسے مایوس ہوگئے کہ انھوں نے ۱۳ر اپریل کو ڈینمارک کے جو جہاز ان کی بندرگاہوں میں تھے اُن پر قبضہ کرلیا ناروے کو بچانے کے لئے اتحادی بالکل تیار نہ تھے۔ مسٹر چرچل نے اپنی ایک تقریر میں اِن لوگوں کو بہت سمجھایا اور ڈانٹا جنھوں نے برطانیہ کے بیڑے پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ناروے کی حفاظت نہیں کی اور ناروے کے ساحلوں پر اس طرح پہرہ نہیں دیا کہ جرمنی کے جنگی جہاز ناروے کی بندرگاہوں میں جاکر سپاہیوں کو وہاں اُتار نہ سکیں۔ ناروے اور برطانیہ کے درمیان بحر شمالی کے بیشتر حصّے میں بحری بم بچھے ہوئے ہیں، اور ان کے درمیان صرف چند رستے ہیں جن کی آسانی سے ناکہ بندی کی جاسکتی تھی۔ اگر برطانوی جہازوں کی وہی قدر و قیمت ہے جو مسٹر چرچل نے بیان کی ہے، اور ان سے ناکوں پر پہرہ دینے کا کام اس واسطے نہیں لیا جاسکتا تھا کہ جرمن آبدوز انہیں ڈبو دیتے تو پھر سیاست کو اور بھی زیادہ ہشیار رہنا چاہیئے تھا اور ناروے پر جرمن حملے کی پیش بندی کے اور طریقے سوچنا چاہیئے تھا،

مسٹر چرچل نے برطانوی بیڑے کو الزام سے بری کرنے کے لئے سارا الزام برطانوی سیاست پر لے لیا ہے لیکن اس سے بھی ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو اطمینان نہیں ہو سکتا جو دنیا کو جرمن سیاست کی وبا سے بچانا چاہتے ہیں۔

بہرحال اس سے اب انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس وقت جرمن فوجیں ڈنمارک اور جنوبی ناروے میں داخل ہوئیں اس وقت جرمن سپاہیوں کو لے کر نارویک کی بندرگاہ میں پہنچ گئے جو ناروے کے بالکل شمال میں ہے اور ناروے کی تمام بندرگاہوں پر جرمنی کی ایک ہی وقت میں قبضہ ہو گیا۔ خبریں بھیجنے کے جتنے ذریعے ہو سکتے ہیں وہ سب بند تھے۔ ناروے کی حکومت دارالسلطنت آسلو سے شمال کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوئی تھی اور وہ ناروے کی فوج کو تیار ہونے کے احکامات بھی نہیں دے سکتی تھی، گویا ناروے کی ریاست کے سر پر پیچھے سے اور اچانک لاٹھی ماری گئی تھی جس کی وجہ سے وہ کچھ دیر تک بالکل بیہوش رہی۔ پھر جب ہوش آیا تو جگہ جگہ پر جرمن فوجوں کی مخالفت کی جانے لگی اور قزاقانہ جنگ کا طریقہ اختیار کیا گیا لیکن اس کی اُمید رکھنی فضول ہے کہ یہ قزاقانہ جنگ جرمنی کی طاقت کا مقابلہ کر سکیگی اور منتشر فوجیں اس تنظیم کی تدبیریں اُلٹ سکیں گی کہ جس نے چند گھنٹے کے اندر ملک پر قبضہ کر لیا۔ اتحادیوں نے حملے کی خبر سُنتے ہی اس کا اعلان کیا تھا کہ وہ اپنی فوجیں ناروے بھیجیں گے اور برطانیہ کے بحری اور ہوائی جہازوں نے جگہ جگہ پر جرمنوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ نارویک، برگن، اور آسلو کے قریب بڑے مقابلے ہوئے لیکن فوج بھیجنے کے ارادے پر اتحادی معلوم نہیں قائم ہیں یا نہیں۔ ۱۴ اپریل کو جو خبر آئی تھی اس میں اس فوج کی دشواری کا اشارہ کیا گیا تھا جو ایسے ساحل پر اُترنا چاہے جس پر دشمن کا قبضہ ہو۔ لیکن ہم نے اس خبر سے یہ نتیجہ تو نہیں نکالا کہ اتحادی اپنی فوجیں ناروے نہیں بھیجیں گے

(م، م)

عالمِ اسلام

یورپ میں پچھلے سات مہینوں سے سخت ہولناک جنگ لڑی جارہی ہے۔ فریقین کے توپ و تفنگ سے بے کس عورتیں اور معصوم بچے تک محفوظ نہیں، ہر شخص کو ہر لحظہ اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب دشمن کے ہوائی جہاز آگ برسانے کے لئے فضا میں نمودار ہوتے ہیں اور اشارہ پاتے ہی انھیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر زمین کے نیچے تہ خانوں میں پناہ ڈھونڈتی پڑتی ہے۔ آٹھ پہر دن میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ ان لوگوں کو دشمن کے حملے سے اطمینان نصیب ہوتا ہو۔

یورپ تو میدان کارزار بنا ہوا ہے اس لئے یورپ والوں کا خوف و ہراس ایک قدرتی چیز ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مشرق وسطی اور مشرق قریب میں مراکش سے لے کر بلوچستان اور کابل تک جسے ہم دنیائے اسلام کہتے ہیں افرا تفری کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس وسعت آباد میں اب تک ایک بندوق بھی سر نہیں ہوتی۔ لیکن ایک سرے سے لے کر دوسری سرے تک میدان جنگ کا پورا نقشہ کھنچا ہوا ہے۔ فوجیں کیل کانٹے سے آراستہ مستعد کھڑی ہیں، آئین قانون کی جگہ کم و بیش فوجی قانون کا عمل درآمد ہے، قواعد اور فوجی مشقوں کی بھرمار ہے۔ ہر کوئی پریشاں ہے کہ دیکھئے کب اور کس طرف سے اس کے ملک پر حملہ ہوتا ہے۔

مراکش اور الجزائر نسبتاً دور ہیں اور ہٹلر اور مسولینی کی دست برد سے ایک حد تک محفوظ۔ لیکن میسولینی برسوں سے بحیرۂ روم کو کلیتہً اطالوی سمندر بنانے کے راگ الاپ رہا ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی میں جنرل فرانکو کے حق میں مداخلت کا مطلب ہی یہی تھا کہ شمالی افریقہ کی فرانسیسی مقبوضات پر آسانی سے شہ

پڑ سکے، ادھر طرابلس پر تو اٹلی قابض ہے اور کئی سال سے اسے فوجی اعتبار سے مستحکم کرنے کی سر توڑ کوشش کی جارہی ہے، خیال ہے کہ فرانس اور برطانیہ نے اگر جنگ میں ذرا بھی کمزوری دکھائی تو طرابلس سے اٹلی کی فوجیں ایک طرف مصر پر اور دوسری طرف فرانسیسی مقبوضہ ٹیونس پر چڑھ دوڑیں گی، مسولینی گو اس وقت تک جنگ سے الگ ہے لیکن گاہے گاہے روسی شیر غراتا ضرور ہے جس سے فرانس اور برطانیہ پر دہشت چھائی ہوتی ہے اور انھیں مجبوراً مصر اور ٹیونس میں بہت بڑی تعداد میں فوجیں رکھنی پڑی ہیں۔

ترکی اس وقت جس ضغطے میں ہے اس کا ذکر اصولی طور پہ پچھلے پرچے میں ہو چکا ہے، ایران کی حالت قریب قریب ترکی کی سی ہے، اور آئے دن یہ خبریں سننے میں آتی ہیں کہ روسی فوجیں ایران کی سرحد پہ اکٹھی ہو رہی ہیں۔ ایران سے ملی ہوئی عراق کی سرحد ہے اور روسی حملہ کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ یہ جنگ تیل کے بل پر لڑی جائے گی اور جیت اس کی ہوگی جس کے تیل کے ذخیرے کم نہ ہوں گے ایران اور عراق میں برطانوی کمپنی کا تیل کا اجارہ ہے۔ اور برطانی سامراج پر سب سے کاری اور زود اثر ضرب صرف ان نواح میں پڑ سکتی ہے، افغانستان گو دنیا سے الگ تھلگ ہے لیکن ہندوستان اور روس کے بیچ میں واقع ہونے سے اس کی اہمیت ایران اور ترکی سے کم نہیں، برطانوی سامراج کے لئے دوسرا خطرہ ہندوستان پر روسی حملہ ہے جو افغانستان کے راستہ سے ہو سکتا ہے، چنانچہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ یورپ کے کسی نہ کسی پایہ تخت سے یہ تار دنیا کے طول وعرض میں گشت نہ لگاتا ہو کہ روسی سیلاب کا رخ کچھ دنوں میں افغانستان کی طرف ہوا چاہتا ہے، یمن، حجاز، فلسطین، اور شام فرانس اور برطانیہ کے دشمنوں سے جغرافی لحاظ سے کٹے ہوئے ضرور ہیں۔ لیکن ہوائی قوت کی تاخت وتاراج کے سامنے ارض وسما اور بحر وبر کی پہنائیاں

اب موہوم حیثیت رکھتی ہیں، اس لئے ان کا حال بھی کچھ کم نازک نہیں۔

وسطی ایشیا اور مشرق قریب کا مسئلہ برطانیہ اور فرانس کی شہنشاہیتوں کے لئے بہت اہم بن گیا ہے۔ ان ملکوں کی فوجی اور اخلاقی مدد ان دو سامراجی سلطنتوں کا بہت بڑا سہارا ثابت ہوسکتی ہے۔ ان کے دشمن چاہتے ہیں کہ اس محکوم، نیم آزاد ملکوں کی مسلمان آبادی کو اتحادیوں کے خلاف ابھاریں۔ اور اس طرح سامراج کی شہ رگ پر کاری ضرب لگائیں۔ اس کے برخلاف برطانیہ اور فرانس کی یہ کوشش ہے کہ مراکش سے لے کر پشاور تک اور نہ (ترکی) سے عدن تک کے مسلمانوں کو کسی نہ کسی رشتے میں پرو کر ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم اس وقت فاسسٹی، نازی اور بالشویکی سیلاب کو روکنے کا کام لے، اس مقصد کے لئے ڈپلومیسی اور پروپیگنڈے کے دوررس حربے استعمال کئے جارہے ہیں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عربوں ترکوں، ایرانیوں اور افغانوں نے برطانیہ اور فرانس کے خلاف اپنی پچھلی کدورتیں دلوں سے دھو دی ہیں۔ اور وہ خلوص منت سے ان کی دوستی اور حمایت کا دم بھرنے لگے ہیں۔

اس وقت تک اتحادیوں کا کھلا ہوا دشمن صرف جرمنی ہے۔ اور خوش قسمتی سے اتحادیوں کے مشرقی مقبوضات اس کی پہنچ سے باہر ہیں، لیکن روس اور اٹلی کا معاملہ اب تک صاف نہیں، اتحادیوں کو ان کی غیر جانبداری مشکوک نظر آتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک ان دونوں کی غیر جانبداری سے جرمنی ہی فائدہ میں ہے۔ اور آگے چل کر اگر حالات نے کوئی دوسری شکل اختیار کی تو غالباً روس اور اٹلی دشمنوں ہی کی صف میں نظر آئیں گے۔ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ آنے والے خطرات کی روک تھام پہلے ہی سے کی جائے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اسٹالین، ہٹلر اور مسولینی کے ہوا خواہ اسلامی ملکوں میں خال خال نظر آئیں گے، اور وہ بھی چند سر پھرے نوجوان ہیں جن کی ہمتوں کی پستی

ان کے شوق کی بلندی کی تاب نہیں لاسکتی اور انھیں مجبوراً سب سے الگ راہ اختیار کرنا پڑتی ہے ورنہ عام جمہور، حکمراں طبقوں کے پورے طور پر اثر میں ہیں، اور یہ حکمراں کسی قسم کی انقلابی تحریک کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں، مسولینی نے طرابلس کے عربوں پر جو ستم ڈھائے ان کی یاد اب تک دلوں میں تازہ ہے۔ اور آج اٹلی والے ریڈیو سے اپنی اسلامی دوستی کا لاکھ وعظ کہیں، ان کی آواز قطعاً بے اثر رہے گی، ہٹلر کو جس بھیانک شکل میں اب تک پیش کیا گیا ہے اور جس سینہ زوری سے اس نے کمزوروں کو ملیامیٹ کیا ہے، اس کو دیکھ کر اسلامی ملک جو سب کے سب ابھی کمزور ہیں کبھی بھی جرمنی کا دل سے بھلا نہیں چاہ سکتے۔ چنانچہ برلن ریڈیو اسٹیشن سے عربی، ترکی اور فارسی کا سارا پروپیگنڈا ہٹلر کی نفرت کو کم نہیں کرسکتا، روس سے اس کے اسلامی ہمسائے خائف ہیں، ان کی دوستی اس وقت تک تھی جب تک وہ فرانس اور برطانیہ کی دراز دستیوں سے نالاں تھے، اب حالات بالکل بدل گئے ہیں اس لئے ترکی، ایران اور افغانستان روس سے دور ہی رہنا چاہتے ہیں۔

روس میں ایک انقلابی نظام چل رہا ہے۔ اور یہ نظام جارحانہ ہے جو آگے بڑھنا چاہتا ہے، نیز روس نے ایران، افغانستان اور ترکی کی سرحدوں پر ان ملکوں کی ہمجنس اور ہم زبان لوگوں کی نیم آزاد اشتراکی جمہوریتیں قائم کر رکھی ہیں، ظاہر ہے روس جوں جوں مضبوط ہوتا جائے گا، ان اشتراکی جمہوریتوں کا اثر بھی پھیلتا جائے گا، اس میں ترکی، افغانستان اور ایران کو اپنی موت نظر آتی ہے کیونکہ اشتراکیت کے بہاؤ میں کمزور قوموں کا اپنی مستقل قومیت کو برقرار رکھنا کسی طرح ممکن نہیں۔

یہ اسباب ہیں جنھوں نے اسلامی ملکوں کی تمام سیاسی جماعتوں کو جو جنگ سے پہلے برطانیہ اور فرانس کی سخت حریف تھیں آج ان دونوں کا ہمدرد بنا دیا ہے۔ اور ہر طرف

سے یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ اسلام جمہوریت کا حامی ہے اور تمام مسلمان جمہوری سلطنتوں یعنی فرانس اور برطانیہ کے دل وجان سے خیر خواہ ہیں۔ اور ہر طرح ان کی مدد کرنے کو تیار ہیں اتحادی اس خیر خواہی کے جذبہ کو ہر ممکن تدبیر سے تقویت پہنچا رہے ہیں۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ اگر لڑائی طول کھینچ گئی اور اتحادیوں کو دشمنوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوتا گیا تو مشرق قریب اور وسطی ایشیا کی اسلامی حکومتوں کی سیاست میں بہت بڑا تغیر ہو کر رہے گا۔

ایک صدی پہلے دنیائے اسلام کی ایک بری بھلی وحدت موجود تھی، عثمانی ترک اس وحدت کے بانی تھے اور اصل میں سیاسی قوت اور بظاہر مذہب کے نام سے انھوں نے اس وحدت کو ۱۹۱۴ء کی جنگ تک سنبھالے رکھا۔ ان کی شکست سے اسلامی وحدت کا شیرازہ پارہ پارہ ہوگیا، اور ایک سلطنت کی بجائے بیسیوں ریاستیں بن گئیں، تعجب یہ ہے کہ اس وحدت کو توڑنے کے ذمہ دار وہی لوگ تھے جو آج عالم اسلام کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کے بہت بڑے داعی ہیں۔ یعنی برطانیہ اور فرانس۔ یہ ہیں سیاست کی نیرنگیاں! ان دونوں نے اسلامی ملت کے جسم کی اس طرح تکا بوٹیاں کیں کہ شام کے ایک مختصر سے صوبہ میں جس کی آبادی بمشکل ایک کرور ہوگی کوئی چھ سات جمہوریتیں قائم کر دیں۔ لیکن آج برطانیہ اور فرانس، وحدت عربی، وحدت اسلامی اور معلوم نہیں کس کس وحدت کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں، اسلامی وحدت کی یہ نئی تعمیر یورپی سیاست کا شاہکار ہے۔ قارئینِ "جامعہ" کے لئے اس کا ایک اجمالی خاکہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کچھ عرصہ ہوا معاہدہ سعد آباد کے ذریعہ افغانستان، ایران، عراق اور ترکی کو ایک صف میں لایا گیا۔ اس معاہدہ پر بڑی خوشیاں منائی گئیں، اور مشرقی جمعیت الاقوام کے خواب دیکھے جانے لگے، دراصل اس معاہدہ کی تہ میں

برطانوی سیاست کام کر رہی تھی، اور یہ روس کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی ایک تدبیر تھی۔ اب اس معاہدہ کو اور مستحکم کیا جا رہا ہے۔ اور ریلوے لائن کے ذریعہ ان چاروں ملکوں کو باہم ملانے کا کام زوروں پر جاری ہے۔ ترکی کو بہت بڑی تعداد میں اسلحہ خریدنے کے لئے قرضہ دیا ہے۔ اِدھر ایران کو قرضہ دینے کی گفتگو ہو رہی ہے، برطانیہ کا خیال ہے کہ اگر روس مشرق کا رُخ کرے تو ایران ترکی اور افغانستان اتنے مضبوط ہوں کہ وہ روس کا راستہ روک لیں، اور اسے برطانوی مقبوضات تک بڑھنے کا موقعہ نہ دیں۔

اٹلی کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے "اتحادِ عرب" کا منصوبہ مفید ثابت ہو رہا ہے، عراق کے فوجی افسر یمنی فوجوں کو قواعد سکھانے صنعاء پہنچ گئے ہیں، ابن سعود کا ایک بیٹا امام یمن کی زیارت کو گیا ہے۔ دوسرا بیٹا خلیج فارس کے ساحلی شہر کویت کی سیر کر رہا ہے۔ عراق اور نجد میں پرخاش چلی آئی تھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ ان دونوں کا آپس میں سمجھوتہ کرا دیا۔ فلسطین کی وجہ سے عرب خفا تھے اب عراق اور مصر کے وفد فلسطین کے تباہ و برباد عربوں میں زرِ امداد تقسیم کر رہے ہیں، مصر تو اسی اتحادِ عرب کا مرکز ہے۔ اور برطانوی سیاست کی رہنمائی میں یہ کام بڑے اچھے پیمانے پر کیا جا رہا ہے۔

ازھر دیندار عربوں کا ذہنی مرکز ہے، اور اس کے موجودہ شیخ مصطفیٰ المراغی برطانیہ کی اس اتحادِ عرب پالیسی کے پورے مؤید ہیں ان کی وساطت سے اب سوڈان میں عربی کلچر کا احیاء ہوگا تاکہ حبش کی طرف سے اٹلی کے پروپیگنڈے کا جواب عربی وحدت سے دیا جا سکے، شمالی افریقہ میں مراکش الجزائر اور ٹیونس کے پڑھے لکھے طبقے عربی وحدت کے پرستار ہیں، اس انبوہ میں طرابلس سے اٹلی کی عرب دوستی کی آواز بھلا کون سنے گا؟ بہرحال مشرق میں ترکی ایران،

عراق اور افغانستان کی سیاسی وحدت اور مغرب میں عربوں کے اتحاد کی مدد سے برطانیہ اور فرانس روس اور اٹلی کے بالشویکی اور فاشسٹی رو کو روکنے کی تدبیر کر رہے ہیں۔

اسلامی وحدت کی اس تعمیر میں نہ کسی ایک مسلمان قوم کا سیاسی غلبہ اثر انداز ہے اور نہ مذہبی جذبہ، بلکہ ملک اور وطن کی ٹھوس ضرورتیں ہیں جو ان پراگندہ قوموں کو ایک لڑی میں پرو رہی ہیں۔ البتہ یہ وحدت اور اتحاد فرانس اور برطانیہ کے جھنڈے تلے صورت پذیر ہو رہا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ اسلامی وحدت کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی بھی ہو سکے گی یا ہمیشہ دوسروں کا آلۂ کار بن کر رہے گی۔

(نقشہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

اسلامی ریاستیں
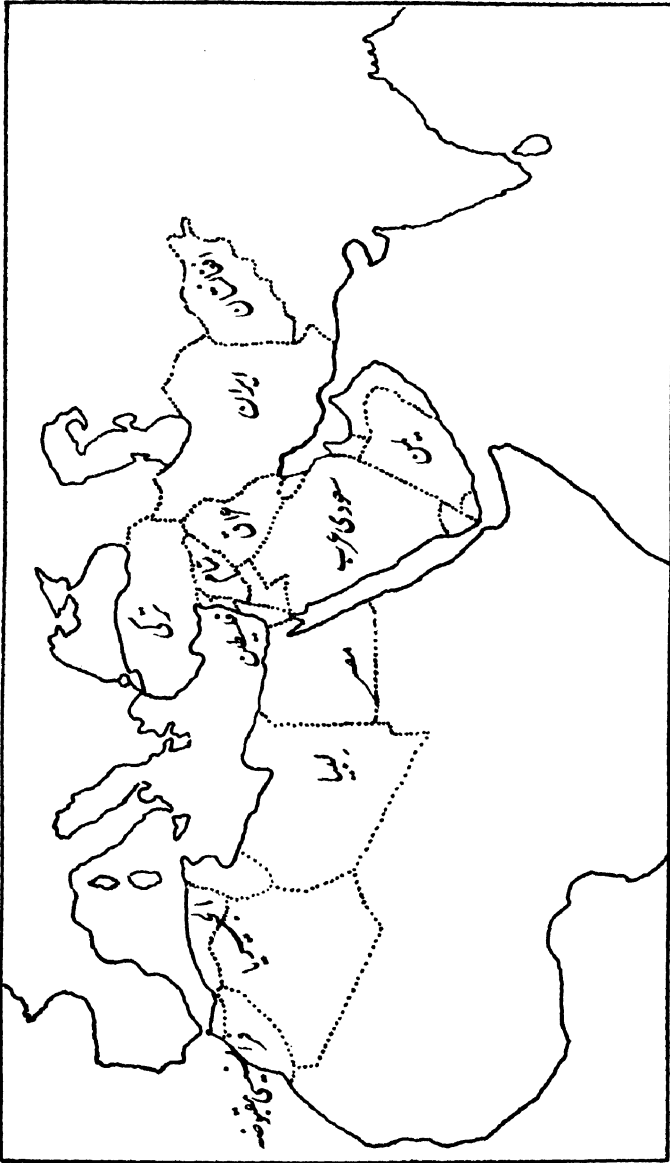
دُنیائے ادب

(۱) موجودہ انگریزی ڈرامہ۔ ۲۹ رفروری کو مسٹر آبری منن نے ٹاؤن ہال بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ انگریزی کے موجودہ ڈرامے کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم کے ڈرامے تو وہ ہیں جن پر ایک خاص قسم کا مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ مسٹر برنارڈ شا اس قسم کے ڈرامہ نگاروں میں سب سے آگے ہیں۔

دوسری قسم کے ڈرامے وہ ہیں جن میں اونچے طبقے کے لوگوں کی زندگی کے بڑے پہلو پیش کیے جاتے ہیں، اور جنہیں دیکھ کر اوسط طبقہ کے عوام ایک خاص قسم کا سکون اور اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ ایسے لکھنے والوں میں مسٹر لونس ڈیل کوڈرڈ اور سومرسٹ مام کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تیسری قسم طربیہ ڈراموں کی ہے جو دوسری قسم کے ڈراموں کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ اپنی تقریر کے دوران میں مسٹر منن نے ترقی پسند گروہ کی ادبی خدمات کا خاص طور پر ذکر کیا، اور اس سلسلہ میں بتایا کہ اس گروہ نے روس کے ڈراموں سے متاثر ہو کر ۱۹۲۴ء سے نئے قسم کے ڈرامے لکھنے شروع کیے پچھلے دو تین برسوں میں انگلستان نے محسوس کیا کہ اسے کوئی بڑی لڑائی لڑنی پڑے گی، اور اس خیال کے ماتحت اس ترقی پسند گروہ نے تازہ سیاست کے اہم پہلوؤں کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنا لیا۔

اُردو میں ایک تو یونہی سرے سے ڈراموں کی کمی ہے، اور جو لکھے جاتے ہیں اُن میں اکثر زمانے کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی کشمکشوں کا آئینہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ ڈرامہ ہی ایک ایسی

صنف ہے جس کی مدد سے عوام کو ملک اور قوم کی سیاسی اور سماجی زندگی سے زیادہ سے زیادہ قریب لایا جا سکتا ہے۔ اس لئے ڈرامہ نگاروں کو انگریزی ڈرامے کی اس ترقی پسند روش سے سبق حاصل کرکے اُنہیں پُرانے راستوں سے ہٹا کر نئی راہوں پر لگانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۲) بنگالی ادب کا ایک سال :- ہیرندر ناتھ مکرجی نے ۱۴ اپریل کے "اسٹیٹسمین" میں "بنگالی ادب کا ایک سال" کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہوئے گذشتہ سال کی ادبی پیداوار کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ادبی نقطۂ نگاہ سے یہ سال کچھ اچھا نہیں رہا۔ حالانکہ افسانے اور شاعری کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، ٹیگور کی کئی چیزیں شائع ہوئیں جن میں سے ایک اُن کے خطوں کا مجموعہ ہے، اور دوسرا ایک ڈرامہ۔ اس کے علاوہ ٹیگور کے مضامین کے دو ضخیم مجموعے شائع ہوئے۔ خود ٹیگور کی زندگی اور اُن کے کام پر اس سال کئی کتابیں نکلیں۔ بنکم چندر چیٹرجی کے ادبی کارناموں کا ایک مجموعہ مفصل تنقید کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایشور چندر ودیا ساگر کے مضامین نثر کو مرتب کرکے شائع کیا جا رہا ہے۔

(۳) کناری کا نیا ادب :- کناری زبان کے نئے ادب پر پروفیسر کلکارنی نے ایک مقالہ لکھا ہے، اور اور اس میں اس زبان کے ادب کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کناری زبان کے مختصر افسانے ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے بیحد بلند ہیں۔ ناول اور تنقیدی ادب بھی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ بچوں کے ادب اور سائینس کی کتابوں کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے، لیکن ان دو حیثیتوں کے علاوہ کناری ادب اور کچھ زیادہ ترقی نہیں کر رہا ہے۔

(۴) ہندی کے موجودہ دور کے شاعر :- مارچ کے "پی، ای، این" میں موجودہ دور کے ہندی کے شاعروں کی ایک فہرست شائع ہوئی ہے۔ ہم اس جگہ اُسے ناظرین کی دلچسپی کے لئے شائع کرتے ہیں۔

(۱) بھارتیندو ہریش چندر (۱۸۵۰ - ۱۸۸۵) موجودہ طرز شاعری کا بانی، جس نے شاعری کے موضوع اور اس کی بحروں میں تنوع پیدا کیا اور شاعروں کو اٹھارویں صدی کی رسمیات

سے پاک کیا۔

(۲) ایودھیا سنگھ اپادھیا (۱۸۶۵ ـ)

(۳) مہابیر پرشاد دِویدی (۱۸۶۴ ـ ۱۹۳۸) ہندی شاعری کو سادہ اور نیچرل بنایا۔

(۴) میتھلی سرن گپتا (۱۸۸۶) انہیں بجا طور پر ہندی کا قومی شاعر کہا جا سکتا ہے۔

(۵) رام نریش ترپاٹھی (۱۸۸۹) بہت اچھے شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے نقّاد بھی ہیں۔

(۶) دیوگی ہری (۱۸۹۶ ـ)

(۷) ٹھاکر گوپال سرن سنگھ (۱۸۹۱ ـ)

(۸) جے شنکر پرشاد (۱۸۸۹ ـ ۱۹۳۸) موجودہ ہندی شاعری میں "مذہبی" رنگ پیدا کرنیکا بانی۔

(۹) سمترانندن پنت (۱۹۰۱ ـ)

(۱۰) سوریا کانت ترپاٹھی (نرالا ۱۸۹۸ ـ)

(۱۱) رام کمار ورما (۱۹۰۵ ـ)

(۱۲) بھگوتی چرن ورما (۱۹۰۳ ـ)

موجودہ دور کے نوجوان شاعر جن کی شاعری پر مذہب کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ (۹ تا ۱۲)

(۱۳) سیارام سرن گپتا (۱۸۹۵ ـ)

(۱۴) مہادیوی ورما (۱۹۰۷ ـ)

(۱۵) سبھدرا کماری چوہان (۱۹۰۴ ـ) انہوں نے بعض بہت اچھی قومی نظمیں لکھی ہیں ان میں "جھانسی کی رانی" بہت مشہور ہے۔

(۱۶) بال کرشنا شرما (۱۸۹۹ ـ) ان کی نظموں میں تغزّل اور قومیت کا عنصر غالب ہے۔

(۱۷) ماکھن لال چترویدی (۱۸۸۸) انہوں نے بھی بعض بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں۔

خبریں :-

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی نے حال ہی میں "بمبئی کرانیکل" میں ایک مضمون "گجرات میں ہندوستانی" کے عنوان سے لکھا ہے، اور اس میں یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ اُردو ادب کی ابتدائی تصانیف یا تو دکن میں ہوئیں یا گجرات میں۔ دکن اور گجرات کے ادب کے متعلق اب تک جو تحقیقات ہو چکی ہیں، یہ مضمون بعض حیثیتوں سے اُن پر ایک مفید اضافہ ہے۔

انگلستان میں جتنے ہندوستانی مُصنّف ہیں اُن کی تجویز ہے کہ انڈین رائیٹنگ (Indian writing) کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالا جائے جس میں ہندوستانی مُصنّفوں کے خاص خاص مضامین چھاپے جائیں۔ جن لوگوں نے یہ تجویز پیش کی ہے اُن میں ڈاکٹر ملک راج آنند، مسٹر اقبال سنگھ اور ڈاکٹر شتادھر سہنا کے نام خاص کر قابل ذکر ہیں۔ اس رسالہ کا دفتر ۱۶ لیٹل رسل اسٹریٹ لندن (ڈبلیو، سی، ون) ہوگا اور ہندوستانی خریداروں کے لئے اُس کا چندہ تین روپے سالانہ ہوگا۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا ادب میں جو مرتبہ ہے اُس کا اعتراف دنیا کے لوگ مختلف طریقے سے کر چکے ہیں۔ حال ہی میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ٹیگور کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دے تھوڑے ہی دن ہوئے میں ان کی ہشتادسالہ برسی منائی گئی ہے۔

اس سال کے شروع میں انگریزی شاعر ہمبرٹ اُلف کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال سے انگریزی ادب کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اس لئے کہ اُلف موجودہ دور کا بہت اچھا شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھا نقّاد بھی تھا۔ اُس کی شاعری اور تنقید میں طنز کا عنصر اُس کی امتیازی خصوصیت ہے۔

(و۔ ع)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اُردو کے ہندو ادیب

اُردو زبان ہندو مسلمانوں کے آپس کے میل ملاپ کی پیداوار ہے، اور اُردو ادب کے پروان چڑھانے میں ہندو مُسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سیاسی اور سماجی فضاؤں اور زمانہ کی بدلتی ہوئی حالتوں کی وجہ سے ایک قوم کو زبان کی زیادہ خدمت کرنیکا موقع ملا اور دوسری کو کم۔ لیکن تذکرہ نویسی نے ہندو شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ حق تلفی سے کام لیا ہے، اور ادب کی خدمت میں ہندوؤں نے جو حصّہ لیا ہے اُس کا ذکر اکثر اوقات کسی قدر کمی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی موجودہ سیاسی ضروریات کا تقاضا ہے کہ ہندو مسلمان اس بات کو محسوس کریں کہ اُن کی زندگی کی تمام اہم چیزیں، جن میں زبان اور ادب خاص طور پر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، آپس کے اتفاق و اتحاد کا نتیجہ ہیں۔ اِس لئے ہر قوم پرست اپنے اپنے دائرۂ عمل میں اُس باہمی افتراق کو دُور کرنے کی کوشش میں مصروف ہے جو حکومت کی پالیسی نے ضرورتاً ہندوستان کی دو قوموں کے درمیان پیدا کر دیا۔ ادبی حلقوں میں بھی یہ کام سرگرمی سے ہو رہا ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس میں اور زیادہ سرگرمی دکھائی جائے۔ جناب ناظر کاکوروی کی کتاب "اُردو کے ہندو ادیب" ان مُسلسل کوششوں کی ایک کڑی ہے۔ اسے انور بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

مُصنّف نے کتاب لکھنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے، اور اُس میں زبان اور ادب کے جھگڑے کے متعلق مختلف قسم کی بیحد معلومات جمع کی ہیں۔ لیکن جہاں تک کتاب کے اصل موضوع یعنی "اُردو کے ہندو ادیبوں" کا تعلق ہے کتاب تشنہ اور غیر مکمّل ہے۔ گو مُصنّف نے شروع

ہی میں کہہ دیا ہے کہ "اس رسالہ کا مقصد نقد و تبصرہ نہیں ہے محض رسماً روشناس کیا گیا ہے"
لیکن صرف کہہ دینے سے اُس کی ذمہ داری کم نہیں ہو جاتی۔ اس لئے کہ "رسماً روشناس کرانے" کے
لئے بھی ضروری ہے کہ کم از کم تمام خاص خاص شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کر دیا جاتا۔ پہلی ہی نظر میں بعض خاص خاص
شاعروں اور ادیبوں کے ناموں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جن میں برہمن سرشار، امر چند قیس جالندھری، نانک
لکھنوی، نوبت رائے نظر، کرشن چندر، ملک راج آنند کے نام خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر زبان و
ادب کی اتنی زیادہ خدمت کر رہے ہیں جتنی مصنّف کے منتخب کئے ہوئے اکثر شاعروں اور ادیبوں نے نہیں کی ہوگی۔

کتاب کی ترتیب ایسی ہے کہ اُسے دیکھ کر جی گھبراتا ہے۔ پوری کتاب میں ۲۵۶ صفحے ہیں۔
شروع میں ضیاء الحسن علوی صاحب اور پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق کے دو خط ہیں، جن میں
اُنہوں نے کتاب کو سراہا ہے۔ اُس کے بعد سر تیج بہادر کا وہ خطبہ نقل کیا گیا ہے جو موصوف
نے انجمن ترقی اُردو کے جلسہ کی صدارت کے موقع پر پڑھا تھا۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی صاحب
کا دیباچہ ہے۔ ان سب چیزوں کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے

مختصر سی تمہید کے بعد مصنّف نے اُردو کے مختلف تذکروں کی مثالیں پیش کر کے اس اعتراض
کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو عام طور پر ہمارے تذکرہ نگاروں پر یہ کہہ کر کیا جاتا ہے کہ انہوں
نے ہندوؤں کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ اس کے بعد اُردو کے قدیم اور جدید شاعروں کا بالکل مختصر
ذکر کر کے اُن میں سے ہر ایک کے کلام کی مختصر مثالیں پیش کی ہیں۔ لیکن ان میں بھی بعض اوقات توازن سے
کام نہیں لیا گیا، اور ایسے شاعروں کے کلام کی مثالیں کئی کئی صفحے میں لکھ دی ہیں۔ جن کا کلام عام طور پر
لوگوں تک پہنچ چکا ہے۔

تذکرہ نگاری ۱۳۳ صفحے پر ختم ہو جاتی ہے، اور اُس کے بعد مصنّف اشہب قلم کو مختلف
میدانوں میں دوڑانے لگتا ہے۔ سب سے پہلے تو اُردو ہندی کے پیچیدہ مسئلہ کے متعلق لکھنا شروع کیا ہے
اور اس سلسلہ میں مولانا عبد الحق، سر تیج، پنڈت وشوناتھ ورما، پیارے لال شاکر، پنڈت کشن پرشاد کول،
مسٹر فیلڈن، جواہر لال نہرو، سر سکندر کے خیالات اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا

سائمن کمیشن رپورٹ اور بعض دوسری رپورٹوں کے حوالے سے ہندوستانی زبان کی اہمیّت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اخباروں، رسالوں کی گنتی کر کے بتایا ہے کہ ملک میں مختلف زبانوں کے کتنے اخبار اور رسالے نکلتے ہیں۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ہندوستان کے باہر اُردو بولنے والے کتنے ہیں۔ ان سب باتوں کے بعد رسم الخط کا پیچیدہ مسئلہ چھیڑ دیا ہے، اور مختلف رپورٹوں، صدارتی تقریروں اور مختلف مُفکّرین کے اقتباسوں سے اس بات کے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اور آگے چل کر ہندوستان کے اُن قدیم اور جدید ہندو ہندو پردیسیوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اُردو کی ترقی و اشاعت میں نمایاں حصّہ لیا، اور ہر مطبع کے سلسلہ میں اُن تمام ہندو مسلمان اہلِ قلم حضرات کے نام گنوائے ہیں جنہوں نے اِن ہندو پردیسیوں کی سرپرستی میں اُردو کی خدمات انجام دیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ تمام مسائل بیحد اہم ہیں، اور زبان اور ادب کی تاریخ میں انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن ہر چیز کی ایک جگہ ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں اہم ہونے کے باوجود اس کتاب کے موضوع سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مُصنّف نے اِن تمام چیزوں کے جمع کرنے میں بڑی کاوش اور جانفشانی سے کام لیا، لیکن اگر اُنہیں کسی مُرتّب شکل میں پیش کیا جاتا تو بے حد مفید خدمت ہوتی۔ اس کتاب میں یہ چیزیں بھی اپنی جگہ پر کسی قدر مفید ثابت ہوسکتی تھیں، اگر کتاب کے شروع میں کوئی باقاعدہ فہرست ہوتی اور پڑھنے والوں کو کچھ اندازہ ہو سکتا کہ کتاب کے اندر کیا کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں چند مفید ضمیمے ہیں۔ پہلے ضمیمہ میں بہت سی ایسی اُردو کتابوں کی فہرست معہ اُن کے سنہ اشاعت کے درج ہے جن کے مصنّف ہندو تھے۔ دوسرے ضمیمہ میں یورپین مُصنّفوں کی اردو کتابوں کے نام درج ہیں۔ اس کے بعد شاعری کے مختلف دور کر کے ہر دَور کے شاعروں کے نام اس میں لکھے گئے ہیں۔ دوروں کی تقسیم بھی بہت دلچسپ اور انوکھی ہے۔ شہاب الدین غوری سے لیکر جارج ششم تک ہر بادشاہ کے عہد میں جتنے شاعر ہوئے ہیں اُن کے نام اس بادشاہ کے نام کے نیچے لکھ دیئے گئے ہیں۔ پھر دو صدی کی اُردو ادب کی خاص خاص تاریخیں لکھی گئی ہیں، اور اُن کے آگے اُس خاص سنہ کا مشہور ادبی واقعہ۔ اس کے بعد سرمایۂ مشترک، کے عنوان کے نیچے مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی

اور مولانا عبدالماجد کے خیالات زبان کے متعلق نقل کئے گئے ہیں، اور اس کے بعد ہی فوراً بغیر کسی عنوان کے کوئی چالیس صفحے میں تھوڑے سے اور شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاید ان کا نام بعد میں مصنف کے ذہن میں آیا۔ بالکل آخر میں ایک ضمیمہ ہے کئی مشاہیر ملک کے وہ پیغامات شامل کئے گئے ہیں جو انہوں نے انجمن ترقی اُردو کی اُردو کانفرنس کے موقع پر بھیجے تھے۔ اس کے بعد کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ مُرتب کی کاوش اور محنت لائق ستائش ضرور ہے، لیکن ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں وہ اپنے مواد کی ترتیب بہتر کریں گے۔ کتاب کی کتابت اور طباعت معمولی ہے۔ عہر میں انوار بک ڈپو لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔ (د۔ ع)

سہارا اور دوسرے افسانے :۔

یہ کتاب شفیق بانو صاحبہ مدیرہ "خاتون مشرق" کے کئی افسانوں کا دلکش مجموعہ ہے جو ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے سرورق لکھا ہوا ہے "سہارا اور دوسرے رومانی افسانے" اور اس میں شبہ بھی نہیں اس مجموعے کے سارے افسانے رومانی کیف سے پُر ہیں۔ اکثر افسانوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کے واقعات عموماً زندگی میں رُونما نہیں ہوتے۔ لیکن افسانہ نگار نے اپنے انداز بیان سے اُن میں رومان کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جہاں صداقت کی تلاش کی ضرورت باقی نہیں۔

افسانوں پر جذباتی عنصر غالب ہے، اور اسی چیز نے ان افسانوں کو دلچسپ بنا دیا ہے، لیکن لیکن کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جذبات کی رو میں بہنے کی عادت پڑ جانے کے بعد ادبی توازن اور دلکشی کو باقی نہیں رکھا جا سکا ہے

افسانوں کے طرز میں دلکشی ہے۔ زبان بھی سادہ اور لوچدار ہے، لفظوں کے استعمال میں ایک خاص قسم کی کیفیت ہے۔ خصوصاً اکثر افسانوں کے خاتمے محض لفظوں کے رومانی استعمال ہی کی وجہ دلچسپ ہو گئے ہیں۔ اُن کا پہلا افسانہ "سہارا" اس طرح ختم ہوتا ہے " ایک بے سہارے کو ایک بے سہارے کا " سہارا " مل گیا۔ اُن کے دوسرے افسانے " ملاپ " کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے " جوگی کی اُمیدوں کی صبح ہوئی لیکن تاریکیوں کے سایہ میں! پجاری کو دیوی ملی لیکن کب؟ جب کہ زندگی کی شام ہو چکی! محبت کا چاند طلوع ہوا لیکن کب؟ جب کہ حسرتوں کی گھٹاؤں میں اس کی روشنی کا عکس

بھی مدھم پڑ گیا! دنیا ختم ہو کر دنیا ملی ــــ زندگی ختم ہو کر زندگی کا مقصد ملا۔"

افسانوں کے پلاٹ اور زبان میں کہیں کہیں ناہمواری ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے افسانے دلچسپ ہیں۔

کتاب عہ میں شفیق بانو صاحبہ نجیب آباد کے پتے سے مل سکتی ہے۔ (و۔ع)

مجلس اشاعت دکنی مخطوطات

حال ہی میں حیدر آباد دکن میں نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں قدیم دکنی مخطوطات کی اشاعت کے سلسلہ میں ایک مجلس وجود میں آئی ہے۔ اس مجلس کا مقصد قدیم شاہانِ دکن کے ادبی آثار اور اُردو کی قدیم کتابوں کی اشاعت ہے۔

مولوی سید محمد اعظم صاحب اس کے صدر، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب نائب صدر اور مولوی سید محمد صاحب اس کے سکریٹری ہیں۔ فی الحال اس مجلس نے مندرجۂ ذیل پانچ کتابیں شائع کی ہیں۔

۱۔ کلام الملوک۔

۲۔ مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال۔

۳۔ مثنوی طوطی نامہ۔

۴۔ مثنوی پھول بن۔

۵۔ قصہ بے نظیر۔

نواب سالار جنگ بہادر کی اس علم دوستی پر ہم انہیں مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ درحقیقت اُردو قدیم مخطوطات کی حفاظت اور اشاعت ایسا کام ہے جو اردو داں پبلک ہمیشہ نظر احسان سے دیکھے گی اور جو اُردو کی تاریخ میں ایک نہ مٹنے والے سنگ راہ کا کام دے گا۔ موجودہ پانچ کتابوں کی اشاعت اور طباعت جس کاوش اور دریا دلی سے کی گئی ہے وہ اراکین مجلس اور نواب صاحب کے ذوق وشوق پر دال ہے۔ ہر کتاب کا کاغذ طباعت اور کتابت بہت اعلیٰ قسم کی ہے۔

جگہ جگہ متروک دکنی الفاظ کے معنی بھی دیدیئے ہیں۔ سرورق کا خاص اہتمام یہ کیا ہے کہ غالباً پُرانی کتابوں ہی کا قائم رکھا ہے تاکہ پُرانا پن محسوس ہوتا ہے۔ اب ہم ہر کتاب کا الگ الگ تبصرہ کرتے ہیں۔

کلام الملوک:۔

صفحات ۱۴۲، مرتبہ میر سعادت علی رضوی قیمت تین روپے۔ اس میں سلاطین دکن بہمنیہ و قطب شاہی دونوں خاندانوں کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ مرتب نے مختلف نسخوں اور مختلف کتابوں کی چھان بین کے بعد اسے ترتیب دیا ہے۔ اور جو دقتیں انہیں پیش آئی ہیں یا جو کمیاں اس میں رہ گئی ہیں اُن کو بھی ظاہر کر دیا ہے مثلاً قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کی ایسی معتبر تاریخیں موجود نہیں جن کو پیش نظر رکھ کر ان کے کلام کا تبصرہ کیا جا سکے۔ نیز کلام اس قدر مختصر دستیاب ہوا کہ اس پر مفصل تنقید کی گنجائش نہیں ہے۔ تاہم رضوی صاحب نے جو کچھ فراہم اور یکجا کر دیا ہے وہ اس کام کی طرف ذوق و شوق رکھنے والوں کے لئے اچھا آغاز ہے۔

ہر بادشاہ کا مختصر حال نیز ہر دو خاندان کا شجرہ نسب داخل کر دیا ہے اور تقریباً ہر بادشاہ کی تصویر آرٹ پیپر پر دیدی گئی ہے۔

قصہ بے نظیر:۔

۱۶۰ صفحات، مرتبہ عبد القادر سروری صاحب۔ قیمت ۱۲؍ یہ قصہ در اصل عام طور پر "قصہ تمیم انصاری" کے نام سے موسوم مشہور ہے۔ اس مثنوی کا مصنف صنعتی تھا جو بیجا پور کا رہنے والا اور عادل شاہی خاندان کے چھٹے حکمران عادل شاہ (۱۰۳۰ھ و ۱۰۶۵ھ) کا ہمعصر تھا۔ یعنی اس قصہ کی اُردو تین سو سال پہلے کی اُردو کا نمونہ ہے۔

صنعتی کے اپنے حالات ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ لیکن قصہ کی داخلی شہادتوں سے اس کے متعلق کسی قدر واقعات سامنے آتے ہیں۔ پوری مثنوی میں بارہ مقامات ہیں۔ ان کے علاوہ کئی تمہیدی ابواب ہیں۔ مثلاً حمد و نعت، منقبت شیخ عبد القادر جیلانیؒ وغیرہ۔ بارہ مقامات میں سند باد جہازی کی طرح ابو تمیم انصاری کے بارہ مہمات کا تذکرہ ہے۔ واقعات مافوق فطری اور مہاتی ہیں۔ شاعر نے اپنے تخیل کو داستان گو کی طرح آزاد چھوڑ دیا ہے، لیکن واقعات دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی پس منظر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ دجال، دابۃ الارض، خضر، دیو، پریاں، سلیمان علیہ السلام اس قسم کے تمام افراد سے مثنوی کا ہیرو ملتا ہے۔

ابو تمیم انصاری در اصل ایک صحابی تھے جن کے متعلق مافوق الفطرت قصے مشہور ہیں ان کو ہیرو بناکر اس قسم کی اور بھی کتابیں مختلف وقتوں میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً قصہ تمیم انصاری مصنفہ سید محی الدین قادری جعفری ابن سید شاہ شمس الدین قادری گنگوہی۔ یہ قصہ نثر میں ہے، یا قصہ تمیم انصاری مصنفہ غلام رسول، ساکن کھمبات، منظوم تصنیف ۱۲۱۸ھ۔ مگر صنعتی کی مثنوی ان سب میں بہتر ہے اور اپنے اندر ڈرامائی خوبیاں رکھتی ہے۔

یہ مثنوی مقبول کیوں نہیں ہوئی، اس کی وجہ فاضل مرتب صاحب یہ بتاتے ہیں کہ اول تو اس وقت بیجاپور کا دربار بہت بڑے بڑے شاعروں کے نغموں سے گونج رہا تھا، اس لئے صنعتی ان کے مقابلہ میں نہ آسکا، دوسرے یہ کہ اس کی مثنوی عرصہ تک نظروں سے اوجھل رہی۔ اس کا کوئی مخطوطہ یورپ کے کسی کتبخانہ میں نہیں ہے صرف ایک جامعۂ عثمانیہ میں ہے اور ایک انجمن ترقی اردو کے دفتر میں جو بہت ناقص نسخہ ہے۔ بہرحال مرتب نے اب اسے بڑی کاوش سے دیدہ زیب صورت میں پیش کر دیا ہے، امید ہے قدیم اردو کے شائقین اس کی ضرور قدر کریں گے۔

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال

۲۲۶ صفحات، مرتبہ میر سعادت علی رضوی صاحب قیمت عہ۔ یہ مثنوی مشہور قدیم شاعر غواصی نے ۱۰۳۵ھ میں لکھی۔ غواصی سلطان عبداللہ شاہ کے دربار میں ملک الشعراء کی حیثیت رکھتا تھا۔ قصہ دراصل الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ لیکن غواصی نے ایک فارسی نثر سے ترجمہ کیا ہے حالانکہ اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

شروع میں فاضل مرتب نے غواصی کے مختصر اور کمیاب حالات زندگی لکھے ہیں، پھر غواصی کی شاعری اور طرز بیان، قصہ کے ماخذ اور مختلف زیر نظر مخطوطات کا تذکرہ ۷۳ صفحات میں کیا ہے۔

غواصی کی روانی کلام خوب چیز ہے۔ قدردانِ سخن قدیم کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

مثنوی پھولبن:-

صفحات ۳۰۶، مرتبہ عبدالقادر سروری قیمت تین روپے۔ پھولبن، ابن نشاطی کی مشہور مثنوی ہے

جو عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں گیارہویں صدی ہجری میں تصنیف کی گئی۔ سلاست اور روانی اس کا خاص حصّہ ہے
شروع میں عبدالقادر صاحب کا لکھا ہوا ۱۱۹ صفحے کا مقدمہ ہے جس میں فاضل مرتب نے دکن میں
مثنوی کا ارتقا، مصنّف کے حالات اور اس کے کارنامے کی تفسیر و تنقید بہت خوبی سے کی ہے۔
عبداللہ شاہ اور ابن نشاطی کی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں۔ مثنوی میں پُرانے دکنی الفاظ کے معانی
بھی دیدیئے گئے ہیں۔ اُردو کے مثنوی کے طالب علم کے لئے یہ جلد ناگزیر ہے۔

مثنوی طوطی نامہ:۔

۴۳۴ صفحات، مرتبہ میر سعادت علی صاحب رضوی قیمت تین روپلے۔ یہ مثنوی بھی اُسی مشہور شاعر
غواصی کی لکھی ہوئی ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔
شروع میں ۴۱ صفحات کا ایک مقدمہ ہے۔ جس میں رضوی صاحب نے غواصی کے حالات زندگی،
اس کی شاعری، اس کی زبان و طرز بیان، خلاصہ قصہ و زیر نظر مخطوطوں کا ذکر کیا ہے۔ دیگر خوبیاں
مندرجۂ بالا دوسری جلدوں کی طرح ہیں۔
مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی یہ تمام کتابیں "سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدرآباد۔ دکن" سے مل سکتی ہیں

رسید کتب و رسائل

۱۔ آزادی کی نظمیں، مرتبہ سید سبط حسن صاحب، نیا ادب حضرت گنج لکھنؤ۔
۲۔ شعرائے عثمانیہ (جلد چہارم) ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد۔ دکن
۳۔ تاریخ گولکنڈہ 〃 〃 〃
۴۔ اُردو دانی کی کتابیں (پہلا حصہ) 〃 〃 〃
۵۔ اُردو مثنوی کا ارتقا 〃 〃 〃
۶۔ مسلمانان ہند کی حیات سیاسی کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی
۷۔ دوشیزۂ صحرا 〃 〃
۸۔ بغداد کا جوہری 〃 〃
۹۔ رسالہ ہمارا مستقبل لکھنؤ
۱۰۔ 〃 محرم کی تجلیاں سکندرآباد
۱۱۔ رسالہ جات قرانی دنیا و مومنہ حیدرآباد۔ دکن
۱۲۔ نظام ادب حیدرآباد۔ دکن

شذرات

گذشتہ مہینے کے مضمون "مسلمان کیا کریں" میں مضمون نگار صاحب نے آخر میں یہ سوال اُٹھایا تھا کہ بہتر یہ ہو اگر پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ مسلمان کا تمدّن کیا ہے، اس عنوان پر ہمیں ایک دوسرے صاحب کا مضمون دیر میں ملا، اس لئے افسوس ہے کہ اس ماہ وہ رسالہ میں شائع نہ کیا جا سکا۔ انشاء اللہ آیندہ مہینے میں شائع کیا جائیگا۔

ہندوستان میں مسلمان جس گو مگو کی حالت میں ہیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں اور اس حالت کی پیچیدگی کے باعث اور بہت سے پیچیدہ سوالات اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ پاکستان اسکیم نیشنلسٹ مسلمانوں کا نقطۂ خیال، ہندوؤں کے ساتھ تعاون یا عدم تعاون، اور دستور ساز اسمبلی و مسلمان وغیرہ کئی بنیادی مسئلے ایسے پیدا ہو گئے ہیں، جن کی اہمیت ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ بقا یا فنا کو دیکھتے ہوئے نہایت اہم ہے۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ رسالہ جامعہ میں آیندہ اس قسم کے مضامین خصوصیت سے جگہ پائیں، جو مسلمانوں کو اپنی قومی ہستی کی بقا کا صحیح راستہ بتائیں۔ چنانچہ رسالہ "جامعہ" کی طرف سے ہر صاحب فکر و تدبیر اور ہر ہمدرد قوم کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنے مفید مشوروں سے مُلک کو روشناس ہونے کا موقعہ دیں۔ مقصد ہنگامہ آرائی نہیں ہے بلکہ سر جوڑ کر اپنے سیاسی مسئلوں کو حل کرنا ہے۔ ہر صاحب اپنا اپنا نقطۂ خیال پیش کر سکتے ہیں۔ مضامین مدلّل ہوں، جذباتی یا محض صحافتی نہیں۔ ہم ان حضرات کے ممنون ہوں گے جو ہمارے اس ارادے کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

دوسرا ارادہ "اپنی اصلاح" کی ایک مستقل سرخی سے ایک نئے تعمیری عنوان کا کھولنا ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی ظاہر ہے، چند بنیادی خرابیوں اور غلط راہ روی کی وجہ سے ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ درد

عقل رکھنے والے حضرات جو مسلمانوں کو بہتر حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں اپنے مضامین کے ذریعہ بتلائیں کہ ہندی مسلمانوں میں کونسی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اور ان کا کیا علاج ہوسکتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی زبوں حالی، اپنی پستی اور کمزوری کو دور کرکے اقوامِ عالم میں سرخرو ہوسکتے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ محسوس کرسکتے ہیں۔ خرابیاں معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی سرخیوں کے تحت میں آسکتی ہیں۔ لیکن اس امر کا اظہار کردینا ضروری ہے کہ یہ عنوان تفریحی بحث و مباحثہ کے لئے نہیں کھولا جارہا ہے بلکہ تمامتر تعمیری مقاصد کے لئے۔ ہر شخص اپنی اپنی تشخیص اور اپنا اپنا علاج پیش کرسکتا ہے۔ اگر کسی کو کسی کے علاج یا تشخیص سے اختلاف ہو تو وہ اپنے دلائل و براہین، اپنی تشخیص و علاج پیش کرسکتا ہے، بشرطیکہ ذاتیات و جذبات سے متاثر نہ ہوا جائے۔

مکرر یہ عرض ہے کہ موجودہ حالات و موجودہ زمانہ کی رفتار دیکھتے ہوئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بھی زمانہ کو اپنے قابو میں لائیں، اور زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے اندر کی اُن خرابیوں کو دور کریں جو انہیں پیچھے ڈالے ہوئے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنی حالت نہ بدلی تو ظاہر ہے کہ خدا اُس قوم کی حالت نہیں سنوارتا جس میں خود اپنے سنوارنے کی فکر نہ ہو! اس لئے اپنی اصلاح کی جو اسکیمیں پیش کی جائیں وہ تمامتر سنوارنے کی ہوں محض گلچھپ نہیں۔ مسلمانوں میں آج کل بیداری کے آثار ظاہر ہورہے ہیں ظاہر ہے اگر ان کے اس جوش اس قوت کو تعمیری کاموں کی طرف مائل نہ کردیا گیا تو بیکار جائیگا۔ تعمیری کاموں کی طرف رجوع کرنے کی یہ ذمہ داری جامعہ ملیہ خود نہیں لے رہی ہے بلکہ ہر صاحب فکر و تدبیر کو دعوت ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے جو مفید اسکیمیں ذہن میں رکھتے ہوں انھیں پیش کریں یا ان پر بحث و مباحثہ کریں تاکہ مفید رائیں نکھر سکیں اور مسلمان ان پر عمل کرکے جوش عمل اور خود اعتباری کے جذبے سے معمور ہوسکیں۔

ترکی اور اس کے حلیف

(محترمہ خالدہ ادیب خانم)

مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ دنیا کے تمام سیدھے سادھے لوگ موجودہ نازک صورت حال کے متعلق ایک ہی انداز میں سوچتے ہیں، ہاں جغرافی پوزیشن اور قومی نقطہ نظر کی وجہ سے تھوڑا بہت اختلاف ہونا ضروری ہے۔ ذیل میں ایک ترکی ملاح اور ایک ترکی روشن خیال باخبر شخص کی ایک گفتگو نمونتہً دی جاتی ہے جو آبنائے باسفورس میں کشتی رانی کے دوران میں واقع ہوئی۔ اسی روز اخباروں میں برطانوی ترکی اتحاد پر دستخط ہونے کا اعلان ہوا تھا

ملاح نے کہا اخبار کہتے ہیں کہ انگریز اب ہمارے حلیف ہیں اور فرانسیسیوں کے متعلق بھی میں نے یہی خبر سنی ہے۔ یہ تو بالکل جنگ کریمیا کے سے آثار ہیں۔

"جنگ کریمیا کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟"

"میرا دادا اس میں لڑا تھا"

"کیا تمہیں اس معاہدہ سے اتفاق ہے؟"

"ہاں ہے"

"کیوں؟"

"کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ جنگ ہو اور بہت بڑی جنگ ہو، اگر ایسا ہوا تو ہم خطرہ میں ہوں گے اور پھر ہمیں ساتھیوں کی ضرورت ہو گی۔ ہماری حکومت نے اس معاملے میں عقلمندی سے کام لیا ہے"

"کیا تم بھول گئے کہ ان ملکوں نے جنگ عظیم کے بعد ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟"

"نہیں"۔ وہ اس کے لئے تیار نہ تھا کہ ایک وقت میں دو باتوں پر غور کرے۔ تھوڑی دیر

تک وہ خاموشی سے کشتی کھیتا رہا۔ پھر رکا اور اپنے ہاتھوں کو چپو پر ٹیک کر انا طولی مخصوص سنجیدگی کے ساتھ بولا "دیکھئے ہمارے دشمن معمولی نہیں۔ ہر جنگ میں کوئی نہ کوئی ہمارے ملک کو ہضم کرنا چاہتا ہے۔ انگریز اور فرانسیسی ان لوگوں میں نہیں ہیں جن کے دانت اس وقت ہمارے ملک پر ہیں بلکہ اب تو صورت یہ ہے کہ جو لوگ ترکی لینا چاہتے ہیں وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے بھی دشمن ہیں۔ اس لئے اس مرتبہ یہ لوگ ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔"

اس نے پھر کھینا شروع کر دیا۔" اپنے گھروں کی حفاظت کے لئے تو ہم ہر وقت موجود ہی ہیں۔" اس نے ایسے سیدھے سادے انداز میں کہا کہ شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

ملاح کا یہ آخری جملہ قابل غور ہے جب کبھی عوام اپنے آپ کو کسی خطرناک اور پیچیدہ صورت حالات کے روبرو پاتے ہیں تو وہ عام طور سے اسی طرح سوچتے ہیں۔ ترک عوام جس انداز سے اپنے ملک کی خارجی پالیسی کے متعلق سوچتے ہیں اس کے نفسیاتی مطالعہ میں یہ نکتہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ترک انگریزوں کی طرح واقعات کو جان پہچان کر سمجھ بوجھ کر ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ گذری ہوئی باتوں کو بھلا دیتے ہیں خاص طور سے جب گذری ہوئی باتوں کی یاد موجودہ حالات سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں حارج ہوتی ہو۔ یونان اور ترکی کی دوستی اسی بنیاد پر قائم ہے یہ ہماری عقل سلیم ہے جس نے یونانیوں سے ہماری دوستی کرائی۔ اور یہی ہماری حقیقت بینی ہے جس نے ہمیں یہ بات سمجھائی کہ یونان کو اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ اسے خود اپنے تحفظ کے لئے ہماری دوستی کی ضرورت ہے تو پھر وہ ہمارا کتنا قابل اعتبار دوست بن سکتا ہے۔

ہماری خارجی پالیسی کو عوام کی تائید حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ آج ترکی اور جمہوری اقوام ایک ہی خطرہ میں مبتلا ہیں اور پھر ان کی یاد سے جنگ کریمیا کا نقشہ ابھی محو نہیں ہوا ہے یہی سبب ہے کہ آج وہ اتحادیوں کی دوستی کو اپنے تحفظ کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دشمنوں کا پروپاگنڈا مرکز بڑی پابندی سے گمنام دستی اشتہاروں کے ذریعہ ہمیں بتلاتا رہتا ہے کہ ہمارے دوستوں کی نیت میں کھوٹ ہے۔ وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ انھوں نے جنگ عظیم میں ہمارے

ساتھ کیا گیا تھا، وہ ہمیں سمجھاتا ہے کہ اگر ہم اپنا محاذ بدل دیں تو ہمارے لئے کتنا بہتر ہو۔ لیکن
ان سب باتوں پر ہمارے عوام شک سے سر ہلاتے ہیں اور عصمت انونو کی خارجی پالیسی پر
اظہار پسندیدگی کرتے ہیں۔

ہماری خارجی پالیسی کے سلسلے میں عوام کی نفسیات کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔
میں اس کو بھی ایک گفتگو کے ذریعہ واضح کروں گی جو میرے اور ایک سیدھی سادی عورت
کے درمیان ہوئی۔ یہ عورت ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ جس کی تعلیم ساتویں آٹھویں درجہ تک
کی تھی، بال بچے والی، وہ گویا پرانے اور نئے دور کی ملانے والی ایک کڑی تھی۔ اس زمانے
میں اخباروں میں بڑے زور شور سے جمہوریتوں کے ساتھ ترکی کے اتحاد کی خبریں آ رہی تھیں
اور عام طور سے یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ہماری حکومت اس کا وعدہ کر چکی ہے۔ دستخط ہونے سے
چند روز پہلے یہ افواہ اڑگئی کہ ممکن ہے ہم اپنا محاذ بدل دیں اور انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔ جب آخرکار
میثاق پر دستخط ثبت ہو گئے تو اس عورت نے مجھ سے کہا "میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتی
پھر بھی مجھے اس افواہ سے فکر سی ہو گئی تھی۔ ہم کو دستخط کرنا ہی تھے۔ اگر ہم اس سے پھر جاتے تو یہ
اچھی بات نہ ہوتی ہم ہمیشہ اپنی بات کے پکے رہے ہیں چاہے وہ لکھی ہوئی ہو یا بے لکھی"

بین الاقوامی معاملات میں ترکی کی تمام تاریخی حسن معاملت اس عورت کے بیان میں
جھلک رہی ہے یہ ایک دستور ہے جو ہماری قوم میں پرانے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور جس نے
اس دور میں بھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑا جب کہ ہم تمام پرانی رسموں اور دستوروں کو چھوڑ رہے ہیں۔
دنیا میں ہمیشہ کچھ لوگ اس عقیدہ کے پابند رہے ہیں کہ کامیابی کا واحد ذریعہ اندرونی
اور بیرونی سیاست میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کو دھوکا دینے کی صلاحیت ہے۔ دنیا
میں کچھ لوگ اس عقیدہ کے بھی ہیں کہ آدمی کا رویہ ہر حال میں صحیح ہونا چاہئے اور اسے اپنے قول
کا سچا ہونا چاہئے۔ ہم لوگ اس دوسرے عقیدہ کے پابند ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل کے واقعات
بتلا دیں گے کہ انسانوں کے آپس کے تعلقات میں، خواہ وہ کسی نوعیت کے کیوں نہ ہوں حقیقت

شناسی اور عقل، حسن معاملت اور بلند اخلاق کے نقیض نہیں بلکہ فطری ساتھی ہیں

ترکی کی خارجی پالیسی کو عوام میں جو مقبولیت حاصل ہے اس کے نفسیاتی اسباب میں سب سے اہم امن کی خواہش ہے میں تھوڑی دیر میں بتلاؤں گی کہ کس لئے یہ جنگ آزمودہ قوم امن اور آشتی چاہتی ہے۔ بہرکیف یہ بات بالکل یقینی ہے کہ یہ لوگ امن کے خواہاں ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوامی امن حاصل کرنے کی کوئی تدبیر مل جائے۔ دنیا کی اس حالت میں جبکہ ہر قوم مسلح ہے اور کسی کو اس کا پتہ نہیں کہ اب کس کی باری ہے کہ بیٹھے بٹھائے ناگہانی حملہ کا شکار ہو جائے، دنیا میں کونسا طریقہ ہے کہ ترکی اپنے وجود کو قائم رکھ سکے؟ اس کا جواب بھی آسان ہے ان لوگوں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر جن کا مقصد اور جن کا مفاد حملہ کرنا نہیں بلکہ بچاؤ کرنا ہے۔ اگر ترک قوم کو لڑنا پڑا تو امن کے لئے اور ان تمام شائستہ قدروں کے لئے لڑے گی جنہیں دنیا کے لوگ مانتے ہیں ورنہ اسے غلام بننا پڑے گا اور یہ غلامی قرون وسطی کی غلامی سے بھی کہیں زیادہ ذلت آمیز ہو گی۔

اسی لئے جب جمہوریتوں نے ہمارے اتحاد کے خلاف پروپاگنڈا کرنے والے ترکی امن پرستی کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھتے ہوئے کہتے ہیں "تم اگر دوسرا راستہ اختیار کرتے تو جنگ سے بچ جاتے" تو ترک قوم کی عقل جواب دیتی ہے "چیکوسلوکیا کا کیا ہوا۔ چیک لوگوں نے سوڈیٹین علاقہ جو واقعی تمہارا تھا تمہارے حوالے کر دیا۔ پھر کیا ہوا؟ جب یہ پروپاگنڈا کرنے والے چپکے سے آکر ہمارے کان میں کہتے ہیں "اگر تم ہمارے ساتھ ہوتے تو ہم تم کو یہ دلاتے وہ دلاتے" تو ہماری حقیقت شناسی جواب دیتی ہے "ہم کچھ لینا نہیں چاہتے بلکہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اس کو بچانا اور قائم رکھنا چاہتے ہیں"

اب ان سیدھے سادے لوگوں کو چھوڑ کر ہم ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے اور جو میثاقوں اور معاہدوں پر دستخط کرتے ہیں، یعنی کہ ترکی حکومت۔ راقمہ سے جو کچھ حکومت کے ذمہ دار اشخاص نے کہا اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ہمارے بچوں کے علاوہ ہماری قوم کے ہر فرد کو جنگ عظیم یاد ہے اور وہ اس کی ہولناکیوں سے واقف ہے۔ جنگ عظیم میں ہم نے سخت چوٹ کھائی تھی لیکن ساتھ ہی اس دور کی کش مکش اور قربانیوں نے ہم میں ایک نئی جان ڈال دی، ایک نیا ایمان بخشا۔ اسی نے ہمیں وہ حوصلہ عطا کیا کہ سولہ سال کے قلیل عرصے میں ہم نے جنگ کے ویرانوں پر ایک نیا ملک بنا کر کھڑا کر دیا ہر ترک کو فخر ہے کہ اس نے اس تعمیر میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ یہ نسل امن کی خواہاں ہو۔ ترکی نے وہی راستہ اختیار کیا ہے جس پر گامزن ہو کر وہ اپنی قوم کا حق ادا کر سکتی ہے اور عام انسانی تہذیب کا بھی۔ کیونکہ وہ امن چاہتی ہے، نہ صرف اپنی قوم کے لئے بلکہ اپنے ساتھیوں اور پڑوسیوں کے لئے بھی۔ میثاق بلقان اور ترکی، افغانستان، ایران اور عراق کے درمیان میثاق سعد آباد اسی نصب العین کے خارجی مظاہر ہیں۔ پر وہ ملک جو دوسروں کے حقوق کا احترام کرتا ہے اور امن کو محبوب رکھتا ہے ترکی جمہوریہ کا قدرتی دوست ہے۔

اسی طرح ہر وہ حکومت جو اپنے اندھے پن میں ترکی کو کسی طرح دھمکائے یا اس کے امن کو خطرے میں ڈالے اسے متنبہ ہو جانا چاہئے کہ اگر ضرورت پڑی تو ہر ترک جسے اپنے وطن سے محبت ہے لڑے گا،

عمومی نفسیات اور ذمہ دار لوگوں کی رائے کی مندرجہ بالا ترجمانی کرنے اور یہ دکھانے کے بعد کہ یہ دونوں آپس میں متحد اور متفق ہیں، میں چاہتی ہوں کہ موجودہ نازک صورت حالات کو ایک اور زاویہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کروں اور یہ بیسویں صدی کا زاویہ ہے۔ کیوں کہ کم از کم میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ دنیا کے موجودہ مصائب دراصل نئے دور یعنی بیسویں صدی کی پیدائش اور افزائش کی تکلیفوں کی ہی ایک شدید کیفیت ہیں۔ بیسویں صدی کی اب عمر چالیس سال کی ہو چکی لیکن پھر بھی وہ اس صدمے سے پوری طرح نہیں سنبھلی ہے جو اسے چودہ سال کی عمر میں اٹھانا پڑا تھا۔

مادہ پرستی، خود پرستی، نسل پرستی، مجنونانہ امن پرستی۔ مجنونانہ موہام پرستی

(علے ...... (Hysterical Mysticism) اور پروائی و بے تعلقی، یہ سب چیزیں ایک خودرو جھاڑی کی شاخوں کی طرح ایک دم پھیل پڑی ہیں اور آپس میں الجھ گئی ہیں یہی الجھاؤ یورپ کی موجودہ تباہی کا ذمہ دار ہے

مادہ پرستی نے افراد اور اقوام دونوں کی زندگی میں غیر محدود "انانیت" پیدا کردی ہے "انا" نے اتنی جگہ گھیر لی ہے کہ دوسری قدروں کے لئے گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس کا لازمی نتیجہ چند ایسے آمروں کا برسر اقتدار آنا تھا جو اپنے آپ کو اپنی قوم کا دیوتا سمجھتے ہیں۔ ان کا حوصلہ ہے کہ ساری آباد دنیا پر اپنا سکہ جمائیں اس سے کم پر وہ راضی نہیں نسل پرستی اور خدا کی

علے۔ ......ticism جس طرح فرد کے دل میں بعض اوقات موہوم آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں جنھیں وہ خود بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتا لیکن جو اسے کسی خاص حرکت پر مجبور کرتی ہیں اسی طرح جماعت کے دل میں بھی موہوم آرزوئیں پیدا ہوا کرتی ہیں کہیں کہیں زیادہ شدت اور ہیجان کے ساتھ۔ اجتماعی نفسیات کے ماہرین جماعت یا گروہ کی بہت سی حرکتوں کو اسی کیفیت کا مظہر بتلاتے ہیں۔ اگر ان آرزوں کو تنظیم اور قیادت حاصل ہو جائے تو پھر یہ بڑی خطرناک ہو جاتی ہیں۔ مسولینی کا "رومتہ الکبری" کا دیوانہ خواب۔ ہٹلر کی "وسیع تر جرمنی"، اور جاپان کا "مشرقی مشن" یہ سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں فاشسٹ خود اپنی بنیاد عقل و شعور پر نہیں بلکہ ارادہ اور جذبہ پر رکھتی ہے۔ ہٹلر اور مسولینی اس فن سے خوب واقف ہیں کہ کس طرح لوگوں کے دل میں ایسی آرزوئیں بیدار کی جائیں، کس طرح ان کو ابھارا جائے اور پھر کس طرح ان کو ہیجانی عمل کا محرک بنایا جائے۔

بیسویں صدی میں بہت سی ایسی جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں جو اس طرح کے پریشان خواب دیکھا کرتی ہیں اور پھر تشدد اور دہشت انگیزی سے ان کی تعبیر حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ لوگ ان کی توجیہ موہوم پرستی کے ذریعہ کرتے ہیں۔ سوشلسٹ مفکرین اس توجیہ سے متفق نہیں وہ کہتے ہیں کہ ان کی پیدائش کی ذمہ دار اقتصادی بدنظمی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ ان کی پرورش کرتا ہے اور انھیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ وہ سامراج کو قوم کی دبی ہوئی آرزوں کا مظاہرہ نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ بتلاتے ہیں حقیقت شاید ان دونوں نظریوں کے درمیان میں ہے۔ (مترجم)

"منتخبہ قوم"[1] کے تخیل نے تمام ان لوگوں کو خطرہ میں مبتلا کر دیا جنھوں نے کسی اور قوم میں جنم لیا ہو۔ جمہوری ممالک میں ایک اور مرض مجنونانہ امن پرستی کا ظہور ہوا ہے شدید امن پرستی امن کی سخت ترین دشمن ہے۔ جو کوئی بھی امن چاہتا ہے لیکن قیام امن کے لئے "تمام تجھوں" کی قربانی، بلکہ خود زندگی کی قربانی دینے کے لئے تیار نہیں اسے کبھی امن چین نصیب نہیں ہوگا۔ مجنونانہ موہیام پرستی ان تمام جماعتوں کی گھر کی لونڈی ہے جو اپنے خلاف عقل مقاصد کو دھونس اور دھمکی سے منوانا چاہتے ہیں لیکن وہ چیز جس نے اس سب جھاڑ جھنکاڑ کو بڑھنے کا موقع دیا، لاپروائی کی عام ہوا ہے۔ بڑے بڑے عقلا جو خطرہ سے واقف تھے وہ برفی گرم شدہ کمروں میں آرام کرسی پر بیٹھے سورت حالات پر شاعرانہ انداز میں بحث کرتے رہے کسی نے خطرہ کے تعین اور فوری اقدام کی ضرورت پر توجہ نہ کی۔ جب کسی بیمار کا بدن مرض کی مدافعت نہ کر سکے اور اس کا دماغ اپریشن کی ضرورت محسوس کرنے سے اِبا کرنے لگے تو پھر اس کی ہلاکت یقینی ہے۔

۱۹۳۹ء میں مغربی تہذیب کی بالکل یہی حالت تھی۔ میں سوچتی تھی کہ بیسویں صدی انسانی تاریخ کا سب سے خوفناک باب اور انسانی دماغ کا بدترین خواب ہو کر رہے گی۔ شاید، میں سوچتی تھی یہ ہمیں ایک نئے تاریک دور کی طرف لے جائے گی جو پہلے تاریک دور (یورپ کے قرون وسطیٰ) سے زیادہ منظم زیادہ سلجھا ہوا (اور اس لئے زیادہ تباہ کن)، اور زیادہ دیرپا ہوگا کیونکہ بیسویں صدی کا ترقی یافتہ فن اس کی ترتیب میں شامل ہوگا۔ پھر اسی سال پیرس کے قیام کے آخری ایام میں فضا میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ خیالات میں ایک نئی اور غیر متوقع سنجیدگی ظاہر ہوئی۔

---

[1] یہ خیال غالباً سب سے پہلے یہودیوں میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی منتخبہ قوم سمجھتے تھے۔ آج وہ خدا کی راندۂ درگاہ قوم ہیں۔ ان کے بعد مسلمان قوم نے اپنے آپ کو امت مقبول سمجھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی دور میں وہ منتخبہ قوم تھے وہ جہاں بھی گئے اپنے ساتھ روشنی، زندگی اور انسانیت کا پیغام لے گئے وہ جاپان اور جرمنی کی طرح اپنے آپ کو خدائی فوج دار نہیں بلکہ خدائی خدمت گار تصور کرتے تھے۔ آج جاپانی اور جرمن اقوام اپنے آپ کو منتخبہ اقوام تصور کرتی ہیں۔ (مترجم)

رفتہ رفتہ دماغ جرّاح کے نشتر کے لئے آمادہ ہونے لگا۔ بقائے حیات کا ایک قوی جذبہ حرکت میں آیا۔ پھر کچھ امید ہوئی کہ شاید ہماری صدی تباہی سے بچ جائے۔

اب ۱۹۴۰ء میں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ مغربی تہذیب بچ سکتی ہے، میرا مطلب ہے کہ اسے پھر زندگی مل سکتی ہے کروروں مرد اور عورتیں اس یقین میں میری شریک میں تھکی ہاری دنیا کو سنجیدگی کے راستہ پر لگانے اور پھر اس کو امن کی منزل پر پہنچانے کی کوشش ان لوگوں نے ابھی شروع کی ہے۔ لیکن جب تک مقاصد میں وحدت باقی ہے، جب تک سخت سے سخت مصیبت کے لئے آمادہ رہنے کی کوشش جاری ہے، جب تک نتائج کا، خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہوں، مقابلہ کرنے کی ہمت ہے دنیا بجا طور پر امید کر سکتی ہے کہ بیسویں صدی انسانیت کو پیچھے نہیں ہٹائے گی بلکہ آگے بڑھائے گی۔

اب میں ترکی کے دائمی مقاصد بیان کرنے کی کوشش کروں گی۔ اس مضمون کا امریکی پڑھنے والا[1] کہہ سکتا ہے "تم نے اپنا مضمون غلط مقام سے شروع کیا اور پھر تم بیسویں صدی کی تمثیل میں آ بھٹکیں۔ اس طرح چکر میں پڑنے اور ڈالنے سے کیا فائدہ؟ اگر تمہیں ترکی کے مقاصد میں کوئی دائمی چیز نہیں ملتی تو اس کا اعتراف کر کے بات کو ختم کیوں نہیں کر دیتیں؟

ترکی مقاصد کی بحث میں عمومی نفسیات کو میں اس لئے سب سے پہلے لائی کہ اس کی اور سرکاری نقطہ نظر کی ہم آہنگی اس کو ایک خاص پائیداری بخشتی ہے۔ لغیر کسی تسلسل کے بیسویں صدی کی بحث میں اس لئے پڑ گئی کہ تمام مقاصد کسی نہ کسی طرح اپنی صدی سے متاثر ہوتے ہیں ترکی کے دوامی مقاصد کی بحث کو سب سے آخر کے لئے اس لئے چھوڑ رکھا تھا کہ پہلے ہمیں لفظ "دوامی" کے مفہوم کو واضح اور متعین کرنا ہے۔

کسی امریکی سے بھی ریاست ہائے متحدہ کے دوامی مقاصد کے متعلق سوال کیا جائے، ہمیشہ ایک ہی جواب ملے گا "جمہوریت کی حفاظت"۔ بیسویں صدی نے جمہوریت کو بہت سے

---

[1] یہ مضمون امریکہ کے جریدہ FOREIGN AFFAIRS کے لئے لکھا گیا تھا۔ (مترجم)

مختلف معنی بخشتے ہیں اس اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی امریکی جمہوریت کے دوام کو مانا جا سکتا ہے کیونکہ واقعات اور شخصیتوں کے اثر نے جمہوری عقائد کو کہیں کمزور کر دیا ہے اور کہیں قوی تر کر دیا ہے لیکن امریکہ بدستور جمہوری عقائد پر قائم ہے۔ اس کے علاوہ ایک کافی طویل عرصے تک امریکہ نے اپنی جمہوریت کی حفاظت کے لئے مردانہ وار قربانیاں کی ہیں۔ ان طویل قربانیوں نے امریکی جمہوریت کو دوام کی فضا اور عادت کا خاصہ بخش دیا ہے۔

میں اپنے ذاتی تجربہ اور تاریخی معلومات کی روشنی میں ترکی کے دوامی مقاصد کو جس طرح سمجھ سکی ہوں وہ اپنی کتاب "ترکی کا مغرب سے مقابلہ" میں قلم بند کر چکی ہوں ترکی انیسویں صدی کے شروع ہی سے مغرب کا مقابلہ کر رہا ہے۔ تقدیر نے اسے ایک مغربی ملک بننے پر مجبور کیا ہے۔ پرانے اور نئے نظام میں تقریباً ایک صدی تک کش مکش جاری رہی۔ ایک طرف سے جان توڑ مقابلہ اور دوسری طرف مردانہ وار قربانیاں ہوئیں۔ اب قدامت کا خاتمہ ہو چکا۔ آج ترک کا مقصد اور اس کا فرض قدامت سے لڑنا نہیں بلکہ نئے دور کی برائیوں اور اچھائیوں میں امتیاز کرنا ہے

ترکی میں مغربی تہذیب رائج کرنے کی سرگرم کوششیں ۱۸۲۶ء، ۱۸۳۹ء اور ۱۹۰۸ء میں ہوئیں۔ عبدالحمید کے عہد حکومت (۱۸۷۶ تا ۱۹۰۸) کو چھوڑتے ہوئے اس پورے دور میں ترکی باوجود دقتوں اور مخالفتوں کے بڑی جرأت کے ساتھ تغریب (Westernization) کے راستے پر چلتی رہی۔ معاہدہ لوزان کے بعد ایک نئے ترکی ـــ ترکی جمہوریہ نے جنم لیا۔ اتاترک اور عصمت انونو اس کے روح رواں اور راہ نما تھے۔ کچھ اس لئے کہ اس کی جڑیں ماضی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کچھ اس لئے کہ جن لوگوں نے اس کی تشکیل کی وہ غیر معمولی جرأت اور قوت کے مالک تھے یہ جمہورہ اب محفوظ اور مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے۔ اتاترک آج ہم میں نہیں۔ آج نئی ترکی کی باگ ڈور عصمت انونو کے ہاتھ میں ہے۔ اتاترک کا ایک مصلح اور حکمراں کی حیثیت سے کیا رتبہ تھا۔ اس کے متعلق میں اپنی کتاب مذکورہ بالا میں لکھ چکی ہوں یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ترکی ہمیشہ کے لئے مغربیت اختیار کر چکی ہے

ہر ملک کا داخلی ارتقار اس کی خاص اپنی تمدنی اور تاریخی قوتوں کے مطابق ہوتا ہے۔
جس طرح جمہوریت امریکی زندگی پر طاری ہے۔ اسی طرح مغربیت ہماری زندگی میں ساری
ہے۔ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ مغربیت کس نوع کی ہے ؟ ایک مغرب جمہوری حکومتوں کا
ہے۔ ایک آمری حکومتوں کا۔ ۱۹۴۰ء میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترکی نے جمہوری طرز اختیار کر لیا
ہے۔ اس لئے بڑی جمہوری حکومتوں کے ساتھ دفاع اور وسیع انسانی قدروں کے تحفظ کے
لئے ہم نے جو اتحاد کیا ہے وہ جلد ختم ہونے والا نہیں۔ اگر جنگ کل ہی ختم ہو جائے تب بھی قیام
امن، معاملات میں سنجیدگی کے احیا اور وسیع انسانی قدروں کے تحفظ جن کے واسطے ہم جان
دینے کو تیار تھے، ان کے لئے جمہوریتوں سے تعاون جاری رکھیں گے۔ پچھلے تجربے اور
ہماری تقدیر نے ہمیں جمہوریت تک پہنچا دیا ہے اور ان قوموں سے ہم رشتہ کر دیا ہے
جو اس پر عامل ہیں۔

ترکی کے موجودہ ارباب حل و عقد کو بھی اس بات کا پورا احساس ہے۔ یہ ہمارے
وزیر اعظم رفیق سیدم کی اُس تاریخی تقریر سے ظاہر ہے جو انھوں نے ۱۸ ر جنوری ۱۹۴۰ء کو کی تھی
انھوں نے کہا تھا "ہماری حکومت دستوری اصولوں پر مبنی ہے۔ ہم سب کی آزادی کا احترام کرتے
ہیں.......... ایسے نظام کا چلانا جس کے پیش نظر بغیر کسی روک ٹوک کے (غیر ذمہ دارانہ)
حکومت کرنا ہو بہت آسان ہوتا ہے۔ لیکن یہ نظام ہم کو قبول نہیں ہمارا مقصد مطلق العنانی سے
حکومت کرنا نہیں بلکہ محفوظ طریقوں سے ترقی و خوش حالی حاصل کرنا ہے ہماری رائے ہیں محفوظ ترین
راستہ وہی ہے جو ذمہ دار جمہوری حکومت کی طرف لے جاتا ہے"

رفیق سیدم کو سولہ سال کا حکومتی تجربہ ہے وہ اس نکتہ رس فہم کے مالک ہیں جو بخوبی سمجھ
سکتی ہے کہ کون کون چیزیں ترکی کی اندرونی ترقی کے لئے مفید ہیں ان کے ان الفاظ کو اس
سولہ سالہ تجربہ اور اس فہم کا نچوڑ سمجھنا چاہیئے۔ ترکی اب تغیر کے راستہ کا بہت کافی حصہ طے
کر چکی ہے۔ تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی اور دوسرے شعبہ جات زندگی میں اب تک جو کچھ اصلاحات

ہو چکی ہیں ان سب میں آخری طور سے ہم آہنگی اور تطابق پیدا کرنے کے لئے اب قوت عمل کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ دانائی، دور اندیشی اور صبر کی۔ یہ ہم آہنگی زیادہ سے زیادہ جمہوری اسپرٹ میں (جس کی اجازت ملکی حالات دیں) حاصل کرنا چاہیئے۔ عصمت انونو اور رفیق سیدم دونوں اس تجربے اور قابلیت کے مالک ہیں جو اس جیسے نازک کام کو سرانجام دینے کے لئے ضروری ہے کسی قوم کی خارجی پالیسی کے تعین میں اس کے قومی مفاد اور تمدنی و اخلاقی رجحانات دونوں شریک ہوتے ہیں اس زاویہ نظر سے بھی ترکوں کی بیرونی پالیسی ایسے مقاصد سامنے رکھتی ہے جنھیں ہم دوامی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں کسی تفصیلی جائزہ لینے کی گنجائش نہیں، لیکن پھر بھی ہم اس علاقے پر نظر ڈالتے چلیں تو بہتر ہے۔

بلقانی اقوام کے ساتھ اقتصادی اور دفاعی دونوں مقاصد کے لحاظ سے اتحاد ترکی کے امن کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اتحاد بلقانی اقوام کی حفاظت کے لئے بھی اہم ہے۔ ترکی جمہوریہ نے اس بات کو سمجھ لیا اور میثاق بلقان کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا۔ اگر بلقانی ملک آپس میں بھی خوب متحد رہیں اور ترکی کے ساتھ بھی تو وہ اپنی پوزیشن قائم رکھ سکتے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے شہنشاہی منصوبوں سے بچ سکتے ہیں اور امن و خوش حالی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ایک اور بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے :۔ اگر مستقبل قریب میں ان میں سے کوئی ملک متحدہ محاذ میں رخنہ ڈال کر جنگ کے سیلاب کو مشرق قریب میں لانے کا مرتکب ہوگا، تو وہ ترکی نہ ہوگا۔

اٹلی شاعرانہ انداز میں بحیرہ روم کو اپنا قومی بحیرہ بتلاتا ہے ترکی کے ساحلی شہروں پر جو اس نے منصوبے باندھ رکھے ہیں وہ اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک انگلینڈ اور فرانس کی شہ اور جرمنی اور روس کی امداد اُسے حاصل نہ ہو اور اب یہ چیز ناممکن ہے کہ انگلینڈ اور فرانس ترکی علاقہ پر اطالوی قبضہ ہوتے ہوئے دیکھیں اور مزاحمت نہ کریں۔ جب اٹلی سے ان کی دوستی تھی اس وقت بھی انھوں نے بحیرہ روم میں اٹلی کو بہت زیادہ طاقت حاصل کرنے سے روکا اور اطالوی اتنے بے وقوف نہیں کہ وہ اس بات کو نہ سمجھتے ہوں کہ جرمنی اس وقت چاہے ان سے

کتنے ہی وعدے وعید کرے وہ کبھی اٹلی کو اس علاقے میں قدم نہ جمانے دے گا جو خود اس کے LEBENSRAUM (وہ علاقہ جس کا حصول جرمنی اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ضروری سمجھتی ہے۔ لفظی معنی "رہنے کے لئے جگہ") میں شامل ہے ہم امید کرتے ہیں کہ اٹلی میں ذرا بھی سمجھ ہوگی تو وہ بلقانی منصوبوں سے باز رہے گا لیکن مطلق العنانی حکومتوں میں سمجھ کا مادہ ذرا کم ہوتا ہے وہ بڑی بڑی چیزوں کے لئے پانسہ پھینکتے ہیں اور بھاری بھاری بازیاں لگاتے ہیں اس لئے ترکی کو برے سے برے وقت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس نقطہ نظر سے بھی ترکی کو اب اور آئندہ بھی انگلینڈ اور فرانس سے تعاون کرنا ہوگا تاکہ وہ مشرق قریب میں امن قائم رکھ سکے۔

پچھلے بیس سالوں میں روس سے ہمارے تعلقات نہ صرف دوستانہ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ اچھے رہے ہیں۔ ہماری تاریخ کے ایک نازک دور میں نئے روس نے ہمارا ساتھ دیا۔ ہم ایک دوسرے کے وفادار دوست رہے ہیں۔ اس کے علاوہ نئی روسی حکومت کی پالیسی بہت صلح کن اور مستحسن تھی اس نے خارجی معاملات میں ایک نہایت عمدہ مثال قائم کی تھی۔ بدقسمتی سے یہ سب چیزیں نازی جرمنی سے اتحاد ہوتے ہی ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے: پولینڈ! فن لینڈ!! کیا سویٹ روس، زاری استبداد کی طرف بازگشت کر رہا ہے؟ ہمیں اس پر اعتبار کرتے ہوئے دقت بھی محسوس ہوتی ہے اور دکھ بھی۔ روس اور ترکی کے درمیان اچھے تعلقات ہونا دونوں کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر روس ترکی پر حملہ کر بیٹھے تو اس کو فنی مہم سے کہیں زیادہ مصیبتوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پونے دو کروڑ ترکی مرد عورتوں کو ایک ایک کر کے تہہ تیغ کرنا ہوگا۔ جرمنی جو آج روس کو ترکی پر چڑھائی کرنے کو اکسا رہا ہے۔ اس وقت موقع دیکھ کر خود روس پر ٹوٹ پڑے گا۔ یہ سب سمجھ کی باتیں ہیں اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں آمریت پرست اقوام عقل کے ذریعہ سے نہیں سوچتیں۔ ان کی قوت فیصلہ پر اور ہی چیزیں چھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس بلا کا اگر کچھ حفظ ما تقدم ہو سکتا ہے تو وہ انگلستان اور فرانس سے اتحاد ہو سکتا ہے۔

جنگ عظیم کے زمانے سے جرمنی سے ترکی کے تعلقات دوستانہ رہے ہیں۔ ہمارے اقتصادی

مفاد جرمنی سے وابستہ تھے کیوں کہ وہ ہماری درآمد اور برآمد میں برابر کا حصہ دار تھا۔ یہ چیز بجائے خود خوش گوار تعلقات کو استقلال بخشنے کے لئے کافی تھی لیکن بدقسمتی سے اس خطرہ کے سامنے ہوتے ہوئے ترکی کے لئے سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ وہ فرانس اور برطانیہ سے اتحاد کرے، کیوں کہ یہی دو طاقتیں ہیں جو مشرق قریب میں جرمنی اور روس کی سامراجی توسیع کو روک سکتی ہیں اور جو خود اپنے بچاؤ کے لئے ان کو روکنے پر مجبور ہوں گی

اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قسمت نے ہمیں اس اتحاد کا راستہ دکھلایا ہے اور تاریخی ضروریات اس کو دائمی بنا دیں گی۔

ترکی کی جنگ آزادی جیتنے کے بعد اتاترک کو خوش قسمتی سے بیرونی کش مکش سے نجات مل گئی۔ اور یہ موقعہ ملا کہ جنگ کے خطرات کی فکر سے یک سو ہو کر اندرونی تبدیلی و اصلاح پر پوری توجہ دے سکیں۔ عصمت انونو دنیا کی تاریخ کے ایک پر خطر وقت میں برسر اقتدار آئے ہیں بالکل سچائی کے ساتھ کہتی ہوں کہ ترکی کو اس آزمائش سے کامیابی کے ساتھ نکال لے جانے کے لئے کوئی عصمت انونو سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتا۔ ایک انسان کی حیثیت سے وہ سادہ ترک کی بہترین مثال ہے۔ وہ اس انسانی مواد کی تمام کمزوریوں اور خوبیوں سے واقف ہیں جن سے وہاں کی حکومت کی مشین بنی ہے۔ ان کی شخصیت نے قومی زندگی میں ایک اتحاد کی فضا پیدا کر دی ہے اور خارجی امور میں ان کے تجربے اور بلند اخلاقی خوبیوں نے ان کو بین الاقوامی محاذ امن پر ایک نمایاں پوزیشن کا مالک بنا دیا ہے۔

(ترجمہ ریاض الاسلام صاحب
بی۔ اے۔ علیگ)

ہندوستانی مسلمانوں کا تمدن و تہذیب کیا ہے؟

(از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن)

تہذیب کا لفظ ہمارے زمانے کی عجائبات میں سے ہے۔ ہر تعلیم یافتہ مہذب ہونے کا یقین رکھتا ہے۔ ہر قوم اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اپنی تہذیب کی قدر کرے اور دنیا سے اس کی قدر کرائے۔ لیکن تہذیب کے معنی پوچھیے تو ہر شخص اس کی ایسی تشریح کرتا ہے کہ جس سے اس کا اپنا مذاق، اپنے خیالات، اپنا رہن سہن، تہذیب کا لب لباب معلوم ہوتا ہے۔ اور قومیں اپنی تہذیب کے گن گاتی ہیں تو اس سے ان کا مطلب ہوتا ہے کہ ان کی طاقت بہت بڑھ گئی ہے، اور سیاست اور جنگ میں جتنی ان کو کامیابی ہوتی ہے اتنی ہی وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی تہذیب پھیلی۔ خالص علمی نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو تہذیب کا مفہوم یا تو اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کی تعریف ممکن نہیں، اور یا اتنا تنگ کہ اس کے وجود ہی کا یقین نہیں رہتا۔

اسلامی تہذیب کی تعریف کرنا اور بھی مشکل ہے کہ یہ کسی قوم اور کسی زمانے کی تہذیب نہیں اس کا پھیلاؤ ایسا رہا ہے اور اسے اتنی مختلف مزاج اور معاشرت رکھنے والی جماعتوں نے قبول کیا ہے کہ اس کی خصوصیات بیان کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا یہ بتانا کہ دنیا کی سطح کیسی ہے۔ اس کی ایک مجموعی شکل ہے بھی اور نہیں بھی ہے، اس کی جڑیں ہمیشہ حقیقت کی زمین کو مضبوط پکڑے رہی ہیں تو اس کی چوٹی ہمیشہ عالم خیال میں رہی ہے، اس نے پلٹے کھائے ہیں زور باندھا ہے، وہ ابھری بھی ہے اور گری بھی ہے اس نے کبھی مذہب کا دامن پکڑا تو کبھی سیاست کا۔ کبھی دوسروں کے اثر کو دھبے جان کر مٹایا۔ کبھی اسے شراب کی طرح پی گئی، کبھی انا و لا غیری کا دم مارا، کبھی شکر کی طرح گھل گئی فضا کی ایک کیفیت بن کر نظر سے اوجھل ہو گئی۔ دن کا اجالا اور رات کا سکون بن کر زندگی میں گم ہو گئی لیکن مسلمانوں کی تاریخ کا اتار چڑھاؤ ایسا رہا ہے کہ ہر زمانے کے لوگ مذہب اور تہذیب کے مفہوم پر غور کرتے رہے ہیں،

اس وقت اگر ہم بیٹھ کر سوچیں تو ہم بھی اسلامی تہذیب کا ایک خاکہ تیار کر سکتے ہیں اور ممکن ہے بناتے بناتے ہم ایسا کچھ بنالیں کہ جو چاہے زبان سے بیان نہ ہو سکے، دل میں گھر ضرور کرے گا۔

ایک بات کا خیال ہم کو خاص طور پر رکھنا ہوگا، اور وہ یہ کہ اسلامی تہذیب نے کبھی اپنے اور غیر کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کی۔ مسلمانوں کو کبھی نرالے اور انوکھے بننے کا شوق نہ ہوا اور ہماری تاریخ میں کوئی ایسا دور نہ ملے گا جب مسلمانوں کی زندگی ایسی عجیب یا غیر معمولی خصوصیتیں تھیں کہ جس پر فوراً نظر پڑتی اور آسانی سے بیان کردی جاتیں۔ اس کے برعکس ہماری تہذیب کا میلان ہمیشہ پھیلنے دوسری تہذیبوں سے اثر لینے اور ان پر اپنا اثر ڈالنے کی طرف تھا اور اس میلان کو ہم نے اس قدر صحیح اچھا اور اپنے وجود کے لئے ایسا لازمی سمجھا کہ ہم نے کبھی اس کا حساب لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ہم نے کتنا لیا اور کتنا دیا۔ ہم اس کا حساب لگانے کی کوشش بھی کرتے تو شاید کامیاب نہ ہوتے اس لئے کہ ہم نے اپنی تہذیب کی کہیں قلم بھی نہیں لگائی۔ بلکہ اس طرح ملے جیسے شکر اور پانی۔ یورپ والے اب صدیوں کی حجت کے بعد ماننے لگے ہیں کہ مسلمانوں نے دنیا کے علم کو بہت بڑھایا اور پھیلایا۔ لیکن یہ دعویٰ اب بھی شاید ہی کوئی تسلیم کرے کہ بول چال کی زبانوں کو ادبی زبانیں بنانا مسلمانوں کی ایک خاص خدمت تھی۔ ہماری تہذیب کا اثر روحانی ذہنی اور جسمانی تندرستی کی طرح تھا جو کہ خود محسوس نہیں ہوتی جس کی کیفیت بیان کیجئے تو خود ستائی معلوم ہوتی ہے اور جس کے موجود نہ ہونے یا ضائع ہوجانے کا غم بھی اکثر نہیں کیا جاتا۔ اس لئے کہ خود فریبی انسان کی گھٹی میں ملی ہوئی ہے۔

اسلامی تہذیب میں نمایاں ظاہری علامتیں خاص طور پر اس وجہ سے پیدا نہیں ہو سکیں کہ مذہب اسے ہمیشہ ہموار کرتا رہا۔ اسلام بجائے اس کے کہ تہذیب کی خلعت پہن کر الگ عزت کے مقام پر بیٹھ جائے۔ خود تہذیب کے مقام کو بدلتا اور اس کی حیثیت کو بدگمانی کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس طرح وہ کبھی تہذیب کے ہم معنی یعنی تہذیب میں گرفتار نہ ہوا۔ مسلمان کبھی اتنے مہذب نہ ہو سکے کہ اسلام ہی غافل ہو جائیں۔ ان کا دین ان کی دنیا کو جھنجھوڑتا رہا جیسے کوئی استاد ضدی کے مارے شاگرد کو۔ اس وقت بھی اگر آپ دیکھئے تو تہذیب ابھی انگریزی حکومت کا سہارا لے کر اور مغرب کی علمی ترقیوں

کی قسمیں کھا کر مذہب کو نیچا دکھانے کی کوشش کر چکی ہے اور کامیاب نہیں ہوئی ہے ہم دوسری قوموں کی طرح مذہب کو چھوڑ کر تہذیب کو پکڑ نہیں سکتے اس وجہ سے ہم دوسروں سے کم سمجھے جاتے ہیں اور ہماری ہنسی بھی اڑائی جاتی ہے لیکن تہذیب کے ناعاقبت اندیش فدائیوں کی ضد میں ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم صرف مذہب کو جانتے ہیں تہذیب کو نہیں جانتے۔ اس لئے کہ پھر ہمیں ہر موجودہ تہذیب سے قطع تعلق کر کے بالکل صحیح قرآنی تعلیم کی بنیاد پر ایک نئی اور سب سے الگ زندگی کی طرح ڈالنا ہوگی یہ ممکن تو بیشک ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ ہماری زندگی میں آگے چل کر ایسا کوئی انقلاب ہو جو موجودہ تہذیب کی عمارت کو ڈھا کر کوئی نئی عمارت اس کی جگہ کھڑی کرے لیکن ایسا انقلاب پیدا کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس لئے ہمارے واسطے یہی زیادہ مناسب ہے کہ ہم مذہب کو تہذیب سے الگ نہ سمجھیں، مذہب کو تہذیب کی روح اور عمل کا معیار جانیں اور اس کی آرزو دل میں رکھیں کہ یہ دونوں مل کر ایک ہو جائیں۔ اس لئے اگر میں اسلامی تہذیب کی خصوصیات بیان کرتے وقت عقیدوں کا ذکر جتنا کہ آپ کے خیال میں ہونا چاہئے نہ کروں تو اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ میں عقیدے کی اہمیت کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ یہاں بحث صرف تہذیب سے ہے مذہب سے نہیں، اور عقیدے مشترک ہیں، یعنی تہذیب میں قریب قریب اسی شکل میں پائے جاتے ہیں جیسے کہ مذہب میں انھیں میں نے تہذیب میں شامل سمجھا ہے۔

تہذیب کے مفہوم اور عالم اسلام کی وسعت اور رنگا رنگی کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی تہذیب کی چھ سات خصوصیتیں سب سے پہلے میرے خیال میں آتی ہیں۔ سب سے بڑا مرتبہ انسانیت کے اس تصور کا ہے جو اس تہذیب کی جان ہے، وہ تصور کہ جس نے انسانیت کے امتیازات کو نسل مذہب اور مقام کا پابند نہیں رکھا جس نے مسلمان کو آزادی دیدی کہ جس ملک کو چاہے اپنا وطن بنائے جو زبان چاہے بولے، ہر نسل اور مذہب کے آدمیوں کے لئے اس کی صورت نکالی کہ وہ مسلمانوں سے مل کر رہیں۔ مسلمانوں میں آپس کی عداوتیں تھیں، لیکن یا تو سیاسی تھیں یا مذہبی، تہذیبی نہیں تھیں اور انھوں نے کسی کو انسانیت سے محروم نہیں کیا۔ ہماری تہذیب کی اس خصوصیت

کی سب سے اچھی مثال وہ رویہ ہے جو ہم نے یہودیوں کے ساتھ اختیار کیا جنھیں کسی نسل اور کسی مذہب کے لوگ اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کرتے تھے، اور جن سے اب تک ایسی نفرت برتی جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ وہ یہودی جو مسلمانوں کے سایہ میں رہے طبیعت اور اخلاق کے لحاظ سے یورپ کے یہودیوں سے مختلف یا بہتر نہیں تھے لیکن انھیں ہمارے دین نے اہل کتاب کی حیثیت دے کر ہی رواداری کا مستحق بنایا اور ہماری تہذیب نے ان کو خدمت اور ترقی میں شریک ہونے کا پورا موقع دیا، یہودی تو خیر سامی نسل کے اور ایک خدا کو ماننے والے تھے، اسلامی تہذیب نے بت پرستوں کو بھی انسانیت کے کسی حق سے محروم نہیں کیا اور ان کی گمراہی کو انھیں حقیر یا ذلیل سمجھنے کا بہانہ نہیں بنایا۔

انسانیت کے بعد اسلامی تہذیب کی دوسری بڑی خصوصیت عقلیت ہے یعنی وہ جگہ جو اس کے معیار زندگی میں عقل سلیم کو دی گئی۔ جس طرح ہم ہر آدمی کی صورت رکھنے والے کو آدمی مانتے رہے ویسے ہی ہمارا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ انسان کو اپنی طبیعت اور اپنے عمل میں توازن قائم رکھنا چاہئے ایسا توازن کہ جو ایمان کو قائم اور مضبوط رکھے مگر انسان کو ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست نہ بننے دے جو شوق اور مہارت کی سچی اور پوری قدر کرے مگر ضبط دبے اعتدالی اور انتہا پسندی کو فوراً پہچان لے جو انسانی زندگی کو عقیدے اور عقل کا پابند رکھے مگر رسم اور عادت کا غلام نہ ہو جانے دے۔ تہذیب کی اس خصوصیت نے مسلمانوں کو جہاں تک کہ اخلاقاً صحیح ہے آزاد کر دیا، ان کی آمد ورفت اور میل جول پر کوئی قید نہیں لگائی، جب کبھی وہ رسم ورواج میں گرفتار اور عادت سے مجبور ہونے لگے تو ان کے سامنے رہائی کی ایک تدبیر پیش کر دی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کی طبیعت اور ذہن میں ایک لوچ پیدا کر دیا کہ جس کی بدولت وہ اپنی زندگی کو ماحول سے بہت جلد ہم آہنگ کر سکتے تھے، اسی عقلیت نے مسلمانوں کے دل میں تجربے اور احساسات کی اتنی وقعت رکھی کہ وہ منطق کے پھیر میں نہیں آئے اور اگر کبھی آئے بھی تو بہت جلد اس سے نکل بھی گئے اسی نے دینداری کو ریاضت سے روکا، دنیاداری کو بے لگامی سے اور نعمت کی قدر اور عذاب کے خوف کے دو رنگ ملا کر نہ جانے کیسی کیسی دلکش تصویریں بنائیں۔

مسلمانوں میں عقلیت پیدا نہ ہوتی نہ قائم رہتی اگر اسلام نے بہت بین طور پر میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم نہ
دی ہوتی لیکن اسلامی تہذیب کی تاریخ دیکھئے تو علم و عقیدے کے میدان میں عقلیت ان لوگوں نے نہیں
برتی جو کہ دینی علوم کے حامل تھے۔ بلکہ ان لوگوں نے جنھیں خاص علمی شوق تھا یا وہ جن پر سیاسی ذمہ داریاں
تھیں، اس کے برخلاف ہماری تہذیب کی تیسری خصوصیت مساوات ہرگز باقی نہ رہتی، اگر وہ ہمارے دین
میں شامل نہ ہوتی اور اسے برتے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا۔ مساوات کا عقیدہ ایسا ہے کہ جس
سے سیاست اور دولت دونوں ہمیشہ بیزار رہی ہیں اور انھوں نے اسے مٹانے کی ہر طرح کوشش کی مگر آخر کامیاب
نہ ہوئیں کہ مساوات کے خلاف کوئی نظیر یا سند قائم ہو جائے۔ اب بھی مساوات کا بھروسہ صرف مذہب پر
ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ مذہب کا حکم بہت صاف اور واضح ہے اور اسی کے ساتھ انسانیت کی قدر
بھی اسی طرح ہماری تہذیب میں شامل ہو گئی ہے کہ سیاست اور دولت چاہیں جیسا نشہ پلادیں، جذبہ
دینی کا ایک گھونٹ اس کا توڑ کر دیتا ہے، یا انسانیت کی قدر نشے کو آہستہ آہستہ اتار دیتی ہے۔

اسلام نے آدمیت کو معیار مانا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ملت اور جماعت کے احساس کو بھی لازمی
ٹھیرایا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک طرح کا تضاد ہے۔ لیکن اگر آپ یہ یاد رکھئے کہ انسانیت محض ایک تصور ہے
اور حقیقت میں انسانی آبادی جماعتوں پر مشتمل ہے اور ابھی تک زبان، خیالات، معاشرت اور ماحول میں ایسی
یکسانی پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے کہ جو دنیا کی تمام قومی حدبندیوں کو توڑ کر انسانوں کو ایک جماعت
بنادے، تو یہ سمجھ جانا کچھ دشوار نہیں کہ مسلمانوں کو ایک ملت بنے رہنے کی تاکید کیوں کی گئی۔ اسلامی تہذیب
کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ملت کے احساس کو خاص تقویت پہنچائی اور سیاست تو مساوات
کی طرح ملت کے تصور کو بھی ہمیشہ اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتی رہی لیکن سیاست کا کچھ بس نہ چلا، اور
تہذیب کو اس پر مطمئن ہونا پڑا کہ ملت اور انسانیت کے درمیان صلح قائم رکھے جو کہ بذات خود ایک
بڑی مشکل خدمت تھی اور بہت خوبی سے انجام دی گئی۔

اسلامی تہذیب کی جو خصوصیتیں میں نے اب تک بیان کی ہیں ان میں سے عقلیت مسلمانوں
میں کمیاب ہو گئی ہے اس لئے کہ مسلمان کئی سو برس سے اس کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اگر

وہ کسی حد تک موجود ہے تو صرف اس لئے کہ اسے اس کے دشمن اسلام سے خارج نہیں کر سکے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی دو اور خصوصیتیں ہیں جو اس وقت مسلمانوں میں نہیں ملتیں، بلکہ یورپ میں ہیں اور ان کا ذکر میں صرف اس سبب سے کر رہا ہوں کہ ایک زمانے میں اسلامی تہذیب کو رونق انھیں سے تھی اور ہم بھی چاہیں تو یورپ کی تقلید کئے بغیر اپنی تہذیب کے ان بجھے ہوئے چراغوں کو جلا کر اپنی محفل کو روشن کر سکتے ہیں اسلامی تہذیب کی ان خصوصیتوں میں سے پہلی یہ تھی کہ علم حاصل کرنا انسانیت کا فرض ٹھہرایا گیا اور اس کا یقین دلایا گیا تھا کہ علم کی بدولت ہر طرح کی ترقی ممکن ہے۔ انسان ترقی کرتا رہا ہے اور آئندہ ترقی کرتا رہے گا۔ یہ دعویٰ اس زمانے میں بڑا انقلاب انگیز تھا جب ساری دنیا میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کامل علم اور کامل معصومیت کی حالت سے آہستہ آہستہ گرتا رہا ہے اور عیبوں کی تاریکی میں گھرتا رہا ہے۔ اب یورپی قوموں کے علمی کرشموں کو دیکھتے ہوئے اس دعویٰ میں کوئی وزن نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی جماعت میں اب بھی وہ انقلاب انگیز ہو سکتا ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کے نزدیک اب سارا علم قرآن میں بند ہے اور قرآن کو وہ غلاف میں بند رکھتے ہیں۔

علم کے لئے جستجو، شک، تجربہ لازمی ہے اور جس زمانے میں علم کی مشعل اسلامی تہذیب کے ہاتھ میں تھی، اس نے علم کو ہر طرح کی آزادی دی اور علم کے شیدائیوں نے ایسی رواداری برتی اور ایسے صدمے بھی اٹھائے کہ جس کی مثال صرف یورپ کے دور جدید کی ابتدا میں ملتی ہے۔ یورپ میں اب علم اصولاً بالکل آزاد ہے۔ لیکن وہ سیاسی اور تہذیبی تعصبات سے خالی نہیں۔ اور اس نے دین سے ایسی سرد مہری اور عداوت برتی ہے کہ جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچا ہے اور خود علم کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ مسلمانوں میں دینی علوم کے نمائندے خالص علم کے نمائندوں سے جھگڑے اور ان سے اور کسی طرح بس نہ چلا تو مار پیٹ کر کے اپنی برتری تسلیم کرائی یہ سمجھئے انسانی کمزوری تھی ورنہ جن علماء کی پرورش اسلامی تہذیب کی گود میں ہوئی وہ خود سر اور انتشار انگیز نہ تھے، انھوں نے نہ عقیدے کی جڑ کاٹی نہ حق بات کہنے سے جھجکے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی اور دنیاوی علوم کی ہم آہنگی قائم رہی اور انسان کی صحیح نشو و نما اور ترقی کے لئے دونوں کی ضرورت تسلیم کی جاتی رہی۔

آخر میں آپ اجازت دیں تو اسلامی تہذیب کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کر دوں جس کا یقین کرنا اس زمانے کی فضا کو دیکھتے ہوئے بہت مشکل ہے، وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے بہت سی غیر تہذیبوں کی پرورش کی۔ صرف اس سیاسی مصلحت کے اشارے پر نہیں جو دنیا کو کاٹ کر مسلم اور غیر مسلم کے دو حصوں میں تقسیم کرنا اپنے لئے مفر سمجھتی تھی بلکہ تہذیبی باغبانی کے ایسے شوق میں کہ جس نے نفع نقصان کا حساب رکھنا اپنی توہین سمجھا اور صرف اپنے چمن کی رنگارنگی کو دیکھتا رہا یہی وجہ ہے کہ بعض محقق جنھیں اسلامی تہذیب کی خوبیاں تسلیم کرنا منظور نہیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کے فروغ کا وہ زمانہ مسلمانوں کے سوا اور ہر تہذیب کے فروغ کا زمانہ تھا۔ اسلامی تہذیب مختلف قومی اور مقامی تہذیبوں کا ایک مجموعی نام ہے۔

اسلامی تہذیب ان تمام خصوصیات کو جو میں نے بیان کی ہیں ساتھ لے کر ہندوستان آئی وہ ساتھ میں تلوار لے کر نہیں آئی جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ تجارت کا مال یا سیاحت کا شوق یا خدمت کے حوصلے لیکر آئی اس کا پہلا مرکز جنوبی ہندوستان کی بندرگاہیں تھیں جہاں سے وہ آہستہ آہستہ ملک کے اندر پھیلی شمالی ہندوستان میں وہ شمال مغرب کی تجارتی شاہراہ سے آئی۔ مگر پھر امیر محمود غزنوی کے حملوں کی گرد و غبار میں وہ اسی طرح غائب ہوگئی جیسے کہ خوشبو کسی آندھی میں لیکن امیر محمود کے ساتھ استاد البیرونی کا بھی ہندوستان میں آنا ہوا اور غالباً تہذیب کے کسی سچے قدردان کو یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ ان کی کتاب الہند تہذیب کی ایسی خدمت ہے جو سلطان محمود کی پیدا کی ہوئی عداوتوں کی تلافی کر سکتی ہے بہر حال عداوتیں اور لڑائیاں تاریخ ہی میں زندہ رہیں نسل انسانی انھیں بہت جلد بھول گئی اور ہندوستان کا قریب کے ملکوں سے تعلق بڑھتا ہی رہا۔ بارہویں صدی کے آخر میں جب محمد غوری کی فتوحات نے شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے لئے میدان صاف کر دیا تو شیخ معین الدین چشتی بھی ہندوستان تشریف لائے اور انھوں نے خدمت اور تبلیغ کا کام اسی شہر سے شروع کیا جو کہ سب سے ممتاز راجپوت سلطنت کا مرکز تھا اور جس پر قبضہ کرنے کے لئے ہندو مسلمان دونوں اپنا خون بہا چکے تھے

مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو ہندوستانیوں میں سیاسی حس بہت کم تھا مگر مذہبی حس بہت قوی تھا اور اسی وجہ سے ہم اسلام کا ردعمل سب سے پہلے ہندوستان کی مذہبی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ انھوں

اور نویں صدی میں شری شنکر آچاریہ کی اصلاحی تحریک نے مقدس کتابوں کو وہی رتبہ دیا جو کہ ہم قرآن کو دیتے ہیں یعنی ان کو الہامی مانا اور ان کی نسبت یہ دعویٰ کیا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اسی تحریک نے بدھ متیوں جینیوں، جوگیوں اور برہمنوں کی تعلیمات کو چھ درشن یعنی حقیقت سے روشناس ہونے کے چھ مختلف مگر برابر کی قدر رکھنے والے طریقے ٹھہرا کر عقائد کے اس انتشار کو دور کیا جو اب تک پایا جاتا تھا اور دینی تعلیم میں جو یک جہتی اس طرح سے پیدا کی گئی تھی اسے بدھ متیوں سے جاترا یعنی زیارت کا رواج اور جینیوں سے اہمسا کا عقیدہ لیکر اور مضبوط کیا۔ امیر محمود نے جب ہندوستان پر حملے کئے تو میدان جنگ میں ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا لیکن اسلام اور اسلامی تہذیب کی طاقت آزمانے کے لئے ہندو دھرم اور ہندو جاتی یعنی ملت موجود تھی اور بعد کو جو تحریکیں اٹھیں وہ انھیں کی کش مکش کا نتیجہ تھیں۔

میں یہاں پر ان اثرات پر تفصیل سے بحث نہیں کر سکتا جو اسلامی تہذیب نے ہندوستانیوں کی ذہنیت پر ڈالے لیکن یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ انسانیت اور مساوات کے جو پختہ عقیدے وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ انھوں نے ذات کے اس تصور کو جو یہاں ایک اٹل قانون بن گیا تھا فلسفے اور مذہب سے نکال باہر کیا اگرچہ رواج کو بدل نہ سکی۔ اسنے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اتحاد عمل کی صورت پیدا کی جنھیں دونوں کے مذہب نہیں تو مذہبی منطق گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بھگتی کے طریقوں کو، اپنشدوں کے فلسفے کو، ہندوستان کی موسیقی اور فنون لطیفہ کو ایسا سراہا صنعتوں کی اس طرح دل کھول کر سرپرستی کی اور ہندو معاشرت میں جو ضروری معلوم ہوا اس کو ایسی خوشی سے اختیار کیا کہ اسلامی تہذیب بہت جلد ہندوستانی تہذیب بن گئی۔ ہندوستان میں رواج کی اتنی قدر ہے کہ اسلامی تہذیب نے بہت کیا اگر معقولیت کے تصور کو قائم رکھا اور زندگی اور معاشرت میں نمایاں طور پر نہیں تو کم ازکم شاعری میں اسے ہر اور مسلک پر بھاری کر دیا۔ دنیاوی علوم کا نہ یہاں شوق پھیلا نہ انھیں کوئی ترقی دی جا سکی لیکن تعلیم کا ایک نصاب اور شائستگی کا ایک ایسا معیار عام کر دیا گیا کہ جس نے تہذیب کو زوال سے بچایا اور ہر علم فن اور ہنر کی قدر قائم رکھی۔

لیکن ہندوستان کی اسلامی تہذیب کے ماننے والوں میں سے تمام ہندو اور بہت سے مسلمان
اس کی شکایت کرتے رہے کہ اس تہذیب نے ہندوستان میں گھر تو بنا لیا ہے مگر مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز
مٹانے اور اسلام سے رشتہ توڑنے پر تیار نہیں، معمولاً پوری رواداری برتتی ہے مگر کبھی کبھی اسلام کو حقیقت
کا واحد مظہر کہہ کر ہر غیر فلسفے اور عقیدے سے منھ پھیر لیتی ہے۔ کبیر صاحب کے کلام میں یہ شکایت اکثر ملتی ہے
اور غالباً وہی اکیلے نہیں بلکہ اور جتنے غیر مسلم مصلح ہندوستان میں پیدا ہوئے وہ سب اپنے آپ کو مسلمان
کہتے اگر مسلمانوں نے انسانیت اور مساوات سے عقیدت رکھنے کے باوجود مومن اور مشرک کے فرق پر
زور نہ دیا ہوتا اور اگر وہ گوشت کھانا چھوڑ دیتے۔ اسلام مومن اور مشرک کے فرق کو نظرانداز کر کے پھیلایا جاتا تو یقیناً
اس کی کایا پلٹ ہو جاتی وہ یہاں کے مذہبی فرقوں میں سے ایک فرقہ بن جاتا، علم، معقولیت اور فطرت کا سکھایا
ہوا مذہب نہ رہتا بلکہ رسم و رواج اور قدامت پرستی پر بھروسا کرتا، مسلمانوں کے سامنے کوئی معیار نہ رہتا اور
ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہ ہوتی، اس میں نقصان صرف مسلمانوں کا نہ ہوتا بلکہ ہندوستان کا بھی ہوتا
اس لئے کہ انسانیت، عقلیت، مساوات ایسے تصور نہیں ہیں کہ ایک مرتبہ دل میں جم جائیں تو پھر وہاں سے
نکلنے کا نام نہ لیں۔ تنگ نظری، جہالت، اوہام پرستی، بزرگوں کی پوجا، دولت کی پوجا اصل میں تو یہ چیزیں ہیں
جو انسان کی طبیعت کو روگ کی طرح لگ جاتے ہیں یا گرد کی طرح دل کے آئینے پر جم جاتے ہیں اور بڑی
مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ ملت اسلامی کو غیر مسلموں سے الگ رکھنے، مومن اور مشرک کے فرق کو ضد کر کے
قائم رکھنے اور شرعی قانون کو برابر حکومت کے اختیار اور رسم و رواج کے اثر سے باہر اور بالاتر قرار دینے
کے باوجود بھی آپ دیکھئے تو ہماری معاشرت اسلامی قانون سے بہت منحرف ہو گئی ہے ہم نے عورتوں
کے سارے حق مار لئے ہیں، برادری اور ذات کو دیکھ کر شادی بیاہ کرتے ہیں، نوکروں کو اپنے ساتھ کھلاتے
نہیں اپنا سا پہناتے نہیں، اپنے برتنوں میں پانی نہیں پینے دیتے۔ اخلاق کو اور جو نقصان ہوا ہے
اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

انگریزی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہماری معاشرت ہندو معاشرت کے رنگ میں رنگ گئی تھی
لیکن قرآن کی تعلیم کا معیار موجود تھا۔ انگریزی حکومت اور اس سے بھی زیادہ انگریزی تعلیم نے ہم کو ایک ایسے

پھیر میں ڈال دیا ہے کہ جس سے نکل جائیں تو سمجھئے جان بچی آپ مانیں یا نہ مانیں، سچ تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی دو بڑی خصوصیتیں، عقلیت اور علم کی پیاس ہمیں ورثے میں نہیں ملیں بلکہ یورپی قوموں کو اور اسی ورثے کی بدولت انھوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب ساری دنیا ان کی ہو گئی ہے۔ اب یورپی تہذیب کے سب سے کارگر ہتھیار یہی ہیں اور ہم اسلامی تہذیب کو بچا نہیں سکتے جب تک کہ ہم اپنے اندر یہ دونوں صفتیں پھر سے پیدا نہ کریں۔ ہمارے دیس کے بھائیوں نے جنھوں نے اسلامی تہذیب کے بہت سے اثرات قبول نہیں کئے تھے اور جو اب اس سے انکار کرتے ہیں کہ ان کا ہندوستان کی مشترک تہذیب میں کوئی حصہ تھا، یورپی تہذیب کو اپنا کر بظاہر ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ان میں آزاد خیالی ہے جو موجودہ معیار کے لحاظ سے ہر مہذب آدمی میں ہونا چاہئے مگر مسلمانوں میں عام طور پر نہیں ہے وہ ملت اور ملت کے قانون کو چھوڑ کر جمہور بن گئے ہیں اور جمہوری طریقے پر معاشرتی قانون بناتے ہیں اور بناتے رہنا چاہتے ہیں، ہم نہ اپنے دین کو چھوڑتے ہیں نہ اپنے شرعی قانون کو نہ ملت کے خیال کو اور نہ اسلامی تہذیب کی محبت کو۔ اگر ہم نے یہ مسلک خالی ضد میں اختیار کیا ہوتا تو معاملہ بہت آسان ہوتا اور ہمارے لئے اس کی کوشش کرنا کہ تعلیم جلد پھیلے اور جہالت دور ہو کافی ہوتا۔ مشکل تو یہ ہے کہ دنیا میں اور ملک میں ہماری حیثیت کچھ بھی ہو، ہماری کوئی سنے یا نہ سنے بات ہمیں ٹھیک کہتے ہیں کہ تہذیب و معاشرت کو مذہب کا سہارا چاہئے علم کو راہ پر رکھنے کیلئے عقیدہ چاہئے، سیاست کو قابو میں رکھنے کے لئے ملت کا احساس۔ انسانیت کا معیار اور اخلاق اور مذہب کی فرماں روائی چاہئے، ہم عقلیت کے نام سے عقل کی پرستش نہیں کرنا چاہتے، بندے سے رشتہ جوڑنے کی خاطر خدا سے رشتہ توڑنا نہیں چاہئے، آدمی بننا چاہتے ہیں مگر ایسی تہذیب نہیں چاہتے کہ جس کا دیوتا نفس پرستی ہو۔ ہماری مشکل وہی ہے کہ جو ہمیشہ سے آدمیت کی مشکل رہی ہے۔

اسلامی تہذیب کا معیار میانہ روی اور اعتدال ہے۔ اس لئے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہئے اگر میں عرض کروں کہ اس وقت ہمارا فرض ہے کہ اپنے دل سے ضد اور غصہ بالکل نکال دیں اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کو سلامت رکھنے کے لئے ہم کو کیا ہونا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے۔

ظاہر ہے اسلامی تہذیب کی بقا کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہمیں اس کے صحیح اور اچھے ہونے کا

پورا یقین ہو۔ ہم دل سے مانتے ہوں کہ انسانیت، قوم اور نسل پرستی پر غالب آئے گی معقولیت اور اعتدال پسندی کا مسلک ایک نہ ایک دن ہمیں اوہام پرستی اور جہالت اور انتہا پسندی کی بھول بھلیوں کے باہر پہنچا دے گا۔ علم ایک طرف انسانی زندگی کو آسان کرتا اور دوسری طرف نجات کی راہ صاف دکھاتا رہے گا۔ لیکن یہ تو اسلامی تہذیب کا نصب العین ہے اسے بغیر سمجھے مان لینے اور زبانی عقیدت سے ہم حاصل نہیں کر سکتے ہم کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کن اجزا سے بنا ہے اور پھر انہیں کو اپنے عمل میں یکجا کر کے حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے اس لئے آپ اجازت دیں تو میں اس وقت کے چند عام رجحانات پر بحث کر کے اپنا مطلب صاف کر دوں

میں اسے بالکل صحیح اور بہت اچھا سمجھتا ہوں کہ مسلمان اس وقت اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ وہ ایک ملت اور تہذیبی جماعت ہیں، کیونکہ یہ ایک دینی اور تہذیبی آئین کو محفوظ رکھنے کے لیے لازمی ہے لیکن مجھے کسی طرف اسلامی ملت اور تہذیب کے تصور کو غیر مسلموں کیا مسلمانوں کے لئے مفید اور ان کی ترقی کا ذریعہ بنانے کی خواہش اور کوشش نظر نہیں آتی ملت کا احساس مجھے چند دنوں کا مہمان ہے اگر وہ ملت کے افراد میں سچی محبت، خدمت کا شوق اور خدمت کی استعداد پیدا نہ کرے بلکہ افراد کی خود غرضیوں کے لئے ایک آڑ یا ان کے نکمہ پن کے لئے بہانہ بنا رہے۔ انسانیت کے جس معیار کو ہم مانتے ہیں وہ تو یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنوں کی ہر ضرورت پوری کر کے دوسروں پر احسان کرنے کے مواقع نکالیں ہماری ملت کے افراد اپنا حق وصول کر کے اس قدر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فرض ادا کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ یہی سبب ہے کہ دوسری جماعتیں ہماری اجتماعی اغراض پر بھی ذاتی اغراض کا شبہ کرتی ہیں اور ہم اپنی ملت کا الگ وجود تسلیم کرانا چاہتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم جمہوریت کے آداب برتنے سے انکار کرتے ہیں۔

حقیقت میں ہم جس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں وہ نہ ہمیں کوئی دے سکتا ہے نہ ہم سے لے سکتا ہے ہم اگر خدمت کا وہ حق ادا کریں جسے ہمارے دین نے عبادت کا مرتبہ دیا ہے۔ علم حاصل کرنے اور پھیلانے کا فرض جیسا کہ چاہئے انجام دیں تو ہماری ملت خود بخود بنی رہے گی، اور اس کے خادموں

کے سامنے ہمارا دینی اور تہذیبی نصب العین بھی رہے گا جس کی قدر در اصل تجربہ اور انسانی طبیعت اور زندگی کی اونچ نیچ سے واقفیت پیدا کرتی ہے اس زمانے میں جب کہ جہالت اور اوہام پرستی ہم کو گھیرے ہوئے تھی اور ہمیں ڈر تھا کہ ہم اس میں گم ہو جائیں گے، ہمیں اور مشرک کے فرق کو نظروں کے سامنے رکھنا ضروری تھا اِس وقت جب کہ غیر مسلموں میں تعلیم پھیل رہی ہے وہ رسمیں توڑی جا رہی ہیں جنھوں نے زندگی کو جکڑ لیا تھا اور عقل کی اتنی قدر بڑھ گئی ہے کہ مذہب بھی کہیں کا نہ رہا ہے تو ہمارا اس پر اصرار کرنا کہ ہم سب سے الگ ہیں خود ہمارے آئین کے خلاف پڑ سکتا ہے ہماری تہذیب کی قابل قدر خصوصیات بڑی حد تک عام تہذیب میں شامل ہو گئی ہیں اب ہماری ملت صرف اس طرح ملت بنی رہ سکتی ہے۔ کہ وہ اپنے افراد کی زندگی و عمل میں وہ فضیلت ظاہر کرے جو اسے اسلام کی بدولت حاصل ہے۔

اسلام نے میانہ روی اور اعتدال کی جو تعلیم دی ہے وہ ہمارے لئے مصلحت اندیش ہونا لازمی کر دیتی ہے ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ اپنی بھلائی کی فکر کریں، ہمارے ذمے تو اسلام کی تبلیغ کر کے یعنی اس کی تعلیم کو ہر تعلیم سے زیادہ موثر اور مفید ثابت کر کے دنیا کو نجات کا راستہ دکھانا ہے۔ یہ مقصد بغض وحسد کینے اور ضد سے حاصل نہیں ہو سکتا، تنگ نظری، خود غرضی اور خوف آپ اپنے پیر پر کلہاڑی مارتا رہتا ہے، ہم میں نوع انسانی کے لئے ایسی سچی خیر خواہی ہونی چاہئے جو دھوکا کھائے اور باز نہ آئے، جو صدمے اٹھانے سے اور پختہ ہو۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ہمیں کم از کم اپنوں پر اعتبار ہونا چاہئے اور ہر شخص کو جو بظاہر خلوص کے ساتھ خدمت کا ارادہ رکھتا ہو سہارا دینا چاہئے۔ وہ جہاد جو اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی آخری تدبیر ہے اس وقت لڑ کر نہیں کیا جا سکتا، اس وقت کا صحیح جہاد تو ایسی مصلحت اندیشی ہے جو افراد کی استعداد کو ملت کی شیرازہ بندی کا ذریعہ بنائے اور قوم کی خدمت کو ملت کے الگ وجود کا سہارا۔ ظاہر ہے کہ اس میں خطرے بہت ہیں لیکن اسلامی تہذیب تو خطروں میں پلی ہے اور اس کا کیا علاج ہے کہ مشیت ایزدی نے قدر اسی چیز کی بڑھائی ہے جو مشکل سے ہاتھ آئے اور آسانی سے ضائع ہو جائے۔ اسلامی تہذیب کی بقا کا مصلحت اندیشی پر منحصر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں جب قدرت کو موتی جیسی دولت رکھنے کے لئے سیپ کے نازک سینے کے سوا کچھ نہ ملا۔

قدیم ہندوستان کا نظام تعلیم

میں نے اس مضمون میں سب سے زیادہ فائدہ مسٹر این۔ این۔ مزمدار کی کتاب "قدیم ہندوستان کی تاریخ تعلیم" سے اٹھایا ہے اور انھیں کے تجویز کردہ خاکے کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے

(ناشر)

جب آریہ قوم ہندوستان میں نئی نئی آباد ہوئی تھی اس وقت اس میں جسمانی اور ذہنی دونوں قسم کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ رشی منی جو ویدک دھرم کے مبلغ اور نگراں تھے اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ کے موقعوں پر نبرد آزمائی میں بھی اپنا امتیاز قائم رکھتے تھے لیکن جب آریوں نے اپنی مخالف قوتوں پر قابو پالیا اس وقت زمین کی زرخیزی اور آب و ہوا کا نرم پن ان پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس وقت جبکہ یورپ کی قومیں تنازع اللبقا کے اصول کے ماتحت زیادہ سے زیادہ قوی اور جسور بننے کی فکر میں مادی وسائل کی تلاش وتحقیق میں مصروف تھیں۔ آریہ قوم سرسبز کھیتوں میں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھ کر فلسفہ کی دیوی کے گیسو سنوار رہی تھی۔ یہی وجہ ہے اس فرق کی جو یورپ اور ہندوستان کے علوم وفنون، سائنس اور آرٹ میں آج تک پایا جاتا ہے۔ یورپ والے زندہ رہنے کے لئے مادی دنیا اور مادی زندگی پر زور دینے کے لئے مجبور تھے لیکن آریوں کے لئے بھگوان کا گیان ان کی زندگی کا سب سے بڑا اصول بن گیا۔

یورپ کی تاریخ کی طرح ہندوستان کی تاریخ بھی تین دوروں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ دور قدیم (تقریباً ۲۰۰۰ ق۔م سے ۷۰۰ صدی عیسوی تک) دور وسطیٰ ہرش کی سلطنت کے زوال کے وقت سے انگریزوں کے تسلط کے قیام تک۔ اور دور جدید برطانوی تسلط کے بعد سے آج کی تاریخ تک۔

دور قدیم کا پہلا حصہ۔ (۲۰۰۰ ق۔م سے ۲۰۰ ق۔م تک) ادبی نشو ونما کے لئے ممتاز تھا۔ اس زمانے میں خالص مذہبی ادب پیدا کیا گیا۔ مترنم قسم کی نظمیں افراط کے ساتھ لکھی گئیں اور فلسفے

میں بے مثل ترقی ہوئی۔ چنانچہ ویدک گیت اور اپنشد اور سوترا سب اسی دور کی ملک ہیں۔ اپنشد اپنے زمانے کی ذہنی اپج کا بہترین نمونہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس شاہکار کے بعض خیالات سے افلاطون اور کانٹ نے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ شوپنہار نے ان سے جو اثر لیا ہے وہ ظاہر ہے۔ شوپنہار نے خود شہادت دی ہے:۔

"دنیا میں کوئی مطالعہ اس قدر نفع بخش اور نظر افروز نہیں ہے جس قدر اپنشدوں کا مطالعہ میرے لئے زندگی میں یہ سکون کا سرچشمہ تھے اور موت میں بھی راحت اثر ثابت ہوں گے"

تیسری صدی ق۔م نے بدھ مذہب کا عروج اور سنسکرت کے مقابلے میں پراکرت کا نشو نما دیکھا۔ علوم و فنون نے اس دور میں بہت ترقی کی۔ ٹکسلا کے دار العلوم میں سولہ مضمون داخل نصاب تھے۔ جن میں سے خاص خاص علم الادویہ، سنگ تراشی، مصوری اور دوسری دستکاریاں تھیں۔ اوجین علم نجوم کے لئے ممتاز تھا یہی نہیں بلکہ جانوروں کے امراض کے متعلق بھی کافی کاوشش کی جاتی تھی۔ اشوک کے زمانے میں ملک کے مختلف حصوں میں مویشی خانے موجود تھے۔

دور قدیم کا دوسرا حصہ:۔ علم و ادب سائنس اور فلسفہ میں گوناگوں ترقیوں کے لئے یادگار رہے۔ ادب میں دین کے ساتھ ساتھ دنیا کو بھی جگہ ملی۔ چنانچہ جذباتی شاعری، ڈرامہ، افسانہ اور رومان سب ہی کچھ اس دور میں پھلا پھولا۔ اور ان سب کو کمال تک پہونچانے کے لئے کالیداس پیدا ہوا۔ آریہ بھٹ (پیدائش ۴۷۶ء) نے ریاضی اور فلکیات کو ترقی دی اور وراہم میر (متوفی ۵۸۷ء) نے فن تعمیر، سنگ تراشی اور مصوری کو فروغ دیا۔ گپتا خاندان کے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ہرش نے علوم و فنون کے چراغ کو پوری آب و تاب کے ساتھ روشن رکھا۔ ہرش ہی کے زمانے میں بہار میں نالندہ کا دار العلوم قائم ہوا تھا چینی سیاح ہوان سانگ کے قول کے مطابق دس ہزار طالب علم یہاں رہ کر مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے نصاب میں قواعد، عروض، منطق، ریاضی، اقلیدس، نجوم، موسیقی، طب، فلسفہ، سنسکرت اور پالی شامل تھے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر ڈاکٹر میکڈانل نے شہادت دی ہے کہ ہندوستانی تعلیم کے میدان میں یونانیوں سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اس عہد میں بکرماجیت اور اس کے نورتن بھی تھے

اور یہی وہ عہد ہے جسے ہم پیریکلیز کے ایتھنز آگسٹس کے روم اور الزبتھ کے انگلستان کے مقابلے میں لاسکتے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور نہ صرف علوم وفنون کی ترقی کے لئے ممتاز ہے بلکہ سماجی پاکیزگی کے لئے بھی اسی قدر اعلیٰ وافضل تصور کیا جاتا ہے۔ اس دور میں قوم وقومیت کے جذبات زندہ تھے۔ اور ہند وتہذیب ان لایعنی پابندیوں سے یکسر پاک وصاف تھی جو آج اسے مملو کئے ہوئے ہیں۔ علم ہنوز برہمنوں کی اجارہ داری سے آزاد تھا اور اسی طرح کسی پیشے کے ساتھ حقارت کا سلوک روا نہ تھا۔ عورتوں کو شادی کے معاملے میں آزادی تھی۔ کم عمری کی شادی کا بالکل رواج نہ تھا۔ عورت سماج اور سماجی مشاغل سے یکسر بے خبر وبے نیاز نہیں تھی بلکہ اپنے زمانے کے علمی مشاغل اور ذہنی تحقیق وکاوش میں برابر کی حصہ دار تھی۔ گوتم بدھ نے ایک مرتبہ ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ظاہر کی تھی جو "لکھ سکتی ہو اور شعر کہہ سکتی ہو۔ ایسی خصوصیات کی مالک ہو اور جو شاستروں کی تعلیم سے کما حقہ واقف ہو" یہ دور بت پرستی کی رسم سے بھی بیگانہ نہ تھا۔ بت پرستی کی رسم بعد کی تخلیق ہے اور اس کی تخلیق اس بات کا ثبوت ہے کہ مذہبی تعلیم بھی مادی سے غیر مادی یا شے کی طرف اشارہ کے اصول پہ دی جاتی تھی۔

عہد وسطیٰ ذات پات کی بندھن، بتوں کی پوجا، کم عمری کی شادی، سماج سے عورتوں کی علیحدگی اور ان کے تعلیمی حقوق کی پامالی کے لئے مخصوص ہے۔ اس دور کے بھی سہولت کے لئے دو حصے کر لینے چاہئیں اول نصف ۶۴۷ء سے ۱۲۰۰ء تک اور دوسرا ۱۲۰۰ء سے ۱۷۶۴ء تک

ہرش کی حکومت کے بعد گو ملک میں بدنظمی پھیل چکی تھی تاہم تعلیمی نظام اپنی جگہ قائم رہا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں قنوج علم کا مرکز تھا۔ نویں صدی میں بنارس کی تعلیمی حیثیت بھی قائم ہو چکی تھی شنکر آچاریہ بنارس ہی کے پروردہ تھے۔ پشاور اس دور کا تیسرا تعلیمی مرکز تھا۔ بہار میں نالندہ کے علاوہ گنگا کے کنارے وکرما سلا کی خانقاہ بارہویں صدی تک بدھ مذہب کی خاص تعلیم گاہ تھی۔ بنگال میں سین حکمرانوں کے زیر سایہ نودیپ میں ہندو تعلیم کا چراغ روشن رہا۔ لکشمن سین۔ بنگال کے آخری حکمراں کے دربار میں جے دیو نے اپنی مشہور ومعروف گیتا گوبند تصنیف کی۔ گو اس دور کا علم وادب کالیداس کے معیار کو تو

نہیں پہونچ سکا تاہم یہ زمانہ ان تفسیروں کے لئے ضرور یاد رہے گا جو مختلف ویدوں اور بھگوت گیتا پر شائع ہوئیں۔ الجبرا اور نجوم پر بھسکارا (پیدائش ۱۱۱۴ء) کی متعدد تصانیف بھی اس زمانہ کی یادگار ہیں۔

عہد متوسط کے دوسرے نصف حصے میں (۱۲۰۰ء سے ۱۸۰۰ء) مدرسوں اور خانقاہوں کے ساتھ سنسکرت کا بھی زوال ہوا لیکن ہندی نے اسی قدر فروغ پایا۔ ودیاپتی اور چنڈی داس اور میرا بائی کے شاہکار اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ اس دور میں ادب کے مقابلے میں فن تعمیر اور سنگتراشی کا معیار بہت بڑھا چڑھا تھا۔ آٹھویں صدی سے چودہویں صدی تک ہندوستانی آرٹ اپنے شباب پر تھا۔ اور یورپ کے گوتھک آرٹ کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ یہی آرٹ مغل آرٹ سے مل جل کر سترہویں صدی تک نئے رنگ روپ میں زندہ رہا۔

مذہب میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ بدھ مذہب کے رہے سہے اثرات بھی ختم ہوگئے۔ اور ان کی جگہ موجودہ ہندو مذہب نے لے لی۔ اس زمانے میں ذات کی بندشیں سخت سے سخت تر ہوگئیں اور برہمنوں کو عام طبقے کے لوگوں سے بلند و بالا سمجھا جانے لگا۔ یہاں اگر ہندو تہذیب کو اور زیادہ ترقی کا موقعہ نہ ملا اس لئے تعلیم بھی اپنی جگہ ٹھٹھر گئی اور اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ رہا کہ اپنے طلبہ کو گذرا ہوا زمانہ یاد دلاتی رہے اکثر مورخین نے مسلمان حکمرانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے لیکن یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ مسلمانوں نے دنیا کی ہر دوسری قوم کی طرح ملک گیری اور جنگ و جدل کے وقت وہ سب کیا جس پر واقعات کی منطق انھیں مجبور کر سکتی تھی حقیقت کا یہ ایک پہلو پھر بھی تی رہتا ہے کہ تسلط قائم ہو جانے کے بعد انھوں نے امن وامان اور مدنی زندگی کی ہر ضرورت پورا کرنے کے لئے ہر ممکن موقع دیا۔

انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہو جانے کے بعد سے ہمارا موجودہ دور شروع ہوتا ہے شروع شروع میں اونچے خاندان کے بچوں کو پنڈت پڑھایا کرتے تھے۔ درس و تدریس میں ہنوز ایک راہبی تعلق موجود تھا۔ نیچ قوموں کے بچوں کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ ان کے لئے کہیں کہیں گاؤں میں مدرسے موجود تھے۔ بنارس کی اہمیت ہنوز باقی تھی۔ چنانچہ بنارس کے ریزیڈنٹ

سے ایا سے ۱۷۹۲ء میں سنسکرت کالج کھلا ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ میں ایک دفعہ ایسی شامل کردی گئی جس کے ماتحت گورنر جنرل کو کم از کم ایک لاکھ روپیہ تعلیم پر خرچ کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ کچھ عرصے تک یہ رقم مروجہ تعلیم پر وظائف کی شکل میں صرف ہوتی رہی اسی اثنا میں انگریزی دانی ذریعہ معاش بن گئی۔ لیکن یہاں ہندوستانی طریقۂ تعلیم اور مغربی طریقہ تعلیم کے درمیان تنازع تفوق پیدا ہو گیا ۱۸۳۳ء میں لارڈ میکالے کی زیر نگرانی ایک کمیٹی مقرر ہوئی ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بینٹنک نے اپنا فیصلہ شائع کرکے اس تنازع کو انگریزی کے حق میں ختم کر دیا۔ اس فیصلے نے ہندوستان کی تعلیم تمدن، معاشرت اور قومی زندگی پر جو اثر کیا وہ سامنے کی بات ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا مرتب کردہ بنیادی قومی تعلیم کا پروگرام اس زہر کے خلاف جو قریب سو سال سے ہماری رگوں میں موت کے اثرات تیز کر رہا تھا ایک تریاق ہے۔ لیکن کاش ہم متحد ہو کر اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے:

ذاتوں کا قایم ہونا اور تعلیم پر ان کا اثر:۔ جب تک آریہ قوم ستلج سے آگے نہیں بڑھی تھی ان کے یہاں رشی منی کسی الگ ذات سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ تاہم بعض خاندان اس ابتدائی دور میں بھی مذہبی رسوم کو خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے میں اور مذہبی گیت لکھنے میں دوسروں سے زیادہ مشہور و ممتاز ہو چکے تھے۔ اسی طرح بعض خاندان مردانہ ہمت و قوت کے لئے مخصوص سمجھے جانے لگے تھے۔ کچھ زمانے کے بعد جب آریہ قوم ستلج سے آگے بڑھ کر گنگا جمنا کے دامن میں پھیلی تو اس کے سماج اور مذہب میں جو ان کے تمدن کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ اس قدر تغیر و تبدل اور الجھاؤ پیدا ہو گیا کہ بعض رشیوں کو دوسرے تمام کام چھوڑ کر صرف مذہب اور مذہبی روایات کی حفاظت و تحفظ کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اسی طرح تقسیم کار کے اصول کے ماتحت چار ذاتیں وجود میں آئیں۔

ہندو مفکرین کا عقیدہ تھا کہ انسان کی افتاد طبیعت کا انحصار تین عناصر پر ہے — صداقت و پاکیزگی ([illegible])، جذبہ یا فعالی (रजस)، اور تاریکی یا کند ذہنی (तमस)۔ مختلف انسانوں میں یہ عناصر مختلف تناسب میں موجود ہوتے ہیں اور اسی تناسب پر فرد کی طبیعت کا انحصار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ذات کی تخلیق کا محرک بھی یہی فلسفہ تھا۔

ویدک دھرم اور اس کا تعلیمی پہلو! ہندوؤں کی مذہبی تخیل متعدد منازل سے گذر کے تکمیل تک پہونچی ہے

عہد قدیم کے آریہ کا واسطہ زیادہ تر فطرت کی قوتوں سے تھا۔ اس لئے اس نے فطرت کی قوتوں ہی کو خدا بنا کر پوجنا کافی سمجھا۔ اس کے رشیوں منیوں نے حوادث فطرت کے اسباب پر غور و خوض نہیں کیا۔ اس دور میں قربانی کا تصور پیدا ہوا اور عبادت کے طریقوں کو کتابی صورت میں مرتب کیا گیا۔ اس کے بعد ایک منزل آئی جہاں آریہ کو یہ تمام رسوم بے مقصد معلوم ہونے لگیں چنانچہ اس نے کائنات اور اس کی آفرینش پر غور کرتے کرتے یہ نتیجہ نکالا کہ خدا ہی زندگی کا واحد سرچشمہ ہے۔ وہ ہی ہر چیز کی ابتدا اور وہ ہی انتہا ہے رسوم کی مذہب میں کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہیے اور سزا کے خوف اور جیسنرا کے لالچ سے اس کی عبادت کرنا عقل کے خلاف ہے۔ خدا کی ابدیت اور انسان کی روزمرہ زندگی میں کوئی بامعنی ربط اس وقت قائم ہو سکتا ہے جب انسان ہر مادی مدعا سے درگذر سے یہی انسان کی زندگی کی معراج ہے اور یہی اپنشدوں کی تعلیم وتلقین کا نچوڑ ہے۔

آرزو اور مدعا سے درگذرنا اس بات کا مرادف نہیں ہو سکتا کہ انسان اجتناب کی زندگی بسر کرے ”نہ اجتناب انسان کے لئے آزادی کا ذریعہ ہے، اور نہ انحراف تکمیل کا باعث“ (گیتا باب سوم اشلوک ۴) مقصد یہ ہے کہ انسان کام کرے اور اس کے انجام سے بے نیاز ہو کر اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب انسان اپنے مقاصد واغراض سے زیادہ دوسروں کی بھلائی، آرام اور خدمت کو اپنی بھلائی، آرام اور خدمت سمجھنے لگے۔ بہ الفاظ دیگر دوسروں کی ذات میں اپنی ذات کا فروغ اور دوسروں کی آرزو میں اپنی آرزو کی جھلک دیکھنا ہی خودشناسی ہے اور یہی تعلیم کا صحیح مقصد ہے۔

خودشناسی کی یہ منزل انسانی زندگی کی تکمیل ہے۔ اس منزل پر پہونچنے سے پہلے ہر انسان کو تین فرض ادا کرنے پڑتے ہیں۔ مذہبی پیشواؤں کا فرض طالب علم بن کر ادا کیا جاتا ہے دیوتاؤں کا فرض قربانیوں سے اور ماں باپ کا فرض گرہست کی زندگی بسر کرنے سے۔ ان تینوں فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی انسان خودشناسی کی منزل پر پہونچ سکتا ہے اور اپنی عمر کا بقیہ حصہ

جنگل میں گیان دھیان میں گذار سکتا ہے لیکن کس شرط کے ساتھ ؟ — یہ مہابھارت کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ "بھارت! اس شخص کے جنگل میں جانے کی کیا ضرورت جسے اپنے نفس پر قابو نہیں ؟ .... نفس پر قابو رکھنے والا انسان جہاں بھی رہتا ہے وہی اس کے لئے جنگل ہے"

مندرجہ بالا گفتگو سے واضح ہو گیا ہوگا کہ عہد قدیم کے ہندوستان میں تعلیم ایک مکمل زندگی کی تیاری تھی۔ طالب علم کو ہر منزل پر پہونچنے کے لئے مخصوص تیاری کی ضرورت ہوتی تھی۔ پہلی منزل میں ذہن کی بیداری اور جسم کو ذہن کا تابع بنانا مقصود ہوتا تھا، دوسری میں ذہن کے حاصل شدہ اصولوں پر عمل اور تیسری میں خود اپنی ذات کا مطالعہ۔ گویا ابتدائی زمانے کے ہندو فلسفیوں کا تعلیم سے وہی منشا تھا جسے آگے چل کر فروبل نے ایک نئی شکل وصورت میں پیش کیا۔ فروبل کے الفاظ میں۔ "تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ فرد کی زندگی میں اس قدر وسعت پیدا ہو کہ وہ اپنی ہمہ جہتی روحانی فعالی کے ذریعے اپنے وجود کو سمجھ سکے"، بہ الفاظ دیگر انسان عرفان ذات کے درجے کو پہونچتا ہے اپنے ہی عمل اور تجربے کے ذریعے۔ اسی لئے۔ گیتا نے اس بات کی ممانعت کی ہے کہ کسی غیر تربیت یافتہ ذہن پر ایسی بات جبر نہ کی جائے جو ترقی یافتہ دماغ کی کدوکاوش کا نتیجہ ہو (گیتا باب ۳۔ اشلوک ۲۶) اس سے ظاہر ہے کہ قدیم ہندو نظام تعلیم میں کس حد تک فرد کی انفرادیت کے نشوونما کا موقع تھا۔

عہد قدیم کے ہندوؤں کا نصب العین یہ تھا کہ انسان اپنی ذات اور خدا کے وجود کے درمیان جو تعلق اور رشتہ ہے اسے سمجھنے لگے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب انسان خیال اور عمل دونوں میں یکساں طور پر آگے بڑھا ہوا ہو۔ یہاں ہم ہندوستان کے تعلیمی مقصد کو ان یونانیوں کے مقصد کے ساتھ ساتھ پیش کر سکتے ہیں جن کا مدعا تعلیم کے ذریعے عملی انسان (MAN OF ACTION) اور عقلی انسان (THE MAN OF WISDOM) دونوں پیدا کرنا تھا۔ اپنشد کے الفاظ میں۔ "وہ دونوں عمل اور علم سے واقف ہے، عمل کے ذریعے موت پر قابو پائے گا اور علم کے ذریعے ہمیشہ کی زندگی پر"

یہاں آکر واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم میں وہ کتنی باتیں موجود تھیں جو آج ہمارے نظام تعلیم کی جان بنی ہوئی ہیں۔ اول ہر شخص کو مذہبی اعتبار سے وہ ہی منزلیں طے کرنی پڑتی تھیں جو اس کے آباؤ اجداد وسطے کر چکے تھے۔ یہ صورت وہ ہی ہے جو Parallelism between the individual and the race development کہلاتی ہے
دوم ہر منزل پر تربیت کا وہ ہی سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ جو ان کے آباؤ اجداد نے استعمال کیا تھا۔ یہ ہماری موجودہ (Culture Epoch Theory) ہے، جس کے تحت ہم اپنے تعلیمی مواد کو تربیت دیتے ہیں انسانی تمدن کی تاریخی منزلوں کے مطابق اور ان منازل کو مد نظر رکھتے ہوئے جن سے نشوونما کے دوران میں نسل گذر چکی ہے۔ سوم عمل کو خود شناسی کی شرط بنا دیا تھا (Learning by doing) کے اصول کو ترویج دینا تھا۔ چہارم فرض کو فرض کے لئے ادا کرنے کی تلقین کا مدعا یہ تھا کہ انسان بیرونی محرکات کا غلام بننے کے بجائے اپنی اپج اور اپنے شوق سے عمل کرنا سیکھے اسی چیز کو فروبل نے (Self activity + Self Control) سے تعبیر کیا ہے۔ سب سے آخر میں یہ بھی صاف کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اس نظام تعلیم میں ایک منزل کے بعد دوسری منزل پر پہونچنے کا التزام موجودہ زمانے میں ہمارے (Principle of activity) کی بنیاد ہے۔

ابتدائی تعلیم | قدیم زمانے میں بچہ عموماً باپ کا ہی پیشہ اختیار کرتا تھا۔ اس لئے باپ کے کام میں عملی شرکت ہی اس کی تعلیم تھی۔ پھر ابتدائی مدرسے کے طور پر کسی ادارے کا وجود بھی نہ تھا چھٹی صدی عیسوی میں تو ابتدائی مدرسے کے وجود کا ثبوت ملتا ہے جہاں اخلاقی تعلیم کے علاوہ لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جاتا تھا۔

کھلی ہوا میں کسی درخت کے نیچے کچھ بچے جمع ہو جاتے تھے اور یہی اس زمانے کا مدرسہ تھا۔ حروف تہجی سکھانے کا وہ ہی طریقہ رائج تھا جو آج ہم بھی استعمال کرتے ہیں۔ حرف بتانے کے لئے اس حرف سے شروع ہونے والا پورا جملہ بچوں کو بتاتا تھا۔ جو ذرا بڑے بچے ہوتے تھے وہ اپنے چھوٹے ساتھیوں کو پڑھا دیتے تھے۔ آج کل یہ طریقہ Monitorial system کہلاتا ہے۔ اینڈریو بیل

نے یہ طریقہ ہندوستان ہی کی تقلید میں انگلستان میں بھی رائج کیا تھا۔

ثانوی تعلیم ابتدائی دور میں مدرسے کا وجود تو تھا ہی نہیں۔ گھر کا بڑا بوڑھا رشی ہوتا تھا۔ قربانیاں اور عبادت اسی کی زیر نگرانی ہوتی تھیں اور یہی مذہبی تعلیم اپنے بچوں تک پہونچاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب مذہبی ادب میں الجھاؤ پیدا ہو گیا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بچوں کو مذہبی ادب سے صحیح طور پر واقف کرانے کے لئے کسی استاد کی مدد بھی درکار ہوگی۔ چنانچہ جنھیں شوق ہوتا تھا وہ دور دراز کے سفر کرکے مشہور مشہور برہمنوں کے پاس جاتے تھے۔ یہ عالم برہمن یا تو جنگلوں میں رہتے تھے اور یا راجوں مہاراجوں کے دربار میں۔ رفتہ رفتہ یہی برہمن مدرسوں کے بانی ہوئے۔ ان برہمنوں کے پاس چیلے اور شاگرد جمع ہو جاتے تھے۔ یہ شاگرد علم حاصل کرنے کے ذوق و شوق میں اپنے گرو کی ہر ممکن خدمت کرتے تھے۔ بعض مرتبہ گرو اپنے چیلے کی خدمت کی ذرہ برابر بھی داد نہیں دیتا تھا۔ چھندوگیہ اپنشد میں چوتھے باب کے دسویں حصے میں ذکر ہے کہ کس طرح اُپ گوسلا بارہ سال تک اپنے گرو کی خدمت کرنے باوجود اس سے کچھ نہ سیکھ سکا۔

جس وقت تک علوم وفنون سے متعلق ادب ناکافی تھا اس وقت تک صرف ایک ہی قسم کے مدرسے یعنی ویدک مدرسے کافی تھے۔ ان ویدک مدرسوں میں تعلیم کا نصب العین خالص روحانی مقاصد کی حصول یابی تھی یعنی وہ علم سکھانا جس سے "بغیر سنی ہوئی باتیں سنی ہوئی بن جائیں، بغیر سوچی ہوئی باتیں سوچی ہوئی بن جائیں اور بغیر جانی ہوئی باتیں جانی ہوئی بن جائیں"۔ (چھندوگیہ اپنشد باب ۶ حصہ ۱) جب اس تعلیم کا مقصد یہ تھا تو اس مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی کچھ ایسا تھا۔ وضاحت کے لئے میں چھندوگیہ اپنشد کے ساتویں باب کے پہلے حصے سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔

> نرادا ایک طالب علم سناتاگوما کے پاس جاتا ہے۔ سناتاگوما اس طالب علم سے کہتا ہے "پہلے تم مجھے بتاؤ کہ کیا جانتے ہو پھر اس کے بعد جو باتیں ہیں وہ میں تمہیں بتا دوں گا"
>
> نرادا جواب دیتا ہے "میں جو باتیں جانتا ہوں وہ یہ ہیں — رگ وید، یجروید

سام وید، اتھروید، اتہاس، پران، ریاضی، دیوتاؤں کا علم، وقت کا علم، منطق اخلاقیات سیاسیات، علم الحرف، برہما کا علم، علم العناصر، جنگ کا علم، علم النجوم، سانپوں کے منتر اور فنونِ لطیفہ — میں ان سب سے واقف ہوں"

سناتا گوما کا جواب ملاحظہ ہو "تم نے جس چیز کا مطالعہ کیا ہے وہ تو صرف نام ہے تم نام پر غور و خوض کرو پھر نطق پر، پھر قوتِ ارادہ پر، پھر ذہانت پر، پھر قوتِ فکر پر، پھر علم پر، پھر قوت پر، پھر کھانے پر، پھر پانی پر، پھر آگ پر، پھر ایتھر پر، پھر یادداشت پر پھر خواہش پر، پھر پران (روح) پر[1]"

لیکن جب علوم و فنون کی ترقی ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ تعلیم کو صرف مندرجہ بالا مذہبی رنگ کے خاکے تک محدود رکھنا غلطی ہے چنانچہ علوم و فنون کے مدرسے الگ کھولے گئے اور انھیں ویدک مدرسوں کے مقابلے میں بہت جلد مقبولیت حاصل ہو گئی۔ ویدک مدرسوں میں تعلیم محض سطحی ہوتی تھی۔ طلبہ بغیر سوچے سمجھے طوطے کی طرح اشلوک وغیرہ ازبر کر لیتے تھے لیکن ان نئے مدرسوں میں کوئی ایسی الجھن نہ تھی۔ طلبہ جو کچھ سیکھتے تھے وہ سمجھتے بھی تھے اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔

اس وقت سب سے اہم تعلیمی مرکز "پریشد" تھے۔ انھیں اس دور کے یورپ کے اقامتی کالج کی قسم کا سمجھنا چاہیئے۔ ابتدا میں ہر پریشد کی نگرانی کے لئے تین برہمن مقرر ہوتے تھے۔ بعد ازاں نگراں برہمنوں کی تعداد ۲۱ تک پہونچ گئی۔ یہ برہمن فلسفہ، مذہب اور قانون پر پورا پورا عبور رکھتے۔ پریشد اکثر شہر سے دور ہوتے تھے۔ طلبہ کو تعلیم مفت دی جاتی اور ان کے کھانے پینے کا خرچ راجہ، مہاراجہ اور رؤسا برداشت کرتے تھے۔

نصاب | ایک سال سے پانچ سال کی عمر تک بچہ کھیلنے کودنے کے لئے آزاد سمجھا جاتا تھا۔ پانچ سال یا دیر سے دیر آٹھ سال کی عمر پر بچے کی تعلیم شروع ہو جاتی تھی "بسم اللہ" کی رسم بچے کی روحانی زندگی

[1] یہ ایک طویل تقریر کی تلخیص ہے۔

کی ابتدا سمجھی جاتی تھی۔ برہمنوں کے بچوں کے لئے ۸ سے ۱۶ سال کی عمر، چھتری بچوں کے لئے ۱۱ سے ۲۲ سال کی عمر اور ویش بچوں کے لئے ۱۲ سے ۲۴ سال کی عمر اسی رسم کی ادائیگی کے لئے مقرر تھی۔ اس کے بعد بچہ روحانی اور ذہنی تربیت کے لئے وکشا گرو کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ گرو کے ساتھ بچہ تمام کو روزانہ کچھ وقت مذہب، علم، اور فن پر سبق لینے میں صرف کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بچہ گرو کے ساتھ ساتھ ہی ہر عبادت میں شریک ہوتا تھا تاکہ مذہبی رسوم کی ادائیگی عملی طور پر سیکھ سکے۔

طالب علم کو طلوع آفتاب سے پہلے اُٹھنا پڑتا تھا اور ہر روز طلوع اور غروب کے وقت اپنی تمام توجہ کے ساتھ گیاتری کا ورد کرنا ہوتا تھا۔ ہون کے لئے لکڑیاں جمع کرتا تھا۔ کھانا اپنے اعزا سے مانگ کر لاتا تھا اور ایک نیچے بچھونے پر سوتا تھا۔ اس کا لباس سادہ ہوتا تھا اور کھانے پینے میں اعتدال سے کام لیتا تھا۔ غرض اسے وہ تمام شرائط پوری کرنا ہوتی تھیں جو ایک برہمچاری کے لئے ضروری تھیں۔ شہد، گوشت، عطر، پھول، مشروبات، عورتوں سے ملنا جلنا، جانوروں کو مارنا، جسم پہ مالش کرنا، آنکھوں میں کاجل لگانا، جوتہ پہننا، چھاتا لگانا، سیر و تفریح، غصہ، حرص اور ناچنا گانا۔ یہ سب باتیں اس کے لئے ممنوع تھیں۔ بہر حال زندگی یکسر ضبط اور یکسر تادیب تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندو مذہب کا واسطہ دراصل الفاظ سے زیادہ عمل سے تھا اور یہ کہ ہندو بچے کی تعلیم و تربیت میں سب سے زیادہ قوی اثر اس کے ماحول کا ہوتا تھا۔ اس تعلیم کے بعد طلبہ کو اپنے گھر واپس آکر شادی بیاہ کی اجازت ہوتی تھی۔

<u>طریقۂ تعلیم</u> | ہر سبق کے اوّل و آخر میں شاگرد استاد کے پاؤں چھوتا تھا۔ استاد کے سوال کرنے کے بعد شاگرد سوال کو صاف صاف بلند آواز سے صحیح تلفظ کے ساتھ دہراتا تھا۔ اور اس طرح شاگرد ہر عبارت کو زبانی یاد کر لیتا تھا۔ استاد قریب نصف سال سبق دیتا تھا۔ تعلیم اکثر برسات کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی تھی۔ تعطیلات بھی کافی ہوتی تھیں

کسی مذہبی اصول کو سمجھنے کے لئے پانچ منزلیں مقرر تھیں۔ الفاظ کا سننا، معنی کا سمجھنا۔ اس سے کوئی عام نتیجہ اخذ کرنا۔ کسی دوست یا استاد سے اس کی تصدیق کرانا اور اس پر عمل کرنا۔ یہ طریقہ جان ڈیوی

کے تجویز کردہ اصولوں سے بہت قریب ہے۔ ڈیوی نے یہ منزلیں مقرر کی ہیں۔ اول مسئلہ کو سمجھنا۔ دوم مختلف حلوں میں سے ایک حل منتخب کرنا اور سوم اس حل کا عمل۔

ضبط و تادیب | ضبط کے سلسلے میں کوئی سخت قانون نافذ نہیں تھا۔ منو میں صاف طور سے استادوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو نرمی کے ساتھ لکھائیں پڑھائیں اور کوئی ایسی سزا نہ دیں جس سے بچوں کے چوٹ لگے۔ اگر کوئی شاگرد کسی سخت جرم کا مرتکب ہوتا تھا تو اسے پیٹھ پر رسی یا پھچی سے مارا جاتا تھا اور اس بات کی احتیاط رکھی جاتی تھی کہ سزا کہیں جرم سے نہ بڑھ جائے۔ ضبط کے متعلق چانکیا (اشوک کا دادا اور چندر گپت کا وزیر) کے الفاظ ہیں۔ "پانچ سال تک بچے کو پرورش کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد دس سال تک اس کی تربیت ہونی چاہئے اور جونہی وہ سولہ سال کا ہو جائے استاد کو اس سے دوستانہ سلوک کرنا چاہیئے۔"

عام خصوصیات | عہد حاضر کے علما تعلیم دو اثرات کے قائل ہیں۔ اوّل بچے کے نجی رجحانات اور صلاحیتیں اور دوم وہ ماحول جس میں بچہ رہ کر دانستہ یا غیر دانستہ طور سے اثرات قبول کرتا ہے۔ ہندو نظام تعلیم میں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ استاد ان باتوں سے بے خبر نہیں تھا۔ چنانچہ بچے کی افتاد طبیعت پر زور دینے کے ساتھ اس ماحول کو بہت اہم سمجھا جاتا تھا جس میں وہ رہتا تھا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح شاگرد اپنے گرد کے پاس گروہی کے خاندان کا ایک فرد بن کر رہتا تھا۔ اس لئے شاگرد کی تربیت میں سب سے زیادہ حصہ اس کے ماحول کا ہوتا تھا۔ آج کل کے اقامتی تعلیمی ادارے اسی قدیم اصول پر قایم کئے گئے ہیں لیکن ان اقامتی اداروں میں اس صاف ستھری فضا کا پیدا کرنا ممکن نہیں ہے جو قدیم ہندوستان میں ممکن تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے ہمارے زمانے میں تعلیم کا معاملہ بھی دنیا کے دوسرے کاموں کی طرح تجارت کا معاملہ ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان جو کڑی ہوتی ہے وہ مادی کڑی ہوتی ہے یعنی روپے پیسے کی کڑی۔ اس کے برخلاف قدیم ہندوستان میں استاد اور شاگرد کے درمیان کسی مادی تعلق کے بجائے خالص روحانی رشتہ ہوتا تھا۔ اسی لئے قدیم ہندوستان میں استاد کی ذات ہی بچے کی تعلیم کا مرکز ہوتی تھی۔ استاد کو جو تعلیم بچے کو

دینی ہوتی تھی استاد پہلے اپنی ذات کو اس تعلیم کا مظہر اور عملی نمونہ بنا لیتا تھا۔ بچہ استاد کی مثال سے متاثر ہوتا تھا اور فطری طور پر اپنے ذہن میں دائمی ارتسامات قایم کر لیتا تھا۔ یہی باعث ہے اُس زمانے میں اخلاقی تعلیم کی کامیابی کا۔

ایک اور بات جس کا ہمیں ذکر کرنا چاہیئے یہ ہے کہ قدیم ہندوستانی مدرسے اور سماج کے درمیان وہ دیواریں موجود نہیں تھیں جن کے مضر اثرات کو محسوس کرانے کے لئے ہمارے زمانے میں جان ڈیوی پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں آج اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ وہ تعلیم ناقص ہے جو ہمیں زندگی کے لئے تیار نہیں کر سکتی۔ قدیم ہندوستانی معلم اس اصول سے باخبر تھے اس زمانے کے سماج کی زندگی کا تجزیہ ان پانچ عنوانات کے ماتحت کیا جا سکتا ہے۔ (۱) ویدوں کا مطالعہ (۲) آباؤ اجداد کے نام پر خیرات وغیرہ دینا (۳) دیوتاؤں کو نذر دینا (۴) جانوروں کا پیٹ بھرنا اور (۵) مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا۔ چنانچہ اس زمانے کے مدرسے میں بھی تعلیم ان مرکزوں سے ہٹ کر کسی ایسی بات سے تعلق اور واسطہ نہیں رکھتی جس کی سماج کی زندگی میں کوئی اہمیت نہ ہو۔

جاپانی شاعری

(مترجمہ ریاض الاسلام صاحب۔ بی۔اے علیگ)

جاپان کے تمام فنون لطیفہ میں شاعری کا ہی وجود سب سے زیادہ قدیم ہے اور سب سے زیادہ مسلسل رہا ہے۔ ایک مشہور نظم کی عمر تو بلا شبہ پندرہ سو سال کی ہے اور بہت سی اور نظمیں زمانۂ ماقبل تاریخ سے چلی آرہی ہیں۔

اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں جو شخص بھی جاپانیوں میں مل جل کر رہے اسے بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ یہ لوگ فطرت کی خوبصورتیوں کو سمجھ کر کس قدر لطف اندوز ہوتے ہیں ان کی زندگی کے ہر پہلو سے یہ چیز نمایاں ہے۔ بچوں، گاؤں، معمولی سرایوں اور نفیس ہوٹلوں کے نام اکثر بہت شاعرانہ قسم کے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جاپانی تباہ کن کشتیوں کے نام "گلابی سحر"، "ہلکی پھوار"، "بجلی کی چمک"، "صبح کا کہر" اور اسی طرح کے دوسرے نام رکھے جاتے ہیں۔

ایک مشہور جاپانی مضمون میں آیا ہے کہ انسان کو چاند، پھول، چڑیوں، ادوں اور برف کے تودوں کے حسن سے سکون حاصل ہوتا ہے اور ان چیزوں کو دیکھ کر زندگی کے خطرات، محبت اور نفرت، جوانی کی مسرتوں اور بڑھاپے کی مصیبتوں کے متعلق احساسات دل میں ابھر آتے ہیں ان کے اظہار سے بھی ایسا ہی سکون ملتا ہے، اور شعر ترتیب دینے میں انسان کے دماغ کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس خیال کا اظہار آج سے ایک ہزار سال پہلے کی تو تسورا یوکی نے کیا تھا جو جاپانی شاعری کی ماہیت دریافت کرنے والا پہلا فلسفی محقق تھا۔ اس کے ایک ہزار سال بعد کے ایک دوسرے مفکر نے کہا ہے "ایک جاپانی کے لئے شاعری زندگی کا راز اور روح کی آواز ہے جو پوری قوم کے روحانی ورثہ کا لفظوں کی موسیقی

کے ذریعہ سے اظہار کرتی ہے" دراصل ان دونوں نے ایک ہی بات کہی ہے۔ وہ یہ بتلاتے ہیں کہ شاعران احساسات کا اظہار کرتا ہے جو کسی چیز کے دیکھنے یا سننے سے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک جاپانی شاعر خیالی اور بے بنیاد باتوں کے متعلق نہ کبھی لکھتا ہے اور نہ اسے لکھنا چاہئے۔ وہ چاند، پالے اور چڑیوں کی پکار پر قلم اٹھاتا ہے۔ وہ کیڑوں اور گھونگوں تک کو بھی اپنی شاعری میں شامل کر لیتا ہے۔ اس کی نظموں کے موضوع حقیقی چیزیں ہوتی ہیں اور اس کے محسوسات حقیقی محسوسات، جو واقعی اس کے دل پر گذرے ہوئے ہوتے ہیں اور جنھیں وہ اپنی حسن کاری سے ہمارے دلوں تک اس طرح پہنچاتا ہے کہ ہم اس کی مسرت محسوس کرتے ہیں اور اس کے غم میں شریک ہوتے ہیں۔ حالانکہ پہلی نظر میں اس کی نظمیں موضوعی معلوم ہوتی ہیں ۔ یعنی یہ کہ ان کا اصل تعلق اشیاء سے ہے۔ لیکن ذرا سی فکر اس نتیجہ پر پہنچا سکتی ہے کہ ان کا اصلی تعلق شاعر کے جذبات سے ہے۔ اگر شاعر ہمیں بھی محسوس کرا سکے جو اس نے خود محسوس کیا ہے تو اس کی شاعری سچی شاعری ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ گنجان آبادیوں اور مشینوں کے اس دور میں ہم وہ کچھ محسوس کر سکیں جو اب سے ایک ہزار سال پہلے کیوٹو کی پرسکون اور لطیف فضا میں ایک جاپانی شاعر کے دل پر گذرا ہوگا؟ آیئے کوشش کر کے دیکھیں۔ آزمائش کے لئے اس عہد کی یہ نظم لیتے ہیں۔ یہ اوائل بہار کی نظم ہے۔

"سفید پھول گر رہے ہیں۔ بہت بلندی سے گر رہے ہیں۔
حالانکہ کڑاکے کا جاڑا ابھی پوری طرح سے نہیں گیا"
کہیں ایسا تو نہیں کہ آسمان کے اس پار،
بہار ۔ جس کے ہم یہاں منتظر ہیں ۔ آن پہنچی ہے!؟"

اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانی شاعری کس طرح جذبات کی ترجمانی کر سکتی ہے۔ اس نظم کا خیال دلفریب ہے اور ایسا کہ ہر کسی شخص کے دل میں گذر سکتا ہے، اور مجھے امید

ہے کہ اب جب بھی برف گرنے کا سماں ہم دیکھیں گے تو ہم میں سے ہر ایک شخص کے دل میں یہی خیال پیدا ہوگا۔ شاعر نے ہمارے لئے جادو کی کھڑکی کھول دی ہے اور آسمان سے گرتے ہوئے برف کے گالوں کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا ہے۔

انگریزی میں مسز شارلاٹ پیک نے مندرجہ بالا ترجمے میں صرف چار مصرعے لکھے ہیں لیکن ترجمہ پھر بھی اصل سے کافی بڑا ہے۔ بالکل ابتدائی دور کی کچھ نظمیں جو اس زمانے تک پہنچی ہیں زائد سے زائد بیس مصرعوں تک پہنچتی ہیں لیکن عام صنف پانچ مصرعے والی نظم کی ہے۔ ان میں وزنی موسیقی پانچ اور سات رکن تہجی[1] والے مصرعوں کو یکے بعد دیگرے لانے سے پیدا کی جاتی ہے۔ برف اور پھول والی اصل نظم میں صرف ۳۱ ارکان ہیں ۳۱ ارکان میں ایک پوری نظم لکھنا کس طرح ممکن ہے؟ انگریزی زبان میں بہت سے لفظ صرف ایک رکن تہجی کے ہوتے ہیں (اور اس طرح ۳۱ ارکان میں کافی لفظ نکل سکتے ہیں) لیکن جاپانی زبان میں لمبے لمبے لفظ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ چھوٹے الحاقی حرفوں کے ذریعے سلے ہوتے ہیں۔ نظم کو ۳۱ ارکان میں محدود کر دینا جاپانی شاعروں کے لئے بڑی بھاری رکاوٹ ہے۔ (الفاظ لمبے ہونے کے سبب سے ایک ایک لفظ کئی کئی ارکان تہجی پر پھیل جاتا ہے اور اس طرح بہت تھوڑے سے الفاظ استعمال کرنے کی گنجائش رہ جاتی ہے) لیکن انھیں پابندیوں میں شاعر اپنی فن کاری دکھلاتا ہے۔ جاپانی شاعر اپنے کمال کے لئے شیلے کی کثرت الفاظ، سوئن برن کی ترکیبوں کی روانی اور اتار چڑھاؤ اور ملٹن اور براؤننگ کی دلفریب طوالتوں کا ممنون احسان نہیں ہوتا۔ اس کا راستہ اختصار اور ضبط کا راستہ ہے۔ بہت سے شاعر ۳۱ ارکان تہجی والی نظموں کو بھی مناسب حد سے زیادہ لمبا خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے چار سو سال کے اندر ہیگو کا رواج بہت بڑھ گیا ہے۔ ہیگو تین مصرعوں کی نہایت ہی مختصر سی نظم ہوتی ہے۔ اس کے پہلے اور تیسرے مصرع میں ۵ اور درمیانی مصرع میں ۷ ارکان ہوتے ہیں۔

---

[1] رکن تہجی (   ) لفظ کا وہ درمیانی ٹکڑا جو ایک سانس میں ادا ہو جائے مثال کے لئے ارمان کے دو رکن ہیں "ار" اور "مان"

"اِس ٹھنڈی شام کو
کیا چاند
وہاں پانی میں محو خواب ہے؟"

اگر الحاقی حروف کو نظر انداز کر دیا جائے، جن کے مماثل دوسری زبانوں میں لفظ کے آخری رکن کے کھنچاؤ[1] ہیں، تو اصل نظم میں صرف پانچ لفظ ہیں۔ لیکن یہ پانچ لفظوں کی نظم خاموشی، گرمیوں کی شفاف شام۔ سکون اور دماغی آسودگی کی کتنی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔

اس نظم سے جاپانی شاعروں۔ بلکہ تمام جاپانی فن کاروں۔ کے مافی الضمیر کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔ فن کار ہمارے سامنے ایک مکمل اور حسین نظارہ پیش کرتا ہے۔ لیکن وہ یہیں نہیں تھم جاتا۔ جتنا وہ دکھاتا ہے اس سے زیادہ وہ اشارہ سے سمجھاتا ہے۔ جو وہ نہیں کہتا وہ ہم محسوس کرتے ہیں۔ وہ حس سے زیادہ ہمارے متخیلہ کو اپیل کرتا ہے وہ ہمارے لئے جادو کی کھڑکی کھول کر ہماری دل کی آنکھوں کو اپنے رویا میں شریک کر لیتا ہے۔ غالباً اسی لئے جاپانی شاعر طوالت سے گریز کرتا ہے۔ پانی میں چاند کی اس ننھی سی نظم کو یورپ کا شاعر ایک طویل خود کلامی (soliloquy) میں بدل دیتا، وہ شام کی خموشی، آسمان کا سکوت، پانی کی سطح لہروں سے آزاد اور اتنی ساکن کہ موسم خزاں کے پورے چاند کی درخشانی اس میں منعکس نظر آتی ہے، ان سب کا تفصیلی بیان کرتا۔ وہ شاید اپنے ساتھی کا بھی ذکر کر دیتا جس کی معیت میں وہ اس منظر کے حسن سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ لیکن کیا یہ پھیلاؤ اصل نظم کے پانچ لفظوں سے زیادہ بتا سکتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بھی کم۔ کیونکہ اس تفصیل کے بعد سننے والے کے لئے یہ گنجائش نہیں رہتی کہ وہ اپنی داخلی دنیا میں سے بھی کوئی چیز لا کر بڑھا سکے بجائے اس کے کہ یہ جاپانی شاعر کی طرح سننے والے کو بھی شاعرانہ تخیل بخش دے۔ یہ اسے غیر دلچسپ اطلاعات اور تفصیلات بہم پہنچاتی ہے اور بس۔

۱؎ Cause Ending آخری رکن کا مد۔ جیسے فرانسیسی لفظ (Attaché) اٹاشے میں شے۔

چاند شاید جاپانی شاعروں کا سب سے دل پسند موضوع ہے۔ اس کے بعد شاہ دانے کے شگوفوں کا نمبر ہے سب سے پرانی نظمیں جو قلم بند ہو چکی ہیں، ان میں سے شگوفوں پر ایک نظم یہ ہے۔

"شاہ دانے کے شگوفوں کا موسم
ابھی گذرا نہیں ہے۔
لیکن اب انھیں گذر جانا چاہئے
اب جبکہ ان کے دیکھنے والوں کی محبت بہار پر ہے"

شاعر کو اس خیال سے دکھ ہوتا ہے کہ پھولوں کے حسن کو زوال ہے، کتنا اچھا ہو، وہ سوچتا ہے، کہ وہ یاد آئیں تو اپنے شباب کی شان و شوکت کے ساتھ یاد آئیں۔ یہی احساس ہے جس کی بنا پر یہ شگوفے جاپان کی مسلح قوتوں کے نشان کے طور پر اختیار کئے گئے ہیں سپاہی کے بٹن اور بحری افسر کی ٹوپی پر یہی نشان ثبت ہوتا ہے۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی ان شگوفوں کی طرح عین شباب میں جان دینے اور مرنے کے لے تیار رہتے ہیں۔ خود ایک انگلستان کے شاعر نے کہا ہے۔

یہ شگوفے کبھی پرانے نہ ہوں گے
یہ ہماری طرح بڈھے ہونے کے لئے نہیں رہ جائیں گے"

ایک اور مرغوب مضمون، خاص طور سے عشقیہ نظموں کا ہوٹوگی سو ہے جو ایک قسم کی کوئل ہوتی ہے۔ اس کی پکار میں شاعر ناکام محبت کی چیخ سنتا ہے۔ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جاپانی پرند کا ترجمہ پپیہا کیا جائے جس کے ساتھ ہماری شاعری میں اسی قسم کے خیالات اور واردات وابستہ ہیں جو جاپانی شاعری میں ہوٹوگی سو کے ساتھ ہیں۔

"سحر ہو گئی اور میں ابھی تک نہیں سویا ہوں
اُس کے خیال میں جس سے مجھے عشق ہے۔

پپیہے کے
مسلسل نغمے
اب برداشت نہیں ہوتے"۔

سنہ ۲ ۱۷ء کا واقعہ ہے کہ ایک نوخیز شاعرہ کو معلوم ہوا کہ اس کے شہر میں ایک نامی شاعر آکر ٹھہرا ہے وہ اس کے پاس گئی اور اس سے شاعری کے سلسلے میں ہدایات کی طالب ہوئی اس نے اسے پپیہا کا ایک مضمون باندھنے کے لئے دیا۔ ایسے فرسودہ مضمون میں جدت پیدا کرنا کس قدر کٹھن کام ہوگا، چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس کی پہلی اور دوسری کوششوں کو استاد نے بالکل ناپسند کیا اور لاپروائی سے سوگیا۔ شاعرہ نے ہمت نہ ہاری اور تمام رات بیٹھی اپنے موضوع پر غور کرتی رہی شاعر کی آنکھ کھلی تو اس نے پوچھا "کیا دن نکل آیا؟" لڑکی نے جواب دیا۔

"پپیہا؛
پپیہا، میں کہتی رہی
دیکھا! .... تو سویرا تھا"

ان چار لفظوں میں (اصل جاپانی نظم میں صرف چار لفظ ہیں اس نے شاعر کو بتلایا کہ تمام رات وہ اسی دھن میں لگی رہی یہاں تک کہ آسمان میں دوڑتی ہوئی سرخی نے اُسے بتلایا کہ اس نے اپنا کام ختم کر لیا ہے۔ اس نظم میں شاعرہ نے وہ سب کچھ ادا کر دیا ہے جو اس سے پیشتر کے شاعر نے اپنی مقابلتہً لمبی نظم میں پیش کیا تھا۔ استاد حیرت میں رہ گیا۔ اس نے کہا تم تو فن کی ماہرہ ہو اور تمہیں کسی سے اصلاح لینے کی ضرورت نہیں۔ ان دو نظموں میں ترجمہ کی بدنمائی کے باوجود جاپانی شاعروں کا مقصد یعنی تھوڑے لفظوں میں بہت کچھ کہنا، بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے کہ جینیو نے خود اپنی شاعری کے متعلق کہا ہے "الفاظ ختم ہو جاتے ہیں، لیکن احساس جاری رہتا ہے"۔

پپیہے پر ایک نظم اور ملاحظہ ہو۔ایک قاتل کو موت کا فیصلہ سنایا جا چکا تھا۔ جلاد کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا کہ اوپر پپیہے کو بولتے ہوئے سنا۔ مجرم نے اوپر نظر کی اور کہا:۔

"بس پپیہے!
باقی میں برزخ کے راستے میں
سنوں گا"

کسی کو اس مجرم کا نام یا اس کی زندگی کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں۔لیکن جاپانی قوم اس کے ان اشعار کو کبھی نہیں بھولے گی۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کا احترام کرتی ہے جو موت کا مقابلہ ہمت سے کرتے ہیں۔

ان مثالوں سے معلوم ہوگا کہ جاپانی نظم میں قافیہ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔شعری زبان کے لئے صرف ایک چیز ضروری ہے:۔پانچ اور سات ارکان تہجی والے مصرعوں کی وزنی موسیقی۔ اس لئے شعر گوئی کوئی مشکل کام نہیں۔ البتہ نیا خیال اور اس کے لئے نیا انداز بیان نکالنے میں کافی دقت پڑتی ہے اور یہی چیزیں سچی شاعری کی پہچان سمجھی جاتی ہیں۔جاپانی لوگ جن کی پرورش صدیوں سے شاعری کی فضا میں ہوئی ہے بڑی آسانی سے اپنا مطلب ہر موقعہ پر شعر کے ذریعہ سے ظاہر کرتے ہیں۔

آج بھی شعری پیداوار بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے ۔دیوان منتخبات اور شعری رسالے برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔حالانکہ یہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سو سال کی مسلسل شاعری کے بعد شاہ داتے کے شگوفے کے بارے میں کوئی نئی بات کہی جاسکے پھر بھی ہر سال پھولوں کے مشہور کنجوں میں سیکڑوں نظمیں درختوں سے لٹکی ہوئی نظر آتی ہیں حسن کی اس کثرت کے سامنے سیر کرنے والوں کے لئے خاموش رہنا ناممکن ہوتا ہے۔

مرحوم شاہ میجی کو ایک غیر معمولی مرتبہ کا شاعر مانا جاتا ہے۔اس نے اپنی ساٹھ سال کی زندگی میں ایک لاکھ نظمیں لکھیں۔

اس کے آخری ایام میں روس اور جاپان کی جنگ چھڑ گئی اور اسی جنگ کے زمانے

میں اس نے یہ نظم لکھی تھی۔

"حملہ کرنے والے دشمن کو
اپنے وطن کی طرف سے
پوری قوت سے جواب دے
لیکن وار کرتے دم بھی
اس سے محبت کرنا نہ بھول"

(آسوالڈ ٹک - ایشیاٹک ریویو)

کچھ کلام انیس پر

(از سید مقبول حسین صاحب احمد پوری)

ہر ملک کی آب و ہوا اور طرز زندگی کے ماتحت رفتار زمانہ کا ایک مخصوص رویہ ہوا کرتا ہے۔ جو اپنی چند ہمہ گیر خصوصیات کی بنا پر ایک امتیازی معیار کا پابند ہے اس معیار کو بعض قوموں کی ذہنیت سے ایسا گہرا تعلق ہوتا ہے کہ اسے قوم کا مخصوص کیریکٹر سمجھنا چاہیئے اسی قیاس پر ہر قوم کی برائی بھلائی کو ایک معیاری عینک سے دیکھا جا سکتا ہے اور اگر سچ پوچھئے تو اس قسم کی معیاری عینک مورخ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی کہی ہوئی کہانی پر وقتاً فوقتاً دنیا کی ہر فاتح قوم نے اپنا اثر ڈالا ہے البتہ شاعری حقیقی معنی میں قوم کی عینک ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ چند الہامی نظموں اور شاعرانہ خیال آرائیوں پر منحصر ہے۔ یہاں شاعری کے مقابلہ میں تاریخ کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ہومر، فردوسی، والمیک، تلسی داس اور انیس قسم کے شاعر ہی دنیا کی تاریخ کا مواد بہم پہونچانے والے ہوئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہمارا ارادہ ہے کہ ملک اودھ کے ہر دلعزیز شاعر انیس کے کلام پر اپنی استعداد کے موافق اظہار خیال کریں۔

چونکہ ہندوستانی سوسائٹی میں مذہب کا عنصر ابھی تک بدرجہ اتم موجود ہے اس لئے زبان و بیان کی خوبیاں جب تک مذہبی جذبات سے شیر و شکر نہ ہوں مقبول عام نہیں ہوتیں یہی وجہ ہے کہ انیس کے کلام کو وہ لوگ بھی پسند کرتے ہیں جو ان کے مذہب ہی سے نہیں بلکہ ان کی معاشرت سے اور ان کے ماتمی پیام سے بھی بیر رکھتے ہیں

ذیل میں چند مخصوص عنوانات کے ماتحت ہم انیس کے کلام کا مقابلہ دوسرے شعرار کے کلام سے کرتے ہیں تاکہ انیس کو صحیح معنی میں ہم سمجھ سکیں۔ یہاں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں

کہ انیس کی بابت حالی نے کیا کہا یا شبلی کے کیا خیالات ہیں۔ ہم تو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انیس دراصل ہماری نگاہ میں کیا ہیں اور ہم نے ان کو کہاں تک سمجھا۔

انگریزی زبان نے ہمیں دنیا بھر کے علم و ادب سے تھوڑا بہت واقف کر دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہومر، شکسپیر اور گوئٹے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ اور ان کا مرتبہ ہمارے فردوسی اور تلسی داس کی طرح لٹریچر میں اعلیٰ ہے۔ لیکن انگریزی زبان میں ایک شکسپیر ہی بڑا شاعر نہیں۔ ملٹن شاعر ہونے کے علاوہ عالم اور فقیہہ بھی تھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں شکسپیر کی ہمہ گیری ہر جگہ مسلمہ ہے۔ اسی قسم کا تفاوت اور اختلاف اردو زبان کے شعراء میں بھی ہے۔ بعض شعراء اس قدر مقبول ہوئے کہ ان کی طرف لوگوں کا خود ساختہ کلام بھی منسوب ہو گیا۔ گویا بیربل کا لطیفہ ہیں۔ جو چانڈو خانوں میں تصنیف ہو کر بیربل کی طرف منسوب ہوئے۔ میر صاحب کے بہتر نشتروں کی یہی قطع ہے۔ کوئی چبھتا ہوا شعر سنا گیا میر صاحب کا نشتر ہو گیا اور اب تو اکبر مرحوم بھی اس اعتبار سے شہرت عام کے حقدار نظر آتے ہیں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اکبر کا سنجیدہ کلام بھی ایک زندہ دل تنقید ہونے کے علاوہ اخلاقی افادیت کا دلفریب ریکارڈ ہے۔ اور مسلمان ہی نہیں بلکہ ہنود بھی اور انگریز بھی ان کو بہترین شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

خیالات کی محض وہ بلندی جہاں تک عوام الناس نہ پہنچ سکیں معیار کو محدود کر دیتی ہے انگریزی زبان کے شاعر براؤننگ کی مثال موجود ہے، خود ہماری زبان کے غالب اور اقبال کو لیجئے۔ لیکن انیس اگر صرف مرثیوں اور رثائی مضامین پر اپنی استعداد نہ صرف کر دیتے تو غالباً وہ شکسپیر، تلسی داس اور فردوسی سے کم شہرت نہ حاصل کرتے کیونکہ ان کے ہمہ گیر ہمعصر میر سلامت علی دبیر بھی زبان فصاحت میں ان کا مقابلہ نہ کر سکے تھے۔ اردو زبان اگر اپنے محدود دائرے میں کوئی اہمیت رکھتی ہے تو اس مطابقت سے ہم انیس کو ہومر، شکسپیر، گوئٹے، فردوسی اور تلسی داس سب کچھ کہہ سکتے ہیں راقم الحروف کا سابقہ پرستاران انیس سے بہت کچھ رہا۔ ان کے نزدیک انیس ماورائے انسان سمجھے جاتے ہیں اور ان کے مرثیوں کی حیثیت

وہی ہے جو ہنود میں رامائن کی اور بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ واقعہ کربلا، مہا بھارت اور رامائن میں بہت کچھ مطابقت ہے، مہابھارت کے کورو اور پانڈو معرکۂ کربلا کے فریقین کی طرح ایک دوسرے کے عزیز تھے۔ رامائن کے رام اور لکشمن ایک طرف اور بھرت کی رقابت ایک طرف مسئلہ خلافت اور بنو امیہ کی خاندانی عداوت سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ غرض پلاٹ ایک ہی ہے گو مقاصد دوسرے ہیں۔ اس طرح مراثی انیسؔ اردو زبان کی مہابھارت، رامائن یا شاہنامہ سب کچھ ہیں لیکن اردو زبان کی کم مائگی کو دیکھتے ہوئے ان زبردست رزمیہ مضمونوں سے بے ترتیب مرثیوں کا مقابلہ کرنا بے محل سا ہے۔ تاہم بفرض محال اگر کسی قسم کا مقابلہ ممکن ہے تو صرف یہ جو کیا گیا۔ اگر مراثی انیسؔ کے واقعات کی ترتیب وہی ہوتی جو رامائن یا شاہنامہ میں ہے تو اس صورت میں غالباً مراثی انیس بھی دنیا کی بڑی رزمیہ نظموں میں شمار ہوتے۔ لوگوں نے اس قسم کی کوشش اپنے طور پر کی ہے مگر وہ بات کہاں جو خود شاعر سے ممکن ہو سکتی تھی۔

تبصرہ۔ یہ امر واقعہ ہے کہ شاعر کے خیالات ہمیشہ نئے نہیں ہوا کرتے۔ نوعیت محض اظہار خیال کی خوبی اور طرز ادا کا جادو ہے۔ چنانچہ موازنہ مقابلہ یا در اصل خیالات کا نہیں ہوتا بلکہ طرز ادا کا کہ کس طرح ظاہر کئے گئے اور وہ کونسی خوبی تھی جس کی وجہ سے وہ نئے معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً "معرفت حق" سے متعلق مضامین پر ہماری زبان کے شعرا نے خیال ایک ہی ظاہر کیا ہے، مگر طرز ادا مختلف ہے۔ چنانچہ میر صاحب کہتے ہیں ؎

فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا   مری آہ نے برچھیاں ماریاں

یعنی انسان کی آہ فلک قدس سے بھی پرے منزل "لا احصی" تک پہنچ گئی۔ شعر کیا گویا رجز ہے۔

غالب ؎ اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا   جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

محاورہ "دوچار ہونا" سے جو نتیجہ ماخوذ ہے وہ احدانیت کی بالکل اچھوتی توجیہ ہے۔

الفاظ یگانہ اور یکتا بھی قابل غور ہیں۔ لفظ "یگانہ" ہر قسم کے تعلق اور رشتہ کی نفی کرتا ہے اور لفظ "یکتا" قائم بالذات ہے یعنی لفظ "ایک" کے بعد "دو" کا خیال ہونا ضروری ہے مگر "یکتا" اپنے سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اکبر؎ عقل میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا — جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

عقل محدود ہے اور خالق عقل لامحدود۔ سمجھ میں تو وہی شے آسکتی ہے جس کی تمثیل ممکن ہو اور جو سمجھ کے دائرے سے باہر نہ ہو۔ غالب اور اکبر کے ان دو اشعار کا مقابلہ گویا زبان و بیان کا مقابلہ ہے۔ اگر غالب کا شعر صرف زبان ہی زبان ہے تو اکبر کا شعر بیان ہی بیان ہے اور دونوں میں نغز کی خوبی بھی ہے ؎

حالی؎ ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا — آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے — انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

حالی نے وہی بات معاشرتی اور سماجی دلائل سے پیش کی ہے۔

اقبال؎ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اس شعر میں مرحوم گویا اپنے کو "صنم آشنا" ثابت کر رہے ہیں۔ حقیقت کل لامحدود ہے اور مجاز محدود۔ مجاز میں حقیقت کا مشاہدہ خیال باطل ہے۔ لہٰذا "ارنی" کا جواب "لن ترانی" کے سوائے کیا ہو سکتا ہے۔

امیر؎ اس کی حسرت ہے جسے دل سے بھلا بھی نہ سکوں — ڈھونڈھنے اسکو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں

یہ اقرار نارسائی "شریعت" کے حدود کے اندر ہے۔

انیس؎ پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو — آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو
ہے قرب رگ جاں سے بھی اس پر یہ بُعد — اللہ! اللہ! اکس قدر دور ہے تو!!!

انصاف شرط ہے۔ اس رباعی میں غالب کی زبان، اکبر کا بیان، حالی کا اعتقاد اور اقبال کا جذبۂ عبودیت سب کچھ ہیں اور مندرجہ بالا ہر مثال کا خلاصہ یہ رباعی ہے۔ یعنی یہ نغز بھی ہے

حسنِ تعلیل بھی، تفسیرِ قرآن بھی، رمزِ توحید بھی اور زبان تو اس قدر سلیس ہے کہ ہر کس و ناکس بھی سُن کر وجد کرنے لگے۔

موازنہ اس مختصر تبصرے کے بعد ہم انیس کے کلام کا موازنہ دوسرے شعراء سے کرتے ہیں۔
انیس کے ہر مرثیے یکساں ہیں سب کا انجام ٹریجڈی ہے۔ ہر مرثیہ مظلومیت، صبر، شجاعت وضع داری تسلیم و رضا وغیرہ جذبات کے جداگانہ اور مجموعی پہلوؤں کا ریکارڈ ہے۔ اور معاشرت کا ہر پہلو اِن میں نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دودمانِ حسین علیہ السلام کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی اردو ہی تھی۔

ٹریجڈی کی بنیاد حزن و ملال ہی پر ہے اور یہی مرثیہ کا بنیادی عنصر ہے تاہم اس مایوس کن زمین میں انیس نے جو گلزارِ سخن لگایا ہے اس کا لگانا شاداب زمین میں بھی مشکل تھا۔ کم و بیش دنیا کے دانا ترین فلسفی اور غیور طبع لوگ طبعی طور پر حزن و ملال کا شکار ہوتے ہیں۔

غالب نے لکھا ہے۔ ع "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"

اقبال کہتے ہیں۔ ع "دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب"

انگریزی زبان کے شاعر شیلی نے لکھا ہے۔ ع

"ہماری ہنسی میں بھی کچھ دکھ ملا ہے"

میر درد اس سب کا خلاصہ اس طرح لکھتے ہیں ؎

"جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا کہ نہ ہنستے ہی رو دیا ہوگا"

انیس نے اپنے روزمرہ میں اس کو عام بات ظاہر کی ہے اور لکھا ہے کہ ؎

دنیا میں سدا ایک سا رہتا نہیں احوال ادبار ہے انساں کا کبھی اور کبھی اقبال

اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ؎

کچھ پھول تو دکھلا کے بہار اپنی ہیں جاتے | کچھ سوکھ کے کانٹوں کی طرح ہیں نظر آتے
کچھ گل ہیں کہ پھولے نہیں جامے میں سماتے | غنچے بہت ایسے ہیں کہ کھلنے نہیں پاتے
بلبل کی طرح روتے ہیں فریاد و فغاں سے | کچھ بس نہیں چلتا چمن آرائے جہاں سے

انیسؔ شاعر غم ہیں۔ ان کے کلام میں مسرت و بہجت سے متعلق مواد نہیں ہے اور یہ کمی ایسی ہے کہ ان کو ہمہ گیری کے مرتبہ تک نہیں پہنچنے دیتی بعض مغربی اہل قلم بھی حزن و ملال ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً ٹامس ہارڈی اپنے ایک ناول میں دنیا کی ستم ظریفیوں کا ایک تمثیلی خاکہ اس طرح پیش کرتا ہے:۔

"نیچر کی اس سہانی شام کا تصور کیجئے جب گلابی شفق سے نورانی گلال سورج کی کرنوں کے عبیر سے مل کر عالم لاہوت کی ہولی کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اسی سماں میں ان قزاقوں کا بھی تصور کیجئے جو چند دہات کے ٹکڑوں کے لئے ایک مسافر کی گردن پر چھری ریت ریت کر سُرخ لہو کی ندّی بہاتے ہیں۔"

دونوں مناظر ایک ہی ہیں مگر پہلا سین دوسرے کی حالت پر مسکرا رہا ہے اور دوسرا پہلے کی بےحسی پر خون اگل رہا ہے، مراثئ انیس کی عام روش اسی قسم کے مناظر لیئے ہوئے ہے یہاں ہم صرف ایک بند پر اکتفا کرتے ہیں ؎

جلوہ وہ دمِ صبح کا وہ نور کا عالم | دلچسپ صدا نوبت و شہنا کی وہ باہم
سرخی وہ شفق کی افق چرخ پہ کم کم | وہ گل کے کٹوروں پہ دُرافشانی شبنم
خشکی میں بھی سردی سے ترائی کا سماں تھا
پر مالکِ گلزارِ جہاں تشنہ دہاں تھا

اسی قسم کی ایک حالت شکسپیر نے اپنی آزاد نظم میں اس طرح پیش کی ہے جو محض ادبی اور تنقیدی پہلو کو مدنظر رکھ کر یہاں لکھی جاتی ہے، ایک عیش و نعم میں دن گذارنے والا

بادشاہ نیند کی خوشامد اس طرح کرتا ہے ؎ ترجمہ۔

اے نیند پیاری پیاری
تو دایۂ فطرت ہے
کیوں مجھ سے خوف کھایا
کیوں میری تھکی پلکوں پر بار نہیں آیا۔
اے کاش خودی سے میں دم بھر کو گذر جاتا
اور خواب فراموشی میں ڈوب کے مرجاتا !
ان کوٹھریوں میں تو گھٹتا ہے دھواں جن میں
مچھر کی نفیری میں چبھتے ہوئے ڈھیلوں پر
دہقان کو سلاتی ہے۔
اور میری خوابگاہیں خوشبو سے معطر ہیں
اور میرے شامیانے شمعوں سے منور ہیں
اور میٹھی لوریوں کی آواز گونجتی ہے ....
اے پیاری نیند یہ سب مرغوب نہیں تجھ کو "

انیس کے زیادہ تر کلام کو رزمیہ شاعری کہا جا سکتا ہے، اور چونکہ رزمیہ پہلو پر لوگوں
بہت کچھ لکھا ہے اس لئے ہم اس بحث کو یہاں قلم انداز کریں گے، البتہ انیس کی بزم پر ابھی
کوئی دلچسپ اشارہ نظر نہیں آیا۔ انیس کی بزم اور فردوسی کی بزم میں بہت زیادہ فرق
، جس طرح نظامی نے فردوسی کے مقابلہ میں بزم پر زیادہ زور دیا ہے، اردو میں دبیر
نیس سے زیادہ بزم پر زور دیا۔ لیکن بزم کے پہلو پر مولانا کا کوری سب میں پیش پیش ہیں
انیس اور محسن کے کلام سے دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مولانا محسن نے پیغمبر السلام صلعم
اسلا

کی پیدائش سے متعلق نغمۂ نشاط اس طرح لکھا ہے ؎

سامانِ ظہور کی ہے تمہید قدرت پہ یہ ہو رہی ہے تاکید
فیض روح القدس عیاں ہو افشائے رموز کن فکاں ہو

اللہ! اللہ! کیا سماں ہے ہر شے کو حیات جاوداں ہے
ہستی و عدم میں ایک لے ہے لاشے کے بھی لب پہ آج نے ہے
نازل ہے زمیں پہ کبریائی بندے کے لباس میں خدائی
اس وقت دیار میں عرب کے مطلع سے تجلیاتِ رب کے
برجِ شرفِ قریشیاں میں اور ہاشمیوں کے خانداں میں
اسلام کا آفتاب چمکا بے پردہ بے نقاب چمکا

انیسؔ کے بند ملاحظہ ہوں جو حضرت امام حسین علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق ہیں ؎

ہاں اے فلک پیر نئے سر سے جواں ہو اے ماہ شب چاردہم نور فشاں ہو
اے ظلمت غم دیدۂ عالم سے نہاں ہو اے روشنی صبح شب عید عیاں ہو
شادی ہے ولادت کی یداللہ کے گھر میں
خورشید اُترتا ہے شہنشاہ کے گھر میں

اے کعبۂ ایماں تری حرمت کے دن آئے اے رکن یمانی تری شوکت کے دن آئے
اے بیت مقدس تری عزت کے دن آئے اے چشمۂ زمزم تری چاہت کے دن آئے
اے سنگ حرم جلوہ نمائی ہوئی تجھ میں
اے کوہ صفا اور صفائی ہوئی تجھ میں

اے ختم رسل گوہر مقصود مبارک یا نور خدا رحمت معبود مبارک
یا شاہ نجف شادی مولود مبارک یا خیر امم اختر مسعود مبارک
رونق ہو سدا نور دوبالا رہے گھر میں
اس ماہ دو ہفتہ کا اجالا رہے گھر میں

اے ماہِ معظم ترے اقبال کے صدقے　　شوکت کے فدا عظمت و اجلال کے صدقے
اتری برکت فاطمہ کے لال کے صدقے　　جس سال یہ پیدا ہوئے اس سال کے صدقے
اسپند کرو فاطمہؓ کے ماہ جبیں پر　　فرزند نہیں چاند اتر آیا ہے زمیں پر
ماتھے پہ چمکتا ہے جلالت کا ستارا　　نقشہ ہے محمد سے شہنشاہ کا پیارا
تصویر رسول عربی دیکھ رہے ہیں　　ہر آنکھوں کی گردش کہ نبی دیکھ رہے ہیں

گلستان عالم کی چمن آرائی پر بہت کچھ لکھا گیا۔ بزم عالم ہمیشہ سے دلہن بنی رہی ہے اور رہے گی اس موضوع سے متعلق ہم ہندوستان کے شکسپیر آغا حشر کاشمیری کا ایک نغمہ یہاں لکھتے ہیں ؎

جگ مالی ، تہاری ،کرتاری کے واری
قائم کی سرداری ، کیا پھولی پھلواری
نیاری نیاری گلکاری　　قدرت کی سگرو جگ میں
جگ مالی، تہاری، کرتاری کے واری
قائم کی سرداری، کیا پھولی پھلواری

شجر حجر، برگ و بار
پھول پات ڈار ڈار
کوئی نہ پایو تمہرو پار　　حشر جگت ہاری
جگ مالی، تہاری کرتاری کے واری
قائم کی سرداری، کیا پھولی پھلواری!

رام بھرو کے بیٹھ کے سب کا پرکھا میت　　جا کی جیسی چاکری تا کو نیسا دیت
تو ماتا، تو پتا، تو داتا نیارا　　تو ہی پار لگا دن ہارا
جگ مالی، تہاری کرتاری کے واری
قائم کی سرداری، کیا پھولی پھلواری

یہ ترانہ محض ڈراما وغیرہ کے لئے ہے۔ اس کو ادبی معیار سے کوئی واسطہ نہیں تاہم خیالات
وہی ہیں جو عموماً ہوا کرتے ہیں، انیس کے مندرجہ ذیل اشعار گویا اس نغمہ کی جان ہیں مثلاً ؎

گرمیٔ صحرا اور وہ پھولوں کا مہکنا — مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا — وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا
مہتاب ہوا گم فلکِ نیلوفری کا — پھولا گلِ خورشید نسیمِ سحری کا
اُٹھ اُٹھ کے چمک اپنی دکھانے لگے ذرّے — خورشید کو پہلو میں دبانے لگے ذرّے
اس دشت میں روتی ہے جو شبنم شہِ دیں پر — ہو موتیوں کا فرش زمرد کی زمیں پر
مشکل نہ کسی رنج کو سمجھے نہ بلا کو — بندہ وہی بندہ ہے جو بھولے نہ خدا کو

مقابلہ:۔ اس عنوان کے ماتحت اردو زبان اور دیگر زبانوں کے مستند شعرا کے چند اشعار سے
انیس کا مقابلہ کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مرثیہ ایسی خشک زمین پر انیس نے کیا کیا پھول کھلائے

حسرت ؎ ہے یہی شرطِ وفاداری کہ بے چون وچرا — وہ مجھے چاہے نہ چاہے میں اُسے چاہا کروں
انیس ؎ عشقِ گل تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے — معشوق کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے
کٹنے میں رگوں کے نہ صدا آہ کی نکلے — ہر رگ میں لو الفتِ اللہ کی نکلے

مومن ؎ بن ترے اے شعلہ رو آتشکدہ تن ہو گیا — شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہو گیا
ریاض ؎ صبا آتشیٔ گل ہو یا داغِ بلبل — یہ سب آگ انھیں کی لگائی ہوئی ہے
داغ ؎ جنبش میں یوں ہیں وہ لبِ نازک نفس کے ساتھ — جیسے ہلے نسیم سے پتی گلاب کی
انیس ؎ چمن کے افشاں جو نظر یار نے کی تاروں پر — آسماں رات کو لوٹا کیا انگاروں پر

تلسی داس ؎ رگھو کل ریت سدا چلی آئی — پران جہین ارو بچن نہ جائی
(ترجمہ:۔ یہ دستور رگھو کے گھر ہی میں پایا — نکل جائے جی بات رہ جائے لیکن)

انیس وہ ہے بات کی پیچ نام پہ مرتے ہیں بہادر		جو کہتے ہیں منہ سے وہی کرتے ہیں بہادر

مراثی انیسؔ کی تعداد کئی سو تک ہے جو نولکشور پریس کی پانچ جلدوں میں شائع ہوئے ہیں، اکثر مرثیے دو تین سو بند تک پہنچتے ہیں۔ ذیل میں صرف پہلے مرثیے سے انتخاب کر کے چند ایسے مصرع لکھے جاتے ہیں۔ جن میں ضرب المثل ہونے کی اہلیت ہے۔ اگر مراثی انیسؔ کی پانچوں جلدوں سے اس قسم کے محاورے منتخب کیے جائیں تو ایک دلچسپ ڈکشنری مرتب ہو جائے:۔

۱۔ اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے
۲۔ دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گذری
۳۔ انسان ہوں کلیجہ مرا پتھر نہیں بابا
۴۔ عارف کبھی اتنا بھی تجاہل نہیں کرتے
۵۔ دنیا میں گذر جاتی ہے انسان کی بہر طور
۶۔ جب اٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے
۷۔ (شعر) کس باغ پہ آسیب خزاں آ نہیں جاتا
گل کونسا کھلتا ہے کہ مرجھا نہیں جاتا!

دو کسان

(جری احمد سید صاحب ایم اے)

(۱)

دونوں جھونپڑے ایک پہاڑی کے نیچے تھے۔ ندی بھی پاس تھی جہاں مویشی پانی پینے آتے تھے۔ ان جھونپڑوں کے رہنے والے دو کسان آس پاس کی اوسر بنجر زمین پر سخت محنت مشقت کرتے اپنی روزی پیدا کرتے اور اپنے بال بچوں کی پرورش کرتے۔ دونوں کے گھروں میں چار چار بچے تھے۔ صبح سے شام تک جھونپڑوں کے سامنے مٹی میں کھیلا کرتے، دو سب سے بڑے، چھ چھ برس کے اور دو سب سے چھوٹے، پندرہ پندرہ مہینے کے تھے، دونوں کسانوں کے گھر بھی ساتھ ساتھ بسے تھے اور پھر زچے خانے بھی تقریباً ایک وقت میں رچے تھے

یہ بچے مٹی میں ایسے لت پت رہتے کہ مائیں بھی مشکل ہی سے اپنے اپنے بچوں کو پہچان پائیں، اور دونوں کسان تو ہمیشہ ہی غلطی کرتے، ان کے ذہنوں میں آٹھوں نام گڈمڈ ہو گئے تھے، ایک کو پکارنا ہوتا تو دو چار نام ضرور زبان پر آجاتے پھر کہیں اصلی نام یاد آتا۔

ندی کی راہ سے آنے میں پہلا جھونپڑا تو اتش کا پڑتا، اس کے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا، دوسرا ولائیں کا، اس کے ایک لڑکی اور تین لڑکے تھے۔

ان کی پرورش والدین پر گراں تھی، آلو اور ترکاریوں کا شوربہ ان کی کل غذا تھی۔ اور تازی ہوا اور بس، کھانا بھی صرف تین وقت میسر آتا، سات بجے صبح، دن چڑھے دوپہریں، اور پھر چھ بجے شام کو۔ وقت آتا۔ مائیں اپنے چینگی پوتوں کو کھلانے پلانے کے لئے جمع کرتیں جیسے کوئی ننھے ننھے چوزوں کو چگانے کے لئے جمع کرتا ہے، کھانے کی میز پچاس برس پرانی، کثرت استعمال سے خوب چکنی چمکدار ہو گئی تھی، سب لاکر اسی پر بٹھا دیئے جاتے۔ سب سے بڑا ایک کونے پر پھر اس سے چھوٹا، پھر اس سے

چھوٹا، آخر میں سب سے ننھا، اس کا منہ مشکل سے میز تک پہونچتا. ان کے سامنے ایک کونڈلیا رکھ دی جاتی جس میں ترکاریوں، بھاجیوں، پیاز، آلو وغیرہ کا شوربہ ہوتا اور اس میں روٹی بھیگی ہوتی سب کے سب اس پر جھک پڑتے یہاں تک کہ خوب آسودہ ہو جاتے. سب سے چھوٹے کو ماں خود کھلاتی جاتی۔ ہر اتوار کو ترکاری بھاجی اور پیاز کے ساتھ تھوڑا گوشت بھی شامل کر لیا جاتا، باپ اس دن دیر تک میز پر بیٹھا مزے لے لے کر کھاتا رہتا اور کہتا جاتا "مجھے یہی ملتا رہے تو بھی میں خوش ہوں!"

اگست کا مہینہ تھا اور شام کا وقت ایک ٹم ٹم جھونپڑوں کے سامنے آکر رکی! ایک کم عمر مادام کے ہاتھ میں اس کی لگام تھی، ساتھ بیٹھے موسیو سے کہنے لگی۔ "اہا ہنری، دیکھو تو! یہ بچے کیسے پیارے لگ رہے ہیں مٹی میں لت پت! ایں؟" ہنری نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اس کا عادی ہو چکا تھا کہ جہاں کہیں بچے نظر پڑے اور وہ شفقت و محبت سے بیتاب ہو گئیں۔ اس سے اس کے دل کو رنج بھی پہونچتا اور طبیعت کو ٹھیس بھی لگتی۔

مادام رکی نہیں: "میں ان کو پیار کر کے رہوں گی، کاش ان میں سے ایک میرا ہوتا، وہ سب سے چھوٹا، ننھا پیارا سا"

یہ کہہ، ٹم ٹم سے کود، دوڑ بچوں کے پاس پہونچ گئی، سب سے چھوٹے ننھے تواش کو گود میں لے لیا، اس کے خاک دھول میں اٹے ننگے بچے چہرہ اور گھونگر والے بالوں کو جوش محبت میں پیار کرنے لگی۔ بچہ کو یہ لپٹانا، پیار کرنا ایک مصیبت معلوم ہو رہی تھی جب وہ اس کی گرفت سے چھوٹنے کی کوشش کرتا اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے منہ کو ہٹاتا تو وہ اور بھی پیار کرنے لگتی، خوب پیار کر کے وہ ٹم ٹم میں بیٹھی اور چلی گئی۔

اگلے ہفتہ وہ پھر آئی، زمین پر بیٹھ گئی ننھے تواش کو گود میں اٹھا لیا، خوب کیک اور مٹھائیاں کھلائیں۔ دوسرے بچوں کو بھی بانٹیں، دیر تک ان کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتی رہی اس کا

شوہر صبر و سکون کے ساتھ ٹم ٹم میں منتظر بیٹھا رہا۔

وہ پھر آئی، ان کے والدین سے بھی ملاقات کی اب اس نے اپنا معمول بنا لیا، روز آتی جیبوں میں مٹھائیاں اور پیسے بھر لاتی بچوں کے ساتھ کھیلتی، مٹھائیاں کھلاتی پیسے بانٹتی اور چلی جاتی"

(۲)

اس کا نام مادام ڈہوبیر تھا۔

ایک صبح آئی، ساتھ میں اس کا شوہر موسیو ڈہوبیر بھی ٹم ٹم سے اتر آیا بچوں کی طرف رخ بھی نہیں کیا۔ دونوں سیدھے جھونپڑے کے اندر چلے گئے

تواشس میاں بیوی اندر ہی تھے جلانے کے لئے لکڑی چیر رہے تھے، ان کو آتا دیکھ کر متعجب کھڑے ہوگئے، جلدی سے ان کے پاس کرسیاں لاکر رکھیں اور انتظار کرنے لگے کہ کیا بات ہے۔

مادام نے گفتگو شروع کی، اس کی آواز کانپ رہی تھی، لفظ ٹکڑے ہو ہو کر نکل رہے تھے۔ اس نے کہا "میں آپ لوگوں سے ایک بات کہنے آئی ہوں، میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ...... کیا جی چاہتا ہے کہ اٹھالے جاؤں اپنے ساتھ لے جاؤں تمہارے .... کو...... تمہارے ننھے پیارے کو"

تواشس میاں بیوی حیرت زدہ، دم بخود کھڑے رہے۔ ان کے منہ سے ایک بول بھی نہ پھوٹ سکا۔

مادام نے ایک سانس بھری اور پھر کہنے لگی "ہمارے کوئی اولاد نہیں، ہم بالکل اکیلے ہیں، میں ہوں اور یہ میرا شوہر اور کوئی نہیں، ہم اس تمہارے ننھے کو گود لے لیں گے .... اگر تمہاری مرضی ہو تو!"

کسان کی بیوی کی اب سمجھ میں آیا "آپ شارلو کو ہم سے لے جانا چاہتی ہیں؟ آہ ایہ

کیسے ممکن ہے! ہرگز نہیں، یہ نہیں ہوسکتا!"

اب موسیو دہوبیر بیچ میں بولے "دیکھو بات سمجھ لو۔ میری بیوی نے بات کو ادا اچھی طرح نہیں کیا۔ ہم تمہارے شارلو کو گود لینا چاہتے ہیں، لیکن پھر وہ تم کو دیکھنے، تم سے ملنے بھی آئے گا۔ بڑا ہو کر اگر وہ اس لایق ہوا اور یقینی ہوگا تو ہم اسے اپنا وارث بنائیں گے، اگر خوش نصیبی سے ہمارے اولاد ہو گئی تو اس کے ساتھ برابر کا حقدار ہوگا لیکن اگر خدا نخواستہ نالایق نکل گیا تو ہم اس کے نام بیس ہزار فرانک لکھ دیں گے۔ یہی نہیں، ہمیں تمہارا بھی خیال ہے، تم کو بھی ہم سو فرانک ماہوار دیں گے اور تمام عمر دیتے رہیں گے، سمجھیں آپ؟"

عورت غصہ سے آگ ہو گئی۔

تم چاہتے ہو میں شارلو کو تمہارے ہاتھ بیچ دوں، آہ میرے اللہ! یہ ماں سے کہنے کی بات ہے! نہیں ہرگز نہیں! یہ پاپ ہے پاپ!"

کسان سوچ بچار میں خاموش کھڑا تھا، اب تو وہ بھی سر ہلانے لگا۔ ہاں ٹھیک کہتی ہے!"

دل شکستہ و مایوس مادام کے آنسو نکلنے لگے، اس نے شوہر کی طرف دیکھا، سسکیاں بھرنے لگی، کہنا چاہا مگر رونے سے آواز بندھی بندھی سی ہو گئی جیسی ضدی بچے کی جس کی ضد ہمیشہ پوری ہوتی ہوں اور اب بات ٹوٹ رہی ہو۔ "وہ نہ مانیں گے ہنری وہ نہ مانیں گے۔"

دونوں نے ایک آخری کوشش کی، "لیکن میری بہن ذرا اپنے بچے کے مستقبل کا بھی تو خیال کرو، اس کی آرام و آسائش، اس کی ......"

یہ سن کر کسان کی بیوی آپے سے باہر ہو گئی۔ خوب خیال کر لیا، خوب سوچ سمجھ لیا۔ بس تم لوگ چلے جاؤ، آئندہ اپنی صورت یہاں نہ دکھانا، خدا ہی سمجھے، یہ میرے بچے کو لے جانا چاہیں اور میں لے جانے دوں! ایسے بچے کو ....!"

باہر آنے پر مادام کو خیال آیا چھوٹے بچے تو دو ہیں۔ اسی رونے کی حالت میں کہنے لگی "لیکن دوسرا ننھا تو تمہارا نہیں ہے؟" اس کے لہجے سے بچے کی سی ضد اور ہٹ ٹپکتی تھی۔ ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بچپن ہی سے اس کی اٹھان بگڑ گئی ہو جیسے وہ صرف اپنی ہی راہ چلنا جانتی ہو۔
تو اسٹس بولا، "نہیں وہ ہمارے پڑوسی کا بچہ ہے تمہارا جی چاہے تو ان کے پاس جاؤ"
وہ اپنے جھونپڑے میں واپس چلا گیا۔ اس کی بیوی جوش غضب میں اب بھی بڑبڑا رہی تھی

(۳)

دلائیں میاں بیوی کھانے کی میز پر بیٹھے مزے مزے سے توس کھا رہے تھے بیچ میں مکھن کی پلیٹ رکھی تھی چھری پر مکھن لگا لگا کر توسوں کو ہلکا ہلکا کھرچتے جاتے۔

مادام دہوبیر نے اپنا سوال پیش کیا، لیکن پہلے کی طرح ڈھیلا سا نہ مارا بلکہ کم اختصار سے اور زیادہ موثر لہجہ و طرز ادا اختیار کیا۔

پہلے تو دونوں میاں بیوی نے انکار میں سر ہلا دیئے لیکن جب سنا کہ ان کو بھی سو فرانک ماہوار ملیں گے تو ذرا سوچ میں پڑ گئے ایک دوسرے کی طرف ششش و پنج کی حالت میں دیکھنے لگے، ان کے پہلے ارادہ میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ لیکن تذبذب کی الجھن میں دیر تک کچھ نہ کہہ سکے۔ بیوی نے اس خاموشی کو توڑا، "کہو صاحب تمہارا کیا خیال ہے ؟"

اس نے نہایت ہی سنجیدہ و فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا "میرا خیال ہے کہ یہ بات اس طرح ٹھکرائی نہیں جا سکتی"

مادام جواب کے انتظار میں بے چینی و بیتابی سے کانپ رہی تھی آسرا بندھتے ہی بچہ کی آرام و آسائش، اس کے مستقبل کے بن جانے کا ذکر کرنے لگی اور کہا کہ "وہ آگے چل کر جب روپیہ پیسہ ہو گا تو وہ تمہاری بھی مدد کر سکے گا"

کسان نے پوچھا "یہ بارہ سو فرانک سالانہ کے گذارہ کا وعدہ ایک قانونی گواہ کے سامنے ہو گا ؟"

موسیو دہوبیر بولے، "ہاں ہاں کیوں نہیں کل ہی !"

کسان کی بیوی اب تک غوطہ میں پڑی ہوئی تھی بولی، "لیکن سو فرانک ماہوار تو کافی نہیں

تھوڑے دن میں وہ بڑا ہو جائے گا، ہمارے ساتھ ساتھ کام کرنے لگے گا۔ اتنے میں ہم اپنے بچے کو نہیں دے سکتے! ہاں اگر ایک سو بیس فرانک ہوتے!

مادام بالکل بے صبر ہو رہی تھی، اس نے اس کو بھی فوراً منظور کر لیا، بچے کو وہ فوراً ہی لیجانا چاہتی تھی، سو فرانک بخشش کے طور پر اس کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ موسیو دھو بیر نے مسودہ تیار کیا، میئر اور ایک پڑوسی بلا آئے اور گواہ ہو گئے۔

نوجوان مادام خوشی سے پھول رہی تھی۔ بچہ کو لے کر عجیب عجیب آوازیں نکالتی بھاگی جیسے بچہ کو کوئی کھلونا مل جائے جس پر وہ عرصہ سے حسرت بھری نگاہیں جمائے ہوئے ہو۔

تواشں میاں بیوی چپ چاپ کھڑے ان کو جاتے دیکھتے رہے وہ شاید اب پچھتا رہے تھے کہ انھوں نے انکار کیوں کیا۔

(۴)

ننھا ژین دلائیں اس طرح رخصت ہو گیا۔ اس کے ماں باپ ہر ماہ موسیو دھو بیر کے وکیل سے روپیہ لینے جاتے، لیکن وہ اپنے پڑوسیوں سے سخت نالاں تھے، تواش کی بیوی نے انھیں خوب خوب رسوا کیا تھا ہر جگہ کہتی پھرتی "کیسی بے غیرتی ہے یہ؛ اپنا لڑکا بیچ دیا، خدا بچائے، کیسے ذلیل ہیں یہ لوگ!"

کبھی ننھے شارلو کو ٹھاٹھ باٹھ سے لیکر نکلتی کھلاتی جاتی اور کہتی جاتی "دیکھا تو نے، میں نے تجھے نہیں بیچا، میں اپنے ننھے پیارے کو نوچ بیچوں، میں اپنے بچے نہیں بیچا کرتی، کبھی نہیں، میں غریب سہی، لیکن اپنے بچے تو نہیں بیچ ڈالتی۔

سال بہ سال روز یہی ہوتا رہا۔ زور زور سے دلائیں ماں باپ پر آوازے کسے جاتے کہ ان کے کان تک پہونچیں۔ تواش ماں باپ نے یقین کر لیا کہ گرد و نواح میں مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں کیونکہ میں نے شارلو کو نہیں بیچا۔ لوگ اس کی باتیں کرتے، کہتے،" یہ ٹھیک ہے دل ضرور چاہا ہوگا، دل کس کا نہیں چاہ جاتا، لیکن اس نے وہی کیا جو ایک ماں کو کرنا چاہئے تھا، شاباش

ہے اس کو!"

لوگ اس کو مثال کی طرح پیش کرتے کہ ماں ہو تو ایسی ہو۔ شارلو اب اٹھارہ برس کا ہوگیا تھا اس کے دل و دماغ میں بھی ساری عمر یہ بات بیٹھی رہی اور یہی سمجھتا تھا کہ میں بھی سب سے بہتر ہوں کیوں کہ میری ماں نے مجھے نہیں بیچ دیا۔

دلائیں اپنے گذارے پر آرام و آسائش سے بسر اوقات کرتے۔ مگر تواش غریب کے غریب ہی رہے یہی وجہ تھی کہ ان کا گھر بھر ان سے جلتا اور ان پر غصہ اتارا کرتا تھا۔

دلائیں کا سب سے بڑا لڑکا فوجی تعلیم کے لئے چلا گیا، دوسرا مرگیا، شارلو تواش اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹانے، ماں باپ کی خدمت کرنے اور اپنی بہنوں کی پرورش کرنے کے لئے گھر پر ہی رہتا۔

(۵)

اب شارلو کوئی اکیس سال کا تھا۔

ایک صبح ایک خوبصورت خوش وضع ٹم ٹم جھونپڑوں کے سامنے آکر رکی، ایک نوجوان اس سے اترا، ساتھ میں ایک بوڑھی مادام کو بھی ہاتھ کا سہارا دے کر اتارا، نوجوان کی وضع قطع رئیسانہ تھی جیب سے سونے کی زنجیر لٹک رہی تھی۔ مادام کے بال بڑھاپے سے بالکل سفید ہو چکے تھے،

"وہ ہے وہ، میرے بچے! وہ دوسرا گھر!" بوڑھی مادام بولیں۔

اور وہ دلائیں کے جھونپڑے میں بے تکلفی سے گھس گیا، جیسے کہ وہ یہاں سے بخوبی واقف ہو بوڑھی ماں بیٹھی اپنے ایپرن (پیش بند) دھو رہی تھی۔ بوڑھا ضعیف باپ آتش دان کے پاس لیٹا سو رہا تھا۔ دونوں کی نظر اچانک اوپر اٹھی، نوجوان بیتابانہ کہنے لگا "میری ماں آداب عرض، میرے ابا آداب عرض!" بوڑھے ماں باپ ایک دم سے چونک پڑے، ماں کے ہاتھ سے صابون گر گیا۔ "ارے تو ہے میرے ژین! ارے تو ہے، تو ہی ہے!" نوجوان اپنی ماں کو لپٹائے ہوئے برابر کہہ رہا تھا،

میری اماں، میری اماں سلام سلام آداب آداب میری اماں"

بوڑھا باپ تن بدن سے کانپ رہا تھا لیکن حسب عادت سنجیدگی و متانت میں بل نہ آیا "تو میرے ڑین تم واپس آگئے" گویا ابھی گذشتہ ماہ ہی زین کو رخصت کیا تھا۔

خوشی سے وہ پھول رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر تنگ معلوم ہونے لگا۔ جی چاہا کہ ڑین کو باہر لیجائیں کہ پاس پڑوس میں لوگ اسے دیکھیں، فوراً ہی قصبہ کے میئر و پادری اور اسکول ماسٹر سے ملنے روانہ ہو گئے سنار ہونے اسے جاتے دیکھا۔

شام کو کھانے پر باپ سے کہنے لگا "تم نے یہ انتہائی حماقت کی کہ وہ ڑین کو لے گئے اور میں یونہی رہ گیا"۔

باپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس طرح بھینٹ چڑھ جانا قطعی برا نہیں ہے" تو اس نے جھنجلا کر کہا "کیا تم ہم کو جلانے اور گالیاں دینے پر تلے ہوئے ہو؟ .... اس بات پر کہ ہم نے تم کو اپنے سے جدا نہ کیا"

بیٹے نے نہایت بے دردی سے جواب دیا "ہاں میں تمہیں گالیاں ہی دے رہا ہوں تم لوگ بالکل گدھے ہو تمہارے ایسے ہی ماں باپ ہوتے ہیں جنکی اولاد کی ہمیشہ بلتے کٹتی ہے میں تم کو چھوڑتا ہوں تم لوگ اسی لائق ہو۔"

سیدھی سادی نیک بخت ماں اپنی شوربے کی پلیٹ سامنے رکھے رو رہی تھی، حلق میں اترتا ہوا شوربہ بھی لوٹ آیا۔ "پال پوس کر بڑا کرنے سے کیا حاصل؟"

بیٹے نے درشتی سے جواب دیا "میرا یہاں رہنا..... کاش میں پیدا ہی نہیں ہوا ہوتا، میں نے ابھی ڑین دلائیں کو دیکھا تو میرا خون کھول گیا، میں نے دل میں کہا یہ ہے جو آج میں ہوتا!"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہی بہتر ہے کہ میں اب ایک گھڑی نہ ٹھہروں، میں صبح سے شام تک تم کو گالیاں ہی دیتا رہوں گا تمہاری زندگی تم پر بار ہو جائے گی ...... تم جانتے ہو میں تم کو قطعی معاف نہیں کر سکتا؟"

بوڑھے ماں باپ روتے روتے بے دم ہو رہے تھے۔

"نہیں یہ خیال ہی میرے لئے ناقابل برداشت ہے، جہاں رہوں گا دو روٹی کما کھاؤں گا۔

اس نے دروازہ کھولا۔ باتیں کرنے کی آوازیں آئیں، دلائیں، ماں باپ اپنے بچے کے واپس آنے پر خوشیاں منا رہے تھے۔

ستارہ والدین کی طرف مڑا، زمین پر زور سے پیر پٹخا "کم بخت کہیں کے۔ بدنصیب!" اور رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ (راہ پسان)

چند افسانوں کی کتابیں

واردات:۔ منشی پریم چند آنجہانی کے جادو نگار قلم کے تیرہ تازہ ترین مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ یہ افسانے ہماری معاشرت اور سماج کی تصویریں ہیں جو افسانوں کی شکل میں منشی صاحب آنجہانی نے پیش کی ہیں۔ کاغذ، طباعت اعلیٰ تقریباً ۲۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد عہ ر

زادِ راہ:۔ از منشی پریم چند آنجہانی۔ یہ وہ افسانے ہیں جو منشی پریم چند نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں لکھے تھے۔ زادِ راہ منشی جی کے فنی کمالات کا آخری اور بہترین نمونہ ہے۔ قیمت مجلد عہ ر

چغتائی کے افسانے:۔ ملک کے مشہور مزاحیہ نگار مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کا ادبی شاہکار۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں افسانے اور دوسرے میں ذکاہات و مزاحیات۔ مزاحیہ ڈرامے طنزیات اور ادبیات درج ہیں۔ قیمت حصہ اول ۱۲ حصہ دوم ۱۲ مکمل سے ر

چاند کا گناہ:۔ از راجہ مہدی خاں۔ اس میں کل ۳۵ افسانے ہیں۔ دنیا کے نقادانِ ادب کے بہترین تسلیم شدہ افسانے ہیں جو اب تک اردو میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ ۲۲۵ صفحات مجلد عالر

پتھر سے ہیرا:۔ محبت کی ایک نگاہ ایک انسان کی زندگی میں کیسے کیسے انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور خونخوار وحشی درندوں کو کس آسانی سے رام کر سکتی ہے۔ یہ سچا افسانہ بتائے گا کہ دنیائے انسانی میں ایک عورت کی سچی ہمدردی اور محبت سے بھری گفتگو کیا کچھ جادو کر سکتی ہے۔ یہ قصہ یقین دلا دے گا کہ بچوں کی صحیح تربیت کا طریقہ کیا ہے۔ ایسا دلچسپ اور دلآویز کہ ختم کئے بغیر نہ چھوٹے گا۔ یہ ادبی رنگینیوں کا بھی بس ہیرا ہے۔ اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کے قلم کا ایک اچھا نمونہ ہے قیمت صرف ۱۲ر

مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ۔ دہلی

غزل

(حضرت فراق گورکھپوری)

اف تری پرسشِ کرم اف تری مہربانیاں
بڑھتی ہی جا رہی ہیں اب عشق کی بدگمانیاں

حسن کے اعتدال سے ملتی ہیں سب کی سرحدیں
اپنے حدود ہی میں ہیں بحر کی بیکرانیاں

زخمِ نہاں کا رنگ ہے عشق کے ہر نشاط میں
نشترِ نازِ حسن کی مٹ نہ سکیں نشانیاں

پوچھ نہ کس طرح اڑا رنگ سکوتِ سرمدی
آج سوالِ عشق پر حسن کی بے زبانیاں!

موج کو موج جانیے سطح پہ ہو کہ تہ نشیں
"عشق میں یونہی بے سکوں کٹتی ہیں زندگانیاں"

رنگ بہارِ زندگی خون کے آنسوؤں سے ہے
عشق کی گلفشانیاں عشق کی شادمانیاں!

رازِ نشاطِ بیکراں ایک جہاں سے کہہ گئیں
دردِ حیات کی طرح اٹھتی ہوئی جوانیاں

دیکھ یہ ربطِ حسن و عشق آگے کو گل کھلائیں کیا
کچھ مجھے بدگمانیاں کچھ تجھے بدگمانیاں

میرے سکوت پر نہ جا بدلا ہوا جہان دیکھ
آہ و فغاں سے کب ہوئیں عشق کی ترجمانیاں

عکس سا پڑ کے رہ گیا دل پہ تری نگاہ کا
یاد سی آ کے رہ گئیں بھولی ہوئی کہانیاں

رازِ حیات کہہ گئے عشق کے چند غم شناس
درسِ حیات دے گئیں حسن کی شادمانیاں

ابرِ سیاہ میں فراقؔ برق چمک کے رہ گئی
آج تو یاد آ گئیں حسن کی مہربانیاں

آئینۂ امروز

(شایق ہندو صاحب)

معنیٔ حسن سے محروم ہیں اقوام ابھی ہے نظر محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

حسنِ صورت ہے فقط مطمحِ اربابِ نظر کوئی سمجھا ہی نہیں معنیٔ اصنام ابھی

دور کیونکر نہ ہوں رندوں سے مقاماتِ سرور سنگ حائل ہے نشانِ قدح و جام ابھی

کارفرما ہے درخشندہ فلزات کی حرص گندم پختہ سے بہتر ہے زرِ خام ابھی

دیکھئے کیسے اٹھے روئے حقیقت سے نقاب عقلِ درّاک پہ ہے پردۂ اوہام ابھی

کہہ رہی ہے یہ جفا پیشگیٔ کرس و عقاب اہلِ یورپ میں ہے ہیجانِ دد و دام ابھی

فی الحقیقت یہ ہے تاراجیٔ چین کا راز خونِ جاپان میں ہے گرمیٔ بہرام ابھی

ہند کا حال گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ اور ہونے کو ہے کیا موردِ الزام ابھی

کیوں پریشاں نہ ہو شیرازۂ ناموسِ چمن نفسِ بادِ سحرگاہ ہے نمّام ابھی

ایسا آسان نہیں عرفانِ تمدّنِ ہندو
کچھ ریاض اور کرے مجلسِ اقوام ابھی

رفتارِ عالم

جرمنی نے ۱۰ مئی ۱۹۴۰ء کو ہالینڈ اور بلجیم پر حملہ کر دیا۔ ہمیں خیال تھا کہ لڑائی کے مسائل پر بیس برس تک غور کرنے کے اور فن جنگ میں طرح طرح کی نئی ایجادیں کرنے کے بعد انگلستان اور فرانس سے لڑنے کے لئے کوئی نیا محاذ تجویز کیا جائے گا۔ لیکن جرمنی نے اس مرتبہ وہی کیا جو کہ اگست ۱۹۱۴ء میں کیا تھا سوا اس کے کہ اس مرتبہ بلجیم کے ساتھ ایک اور چھوٹے غیر جانبدار ملک ہالینڈ پر بھی تباہی آئی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ انسان بہت کچھ ترقی کرنے کے بعد بھی عادت کا سہارا لئے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ اس وقت کا میدان جنگ بڑا تاریخی میدان جنگ ہے۔ جب سے فرانس اور جرمنی کا مقابلہ شروع ہوا ہے خواہ جرمنی کا نام مقدس رومی سلطنت ہو یا جیسا کہ اس وقت "تیسری سلطنت" ان دونوں کا مقابلہ اسی میدان میں ہوتا رہا۔ چونکہ ان دونوں کے مقابلہ میں انگلستان بھی اب فرانس کی طرف سے شریک ہے، میدان اور فوجی نقل و حرکت کی منزلِ مقصود میں کچھ تبدیلی ہو جانا چاہئے تھی۔ لیکن بظاہر وہی ۱۹۱۴ء کی کہانی سنائی جا رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب اسے ٹینک اور ہوائی جہاز سنا رہے ہیں۔

لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بات کو غلط سمجھے ہوں۔ جرمنی کا مقصد پیرس پر قبضہ کرنا نہ ہو اور وہ اس گمان میں نہ ہو کہ فرانسیسی دارالسلطنت پر قبضہ کرنے سے جنگ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اتحادیوں کے وزیر اعظم ہی نہیں بلکہ سپہ سالار بھی اس کا اعتراف کر چکے ہیں کہ ابھی تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جرمن سپہ سالار کیا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات سے اور بھی الجھن ہوتی ہے کہ جرمن جس طریقے پر لڑ رہے وہ بھی بہت نرالا ہے اور اسی وجہ سے ان کا مقابلہ کرنا دشوار ہو رہا ہے۔

۱۰ مئی ۱۹۴۰ء کو جرمن فوجوں نے ایک ہی وقت میں ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ کی سرحد کو پار کیا اور برابر آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ہالینڈ فتح ہو گیا۔ ۱۴ مئی ۱۹۴۰ء کو ان کا جو محاذ تھا اس کا مقام معلوم کرنے کے لئے نقشہ کو دیکھئے اور مون مدی (Montmedy) سے جہاں پر فرانس کی پکی ماژنیو لائن ختم

ہوتی ہے شمال کی طرف ایک لکیر ہیگ تک کھینچ دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ جنوب مغربی ہالینڈ میں دریائے
رائن نے جو جزیرے بنا دئیے ہیں۔ وہ لکیر کے باہر ہیں۔ ہالینڈ میں جرمنی کا آخری فوجی مقصد یہ تھا کہ جزیرے
بھی فتح کر لئے جائیں اسی کے ساتھ اینٹ ورپ برسلز اور شارل روا پر جرمن فوجیں بڑھیں اور ۱۸، ۱۹ مئی ۱۹۴۰ء
کو یہ تینوں شہر فتح ہو چکے تھے۔ اسی دوران میں جرمن فوجیں مون مدی کے شمال مغرب میں شہر سیدان کے
سامنے ماژنیو لائن کے اس حصے کو جو پچھلے سال دسمبر ۱۹۳۹ء میں تیار ہوا تھا اور کچھ بہت زیادہ مضبوط نہیں
ہے پار کیا اور اس طرف تیزی کے ساتھ پھیل پھیل کر بڑھنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ حصہ جو ان کے محاذ کی لکیر
میں ایک ذرا سا ابھار تھا قریب ۵۰ میل لمبا اور ۴۰ میل گہرا ہو گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ جرمن قریب ۴۰ میل
فرانس کے اندر بڑھ گئے تھے۔ اس محاذ کا آپ اندازہ کرنا چاہیں تو مون مدی سے لاؤن، لافیر، سینٹ کوئنٹن
اور لا کتو سے ہوتی ہوئی شمال کی طرف جو لکیر نقشہ میں جا رہی ہے اس کو دیکھ لیجئے۔ ۲۰ مئی تک بڑا سوال یہ
تھا کہ جرمن فوجیں اب کدھر کو جائیں گی۔ وہ دریائے اوآز اور دریائے آئن کی وادیوں سے بڑھ کر پیرس
کی طرف جا سکتی تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ فرانس کے اندر آگے نہ بڑھیں بلکہ سینٹ کومن سے بندرگاہ
سیکلے تک اپنا نیا محاذ بنائیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس محاذ پر جرمنی نے اپنی ساری پونجی لگا دی ہے۔ اس کی کامیابی کے
لئے ضروری ہے وہ اپنا مقصد جلد سے جلد حاصل کر لے لیکن مقابلہ سخت ہے اگرچہ اس کی لشکرکشی کا مقصد
اتحادیوں کی سمجھ میں نہیں آیا ہے اور جس طرح کہ چاہئے وہ اس کا توڑ نہیں کر سکے ہیں

۲۰ مئی ۱۹۴۰ء تک جو بیانات شائع ہوئے ان سے یہ خیال ہوتا تھا کہ فرانسیسی محاذ پر ٹینکوں اور
ہوائی جہازوں کی ایسی ریل پیل ہے کہ جرمن خود اپنا مقصد بھول جائیں اور ان کی فوج کے بہت سے
حصے گھر جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ برطانیہ کے ہوائی جہاز اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن متفرق طور
پر خاصا نقصان پہنچا رہے ہیں اگر ان کی نظر میں کوئی خاص مقصد ہوتا اور وہ اسے حاصل کرنے پر اس
طرح مامور کر دئیے جاتے جیسے کہ جرمن ہوائی جہاز تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ جرمن فوجوں کو روک نہ لیتے
لیکن ۲۰ مئی تک صورت یہ تھی کہ جرمن ہوائی جہاز ٹینکوں اور پیدل فوج کے ساتھ استعمال کئے جا رہے تھے۔

اور جرمن سپہ سالاروں کو بظاہر اس کی پروا نہ تھی کہ خاص مقصد حاصل کرنے میں ان کا کتنا نقصان ہوجاتا ہے۔ اس کے برخلاف اتحادیوں کی ہوائی طاقت صرف دشمن کے پٹرول کے ذخیروں میں آگ لگانے اور جگہ جگہ پر سڑکوں پلوں اور ریل کی پٹریوں کو اڑانے میں کام میں لائی جارہی تھی۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ ۲۰ مئی تک جرمن لشکر کشی کا خاص مقصد سمجھ میں نہیں آیا تھا ممکن ہے جرمن سپہ سالار یہ چاہتے ہوں کہ فرانسیسیوں کے دل میں پیرس اور انگریزوں کے دل میں کیلے کو بچانے کا خیال ڈال دیں اور اس طرح اس اتحاد عمل کو ختم کردیں جو دراصل جرمنی کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے لیکن یہ بہت موٹی سی بات ہے۔ جو اتحادیوں کے سپہ سالار ضرور سمجھ گئے ہوں گے اور اس چال کا وہ مناسب جواب ضرور دیں گے۔ ۲۰ مئی ۱۹۴۰ء تک بلجیم میں انگریزی فوجیں پیچھے کی طرف ہٹ رہی تھیں اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ کسی جگہ پر مورچہ بندی کرکے جرمن فوجوں کو روکا جائے گا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ مورچہ بندی ماژینو لائن کے اس حصہ میں کی جائے گی جو بلجیم کی سرحد کے ساتھ ساتھ سمندر تک جاتا ہے یا اس کے آگے یا پیچھے ۲۲ مئی کو جو خبریں آئیں وہ بہت ہی دہشت انگیز تھیں فرانس کے وزیر اعظم کی زبانی معلوم ہوا کہ دریائے میوز کی وادی میں یعنی جہاں پر جرمن فوجیں پہلے اندر گھسی تھیں، فرانسیسی فوج منتشر تھی اور وہ پسپا ہوتے وقت پلوں کو توڑنا بھول گئی۔ اس طرح جرمن فوجوں کے لئے آگے بڑھنا بہت آسان ہوگیا، اور وہ جنگ کے اس نئے طریقے کو پوری طرح برت سکیں جس پر ان کا بھروسا ہے۔ نیا طریقہ یہ ہے کہ پہلے نیچے نیچے ٹینک اور اوپر ہوائی جہاز آگے بڑھتے ہیں اور ان کے پیچھے مسلح موٹروں پر سپاہی بھیجے جاتے ہیں تاکہ وہ ان مقاموں پر قبضہ کرلیں جہاں سے دشمن ہٹا دئے گئے ہوں۔ جرمن فوج اس قسم کے حملے اندھادھند کرتی رہی، کہیں پر اسے روک لیا گیا کہیں وہ فرانسیسی محاذ کو توڑ کر نکل گئی۔ جہاں وہ نکل گئی وہاں وہ بے دھڑک آگے بڑھتی رہی اور اس کی پرواہ نہ کی کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ دریائے آئن پر فرانسیسیوں نے جرمن حملے کو روک لیا ہی لیکن اس کے شمال مغرب یعنی دریائے اوآز کی وادی میں وہ اسے نہیں روک سکی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن آمیاں اور شاید آب ول تک بڑھ گئے ہیں۔ یہ حملہ آور فوج کے الگ حصے ہیں۔ انھیں

سمجھئے دریائے آئن سے شمالی سمندر تک جو وسیع علاقہ ہے اس میں دوڑا دیا گیا ہے کہ جو کچھ کر سکو کرو
ان حملہ آوروں میں سے بعض موٹر سائیکلوں پر سوار ہیں، بعض مسلح لاریوں پر بعض ٹینکوں پر کہیں کہیں
یہ حملہ آور ہوائی جہاز سے ٹپکا دیے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس تمام علاقہ میں ایک طوفان برپا ہے
ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس پر جرمنی کا قبضہ ہے، اس لئے کہ جرمن فوجیں اپنے حملہ آور گروہوں سے
بہت پیچھے ہیں، لیکن اس پر فرانسیسیوں کا قبضہ اسی وقت ہو سکے گا اور یہاں جرمن فوجوں کا مقابلہ
اسی وقت کیا جا سکے گا جب حملہ آوروں کے گروہ چن چن کر ختم کر دیے جائیں۔

جنگ کے اس انوکھے طریقے نے سپہ سالاروں کو پریشان کر دیا ہے، اس لئے کہ جنگ کا
کوئی محاذ جم کر مقابلہ کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ اخباروں کے نامہ نگار بھی بہت پریشان ہیں، اس
لئے کہ وہ صحیح حالات معلوم نہیں کر سکتے۔ لیکن ایک بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ پچھلی جنگ
کی طرح اس مرتبہ فوجیں خندق کھود کر بیٹھ نہ پائیں گی۔ لڑائی ہر طرف ہر طرح کی ہوگی اور بے پناہ ہوگی

جس وقت سے کہ جرمنی نے ہالینڈ اور بلجیم پر حملہ کیا۔ اٹلی کا انداز جو پہلے بھی دوستانہ نہیں تھا۔ بدتر
ہو گیا۔ بحر روم میں انگریزی بیڑا پہلے ہی بھیجدیا گیا تھا۔ اور مصر فلسطین اور شام میں انگریزی اور فرانسیسی
فوجیں اس تعداد میں اور اتنے سامان کے ساتھ موجود ہیں کہ اٹلی کا ادھر کوئی کارروائی کرنا بڑی حماقت
ہوگی۔ اٹلی کا مقام اور قدرتی ساخت دیکھتے ہوئے کوئی عقل مندی کی بات نہ ہوگی اگر وہ فرانس اور برطانیہ
کی ہوائی اور بحری طاقت کا مقابلہ کرے۔ اس لئے کہ اس پر ہر جگہ اور ہر طرف سے حملہ کیا جا سکتا
ہے۔ اور اگرچہ اسے اپنے ہوائی جہازوں پر بڑا ناز ہے ہمیں یہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ وہ
اپنے ساحل کو اور ساحل کے قریب کے شہروں کو محفوظ رکھ سکے گا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ برطانیہ
اور فرانس کی اس وقت کی پریشانی سے فائدہ اٹھا کر ان سے کچھ سودا کرنا چاہتا ہے یعنی جرمنی کا ساتھ
چھوڑنے کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ اتحادی اٹلی والوں کی خصلت سے خوب
واقف ہیں اور وہ اس وقت ہرگز کوئی سودا نہ کریں گے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو خاص فکر اس کی ہے اگر بحر روم میں لڑائی چھڑ گئی تو ترک کیا کریں گے؟

ترکوں کا اتحادیوں سے معاہدہ ہے۔ لیکن اس معاہدہ کی ایک یہ شرط ہے کہ ترکوں سے روسیوں کے خلاف لڑنے کو نہیں کہا جائے گا۔ اٹلی اور روس کے درمیان کوئی خفیہ معاہدہ ہو تو ہو بظاہر روس پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ اگر اٹلی بحر روم میں کسی فریق سے لڑائی چھیڑے تو روس اٹلی کی مدد کو پہنچے گا۔ جرمنی جب تک اپنے مغربی محاذ پر مصروف ہے وہ بحر روم میں اٹلی کی سیاست کو کچھ زیادہ سہارا نہیں دے سکتا۔ اس لئے اگر اس وقت اٹلی لڑے گا تو وہ تن تنہا لڑے گا اور اس صورت میں ترک اپنی مصلحت سے لڑائی میں شریک بھی ہوئے تو ان کے لئے کوئی خاص خطرہ نہیں ہے۔

روس کے متعلق خبر آئی تھی کہ وہ جرمنی کی کامیابیوں سے چوکنا ہو گیا ہے اور کوئی تعجب نہ ہوگا اگر وہ یورپ میں توازن قوت قائم رکھنے کے لئے اب جرمنی کا ساتھ چھوڑ دے لیکن ایسی خبریں پہلے بھی آچکی ہیں۔ روس کے لئے بے شک یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی کہ جرمنی جیسے بے چین اور اولوالعزم ملک کا مغرب میں ناروے، ڈین مارک، ہالینڈ اور بلجیم پر اور مشرق میں آدھے پولینڈ پر قبضہ ہو جائے شمال میں سویڈن اور جنوب میں بلقان کے ملکوں پر اس کی سیاست حاوی ہو جائے لیکن فی الحال روس کے لئے جرمنی کا ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ جرمنی نے اپنی تمام کارروائیوں میں روس کو شریک کر رکھا ہے اور جرمنی کے سوا اس سے بات کرنے والا کوئی نہیں ہے اگر وہ جرمنی کی مخالفت بھی کرنا چاہے تو زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتا تھا کہ جرمنی کو جس خام مال کی ضرورت ہے اسے پہنچانے میں بہانے کرے یا دیر لگائے لیکن یہ چال بھی آزادی کے ساتھ نہیں چلی جا سکتی۔ اس لئے کہ بہت سے بڑے کارخانوں اور پیٹرول کے بڑے کنوؤں پر جرمن انجینیر اور ماہر مسلط ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ روسی حکومت کا کوئی ارادہ عمل میں آئے اور انھیں اس کی خبر نہ ہو۔

اتحادیوں کا پلہ بھاری کرنے کے لئے دراصل روس کی شرکت کچھ اتنی ضروری نہیں۔ جتنی کہ امریکہ کی۔ امریکہ میں ایک بہت بڑی اور مضبوط پارٹی ہے جو اس پر تلی ہوئی ہے کہ امریکہ یورپ کے سیاسی جھگڑوں سے علیحدہ رہے۔ اس پالیسی پر عمل کرنے میں یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ امریکہ یورپ کی لڑائیوں سے بچا رہتا ہے۔ اس میں ایک فائدہ بھی ہے کہ امریکہ کی تجارت کو بہت ترقی

ہوئی ہے اور تجارت بھی انھیں قوموں سے بڑھی ہے۔ جو نقد قیمت دے سکتی ہیں، لیکن جب سے جرمنی نے ہالینڈ اور بلجیم پر حملہ کیا ہے۔ وہ امریکہ والوں کی نظروں میں بہت گر گیا ہے۔ اور کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے ہیں کہ وہ لوگ جو ہر حالت میں امریکہ کو یورپ کی سیاست سے علیحدہ نہیں رکھنا چاہتے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت امریکہ کے علیحدہ رہنے سے صرف آزادی اور جمہوریت کے اصولوں کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ امریکہ کی تجارت بھی نقصان اٹھا رہی ہے امریکہ کو جنگ میں شریک کرنے کے لئے اتنی سی بات کافی نہیں ہے لیکن سیاست اور تجارت میں ذرا سی بات بہت بڑھ جایا کرتی ہے۔

انگلستان
بحر شمال
ہالینڈ
دریائے رہائن
انگلستان
بلجیم
جرمن محاذ
جرمنی
لکسمبرگ
میل

بین الاقوامی سیاست

چرچل

اسٹالین

بلقان

مسولینی

ہٹلر

دُنیائے ادب
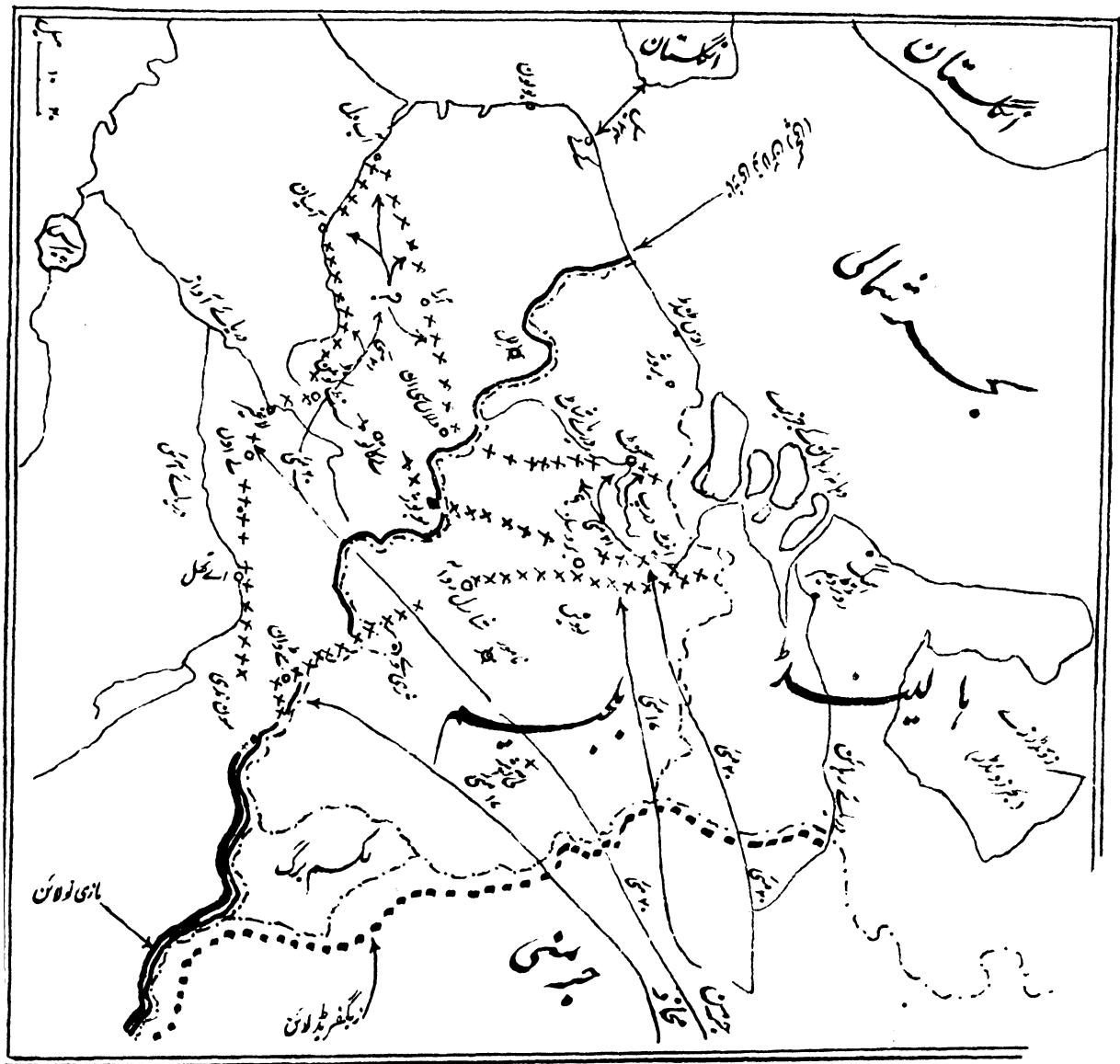
قومی زبان — ہندستانی، اردو یا ہندی

مندرجہ بالا عنوان سے اپریل سنہ ۴۲ء کے ماڈرن ریویو میں پروفیسر مرلی دھر ایم۔اے کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ سرخی دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک موقر رسالے میں اور بظاہر ایک موقر اہل قلم نے اس سلسلے میں یقیناً کچھ مفید اور کار آمد خیالات کا اظہار کیا گیا ہوگا۔ لیکن مفہوم پڑھ کر بے حد مایوسی ہوئی۔

مضمون نگار نے سب سے پہلے تو رسم الخط کا مسئلہ چھیڑا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ کہ جب تک سارے ملک میں ایک رسم الخط رائج نہ ہو جائے، کوئی قومی زبان بنانے یا پیدا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ زبان اور رسم الخط میں کچھ ایسا مقناطیسی تعلق ہے کہ ایک مخصوص رسم الخط کو قائم رکھ کر صرف اسی زبان کو استعمال کیا جا سکتا ہے جو زمانہ نے اس کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ خیال بہت بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن ہندوستان میں آج کل جتنی زبانیں رائج ہیں ان میں اردو سے زیادہ لچک کسی اور میں نہیں، نئی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ چلنے کی صلاحیت اردو میں کتنی زیادہ ہے، اس کا اندازہ اس کی مختصر سی زندگی کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اب سے سو برس پہلے کی رجب علی بیگ کی شاعرانہ زبان اس زمانہ کے لئے موزوں تھی۔ سر سید کے زمانہ کو ایک سیدھی سادی زبان کی ضرورت تھی، جو عام فہم بھی ہو اور جس میں شگفتگی اور روانی کے ساتھ ساتھ بدگمان اور گم کردہ راہ مسلمانوں کو قائل کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ جو آسان بھی ہو اور مدلل بھی، ادبی بھی اور کاروباری بھی۔ اردو ہی میں یہ صلاحیت تھی کہ زمانہ کی پسند اور ضرورت کو دیکھ کر اس نے وہ بوجھل اور پر تکلف لباس اتار پھینکا اور اس کی جگہ بالکل سادہ اور بے تکلف لباس زیب تن کر لیا اور اس کے باوجود بھی اس کی جامہ زیبی ملاحظہ ہو کہ اس نئے لباس میں بھی اس کی پھبن کم ہونے کی جگہ زیادہ ہو گئی۔ جس نے دیکھا وہ فریفتہ ہوا جس نے سنا وجد کیا۔ اب ایسی زبان کے متعلق یہ کہنا کہ رسم الخط کی پابندی کی وجہ سے اس میں زمانہ کی ضرورت کے

مطابق تبدیلی یا ترقی کی گنجائش نہیں، محض نادانی اور ناواقفیت کی دلیل ہے۔

اردو شاعری اور ادب سے مضمون نگار کو کتنا مس اور تعلق ہے اس کا اندازہ خود اسی کی کہی ہوئی باتوں کو سن کر کیجئے۔ مضمون کے درمیانی حصہ میں لکھا ہے:۔

"ادبی دنیا میں اردو کا کیا کارنامہ ہے اور تعلیمی دنیا میں اس نے کیا اضافہ کیا ہے؟ اس میں شاعر اتنے ہیں جتنے کہکشاں میں تارے۔ لیکن ان میں سے کسی میں بھی چمک نہیں۔ اور جس میں تھوڑی بہت چمک ہے وہ ہم تک اس لئے نہیں پہنچتی کہ ایک مشکل زبان ہمارے اور ان کے درمیان حائل ہے اس نے تعلیم کو ترقی دینے کی جگہ اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں......... غزلوں اور دوسری بعض فضول اصناف سخن کے سوا اس کے پاس اور کچھ نہیں۔ اس کی عشقیہ شاعری میں کچھ شیرینی ہے، لیکن یہ ہمارے سامنے کوئی بلند چیز پیش نہیں کرتی۔ اس کے سامنے کوئی بلند مقصد نہیں، وہ امید کا کوئی پیغام ہم تک نہیں پہنچاتی۔ یہ ہمارے دلوں میں ملک کی محبت اور قربانی کا جذبہ نہیں پیدا کرتی، فطرت یا زندگی سے اسے ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ اس میں کوئی رزمیہ چیز نہیں اس نے اب تک ڈرامہ نہیں پیدا کیا۔

"فطرتاً اردو میں ترقی کرنے یا مفید چیزیں پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس لئے اپنے خیالات ہندوستان کی سرزمین سے نہیں لیتی"

ہمیں ان میں سے کسی بات پر ذرا بھی اعتراض نہ ہوتا۔ اگر یہ خیالات کسی ایسے پرچے میں نکلتے جو ادبی ایمانداری کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہم ان سب باتوں کو سن کر خاموش ہو جاتے اگر یہ خیالات کسی ایسے شخص نے پیش کئے ہوتے جسے آسانی سے بے بہرہ، کہا جا سکتا۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ادبی ذمہ داری محسوس کرنے والے ایسی باتوں پر قلم ہی کیوں اٹھاتے ہیں جن کا انھیں علم نہیں۔ اردو میں حیات اور امید کا کوئی پیغام ہے یا نہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اقبالؔ کا ہی مطالعہ کافی ہے۔ وہ ہماری روح کو کیا ابدی پیغام دیتا ہے، وہ ہماری زندگی کو کس طرح بلندی کی طرف مائل کرتا ہے، وہ ہمیں ملک اور قوم کی

محبت کا سبق کس طرح پڑھاتا ہے۔ اس کی شاعری زندگی کو کیا سمجھتی ہے اور مردہ دلوں کو کس طرح زندگی کے قریب لاتی ہے اس کا اندازہ صرف اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو ان چیزوں کو صرف نکتہ چینی کے خیال سے نہیں بلکہ ایک صحیح طالب علم کی طرح پڑھے۔ ہمارے موجودہ شاعروں اور نثاروں میں ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں ایسے ہیں جن کی شاعری کا سرچشمہ حیات انسانی کی کشمکش اور ہندوستانی زندگی کی رومانی، سیاسی، سماجی کیفیتیں اور حالتیں ہیں ضرورت تو صرف جستجو کرنے والی نظر کی ہے۔ اقبال کو چھوڑ کر جوش ملیح آبادی، احسان دانش حفیظ جالندھری، ساغر، روش، اندرجیت، قیس، حفیظ ہوشیارپوری وغیرہ کے کلام اور نثر لکھنے والوں میں منشی پریم چند، سدرشن، ڈاکٹر اعظم، علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، کرشن چندر ایم اے، اختر انصاری، اختر رائے پوری کے افسانے اور ناول اردو کے اتھاہ خزانے ہیں سے صرف تھوڑے سے ایسے نمونے ہیں جن میں قدم قدم زندگی اور اسکی تمام کیفیات آئینہ کی طرح جھلکتی نظر آتی ہیں۔ نہ دیکھ سکنا چیزوں کے نہ ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔

اور آگے چل کر مضمون نگار نے لکھا ہے: "کچھ عرصہ سے اردو نظم و نثر پر بیرونی اثرات اس قدر غالب آ گئے ہیں کہ اچھی فارسی اور تھوڑی بہت عربی جانے بغیر ان کا سمجھنا غیر ممکن ہے۔"

اس قسم کی کوئی بات کہنے کا مطلب بھی بیگانگی کے سوا کچھ نہیں اس لئے کہ ہمارے موجودہ نثار عام طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی زبان کو زیادہ سے زیادہ عام فہم بنائیں۔

مضمون میں اور آگے چلکر مضمون نگار نے ہندی کو الفاظ کا ایک بے معنی اور بے اثر ذخیرہ کہکر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان نہ اردو ہو سکتی ہے نہ ہندی اور نہ ہندوستانی سوال یہ ہے کہ پھر کیا کوئی آسمانی زبان آکر اس جھگڑے کو چکائیگی

کچھ ادبی خبریں: ہندی۔ حال ہی میں "موجودہ ہندی ادب" کے عنوان سے انگریزی میں ڈاکٹر اندرناتھ مدن کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے موجودہ ہندی ادب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

سندھی: سندھ گورنمنٹ نے حال ہی میں ایک تعلیمی بورڈ بنایا ہے جس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ سندھی زبان میں ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کروائے۔ اس کے علاوہ ادب کی ایک تاریخ اور بچوں کے لئے درسی کتابیں تیار کرنے کا کام بھی اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ (و-ع)

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

آزادی کی نظمیں، مرتبہ سبط حسن صاحب، حلقۂ ادب، ہال روڈ، لکھنؤ۔ قیمت عہ

ہندوستان کے موجودہ رنگ کا یہ تقاضا تھا کہ اس قسم کی نظمیں اور ادب یکجا ہو جائے جو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ ہو۔ یہ تقاضا ضرورت کی حد تک پہونچ گیا تھا چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایما پر نئے ادب والوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور جلد از جلد ختم بھی کر دیا۔

شروع میں رفیع احمد صاحب قدوائی کا مختصر تعارف ہے جس میں موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ آزادی ضرورتوں کے محسوس کرنے کا نام ہے۔ انھی ضرورتوں کا احساس جب سے شدت پکڑ گیا ہے شعر و ادب میں اس کا اظہار ہوتے لگا ہے۔

اردو شاعری میں یہ احساس غدر کے زمانے سے شروع ہوا اور مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا۔ کہیں نالے رہے کہیں فریاد کہیں محض شکوہ و شکایت، کہیں محض گداگری۔ موجودہ دور کے آزادی کے تخیل میں جرأت رندانہ بھی شامل ہے۔ کتاب میں ہر دور کے نمونے تاریخی تسلسل کیساتھ دئے ہیں کتاب اس لحاظ سے بھی خوب ہے کہ ادب و زندگی کے رشتہ کو واضح کرتی ہے۔

غدر کے زمانہ میں جو محکومی، مظلومی اور پابندی کا احساس ہو چلا تھا وہ تقریباً اس دور کے ہر مشہور شاعر کے کلام میں نکالا جا سکتا ہے۔ غالب، ظفر، مومن، (باستثنائے ذوق) ہر ایک کے کلام میں کچھ نہ کچھ اس کا رنگ موجود ہے۔ غالب کا ایک قطعہ مرتب صاحب نے بھی دیا ہے۔ جس میں ایک نجی خط میں انگریزوں کے خلاف شکوہ و شکایت ہے۔ مومن میں مذہبیت زیادہ تھی اس لئے وہ اکثر و بیشتر جہاد کرنے پر نظر آتے ہیں

پلا مجکو ساقی شراب طہور کہ اعضا شکن ہے خمار فجور

کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا | کہ آ جائے بس نشہ اسلام کا
عناد نہفتہ کو ظاہر کروں | دم تیغ سے قتل کا فر کروں
پلے تشنہ کامی سبو در سبو | پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو
یہی اب تو کچھ آ گیا ہے خیال | کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

اور یہ گردن کش کون تھے ان کا حال فارسی کے قصیدہ میں سن لیجئے۔

ایں عیسویاں بلب رسانند | جانِ من و جانِ آفرینش
تا چند بہ خواب ناز باشی | فارغ ز فغانِ آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست | اے فتنہ نشانِ آفرینش

ظفر کے یہاں یہی چیز عبرت و نالہ کے مضامین میں بندھی ہے ان میں زیادہ صاف کہنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے | شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے
جہاں چٹیل ہے میداں اور سراسر ایک خارستاں | کبھی یاں قصر و ایواں تھے چمن تھے اور شجر یاں تھے

کتاب چونکہ بہت عجلت میں ترتیب دی گئی ہے جیسا کہ مرتب خود اعتراف کرتے ہیں اس لئے زیادہ توجہ نہ دی جا سکی مگر پھر بھی کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے خوب ہے۔ مختصر اور جامع ورنہ ایسے تو یہ مضمون ہی ایسا ہے کہ ریسرچ کے ذریعہ اس کو مکمل کیا جائے۔

محامد الخلفاء، مرتبہ حافظ اخلاق احمد صدیقی و سجاد حسین صدیقی اکبرآبادی چھوٹی تقطیع تقریباً ۸۴ صفحات کتابت و طباعت عمدہ۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ قیمت ۸ر مجلد ۱۲ر۔ اس میں نظماً و نثراً خلفاء اربعہ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ زبان اچھی ہے۔ اور عوام کے لئے دلچسپ ہے۔ روایات کے انتخابات بھی خوب ہیں۔ آخر میں بعض علما مثلاً مولوی احمد سعید صاحب دہلوی اور پروفیسر سعید احمد صبا اکبرآبادی وغیرہ کی تقریظیں درج کیگئی ہیں

رسالہ جات

سہیل (گیا) خاص نمبر۔ بڑے اہتمام اور آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ اچھے اچھے مضامین، افسانے نظمیں، و غزلیں جمع کی ہیں۔ جس میں خاص کر طلسم ہوش ربا، فردوسی و اسدی، مسلمانوں کے زمانہ

ہیں ہندوستان کا نظام تعلیم اچھے مقالے ہیں۔ ایک خاص نقص اشتہارات کا ہے اور یہ صرف سہیل ہی میں نہیں بلکہ اردو کے اکثر بلند پایہ رسالوں اور اخباروں میں پایا جاتا ہے وہ فحش اشتہارات ہیں۔ نہیں معلوم اردو صحافت اس سے کب پاک ہو سکے گی

نیرنگ خیال (سالنامہ) پرانی آب و تاب سے نکلا ہے لیکن اکثر مضامین اس کے لئے پہلے کی طرح خاص کر نہیں لکھے گئے ہیں مگر انتخاب اچھا ہے۔ تصاویر دلچسپ ہیں۔ اشتہاروں میں وہی بد مذاقی یہاں بھی ہے جو سہیل میں ہے۔ قیمت عہ

نظام ادب :۔ طلبائے نظام کالج حیدر آباد دکن کا بہت شائستہ پرچہ ہے۔ بہت اچھے اچھے مضامین ہیں مثلاً دلی کی بیگمات، ڈاک کے ٹکٹوں کا ذخیرہ، ہندوستانی تہذیب پر اسلامی حکومت کا اثر، ہندوستان کی صنعتی ترقی کے ذرائع۔ جامعات و مسئلہ بے روزگاری، فسطائیت مسئلہ ناخواندگی اور ہندوستان وغیرہ خصوصاً بہت مفید اور بہت خوب مضامین ہیں، کتابت و طباعت بہت اچھی ہے قیمت عہ فی پرچہ ششماہی نکلتا ہے

میل ملاپ :۔ بانکی پور پٹنہ کی تھیاسوفیکل سوسائٹی نے ہندو مسلمانوں میں میل ملاپ پیدا کرنے کے خیال سے یہ رسالہ نومبر ۱۹۳۱ء سے نکالنا شروع کیا ہے رسالہ کا نصف حصہ اردو میں ہوتا ہے نصف ہندی میں۔ خیال اور جذبہ دونوں نہایت خوب ہیں۔ سب سے بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ بالکل بے تعصب ہے مضامین ایسے رکھے جاتے ہیں جو میل ملاپ کے خیال کو ابھاریں۔ اگر زبان بھی جو دونوں حصوں میں استعمال ہوتی ہے ایک ہوتی تو خوب ہوتا۔ ظاہری خوبیوں کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے قیمت سالانہ عاہ

ہمارا استقبل :۔ مسلم لیگ نقطۂ نظر کا ماہوار رسالہ ہے۔ لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا ہے مضامین بہت اچھے ہیں۔ خدا کرے جاری رہے۔ قیمت سالانہ ۔ے ر

جدید اردو :۔ کلکتہ سے نکلتا ہے۔ ماہواری رسالہ ہے۔ مشرقی ہندوستان سے جتنے رسالے نکلتے ہیں ان میں یہ خوب ہے۔ خدا اسے ترقی دے۔ قیمت سالانہ عاہ

تعلیم بالغان اور خطبہ جمعہ

(سید مہدی حسن صاحب)

آج کل تعلیم بالغان کا بہت زور ہے اور یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمدردان قوم کو اپنی قوم کی تعلیم کا خیال آیا اور خیال کے ساتھ خوش قسمتی سے اس پر عمل بھی شروع ہوا۔ ہندوستان میں جہاں تعلیم اس قدر کم ہے اس قسم کی اصلاح نہایت خوش آئند مستقبل کی امید و توقع دلاتی ہے۔ خدا کرے یہ ذوق شوق اسی زور و شور کے ساتھ آئندہ بھی باقی رہے۔

جہاں تک مسلمانوں کی تعلیم کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ نادار ہونے کی وجہ سے ان کو بہت کم ایسے مواقع تھے اور ہیں جن سے وہ اپنے کو تعلیم یافتہ بنا سکیں۔ گذشتہ میں تو ہر نئی تعلیم کی طرف مسلمانوں میں ایسی بےحسی رہی کہ دوسری قومیں ان سے آگے بڑھ گئیں اور ان کے آنکھوں پر سے پردے ہی نہیں اٹھے۔ اب جب کہ ان میں کچھ کچھ بیداری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں موقع ہے کہ ان کی اس بیداری یا نیم بیداری سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کو اس راستے پر گامزن کیا جائے جو ان کے لئے مفید ہے۔

تعلیم بالغان کا مقصد ایک تو ناخواندہ کو خواندہ بنانا ہے دوسرے خواندہ کو تعلیم یافتہ۔ تعلیم کے ضمن میں مختلف قسم کی معلومات آتی ہیں اور ساتھ ہی بہتر شائستگی اور بہتر اخلاق کی ہدایات اور اسباق۔ مسلمانوں کے عوام کو اخلاق و شائستگی میں بھی درس دینے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ان کے معلومات میں اضافہ کرانا بھی ہر ہمدرد مسلمان کا فرض ہو سکتا ہے۔

جہاں تک خطبہ جمعہ کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر موقعہ اور جگہ عوام مسلمانوں کی تعلیم و تلقین کے لئے نہیں ہو سکتی۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ان کو خطبہ میں ایک لمبا چوڑا وعظ سنا دیا جائے بلکہ یہ خطبۂ تعلیم اتنا ہی مختصر ہو جتنا کہ خطبہ عموماً ہوا کرتا ہے تاکہ بہت سے کاروبا

مسلمانوں کا کام حرج نہ ہو۔

رہا یہ امر کہ کیا باتیں بیان کی جائیں اور سمجھائی جائیں۔ میری رائے میں وہ سب کچھ ہوں لیکن سیاسی نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو کسی پارٹی کا پروپگنڈا یا کسی پارٹی کی طرف سے نہ ہوں کیونکہ اس طرح سے مسجد میں بدامنی پھیل جائے گی اور اس صورت سے تعلیم کا مقصد ہرگز ہرگز حل نہیں ہوگا اول کوشش تو یہی کی جائے کہ مسلمانوں کو بہتر اخلاق اور بہتر شائستگی کی تعلیم دی جائے۔ ان کی بری باتوں اور بری عادتوں کی طرف توجہ دلائی جائے کہ وہ انھیں چھوڑیں مثلاً جوا کھیلنا، فحش گالیاں بکنا جو عوام جاہل مسلمانوں میں عام ہے وغیرہ وغیرہ اور ساتھ ہی انھیں اپنی خودی کی پرورش اور جوش و شجاعت کی مزید تلقین، اقتصادی پختگی کی تعلیم اور ہدایات، قوم و جماعت کی خاطر جان و مال سے امداد دینے کا وطیرہ، ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ اب پل بنانا، چاہ بنانا، مسجد و تالاب بنانا، پر اپنا روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تو اب گورنمنٹ کا فرض ہے بلکہ اپنی قوم کے لئے تعلیم گاہیں مسافر خانے تبلیغی انجمنیں وغیرہ بنانے کا کام ثواب کا کام اور اپنی قوم کو فائدہ پہنچانے کا کام ہے۔

ایک بڑی دشواری جو ابھی تک اس قسم کی تعلیم دینے میں صدیوں سے اب تک حارج رہی ہے وہ خطبے کا عربی زبان میں ہونا ہے۔ پہلے تو اسی نقص کو دور کرنا چاہئے۔ درحقیقت یہ ایک نقص نہیں ہے اس صورت سے کہ اس سے کم از کم مسلمانوں میں اپنی چیزوں سے جذبہ عقیدت تو قائم رہتا ہے اور وہ اگر آگے نہیں بڑھتے تو پیچھے بھی نہیں ہٹتے۔ لیکن یہ نقص ان معنوں میں ضرور ہے کہ اس سے مسلمان آگے نہیں بڑھ پاتے اور یہ بہت بڑا نقصان ہے عربی زبان متبرک یقینی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جمعہ کے خطبے بھی اسی زبان میں ہوں۔ جمعہ کے خطبے دراصل جاہل یا نیم تعلیم یافتہ یا کم سمجھ مسلمانوں کو تعلیم دینے اور ان کو اچھی بری بات بتلانے کے لئے ہوا کرتے تھے تاکہ وہ خدا اور رسول کی بتائی ہوئی باتوں یعنی صحیح راستوں پر چل کر دنیا کی قوموں میں ممتاز ہو سکیں لیکن ہندوستان میں یہی خطبے عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے کسی فائدے کے نہیں رہے۔ ہم محض رٹا خطبوں کو سن لیتے ہیں خواہ وہ جمعے

سکے ہوں یا عیدین کے۔ اور دل کو یہ تسلی دے کر اُٹھتے ہیں کہ ہم نے خطبہ سُن لیا ثواب مل گیا کافی ہے۔ حالانکہ یہ خطبے تو عرب میں اور عربی زبان میں دنیاوی فائدوں اور دنیا میں صحیح راستہ صراط مستقیم کی غرض و غایت سے سنائے جاتے تھے۔ نیز روحانی فائدہ بھی اگر مدنظر ہو تو اس صورت میں بھی تاہیں ان کا سمجھنا ضروری ہے ورنہ کیا معلوم ہو گا کہ ہم کو کیا روحانی فائدہ ہوا۔ بغیر سمجھے تو محض ایک دل کو دھوکا دینا ہوتا ہے کہ ہم سمجھ گئے اور ہم کو فائدہ اور ثواب حاصل ہو گیا۔ غرضکہ بڑی سخت اور اشد ترین ضرورت ہے کہ اول تو ہم اپنے خطبوں کو جلد از جلد اُردو میں منتقل کر دیا تاکہ ہماری قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔ اور مسلمان تو بہت جلد دوسری قوموں کے مقابلے میں ترقی کر سکتے ہیں۔ اگر دوسری قومیں اپنی تعلیم کی وجہ سے ہم سے پچیس یا تیس برس آگے بڑھ گئی ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم تو بہت جلد دوسروں کے برابر ہو سکتے ہیں۔ لیکن جلدی سے کام ختم کر دینے اور دوسروں کے دوش بدوش آجانے کا مفید ترین طریقہ یہی ہے کہ اپنے جمعے کے خطبوں کو بغیر اور کچھ وقت کھوئے ہوئے اپنی زبان میں کرنا شروع کر دیں اور ان میں وہ باتیں بیان کریں جن سے مسلمانوں کا فائدہ دینی اور دنیوی دونوں ہوں۔ ساتھ ہی ان کی تعلیم بھی بڑھے اور ہر قسم کا شعور بھی، سیاسی، ملی، اقتصادی، اخلاقی وغیرہ جیسا میں نے اوپر ذکر کیا۔

مجھے ڈر ہے کہ شاید اس قسم کی اصلاح میں علماء اور وہ خطیب حضرات اعتراض کریں جو مسجدوں میں خطبے کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اول الذکر تو اس وجہ سے کریں گے کہ اُن کی عربی دانی بیکار جائے گی اور محض آیتیں پڑھ کر جو عوام الناس پر رعب جما لیا کرتے تھے اور اپنی قدر و منزلت ان کی نگاہوں میں بڑھا لیا کرتے تھے وہ بند ہو جائے گی۔ وقار کو جاتے ہوئے دیکھنا آسان کام نہیں ہوا کرتا۔ وقار میں زندگی ہے۔ زندگی بغیر وقار لطف نہیں دیتی خواہ وہ وقار ذاتی اغراض کی بنا پر اختیار کیا گیا ہو یا ذاتی مالی فائدوں کے خیال سے۔ میں ان حضرات کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ یہاں قوم کی بہتری، بہبودی، فنا و بقا کا سوال ہے۔ اگر اُن کا ذاتی وقار قوم کی خاطر جاتا رہے تو اُنھیں افسوس نہ کرنا چاہیئے بلکہ خوش ہونا چاہیئے کہ اُنھوں

نے قوم کی خاطر ایثار کیا۔ نیز ان کی عربی دانی کا وقار محض جمعہ کا خطبہ نہ پڑھنے سے چلا نہیں جائے گا۔ وہ اور دوسری صورتوں سے باقی رہے گا جیسا کہ عموماً رہتا ہے۔ موخرالذکر یعنی ملازم امام بھی اس اصلاحی اسکیم پر اعتراض کریں گے اس لئے کہ ان کی تنخواہ اور روزی کا سوال بیچ میں آجاتا ہے۔ اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ فی الحال مسجدوں میں وہ امام تو قائم رکھے جائیں جو پہلے سے ملازم ہیں اور روز کی نمازوں کی امامت کرتے ہیں لیکن جمعہ کا خطبہ وہ نہ پڑھیں۔

جمعہ کا خطبہ دینے کے لئے کون سے اور کس قسم کے حضرات رکھے جائیں اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اول الذکر قسم کے علماء یعنی جو عربی جانتے ہیں وہ رکھے جائیں لیکن شرط یہی ہو کہ وہ اردو میں اپنے خطبات دیں ساتھ ہی ان میں یہ بھی صلاحیت ہو کہ خطابت کا مادہ ہو اور تعلیم دے سکنے کے قابل ہوں ہر قسم کے مسائل پر ان کی نگاہ ہو اور ہر قسم کے معلومات کا اُنھیں علم۔

مجھے امید ہے کہ اگر مسلمانوں نے جلد از جلد میری اس تجویز پر غور کرکے عمل کرنا شروع کردیا تو چند ہی سال میں آپ دیکھیں گے کہ آپ کے مسلمان عوام اور مسلمان بچے بھی عہد حاضر و تہذیب حاضر کی تمام معلومات سے باخبر، دین و دنیا کی باتوں سے آگاہ، خود اعتمادی کے وصف سے مزین تمام اقوام عالم کے ساتھ دوش بدوش بلکہ سب میں مزین اور ممتاز نظر آئیں گے محض عمل کی دیر ہے۔ کاش میری یہ تجویز مسلمانوں کے دلوں کو لگے۔

شذرات

حسب وعدہ ہم اس شمارے سے "مسلمانوں کا تہذیب و تمدن کیا ہے" کے مباحثے کا آغاز کررہے ہیں۔ اس میں ہر نقطہ خیال رکھنے والے مسلمانوں کو شرکت کی دعوت ہے وہ اپنے دلائل سے پبلک کو روشناس ہونے کا موقعہ دیں۔ ہم بہت خوش ہوں گے اگر ہندوستانی مسلمانوں کی سب جماعتیں اپنے اپنے خیالات کا اس موضوع پر اظہار کریں گی۔ اس شمارہ میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اپنے ذاتی خیالات پیش کئے ہیں۔ ان سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے نیز انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے تمدن کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون جامعہ کی ایک گذشتہ اشاعت میں نکل چکا ہے لیکن مضمون نگار صاحب کی اجازت سے ہم اُسے بجنسہ دوبارہ شائع کررہے ہیں

ہم نے ایک دوسرے عنوان کا بھی اعلان کیا تھا یعنی اپنی اصلاح کے عنوان سے ایسی تعمیری اسکیموں کا سوچنا جو مسلمانوں کے لئے مفید ہوں اس سلسلے میں ہمیں پہلا مضمون مہدی حسن صاحب کا موصول ہوا ہے۔ موصوف نے خطبۂ جمعہ کے ذریعے بالغوں کی ناواقفیت دور کرنے کا حل بتایا ہے خیال بہت اچھا ہے اس پر واقعی مسلمانوں کو غور کرنا چاہیئے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے خطبہ اردو میں ہونے کی مہدی صاحب نے مضمون کے آخر میں تلقین کی ہے ساتھ ہی یہ خوف بھی ظاہر کیا ہے مبادا علما حضرات اپنے وقار غائب ہو جانے کے خیال سے اس تلقین کی مخالفت کریں۔ ہمارے خیال میں اس معاملے میں وقار کا سوال بالکل درمیان میں نہیں آتا۔ اصل میں خطبۂ جمعہ کا مسئلہ عرصہ سے مختلف فیہ ہے۔ علمائے اہل حدیث اور اکثر روشن خیال علما اردو خطبے کے حامی ہیں لیکن علما کا ایک طبقہ عربی خطبہ پر مصر ہے۔

ہمارے خیال میں ان بزرگوں کو بھی اس مسئلہ پر دوبارہ غور و تفتیش کی نظر ڈالنا چاہیئے کیونکہ وقت کا اقتضا یہی ہے۔

سزا دینے والے

(عبدالغفور صاحب - ایم۔اے)

محترم عبدالغفور صاحب رسالہ جامعہ کے پرانے مضمون نگاروں میں سے ہیں آپ کا موضوع ہمیشہ سے تعلیم رہا ہے حال ہی میں آپ نے اپنے خشک اور غیر دلچسپ موضوع کو ظرافت کے پیرائے میں لکھنا شروع کیا ہے اس سے قبل "سزا اور امتحان" کے عنوان سے آپ کے مضامین اسی رنگ میں نکل چکے ہیں تعلیم کے سے سنجیدہ مضمون میں جامعیت کو ہاتھ سے دیے بغیر ظرافت کا سمونا بڑا مشکل کام ہوا کرتا ہے۔ غفور صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اس کو نبھا لے گئے۔ امید ہے ناظرین بھی اس کو پسند فرمائیں گے۔ (مدیر)

سزا کے عقیدے پر ایمان لانے والوں کے باوا آدم شاید حضرت موسیٰؑ ہوں گے اور ان کا عصا سب عصاؤں کا مورث اعلیٰ۔ شاید اسی عصا کی برکت سے یہودی قوم میں ذہانت اور فطانت کا طوفان اتنا ابلا کہ تھامے ہی نہیں تھما۔ مگر حضرت موسیٰ کے ہاں ابھی عمل ہی عمل تھا۔ ابھی تک اس مسئلہ پر دقت نظر صرف نہ کی گئی تھی۔ طریقہ تعلیم کے لحاظ سے عملی پہلو کے بعد نظری پہلو آتا ہے اور اس دریا کو نظری لحاظ سے جس نے کوزے میں سربمہر کیا وہ حضرت سلیمان تھے۔ "جو شخص ڈنڈے کا استعمال کم کرتا ہے وہ اپنے بچے سے حقیقی معنوں میں نفرت کرتا ہے اور جو بچے سے دلی محبت رکھتا ہے وہ آئے گاہے گاہے (شاید اپنی محبت کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے) سزا دیتا ہے۔"

حضرت سلیمان کی بادشاہت بڑے دبدبے اور جبروت کی بادشاہت تھی، ان کی حکمرانی جنوں اور انسانوں پر بھی مسلط تھی بعضوں کا خیال ہے کہ یہ پر اسرار طاقت ان میں ایک انگشتری کی بدولت تھی لیکن جن اصحاب نے ڈنڈے کے طفیل تاریخ کو یاد کیا ہے خوب جانتے ہونگے کہ انگشتری کے علاوہ ان کے پاس ایک عصائے سلیمانی بھی تھا۔ ان کی انگشتری کی سطوت ان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گئی لیکن ان کے ڈنڈے کا اثر جنات پر اس کے بعد پورے چھ مہینے تک برابر مسلط رہا۔ شاید خواب میں آتے رہے ہوں گے نہیں بات یہ تھی کہ جب پیغام الٰہی آیا کہ تو اس وقت بیت المقدس کی تکمیل میں چھ ماہ

کا کام باقی تھا حضرت سلیمان کی ہدایت کے مطابق ان کی نعش کو ایک کمرے میں ایسے کھڑا کیا گیا گویا ابھی وہ اور ان کا ڈنڈا زندہ ہیں۔ یہ عصا رکے کرشمے ہیں کہیں بیت اللہ کی تعمیر کراتا ہے کہیں نفس انسانی کی تکمیل میں ہاتھ بٹاتا ہے

یونان میں اہل اسپارٹا جسمانی سزا کے خاص طور پر شائق تھے۔ ان کے لئے یہ جنگجویانہ اور سرفروشانہ زندگی کی پہلی منزل تھی۔ بچوں کے بدن کو مار مار کر بدھیاں ڈال دی جاتی تھیں اور ایک لحاظ سے یہ چیز تھی بھی یونانی احساس حسن کی دلیل۔ سیدھے سادے ٹویڈ ان کے کپڑے کسے پسند آتے ہیں؟ کچھ نقش و نگار تھوڑی بہت پھول پتیاں تو ہونا چاہئیں قدرت نے بچے کی جلد کو اسی لئے سادہ چکنا اور صاف بنایا کہ استاد اس پر کشیدہ کاری کرتے رہیں۔ ان پر بیل بوٹے کاڑھتے رہیں۔ اسی لئے تو ایک رومن استاد نے بچے سے تنبیہاً یا تشویقاً کہا تھا "یاد رکھو تمہاری کھال ویسی ہی پھولدار بنا دوں گا جیسا تمہاری دایہ کا سایہ ہے"۔

بالعموم مدرسوں کی فضا ایک قبرستان کی فضا کی طرح سنجیدہ اور بوجھل سی ہوتی ہے لیکن ہملیٹ کا گورکن ایک کاسۂ سر پہ بھی پھبتیاں کس لیتا ہے اور بے چارہ استاد اس فضا میں بھی تلخ مزاح کے چند قطرے نچوڑ ہی لیتا ہے۔ اگر بچوں میں اساتذہ اور ساتھیوں کے نام رکھنے میں حیرت انگیز جدت پائی جاتی ہے تو استادوں نے سزا کی اصطلاحات کے سلسلے میں دلچسپ اختراعات کی ہیں۔ یہ اصطلاحات بالعموم عالم حیوانات سے لی جاتی ہیں شاید ان کے وضع کرنے میں استاد کی نفسیات کا ڈارونی پہلو، منصوری، پہلو کو مات دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

مرغا تو اکثر لوگ بنتے ہی چلے آئے ہیں۔ اس کے تخیل سے استاد کی مزاحیہ اپج اور قوت مشاہدہ پھوٹی پڑتی ہے۔ اس قسم کی شاعرانہ اشاعرانہ نہیں بلکہ الہامی جدتیں کسی اتفاق کی مرہون منت نہیں یہ صدیوں کے تربیت یافتہ ذہن اور انسانیت کے مزاح آفریں پہلو کے فائر مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس خوبصورت اصطلاح کی قدر ایک بچہ ہی خوب جانتا ہے۔ اگر وقت کے جھاڑن نے ان نقوش کو آپ کے دماغ کے تختۂ سیاہ سے (بقول بعض ماہرین ذہن ایک تختہ ہے

اور اس کی سیاہی سفیدی آپ کے اختیار میں ہے) دہند لاکر دیا ہے۔ تو آپ ایک مرتبہ اچک کر زمین کے ساتھ ساٹھ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو پھرتی سے ٹانگوں کے نیچے سے نکال کر کان تھام لیں۔ کانوں کو ذرا مستعدی اور دل کڑا کرکے پکڑے رہیں۔ اسی سمجھے دوڑے سے آپ کے جسم کا وہ حسین توازن اور تناسب اُبھرا ہوا ہے جسے مرغا کہتے ہیں۔ آپ کا پچھلا حصہ ایک مرغ کی دم کی طرح پھیلا ہوا اور قدرے اوپر اٹھا ہوا۔ دونوں باہیں مرغ کے بازوؤں کی طرح باہر کی طرف پھڑپھڑاتی ہوئیں اور ناک کی پھنگی مرغ کی چونچ کی طرح زمین سے ملی ہوئی جسم کے بیٹھے بیٹھے اور ریشے ریشے میں ایک مرغ کا سا بناؤ اور تناؤ۔ جتنا آپ پیچھے کا حصہ اونچا اور آگے کا نیچا کرتے جائیں گے اتنا ہی آپ اس خوبصورت تشبیہ کا پورا مجسمہ بنتے چلے جائیں گے

ممکن ہے آپ کو ایسی حالت میں یہ تشبیہ بلکہ جس کو استعارہ کہنا چاہیئے، اسقدر حسین اور درست معلوم نہ ہو۔ تو یقین مانیئے کہ یہ استعارہ کا قصور نہیں بلکہ یہ آپ کی ذہنیت اور ذہنیت نہیں بلکہ جسمانی پوزیشن کا قصور ہے بلکہ اس میں بھی کسر رہ جاتی ہے کہ آپ خود اپنے آپ کو دیکھ نہیں پاتے۔ اگر آپ کسی دوسرے کو بنا ہوا دیکھیں تو آپ کا دل ایک مرتبہ تو داد دینے کے لئے تڑپ جائے گا اور آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے کہ انسانی جسم کا بانکپن اور خروسیت تو مجھ پر آج ہی روشن ہوئی ہیں۔

مرغا تو سزا کا سکونی پہلو ہے۔ لیکن ہر مفکر اور سائنس دان سکونی پہلو کے بعد حرکی پہلو پر بھی توجہ کرتا ہے۔ استادوں نے بھی اس مسئلہ پر جب غور و فکر کیا تو بہت اچھوتی سزائیں خود بخود پیدا ہو گئیں۔ بندر کا ناچ۔ ریچھ کا ناچ اور خدا جانے کیا کیا۔ بعض نے ناچ کی تشریح، حرکت کی شعریت سے کی ہے۔ مدرسوں کا یہ ناچ حرکت کی شعریت تو نہیں البتہ المیت ضرور ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اصطلاحات بالعموم حیوانی دنیا سے لی جاتی ہیں۔ اور حقیقتاً اس میں انسان کی اصلی فطرت کی وہ گنگھنی اور رہا رکھی بہیمانہ قوتیں۔ دنیا کے اوائلی انسان کے وہ وحشیانہ جذبات اپنا مظاہرہ دکھاتے ہیں جن پر موجودہ تمدن و تہذیب محض ایک اوپری اوپری سا روغن چڑھا دیتی ہے مگر جسے کھرچ کر دیکھا جائے تو نیچے سے سولہ آنے وہی برفانی یا جنگلاتی دور کا بالوں سے اٹا ہوا۔

درندہ جبلتوں سے پٹا ہوا وحشی نکلتا ہے۔ خواہ ہٹلر کو (اگر ہمت ہو تو) کھرچ کر دیکھ لو یا کسی معمولی استاد کو مدرسے، دونوں ایک ہی نکلیں گے فرق صرف دائرہ عمل کا ہے ایک کے لئے پورا براعظم یورپ کیا ساری دنیا بھی سکڑ کر محض کے بازی کا دائرہ بن گئی ہے اور دوسرے کے لئے مدرسے کی چار دیواری جو پھیلی ہے تو کل کائنات کے مرادف ہو گئی۔

ہمارے مدرسوں میں پڑھائی اور پٹائی کچھ لازم ملزوم سی ہو گئی ہیں۔ یہ دونوں بیساکھیوں کی مانند ہیں جن کی مدد سے ہمارا نظام تعلیم سہارا لئے ہوئے ہے چل نہیں رہا۔ ٹھٹکا ہوا ہے اور اب تو ٹھٹکا ہوا بھی نہیں منجمد سا ہوتا جا رہا ہے اور اس کا عَلم و نشان اس کا سزا دینے والا بید ہے۔ استاد اور بید دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہیں نفسیاتی اصول سے بھی اگر دو اشیاء کافی عرصہ تک اکٹھی مشاہدہ ہوتی رہیں تو بعد میں ایک کے یاد آنے پر دوسری کی یاد خواہ مخواہ تازہ ہو جاتی ہے اس لئے اگر بید نظر آ جائے تو ڈر ہی رہتا ہے کہ اس کے اردگرد ضرور کسی استاد کی روح منڈلا رہی ہو گی اور اگر استاد اکیلا دکھائی دے جائے تو ڈر رہتا ہے کہ کہیں ادھر ادھر کوئی گیتی بید تو چھپا ہوا نہیں ہے اور ویسے تو ایک اچھے استاد کا پورا جسم ایک زنزناتا ہوا اور سنسناتا ہوا بید ہے اور بعض وقت تو کچھ استادوں نے جو بید یا گھونسا وجس کو ایک فی البدیہہ بید کہیئے، پر تصور باندھا تو بہت سے مدارج معرفت طے کر گئے۔ مجھے خود ایسے پہنچے ہوئے استاد کی زیارت کا فخر حاصل ہوا جو تو من شدی من تو شدم، کی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ انھیں اکثر مرتبہ شبہ ہونے لگتا تھا کہ وہ خود ایک مجسم گھونسا ہیں یا ان کا گھونسا وہ آپ ہیں۔ ان کی جماعت کو پڑھانے والے وہ خود ہیں یا ان کا گھونسا۔ اکثر اوقات جب بچے ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت کرتے تھے تو وہ گھونسا بنا کر اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے "کم بختو! مجھ سے کیا پوچھتے ہو اپنے اس استاد سے پوچھو اس کی موجودگی میں میں کیا بتاؤں۔"

اللہ اللہ یہ ہے تعلیمی سلوک کی منزل فنا۔ ان کے لئے وہ گھونسا ایک جیتی جاگتی قائم بالذات شخصیت تھی اور بچوں کے لئے استادی کا نشان اور سچ تو یہ ہے کہ اگر استاد کی جگہ ان کی کرسی پر محض ایک گھونسا یا ان کی میز پر ایک بید پڑا رہتا تو بچے اس کا اتنا ہی احترام کرتے جتنا استاد کا۔ بات یہ ہے

کہ بچے بھی اپنے محدود انداز میں تقسیم کار کا مسئلہ خوب سمجھتے ہیں اور یہ تقسیم کار ایک زمانہ سے چلی آتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن اپنے استاد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے زندگی بھر کسی بچے کو نہیں پڑھایا استاد اور بچوں نے کام کا اچھا خاصہ بٹوارا کر لیا تھا۔ استاد کا کام تھا پٹائی اور بچوں کا رٹائی۔

بہرحال بید استاد کا نشان ہو گیا ہے اور ازمنہ وسطی کے فن کار مصورین یا سنگ تراشوں نے اس کا بڑا بلیغ اور بولتا چالتا استعمال کیا ہے۔ شیوجی کا ترشول۔ مغل نادر کاری میں شہزادہ کے ہاتھ کا کھلتا ہوا پھول۔ یونانی سنگ تراشی میں زیتون کی شاخ ایک پوری سماجی سیاسی اور جذباتی زندگی کی رنگین فلم ہمارے سامنے کھول کے رکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح ازمنہ وسطی کے نقوش اور مجسموں میں استاد کا ہر جگہ ایک بید کے ساتھ ہونا بھی اس زمانے کی تعلیم و تعلم پر بڑی تیز تیز اور گرم گرم روشنی ڈالتا ہے۔

جرمنی کے لاطینی مدرسوں میں تو سزا کے لئے ایک باقاعدہ افسر مقرر کیا جاتا تھا جسے "نیلا" کہا جاتا تھا۔ کیونکہ اسے ہمیشہ نیلا لباس پہننا پڑتا تھا۔ نیلا کا لفظ ہمیں اندر سبھا کی نیلم پری کا رومانی تخیل دلاتا ہے لیکن نیلم پری کا نام تو اس کی بلوریں اور شفاف جسم کی رعایت سے رکھا گیا تھا جس میں نیلم کی جھلک غمازیاں کرتی تھی۔ مگر "نیلا" افسر کے جسم کو نیلم پری سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ انھیں تو محض اس لئے نیلا کہتے تھے کہ ان کی التفات سے بچوں کے جسم پر نیلاہٹ کی وہ دردناک جھلک آ جاتی تھی جس میں رومانیت کا شائبہ بھی نہ تھا۔

اسکولی اور جماعتی ہر قسم کے ضبط کے لئے جرمنی ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔ اور سزا میں تو وہاں کے اساتذہ نے اچھا خاصا چنگیز خانی ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ سزا بھی دیتے ہیں اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ باقاعدہ رجسٹر میں اندراج بھی ہوتا جاتا ہے شاید اس کا مقصد وہی عدالتی کارروائی ہوگی جس کی رو سے اگر کوئی عادی مجرم دوبارہ ماخوذ ہو تو سزا معہ سود مرکب ادا کر دی جائے ہماری عدالتوں اور ہمارے مدرسوں کی سزائیں اصلاحانہ نہیں سب انتقامانہ ہیں اگر آپ کو یقین نہ آئے تو سزا کے ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو بار بار وہی نام ساتوں مہینوں کے دردانگیز وقفوں کے بعد

نظر پڑیں گے۔ اگر سزا کا مقصد سماج کی حفاظت تھی تو یقیناً یہ سزا بری طرح ناکامیاب ہوئی ہے۔ ایک جانب اس نے ایک انسان کی فطرت کو اور بھی بربریت اور وحشیانہ پن کی طرف رجوع کردیا اور دوسری جانب سماج کے لئے ایک چنگاری کو جو دامن سے ہوا دی ہے تو اس کی لپٹیں آسمان کی خبر لانے لگیں۔ ایک مجرم کی نفسیات، بے پناہ جذبات اور قوتوں کا کھولتا ہوا دریا ہوتی ہے۔ اور سزا اس کے لئے ایک چیلنج ہوتی ہے۔ اس کی امنڈتی رو کے لئے ایک حقیر سی روک کمزور لکڑی کے تختوں کی باڑھ ہوتی ہے۔ اس کی فطرت اس پر سے کودتی پھاندتی، روندتی مسلتی اپنی ترنگ میں بڑھے چلی جاتی ہے ایسی طبائع کے لئے سزا روک اور بچاؤ کا کام نہیں کرسکتی اور کمزور طبیعتوں کو سزا کے علاوہ اور ہزاروں تراکیب سے روکا جاسکتا ہے۔ تو پھر سزا دینے کا فائدہ کیا ہوا؟ خیر یہ باتیں تو جملہ معترضہ ہیں۔ مدرسوں میں سزا کا ریکارڈ رکھنے کی ایک اور وجہ بھی نظر آتی ہے۔ آخر بادشاہ بھی تو فتوحات فیروز شاہی اور اکبر نامہ وغیرہ قسم کی چیزیں تیار کراتے تھے کیا استاد انسان نہیں ہیں؟ کیا ان کے دل میں اپنے کارناموں کو محفوظ رکھنے اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی خواہش نہیں ہے؟ یقیناً اپنے کارناموں کو خود پڑھنا بھی دل میں ایک مافوق البشر تیقن اور خود اعتمادی پیدا کردیتا ہوگا۔ سنا گیا ہے کہ امریکہ کے سرخ انڈین اپنی کھوپڑیوں کو بطور یادگار فتح مندی کے نشان کے اکٹھا کرتے رہتے تھے۔ اساتذہ بچارے تو محض ریکارڈ ہی رکھتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی شاذونادر اگر کسی کا کان زیادہ مسلا گیا تو اس کی نچلی کونپل ہاتھ میں آجاتی ہے ایسے حالات میں انھیں کپتان جنکن کی طرح اس کو اسپرٹ میں محفوظ رکھ لینا چاہئے کہتے ہیں کہ کپتان جنکن کے کان ہسپانوی امیرالبحر نے اسی قصور پر کاٹ لئے تھے کہ وہ جزائر غرب الہند میں ڈاکہ زنی کیا کرتا تھا۔ اس نے پارلیمنٹ میں آکر جو کان دکھائے تو سب کے کان کھڑے ہوئے اور پورے انگلستان نے اپنے کانوں کو بچانے کے اسپین بھر کے کان کھینچنے کی تجویز منظور کردی۔ اس جنگ کو جنکن کے کانوں کی لڑائی کہتے ہیں۔ اسکولوں کے ریکارڈ میں تو کسی "کان کی جنگ" کا حال درج نہیں۔ ہاں کبھی کبھی سزا کے مسئلہ پر استاد اور والدین میں اختلاف رائے ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی اتفاق بھی حسن اتفاق سے ایک لڑکے کے باپ نے اتفاق رائے بلکہ خوشنودی رائے کا

اظہار کیا وہ سننے کے قابل ہے۔

مدرسہ کا ہیڈ ماسٹر نیا ہی بدل کر آیا تھا مگر تھا بڑا زبردست ضبط رکھنے والا۔ قد محض پانچ فٹ بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔ مگر بلا کا پٹائی کرنے والا تھا۔ معلوم نہیں یہ پٹائی کرنے والے لوگ اپنا قد اکثر چھوٹا کیوں رکھتے ہیں۔ شاید بید لگاتے وقت اچھلنے میں یہ زیادہ موزوں رہتا ہوگا۔ یہ ہیڈ ماسٹر تھا بھی بڑا خوش طبع اور بچوں کو خوب ہی خوب سمجھتا تھا۔ پہلے خوب میں تو وہ ہر بچے کے اس رومانی تخیل اور فرشتوں کی سی معصومیت کو پا جاتا جس کے گیت ورڈز ورتھ اور ٹیگور جیسے لوگ گاتے چلے آئے ہیں اور دوسرے 'خوب' میں اس کی نگاہ تیز ان پردوں کو چیر کر بچے کے اس من کے مندر میں پہنچ جاتی تھی جہاں کبھی کبھی ایک ننھا سا شیطان چھپا ہوتا تھا۔ اس ننھے شیطان کا نکالنا کچھ اسی کا حصہ تھا۔ دوسرے مدرسوں کے درست نہ ہونے والے بچے ان کے ہاں درست ہو جاتے تھے۔ دوسروں کی ٹمٹموں اور وکٹوریا میں پٹکیں اچھالنے والے گھوڑے بلکہ گدھے ان کے کھڑکھڑاتے اِکّے میں بھی ٹھیک چال دکھاتے تھے وہ طلبا جو کسی کے ہاتھوں مار کھانے کے لئے تیار نہ تھے ان سے بے دھڑک بغیر چون وچرا مار کھائے چلے جاتے تھے۔

ایک روز مدرسہ میں خاص واقعہ گزرا۔ اس دن نواح کے ایک بڑے جگادری قسم کے لڑکے نے مدرسے میں داخلہ لیا تھا۔ نواح کے مدرسوں کا مشہور بھگوڑا اور مدرسوں کی ہڑتالوں اور منظم بغاوتوں کا مانا ہوا لیڈر۔ مدرسے کی فضا میں اچانک ایسی خاموشی چھا گئی تھی جو آنے والے طوفان کا پتہ دیتی تھی۔ دونوں جانب سے کسی آئندہ آنے والے نامعلوم آشوب کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہیڈ ماسٹر نے تو اس بازی پر صرف ہیڈ ماسٹری کا ہی داؤں لگا دیا تھا۔ مگر مجھن میاں کی تو زندگی بھر کی شہرت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو تو صرف اپنے مدرسے میں ہی بدنامی کا خطرہ تھا مگر انھیں تو پورے علاقے میں اپنی ساکھ قائم رکھنی تھی۔ وہ اتنے مشکل دنگلوں سے اب تک فاتح و منصور بڑھتے چلے آئے تھے کہ اس پانچ فٹے بالشتیے سے تو پیچھے ہٹنا ہتک ہی نہیں بلکہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ انھیں اپنی ساکھ قائم رکھنی تھی اور رکھنی بھی بہت جلد تھی۔ وہ ہٹلر کی طرح دفعتہً اور فوری

کارروائی کے قائل تھے۔ دوسرے دن ہی آشوب ہوگیا۔ گھّن ایک استاد سے جان بوجھ کر بدکلامی سے پیش آئے۔ ہیڈ ماسٹر نے حسب قاعدہ بید لگائے اور انھوں نے بہت خاموشی سے کھائے نہ تو آسمان سے کوئی بجلی گری اور نہ کوئی بم ہی پھٹا۔

اسی دن شام کے وقت ایک پہلوان گاما کی چال ڈھال کا آدمی مدرسے کی چار دیواری میں داخل ہوا۔ کلے جبڑے والا چوڑا چکلا چھ فٹا انسان ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچ کر پوچھنے لگا اور انھیں تو ہیڈ ماسٹر وہ سمجھا ہی نہیں۔ ایسے ناپ اور پیمانے کے انسان کے دماغ میں خیال بھی نہیں آسکتا کہ اتنا چھوٹا سا کھلونا نما انسان بھی ہیڈ ماسٹر ہو سکتا ہے۔

"بھئی میں ان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں جنھوں نے ہمارے گھّن کو آج مارا ہے"

ہیڈ ماسٹر نے پہلے تو اسے سر سے پاؤں اور دوبارہ پاؤں سے سر تک متانت سے بھویں چڑھا کر دیکھا شاید کسی دوسری جنگ کی تیاری کے سلسلے میں حریف کی جانچ کر رہے تھے اور پھر اطمینان سے بولے "میں نے مارا ہے"

یہ بھاری بھرکم انسان باوجود اپنے وزن کے ایک دفعہ اپنی جگہ پر اچک کر رہ گیا اور حیرانی سے استاد پر آنکھیں جما کر کہنے لگا "میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے ہی گھّن کو مارا ہے؟" "ہاں، اور وہ مار کا مستحق بھی تو تھا"

"ارے واللہ تم نے تو خدا کی قسم غضب کر دیا۔ اجی اسے تو میں بھی ہاتھ لگانے سے ڈرتا ہوں اور یہ تو خیال میں بھی نہ آسکتا تھا کہ تمہارے جیسا ذرا سا چھوکرا (شکر ہے اُس نے چھوکرا نہیں کہہ دیا) اسے پیٹ سکے گا۔ لاؤ۔ ذرا ہاتھ تو لاؤ ادھر۔ یار تم تو بڑے کام کے آدمی نکلے"

اس پر دونوں نے پُرتپاک انداز میں ہاتھ ملایا۔

"بھئی میں تو تمہاری جرأت کا آج سے قائل ہوگیا"

اور اس کے بعد دفعتاً بٹوے میں ہاتھ ڈال کر "اور۔ دیکھنا بھئی میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ یہ لو ایک اٹھنی۔ اس کا کچھ کھا پی لینا"

ہیڈ ماسٹر آدمی تھا سمجھدار۔ خاموش ہوگیا اور چپکے سے اٹھنی جیب میں ڈال لی۔ ابھی
اس کا مہمان مدرسے سے باہر نکل رہا تھا اور جاتے جاتے بھی کچھ استعجابیہ اور کچھ تعریفی لہجہ میں
کچھ نہ کچھ کہتا چلا جاتا تھا کہ اتنے میں ہیڈ ماسٹر جماعت میں داخل ہوا۔
"گھمن کھڑے ہو جاؤ" گھمن کھڑا تو ہوگیا مگر زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں ایک سنسناہٹ سی ٹخنے
تلوؤں کے نیچے سے اوپر کو چڑھتی محسوس ہوئی۔
"بھئی مجھے تم سے ایک بات کہنا ہے۔ تمہارے ابا ابھی مجھ سے ملنے آئے تھے اور تمہاری
پٹائی پر ایک اٹھنی انعام دے گئے ہیں اور بھئی اگر آئندہ تم نے ہمیں ایسا کوئی موقعہ دیا تو ہم
ایک روپیہ سے کم کیا کمائیں گے۔"
میاں گھمن تو خیر مار کھانے والے سماجی طبقے کے فرد تھے مگر مدرسے کا خوفناک مایا جال
مار کھلانے والے طبقے کو بھی اکثر اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ سنا ہے ایک دفعہ اکبر اعظم نے
شاہزادگی نہیں اپنی بادشاہی کے زمانے میں کسی تہوار کے موقعہ پر زعفرانی رنگ کے کپڑے
پہن لئے تو صدر الصدور مولانا عبدالصمد نے ان کی شریعت کے لٹھ سے نہیں بلکہ ایک اچھے
خاصے ٹھوس قسم کے مادی لٹھ سے خبر لی باپ زندہ نہ تھے اکبر نے اماں جان سے شکایت کی تو
انہوں نے کہا کہ بیٹا ان باتوں سے اپنی طبیعت پر ملال مت لاؤ۔ تاریخ کے صفحوں میں تمہارا نام
ان زریں حروف میں لکھا جائے گا کہ ایک زبردست سلطنت کے باسطوت و جبروت حکمراں
نے ایک معمولی مسجد کے ملا سے تادیب حاصل کی اور کچھ نہ بولا۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اکبر اعظم نے
کہاں تک اماں کی تشفی آمیز نصیحت سے اتفاق کیا ہوگا۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ مولانا
عبدالصمد نے بعد میں تو اکبر سے شاید آنکھ ملانے کی جرأت نہ کی ہو۔ کیونکہ اگرچہ وہ اس مرتبہ
اکبر کے زعفرانی کپڑے اتروانے میں تو کامیاب ہوگئے لیکن ان کی بجائے کسی علمی رنگ چڑھانے
میں ناکام ہی رہے۔ اور تاریخ کے صفحات کے متعلق بھی وہ مبہم سے کلمات کچھ ایسے اطمینان بخش
نہ تھے کیونکہ اکبر کے لئے عصا کی جھنکار تو عہد حال کا حقیقی المیہ تھی اور تاریخی شہرت محض اس آنے والی

مشہور فلم کی مانند تھی جس کا چھوٹا وعدہ سنیما کے منیجر لوگ مہینوں پہلے سے کر رکھتے ہیں اور اکبر تو تھے بھی ان پڑھ۔ انہیں تاریخ کے وعدوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

اتنا ضرور ہے کہ قانونی لحاظ سے اکبر کی پوزیشن بہت مضبوط تھی وہ چاہتے تو مولانا کے خلاف چارہ جوئی کر سکتے تھے مگر انگلستان کے بادشاہ ہنری ششم کو تو اس پیدائشی حق سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ پریوی کونسل کی ایک تجویز کی رو سے جو ۱۴۲۸ء میں منظور کی گئی۔

"بادشاہ کا اتالیق ارل آف واروک بادشاہ کو اس کی شرارت یا غلطی کی بنا پر پیٹ سکتا تھا تاکہ وہ اس ڈر اور خوف سے غلطی کم کرے اور علم کی طرف زیادہ متوجہ ہو"

ایک جمہوریت پسند ہونے کے لحاظ سے مجھے ہنری ششم کی سزا کا ریکارڈ دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اور غور سے دیکھا جائے تو محض ڈنڈے کا اصول ایک اٹل قانون ہے جس کے سامنے امیر و غریب، شاہ و گدا برابر ہو جاتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس قسم کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ ہاں ایک سوابیا کے استاد کی ۵۱ سالہ اسکولی زندگی میں سزا کا ریکارڈ حسنِ اتفاق سے محفوظ رہ گیا ہے انھوں نے اپنی اس مختصر سی زندگی میں ۹۱۱۵۰۰ دفعہ بید کی سزا دی۔ ۱۳۶۰۰۰ دفعہ ڈنڈے سے چوٹیں لگائیں۔ ۱۰۲۰۰۰ دھپ جمائے۔ ۲۰۹۰۰۰ طلبا کو مدرسہ کا وقت ختم ہونے کے بعد روکا گیا۔ ۲۲۷۰۰ مرتبہ زبانی رٹوانے کی سزا دی اور ۱۲۱ مرتبہ کوڑے لگائے۔ ان کے زندگی کے حالات پڑھ کر مجھے بار بار اسکاٹ کا وہ شعر یاد آتا ہے کہ ایک شاندار نیک نام زندگی کا ایک گھنٹہ بھی گم نام زندگی کے پورے دور سے بہتر ہے۔ گر تعلیمی تاریخ میں یہ کیا ان سے بھی شاندار ہستیاں ہو گزری ہیں۔ وہ بچوں کو مارنے والے بلکہ دھوآں اڑا دینے والے۔ انسانی جسم کے نداف۔ اس قدرت کے شاہکار سانسے موسیقی کے بے شمار مدھم اور پنچم سُر نکالنے والے۔ کنگفمی برادری کے قابل فخر آبا و اجداد۔ جن کے نام سے سینکڑوں شاگردوں کی روحیں اُن کی لحدوں میں کانپ اُٹھتی ہیں۔ اِن سب کے سردار ڈاکٹر کیٹ تھے جو ایک زمانہ میں ایٹن کے مشہور پبلک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کی پٹائی کی گونج اب بھی وقت کے مولناک ایوانوں میں سنائی دیتی ہے۔

جیسے کہ بعض پہنچے ہوئے عطائی حکیم ہر چیز کا علاج ایک ہی اکسیر سے کرتے ہیں۔ کیٹ۔ کے لئے بھی ہر مرض کی شفا ڈنڈے کے استعمال میں مضمر تھی۔ وہ ہر کسی کو پیٹتے تھے اور ہر بات کے لئے پیٹتے تھے۔ ان کا ڈنڈا کیا تھا کسی جادوگر کا طلسمی چھومنتر والا تکہ تھا کہ گھمایا اور کام بن گیا۔

دروغ برگردن راوی سنا گیا ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے مدرسہ کے گرجا میں وعظ فرماتے ہوئے انجیل مقدس کا چھٹا حکم پڑھا" برکت والے ہیں وہ لوگ جو اپنا دل کدورت سے صاف رکھتے ہیں"۔ یہ کہتے ہی وہ گرجا کا ماحول کچھ بھول سا گئے اُن کی آنکھوں میں ایک غیر قدرتی سی چمک آگئی اور وہ اپنی انگشت شہادت کو ہلا ہلا کر گھن گرج کر کہنے لگے "یاد رکھو صفائی باطن تمہارا فرض ہے نہایت اہم فرض اور یاد رکھو اگر تم صفائی باطن پیدا نہ کروگے تو تمہاری ڈنڈے سے خبر لی جائیگی"۔

ان کے زمانے میں ایٹن میں سزا دینے کا بڑا اہتمام تھا ہر چیز کے لئے ٹکٹ بٹا کرتے تھے۔ انعام کے لئے بھی اور سزا کے لئے بھی ہر آہنی اور عسکری نظام میں ٹکٹوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ ہر انسان انسان نہیں ہوتا وہ ایک خاص عدد ہوتا ہے یا کاغذوں کی ایک فائل۔ اس بندھے بندھائے تنے تنائے جکڑ بند نظام کے ماتحت یہ ٹکٹ جاری کئے جاتے تھے۔ اور اُن کی تھی بہت ضرورت۔ کیٹ کے اسکولی ضبط کا تخیل بالکل عسکری اور جنگی حالت کا تھا۔ بھلا کوئی حکومت پورے معاشی اور سماجی نظام کو امن کی حالت میں ٹکٹوں کے ذریعہ چلانے کی جرآت کر سکتی ہے؟ کیٹ کے مدرسہ میں بھی صرف ظاہری صورت امن وامان کی تھی۔ مگر گہرے پانیوں کی طرح جو اوپر سے ساکن اور ٹھہرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اندر اندر ہی بچوں میں نفرت اور بغاوت کی بے پناہ قوتیں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک جماعت انعامی ٹکٹ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ سوء اتفاق سے یا تو یہ ٹکٹ ظاہری شکل وصورت میں سزائی ٹکٹوں سے ملتے تھے۔ اور یا ہیڈ ماسٹر صاحب کے طبعی رجحان نے ان میں کچھ ویسی جھلک سی پیدا کر دی تھی۔ بہر حال وہ ایک سرے سے شروع ہو گئے۔ قمیص کی باہنیں چڑھائے ہوئے پسینہ پونچھتے ہوئے انھوں نے تھوڑے عرصے میں آدھوں آدھ کو نپٹا دیا۔ آگے بڑھنے کو ہی تھے کہ ایک طالب علم نے ڈرتے کانپتے۔ رُکتے رُکاتے

اپنے ٹکٹ کو ان کے آگے بڑھا دیا، کیٹ کو اپنی غلطی کا پتہ چلا تو انھوں نے اس وقت وہی کیا جو ہر با وقار اور سمجھدار آدمی کو کرنا چاہیئے۔ اس دخل درمعقولات سے اُن کا طوفان اور بھی اُبل پڑا گرج گرج کر کہنے لگے "بدمعاشو! تمہارا عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے" اور اس کے بعد انھوں نے اپنی پٹائی برابر جاری رکھی اور پورے گروہ کو ختم کر دیا۔

ایسے بااصول اور استبداد پسند حاکم کے زیر سایہ رہنے سے بچوں کو ایک تسلی ضرور رہتی ہے ان کی مدرسے کی دنیا میں کوئی طبقہ دارانہ تفرق نہیں رہتی۔ سب کے سب ایک مساوات میں عقیدہ رکھنے والی مار کھانے والی جمہوریت کے فرد ہوتے ہیں۔ اور مار کھانے کا حق سب کو برابر بغیر کسی ناجائز جنبہ داری کے پہنچتا رہتا ہے۔ اس گروہ میں کوئی طبقے نہیں ہوتے کہتے ہیں کہ جب ترائی کے جنگلوں میں شیر گایوں کے گلہ پر حملہ کرتا ہے تو سب سینگ جوڑکر اس پر اکٹھی ہلہ بول دیتی ہیں۔ اُمنڈتے ہوئے دریا کے سیلاب کے سامنے مڈبوں کے دل بادل کے درمیان کسان اپنی ذاتی رنجشیں اور جھگڑے کچھ لمحوں کے لئے بھول جاتے ہیں۔ مشترکہ مصیبتیں مسرتوں کی نسبت ہمیں ایک دوسرے سے زیادہ قریب لے آتی ہیں اسی طرح ایٹن کے بچے بھی اس عام خطرے کے خلاف سینگ تو نہیں ہاں چھپ چھپاتے راتوں کو اکثر سر جوڑکر بیٹھتے تھے۔ دنیا میں فرانسیسی انقلاب آیا زار روس کا تختہ اُلٹ گیا لیکن کیٹ کے جیتے جی ایٹن میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔

ارتقائے اعداد

(محمد کامل صاحب فرنگی محل۔ لکھنؤ)

کامل صاحب کا ایک مضمون "فلسفۂ لغت" کے عنوان سے ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۱ء کے پرچے میں نکل چکا ہے۔ اس دلچسپ مضمون کو بھی دراصل اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ (مدیر)

ممکن ہے کہ گنتی انسانی بولی سے بھی پہلے عالم وجود میں آگئی ہو اور انسان اشاروں سے گنا کرتا ہو۔ بہرحال اس کے پاس گنتی کی بنیاد انگلیاں تھیں جس کا اثر آج بھی ہم بعض قوموں کو انگلیوں پر گنتے وقت دیکھتے ہیں۔ ہمارے اس نظریہ کی تائید بعض وحشی قوموں کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے مثلاً جب اہل زولو "چھ" کہنا چاہیں گے تو کہیں گے "تاتی سی توبا" جس کا مفہوم ہے انگوٹھا شامل کرنا یعنی گننے والا جب ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں گن چکا تو اس نے دوسرے ہاتھ کا انگوٹھا شامل کر کے چھ کا عدد پورا کر لیا۔ بعض سرخ ہندوستانی (Red Indians) قبائل جو امریکہ میں نہر اورنیو کے کنارے آباد ہیں اپنی زبان میں پانچ کے لئے کہیں گے "پورا ہاتھ" چھ کے لئے کہیں گے "دوسرے ہاتھ میں سے ایک" اسی طرح دس کے لئے کہیں گے "دونوں ہاتھ" گیارہ کے لئے کہیں گے "پاؤں میں سے ایک" بارہ کے لے کہیں گے "پاؤں میں سے دو" پندرہ کے لئے کہیں گے "پورا پیر" پھر اسی طرح دوسرے پیر میں ایک پر اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔ اور جب بیس کہنا ہوگا تو کہیں گے "آدمی" پھر کہیں گے دوسرے آدمی کے ہاتھ میں سے ایک یعنی اکیس۔ اسی طرح انتالیس تک گنیں گے۔ اور چالیس پر کہیں گے "دو آدمی"

یہ معلوم کر لینے کے بعد آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ گنتی میں "۱۰" کو بنیادی حیثیت کیوں حاصل ہے صرف اس لئے کہ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ پرانے آدمیوں نے شروع میں پانچ کے عدد کو بنیادی حیثیت دی تھی کیونکہ یہ بھی تعداد ایک

ہاتھ کی انگلیوں کی ہے اور بعد میں یہ بنیادی حیثیت "دس" کو حاصل ہوگئی۔ مغربی افریقہ کے سنگالی حبشیوں میں اب تک بنیادی عدد "پانچ" ہے۔ اگر وہ پانچ کے اوپر گننا چاہیں گے تو اسی پر اضافہ کرکے کہیں گے "پانچ اور ایک۔ پانچ اور دو۔ پانچ اور تین وغیرہ" جس طرح ہم لوگ "دس" پر اضافہ کرکے گیارہ۔ بارہ۔ تیرہ" بناتے ہیں۔ اس طرز کا اثر اب تک رومی ہندسوں میں محفوظ ہے۔ جن سے رومی لوگ ہندی اعداد سے پہلے کام لیا کرتے تھے۔

بعض قومیں بنیادی عدد "بیس" کو مانتی ہیں جیسے انگریزی میں اسی کے لئے کہیں گے (Four Score) یعنی "چار بیسی" اسی مفہوم کو فرانسیسی لفظ (Quatre Vinget) ادا کرتا ہے۔ انگریز کہے گا (Four Score & Three) اور فرانسیسی کہے گا (Quatre Vinget Trois) یعنی "تراسی"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض پرانے جرمن قبائل بنیادی عدد "بیس" کو مانتے تھے۔ جو ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کا مجموعی عدد ہے۔ ہمارے ہندوستان میں بعض بوڑھی عورتیں بھی اسی طرح "بیس" کو بنیادی عدد مان کر گنتی ہیں۔ جیسے "دو بیسی پانچ" یعنی پینتالیس یا "تین بیسی" یعنی ساٹھ۔ تاہم عام طور پر بنیادی عدد "دس" ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی پر ہندسوں کا دارومدار ہے (ہندسے) یہ بدیہی امر ہے کہ جب انسان نے پہلی مرتبہ کسی عدد کو لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا تو ایک کی علامت کے لئے ایک لکیر اور دو کی علامت کے لئے دو لکیریں کھینچی ہوں گی جو انگلی کی تصویر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اسی طرح جتنے اعداد لکھنا ہوئے اتنی ہی لکیریں بنادی گئیں۔ جیسا کہ امریکہ کے بعض سرخ ہندوستانی آج تک یہی کرتے ہیں۔ عرصہ دراز تک انسان نے اسی طرح اپنا کام نکالا خواہ اس کو دہائیوں سے گذر کر سیکڑوں تک لکھنے نوبت آجاتی۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس طرح لکھنے میں زحمت اور دقت ہوتی ہے کہ سو کا عدد لکھنے کے لئے سو ہی لکیریں بنائیں جائیں تب ضرورت نے ایسی علامتوں کی طرف اس کی رہنمائی کی جن سے یہ دقتیں دور ہو جائیں۔ اب اس نے یہ کیا کہ پانچ کے لئے علٰحدہ علامت مقرر کی دس کے لئے علٰحدہ اسی طرح پچاس سو، اور ہزار کے لئے بھی۔ جب اس کو پندرہ لکھنا ہوتا تو وہ دس

اعداد	ہیروگلیفی	ہیراتی	فینیقی	تدمری	قدیم سریانی
۱۹	∩||| ||| |||	٢ ٨	||| ||||||¬	||||ﻭ¬	٢٢¬
۲۰	∩∩	٨	o.3.z.=	3	o
۲۱	∩∩|	٨|	=		13	10
۳۰	∩∩∩	Z	¬H	¬3	70
۴۰	∩∩∩∩	ـــ	H H	3 3	o o
۵۰	∩∩∩∩∩	٩	¬H H	¬3	7oo
۶۰	∩∩∩ ∩∩∩	ـــ	H H H	333	ooo
۷۰	∩∩∩ ∩∩∩∩	3	¬HHH	¬333	7ooo
۸۰	∩∩∩∩ ∩∩∩∩	ـــ	HHHH	3333	oooo
۹۰	||∩ ∩∩∩ ∩∩∩	ـــ	¬HHHH	¬3333	7oooo
۱۰۰	၉	၉	٤|o||o|.z	¬3|	7|
۲۰۰	၉၉	ر	(٤")|o||	¬3||	7٢
۳۰۰	၉၉၉	||٦		¬3|||	7٢|

ہیروگلیفی ہندسے سب سے زیادہ بسیط ہیں کیونکہ ان میں ایک دس اور سو کے علاوہ کسی دوسرے عدد کے لئے علٰحدہ شکل نہیں ہے۔ فینیقی میں بیس کے لئے بھی علٰحدہ شکل ہے۔ پھر تدمری میں پانچ اور بیس کے لئے الگ الگ شکلیں ہیں قدیم سریانی میں دو، پانچ اور بیس کے لئے بھی علٰحدہ شکلیں ہیں۔ جن کو بہر حال صرف ایک، دس اور سو کی شکلوں پر فوقیت حاصل ہے۔ ہندی ہندسوں کی طرف سریانی پہلا قدم ہے بایں معنی کہ اس میں دو کے لئے مخصوص شکل ہے۔ اس سے لازمی طور پر یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ہندی ہندسے سریانی سے مشتق ہیں یا ان کی ترقی یافتہ

شکل ہیں۔

متمدن انسان مدت دراز تک اپنے اعداد وشمار میں مخصوص ہندسوں کی ایجاد سے پہلے کا یاں استعمال کرتا تھا یعنی ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹ جن کی تعبیر ہندی ہندسوں سے کی گئی۔ حروف تہجی مرتب ہو جانے کے بعد ان علامات کے بدلے میں وہ حروف استعمال کئے گئے جو ان اعداد کو بنانے والے الفاظ کے شروع میں ہوتے تھے۔ قدیم یونانیوں نے ایک کے لئے یہ علامت مقرر کی تھی (1) جو طبعی طور پر ایک ہونے کا اشارہ ہے یا ایک انگلی کی بگڑی ہوئی تصویر ہے پانچ کیلئے یہ شکل استعمال کرتے تھے (Π) جو اس لفظ (ع I ΙΙ ع) (پانچ) کا پہلا حرف ہے۔ دس کے لئے ڈلٹا (Δ) لکھتے تھے جو اس لفظ (Δ ع ΙΙ α) (دس) کا پہلا حرف ہے۔ سو کے لئے یہ حرف (H) کام میں لاتے تھے معلوم نہیں کیوں؟ اس لئے کہ یہ ان کی زبان میں "سو" کا پہلا حرف نہیں ہے۔ ہزار کے لئے یہ علامت (X) مقرر تھی جو (XLh lo l) (ہزار) کا حرف اول ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ یونانی ان اشکال کو سولن کے زمانہ سے کام میں لا رہے ہیں لیکن وہ خود ان کو ہیرودیان غراماطیقی کی طرف منسوب کرتے ہیں جس نے انہیں دوسری صدی کے آخر میں بتایا۔

رومیوں نے بھی ہندسوں کی جگہ حروف سے کام لینے میں یونانیوں کا اتباع کیا ہے اگرچہ ان کے حروف عددی کسی لفظ کا پہلا حرف نہیں ہوا کرتے تھے۔ رومن ہندسے ملاحظہ ہوں (۱) I - V (۵) - X (۱۰) - L (۵۰) - C (۱۰۰) - D (۵۰۰) - M (۱۰۰۰) - یہ ہندسے آج تک یورپی قومیں بعض حالتوں میں استعمال کرتی ہیں۔

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ سامی زبانوں کے حروف ابجد بھی ہندسوں کے بدلے کام دیتے تھے لیکن ان کا اصول یہ تھا کہ ہر حرف کو اس سے پہلے والے حرف کے اعتبار سے نمبر دیا جاتا تھا مثلاً عبرانی میں ۲۲ حرف ہیں تو اس کے آخری (ــــ) "ت" کا نمبر ۲۲ ہوگا بعد میں یہ اصول تبدیل کر دیا گیا اور ابتدائی ۹ حرفوں کو اکائیوں کے نمبر دیئے گئے۔ دسویں حرف سے اٹھارویں حرف تک دہائیاں بنیں پھر ۱۹ سے ۲۲ تک سیکڑے سمجھے گئے۔ اس حساب سے ان کی ابجد میں سب

بڑا عدد ۲۰۰ تھا جو "ت" کو دیا گیا۔ عربی حروف تہجی میں ۶ حرف زائد ہیں پوری ابجد ۲۸ حرفوں پر مشتمل ہے ان کے یہاں آخری حرف کا نمبر ۱۰۰۰ ہے۔ عربی ابجد مع اعداد ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ا، ب، ج، د، ہ، و، ز، ح، ط، ی، گ، ل، م، ن، س، ع، ف، ص، ق، ر، ش

۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۲، ۳۰، ۴۰، ۵۰، ۶۰، ۷۰، ۸۰، ۹۰، ۱۰۰، ۲۰۰، ۳۰۰

ت، ث، خ، ذ، ض، ظ، غ۔

۴۰۰، ۵۰۰، ۶۰۰، ۷۰۰، ۸۰۰، ۹۰۰، ۱۰۰۰۔

"ہندی ہندسے" یہ ہندسے اب تک متمدن دنیا میں استعمال کئے جاتے ہیں اور یورپین ان کو عربی ہندسے کہتے ہیں۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان شکلوں کا استعمال ہندیوں نے کب سے شروع کیا۔ ان میں ممتاز صفت یہ ہے کہ ایک سے نو تک اکائیوں کی مخصوص شکلیں ہیں پھر صفر ہے جس کا اضافہ اکائیوں کے پہلو میں کر کے دہائیاں بنالی جاتی ہیں۔ دو صفروں کا اضافہ کر کے سیکڑے بنائے جاتے ہیں تین صفروں کا اضافہ کر کے ہزار بنتے ہیں اسی طرح غیر محدود اعداد بنتے چلے جائیں گے ان کی بنا اقتصادیات پر ہے کیونکہ ۹ علامتوں پر صفر کا اضافہ کر کے کوئی بھی بڑے سے بڑا عدد جہاں تک تخیل کی رسائی ہو بنایا جا سکتا ہے۔ یہ صورت حروف ابجد یا کسی دوسرے طریقہ سے ناممکن ہے

غالباً ہندسوں کا یہ طرز عربوں نے ہندوستانیوں سے علوم ریاضیہ نجوم و ہیئت وغیرہ کے ساتھ دوسری صدی ہجری میں سیکھا۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ ۱۵۶ھ میں اہل بغداد نے ہندوستانیوں سے سیکھا بہرحال مسلمانوں میں سب سے پہلے ان ہندسوں کی تشریح ابو جعفر محمد خوارزمی نے نویں صدی عیسوی میں پیش کی اس کے بعد ان کی اشاعت مسلمانوں کے دفتری کاموں اور تصانیف میں ہوئی یہاں تک کہ بارہویں صدی عیسوی میں یورپ والوں نے اسپین میں مسلمانوں سے علم حساب حاصل کیا اور خوارزمی مذکور کی کتاب پڑھی، تو اس علم کا نام ان کے نام پر رکھدیا۔ رینو مشہور فرانسیسی مستشرق کا خیال ہے کہ لفظ (Algorism) الخوارزمی کا یورپی تلفظ ہے۔ (خوارزم میں واو لکھا جاتا ہے مگر بولا نہیں جاتا) اسی طرح (zero) بھی عربی صفر کا یورپی تلفظ ہے۔ اس سے

پتہ چلتا ہے کہ عرب کو یورپ پر حساب میں فضیلت حاصل ہے۔ جب ہندی ہندسوں کی یورپ میں اشاعت ہوئی تو انھوں نے ان کا نام عربی ہندسے تجویز کیا کیونکہ وہ ان کو عرب ہی سے حاصل ہوئے تھے۔

نقشہ نمبر ۲

	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۰
ناناغانی ہندسے	—	=	≡	¥		ϸ	7		2	
	—	=	≡	4	h	6	?	4	3	
دیوناگری ہندسے	१	२	३	४	५	६	७	८	९	०
عربی مشرقی ہندسے۔	١	٢	٣	٤	8	٦	V	٨	9	०
غوباری یا عربی مغربی ہندسے	1	2	ϡ	۴	4	6	7	8	9	0
بوتیوں کے ہندسے	I	T	کم	صو	G	L	∧	8	9	

مذکورۂ بالا نقشہ میں قدیم ہندی ہندسے موجود ہیں جن سے کچھ کچھ پتہ چلتا ہے کہ کس طرح بتدریج ارتقا ہوتا ہوا اُس وقت تک چلا گیا جب سے عربوں نے ان کا استعمال شروع کیا پھر ان کے دور میں بھی ارتقا جاری رہا۔ اگرچہ موجودہ عربی اور یورپی ہندسوں کی شکلیں پہلے سے بہت مختلف ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اصل ایک ہی ہوگی۔

نقشہ نمبر ۳

اردو۔ فارسی۔ عربی	۱	۲	۳	۴-۴-٤	۵-٥	۶	۷-٧	۸	۹	۰
انگریزی	1	2	3	4	5	6	7	8	9	0
موجودہ ہندی	१	२	३	४	५	६	७	८	९	०

نانا غانی ہندسے دوسری صدی قبل مسیح میں ہندوستانیوں کے یہاں رائج تھے جن سے مشابہ
وہ ہندوستانی ہندسے ہیں جو کھدائی میں دستیاب ہوئے۔ ان دونوں کی شکلیں پرانے بسیط
ہندسوں سے ملتی جلتی ہیں۔ دیوناگری ہندسوں کو پہلے دونوں پر صفر کی وجہ سے فوقیت حاصل
ہے ان کا ابتدائی سراغ آٹھویں صدی عیسوی میں ملتا ہے۔ قدیم عربی یعنی مشرقی عربی ہندسے
جو دسویں صدی عیسوی کے آخر میں اصل مکتوب سے شیراز میں نقل کئے گئے موجودہ ہندسوں
سے اگرچہ مختلف ہیں مگر شابہت پائی جاتی ہے مشرقی ہندسے ان ہندسوں سے مختلف ہیں جنکو اندلس وغیرہ بلاد
مغرب کے عرب کام میں لاتے تھے جیسا کہ غوباری ہندسے دیکھنے سے معلوم ہوگا۔ یورپ نے بارھویں صدی عیسوی
میں غوباری ہندسے سیکھے اس لئے یورپی ہندسے آج تک غوباری یا مغربی عربی ہندسوں سے مشابہ ہیں۔

بوتیوس پانچویں صدی عیسوی میں ایک رومی فلسفی گذرا ہے جس کی طرف نقشہ نمبر ۲
کی آخری سطر کے ہندسے منسوب ہیں۔ ان سے یورپ والے پانچویں صدی عیسوی میں کام
لیا کرتے تھے پھر یہ فتح اسلامی سے پہلے ہی ناپید ہوگئے تھے۔ اس بنا پر بعض یورپی لوگوں
کا خیال ہے کہ ہندی ہندسے (یا عربی) جو بارھویں صدی میں ظاہر ہوئے ہرگز وہ ہندسے
نہیں ہیں جو عربوں سے لئے گئے بلکہ بوتیوس کے ناپید ہونے والے ہندسے دوبارہ دستیاب
ہو کر استعمال میں آنے لگے۔ بعض زیادہ متعصب یورپی حضرات کا خیال ہے کہ مغربی عربوں
نے یہ ہندسے ابتدا میں یورپ ہی سے لئے تھے۔ اس قسم کے خیالات تعصب نے بعض
لوگوں کے دماغ میں پیدا کر دیئے لیکن عام طور پر یورپی مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ
یورپ میں مروج ہندسے عرب سے لئے گئے ہیں جنھوں نے ہندوستانیوں سے سیکھے۔

رقمیں

رقمیں اعداد سے بالکل مختلف چیز ہیں۔ ان کو نہ تو ہندسوں میں شمار کیا جاسکتا ہے اور

نہ عدد حرفی میں بلکہ یہ پورے پورے الفاظ ہیں جن کی زودنویسی نے یہ شکل بنادی۔ مثلاً ایک کو عربی میں "واحد" کہتے ہیں جب یہ تیزی سے خط شکست میں لکھا جائے گا تو اس کی یہ شکل ہوگی (وسد) اس رقم (عمص) کی مشابہت خط شکست میں لکھے ہوئے "واحد" سے ظاہر ہے جب ہاتھ زیادہ تیزی کی طرف مائل ہوا تو درمیانی شوشہ غائب ہو کر یہ شکل (عمص) بن گئی جس وقت اور زائد سریع حرکت عمل میں لائی گئی تو ابتدائی اور انتہائی سرے مل کر یہ شکل (عم) عالم وجود میں آئی جو عام طور سے رائج ہے۔

اسی طرح دو کو عربی میں "اثنان" کہتے ہیں اس کو خط شکست میں لکھنے سے یہ شکل پیدا ہوئی (ممل) اور بعد میں یہ صورت (عمل) ہوگئی۔ جب ہاتھ کی تیزی زیادہ ہوئی تو درمیانی شوشہ غائب ہو کر یہ شکل (عل) رہ گئی۔

مندرجہ ذیل نقشوں سے معلوم ہوگا کہ الفاظ کی کتابت میں کس طرح تغیر ہو کر موجودہ رقموں کی شکلیں تیار ہوئیں۔

اکائیاں

اردو گنتی	ایک	دو	تین	چار	پانچ	چھہ	سات	آٹھ	نو	
عربی گنتی	واحد	اثنان	ثلث	اربعہ	خمسہ	ستہ	سبعہ	ثمانیہ	تسعہ	
شکستہ تحریر	وسد	ممل	ملب	ممعہ	ممہ	سہ	سعہ	ممسہ	سعہ	
رقم	عمص	عمل	ے	للعہ	ص	سے	معہ	ملے	لعہ	
	عمص	عل								
	عم	.								

دہائیاں

اردو گنتی	دس	گیارہ	پندرہ	بیس	پچاس	ساٹھ	ستر	اسی	نوے
عربی گنتی	عشرہ	احد عشر	خمسۃ عشر	عشرین	خمسین	ستین	سبعین	ثمانین	تسعین
شکستہ تحریر	عسرہ	رحد عسرہ	عسرہ	حسرہ	مسرہ	سمعہ	سعہ	ممسہ	سعہ
رقم	عہ	لعہ	عہ	عسہ	مہ	سہ	معہ	مسہ	لعہ

سیکڑے

اردو گنتی	سو	دوسو	پانچ سو	نوسو	ہزار				
عربی گنتی	ماۃ	مائتین	خماۃ	تسعماۃ	الف				
شکستہ تحریر	مار	ماسن	خمسار	لسعار	الف				
رقم	ما	مار	حمار	لعمار	الــ				

الفاظ

(عرش تیموری صاحب)

عرش صاحب نے اپنے اس مختصر مضمون میں یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ کسی ادیب یا فن کار کی صحیح تنقید محض اس کے آرٹ کی ظاہری خوبیوں کا شمار نہیں ہے بلکہ اس کی ان روحانی کیفیات کا احساس کرنا ہے جن کی بدولت وہ آرٹ معرض وجود میں آیا۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ نقاد محض نفسیاتی ڈاکٹر ہو کر رہ جائے بلکہ یہ کہ نقاد محض ظاہری خوبیوں ہی پر نہ جائے بلکہ شاعر یا فن کار کے جذبات سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرے (مدیر)

آپ کسی مشاعرے، ادبی مجلس، کالج ہوسٹل، کانفرنس یا ہوٹل (تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا جواڈا بھی ہوں) میں چلے جائیے! ——— وہاں پہونچ کر کوئی نظم یا ادب پارہ سنا دیجئے، تو چند منہ بنائیں گے۔ اور چند جھوم جائیں گے۔ آپ ان سے تنقید کے طالب گار ہوں گے تو وہ آپ سے خالص جمالیاتی اصطلاحات میں اپنے خیال کا اظہار کریں گے ——— مثال کے طور پر یہ چند لفظ۔

"نہایت جمیل" ——— "مرصع" ——— یا ——— "فصاحت سے گری ہوئی" ——— "واہیات" وغیرہ

اگر آپ کا دماغ عبرت پسند ہے تو آپ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ——— لامحالہ آپ سوچیں گے کہ سائنٹفک تنقید کے اس ہندوستان گیر فقدان کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

کسی مجازی خالق، حسن کار اور ادیب و شاعر کی کاوشِ دل و دماغ پر غور کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کسی شہ پارے سے حسن کار کے عقائد و خیالات کا پس منظر، گردوپیش اور طرز زندگی کو دریافت کیا جائے اور جب حسن کار کا عالم ذہن متعین ہو جائے تو پھر اس کے فکر کی بلند پروازی سے لطف یا فائدہ اٹھایا جائے ——— اس روشناسی کا ذریعہ یقیناً الفاظ ہیں۔

ماہرین نفسیات نے ثابت کیا ہے کہ ہر لفظ کے ساتھ کچھ نفسی ایتلاف (Psychological Associations) ہوتے ہیں یعنی جب ایک لفظ سامعت کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا دماغ تک پہونچتا ہے تو ایک معنی لئے ہوئے ہوتا ہے لیکن دماغ میں ان معنوں کے بطن سے نئے نئے لفظ پیدا ہوتے چلے

جاتے ہیں ــــــ بسا اوقات یہ ایک اکیلا لفظ مختلف دماغوں پر مختلف اثرات ہی نہیں ڈالتا بلکہ بعض اوقات ان معنوں کا بھی عکس ڈالتا ہے جو اس کے "رواجی" اور "سادہ" معنوں کا ضد ہوتے ہیں۔

یہ سب حوادث، واقعات، شخصیت، رجحانات اور اسلوب فکر وغور کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور چند واقعات کو لیجئے جن کا میں نے تجربہ کیا ہے۔

شانتی نکیتن کی ایک سرمائی رات کو جبکہ چاند آنولے کی جالدار اور چھدری چھدری شاخوں سے جھانک رہا تھا ــــ چند دوست چاندنی منانے کے لئے نکلے چلتے چلتے میں نے کہا:۔

دیکھو بھئی! میں ایک لفظ کہوں گا ــــ آپ سب حضرات ایمانداری سے کہیں کہ اس لفظ کے سنتے ہی آپ کے دماغ میں کون کون سے تصور آتے ہیں ــــ اور اس کے بعد میں نے کہا:۔ پہاڑ! ــــ "اونچائی" ــــ "سیاہ" ــــ "گرنا" ــــ "پستی" اور "کوئی لفظ نہیں آتا" جوابات تھے۔

اس سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ رجحانات شخصیت اور اسلوب فکر وغور کی آمیزش سے ایک ہی لفظ سے کیا کیا تصورات پیدا ہو گئے جن کی ان لفظوں سے ترجمانی ہو رہی ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ میرے ایک دوست تھے جن کے سامنے اگر کسی کے منہ سے لفظ "پانی" نکل جاتا تو مارے خوف کے کانپنے لگتے تھے (یہ وہی خوف ہے جسے نفسیات کی اصطلاح میں WATER complex کہتے ہیں) ــــ اس خوف کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے ایک دوست کو کھیلتے ہی کھیلتے پانی میں ڈوبتے دیکھا تھا ــــ اس حادثے کے اثر نے لفظ "پانی" کو اُن کے لئے بھیانک بنا دیا تھا۔

آپ کو درسگاہوں میں بھی بہت سی دلچسپ باتیں نظر آئیں گی جیسے کوئی سبق ہو رہا ہے ــــ اس میں کہیں کسی راجہ اور رانی کا ذکر آ جاتا ہے تو لڑکے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور مسکراتے ہیں۔

ان مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نفسی ائتلاف معانی میں کس قدر فرق پیدا کر دیتا ہے۔
چنانچہ جب آئرلینڈ کا مشہور شاعر ٹی۔ایس۔ الیٹ ایک نظم گینڈا لکھتا ہے تو اکثریت گینڈا سے
مراد جانور ہی لیتی ہے اور صرف چند آدمی جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں سمجھتے ہیں کہ گینڈے سے مراد
"سیاست" ہے ـــــ یہاں یہ واضح رہے کہ الیٹ ان شاعروں میں سے نہ ہے جو ابہام نہیں پیدا
کرتے بلکہ اپنی نظم میں شرح کو بھی پوشیدہ کر دیتے ہیں۔

یہ تمہید جو آپ کے سامنے عرض کی گئی ـــــ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان ائتلافات کو نظر
رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ نظم و نثر دور حاضر اور آئندہ کے تجزیہ و تحلیل۔ اور کسی ادیب
و شاعر کی واردات قلب و نظر جانچنے کے لئے موجودہ کتب لغات کے معانی ممد و معاون نہ ہو سکتے
ہیں نہ ہو سکیں گے ا

دوسرے ایک یہ اعتراض بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ ائتلافات بھی نظم و نثر کے تجزیہ و تحلیل میں
ایک خطرناک سنگ راہ ثابت ہو رہے ہیں اور ہوں گے تو پھر کیا کیا جائے ؟

جدید اور آئندہ ادب نظم و نثر کے لئے تنقید کے اصول کیا ہوں ؟ اور سخن فہمی کا معیار کیا ہو ؟

کیا سہل ممتنع حسن کاری (Abstract Art) کے لئے ذہانت کافی ہے ؟

ہمارے ہاں کے بڑے بڑے نقاد اور وہ جو "پڑھے لکھے" مشہور ہیں، جب کسی شاعر کے
کلام کا تجزیہ و تحلیل کرنے بیٹھتے ہیں تو سب سے پہلے ان کا "ذہن" "معنی کی طرف منتقل ہوتا ہے
پھر ذیلی چیزیں ـــــ "فصاحت" ـــــ "تشبیہات" ـــــ "استعارے" ـــــ "صفائی زبان"
اور "اسلوب بیان" وغیرہ

حالانکہ معاف کیجئے، یہ وہ مضحکہ خیز غلطی ہے جو اردو ادب کے ناخدا ابتدا سے اب
تک برابر کرتے آرہے ہیں ۔

"بارہ دری میں بیٹھے ہیں شش در بنائیں گے" والی شاعری یا "لاہاتھ مٹھی کھول یہ چوری
یہیں نکلی" ختم ہو چکی۔ لیکن اب بھی نقد و تبصرے کا ڈھیر وہی ہے، جو اس "بیمار شاعری"

سے کے وجود نے پیدا کیا تھا۔

آدم برسرِ مطلب! ادبیات کا طالب علم جو عصرِ حاضر اور عصرِ مستقبل کے ادب عموماً اور شاعری خصوصاً کا مطالعہ اور تجزیہ و تحلیل کرنا چاہئے اسے اسلوب بیان، تشبیہات، صفائی زبان، فصاحت اور استعاروں سے آنکھیں پھیر لینی چاہئیں

اس کے دماغ میں وہی نفسی ایتلافات پیدا ہونے چاہئیں جو کلیم کے دماغ میں تخلیق کلام کے وقت ہوں گے اسے اُن اثرات سے کنارہ کش ہونے کی کوشش کرنی چاہئے جن کا جنم بھوم زندگی کے واقعات و حادثات یا غیر شاعرانہ رجحانات ہوں

اسے محض "قلبی و روحانی واردات" ہی کو نشانہ کرنا چاہئے جنھیں کسی ادیب و شاعر یا حسن کار نے الفاظ، اسلوب تشبیہات اور فصاحت و بلاغت کے پردوں کے پیچھے چھپا رکھا ہے۔

ہر نظم میں دو حصے ہوتے ہیں —— ایک حصہ شخصی کہلاتا ہے اور دوسرا غیر شخصی یا عکسی۔ شخصی حصے میں کیفیات ذہن یا قلبی و روحانی واردات ہوتی ہیں اور غیر شخصی یا عکسی حصے میں الفاظ بیان اور وزن و قافیہ ہوتا ہے۔ لہٰذا تا وقتیکہ تجزیہ و تحلیل کرنے والا کسی نظم و نثر کے عکسی حصے سے نظر و توجہ کو پھیر نہ لے وہ نظم کی اصلی روح پر فائز نہیں ہو سکتا چنانچہ رچرڈس بھی اپنی کتاب ادبی تنقید کے اصول "Principles of Literary Criticism" میں لکھتا ہے:-

"فن کار سب سے زیادہ اس امر سے تعلق رکھتا ہے کہ وہ ان واقعات کو محسوس کر کے دوام بخشے جو اس کے نزدیک بہت زیادہ لائق لطف ہیں۔"

بالفاظ دیگر رچرڈس کا مطلب یہ ہے کہ حسن کار واردات قلب و روح کا ابر بے پروا خرام ہے سہل ممتنع حسن کاری کے تجزیہ و تحلیل کے لئے علمیت یا ذہانت کی زیادہ ضرورت نہیں بلکہ صحیح نفسی ایتلافات خود اپنے نفس میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور جب تک ادبیات کے طالب علم یا نقادوں میں ایتلافات صحیح نہ پیدا ہوں گے وہ جدید ادب کی روح سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

(سید ناصر الدین صاحب ہاشمی)

[خودکشی فرانسیسی تمثیل نگار Gabriel Timmory کے ایک ڈرامہ سے ماخوذ بلکہ قریب قریب اس کا ترجمہ ہے]

افراد

مختار افروز — ایک تمثیل نگار

احمد داؤد — ایک افسانہ نگار

حبیب الرحمٰن حبیب

[مسوری۔ ہوٹل کا ایک کمرہ۔ دائیں جانب غسل خانے کا دروازہ ہے۔ بائیں جانب باہر جانے کا۔ ایک طرف مسہری لگی ہوئی ہے۔ وسط میں لکھنے کی میز رکھی ہے۔ میز پر ٹیلیفون رکھا ہے۔

پردہ اٹھتا ہے .... مختار افروز بیٹھا لکھ رہا ہے .... توانا آدمی ہے ..... عمر تقریباً ۳۵ سال ہوگی۔ بائیں آنکھ پر "ایک چشمہ" ہے۔ بائیں کہنی کے پاس ایک تار رکھا ہے ..... کھلا ہوا سوٹ کیس پلنگ کے پاس رکھا ہے۔ اس میں رکھا جانے والا سامان اس کے گرد پڑا ہے۔ افروز کا ہیٹ اور اوورکوٹ پلنگ پر پڑے ہیں]

افروز (لکھ رہا ہے) احمد — "بشیر آئندہ ہم تم دونوں مل کر کام نہیں کر سکتے ...... یہ امید کہ کبھی نہ کبھی اتحاد ضرور ہوگا بیکار ہے۔ میں بالکل ناامید ہو چکا ہوں۔ کیوں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔؟" بشیر — "میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں .... مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے" احمد — "لیکن تم کیا رقم لیکر علیحدہ ہو جاؤ گے؟ (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے ...... افروز ریسیور اٹھاتا ہے) ارشاد! ...... کیا فرمایا؟ کیا نام؟ .... محمود؟ اوہ! ..... داؤد ...... احمد داؤد؟ ...... جی ہاں! ...... برائے مہربانی ان کو

یہاں بھیج دیجئے (ریسیور رکھ دیتا ہے) بشیر کس قدر مانگے گا؟...... ۵ ہزار...... میری جیب سے تو کچھ جاتا نہیں رہا...... (لکھتا ہے) بشیر پچاس ہزار" احمد ـ "بہت مانگ رہے ہو!" (دروازے پر دستک ہوتی ہے) اندر چلے آؤ۔

داؤد ۔ (داخل ہوتا ہے...... کوئی چالیس سال کی عمر ہے...... خوش مزاج معلوم ہوتا ہے...... لباس سادہ ہے) کہو بھئی افروز...... کیا حال ہے؟..... معلوم ہوتا ہے کہ قدرت مجھے مصوری تک تم ہی سے ملانے کو کھینچ لائی ہے۔

افروز۔ لیکن بھئی یہ تو بتاؤ کہ تمہیں پتہ کیسے چلا کہ میں یہاں آگیا ہوں؟

داؤد ۔ کیا پوچھتے ہو!...... ذراسی گڑبڑ ہوگئی...... لیکن بھئی میں تو اس گڑبڑ کو دعا ہی دیتا ہوں.... کیونکہ اس کی وجہ سے تم سے ملاقات ہوگئی۔

افروز۔ تم سے اس طرح اچانک مل کر بہت خوشی ہوئی ہے...... ایسی گڑبڑ روز ہو تو اچھا ہے۔

داؤد۔ بہت دنوں سے چھٹی لینے کی سوچ رہا تھا.... تھوڑے دن ہوئے نواب زادے صاحب نے یہاں آنے کے لئے بہت اصرار سے لکھا۔ اونگتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ملا۔ میں فوراً چھٹی لے کر کل رات روانہ ہوا..... ابھی گھنٹہ بھر ہی تو ہوا ہے کہ یہاں پہنچا ہوں... نواب زادے صاحب کو تو جانتے ہو گے؟

افروز۔ ارے میاں اگر میں یہاں کسی کو جانتا ہوتا تو ہوٹل میں آکر ٹھہرتا؟

داؤد۔ واہ بھئی..... تم بھی کیا آدمی ہو! نواب زادے صاحب کو نہیں جانتے؟.... بڑے پُرلطف آدمی ہیں کپڑے کا بڑا کاروبار ہے...... خلوص تو بہت ہے لیکن بھئی...... ذرا یادداشت خراب ہے...... میں چونکہ ان کو اچھی طرح جانتا ہوں اس وجہ سے ان کی کسی ایسی ویسی حرکت سے ناراض نہیں ہوتا...... اب ذرا اسی کو دیکھو!...... مجھے تو اس اصرار سے بلایا اور جو کمرہ میرے لئے مخصوص کیا تھا اس میں ان کے ایک رشتے دار ٹھہرے ہوئے ہیں...... میں جو پہنچا تو بڑے گھبرائے..... اپنی صفائی پیش کرنے لگے..... حسب عادت بالکل بھول گئے تھے کہ مجھے بلایا ہے..... شرم سے پانی پانی ہوئے جاتے تھے...... میں نے کہا کیا بات ہے میں ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا

افروز۔ اچھا تو آپ اس طرح وارد ہوئے ؟

داؤد۔ اجی جناب کیا پوچھتے ہیں!...... اب جو ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں وہ تو قسمت اچھی تھی کہ منیجر صاحب وہیں کھڑے تھے انھوں نے بتایا کہ ایک گھنٹے میں افروز صاحب جانے والے ہیں۔ اگر آپ اتنی دیر توقف کریں تو وہ کمرہ آپ کے لئے حاضر ہے...... مجھے یقین بھی نہ آیا کہ تم یہاں ہو سکتے ہو۔ میں نے ان سے تشریحاً پوچھا کہ "مختار افروز صاحب ـ ڈرامہ نویس" انھوں نے کہا "جی ہاں" میں نے کہا "اگر وہ موجود ہوں تو انھیں میرے آنے کی اطلاع کر دیجئے۔

افروز۔ خیر بھئی تم خوب آئے! مگر یہ ستم ظریفی دیکھو کہ جب میں جا رہا ہوں تو تم آئے!

داؤد۔ لیکن تم واپس کیوں جا رہے ہو ؟

افروز۔ اور کروں بھی کیا ؛ میرا نیا ڈرامہ تمثیل ہونے والا ہے...... اور میں یہ کبھی نہیں برداشت کر سکتا کہ اس کا خون ہو۔ (تار اٹھا کر دکھاتا ہے) ذرا دیکھو تو!...... یہ ہے تار جو انھوں نے بھیجا ہے۔ "بدر سے احمد کے پارٹ کے لئے بات چیت ہو رہی ہے"...... ڈرامے تمثیل کرتے مدت گزر گئی اور یہ نہیں جانتے کہ پارٹ کیسے آدمی کو دینا چاہیئے...... تم تو بدر کو جانتے ہو نا ؟

داؤد۔ کیوں نہیں ؛ اپنے وقت کا یوسف ہے...... نہایت خوبصورت۔

افروز۔ بس خوبصورت ہی ہے...... اور حرکتوں سے نسائیت برستی ہے!

داؤد۔ ہاں نسائیت تو ہے لیکن اس سے ایک خاص نرمی پیدا ہو گئی ہے۔

افروز۔ بس یہ نرمی ہی تو سارے ڈرامے کا ستیاناس کر دے گی...... احمد کے پارٹ کے لئے ایسے اداکار کی ضرورت ہے جس میں کچھ شخصیت ہو...... جو سنجیدہ پارٹ کر سکتا ہو...... جو کچھ درد کا اظہار کر سکتا ہو...... اور وہ ایسے اداکار کو کبھی ڈھونڈھ کر نہیں نکال سکتے...... جیسے ہی مجھے ان کا تار ملا میں نے فوراً انھیں جوابی تار بھیجا کہ میں خود آ رہا ہوں...... اگر وہ احمد کا پارٹ بدر کو دینے پر مصر ہوئے تو میں اپنا ڈرامہ واپس لے لوں گا...... ڈرامہ نویسی بھی بڑی مصیبت ہے

ذرا ذرا سی بات پر معرکہ آرائی ہوتی ہے...... تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہیں اس جھنجھٹ سے دو چار ہونا نہیں پڑتا...... تم سمجھ بھی نہیں سکتے کہ یہ معمولی معمولی سی باتیں کس قدر پریشان کرتی ہیں

داؤد۔ خدا کا شکر ہے بھئی میں ایسی ملتوں سے بچا ہوا ہوں۔

افروز۔ بھئی تم خوب دماغ سے اتار کر لکھتے ہو...... تمہارا کالم بڑا ہی دلچسپ ہوتا ہے۔

داؤد۔ اب تو مجھے اس کی رگ مل گئی ہے...... بھئی پندرہ سال ہونے آئے...... روز ایک کالم لکھتا ہوں...... اگر اب بھی مشق نہ ہوگی تو پھر کب ہوگی...... سال کے سال ایک ناول لکھ لیتا ہوں۔ خاصی اچھی طرح گذارہ ہو جاتا ہے...... یہ میں جانتا ہوں کہ مجھے حیات ابدی تو ملنے سے رہی۔

افروز۔ تم خوش تو ہو؟

داؤد۔ ہاں بھئی آرام سے گذرتی ہے...... قانع آدمی ہوں...... لیکن بھئی یہ میری کیسی بدقسمتی ہے کہ تم ابھی جا رہے ہو اور میں ابھی آیا ہوں۔

افروز۔ لیکن اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے!...... مجھے خود جانے کا بڑا رنج ہے!

داؤد۔ (لکھتے ہوئے کاغذ دیکھتا ہے) تم لکھ رہے تھے؟

افروز۔ ہاں بھئی...... یہ پیشہ ہی جو ٹھہرا!...... میں دوسرے ایکٹ کا اختتام لکھ رہا تھا۔

داؤد۔ اور میں آ کر تمہارے کام میں مخل ہوا۔

افروز۔ جب میرا ڈرامہ تمثیل ہونے والا ہوتا ہے تو مجھے گھڑی بھر بھی سکون نہیں مل سکتا...... آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے...... اور کبھی قسمت سے ان سے فرصت ملتی ہے تو یہ الجھن کہ ڈرامہ کیسا تمثیل ہوتا ہے پیچھا نہیں چھوڑتی... تمہارے آنے سے پہلے تین آدمی اور آ چکے ہیں۔

داؤد۔ لیکن میں تمہارا وقت نہیں خراب کرنے کا! نواب زادے صاحب کے ہاں سے اپنا سامان لینے جا رہا ہوں میرے آنے تک تو تم یہیں ہو گے نا؟

افروز۔ بھئی دس منٹ سے زیادہ ٹھہرنا مشکل ہے۔

داؤد۔ (کمرے کو دیکھتا ہے) کمرہ برا تو ہے نہیں...... اس کے ساتھ غسل خانہ بھی ہے؟

افروز۔ (دروازے کی طرف اشارہ کرکے، ہے! یہ ہے اس کا دروازہ

داؤد۔ ٹھیک ہے۔ اچھا اب چلتا ہوں (ہاتھ سے سلام کا اشارہ کرتا ہے اور چلا جاتا ہے)

افروز۔ (لکھنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے) ہوں! کہاں تک لکھا تھا...... بشیر۔ "پچاس ہزار" احمد۔ "بہت مانگ رہے ہو" لیکن یہ ٹھیک نہیں ہوا...... احمد جیسی شخصیت کا آدمی کبھی نہیں چکانے کا......

آخری سطر کی جگہ ایسا فقرہ لکھنا چاہئے جس سے ذرا جان پڑ جائے...... ہوں! احمد۔ "تم پچاس ہزار مانگ رہے ہو...... میں تمہیں ستر ہزار دوں گا"...... میرا تو کچھ خرچ نہیں ہو رہا۔ بشیر (متحیر ہوکر) "ستر ہزار؟ یہ تو بہت ہیں" بس ایک سطر احمد کی اور...... مزے داری...... (ایک منٹ سوچ کر) احمد۔ "واحد مالک بننے کے لئے آدمی جو کچھ بھی دے تھوڑا ہے"...... اب ٹھیک ہے......

یہاں ختم کر دینا چاہئے...... "پردہ گرتا ہے"...... اوہو...... (کاغذ اکٹھے کر رہا ہوتا ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے) ارشاد! حبیب الرحمان صاحب حبیب!...... کبھی نیاز کا شرف نہیں ہوا......

اخبار کے نمائندے!...... آپ یہاں بھیج دیجئے...... (ریسیور رکھتا ہوا کہتا ہے) پانچویں صاحب آئے (دروازے پر دستک ہوتی ہے) اندر تشریف لے آیئے۔

حبیب۔ (دبلا سا جوان آدمی۔ چہرے پر زردی سی ہے...... لباس پرانا سا ہے لیکن صاف ہے...... ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس ہے) معاف کیجئے گا...... مختار افروز صاحب، میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔

افروز۔ اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے! (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) آپ تشریف رکھیئے......

آپ کس اخبار کے نمائندے ہیں؟

حبیب۔ افروز صاحب! حقیقت یہ ہے کہ میں کسی اخبار کا نمائندہ نہیں ہوں...... مجھے اتفاق سے معلوم ہو گیا کہ آپ یہاں ہیں...... مجھے آپ سے غائبانہ تعارف تو تھا ہی...... مجھے علم ہے آپ کس قدر نرم دل ہیں...... (پر درد آواز میں) مایوسی انتہا کو پہنچ چکی ہے!...... میں تکلف سے دست بردار ہوتا ہوں...... مصیبت سب کچھ کرا لیتی ہے...... مجھے آپ کو تکلیف دینی ہی پڑی...... میں آداب و اخلاق کی پابندیوں کی پرواہ نہیں کر سکتا۔ میری روداد ناکامی......

افروز (مداخلت کرتے ہوئے اٹھنا چاہتا ہے) مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں اور زیادہ نہیں ٹھیر سکتا.....
میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے ابھی جانا ہے اور.....

جلیب (کرخت آواز میں) آپ سُنیں گے۔

افروز۔ لیکن.....

جلیب۔ آپ کو سُننی پڑے گی

افروز۔ میں آپ سے پھر عرض کرتا ہوں کہ مجھے ابھی.....

جلیب۔ آپ پہلے یہاں بیٹھ جائیے

افروز۔ لیکن آپ غور تو کیجئے۔

جلیب۔ (پُر درد آواز میں) تشریف تو رکھئے!..... آپ کا بڑا کرم ہوگا!

افروز۔ (بیٹھتا ہے) کہیے!

جلیب۔ میری روئداد یہ ہے (بیٹھ جاتا ہے اور اپنا بکس میز پر رکھ دیتا ہے) میں لکھنؤ کے ایک معزز
خاندان کا فرد ہوں....... لیکن فلکِ کینہ ساز کسی کو ایک حالت میں نہیں دیکھ سکتا! سب
ہی کو یکے بعد دیگرے اپنی گردش میں پیس ڈالتا ہے... میرے خاندان کے بھی بُرے
دن آگئے ہیں.... میرے والدین نے....

افروز۔ جناب

جلیب۔ مجھے کہنے دیجئے۔ (سلسلہ جاری رکھتا ہے) میری اوائل عمر سے ہی میرے والد نے مجھے فوج
میں بھیجنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن مجھے فوج کی نوکری سے سخت نفرت ہے......
میں ایک صلح پسند آدمی ہوں..... آشتی میرا ایمان ہے...... میں شہرت چاہتا ہوں
لیکن میری یہی آرزو رہی کہ میں ادب کی خدمت کر کے اپنا نام روشن کروں مجھے کامل
یقین تھا کہ جلیب میر یا غالب سے پیچھے نہیں رہ سکتا... لیکن یہ سب تو اوہامات تھے
...... ایک سراب تھا جو میرے پیشِ نظر تھا.... ایک خواب تھا جو فضا میں منتشر ہوگیا...

میرے والد کی رگوں میں فوجی خون ہے..... وہ ادب کو لغویات سے تعبیر کرتے ہیں.... شاعری اُن کے لیے تضیع اوقات ہے..... اساتذہ سے اُنہیں سخت نفرت ہے... تشبیہہ و استعارہ سے اُن کا دم اُلجھتا ہے... میں نے ہمیشہ انہیں صاف بات کہتے سُنا اور وہ بھی نہایت کرخت لہجے میں..... اُن کے سامنے کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اُن کی مخالفت کرے..... جب میں نے فوج میں جانے سے انکار کیا تو اُن کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہیں رہی...... انھوں نے مجھے عاق کر دیا اور قسم کھائی کہ دوبارہ کبھی میری شکل نہیں دیکھیں گے، وہ اپنی بات کے پکے ہیں.... جو بات ایک دفعہ منہ سے نکل جائے پتھر کی لکیر ہوتی ہے

افروز۔ (اپنی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُٹھتا ہے) مجھے بہت افسوس ہے لیکن چونکہ وقت.....

حبیب (بیٹھ جانے کا اشارہ کرتا ہے.... نہایت تند و ترش لہجے میں) سُنیئے۔ (افروز بیٹھ جاتا ہے).... میں دو سال تک زمانے سے جد و جہد کرتا رہا۔ ہزار کوششیں کیں کہ کہیں سر گھسانے کی جگہ مل جائے ہر طرف ہاتھ پیر مارے مگر ناکامی سے دوچار ہونا پڑا...... میں نے غزلیں لکھیں.... جو کسی رسالے نے شائع کرنی پسند نہ کیں..... میں نے ڈرامے لکھے لیکن کسی نے اُن کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا.... کبھی کسی اخبار نے کوئی مضمون چھاپ بھی دیا تو اجرت اس قدر کم دی کہ لیتے شرم آتی تھی..... (اپنے دماغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں جانتا ہوں کہ میرے پاس کوئی معمولی دماغ نہیں... مجھ میں جوہر ہیں لیکن اُن کا انکشاف ہو تو کیونکر ہو جب کہ سب شائع کرنے والوں نے مل کر قسم کھائی ہے کہ میرے قلم سے نکلا ہوا ایک حرف بھی نہیں چھاپا جائے گا!..... آپ مجھے اجازت دیں تو اپنی ایک آدھ غزل.....

افروز۔ وقت بہت ہو گیا....

حبیب۔ میں اصرار نہیں کرتا..... میں دراصل سُنانا بھی نہیں چاہتا کیونکہ اگر آپ نے کچھ بھی سُن لیا

تو آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ کس ہیرے کو پاش پاش کیا جا رہا ہے.... آپ میرے ساتھ ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ ایسا ایک لفظ بھی ہمدردی کا استعمال کریں (ایک ٹھنڈا سانس لیتا ہے اور کہانی جاری رکھتا ہے) جو کچھ بھی تھوڑی بہت رقم میرے پاس تھی سب خرچ ہو گئی۔ میں پیسے پیسے کو محتاج ہو گیا.... آمدنی کی کوئی صورت نہ نکلتی تھی آخر خودداری کا خون کر کے یہاں اپنے ماموں زاد بھائی کے پاس آیا کہ اگر دو ہفتے مجھے اپنے ہاں رکھ لیں تو میں اس اثنا میں ایک ڈرامہ یا ناول لکھ لوں..... یہ میری آخری کوشش ہوتی.... مجھے بڑی قوی اُمید تھی کہ میری یہ کوشش ضرور بار آور ہو گی.... میں نے ڈیرہ دون تک تیسرے درجہ میں سفر کیا.... میرے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ ریل کا ٹکٹ خرید لیتا...... ڈیرہ دون سے یہاں تک پیدل آیا..... تو یہاں قدرت نے ایک نیا گل کھلایا...... مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا..... اپنے بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں.... مجھے دروازے کے اندر بھی نہیں گھسنے دیا..... میری اس قدر تحقیر..... مجھ میں اب برداشت باقی نہیں..... کل دوپہر سے اب تک ایک روٹی بھی کھانے کو نہیں ملی..... (کھڑا ہو جاتا ہے....اور دیوانہ وار کہتا ہے)... کیا کروں؟.... کہاں جاؤں؟ ..... میرا کیا حشر ہو گا؟ (یہ دیکھ کر کہ افروز نے اپنے بٹوے میں سے ایک روپیہ نکالا ہے) آپ کیا کرتے ہیں؟.....

افروز۔ (روپیہ پیش کرتا ہے) چونکہ آپ اس قدر تنگ حال ہیں۔

جلیب۔ (ترش ہنسی ہنستے ہوئے) جی! آپ مجھے ایک روپیہ پیش کرتے ہیں؟

افروز۔ لیکن۔

جلیب۔ ایک روپیہ! مجھے!..... جلیب کو! جیسے کہ میں خیرات مانگنے آیا ہوں؟

افروز۔ لیکن میرا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ آپ کے جذبات کو ٹھیس لگاؤں

حبیب۔ جی ہاں! اسی کا نام تہذیب ہے؟..... یہی شرافت ہے؟..... اسی طرح سے ایک ادیب سے پیش آیا جاتا ہے؟ اس کی مصیبتیں سن کر اس کو بھیک دی جاتی ہے؟.......
نہیں، نہیں! اب تحقیر کی اور گنجائش نہیں رہی...... رسوائی کی بھی حد ہوتی ہے۔
(اپنے بکس میں سے ریوالور نکالتا ہے)

افروز۔ (خوف زدہ ہو کر) تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ (ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

حبیب۔ ہاتھ نہ بڑھے....

افروز۔ (ساکن ہو جاتا ہے) لیکن جناب....

حبیب۔ میں آپ کو متنبہ کئے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھایا یا کسی کو مدد کے لئے بلانا چاہا تو میں آپ کو نشانہ بنا دونگا.... سمجھے آپ!

افروز۔ لیکن آخر یہ حرکت کیا ہے؟

حبیب۔ کیا ہے؟ میں آپ کو ابھی سمجھائے دیتا ہوں! (دروازے کی طرف جاتا ہے لیکن پستول کی نالی افروز کے سینے کی طرف ہی رہتی ہے.... حبیب دروازے کا کھٹکا لگا دیتا ہے) آپ گھبرائیے نہیں..... آپ کو یہی تشویش ہے نا کہ آیا میں آپ کو قتل کرنے آیا ہوں یا آپ سے کچھ چھیننے آیا ہوں..... آپ خاطر جمع رکھیے..... آپ کسی قسم کے خطرے میں نہیں ہیں..... شکار ہونے والا ہے..... لیکن شکاری اور شکار مختلف نہیں....

افروز۔ (ڈر رہا ہے) تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟

حبیب۔ اسی لمحے

افروز۔ (ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے) لیکن میں آپ کو یہاں خودکشی نہیں کرنے دینے کا!

حبیب۔ (افروز کا نشانہ باندھتے ہوئے) حرکت نہ کیجئے۔ اس گھڑی میں سب کچھ کر گزروں گا! کوئی ایسی حرکت نہیں جو مجھ سے بعید نہیں..... اگر آپ نے حرکت کی تو گولی آپ کے سینے کے پار ہو جائے گی.....

افروز۔ میرے پاس کیا آپ خودکشی کی ہی غرض سے آئے تھے؟

جلیب۔ ہُوں (گردن ہلاتا ہے)

افروز۔ کیا خودکشی کرنے کے لئے یہی جگہ رہ گئی تھی؟

جلیب۔ میری ایک ہی آرزو تھی!...... شہرت! میں نے اُس کے لئے دن رات کام کیا! خون پانی ایک کر دیا..... اس ہی کی وجہ سے بڑی بڑی رسوائیاں برداشت کیں.... میری سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں.... مایوسی کے اندھیرے میں روشنی کو ڈھونڈتا پھرتا تھا...... اعضا نے ہمت ہار دی..... پیروں نے جواب دے دیا تھا دفعتاً روشنی کی کرن نظر آئی.... میں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا.... آپ کے سامنے خودکشی کر کے مجھ حقیر کو آپ جیسے ماہر ڈرامہ نویس کی شہرت سے فیض حاصل ہو جائے گا...... انجم کو سورج سے روشنی مل جائے گی..... گل کو حسن سے زینت..... ممکن ہے میری خودکشی آپ کو ایک نئے ڈرامہ کا مواد فراہم کر دے...... عوام کو جو کہ میرے نام سے بھی آشنا نہیں مجھ سے دلچسپی ہوگی..... میرے حالات کے معلوم کرنے کا اشتیاق ہوگا اور اخبار والے خوب حاشیے چڑھا کر میری زندگی کے حالات لکھیں گے۔

افروز۔ لیکن سوچئے تو آپ اس کے لئے کس قدر بڑی قیمت دے رہے ہیں!

جلیب۔ شہرت جس قیمت پر بھی خریدی جائے سستی ہے.... میں گمنامی سے نجات پاؤنگا۔

افروز۔ جب آپ ہی نہ ہوں گے تو آپ کو اس شہرت سے کیا حاصل!

جلیب۔ شہرت کا خیال ہی میرے لئے بڑی خوشی ہے...... میں اطمینان کے ساتھ جان دوں گا...... مجھے یقین ہے کہ میری موت رائگاں نہیں جائے گی جس چیز کو میں زندگی میں نہیں پا سکا موت مجھے اس تک پہنچا دے گی۔ آج لوگوں میں میرا چرچا ہوگا.... کل میرے رد کئے ہوئے مسودے پڑھے جائیں گے..... پرسوں

انہیں شائع کیا جائے گا..... مجھے معلوم ہے کہ میرے قلم میں جوہر ہیں..... بہت ممکن ہے کہ نقاد مجھے اُستاد کے نام سے ممتاز کر دیں مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں واقعی اُستاد بنا دیا گیا..... (ریوالور کی نالی کنپٹی سے لگاتے ہوئے) اس کی آواز آپ کو ناگوار تو نہیں ہوگی؟

افروز - (جلدی سے) ٹھہریئے!

جلیب - کیوں؟

افروز - آپ ہی تو اپنی زندگی کے مالک نہیں!

جلیب - میں نہیں تو پھر کون ہے؟

افروز - آپ کو عزیز و اقارب کا بھی تو خیال ہونا چاہیئے!

جلیب - کس کا؟ عزیز و اقارب کا؟ مصیبت زدہ کا عزیز کون ہوا ہے! ..... اقارب..... باپ جس نے عاق کر دیا..... رشتے دار..... جو اس کے بھی روادار نہیں کہ میں اُن کی دہلیز میں قدم بھی رکھوں! ..... بیوی میرے نہیں! ..... بچے میرے نہیں..... میں اپنی زندگی کا واحد مالک ہوں..... میں جو چاہوں کروں!

افروز - جوانی میں خودکشی؟

جلیب - جوانی؟ ..... رنج و مصائب نے مجھے ضعیف کر دیا ہے!

افروز - یہ خام خیالی ہے..... آپ جوان ہیں تندرست ہیں..... آپ کو کوئی عارضہ نہیں!

جلیب - مجھے عارضہ ناکامی ہے!

افروز - اس کا علاج ہو سکتا ہے!

جلیب - مرض لاعلاج ہو چکا ہے!

افروز - صرف ہمت اور قوتِ ارادی درکار ہے

جلیب - اس سے بھی افاقہ نہیں ہوا!

افروز۔ آپ ہمت نہ ہاریے!...... دو چار ہاتھ اور رہ گئے ہیں

جلیب۔ کیوں؟ کیا مدیر اپنی قسم توڑ دیں گے؟

افروز مستقبل سے ناامید نہ ہو...... کیا ہے جو ممکن نہیں!

جلیب۔ مستقبل؟ (ہنستا ہے) مستقبل تو بہت بڑی مدت ہے مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ رات کہاں گذرے گی

افروز۔ اگر میں کسی طرح مدد کرنا چاہوں تو آپ گوارا نہیں کریں گے!

جلیب۔ (خودداری کے ساتھ) میں بھکاری نہیں ہوں..... میں فیصلہ کر چکا ہوں (پستول دکھاتا ہے) یہ ہے، میری نجات کی کلید! (اپنی ہتھیلی پر رکھ کر دیکھتا ہے) کس قدر دلچسپ چیز ہے...... دیکھنے میں بالکل بے ضرر ہے...... ایک کھلونا سا معلوم ہوتا ہے...... جیب میں ڈال لو تو ذرا سی جگہ میں آجاتا ہے...... لیکن مصیبت میں بڑا کام آتا ہے...... گھوڑے کو ذرا دبایا...... آواز ہوئی...... اور کرۂ دنیا سے ایک فرد کم ہو گیا...... ایک فرد جس کے دل بھی تھا...... دماغ میں نئے نئے خیالات بھی تھے...... جذبات تھے...... زبان بھی...... حرکت کرتا تھا...... ابھی اس دنیا کا متنفس تھا، چشم زدن میں عدم کا مکین ہو گیا...... کس قدر حیرت انگیز۔

افروز۔ واقعی!

جلیب۔ ذرا اس کی حسن ساخت ملاحظہ کیجئے! کس قدر پاکیزہ بنا ہوا ہے! (افروز کو دکھاتا ہے)

افروز۔ (اٹھتا ہوا...... اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے) ذرا دکھائیے!

جلیب۔ (جلدی سے افروز کا نشانہ باندھ کر) خیال رکھئے آپ کیا کر رہے ہیں (افروز بیٹھ جاتا ہے) آپ قریب آنے کی کوشش نہ کیجئے گا! (دوبارہ پستول کو ہتھیلی پر رکھ لیتا ہے) بعض اس سے بھی زیادہ سادہ ہوتے ہیں لیکن وہ اس قدر اچھا کام نہیں کرتے...... اکثر گھوڑا اٹک جاتا ہے...... بعض بہت آواز کرتے ہیں...... لیکن یہ تو نمونہ ہے قابل ستائش...... بیک وقت سات گولیاں آجاتی ہیں اس کے پرزے اس قدر اچھی طرح جائے ہیں کہ ایک اشارے پر گھوڑا کام کرتا ہے...... آواز بھی بہت

کم ہوتی ہے...... جیسے چٹکی بجی...... اس کا تناسب ملاحظہ ہو...... نالی کس قدر موزوں ہے...
دستہ گرفت میں کس قدر اچھی طرح بیٹھتا ہے...... یہ قیمتی ہتھیار مجھ غریب کے پاس کیسے آگیا؟....
آپ بھی سوچ رہے ہیں نا...... ایک دفعہ اتفاق سے میرے پاس ڈھائی سو روپے آگئے تھے
میرے لئے تو دولت سمجھئے وہ سب میں نے اس بے وقوفی میں ضائع کر دیئے...لیکن اب مجھے
اس کا افسوس مطلق نہیں ہے...... دراصل ایسے ہتھیار کا رکھنا تو آپ کو زیب دیتا ہے.... آپ
صاحب دولت ہیں...... آپ کو اپنی حفاظت کی بھی ضرورت ہے۔ آپ کے تو اکثر کام آتا لیکن
میں صرف اس سے ایک ہی بار فائدہ اٹھا سکتا ہوں...... البتہ یہ میری وصیت ہے کہ اس
ریوالور کو میرے بعد آپ لے لیں...... باتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی...... قضا انتظار کر رہی ہے۔
(پستول کا گھوڑا چڑھاتا ہے) ذرا سی آواز ہوگی! گھبرائیے نہیں! (نالی کنپٹی سے لگاتا ہے)

افروز۔ (بے اختیاری سے) ٹھہریئے!

حبیب۔ کیا ہے؟

افروز۔ آپ ہی نے تو مجھے تدبیر سجھائی ہے...... میری ایک تجویز.... لیکن آپ برا نہ مانیئے گا......
آپ کے جذبات کا احساس ہے.... میں آپ کی خودداری کا احترام کرتا ہوں.... میں آپ کا بہت
ممنون ہوں.... واقعی میں بہت لاپرواہ ہوں خبر نہیں کس رات کیا بیتی آئے میرے پاس کوئی بچاؤ
کا ہتھیار نہیں آپ اس ریوالور کی بہت تعریف کرتے ہیں تو کیوں نہ میں آپ ہی سے ریوالور خرید لوں
میں آپ پر کوئی احسان نہیں کر رہا جس قیمت پر آپ نے خریدا ہے میں اتنی ہی رقم آپ کو دیئے دیتا
ہوں۔ میں آپ کو آپ کی خرید سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں دوں گا۔ کبھی آپ یہ سمجھیں کہ میں اس کے
پردے میں خیرات دیتا ہوں...... یہ تو ایک سودا ہے۔ اس میں تو آپ کے احساسات مجروح نہ ہونے چاہئیں

حبیب۔ (پس و پیش کے بعد) اس کا تو مجھے اعتراف ہے کہ یہ رقم اس وقت میرے بہت کام آئے گی۔....

افروز۔ کیوں نہ کام آئے گی؟۔

حبیب۔ لیکن چند روز بعد—

افروز۔ لیکن چند روز کے لئے تو بندوبست کی ضرورت ہے!...... صرف چند روز!...... بدقسمتی کی بھی حد ہوتی ہے ہم یہ دیکھتے آئے ہیں کہ خوش قسمتی کے عروج کی ایک حد ہوتی ہے اور پھر دفعتاً تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ ذرا فطرت ہی میں اس کا عمل دیکھئے...... تخم پھوٹتا ہے...... پتے نکلتے ہیں...... پودا بڑھتا جاتا ہے...... کلی آتی ہے...... پھول کھلتا ہے...... یہ عروج کی انتہا ہوتی ہے۔۔۔ اس کے بعد زوال کا دور شروع ہو جاتا ہے...... آپ تو شاعر ہیں آپ کی نظر سے یہ کب پنہاں ہو سکتا ہے...... آپ انسان ہی کو لیجئے...... بچپن سے جوانی تک عروج ہے...... جوانی کے بعد زوال...... جو اصول خوش قسمتی پر پورا اترتا ہے ضروری ہے کہ وہ اس کی ضد یعنی بدقسمتی پر بھی پورا اترے...... آپ پر مصیبتوں کی انتہا ہو چکی ہے...... اب بدقسمتی کا دور ختم ہونے آیا...... قسمت رخ پلٹے گی۔

(باقی آئندہ)

رازِ رازداں

(حضرت نشترؔ سندیلوی)

رنگ و بوئے گلستاں کو جاوداں سمجھا ہے تو
حیف: اس حدِّ نظر کو آسماں سمجھا ہے تو

وہ چمن ہی ہے حقیقت میں قفس اندر قفس
جس چمن کو آشیان در آشیاں سمجھا ہے تو

خون رلوائے گا اس رنگیں نگاہی کا فریب
پرتوِ رنگ شفق کو گلستاں سمجھا ہے تو!

ہے نگاہوں کے لئے دھوکا سرابِ التفات
ریگ کے صحرا کو دریائے رواں سمجھا ہے تو

کیا ہے یہ دورِ جہاں تیرا سکوں تیرا جمود
بے حسی کو گردشِ دورِ جہاں سمجھا ہے تو

پرخطر وادی سے لازم ہے گزر مردانہ وار
خارزارِ زندگی کو گلستاں سمجھا ہے تو

ہے ترقی کی بنا دنیا میں قوموں کا زوال
ہے وہ بیداری جسے خوابِ گراں سمجھا ہے تو!

اک مسلسل بے قراری، ہے تپش زارِ حیات
اضطرابِ دل کو سعیٔ رائگاں سمجھا ہے تو

ہے ستاروں کو بھی تیری خاک کے ذروں پہ رشک
اپنی ہستی کی حقیقت کو کہاں سمجھا ہے تو؟

کامیابی کے عناصر جوشش و احساس و عمل
زندگی کی شوخیوں کو بجلیاں سمجھا ہے تو

شوق میں جس کے، دریچے وا ہیں نہ افلاک کے
ہے وہ نغمہ جس کو اندازِ فغاں سمجھا ہے تو

مستتر ہے خاک ذروں میں رازِ زندگی
یہ اگر سمجھا تو راز رازداں سمجھا ہے تو

بگولہ

(جاں نثار اختر ایم۔ اے علیگ)

جون کا تپتا مہینا، تمتماتا آفتاب
ڈھل چکا ہے دن کے سانچے میں جہنم کا شباب
دوپہر اک آتشِ سیال برساتی ہوئی
سینۂ کہسار میں لاوا سا پگھلاتی ہوئی
وہ جھلستی گھاس، وہ پگڈنڈیاں پامال سی
نہر کے لب خشک سے، ذروں کی آنکھیں لال سی
چلچلاتی دھوپ میں میدان کو چڑھتا بخار
آہ کے مانند اٹھتا ہلکا ہلکا سا غبار

دیکھ وہ میدان میں ہے ایک بگولہ بے قرار
آندھیوں کی گود میں ہو جیسے مفلس کا مزار
چاک پر جیسے بنائے جا رہے ہوں زلزلے
یا جنوں طے کر رہا ہو گردشوں کے مرحلے
ڈھالنا چاہے زمیں جس طرح کوئی آسماں
جیسے چکر کھا کے نکلے توپ کے منہ سے دھواں
مل رہا ہو جس طرح جوشِ بغاوت کو فراغ
جنگ چھڑ جانے پہ جیسے ایک لیڈر کا دماغ
خشمگیں ابرو پہ ڈالے خاک آلودہ نقاب
جنگلوں کی راہ سے آئے سفیرِ انقلاب
یوں بگولے میں ہیں تپتے سرخ ذرے بے قرار
جس طرح افلاس کے دل میں بغاوت کے شرار

کس قدر آزاد ہے یہ روحِ صحرا یہ بھی دیکھ
کس طرح ذروں میں ہے طوفان برپا یہ بھی دیکھ
اٹھ بگولے کی طرح میدان میں گاتا نکل
زندگی کا خون ہر ذرے میں دوڑاتا نکل

رفتار زمانہ

لڑائی شروع ہوئی تو اس کا بالکل گمان نہ تھا کہ وہ واقعی بڑی شدت کے ساتھ ہو گی خصوصاً مغربی محاذ پر عام اطمینان تھا اور جب یہ خبر آتی تھی کہ آج کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں پیش آیا تو ہم سمجھتے تھے کہ ادھر سے ایسی ہی خبریں آتی رہیں گی اور خدا کے فضل سے لڑائی ختم ہو جائے گی۔ اطمینان کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ برطانوی جہاز جرمنی کی بالائی فضا میں چہل قدمی کرتے تھے جرمن قوم کو ایسے ہینڈبل پڑھنے کو دے آتے تھے کہ جس سے اس کی آنکھیں کھل جاتیں اور وہ اپنے رہنماؤں کی گمراہی سے آگاہ ہو جاتی لیکن جرمن فوج ان کی روک تھام نہ کرتی۔ پھر ہر ہٹلر نے ناروے پر حملہ کیا اور اتحادیوں کی جو فوج وہاں بھیجی گئی اسے خاصی بے آبروئی سے واپس ہونا پڑا۔ تب بھی خیال ہوا کہ یہ شکست مسٹر چیمبرلین کی بے پروائی اور بدانتظامی کے سبب ہوئی ورنہ اگر وہ چاہتے تو ایسا سخت مقابلہ کر سکتے تھے کہ ہر ہٹلر کو اپنی ظالمانہ حرکت پر بڑی پشیمانی ہوتی پارلیمنٹ میں اس ناکامیابی پر بڑی لے دے ہوئی۔ مسٹر چیمبرلین کو وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا، اور مسٹر چرچل کی سرکردگی میں ایک نئی وزارت شروع میں بنی۔ نئی وزارت صحیح معنوں میں قومی تھی کہ اس میں ہر فرقے کے لوگ شامل تھے اور اس نے بہت جلد ایک قانون منظور کرا لیا جس کی بدولت حکومت کے اختیارات بہت بڑھ گئے اور اس کا یقین ہو گیا کہ انتظام میں کوئی سستی اور دشمن کا مقابلہ کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہو گی، اسی دوران میں ہر ہٹلر نے ہالینڈ اور بلجیم پر حملہ کر دیا، اور جمہوریت کے شیدائیوں اور اتحادیوں کے ہمدردوں کو امید ہوئی کہ جو سزا جرمن فوجوں کو ناروے میں نہ دی جا سکی تھی وہ اس میدان میں دل کھول کر دی جائے گی۔

ہر ہٹلر نے جنگ کے شروع میں یہ دھمکی دی تھی کہ ان کے ترکش میں بہت سے تیر ہیں، اور ہمیں یہ خیال تھا کہ اب جو اتحادیوں سے جم کر مقابلہ ہو گا تو وہ انھیں تیروں کے زور سے اتحادیوں

کو عاجز کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن بلٹز کریگ (Blitz Krieg) کے جانے بوجھے طریقے کے سوا اور کچھ دیکھنے میں نہیں آیا، یعنی جرمن فوج نے پہلے ہوائی جہازوں اور ٹینکوں سے حملہ کیا، اس کے پیچھے لاریوں اور موٹروں پر سپاہی بھیجے اور جہاں تک ٹینک پہنچے تھے وہاں پر محاذ قائم کر لیا۔ جرمنوں کا سارا بھروسا اس پر تھا کہ ان کے حملے اتنے سخت ہوں گے کہ اتحادی فوجیں انھیں روک نہ سکیں گی، اور یہ حملے اس قدر جلد جلد ہوں گے کہ ایک مرتبہ پسپا ہونے کے بعد پھر اتحادی فوجوں کو کہیں قدم جمانے کا موقعہ نہ ملے گا۔ محاذ اتنا بڑا تھا کہ اگر حملہ کسی ایک جگہ روک لیا جاتا تو بھی کچھ کام نہ بنتا، اس لئے کہ جرمن فوج کی رفتار بہت تیز تھی، اور اگر وہ کسی ایک جگہ بھی حملے میں کامیاب ہوتی تو پوری اتحادی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑتا ورنہ اس کا اندیشہ تھا کہ جرمن فوج پشت مارے گی اور اسے گھیرے گی۔ افسوس ہے کہ جرمن لشکرکشی کی یہ ایک تدبیر ایسی کارگر ہوئی ہے کہ جرمن فوج میدان پر میدان جیتتی رہی ہے اور اب کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں پہنچ کر بس کرے گی۔

۱۹۱۴ء کی جنگ میں جرمنی کا فرانس پر حملہ فون شلیفن کی تجویز کے مطابق ہوا تھا اس تجویز کی کامیابی کا دارومدار اس پر تھا کہ جرمن فوج کئی حصوں میں بلجیم سے گذر کر پیرس تک پہنچے، اور اسے چاروں طرف سے گھیرے، خیال تھا کہ حملے کی تیزی اور دارالسلطنت کے محاصرہ کا یہ نتیجہ ہوگا کہ فرانس میں مقابلہ کی ہمت نہیں رہے گی اور وہ ہتھیار ڈال دے گا۔ بلجیم نے خلاف توقع بڑا سخت مقابلہ کیا۔ فون شلیفن کی تجویز پر عمل کرنے میں غلطیاں ہوئیں اس لئے جرمن فوج کو پیرس کے سامنے سے پسپا ہونا پڑا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ بات تھی کہ بلجیم کا شمالی حصہ جس میں انیٹ ورپ کا قلعہ ہے اور فرانس کا شمالی ساحل جرمن فوج کے قبضہ میں نہیں آیا، انگریز آزادی کے ساتھ فوج اور جنگ کا سامان محاذ تک پہنچاتے رہے اور جنگ بالکل رد و بدل کا کھیل ہو گئی۔ اس مرتبہ جرمنی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پورے ہالینڈ اور بلجیم پر اور فرانس کی تقریباً تمام شمالی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا ہے اس کی وجہ سے انگریزوں کو فرانسیسیوں

کی مدد کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی، فرانس ان سے مدد کی التجا کرتا رہا اور وہ بس چند ہزار سپاہی بھیج سکے۔

فلانڈرز کی ہولناک جنگ کا سارا حال مسٹر چرچل بڑی سچائی اور وضاحت کے ساتھ سنا چکے ہیں، یعنی یہ کہ ۱۰ مئی کو جرمن فوج نے سیڈان کے سامنے فرانسیسی سرحد کو پار کیا، پھر شمال کی سمت میں ملک کے اندر گھستی چلی گئی، اور چونکہ فرانسیسی دریائے سوم اور دریائے آئن کو اپنا محاذ بنانے پر مجبور ہو گئے تھے، دریائے سوم سے بلجیم تک جرمن فوج آزادی کے ساتھ پھیل سکتی تھی، فرانسیسیوں کو ان کے محاذ پر مصروف رکھنے کے انتظام کر کے اس جرمن فوج نے اس اتحادی فوج کو جو بلجیم کی سرحد کے پاس لڑ رہی تھی گھیر لیا۔ یہ فوج لڑتی ہوئی ڈنکرک کی بندرگاہوں کی طرف پسپا ہوئی اور یہاں سے اس کو ہر طرح کے جہازوں اور کشتیوں پر سوار کر کے انگلستان پہنچایا گیا کوئی اور معمولی ہمت اور ڈسپلن رکھنے والی فوج اس طرح سے گھر جاتی تو ایسی بھگدڑ مچتی کہ لاکھوں سپاہی مارے جاتے، انگریزی فوج بڑے قاعدے سے پیچھے ہٹی، لیکن صورت کچھ ایسی تھی کہ سپاہیوں کی جانیں بچانے کے سوا اور کچھ ممکن نہ تھا اور اسے اپنا پورا جنگ کا سامان دشمن کے حوالے کرنا پڑا۔

جرمن سپہ سالاروں نے اس کامیابی سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ڈنکرک کی بندرگاہ سے آخری اتحادی سپاہی نکلنے نہیں پائے تھے کہ ۶ جون کو جرمن فوج اس محاذ پر ٹوٹ پڑی جو فرانسیسی جنرل ویگان نے دریائے سوم اور دریائے آئن کا سہارا لے کر قائم کیا تھا۔ بلجیم اور فلانڈرز میں اتحادی فوج کی پسپائی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس کے اور دشمن کے ساز و سامان میں کوئی نسبت نہ تھی، وہ نہ جرمن ہوائی جہازوں کا اپنے جہازوں سے مقابلہ کر سکتی تھی نہ ٹینکوں کا اپنے ٹینکوں سے، اور دشمن کے پاس حرب کے تمام آلات بے حساب تھے، مفلسی میں آٹا گیلا ہوا کہ انگریزوں نے جو کچھ توپیں، بندوقیں اور ٹینک بلجیم کو بھیجے تھے وہ سب ہاتھ سے گئے۔ فرانسیسیوں کا اس نئے محاذ پر قدم جمائے رہنا یوں بھی مشکل

تھا، جرمن فوج نے جب چار ہزار ٹینکوں اور نہ جانے کتنے ہزار ہوائی جہازوں سے مسلسل حملے شروع کئے تو سمجھئے فرانسیسیوں کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔

کہا تو یہ جاتا ہے کہ فرانسیسی فوج بڑی بہادری سے لڑی اور فرانسیسی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ لڑنے اور جان دینے میں فرانسیسی کسی سے کم نہیں۔ اتحادیوں کی ہمت اس سے بندھی رہی کہ محاذ پر کہیں نہ کہیں وہ جرمن کو سخت نقصان پہنچا دیتے تھے، لیکن جرمن فوج کہیں کہیں ان کے محاذ کو توڑ بھی دیتی تھی۔ ۱۰ رجون کو اٹلی نے فرانس اور برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور چونکہ سینور مسولینی ایسے آدمی نہیں ہیں کہ اپنی فوج کی ہمت اور استعداد کو خواہ مخواہ آزمائیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرانسیسی محاذ پر جو جنگ ہو رہی تھی اس کا چار پانچ دن کے اندر فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا محض اتمام حجت تھا، اس میں بھی بس ایک ہفتہ لگا، جرمن فوج ۱۴ جون کو پیرس پہنچ گئی، اس کا بایاں بازو جس نے دریائے آئن کی طرف حملہ کیا تھا، اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ماژی نو لائن قریب قریب گھر گئی، چونکہ مقابلے کا امکان نہیں رہا تھا، فرانس کے وزیر اعظم موسیو رینو نے ۱۶ جون کو استعفیٰ دیدیا، ان کی جگہ مارشل پے تین وزیر اعظم ہوئے اور انھوں نے جرمنی سے صلح کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ وقتی صلح جرمنی کی بھاری شرطوں پر ہو گئی ہے۔ لیکن انگریز بھی فرانس کو لڑائی جاری رکھنے کے لئے ابھار رہے ہیں۔

مستقل صلح کی شرطیں کیا ہوں گی یہ ابھی تک (یعنی ۲۰ رجون کو) نہیں معلوم ہے۔ اٹلی نے تو پہلے ہی سے جنوبی فرانس کے اس ساحلی علاقے کا جس میں نیس کا مشہور شہر واقع ہے اور جو فرانسیسی ریویرا کہلاتا ہے اور اس کے علاوہ کورسکا اور فرانس کی تمام افریقی نو آبادیوں کا مطالبہ کیا ہے، لیکن ہمیں یقین نہیں ہے کہ ہر ہٹلر یہ سب اٹلی کو دلوا دیں گے۔ ہر ہٹلر خود غالباً ضلع الساس لورین کا مطالبہ کریں گے۔ مگر اس سے کہیں زیادہ اہم یہ مطالبہ ہو گا کہ فرانس کی خارجی سیاست جرمنی کے صلاح مشورے کے مطابق ہو، اور فی الحال فرانس کا شمالی

ساحل جرمنی کے قبضے میں رہے۔ ممکن ہے ہر ہٹلر نقد روپیہ بھی مانگیں اور فرانس نے جو سونا حفاظت کے لئے حال ہی میں امریکہ بھجوایا تھا اسے واپس منگوانا پڑے۔ فرانس کا شمالی بیڑا امید ہے کہ برطانیہ کے قبضے میں آجائے گا اور ممکن ہے بہت سے ہوائی جہاز اڑ کر انگلستان بھاگ جائیں، بحر روم میں فرانس کا جو بیڑا ہے اس کو سینور مسولینی دبوچ لیں تو کچھ تعجب نہیں۔ فرانس کو کم سے کم جو نقصان ہوگا وہ یہ کہ اب وہ یورپ کی مقتدر ریاستوں میں شمار ہونے کے قابل نہ رہے گا، اور اس کی سیاسی حیثیت ویسی ہی ہو جائے گی جیسے کہ جنگ سے پہلے نوروے اور سویڈن کی تھی یا اس وقت یوگوسلاویہ اور رومانیہ کی ہے۔ اس کی تہذیبی حیثیت بعض سمجھتے ہیں کہ مٹ نہیں سکتی، بعض کہتے ہیں کہ اب سے بہت پہلے ہی مٹ چکی تھی۔

اٹلی کے جنگ میں شریک ہونے سے برطانیہ کی وہ فوج جو مشرقی افریقہ اور مصر میں تھی مصروف ہو گئی ہے، لیکن مشرقی بحر روم اور بلقان کی سیاست میں جس انقلاب کا خطرہ تھا وہ نہیں ہوا۔ اٹلی نے بلقان کی ریاستوں اور ترکی کو اطمینان دلایا ہے کہ اسے ان سے کوئی عداوت نہیں، اٹلی کے قول پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، لیکن صلح کے ایسے اعلان کے جواب میں بھی جنگ کا اعلان نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ترکوں نے غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کے معاہدوں کو دیکھتے ہوئے فی الحال اس کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ کسی فریق کا ساتھ چھوڑیں یا کسی کا ساتھ دیں۔ وہ بدستور غیر جانب دار رہیں گے، بلقان کے ملک بھی فی الحال غیر جانب دار ہی رہ سکتے ہیں۔ اگرچہ اٹلی کی طرف سے انھیں خطرہ بہت ہے۔

روس نے البتہ چپکے چپکے کچھ کارروائیاں شروع کی ہیں۔ پہلے خبر آئی تھی کہ اس نے روسی پولینڈ میں اپنی فوج بہت بڑھا دی ہے، ۱۷ اور ۱۸ جون کو معلوم ہوا کہ اس نے لیتھوئنیا، لیتویہ اور استھونیا کو الٹیمیٹم دے کر اس پر مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے ساحل پر روسی فوج میں اضافہ منظور کر لیں۔ اسی کے ساتھ ان تینوں ملکوں کی وزارتیں بدلیں، لیتھوئنیا کے پریزیڈنٹ نے بھی استعفا دیدیا اور وہ سابق وزارت کے کئی اراکین کے ساتھ سرحد پار کر کے جرمنی

چلے گئے جہاں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ جرمنی ان تینوں ملکوں اور خاص طور سے لیتھوئنیا میں اپنا اثر بڑھا رہا تھا اور روس نے وقت پر دخل دے کر جرمنی کی اس تدبیر کو اُلٹ دیا۔ حال میں رومانیہ سے اپنا پرانا لیا ایبا کا علاقہ لے لیا ہے

روس اور جرمنی کی لڑائی تو ہر ہٹلر کے پروگرام میں ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ کب ہو گی۔ پچھلے سال مارچ تک یہ ممکن تھا کہ جرمنی پہلے روس سے لڑے، لیکن برطانوی سیاست نے پولینڈ کو گیرنٹی دے کر جرمنی کے حملہ کا رُخ بدل دیا۔ اب روس کی سلامتی اس میں ہے کہ وہ جرمنی کو مغربی جنگ سے فارغ نہ ہونے دے اور اسی وقت جرمنی سے لڑائی چھیڑ دے۔ شاید وہ اس انتظار میں ہو کہ جرمنی برطانیہ کی تھوڑی سی مار اور کھالے تب اسے چیلنج دیا جائے، روس کی نیت اگر بدل رہی ہے تو ہر ہٹلر بھی یقیناً اس سے واقف ہوں گے اور ممکن ہے وہ انگلستان سے فیصلہ کن جنگ اس وقت تک ملتوی رکھیں جب تک کہ روس کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے، فی الحال تو آئر لینڈ اور آئس لینڈ خطرے میں ہیں، انگلستان پر حملہ کرنے کی ہمت ہر ہٹلر جب کریں گے تب کریں گے۔
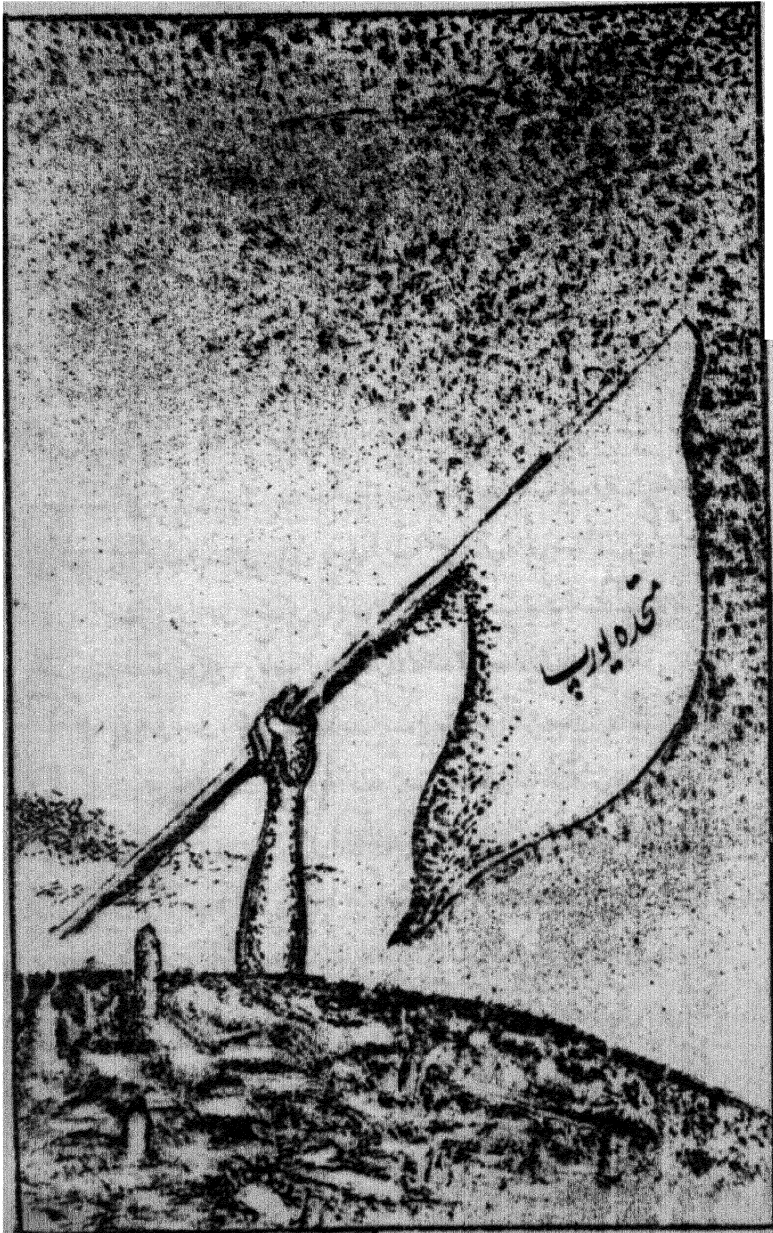
اس وقت جبکہ تمام خزانے خالی ہو جائیں گے اور آخری آدمی مر رہا ہو گا

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

دوشیزۂ صحرا :۔ مصنفہ صادق الخیری صاحب۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔ قیمت عہ/

اردو میں ایک عرصے سے جہاں یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ اُردو میں اچھی کتابیں لکھی جائیں، اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ چھاپی بھی اچھی جائیں۔ جو ناشر کتابیں خوش مذاقی کے ساتھ چھپواتے ہیں وہ اردو کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ "کتب خانہ علم و ادب" کے منتظمین بھی اسی حیثیت سے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ جہاں ایک طرف اپنے لئے اچھی کتابوں کا انتخاب کرتے ہیں، وہاں دوسری طرف انھیں خوش مذاقی سے شائع بھی کرتے ہیں

"دوشیزۂ صحرا" ان بہت سی کتابوں میں سے ایک ہے جو تھوڑے سے عرصہ میں "کتب خانہ" نے شائع کی ہیں۔ یہ کتاب مس جون کون کویسٹ کا ایک انگریزی ناول ہے۔

ناول کا پلاٹ بہت دلکش ہے۔ مصنفہ نے اپنے پلاٹ کا پس منظر عرب کی رومانی سرزمین کو بنایا ہے۔ اور اپنی رنگینی قلم سے اس میں وہ آب و رنگ بھرے ہیں کہ ناول شروع سے آخر تک دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ کہیں کہیں البتہ بعض ایسی کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں، جنھیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار فن کی نزاکتوں کا احساس نہیں کیا۔ مثلاً ایک سب سے بڑی کمزوری تو یہی ہے کہ ناول کی ہیروئن زہرہ پر ضرورت سے زیادہ رنگ چڑھا ہوا ہے۔ مانا کہ وہ ایک ہسپانوی ماں کی بیٹی تھی۔ تاہم اس کی پرورش تو ایسی فضاؤں میں ہوئی تھی جسے مغربیت سے دور کی بھی نسبت نہیں تھی۔ اس لئے پڑھنے والا یہ توقع کرتا ہے کہ اس کی فطرت میں وہی چیزیں رسی بسی ہوں گی جو عرب کی زندگی کے ذرہ ذرہ پر چڑھی ہوئی ہیں بہرحال ناول مجموعی حیثیت سے بے حد دلچسپ ہے اور صادق صاحب کے طرز کی دلکشی اس کے چھوٹے چھوٹے عیبوں کو نظر کے سامنے نہیں آنے دیتی۔

دانہ و دام :۔ مصنفہ راجندر سنگھ بیدی صاحب۔ مکتبہ اردو لاہور۔ قیمت عہ

زیر نظر کتاب چودہ افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو حال میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ بیدی صاحب ایک نوجوان اور ہونہار افسانہ نگار ہیں۔ زندگی کے کافی عمیق مطالعہ کے بعد بیدی صاحب نے جو افسانے لکھے ہیں وہ موجودہ افسانہ نگاری میں کچھ کم شاندار اضافہ نہیں۔ بعض موجودہ ترقی پسند مصنفین کی طرح وہ محض عمومی زندگی کے تاریک پہلو کو نہیں دیکھتے۔ وہ ہماری زندگی سے حقارت نہیں کرتے بلکہ ایک ہمدردانہ دل و دماغ رکھتے ہیں۔ اسکے ساتھ تحریر میں سادہ پرکاری اپنی ارتقائی منزلوں میں ہے۔ اُمید ہے کہ بیدی صاحب آئندہ افسانہ نگاروں کی صف ادبیں میں آکر بہت جلد ممتاز جگہ حاصل کریں گے۔

بغداد کا جوہری

یہ کتاب اشرف صبوحی صاحب کا کیا ہوا کسی انگریزی ناول کا ترجمہ ہے ناول کا پلاٹ دلچسپ ہے اشرف صاحب کی زبان میں ایک خاص طرح کا لوچ اور بیان میں روانی ہے۔

اردو میں ناولوں کی، اور خصوصاً اچھے ناولوں کی بہت کمی ہے اس لحاظ سے کتب خانہ علم و ادب کی خدمات قابل ستائش ہیں کہ وہ اچھے اچھے ناولوں کے ترجمے شائع کر رہا ہے۔ اگر کتب خانہ اس خدمت کو ذرا اور باقاعدہ طریقے سے انجام دے تو ادب اور زبان کی اور بھی اچھی خدمت ہوگی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسری زبانوں کے اچھے اچھے ناولوں کو منتخب کر کے ایک مکمل اسکیم بنالی جائے اور رفتہ رفتہ ان ناولوں کے ترجمے اردو میں کر دئے جائیں۔ اس طرح اردو میں اچھے ناولوں کی جو کمی محسوس کی جاتی ہے کسی حد تک دور ہو جائے گی اور اردو طبقہ اچھے ناول پڑھنے کا عادی ہو جائیگا۔ کتب خانہ کے حلقۂ اثر میں اچھے لکھنے والوں اور اچھے ترجمہ کرنے والوں کی کمی نہیں۔ اس سے جتنا فائدہ اٹھایا جا سکے، اٹھانا چاہئے۔ اس طرح لالہ رخ، دوشیزۂ صحرا اور بغداد کا جوہری اس خوش نما زنجیر کی ابتدائی کڑیاں بن جائیں گی۔

بغداد کا جوہری بھی کتب خانہ کی دوسری مطبوعات کی طرح دیدہ زیب ہے۔ کتابت طباعت کاغذ اور سرورق سب چیزیں اچھی ہیں۔ ناول کی قیمت عہ ہے۔ (د۔ ع)

شعرائے عثمانیہ :-

ادارۂ ادبیات اُردو نے حال ہی میں "مرقعِ سخن" کے نام سے شعرائے دکن کے کلام کا ایک سلسلہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اس کی پہلی اور دوسری جلدوں میں دورِ آصفیہ کے پچھتر شاعروں کا کلام مختصر تنقیدوں کے ساتھ شائع کیا جا چکا ہے۔ تیسری جلد میں دولت آصفیہ کے سو شعراء کا تذکرہ اور ان کا کلام شامل ہے یہ کتاب ابھی زیرِ طبع ہے۔ شعرائے عثمانیہ مرقعِ سخن کے سلسلے کی چوتھی جلد ہے جس میں جامعہ عثمانیہ کے ۲۶ پرانے طالب علموں کے کلام کا انتخاب تھوڑی تھوڑی تنقید کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ کتاب ادارۂ ادبیات کی دوسری مطبوعات کی طرح خوش مذاقی سے شائع کی گئی ہے۔ کتابت اور طباعت بھی اچھی ہے۔ اور ظاہری شکل وصورت بھی۔ کتاب دیکھ کر اُسے پڑھنے کو جی چاہتا ہے لیکن اُسے شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد کچھ مایوسی سی ہوتی ہے۔

جن شعراء کا کلام اس مجموعے میں پیش کیا گیا ہے ان میں سے زیادہ ایسے ہیں جن کا کلام بالکل سبے نمک ہے۔ اور بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کا کلام پڑھ کر کوئی لطف محسوس ہوتا ہو۔ اس کتاب کے شائع کرنے کا مقصد مرتب کے نزدیک "عثمانیہ شعراء کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ منتخب کلام کی ایک ادبی یادداشت اور شیرازہ بندی ہے"۔ جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے۔ یہ کتاب کافی مفید ہے۔ لیکن آج کل اردو میں ایسی کتابیں شائع کرنے کی ضرورت ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کر سکیں اور یہ کتاب ایک بہت محدود حلقہ کیلئے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں صرف وہی لوگ دلچسپی محسوس کر سکتے ہیں جنھیں شعرائے عثمانیہ سے کوئی ذاتی لگاؤ ہے اور اُس لگاؤ کی وجہ سے انھیں ان کے کلام میں طرح طرح کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔

ادارۂ ادبیات کے پاس بظاہر کافی سرمایہ ہے اور اُس کے منتظمین میں ادبی کام کرنیکا بہت اچھا سلیقہ ہے۔ کیا اچھا ہو کہ اس سرمایہ اور سلیقہ کو زیادہ مفید کاموں میں صرف کیا جائے

(و۔ ع)

اُردو دانی کی کتابیں (پہلا حصہ)

مرتبہ زیر نگرانی مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدر آباد دکن قیمت ۲ روپائی

یہ ایک قاعدہ ہے جو ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کے شعبہ امتحانات کے نصاب کے لئے تیار کرایا گیا ہے خصوصیات اس قاعدہ کی حسب ذیل ہیں۔ (۱) مختلف تصویریں قانون تلازم کے مطابق دی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ الفاظ کی شکلیں ذہن نشین ہو جائیں (۲) ہر لفظ کے بول کو الگ الگ لکھا ہے تاکہ مبتدی کو سہولت ہو (۳) الفاظ کی تحلیل کر کے حرفوں کی پوری شکلیں اور ان کے جوڑوں کی شکلوں کی وضاحت کی گئی ہے (۴) رسم الخط ایسا استعمال کیا ہے کہ حرفوں کی اصلی شکلیں حتی الامکان اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں اور (۵) ذخیرۂ الفاظ کو جملوں میں بار بار استعمال کیا گیا ہے تاکہ خوب مشق ہو جائے۔ یہ قاعدہ اس لحاظ سے بہت مفید ہو گیا ہے۔

اُردو مثنوی کا ارتقاء۔

مرتبہ عبدالقادر سروری صفحات ۲۴۴ قیمت عہ۔ سب رس کتاب گھر ادارہ ادبیات خیریت آباد حیدر آباد دکن

مثنوی کے ارتقاء و اس کی تاریخ پر اردو میں کئی کتابیں نکلی ہیں۔ یہ کتاب جدید ترین ہونے کے باعث تقریباً سب سے ممتاز ہے۔ دکن کے قدیم شعرا سے آغاز کیا ہے اور نمونوں کے ساتھ حال کے زمانے تک کی مثنویوں پر پُر مغز تبصرہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی مثنوی کے ارتقاء پر کون کون سے مختلف تاریخی اثرات پڑے، کیوں پڑے اور ان کے اثرات کیا ہوئے ان سب کا مفصل ذکر کتاب میں موجود ہے۔ دکن، پنجاب دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی طرز نگارش، ان جگہوں کے مختلف اساتذہ کے ذاتی رجحانات کا اثر، اصلاح فن کے نتیجے حسن و قبح کلام ہر ایک پر کاوش کے ساتھ تبصرہ کیا ہے یہ کتاب اردو ادب کے طلبا کے لئے ناگزیر ہے۔

حج زینب:۔

مترجمہ محسن بن شبّیر۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن، قیمت ۱۲؍ ر

ایک نو مسلمہ انگریز خاتون لیڈی ایولن کبولڈ زینب نے اپنا سفرنامہ حرمین انگریزی زبان میں

۱۹۳۴ء میں لکھا تھا۔ یہ سفرنامہ اس لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے کہ ایک انگریز خاتون کے قلم سے نکلا ہے اور ان کے تاثرات کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ کہیں کہیں بیچ میں قدیم اسلامی تاریخ بھی دیدی ہے۔ جو انگریز پڑھنے والوں کے خیال سے لکھی گئی تھی۔ ترجمہ بھی اچھا کیا گیا ہے کہیں کہیں دکنی محاورے ہیں لیکن زیادہ نہیں۔ سیدہ زینب نے اپنے بیان میں کسی بات کو نہیں چھوڑا ہر بات تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس لئے حج کا تمام نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ انداز بیان بھی سادہ کہانی کی طرح دلچسپ ہے۔ کتابت طباعت وغیرہ بہت خوب ہے۔

جامعہ اردو آگرہ:۔

محمد طاہر صاحب فاروقی آگرہ سے اطلاع دیتے ہیں کہ اپریل ۱۹۳۹ء سے بزم اقبال کے اراکین نے وہاں ایک جامعہ اردو کی بنیاد ڈالی ہے جس کا مقصد پنجاب کی طرح لسانی طرز پر اردو زبان و ادب کے تین امتحانات جاری کرنا ہے۔ اس جماعت میں یو۔ پی کی تمام یونیورسٹیوں کے اردو کے صدر۔ شیخ الجامعہ دہلی، سکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی وغیرہ بطور نمائندہ شامل ہیں۔

نومبر ۱۹۳۹ء میں اس کا پہلا امتحان ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل کا ہوا۔ لڑکیوں کے لئے ہر سنٹر پر پردہ کا انتظام تھا۔ ادیب کے امتحان کے لئے ۱۱۹، ادیب ماہر کے لئے ۱۹، اور ادیب کامل کے لئے ۲۰ طلبہ و طالبات شامل ہوئے۔ پہلے سال کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد بہت امید بخش ہے۔ امتحانوں کے لئے سنٹر مختلف جگہوں پر قائم کئے گئے تھے مثلاً آگرہ، اجمیر، الہ آباد، بریلی، بھوپال ٹونک، جونپور، جے پور، سنگرامئو، علیگڈھ، کانپور، لکھنؤ، مراد آباد وغیرہ۔ دیگر تفصیلات رجسٹرار جامعہ اردو آگرہ سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

محمد طاہر صاحب فاروقی بے انتہا مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو کی ترویج و ترقی میں ایسا مفید قدم اٹھایا ہے پہلے ہی سال کی کارگزاری ہمیں امید دلاتی ہے کہ یہ جماعت مضبوط بنیادوں پر بہت جلد کھڑی ہو جائے گی۔ اور یو۔ پی و راجپوتانہ میں اردو کے ایک اس قسم کے ادارہ کی جو کمی محسوس کی جا رہی تھی اور جسے لوگ پنجاب جا کر پورا کرتے تھے۔ اب آگرہ کے اس جامعہ اردو سے

کما حقہ مستفید ہو سکیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ ان حضرات کی یہ مبارک کوششیں جلد اور خوب بار آور ہوں۔

پرائمری جماعتوں میں لکھنا سکھانے کا طریقہ :۔

ٹریننگ اسکول اردو ریڈر مصنفہ ماسٹر بھومل صاحب۔ کرسچن ہائی اسکول کھرڑ (پنجاب) قیمت ۱۲

ماسٹر بھومل صاحب اس ملک میں تعلیم جدید اور نئے طریقوں کے نمائشی علمبردار نہیں بلکہ ایک مخلص رضا کار ہیں۔ اس سے پیشتر ہندوستان کے تعلیمی حلقے ان کے نام سے اچھی طرح آشنا ہیں ان کی موجودہ کتاب بھی طریق تعلیم کے باب میں ایک مفید اضافہ ہے۔ مصنف کو اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہمارے یہاں کے بہت سے اہل علم جو ملک و قوم کو تحریر کے ذریعہ اپنے خیالات سے مستفید کر سکتے ہیں غلط قسم کی ابتدائی تربیت سے لکھنے کو جھنجھٹ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اس کتاب میں ان طریقوں پر بحث کی گئی ہے جن سے بچے کے دل میں لکھنے کا طبعی ذوق پیدا ہو جائے۔ اور جن کی امداد سے استاد بچے کی تحریری قوتِ اظہار کی تڑپ کو ہاتھوں ہاتھ لے کر ائے صحیح قسم کے ارتقائی درجے طے کرنے میں مدد و معاون ہو سکے۔ اس طریق کے بنیادی اصول بچے کی دلچسپی شوق اور ماحول کا لحاظ رکھنا اور مطابقت کے طریق کو پیش نظر رکھنا ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب ابتدائی مدرسوں کے استادوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ (غ۔غ)

رسالہ جات :۔

عالمگیر (لاہور) سالنامہ نمبر قیمت ۸؍ صفحات ۲۶۴۔

حسب معمول خوبصورت شائع ہوا ہے۔ اندرونی تصویریں اکثر پرانی ہیں مضامین کا در و بست اچھا ہے چند عنوانات یہ ہیں سنسکرت پر مسلمانوں کا احسان، ہندوستانی کا پہلا مسلمان شاعر، اردو کے یورپین اور اینگلو انڈین شعراء اچھے افسانے اور نظمیں بھی کافی تعداد میں ہیں۔ بعض اشتہارات اکثر اردو رسائل و اخبارات کی طرح فحش ہیں :۔

تصویر :۔ رامپور۔ مدیر نادر علی صاحب برق۔ چندہ سالانہ ۱۲؍۔

اس رسالے نے اب پہلے سے بہت ترقی کر لی ہے ظاہری نمائش اور مضامین کی فراہمی کیطرف پہلے سے زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے مضامین اور نظمیں خاصی ہیں۔ امید ہے کہ قدر دانان ادب اس کی طرف توجہ کریں گے۔

اپنی اصلاح

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم

(جناب غضنفر علی صاحب)

مسلمانوں کی تعلیم کا اولین سرچشمہ تو کتاب اللہ ہے اور جس پر ہر زمانہ اور ہر دور کے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی بنیاد رہی ہے اور ہونا چاہئے لیکن ہندوستان میں جہاں عربی زبان رائج نہیں ہے قرآن کی تعلیمات باوجود تقریباً ہر مسلمان کے قرآن پڑھے ہونے کے کچھ بھی عام نہ ہو سکیں۔ آپ کو تقریباً ہر مسلمان کا بچہ قرآن سے آشنا ضرور ملے گا۔ آپ کو تقریباً ہر مسجد میں ایک دو حافظ ضرور نظر آجائیں گے۔ آپ قرآن کے فوائد سے کسی کو بھی منکر نہ پائیں گے۔ لیکن پھر بھی اگر کبھی کسی سے یہ پوچھ لیا جائے کہ قرآن کے اندر کیا ہے تو تقریباً سب کی زبانیں گنگ نظر آئیں گی۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ خدا نے ہم کو ایک پیغام دیا اچھی اچھی باتیں بتائیں صحیح راہ و صراط مستقیم کی باتیں بتلائیں اپنے خاص رسول کو ہماری بہتری و بھلائی کے لئے بھیجا لیکن ہم ہیں کہ اس کو نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں نہ دوسروں کو سمجھانے کی۔ پھر جب سمجھتے نہیں تو اس پر عمل کرنے کی کیسے توفیق ہو سکتی ہے اور پھر جب عمل ہی نہیں کریں گے تو دوسری قومیں تہذیب و تمدن میں ہم سے یقینی بڑھ جائیں گی۔ بغیر خود سمجھے ہوئے ہم دوسروں کو بھی تو نہیں سمجھا سکتے اس طرح تبلیغ کا کام الگ رک جائے گا جیسا کہ رکا ہوا ہے۔ آج کل ہمارے نوجوان مرد عورتوں میں جو بے دینی اور لامذہبی کی لہر پھیلی ہوئی ہے وہ زیادہ تر ہمارے بچوں کی قرآن کی تعلیمات سے ناواقفیت کے باعث ہے۔ مذہب اسلام کی سب مذاہب سے برتری کا جذبہ افسوس ہے مٹتا جا رہا ہے اور وہ اسے دوسرے مذاہب کی طرح کا ایک مذہب اور دوسرے مذاہب کے برابر سمجھنے لگے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کی تعلیمات بچے بچے کی زبان پر ہوں۔ اسلامی مدرسوں، مکتبوں اور مسجدوں میں جہاں کہیں بھی قرآن شریف بچوں کو پڑھایا جاتا ہے اس امر کا التزام کیا جائے کہ وہ اس کا

ترجمہ بھی پڑھیں اور اس طرح قرآن کو سمجھیں۔ جب خوب سمجھیں گے تو اپنے کو بھی درست رکھ سکیں گے اور دوسرے مذہب والوں کو بھی اس کی تلقین کر سکیں گے۔ اپنا ذاتی کیرکٹر بنانا، روحانی طور پر اپنے کو بلند و برتر کرنا اس امر سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ قرآن شریف سے ہم محض تعویذ اور گنڈوں کا استنباط کیا کریں اور اس سے اپنے کو اور دوسروں کو نہایت ذلیل دھوکہ دیا کریں۔ موجودہ زمانہ قوموں کی بقا کے لئے ایسی بنیادیں چاہتا ہے جو واقعی مضبوط اور غیر متزلزل ہوں محض ان علمی قرون وسطیٰ والی خرافات سے کام نہ چلے گا ضرورت ہے کہ قرآن کی ٹھوس تعلیمات جلد سے جلد عام ہو جائیں اور ہر ایک مومن کے قلب و روح کو منور کر دیں۔

قرآن شریف کا ترجمہ قرآن شریف کے ترجمے متعدد ہوئے اور ہو رہے ہیں لیکن میرے خیال میں ترجمہ کسی شخص کا ذاتی نہ ہونا چاہیے۔ اکثر موقعوں پر تفسیر میں اختلاف رائے ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی اگر بہت سے عربی داں ادیب جمع ہو کر اس متبرک کام کو انجام دیں تو ترجمہ بہتر اور مستند ہوگا ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام گذشتہ ترجموں کو پیش نظر رکھ کر ملک کے سربرآوردہ عربی داں حضرات جو ساتھ ہی اردو پر بھی ادیبانہ قدرت رکھتے ہوں ایک جگہ جمع ہوں یا جمع کئے جائیں اور باہم بحث و تمحیص اور تبادلہ خیالات کے بعد ایک مستند اور اٹل ترجمہ قرآن کریم کا پیش کریں تاکہ آج کل جو تذبذب کی حالت رہتی ہے کہ ہم کس کا ترجمہ پڑھیں یا کس کا سب سے بہتر ترجمہ ہے یہ دور ہو جائے گی اور ملک و قوم کے پاس ایک ایسی قیمتی مفید اور مکمل چیز ہو جائے گی جس کی شدت سے زیادہ ضرورت اور حاجت محسوس کی جا رہی ہے۔ یہ ترجمہ گویا سو دو سو برس تک آخری ترجمہ سمجھا جائے گا۔ اس کی وجہ سے ان طامع ناشرین کی بیجا جد و جہد کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جو محض اپنے مالی فائدہ کی خاطر ہر سال تھوڑی بہت رد و بدل کر کے ایک نیا اردو کا ترجمہ نکالا کرتے ہیں۔

اسی طرح احادیث کے ایک موزوں اقتباس کی سخت ضرورت ہے ہم میں بہت لوگ ایسے ہیں جو احادیث کو بالکل ہی نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو تمام تر لفظ بہ لفظ مانتے ہیں میرے خیال میں موجودہ زمانہ کے تقاضے کے مطابق وہ احادیث جو ہماری آج کل کی زندگی میں رہبری کریں انھیں سب سے

پہلے لینا چاہئے۔ طلبا اس ایجاز و اختصار سے گھبرا بھی نہ سکیں گے اور بہت جلد ان سے واقفیت حاصل کر کے اپنی روزانہ کی زندگی میں اسے برتنے لگیں گے۔ احادیث کے ترجمے تو اکثر ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ان کا اختصار میری نظر سے نہیں گذرا۔ (ایک دفعہ دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کی اکثر مسجدوں میں دیکھا کہ جامعہ ملیہ والوں نے بڑے بڑے تختوں پر قرآن شریف یا حدیث کی کوئی ایک نصیحت بہت خوشخط چھپوا کر نصب کروائی ہے۔ اور ہر مہینے بدلتے رہتے ہیں مسلمانوں کو ان کی صحیح مذہبی تعلیم دینے کا یہ بہت ہی اچھا طریقہ ہے۔ دوسری مسجدوں میں بھی اگر اس قسم کا انتظام کیا جائے تو کم از کم سال بھر میں بارہ باتیں تو مسلمانوں کو قرآن و حدیث کی معلوم ہو جائیں گی)

ان دو امور کے علاوہ فقہ اور اسلامی تاریخ میں ریسرچ کی بہت گنجائش اور ضرورت ہے ہمارے ملک میں کئی ایسی درسگاہیں اور یونیورسٹیاں ہیں جہاں اسلامی فقہ و تاریخ قرآن و حدیث دینیات وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے مگر افسوس ہے کہ اس کا طریقہ تعلیم تمام تر پرانا، جامد اور زمانہ کے تقاضوں سے کلیۃً بیگانہ ہے وہاں کے طلبا جب فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا میں ان کی جگہ کہاں ہے اور ان کی کہاں کھپت ہو سکتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام زندگی در بدری میں گذرتی ہے۔ ان کی زندگی خود انکے اور برادر انکی قوم دونوں پر بار ہو جاتی ہے ہماری مذہبی تعلیم کا کیا مقصد ہے؟ اگر اس امر کا تعین ہو جائے کہ ہماری مذہبی تعلیم کس لئے ضروری ہے نیز اس سے ہماری قوم کے نوجوانوں کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اور کیا ہونا چاہئے تو میرے خیال میں ہم اپنی مذہبی تعلیم کی تشکیل نو بھی بہت آسانی سے کر سکیں گے۔ اب تک جو کچھ ہماری تعلیم کا مقصد رہا ہے وہ اتنا ہے کہ مسلمان بچے ارکان نماز و روزہ سے واقف ہو جائیں۔ طہارت سے واقف ہو جائیں نیز میت کی نماز پڑھ سکیں یا پڑھا سکیں اور زیادہ ہوا تو کچھ مسئلہ مسائل سے واقف ہو گئے کہ فلاں حالت میں کیا کرنا چاہئے۔

ہماری مذہبی تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہئے۔ میرے خیال میں اس کا مقصد ذیل کے شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ ذاتی کیرکٹر کا درست و بلند کرنا اور روح میں اخلاقی استواری و بلندی کا پیدا کرنا۔

۲۔ اپنی قوم کی بھلائی و بہتری یعنی اپنی قوم کی خدمت کا احساس پیدا کرانا۔

۳۔ اپنی قوم و مذہب کی برتری و فوقیت کے جذبے کی تعمیر کرنا۔

۴۔ تبلیغ کا مادہ اس کی صلاحیت اور اس کا ذوق پیدا کرانا۔

۵۔ دینیات کی وہ معلومات بہم پہنچانا جن کی ہمیں روزانہ زندگی میں ضرورت پڑتی ہے۔

۶۔ منتہی طالب علموں کے لئے اور زیادہ اونچے مسائل مثلاً اسلامی نظام ملت کیا ہے۔ دوسرے ادیان سے وہ کیوں مختلف و بہتر ہے۔ اس کا فلسفہ کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۷۔ ریسرچ کے ذریعہ مختلف فیہ مسائل کو حل کرنا تاکہ بہت سی گتھیاں سلجھ سکیں اور ہماری واقفیت میں اضافہ ہو سکے

ساتھ ہی یہ تمام مذہبی تعلیم اس نہج سے ہونا چاہئے کہ مذہب ہماری زندگی میں کوئی بڑا بوجھ یا رکاوٹ بن کر سامنے نہ آئے بلکہ زندگی ہی کا ایک حصہ معلوم ہو جس کے بغیر ہماری زندگی نامکمل سی معلوم ہوتی ہو۔

ذاتی اخلاق کی بلندی اور استواری مذہبی تعلیم کا ایک اہم فریضہ ہے۔ آجکل ہمارے سینکڑوں اور ہزاروں طالبعلم مغرب زدگی کا شکار ہو کر نہ صرف لامذہب ہوتے جا رہے ہیں بلکہ ان میں اخلاقی کمزوریاں بھی بیحد پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ جھوٹ، مکر، فریب، غلط بیانی، دھوکا ان سب امور کو ایک فن کی طرح اختیار کرتے اور برتتے ہیں اور سب سے بڑھ کر افسوسناک بات تو یہ ہے کہ ہماری لڑکیاں بھی جو پہلے گھر کی اور ماں کی تعلیم کے باعث اخلاقی طور پر لڑکوں سے زیادہ مضبوط راسخ اور مومن ہوا کرتی تھیں اب مغربی تعلیم کے زیر اثر آکر وہ بھی لامذہب فیشن پرست اور اخلاقی طور پر اسی طرح کمزور اور پست ہوتی جا رہی ہیں جس معیار پر ہمارے نوجوان مغربی تعلیم کے باعث عموماً پہنچ جاتے ہیں اس کی تمامتر ذمہ داری ہمارے ان ماہرین تعلیم پر ہے جو اسلامی درسگاہوں کے مالک ہیں اور ہمارے نوجوان طلبا و طالبات میں جو بے راہ روی اس مغربی تعلیم کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے اس کا کوئی علاج نہیں کر سکتے

قومی بہتری و بھلائی کا خیال شکر ہے کہ ابھی تک عوام الناس میں تو ہے لیکن ہمارے نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ میں کم ہوتا جا رہا ہے اور بڑی حد تک کم ہو گیا ہے عام طبقے میں لیکن ایک دقت یہ ہے کہ قوم کی بھلائی کی ترغیبات انھیں ثواب، جنت کی ارزانی وغیرہ کی صورت میں دینا ہوتی ہیں تعلیم یافتہ طبقہ قومی بھلائی کی کوئی مد اپنے خرچ میں رکھتا ہی نہیں۔ اس کے یہاں تو صرف اس کی ذات ہے ضرورت ہے کہ ان دونوں کو اس طرح کی مذہبی تعلیم دیجائے کہ ایک کو یہ معلوم ہو سکے کہ ثواب کیا ہے اور دوسرے کو معلوم ہو سکے کہ قوم پہلے ہے اور خود کی ذات بعد کو

تیسری کمزوری جو مغربی تعلیم کے باعث آگئی اور جسے اکثر ایک مخصوص سیاسی نظریہ کے مسلمان اپنی تقریروں

اور تحریروں میں جگہ دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ سب مذاہب برابر ہیں خواہ وہ ہندو مذہب ہو خواہ بودھ خواہ کوئی اور
یہ تعلیمات بالکل غیر اسلامی ہیں۔ خود قرآن میں کئی جگہ اس قسم کے ارشادات موجود ہیں کہ دین اسلام سب سے
اکمل اور سب سے بہتر مذہب ہے اور یوں بھی عقلی طور پر دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی جبتک
اس میں اپنی برتری کا احساس نہو کوئی ملت ترقی کی معراج تک نہیں پہونچ سکتی جبتک خود اس میں ایسی برتر
صلاحیتیں موجود نہوں اور اس ملت کو اس کا احساس شدید نہو۔ یہ تعلیم کہ سب مذاہب برابر ہیں مسلمانوں میں
ایک تعطل کی حالت پیدا کردے گا اور یہ اس کی ملی اور سیاسی دونوں قسم کی زندگیوں کے لئے خطرناک ہے
ضرورت اس امر کی ہے کہ جلد از جلد اس قسم کی کمزور کن تعلیم کا سد باب کیا جائے اور ہماری مذہبی تعلیم کے
پروگرام میں اس برتری کے جذبے کی پوری پوری پرورش کی جائے کیوں کہ ہماری مذہبی برتری ایک ایسی
حقیقت ہے جس کے متعلق خود کلام الٰہی کی شہادت موجود ہے اور جس کی بنا پر اس میں کسی کو شک وشبہ کی
گنجائش نہیں ہوسکتی ہے۔

ہماری مذہبی تعلیم کا چوتھا مقصد تبلیغ کے فرض کا احساس اور شوق کا پیدا کرنا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان
میں ابتک جو اسلام پھیلا وہ بیشتر ولیوں اور بزرگان دین کے تصرف سے۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب
ضرورت ہے کہ ہر فرد خود تبلیغ میں دلچسپی لے کم سے کم اس کی صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ اپنے مذہب کی برتری
دوسروں پر ظاہر کرسکے۔ ایسی انجمنوں کے بننے کی سخت ضرورت ہے جو اس ضروری فرض کو باقاعدہ منظم طور
پر انجام دے سکیں اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب افراد میں اس امر کا احساس ہو اور یہ احساس اسی وقت
پیدا کیا جاسکتا ہے جب ہماری درسگاہیں اس ضروری امر کی طرف توجہ کریں۔

روز مرہ کی دینیات کی تعلیم کے متعلق مجھے کچھ کہنا نہیں ہے کیونکہ یہ تو عموماً ہوتی ہی ہے۔ لیکن جس بددلی
سے طلبا حاصل کرتے ہیں وہ ضرور افسوسناک ہے۔ ان کے لئے یہ ایک قسم کا بار ہوتا ہے جو انھیں مجبوراً کرنا
ہوتا ہے۔ ایک کونین کی شکر آلود گولی ہوتی ہے جو انھیں بصد مجبوری نگلنا ہوتی ہے۔ اس امر میں قصور
ہماری طرز تعلیم کا ہے ان کا اتنا نہیں۔ خود ہی ہمارے معلم اسے کونین کی گولی بنا دیتے ہیں ورنہ اگر وہ اسے
مٹھائی کی ڈلی کی صورت میں پیش کریں تو ہر ایک دلچسپی سے قبول کرلے اور عرصہ تک اس کا مزہ یاد رکھے۔

مرحوم اصغر گونڈوی

انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

دنیا کی بھلی یا بری باتیں دنیا کے بھلے یا برے لوگوں سے ثابت ہوتی ہوں یا نہیں سمجھ میں اسی طرح آتی ہیں ماں باپ بھائی بہن احباب سب کی محبت میری سمجھ میں تو اپنے ہی ماں باپ بھائی بہن اور دوستوں کی محبت سے آئی۔ اصغر صاحب مرحوم میں جو خوبیاں تھیں ممکن ہی نہیں یقین ہے دوسروں میں بھی ہوں گی لیکن مجھے وہ خوبیاں اس لئے زیادہ عزیز تھیں کہ وہ اصغر صاحب کی خوبیاں تھیں جن کی ذات نے ان کو عزیز تر و گرامی تر بنا دیا تھا۔

اصغر صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے جاڑوں میں مدرستہ العلوم کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر علیگڈھ میں ہوئی تھی عجیب اتفاق یہ ہے کہ مولانا اقبال احمد صاحب سہیل (علیگ) ہی کے توسل سے ہوئی جنھوں نے ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرائی تھی۔ اس وقت تک میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے نا آشنا تھا۔ مولانا سہیل سے البتہ پرانی یاد اللہ تھی۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ مولانا اور اصغر صاحب ساتھ ہی میرے مکان پر تشریف لائے۔ میں گھر میں تھا۔ سہیل صاحب کی اطلاع ہوئی تو میں بے اختیار باہر آیا اور بہت سے غیر ذمہ دارانہ فقرے کچھ ادھورے کچھ پورے ورد زبان کرتا آیا۔ اس لئے کہ میں نے مولانا سہیل جیسا بے پناہ برجستہ گو اور دقیقہ سنج آدمی اب تک نہیں دیکھا ہے وہ عالمانہ نکتوں اور فقروں کو اس لطف و فصاحت کے ساتھ ایک دوسرے میں سموتے ہوئے برمحل و مسلسل چست کرتے چلے جاتے ہیں۔ کہ طبیعت عش عش کر جاتی ہے میں جانتا تھا کہ انھوں نے پہل کر دی تو ان کا قابو میں لانا نا ممکن ہو جائے گا اس لئے میں گھر سے

تیار ہو کر نکلا تھا۔

میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ سامنے ایک صاحب نظر آئے۔ کمرہ چھوٹا تھا، دروازے بند اور روشنی مدہم کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اجنبی کے قدوقامت کے مقابلہ میں کمرہ کی وسعتیں لحظہ لحظہ سمٹتی جا رہی ہیں دراز قد، متوسط جسم، ستھری وخوش قطع پوشاک، سر پر پٹے، سڈول بھری بھری فرنچ کٹ ڈاڑھی، سر پر بالوں کی اونچی ٹوپی چہرہ پہ اجالا، آنکھوں میں خلوص کی گہرائی اور ذہانت کی شگفتگی، تیور میں شرافت متوسط عمر، انداز میں خوداعتمادی و دل آسائی۔ ہیک نظر دل نے گواہی دی کہ اچھے آدمی سے ملاقات ہوئی یہ اصغر صاحب مرحوم تھے۔

اصغر صاحب کسی قدر جھکے ہوئے تھے۔ جھکنا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا آدمی بڑائی اور بھلمناہٹ سے جھک گیا ہو۔ یہ جھکاؤ اعضا کا نہیں انداز کا جھکاؤ تھا مسکرانا ایسا جیسا کسی واقعہ پر نہیں مسکرا رہے ہیں بلکہ تبسم ان کی شخصیت کا جزو تھا۔ ان کا مسکرانا لب و دہن کا مسکرانا نہ تھا بلکہ چہرے کی فضا ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولٰنا سہیل سے ہیں بے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا۔ مولٰنا بولے، لو ایک انسان لایا ہوں، میں نے کہا شکر ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ کسی انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے لو، لو، اصغر صاحب ہیں۔ اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغلگیر ہو گئے۔ اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے محبت اور مرحمت کے لمس نے مجھے کشش ثقل سے آزاد کر دیا ہو۔

مولٰنا سہیل نے اتنی فرصت غنیمت سمجھی اور اپنے بندھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے پاس ہی ٹوٹا تھا اسے اس طور پر اٹھا لیا جیسے میرے ہاتھ اسے بیچنے والے تھے مجھ سے اصغر صاحب کے بکس پر بیٹھنے کو کہا اور ابھی میں بیٹھنے کیا سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ بولے۔ سنو اصغر صاحب کا ایک شعر سناتا ہوں۔ ابھی شعر کی باری نہیں آئی تھی کہ بولے اصغر صاحب بس کسر یہ رہ گئی کہ ذاکر نہیں ہیں ورنہ دیکھئے کیا لطف آتا۔ پھر ایک خاص ترنم سے، ہمیشہ دردوں کے نہیں بلکہ بھلے انسانوں کے ترنم میں پڑھا۔

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

مولٰنا سہیل شعر کے بڑے اچھے پارکھ ہیں۔ ذاکر صاحب اچھے شعر سن کر نئی اور اچھوتی دنیائیں بنا دینے میں کمال رکھتے ہیں میں کسی میں نہیں۔ لیکن اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ جو میں نے بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے اور مثال پر مجھے بھروسہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں سارا جھگڑا اسی مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوا ہے

میں نے کہا مولٰنا شعر بڑے مزے کا ہے اللہ اسے بکس و لبستر پر بیٹھکر اور لوٹا ہاتھ میں لیکر غارت نہ کیجئے۔ سب لوگ اطمینان سے بیٹھے، کھانا آیا مولٰنا نے فرمایا۔ اصغر صاحب ذرا روح نشاط تو نکالنا، ان کو اشعار سناؤں۔ میں نے عرض کیا مولٰنا ذرا چھری تلے دم لینے دیجئے۔ جاڑا پڑ رہا ہے انگیٹھی آتی ہے۔ کھانا کھاکر چائے کا دور ہوگا۔ پھر جھوٹ سچ ملایا جائے گا۔ آپ تو اشعار کا بیوپار کرتے ہیں۔ اس سے اصغر صاحب کی دنیا اور میری عاقبت خراب ہوتی ہے۔ آپ کا کیا نہ دنیا کے قائل نہ عقبیٰ کے قائل! مولٰنا ایک خاص انداز سے منہ پر ہاتھ رکھکر ہنسے، دونوں پاؤں گھٹنے سے موڑ کر کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے جھولا سا جھولنے لگے۔ یہ مولٰنا کے ابتہاج و اہتزاز کی خاص علامت ہے۔

ناظرین معاف فرمائیں، ابتہاج، و اہتزاز، ایسے الفاظ استعمال کرنے میں مجھے کبھی اور ضرور تامل ہوتا لیکن جب بھلے مانس اور سمجھدار موجود ہوں تو الفاظ دقیق ہوں خواہ غیر مانوس، ان کے برمحل و بے تکلف استعمال کرنے میں ذوق کو تسکین ہوتی ہے۔ جاہلوں اور لیڈروں کے اس دور میں دقیق یا نازک مفہوم کو موزوں و مکمل الفاظ سے ادا کرنے کو ترس گیا ابلہوں کو کون سمجھائے کہ صاحب ذوق عربی، فارسی یا کسی اور زبان کے الفاظ قابلیت کی نمائش یا تعصب کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ مافی الضمیر کو آسانی سے منتقل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ عوام یا لیڈر کی سمجھ میں وہ لفظ نہ آئے تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ہم کب چاہتے ہیں کہ آپ نرے احمق اور جاہل بھی ہوں اور ہمارے جواہر پاروں سے کھیلنے بھی دیے جائیں۔

عوام کو خوش کرنا بڑے ثواب کی بات ہے لیکن کوئی موقع تو ایسا ملنا چاہئے جب ہم اپنا اور

اپنوں کا جی اپنے طور پر خوش کر سکیں۔

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے۔ ایسے موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کے معنی اپنے اپنے بستر پر لحاف اوڑھ کر لیٹ جانے اور جس کے جی میں جو آئے اسے گذرنے کے ہیں۔ نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا اور نہ زندگی کے فانی ہونے کا غم۔ آواز دی اندر سے پان آ گئے انگیٹھی سرد ہونے لگی نوکر نے کوئلے ڈال دیئے۔ نہ اندر سے کسی کی بلانے کی ہمت نہ باہر سے کسی صاحب کے آنے کا خطرہ۔ نیند آئی سو گئے، ہی چاہا بستر ہی پر رقص کرنے لگے۔

مولنا سہیل نے فرمایا۔ اچھا اصغر صاحب روح نشاط تو نکالیئے۔ مرحوم نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے آپ کو تو یونہی سب کچھ حفظ ہے۔ میں نے کہا مولنا ذرا ٹھہریئے، ابھی پہلا ہی شعر حلق سے نیچے نہیں اترا ہے۔ مولنا نے نہایت متانت سے فرمایا جلدی کیجئے ورنہ پھندا لگنے کا اندیشہ ہے۔ میں نے کہا رند نے ظرف تو اٹھا لیا لیکن ابھی ساغر بننا باقی ہے۔ اس کے بعد پینے اور میخانے بننے کا سوال آئے گا۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اصغر صاحب نے جو شعر کہا ہے اسے وہ ہماری دنیا میں آباد بھی کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ متاع یوسفی مسلم لیکن دام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں میرے آپ جیسے ناگفتنی موجود ہوں وہاں اصغر صاحب ساغر و میخانہ کی فضا بھی پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اصغر صاحب ہنس پڑے کہنے لگے۔ رشید صاحب ساغر و میخانہ کی فضا شاعر نہیں پیدا کرتے کلال پیدا کرتے ہیں۔ شاعر تو شرافت و شہامت کا اعلان کرتا ہے۔ مسجد، میخانہ یا میدان مصاف کا انتخاب تو ہر شخص اپنے اپنے ظرف سے کرتا ہے۔ علی گڑھ میں ساغر و میخانہ کی کیا کمی، کمی تو رندوں کی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک فرمایا۔ لیکن یہ تو بتایئے مولنا سہیل کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگے ان کی نہ پوچھیئے تمام عمر میخانہ میں رہے نکلے تو محتسب بن گئے۔ میں نے کہا محتسب ہی نہیں گواہ سرکاری، بھی۔ علی گڈھ سے نکل کر ان کا یہ حشر ہوا۔ نکالے گئے ہوتے تو یقیناً رند ہوتے مولنا بولے نکالا جاتا تو تمہارا کیا حشر ہوتا ہیں نے کہا وہی جو اب اصغر صاحب کا ہے اس پر مولنا

اور اصغر صاحب دونوں نے قہقہہ لگایا۔

دوسرے دن اصغر صاحب نے نشاط روح کا ایک نسخہ بڑی محبت سے دیا۔ کئی دن بعد مرحوم نے پوچھا، آپ نے نشاط روح کا مطالعہ بھی کیا میں نے کہا، اصغر صاحب اس وقت مولٰنا سہیل موجود نہیں ہیں۔ آپ خود کچھ متفرق اشعار سنائیے۔ یہ شخص بلا کے بے درماں ہے شعر سے لطف اٹھانے نہیں دیتا، سوچنے کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ وہ دیکھئے احاطہ کے پھاٹک پر کسی بزاخفش سے الجھا ہوا ہے۔ یقیناً اس سے وہ باتیں بیان کر رہا ہوگا جو افلاطون و ارسطو سے کرنا چاہئے تھیں اصغر صاحب نے فرمایا متفرق اشعار نہ سناؤں گا پوری غزل سنیئے۔ شاعر کو اسی طرح سننا چاہئے۔ تصور سے ہمکنار ہوجیئے تصویر دیکھکر کیا کیجئے گا۔ پھر یہ غزل سنائی۔ کیا نرم پرتمکین و گداز لہجہ تھا۔

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی — تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی
گذر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی — نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی
یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے — جمال دوست و شب ماہ و بادۂ عنبی
فروغ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے — ادا و رسم بلالی و طرز بولہبی
سرشت عشق طلب اور حسن بے پایاں — حصول تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی
وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں — جہاں سے تو نے لئے خندہائے زیر لبی
کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ اے ساقی — جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

دس گیارہ سال ہوئے ایک دفعہ ایسا بیمار پڑا کہ زندگی کے لالے پڑ گئے۔ لکھنؤ میڈیکل ہسپتال میں مدتوں صاحب فراش رہا اس زمانہ میں اصغر صاحب الہ آباد میں تھے۔ تقریباً ہر اتوار کو میں ہسپتال کے بالاخانہ پر اپنے کمرہ کے قریب ٹھیک نو بجے دن کو پاؤں کی ایک خاص آہٹ سنتا۔ دروازہ کھلتا، اصغر صاحب آہستہ آہستہ لیکن مستقل اور ہموار قدموں سے کمرہ میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ کچھ دیکھکر یا محسوس کرکے خوش ہو رہے ہیں۔ سلام علیکم اس لہجہ و انداز سے کرتے

جیسے کوئی خوشخبری سنا رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ جاتے مجھ سے تو کیا کسی اور سے بھی نہ پوچھتے کہ کیسا ہوں یا کیا ہو رہا ہے۔ بات اس انداز سے کرتے جیسے مجھے دیکھنے کے لئے کوئی لمبا سفر کر کے نہیں آئے تھے بلکہ ہسپتال تک ٹہلنے کے لئے آئے تھے۔ میری طرف بھی آ نکلے۔ باتیں ایسی چھیڑتے جن کا تعلق دور دور تک بھی مرض یا ہسپتال سے نہ ہوتا۔

اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون 'شیطان کی آنت' شائع ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا۔ اصغر صاحب یہ آپ ہر ہفتہ الہ آباد سے یہاں کیوں آتے ہیں۔ اور زحمت و زیر باری اٹھاتے ہیں۔ کچھ سوچا پھر مسکرا کر بولے شیطان کی آنت کھینچ لاتی ہے۔ میں نے کہا فرشتوں کو بھی! فرمایا فرشتہ کو شیطان ہو جاتے بھی تو آپ نے سنا ہوگا! میں نے کہا اصغر صاحب تکلیف نہ ہو تو کچھ سنائیے۔ اصغر صاحب میری اس (غالباً غیر متوقع) فرمائش پر بہت مسرور ہوئے اور ذیل کی غزل بڑے لطف سے سنائی۔

سرگرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ — اڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو کہ بتخانہ

یہ دین وہ دنیا ہے یہ کعبہ وہ بت خانہ — اک اور قدم بڑھ کر اے ہمت مردانہ

قربان ترے میکش ہاں اے نگہ ساقی — تو صورت مستی ہے تو معنیٔ میخانہ

اب تک نہیں دیکھا ہو کیا اس رخ خنداں کو — اک تار شعاعی سے الجھا ہے جو پروانہ

مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمیٔ حسن شمع — اس سے بھی زیادہ ہے سوز غم پروانہ

زاہد کو تعجب ہے صوفی کو تحیر ہے — صد رشک طریقت ہے یہ لغزش مستانہ

اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا — یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ

انداز ہیں خود اسمیں سب شمع شبستاں کے — اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر واپس جاتے وہ بھی اس طرح جیسے رخصت نہیں ہو رہے ہیں بلکہ یوں ہی باہر جا رہے ہیں۔ جب میں صحتیاب ہو کر واپس آ گیا تو ایک عرصہ کے بعد معلوم نہیں کس سلسلہ میں میں نے پوچھا کیوں اصغر صاحب آپ ہسپتال میں مجھے دیکھنے آتے تو آپ پر ایک طرح کی شگفتگی کیوں طاری رہتی۔ میں نے آپ کو اتفاقاً بھی کبھی فکرمند نہ پایا کیا میری ہمت افزائی مقصود تھی۔ بولے بالکل نہیں۔ اچھا سنئے

ایک لطیفہ سناتا ہوں۔

ایک دن میں اکیڈمی سے مکان واپس آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔صاحب راستہ میں ملے اور نہایت غمناک لہجہ میں بولے کہ اصغر صاحب بڑے افسوس کی بات ہے رشید صاحب کا انتقال ہو گیا ایسے تھے ویسے تھے۔ میں سن کر ہنس پڑا اور بولا حضرت ہوش کی باتیں کیجئے۔ انتقال کرنا کیسا میں جانتا ہوں وہ زندہ ہیں اور تندرست ہو کر رہیں گے۔ انھوں نے مجھے بدحواس یا بیوقوف سمجھا اور لگے اپنی خبر کے موثق ذرائع بتانے گنانے میں نے کہا یہ سب صحیح لیکن میں ہر ہفتہ دیکھ آتا ہوں ان کی پیشانی پر نہایت جلی نقوش میں "حیات" لکھی ہوئی ہے۔ وہ نہ مانے۔ میں نے کہا آپ نہیں مانتے تو آئیے تار دیکر دریافت کرلیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور خبر غلط نکلی۔ رشید صاحب واقعہ یہ ہے کہ جب لکھنؤ پہنچ کر آپ کو دیکھا تو فوراً یہ نظر آتا کہ زندگی اپنی پوری تابش و تازگی کے ساتھ موجود ہے اور میں مسرور و مطمئن ہو جاتا۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا۔ انھیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے۔ شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا۔ وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز و محبوب رہتے۔ وہ کچھ عالم تبحر نہ تھے لیکن اردو کے بہت سے شعرا سے کہیں زیادہ ذی استعداد و ذی علم تھے۔ بڑی رسا طبیعت تھی۔ نئے سے نئے اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مسائل کی تہ تک اس سہولت اور صفائی سے پہنچ جاتے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ اس مرحلہ سے انکا یہ سابقہ پہلے ہی بار پڑا تھا۔ انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی اور نہ فن تنقید کے جدید ترین اصول سے آشنا تھے لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے مشیر ادبی کی حیثیت سے اُن اُمور سے سابقہ پڑا تو آپ کے قلم سے نہایت متوازن مستند و بے لوث تنقیدیں نکلیں اور ترجمہ تو ایسا کرتے کہ اکثر اصل کا دھوکا ہوتا۔ پکے مسلمان اور مشرقی تھے لیکن میں نے بڑے بڑے مغربیت مآبوں کو اصغر صاحب کی بصیرت اور ہمہ جہت شخصیت کا معترف پایا۔ اُردو میں عام نثر نگاروں کے برخلاف وہ اپنی تحریر میں زور، رنگینی اور وزن پیدا کرنے کے لئے حشو و زوائد سے کام نہیں لیتے تھے۔ اُردو کے اکثر مستند اہلِ قلم بھی الّا ماشاء اللہ کے یکبارہ

سے ملتے جلتے ہیں۔ بات اتنی معمولی ہوگی کہ اُسے نہ بھی کہیں تو ہرج نہیں۔ لکھیں گے اس طرح جیسے دیوالیہ کا اشتہار لکھ رہے ہیں، ہندو مارے ڈالتا ہے، یا محبوبہ بھاگ گئی ہے۔ مرحوم تحریر و تقریر دونوں میں حفظ مراتب ملحوظ رکھتے تھے۔ انڈین پریس الہ آباد کی فرمائش پر انھوں نے "تحفوں" کا ایک سلسلہ بچوں کے لیے تصنیف کیا جس میں مختلف ممالک کے حالات سے بچوں کو بڑے دلنشیں انداز سے روشناس کرایا ہے کچھ دنوں لاہور کے ادبی مرکز میں بھی علمی خدمات انجام دیں۔ منتخبات کے بعض سلسلے اصغر صاحب ہی کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور بڑے مستند اور وقیع سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم نے ایک مستقل تصنیف اردو کی ذہنی تاریخ، شروع کی تھی کئی سو صفحات کا مسودہ ان کے کاغذات میں اب تک موجود ہے۔ لیکن اوراق اتنے بوسیدہ اور گڈمڈ ہوگئے ہیں اور حواشی اس کثرت سے لکھے ہیں کہ اُن کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اصغر صاحب کی آمدنی بہت کم تھی لیکن میں نے اُن کو کبھی تنگدستی کا شاکی نہ پایا۔ بڑا خرچ تھا، بہت اچھا پہنتے تھے اس سے اچھا کھاتے تھے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کرتے تھے۔ اُن سے دس گنی آمدنی والوں کو بھی میں نے اُن جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا۔ اُن کے جسم پر یا گھر میں کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی گئی جس سے شبہ بھی ہوسکتا کہ محض شوق پورا کرنے کی خاطر دوسرے یا تیسرے درجہ کے بدل پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی ہر چیز میں ذوق وسلیقہ کی شہادت ملتی تھی۔ آج تک میلے اور پیوند لگے لباس میں نہیں دیکھے گئے۔ گفتگو میں رکیک یا خفیف فقرے زبان سے نہ نکالتے۔ گفتگو آہستہ کرتے، مسکرا کر کرتے لہجہ ہمیشہ نرم، پُر وقار یا شگفتہ ہوتا۔ میں نے اُن کو کبھی مایوس، مضمحل یا مضطرب نہ پایا۔ اُن کے ملنے والے مختلف و متضاد مشرب کے لوگ بھی تھے۔ لیکن وہ گفتگو اس انداز سے کرتے کہ اپنی وضع بھی ہاتھ سے نہ جاتی اور دوسرا بھی مایوس یا منغص نہ ہوتا۔

الہ آباد میں پہلے پہل انھوں نے کٹرہ میں ایک مکان دو کانوں کے ذیل میں لب سڑک لے لیا تھا۔ بیٹھک میں براق چاندنی کا فرش، تین چار گاؤ تکیے، الماریوں پر روغن دیوار پر قلعی۔ میں ملنے گیا تو پوچھا، کیوں مکان ملنے میں تو دشواری نہیں ہوئی؟ میں نے کہا جی نہیں، البتہ ذرا شبہ ضرور ہوا کہ

آپ کا مکان ہے یا حکیم اجمل خاں کا مطب۔ خدا کے لئے اِس جگہ کو چھوڑیے۔ لوگ بیٹھے ہوں تو شبہ ہو کہ یا تو مخصوص امراض کے مریض جمع ہیں یا آپ خاص قسم کے پیر ہیں۔ گھورے پر چوکا لگانے سے فائدہ؟ مجھے تعجب ہے آس پاس کے دوکانداروں نے آپ پر اب تک جملہ کیوں نہیں کس دیا۔ اگر جلد چھوڑنا ممکن نہ ہو تو ہومیوپیتھک دواؤں کا کاروبار کیوں نہ شروع کر دیجئے۔ اصغر صاحب ہنس پڑے فرمایا آپ نے بات ٹھیک کہی، مجھے صفائی بہت پسند ہے لیکن معلوم نہیں کیوں جب میں باہر سے آتا تھا تو بیک نظر یہ صفائی خود مجھے کھٹکتی تھی۔

بازار میں کوئی چیز نئی آتی تو اُسے فوراً خریدتے، دوستوں کو دکھائی جاتی۔ کوئی پسند کر لیتا تو اُسی کے نذر کر دیتے۔ ایک دفعہ مرادآباد سے نہایت باریک اور حسین نقشے کی سینی لائے۔ راستہ میں میرے ہاں ٹھہر گئے، سینی دکھائی، پوچھا کہیے کیسی ہے۔ میں نے کہا عشوہ ہے عشوہ، "فتوحات" میں سے ہے یا خریدی ہے؟ بولے جی نہیں، فتوحات کا یہاں کہاں گذر۔ میں نہ مُلّا نہ انگریز۔ خوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے میں نے پوچھا کیا قیمت دی، کہنے لگے، واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے اُسنا نہیں،

جو کچھ کہا کہ ترا حُسن ہو گیا محدود؛

بس یہ آپ کی نذر ہے۔ وہ سینی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ اب مجھے جب کبھی نظر آجاتی ہے تو اُسے منگوا تا ہوں، اُسی میں کھانا منگا کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں غائب ہو چکی ہیں، نقوش دھندلے ہو گئے ہیں۔ میں حافظہ کا کچّا ہوں لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جاننے والے جانتے ہیں بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو ماضی کے سیمیائی پردوں پر رنگ و آہنگ، خط و خال رعنائی و زیبائی کے کیسے کیسے حزیں و حسین نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں!

اصغر صاحب کھلانے پلانے کے بڑے شوقین تھے۔ میں آنے والا ہوتا تو عجیب عجیب اہتمام کرتے۔ مرحوم کا انتقال فالج میں ہوا۔ پہلا حملہ سہنے کو سہہ گئے مگر ہاتھ پاؤں کمزور ہو گئے تھے۔ پاؤں بمشکل سیدھے ہموار پڑتے۔ آخر آخر میں الہ آباد کے سینٹ ہال کے سامنے بوڈریہ کے احاطہ میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا

مکان کے احاطہ کے پھاٹک تک ایک طویل راستہ تقریباً پون فرلانگ لمبا چلا گیا تھا۔ میرا الہ آباد پہنچنے کا وقت متعین تھا۔ میں نے ہمیشہ انتظار میں انھیں اس طویل سڑک پر ٹہلتے ہوئے پایا۔ اس میں کچھ فرق نہ آیا۔ پہلے چست آڑا پاجامہ پہنتے تھے بیماری کے بعد سے غرارہ دار پہننے لگے تھے۔ لمبا چکنی آستینوں کا کرتا، سر پر سپید ٹوپی، ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیہ بٹوا، دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار سگریٹوں کے ڈبے۔ آہستہ آہستہ سر جھکائے، قدم سنبھالتے ٹہلتے ہوتے۔ مجھے آتا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہائے اُن کا باغ باغ ہونا! زبان سے مرحبا یا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے۔ البتہ آنکھوں میں خوشی کی چمک ایسی ہوتی کہ مجھے اپنے قلب میں اُترتی معلوم ہوتی۔ لبوں پر مسکراہٹ اور باتوں میں شادمانی کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہے۔ خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادہ یا اشارہ تک سے نہ ہونے دیتے لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ و زمزمہ سنج معلوم ہوتے۔

اُن کی باتیں تھوڑی بہت اب تک یاد ہیں۔ کہتے رشید صاحب سُنا، جب سے بیمار رہا ہوں ذرا زیادہ عیاش ہو گیا ہوں۔ ہر طرح کے پان تمباکو فراہم رکھتا ہوں۔ یہ دیکھئے ہر مارکہ کا سگریٹ ہے ہر ایک کا رنگ جُدا ہے۔ ان میں وہی لطف آتا ہے جو مخصوص احباب کی صحبتوں میں آتا ہے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے مکان پہنچتے۔ نوکر کو آواز دیتے ناشتہ لاؤ۔ فرماتے یہ لیجئے میں نے ہارلکس مالٹڈ ملک شروع کر دیا ہے، یہ اُوولٹین کا گلاس ہے۔ یہ فورس ہے اور ہاں آپ نے کونڈر کے مکھن کھائے ہیں، ذرا یہ پولسن بھی ملاحظہ فرمائیے۔ غرضکہ ہر چیز بڑے شوق و لطف سے پیش کرتے۔ پھر کہتے ناشتہ کر لیجئے۔ وہ بھی حاضر کیا جائے گا۔ مدتوں سے بانگ احتجاج دے رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا دن قریب ہیں آج اُسے آپ دسترخوان پر چاروں شانے چت پائیں گے! یہ مرغِ مسلّم کا عنوان تھا۔

اور ہاں یہ پان لکھنؤ کا ہے آپ علی گڈھ کے پانوں کا بڑا رونا رویا کرتے رہتے ہیں آج لکھنؤ اور بنارس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ برقی قوام ہے۔ وہ زعفرانی پتی ہے اور ہاں (نوکر کو آواز دے کر) ذرا وہ گولیاں تو لانا۔ حکیم..... صاحب نے دی ہیں۔ کہتے تھے اُن کے مورث اعلیٰ نے شاہانِ اودھ کے لئے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کرایا تھا۔ اس کا نام "آبروئے اودھ" ہے اسے ضرور چکھئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن آج سے

علی گڑھ کی آبرو پر کیا اثر پڑے گا۔ کہنے لگے لیتے جائیے جس کی آبرو خطرہ میں دیکھئے گا دیجئے گا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ یہ سارا اہتمام اور لطفِ بیان میرے لئے تھا۔ جو چیزیں اور جو باتیں مجھے پسند تھیں انھیں کو المضاعف کرکے اور خود ادھر کرپیش کررہے تھے اور اس لطف و نزاکت سے کہ مجھے اُن کی اس حکمت عملی کو فاش کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ امرودوں کی فصل ہوتی تو اُس کا ایک ٹوکرا ساتھ کردیتے اور دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کردیتے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب کو بھیجنے تھے معلوم ہوا کہ وہ آج کل موجود نہیں ہیں۔ زیادہ تو میں نے رکھ لئے کچھ آپ لیتے جائیے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب نے علی گڑھ میں فرمائش کی تھی تھوڑے انھیں بھی بھیجدیجئے گا۔

ایک بار متعلقین وطن سے علی گڑھ آرہے تھے۔ راستہ میں چند گھنٹوں کیلئے الہ آباد میں اصغر صاحب کے ہاں ٹھہر گئے میرا سب سے چھوٹا بچہ احمدؔ گود میں تھا۔ مرحوم کو بچہ کی شکل اور وضع قطع ایسی پسند آئی کہ ٹھیک دوپہر میں اسے گود میں لئے سنبھلتے لڑکھڑاتے پیدل اپنے ایک عزیز دوست کے ہاں پہنچے اصغر صاحب کو اس طرح آتے دیکھکر ان کے دوست اور گھر والوں کو بہت تعجب ہوا۔ سب کے سب دوڑ پڑے۔ کیونکہ اصغر صاحب کو ڈاکٹر نے چارپائی پر مسلسل لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔ غذا بھی کم کردی تھی۔ ہفتوں بعد چارپائی سے اٹھے تھے۔ اس لئے بہت نحیف ہوگئے تھے۔ بعضوں نے لوگوں نے سمجھایا اور ٹوکرنے مانگا۔ لیکن احمد کو اپنی گود سے نہ اتارا۔ تھوڑی دیر بعد بچہ کو گود ہی میں لئے واپس ہوئے۔ شام تک اس کے ساتھ طرح طرح سے کھیلتے رہے۔ حتیٰ کہ دودھ پینے کے لئے ماں تک جانے نہ دیا۔

کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا تھا۔ بولے رشید صاحب آپ تو دیکھ چکے ہو دوست کا بچہ، کتنا خوبصورت، معصوم اور پیارا بچہ ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہو سے مجھے کتنی الفت ہے اور اس کے والدین میرے کتنے سچے اور گہرے دوست ہیں۔ اس دن آپ کے متعلقین آئے تو میں نے احمد کو دیکھا۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتے اسے دیکھکر میرے دل پر کیا اثر ہوا۔ اول تو میں بھول گیا کہ بیمار و نحیف ہوں۔ دوسرے دل میں ایک عجیب فخر آمیز پندار پیدا ہوا کہ احمد ہو سے کہیں زیادہ دلکش اور پیارا ہے۔ ذرا میری بدحواسی تو دیکھئے میں نے ہو کے والدین سے بھی کہدیا کہ

احمد نے بٹو کو زیر کر دیا۔ چنانچہ جس فاتحانہ انداز کے ساتھ میں گیا اس سے کہیں زیادہ فاتحانہ فخرو مباہات سے واپس آیا۔ احمد نے میری ایک کمی پوری کر دی۔

ایک بار خط آیا لکھا تھا "بلّذ پر بشیر اور احمد کی محبت دونوں بڑھ رہے ہیں، دیکھئے کیا انجام ہو"

مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے۔ مرحوم اسے جانتے تھے۔ جب کبھی الہ آباد جاتا تو وہ پتہ لگاتے ہوتے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں۔ اجنبی ہوتا تو اس سے رسم و راہ پیدا کرتے مجھے لے جاتے اور گلاب پسند کراتے۔ ایک بار ایسے ہی ایک جگہ مجھے لے گئے، مالک سے زیادہ خود ہر گلاب کی تعریف کرتے۔ گلاب یوں ہی سے تھے میں نے اخلاقاً ایک آدھ کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی معاً اصغر صاحب نے اسے حاصل کرنے کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ میں نے موقع نکال کر چپکے سے کہدیا، اصغر صاحب فکر نہ کیجئے سب کے سب معمولی درجہ کے ہیں۔ مرحوم کو غیر معمولی مایوسی ہوئی۔ واپسی میں میں نے پوچھا کہ یہ آپ چپ کیسے ہو گئے۔ کہنے لگے۔ کیا کہوں ان کے گلابوں کے نادر ہونے اور اس شخص کے نامعقول ہونے کا بڑا شہرہ سنا تھا۔ گلابوں کے بارہ میں تو آپ نے فیصلہ کر دیا۔ نامعقول ہونے کا حال مجھ سے پوچھئے۔ کمبخت کسی طرح رام ہی نہ ہوتا........ صاحب (الہ آباد کے سب سے مقتدر آدمی) کی معرفت اسے قابو میں کیا گیا۔ اس کے ساتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے۔ الہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کرے گا۔ ٹھیک ہے ایسے مہمل آدمی کے گلاب کیونکر عمدہ ہو سکتے ہیں! پھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بدعادت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڑھ سے آخری گاڑی سے روانہ ہوں گا اور کام ختم ہو جانے پر پہلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔ مرحوم کی آخری علالت کے زمانہ میں میرا جانا الہ آباد ہوا۔ صبح پہنچا شام کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں وہیں قیام کروں۔ ہزار ہزار طریقہ سے وقت ٹالدینے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیکھا کہ کام نہیں چلتا تو اصرار کرنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے کوئی ہرج نہ ہوگا۔ صبح چلے جائیے گا۔ میں ایسا بدبخت کہ نہ مانا۔ اور شام

ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔

مجھے کیا خبر کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔ مرے انکار پر ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے چہرے پر تیخ پڑ گئی لیکن میں کیا بتاؤں کس ضبط و پامردی اور کس مرحمت سے فرمایا۔ تو پھر آپ کی خوشی۔ وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہوجاتی ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن مرحوم کو میں نے جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں اس اعلان واعتراف سے کبھی کبھی امید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب مرحوم کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے۔

ایک ہی دو دن کے اندر اندر تار آیا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی!۔

دوسرے دن میں آلہ آباد پہنچا۔ بوڈیرکار راستہ سونا تھا۔ طبیعت بے اختیار ہوگئی۔ خلوص و محبت و مرحمت کا وہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی۔ زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شیفتگی سے اس میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی برفستانی ہواؤں اور گورستانی سناٹوں کے کچھ اور نہ تھا۔ اب ہمہ تن شوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا۔ میری تحریروں پر کس کو وجد آئے گا اور کون اسے مسرت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا سناتا پھرے گا۔ میرا کوئی مضمون شائع ہوتا سب سے پہلے اصغر صاحب کا تائشی خط آتا۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرد کر دیا۔ میرے اچھے یا برے خیالات کا بیشتر حصہ مضمون لکھنے کے دوران میں سان دگمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح آتا ہے۔ جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو اس کی خوشی ہوتی کہ اصغر صاحب اس کی داد دینگے اور لکھو بہتر لکھو اور جلد لکھو، امنگ پیدا ہوتی۔ اب وہ بات نہیں بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر آیا قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں جنکے بارہ میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شاید اس کی تہہ تک لوگ

نہ پہنچیں یا پہنچنا گوارا نہ کریں۔ اصغر صاحب ہمیشہ اسے پا جاتے۔ داد دیتے اور ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے اسی پر گفتگو کرتے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا صاحب فکر ہوں یا لوگ میری بات نہیں سمجھتے تو کسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں شخصی تجربات یا تاثرات کے لئے غیر معمولی فراست یا علمیت لازمی نہیں ہے یہ تو ہر شخص کے بھید ہوتے ہیں جن سے وہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے۔ میرا یہاں مطلب صرف اس شیفتگی سے ہے جو میرے باریک سے باریک اور نازک سے نازک تاثرات و تصورات سے مرحوم کو تھی اور جن کے خفیف سے خفیف ارتعاش بھی ان کے ذہن و دماغ پر مرتسم ہو جاتے۔

فالج کے حملہ کے بعد سے ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں جن پر وہ محض اس وجہ سے عامل رہتے تھے کہ ڈاکٹر کا یہی حکم تھا۔ ورنہ وہ مرض کے انجام سے ڈرتے نہ تھے۔ غذا یا رہنے سہنے کے سلسلے میں جو پرہیز بتایا گیا تھا۔ اس میں عجیب لطافتیں پیدا کر لی تھیں۔ خون کا دباؤ بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب بھلے چنگوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک بار ڈاکٹر نے کہا خون کے اس دباؤ کے ہوتے ہوئے آپ کا زندہ رہنا بھی کرامات میں سے ہے۔ اصغر صاحب نے کہا بہت ممکن ہے موت اسی سے واقع ہو لیکن زندہ رہنے کے اور ہی گر ہیں۔ زندہ رہنے میں ارادہ کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ ہوش میں رہ کر تو میں مروں گا نہیں۔ البتہ بے خبری میں آپ کا بس چلے تو موت سے نپٹ لیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مرحوم رات کے کھانے پر دوستوں میں سے کسی کے ہاں مدعو تھے۔ سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ فالج کا شدید حملہ اور یک لخت حملہ ہوا اور چند گھنٹے مطلق بے خبری کے عالم میں رہکر ہمیشگی میں مل گئے۔

اصغر صاحب زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گذر رہے تھے۔ ہر قسم کی صحبتیں دیکھی تھیں لیکن انھوں نے خودداری اور بانکپن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ان کا شاعر ہونا

اتفاقی تھا وہ کچھ اور ہوتے تو بھی یہی رنگ قائم رہتا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے ان کے بہت سے ملنے والوں سے سابقہ ہوا۔ اوباش، قلندر، ارباب علم و فکر صاحب باطن، ارباب دول، بکواسی و بے بہرہ طالب علم، کاروباری لوگ۔ میں نے ہر ایک کو ان کا قائل پایا۔ ان کے دشمن بھی کم نہ تھے جنھوں نے مخالفت میں وہ سب کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ لیکن اصغر صاحب کو گھٹیا کسی نے نہیں بتایا۔

اصغر صاحب کے جاننے پہچاننے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے جن کی قابلیت اور شخصیت مسلم ہے وہ بھی اصغر صاحب کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مرحوم میں وہ بات نہ تھی جو ساحروں یا فاتحوں میں ہوتی ہے کہ ان کے سامنے رہئے تو سب کچھ بعد میں کچھ نہیں مرحوم تسخیر نہیں کرتے تھے بلکہ لوگ خود ان کی الفت و اخلاص کی منزلت کرنا عزیز رکھتے تھے۔

ان میں ایک خاص نوعیت کی بڑائی تھی جس کا ہر بڑائی کو لحاظ رکھنا پڑتا تھا!

جامعہ ملیہ میں ایک بار مشاعرہ تھا شعر خوانی اور شعر سرائی ہو رہی تھی۔ اصغر صاحب کی باری آئی مرحوم کی آواز طبعاً پست تھی شعر پڑھنے شروع کئے تو مجمع میں انتشار پیدا ہوا رشید احمد صاحب ڈاکٹر صاحب پاس بیٹھے ہوئے تھے یک بیک اصغر صاحب سے پرچہ لیکر اٹھ کھڑے ہوئے اور شعر سنانے شروع کر دیے۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے

زجوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا ۔۔۔ زلا تسخیر کردم ایں جہانے مہر و انجم را

میں جانتا ہوں مرشد کا یہ اضطراری فعل کس راز کی غمازی کر رہا تھا اور مرشد کے اضطراری فعل کا کیا درجہ ہوتا ہے۔ ان کے چند ہی اضطراری آنسوؤں نے علیگڈھ کی آبرو رکھ لی اور جامعہ کو جامعہ بنا دیا اور مسلمانوں میں ایک نژاد نو کی طرح ڈالی۔

اصغر صاحب مشاعروں سے بیزار رہتے لیکن کہا کرتے تھے کہ طالب علموں کی دعوت رد کرنا گناہ ہے ایک دفعہ فرمایا کہ ان میں بے راہ روی ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ قصور ہمارا ہے۔ ہم میں نظر و فکر کی وہ گہرائی اور وسعت باقی نہیں رہی جو سفینہ نو کی متحمل ہو سکے۔

جگر صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ وہ ان کی بے راہ روی سے بڑے کڑھتے تھے لیکن ان سے محبت کرتے تھے۔ جگر صاحب انتہائی خود فراموشی کے عالم میں بھی اصغر صاحب کا

بڑا پاس کرتے تھے۔ مرحوم اکثر جگر صاحب سے کہتے تھے کہ جو چاہو کر لو آ ناتم کو یہیں پڑے گا۔ جگر صاحب
ایسے غیور عزت پسند قانع اور سادہ مزاج شاعر کم دیکھنے میں آئے جن کو وہ اپنے نزدیک بزرگ یا
بہتر سمجھتے ہیں اس کا لحاظ اس طرح کرتے ہیں جیسے پرانے زمانہ میں چھوٹے اپنے بڑوں کا کرتے تھے
بایں ہمہ جگر صاحب ایسا منھ پھٹ آدمی بھی کم ملے گا۔ جاہ و شہرت سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں
اپنی اس افتاد طبع سے بعض مواقع پر عجیب عجیب نزاکتیں پیدا کر دیں۔ اب تو خدا کے فضل سے مدتوں سے
عالم ہوش میں ہیں اور پچھلی عادت یک قلم ترک کر دی ہے۔ میں نے ان کو انتہائی از خود رفتگی کے عالم میں
دیکھا ہے اور بڑے سے بڑے شاعر اور شخصیت کو سخت سست کہتے سنا۔ لیکن اصغر صاحب کا نام
آتے ہی ان کو یا تو سناٹے میں آتے دیکھا یا بے اختیار اشکبار پایا۔ اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم
ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی
بعض بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی تصرف کا صدقہ سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں

اصغر صاحب کے کلام پر ان کی زندگی ہی میں بعض ناقدین نے سخت نکتہ چینیاں کیں۔ مرحوم
کی نظر سے یہ سارے مضامین گذرتے تھے لیکن میں نے آج تک ان کی زبان سے ناقدوں کو برا
بھلا کہتے نہ سنا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے بشرطیکہ وہ مخلص اور سمجھدار ہوں
خدا کا مفسر شاعر ہے اور شاعر کا مفسر نقاد ہوتا ہے۔ یہ کڑیاں اٹھ جائیں تو دنیا اختلال محض ہو کر رہ جائے
ایک دفعہ انھوں نے فرمایا تھا کہ لوگ اپنی افتاد طبع کا احتساب کئے بغیر غزل یا غزل گو سے برہم
ہونے لگتے ہیں۔ لوگ غزل سے بیزار ہیں۔ اس لئے کہ اس کے موضوع کو پسند نہیں کرتے حالانکہ
اب غزل کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و آہنگ بھی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہئے
کہ برے غزلگویوں نے کیا خرابیاں پھیلائیں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ اچھے غزلگو کتنی خوبیاں پیدا کر سکتے
ہیں اور پھیلا سکتے ہیں۔

مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں غزل کو مدنظر رکھکر شعر نہیں کہتا اس کو کیا کروں کہ بلند گھرے نازک

اور لطیف خیالات خود بخود غزل کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں کاش میرے خیالات واحساسات کوئی دوسرا ہیکل اختیار کر لیتے۔ مجھے قطعاً افسوس نہ ہوگا اگر وہ غزل نہ کہلائیں!

ایک دفعہ میں نے عرض کیا، اصغر صاحب آپ تو جتنے اور جیسے شعر چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ غزل میں صرف اول درجے کے اشعار تو رہنے دیا کیجئے بقیہ کو حذف کردیا کیجئے۔ اصغر صاحب پر ایک جھرجھری سی طاری ہوئی۔ پہلو بدل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا رشید صاحب یہ آپ نے کیا بات کہی؟ آپ ایسی باتیں کرتے ہیں! شاعر کبھی دوسرے درجہ کی بات کہتا ہے؟ کہہ بھی سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ اول ہی درجہ کے شعر کہتا ہے۔ سننے والے کے نزدیک وہ اول درجہ کا ہو یا دوم درجہ کا اس سے شاعر کو کیا علاقہ! آپ کے نزدیک وہ چھوٹی ہو تو ہو جب شاعر نے اُسے کہدیا تو وہ بڑی ہو گئی۔ بہت بڑی کچھ دن اور گذریں تو یہ حقیقت آپ پر خود واضح ہو جائے گی۔

اصغر صاحب کو سجاد انصاری مرحوم سے بڑا لگاؤ تھا۔ کہتے تھے زندگی نے وفا نہ کی ورنہ خدا جانے کیا ہوتے۔ فرمایا ہم میں ایسے نقاد و مفکر کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ اردو میں خرافات نگاروں کی تعداد بہت جلد بڑھ جاتی ہے جن کا تدارک نہ کیا جائے تو ہونہاروں پر زندگی تنگ ہو جائے۔ بڑے بت شکن تھے۔ کچھ دن اور جیے ہوتے تو کیا معلوم توفیق الٰہی انھیں براہیم نہ بنا دیتی۔

سر سپرو کا بڑا احترام کرتے تھے کہتے تھے سر سپرو کا احترام کرنے میں لطف آتا ہے اس لئے کہ وہ احترام کی حرمت سے واقف ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک دن فرمانے لگے کہ ان کی صحبت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی حال میں نہ اپنی سطح سے اتریں گے نہ حاضرین میں سے کسی کو اس کی حدود سے گذرنے دیں گے۔ اردو ہندی کے سلسلہ میں کہنے لگے کہ ہندوستان میں سر سپرو اور پنڈت کیفی ہی ایسے ہندو ہیں جن کو اردو سے بربنائے اردو الفت ہے۔ دونوں میں پرانے زمانہ کے مسلمان شرفا جیسی وضعداری ملتی ہے۔

اونچی جماعتوں کے مختلف الخیال طلبا اکثر ان کی صحبت میں دیکھے گئے۔ تعجب ہوتا کہ یہ نوجوان

جدید ترین افکار کے حامل ہوتے ہوئے بھی کس طرح اصغر صاحب کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ میں نے مرحوم سے ایک دفعہ اس کی وجہ پوچھی، بولے دنیا میں ایک ہی مستقل علم تو ہے نہیں۔ ہر علم کے تار و پود ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں۔ ایک ہی علم کی تکمیل مختلف علوم یعنی مختلف معلموں سے ہوتی ہے پھر آپ تو جانتے ہیں۔ کتابی اور اخباری علم (مسکرا کر) بزرگوں کے تصرف" کا ہمیشہ محتاج رہے گا۔ جب علم ارزاں اور معلم نایاب ہوں تو ظاہر ہے ہم آپ نظر انداز نہیں کئے جا سکتے ۔

اصغر صاحب مرحوم کے کلام پر گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں لیکن میری مشکل یہ ہے کہ ان کے کلام کو ان کی زندگی سے علٰحدہ بھی نہیں کر سکتا۔ مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آتا ہے اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجئے تو ان کا کلام۔

کلام سامنے آ جانے سے مقصد ان کے اشعار کا یاد آنا نہیں ہے بلکہ وہ جمال و کمال اور تصورات کی وہ مینا کاری و فردوس آرائی ہے جسے ان کا کلام بروئے کار لاتا ہے۔ ان کا کلام انیس کی طرح محبت کرنے والا، رفاقت کرنے والا اور ترفع پیدا کرنے والا ہے۔ اصغر آپ کو فکر کی زحمت نہیں دیتے یہ زحمت وہ خود اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے فکر کے رنگین و رعنا نقوش سے آپ کی مدارات کرتے ہیں اور مدارات بھی اس طرح کرتے ہیں کہ آپ پر کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔ یہی بات اصغر صاحب کی زندگی میں ملتی تھی۔

اس سلسلہ میں محض افہام تفہیم کی خاطر میں ضمناً اقبال کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔ حاتم طائی کے کوہ ندا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے اور آپ سے کچھ بن نہ پڑے گا۔ اصغر سے رجوع کیجئے وہ آپ کے ساتھ ہولیں گے اقبال آپ کو سر مو ادھر ادھر نہ ہونے دیں گے۔ اصغر سے آپ خود علٰحدہ نہ ہوں گے۔ اقبال

کے ہاں موضوع فکر (تفہیم) اور دعوت عمل ہے، اصغر کے ہاں تصورات جمیل اور دعوت دید۔ اقبال حکومت کرتے ہیں اور اصغر رفاقت کرتے ہیں۔ معنوی حیثیت سے دونوں جدا ہیں اور اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے دروبست کے اہتمام ترصیع میں دونوں انتہائی احتیاط اور صناعت کاری کو دخل دیتے ہیں اور سلیقہ و شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

اصغر کی زندگی ہی سلیقہ شرافت اور صداقت میں گذری۔ ظاہر ہے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہوگا۔ اصغر سرتا سر غزل گو ہیں لیکن ان کے کلام میں غزل کی مروجہ یا مسلمہ عریانی یا خامکاری نہ ملیگی آپ ان کا کلام بے تکلف جس کے سامنے چاہیں پڑھ سکتے ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ اور جذبات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے اور دونوں کو انتہائی احتیاط اور سلیقہ سے اپنے کلام میں برتا ہے۔ ان کے ہاں ترغیبات یا تجربات جنسی نہ ملیں گے بلکہ ان کی لطافتیں اور نزاکتیں، ان کی رفعتیں اور ان کی ذمہ داریاں۔ ان کے ہاں تفصیل نہیں تحلیل ہے کیمیائی یا نفسیاتی تحلیل نہیں بلکہ شاعرانہ اور عارفانہ تحلیل۔ پھر وہ اس تحلیل کو الفاظ و معنی، کیف و کم رنگ و آہنگ کے ایسے فانوس میں گردش دیتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے اپنے محبوب کا قدو خال نظر آتا ہے۔ عارفانہ بصیرت اور شاعرانہ صناعت کاری کا معجزہ بھی یہی ہے۔

اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کے کلام کے حسن و تاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ تھوڑے بہت لکھے پڑھے، بھلے مانسوں میں بیٹھے اور ذوق و بصیرت رکھتے ہوں۔ شاعری نہیں دنیا کا ہر شریف فن ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔ اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے۔ اگر جدید اسکول اسے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر صاحب کا قصور نہیں ہے۔ قصور اس مقصد اور معیار کا ہے۔ جس کے واضع نہ مقلد نہ مدّاح!

اصغر صاحب اپنے کلام کی جنت میں ہمیشہ زندہ قائم رہیں گے!

رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ)

"گراف اسپی"

[نام دیکھ کر آپ کو شاید یہ خیال ہو کہ نظم سیاسی ہے، مگر میں کہونگا اس میں اتنی ہی سیاست ہے جتنی ایک شاعر کو آسکتی ہے

اس واقعہ کے خط وخال انگلستان کے مشہور اور مستند اخبار "مانچسٹر گارڈین" سے لئے گئے ہیں۔ اور اصل واقعہ سے کوئی تجاوز نہیں کیا گیا ہے۔ نظم کا لطف اٹھانے کے لئے واقعات کا جاننا ضروری ہے ۱۳ دسمبر کی صبح چہارشنبہ کا دن تھا۔ سمندر پر فضا بالکل صاف اور روشن تھی۔ ایک برطانوی کروزر اجیکس، فرانس کے بڑے جہاز فارموسا کو ساتھ لئے ہوئے پنٹا ڈیل اسٹیٹ کے اطراف سے گذر رہا تھا۔ اس کے قریب کچھ فاصلہ پر دو اور چھوٹے جہاز اکسیٹر اور اشیلیز بھی تھے۔ صبح ۶ بجے اُسے اُفق پر دھواں نکلتا ہوا نظر آیا۔ "اس نے سمجھا کہ ایک اور جہاز اڈمیرل شیر ہے۔ لیکن یہ درحقیقت سلطنت جرمنی کا نہایت تیز اور قوی پاکٹ جنگی جہاز اڈمیرل گراف اسپی تھا جس نے نو برطانوی بڑے اور چھوٹے تجارتی جہازوں کو غرق کیا تھا اور مال غنیمت کے ساتھ اکثر سپاہیوں کو قید بھی کیا تھا۔ "گراف اسپی" کے بیچوں بیچ سہ منزلہ آہنی قلعہ تھا۔ جس پر چاروں طرف سولہ انچ سے لے کر گیارہ انچ کی زبردست توپیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ تیز سے تیز تجارتی جہاز بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ اس کی توپوں کی زد تیس ہزار گز تک تھی اور بم کا وزن ۸۰۰ پونڈ سے زائد تھا۔

جب جہازوں کے درمیان ۱۲½ میل کا فاصلہ رہ گیا تو گراف اسپی نے "اکسیٹر" کے اونچے مستول کو دیکھکر بموں سے اس کا خیر مقدم شروع کیا۔ چاندی کی طرح چمکتے ہوئے سمندر اور صبح کی معصوم فضا میں اس خیر مقدم نے برطانوی جہازوں کو فوراً برسرِ عمل کردیا۔ پہلے اکسیٹر نے جس پر ۸ انچ کی توپیں تھیں اور جس کی زد بیس ہزار گز تھی اپنی قسمت آزمائی شروع کی۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ واقعات کے لحاظ سے یہ بھی ممکن تھا کہ جہاز بچ کر بغیر جنگ کئے نکل جاتے۔ لیکن اتفاق سے تین برطانوی جہاز ل

کی قربت نے انہیں گراف اسپی جیسے قدیم اور قوی حریف کو محصور کرنے کی بجائے مدد دی۔ اجیکس نے فارموسا کے سامنے دھوئیں کا پردہ ڈالکر کے اپنے ساتھی مہمان کو ساحل کی طرف روانہ کر دیا۔ اکسیٹر اپنے قوی حریف کے سامنے سینہ سپر ہوا۔ اس پر ۵۰۰ پونڈ کے وزنی بم پھینکے گئے۔ ۲۰ جانوں کا نقصان ہوا۔ صبح کے ۷ بجے یعنی ڈیڑھ گھنٹے کی لڑائی میں یہ جنگ کے قابل نہیں رہا اور واپس ہو گیا اس اثنا میں اجیکس نے دوسری طرف یعنی ساحل کی جانب جاکر گولہ باری شروع کی اس طرف اشیلیز نے بم برسانے شروع کئے ان تینوں جہازوں نے نشانہ بازی کا ایک مثلث قائم کیا تاکہ اپنے قوی حریف کو محصور اور مجبور کریں۔ ان جہازوں پر صرف ۶ انچ کی توپیں تھیں لیکن انھوں نے بڑے فنی کمال اور استقامت کے ساتھ دن بھر جنگ جاری رکھی۔ اور پانچ مرتبہ گولہ باری کی۔ اس متفقہ حملے نے جرمن "نوشیرواں" کو اتنا عاجز کر دیا کہ ۱۴ دسمبر کی رات کو بارہ بجے اسے بندرگاہ مانٹی وی ڈیو (جنوبی امریکہ) میں پناہ لینی پڑی۔ لڑائی میں اجیکس کی توپوں کے ۴ مورچے تباہ کر دئے گئے اور سات جانیں تلف ہوئیں۔ اشیلیز پر بھی سخت جانی نقصانات ہوئے۔

بندرگاہ مانٹی وی ڈیو کے اطراف تین سو میل تک "امن کی سرحد" ہے۔ یہاں حکومت یوراگووے کے ارباب مقتدر نے "گراف اسپی" کو صرف ۷۲ گھنٹوں کی مہلت دی کہ وہ اپنے آپ کو درست کرلے خوف یہ تھا کہ زیادہ دیر ٹھہرنے سے کہیں جنوبی امریکہ کے ساحل تک جنگ کی آگ نہ پہنچ جائے۔ اس اثنا میں تینوں برطانوی جہازوں نے نیوزلینڈ والوں کی مدد سے اپنی ترمیم کرلی۔ ایک بڑا جنگی جہاز کمبرلینڈ بھی آ پہنچا۔ اس طرح ایک قوی برطانوی بیڑا اس امر کا انتظار کرنے لگا کہ "گراف اسپی" سرحد سے باہر آئے۔

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک قوی حریف اتفاق سے گھر گیا ہے جس کیلئے سوائے جنگ بچاؤ کی اور کوئی صورت نہیں۔ ایسے نازک وقت میں صرف ۷۲ گھنٹوں کی مہلت اتنی کافی نہ تھی کہ سنبھالا لیکر کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔

بہر حال وقت مقررہ کے بعد کیپٹن لیانگسڈراف نے جہاز کو باہر نکالا حتی الامکان جنگ

کی۔ لیکن اپنا انجام قریب دیکھ کر پہلے سارے اہلِ جہاز کی جو ایک ہزار کی تعداد میں تھے اور جن میں برطانوی قیدی بھی تھے جان بچانے کا ارادہ کیا اور انھیں کشتیوں میں سوار کر کے یونس آئرس پہنچا دیا جہاں مملکت ارجنٹائن کے ارباب حکومت نے انہیں نظر بند کر لیا۔
کیپٹن لیانگسڈراف نے آخر وقت ایک برطانوی قیدی کیپٹن ڈوو سے جو بعد میں رہا ہو گیا۔ یہ الفاظ کہے "تم انگریز لوگ بڑے چھوٹے ہوتے ہو۔ جب لڑائی ایسی ہو تو ہم تم آپس کا عناد بھول جاتے ہیں"۔ اس نے قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور ٹرائیڈن کی یہ روایت قائم رکھی کہ جنگ نہ کرنے والوں کو جانی نقصان نہ پہنچایا جائے۔
۱۷ر دسمبر کی رات کو اس نے دو زبردست اور یادگار اقدام کئے۔ ایک تو یہ کہ ہٹلر سے یہ اجازت ملنے کے بعد کہ "تم جو چاہو کرو" "گراف اپی" کو دریائے "پلیٹ" کے باہر سرنگ لگا کر اڑا دیا، تاکہ وہ حریفوں کے ہاتھ نہ لگے۔ دوسرے ۱۹ر دسمبر کی شب کو اپنے تنہا کمرے میں اس نے پستول سے اپنی جان دیدی! اس طرح چھ سات روز کی ایک جان فرسا کشمکش میں یہ دریائی ڈرامہ انجام کو پہنچا]

منظر پہلا

[۱۳ر دسمبر۔ چہار شنبہ۔ ۵ بجے صبح سمندر دنیا سے اس طرح مخاطب ہے]

چھایا ہوا ہوں زندگی بے قرار پر
نسبت ہر ایک شئے کو مری انجمن سے ہے

ہر ذرۂ زمیں ہے پہنے قبائے نور
یہ خاک زرنگار مرے پیرہن سے ہے

انساں کی جرأتوں کا ہوں دشمن بنا ہوا
تھوڑی سی دوستی مجھے چرخ کہن سے ہے

گو خشک ہے سیاست دنیائے کم نگاہ
اس میں جو دلکشی ہے مرے بانکپن سے ہے

صبح کا دھندلکا

اک تماشا کرنے والے کا ہوں میں پالا ہوا
ہوں ترے اسٹیج پر پردہ سا ایک ڈالا ہوا

صبح ادلیں، ہر روز نئی صبح ہے ہر روز نئی شام
دریائے رواں پاس ترے ہے کوئی پیغام؟

سمندر

مری عظمت سے موجیں اپنی عظمت ڈھونڈھ لیتی ہیں
مری پہنائیوں میں دل کی دولت ڈھونڈھ لیتی ہیں

وہ موجیں جن کے آگے کھیل ہے طوفان سے لڑنا
اسی ذوقِ فنا میں اپنی قسمت ڈھونڈھ لیتی ہیں

انھیں معلوم ہے گہرائیوں کی نازفرمائی
وہ بوندیں جو صدف میں اپنی خلوت ڈھونڈھ لیتی ہیں

مری بیتابیاں پانی کے اندر مچھلیاں بن کر
جانِ درد میں پیغام راحت ڈھونڈھ لیتی ہیں

نظر آتا ہے ان کو ڈوب کر پرنور ہو جانا
مری شادابیاں جب میری ظلمت ڈھونڈھ لیتی ہیں

لگا رکھتا ہوں سینے سے میں اُن رنگیں نگاہوں کو
جو میرے آئینے میں اپنی حیرت ڈھونڈھ لیتی ہیں

ڈُھندلکا۔ اے صبح تو دریا پہ بڑی شان سے آئی
اپنا کوئی پیغام زمانے کو سنا دے

اس عالمِ مغرور کا دل بھی ہو دوپارہ
ایسا کوئی نظارۂ جانسوز دکھا دے

صبحِ اولیں :-

گو اک گھڑی کی عشرتِ رنگیں سے شاد ہوں
میں تجھ سے کہہ رہی ہوں کہ ناشاد بن کے جی

بھاتی نہیں چمن کو تری خوش نوائیاں
اے صیدِ خود فروش تو صیاد بن کے جی

بھونچال، آگ، زلزلہ، طوفان بن کے اُٹھ
آباد سرزمین پہ برباد بن کے جی

الٹا دے ہر اصولِ غلامی کو یک قلم
اوندھا خیال امن کو، آزاد بن کے جی

دھندلکا۔

لو صبح کے دریا کا نظارہ دکھاتا ہوں
تھوڑا سا نگاہوں سے میں پردہ اٹھاتا ہوں

[دور افق سے دھواں نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جہاز آرہا ہے]

روحِ نظارہ

اے گہر، دور افق پہ ہے نظارہ کس کا!
مل رہا ہے مری آنکھوں کو سہارا کس کا!

دھندلکا:-

حیرانیٔ نگاہ کو پھر آزما کے دیکھ
مقصود دیکھنا ہے تو نزدیک آ کے دیکھ!

جرمنی کا پاکٹ جنگی جہاز "گراف اسپی" دھواں اڑاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اس کی ہر چیز فولاد سے بنی ہوئی ہے۔ بیچ میں سہ منزلہ آہنی قلعہ ہے۔ چاروں طرف گیارہ انچ کے دہانے کی توپیں گردنیں نکالے ہوئے سمندر کے وسیع خلا کو تاک رہی ہیں۔ درمیانی قلعہ کے بالائی منزل پر کھڑکیوں سے کیپٹن لیانگسڈارف دُوربین لگاکر دیکھ رہا ہے۔ اس کے بازو پر دوسرا فوجی جنرل کھڑا ہوا ہے۔ نیچے برقی تار کی ایک چھوٹی سی میز پر ایک شخص وائرلیس کا سامان کانوں سے لگائے ہوئے ہے۔ دوسرا ٹیلیفون لیکر کیپٹن لیانگسڈارف کے احکام دوسری طرف پہنچا رہا ہے۔ کیپٹن آنکھوں سے دُوربین ہٹاکر مایوسی کے لہجے میں

کیپٹن

یہ سحر دیکھنے دیتی نہیں کچھ بھی مجھ کو ایسی مجبوری سے ہو خاک تسلی مجھ کو

جنرل

فطرت کے اس غرور سے مدہوش کیوں ہو تم؟ اس پردۂ خیال سے خاموش کیوں ہو تم؟
دوڑائیں اس فضا میں چلو روشنی کی دھار باقی رہے نہ دید کا آنکھوں کو انتظار

ایک ایسی دُوربین کے قریب آتے ہیں جس سے برق کی تیز روشنی میلوں دور تک جاتی اور فضا کو منور کرتی ہے۔ جنرل چند کیلئے گھماتا ہے۔ کیپٹن اسے روک کر)

کیپٹن

واہ کیا اچھی سیاست ہے کہ ان شعلوں سے اپنے دشمن کو کمیں گاہ دکھانا چاہو!

جنرل

اور یہ کون دلیری ہے کہ ناداں بن کر موت سے سینۂ دشمن کو بچانا چاہو!

دوسرا منظر

صبح کا اُجالا۔ جہاز پر ہر طرف احتیاط کا آغاز۔ ہر شخص اپنے اپنے مقام پر ہے۔ کپتان، جنرل، سپاہی

ملاح، خدام، سبھوں کے چہروں سے رعونت اور خود اعتمادی ٹپک رہی ہے۔ اور سب کے سب ایک ایک محویت کے عالم میں ڈیوٹی پر ہیں۔ کاروباری کمروں میں ابھی رنگین چراغ جل رہے ہیں۔ لیکن کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جہاز کے اندر ایک بڑے ہال میں جو چاروں طرف سے بند ہے ہلکا ہلکا فوجی بینڈ بجتا ہے۔ سپاہی دوڑ کے ایک حلقے میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بیچ میں کمانڈر اور اس کے ساتھی رہتے ہیں سب مل کر ایک ترانہ گاتے ہیں۔ پہلے موٹی اور گونجتی ہوئی آواز میں پھر جوش کے ساتھ۔

اے سمندر تری موجوں پہ رواں ہوتے ہیں
راستے موت کے اب تجھ پہ عیاں ہوتے ہیں

ہم غلامی کو مٹا کر ہی رہیں گے آزاد
یہ قسم کھاتے ہیں جس وقت جواں ہوتے ہیں

ہم کو رد ندا ہے بہت اہلِ سیاست نے مگر
آج ہم اہلِ سیاست پہ عیاں ہوتے ہیں

کر کی چھاؤں کو سمجھا ہے زمانے نے امن
کتنے ہم رنگِ یقیں وہم و گماں ہوتے ہیں

ہم سے منہ آئیں نہ الفاظ پہ مرنے والے
موت کے شعلے بہت تیز زباں ہوتے ہیں

بزدلوں کا ہوسِ زر میں قلم چلتا ہے
جاں فروشوں کے لئے تیر و سناں ہوتے ہیں

کوہ آتش کے فسانے تو بہت سنتے تھے
آج دریا بھی یہاں شعلہ فشاں ہوتے ہیں

اپنے دامن میں لئے پھرتے ہیں موت اور حیات
یہ سفینے جو شب و روز رواں ہوتے ہیں

ریڈیو کے ذریعہ ایک تیز آواز ہال میں آتی ہے: "دشمن! جہاز"! سارے سپاہی تیزی کے ساتھ منتشر ہو جاتے ہیں۔ جہاز کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ کپتان لیا نگسڈارف اور جنرل، دونوں قطب نما اور بحری فصل پیما پر نظر جمائے کھڑے ہوتے ہیں۔ چھت پر کانچ کی نلیوں میں سرخ برقی دھاریں تیزی سے دوڑنے لگتی ہیں

(صبح کے ۶ بجے۔ مقابل کا جہاز ۱۲ ½ میل رہ جاتا ہے۔ "گراف اسپی" سے گولہ باری شروع ہوتی ہے)

سحر کی روشنی

تقدیر کی موجوں پہ زمانہ کی فضائیں
لو بڑھنے لگا تیز حوادث کا سفینہ

آبادی دکہسار سے قوموں کے ارادے — آنے لگے دریا پہ بھی تانے ہوئے سینہ

انسانوں پہ چھائیگی سمندر کی جوانی — بن جائیگی ہر موج رواں موت کا زینہ

آتی ہے جہازوں پہ لئے جنگ یہ پیغام — آزاد ہے جو قوم کا مرنا ہو کہ جینا!

گراف اسپی کے آگے ہولناک ایک خونین قافلہ موت ان پر سوار ہے اور ہنستی ہوئی سب سے آگے والا بم سے کہہ رہی ہے

موت بم سے:

کہتے ہیں خوش آمدی ناز سے انساں مجھے — لیتے ہیں آغوش میں شہر و بیاباں مجھے

دیکھ کے خوش ہوتا ہے وقت گریزاں مجھے — دوش پہ لے جاتی ہے گردشِ دوراں مجھے

تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست!

عشوۂ تہذیب ہوں شوکتِ افکار ہوں — منزلِ نادار ہوں، مایۂ زردار ہوں

عقل کی تہذیب ہوں علم کی رفتار ہوں — محشر تخریب کا دل سے طلبگار ہوں

تیز ترک گام زن، منزل دور نیست!

عشق کے ایوان پر حسن کے آغوش میں — امن و محبت کی ہر منزلِ خاموش میں

خانقۂ عقل میں بہیکۂ ہوش میں — جاؤں گی میں دہر کی محفلِ پرجوش میں

تیز ترک گام زن، منزلِ ما دور نیست!

عقل بشر کے سفیر، صاحب زر کی پکار — شوکتِ اقوام کے، ہوشربا شاہکار

طاقتِ پرواز کے سلسلۂ بے قرار — اے مرے پیغامبر اے مرے آئینہ دار

تیز ترک گام زن، منزلِ ما دور نیست!

تیسرا منظر

سلطنت برطانیہ کا جہاز اجیکس، ایک فرانسیسی جہاز فارموسا کے ساتھ جارہا ہے۔ ان کے قریب قریب دو اور جہاز اکسیٹر اور اشیلیز ہیں۔ بم کا گولہ پانی میں آکر بڑے زور سے گرتا ہے۔ پانی پہاڑوں اچھلتا ہے۔ اجیکس پر نقل و حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ ایک سپاہی دوسرے سپاہی سے)

سپاہی لو مبارک وہ نظر آیا حریفِ جاں ستاں
امن کا جس کو پیامِ شادماں سمجھے تھے ہم

دوسرا سپاہی

آہ کیا ٹوٹا ہے قدرت کی لطافت کا طلسم
اس سحر کو جنتِ امن و اماں سمجھے تھے ہم

قطرے قطرے میں نظر آتا تھا رازِ حسن و عشق
صبحِ رنگیں کو نگاہِ دلبراں سمجھے تھے ہم

تھیں شفق کی بزمِ رنگیں میں، ازل کی تابشیں
ابر کے جلووں کو شمعِ لامکاں سمجھے تھے ہم

رقص زمانے لگا یہ موت کے شعلوں کے ساتھ
نیلگوں پانی کو روحِ آسماں سمجھے تھے ہم

آج اُن پر بھی ہے اک افسردگی چھائی ہوئی
اِن پرندوں کو قضا کا رازداں سمجھے تھے ہم

اس کے سینے سے نکلتی ہے فغانِ دردناک
موج کے نغموں کو شورِ میکشاں سمجھے تھے ہم

اس تموج کو جواب بم سے ہوا ہے سینہ چاک
ارتعاشِ نور کا اک کارواں سمجھے تھے ہم

وسعتِ دریا میں بھی دستِ اجل کا زور ہے
زیست کی رعنائیوں کو نوجواں سمجھے تھے ہم

(بم پانی میں گرنے سے مچھلیوں کے درمیان ایک پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ دو مچھلیاں آپس میں باتیں کرتی ہیں)

مچھلی

کون دریا کو مرے زیر و زبر کرتا ہے
کس کے ہاتھوں مری دنیائے سکوں ہے برباد؟

ہے پری خانۂ فردوس سے بڑھ کر یہ چمن
یاں نہ اندیشۂ گلچیں ہے نہ خوفِ صیاد!

چھپ کے جیتے ہیں نگاہوں سے فلک کی ہم لوگ
چند سانسوں پہ رہے تا نہ ہماری بنیاد

کون پیدا ہوا اک دشمنِ اہلِ دریا
کانپ اُٹھا کس کی نظر سے یہ جہانِ آزاد؟

دوسری مچھلی

سُنتے ہیں خاک پہ رہتا ہے کوئی صاحبِ ہوش
جس کی تقدیر کا دنیا میں نہ فردا ہے نہ دوش

عالمِ بے بدل، وواقفِ رازِ افلاک!
خالقِ امن و کرم، مالکِ عیشِ بے باک!

جس کے قانون ہیں اخلاق کے سنگِ بنیاد!
جس کی ترغیب سے تعمیرِ جہانِ آباد!

جس کی تہذیب کے دامن میں حیات دائم!
جس کی تعمیر کے سایے میں محبت قائم!

علم سے جس کے، جھلکتا ہے دو عالم کا جمال؛
عشق سے جس کے بھڑک جاتا ہے فانوسِ خیال؛
جس کی طاقت سے نگوں سار قوائے ہستی؛
جس کی حرمت سے سرافراز فضائے ہستی؛
جس کو دعویٰ ہے محبت کی جہا نبانی کا؛
جو طلب گار رہے کونین کی سلطانی کا؛
یہ اسی ساقیٔ امید کے پیمانے ہیں؛
یہ اُسی اشرف مخلوق کے افسانے ہیں؛

پہلی مچھلی

بے شک اس ظالم و مغرور کا ہے کام یہی
اس کے اقدام سیاست کا ہے انجام یہی۔
اس کی بیداریٔ افکار سے فطرت مجبور
اس کی آزادیٔ اعمال سے، دنیا مسحور۔
اس کی تحقیق سے پایا ہے تباہی نے فروغ
اس کی تصدیق سے پُر نور ہوئی بزم دروغ
کرۂ ارض کی تقسیم سیاست اس کی
موجدِ طرزِ غلامی ہے قیادت اس کی
اس کو ہم "صاحبِ ایمان" کہا کرتے ہیں؛
اس کو دنیا میں ہم "انسان" کہا کرتے ہیں؛

[ایک اور بم گرتا ہے۔ دونوں مچھلیاں اس کی زد میں آکر مر جاتی ہیں]

چوتھا منظر

جہاز اکسیٹر آخر میں آتا ہے۔ "گراف اسپی" کے سامنے دھوئیں کا پردہ ہے۔ یہ اکسیٹر کو اپنی پوری توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ اکسیٹر کے کپتان اور کمانڈر سپاہیوں کو جو سفید اور نیلی وردیاں پہنے ہوئے ایک اقلیدسی تنظیم کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں، ہدایت کرتا ہے۔ پیچھے بم کے گولے آکر گر رہے ہیں۔ بعض گولوں اور ان کے پرزوں کو سپاہی اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتے ہیں۔ کہیں آگ لگ گئی ہے۔ کہیں دھوئیں کے بادل اٹھ رہے ہیں۔ سپاہی چاروں طرف تیزی سے معروف ہیں بعض لوگ جہاز پر جمع شدہ پانی نکالی کر رہے ہیں۔

برطانوی کمانڈر

بہت آسان ہے لانا تباہی امن عالم پر ۔ بڑا دشوار ہے آنا سلیقہ جاں نثاری کا!

تمہاری عظمتیں ممدوح ہیں عزمِ زمانہ کی ‏ ‏ ‏ تمہاری ہمتیں، آئینہ ہیں اندیشہ کاری کا
بتائے تم نے جمہوروں کو آدابِ شہنشاہی ‏ ‏ ‏ سبق تم نے دیا سب کو دلوں کی پاسداری کا
نہیں معلوم تم میں روحِ مزدوراں بھی شامل ہے ‏ ‏ ‏ زمانہ دے رہا ہے تم کو غم سرمایہ داری کا
ابھی کمسن ہے دنیائے سیاست نوجوانوں کی ‏ ‏ ‏ بھروسہ ہے انھیں جذباتِ دل کی غمگساری کا
مگر جذبات سے کارِ سیاست چل نہیں سکتا ‏ ‏ ‏ سکوں کی چھاؤں میں پلتا ہی شعلہ بیقراری کا
سمندر پر ہمارا تجربہ ہے بحرِ بے پایاں ‏ ‏ ‏ ہے نقشہ سامنے موجِ رواں کی راہداری کا
اگرچہ دست و پا ٹوٹے ہیں لیکن دل نہیں ٹوٹا ‏ ‏ ‏ یہی پیغام ہے دنیائے غم کو دل فگاری کا
چلو دانشوری سے اپنی ناکامی کا دل تھامو ‏ ‏ ‏ تمہیں کیا خوف ہے اے شیر مرد و گولہ باری کا

[ایک زبردست بم جہاز کے عرشے پر آ کر پھٹتا ہے جس سے آگ کے طوفانی شعلے بھڑکتے ہیں]

بم :- (شعلوں سے) میری آوازوں میں ہے انسان کے دل کی صدا
شعلہ بولتا ہے میرے سینے میں کوئی آتش نوا
بم میرے بھونچالوں میں قوت کا تصادم دیکھنا
شعلہ میرے شعلوں میں ارادوں کا تلاطم دیکھنا
بم میں قوم کی اک پھونک ہوں اک آہ رسا ہوں
شعلہ میں آتشِ جذبات کا ایک جلوہ نما ہوں
بم نفرت کے دھماکے ہیں نہاں میرے دہن میں
شعلہ عزت کی ہے آتش زدگی میرے چمن میں
بم میں نوعِ بشر کے لئے تفریق کا ساماں
شعلہ میں بیکسیِ علم کا اک منظرِ عریاں

[روحِ نظارہ، صبح سے کہتی ہے]

اس سمندر کی فضاؤں میں یہ محشر دیکھنا ‏ ‏ ‏ شوکتِ انساں کی بربادی کا منظر دیکھنا

دستوں میں اور سکوں میں بھی ہوا شر و فساد | صبح کے جلوے بھی ہیں ہنگامہ پرور دیکھنا

صبح

میں اک جلوہ ہوں مجھ سے کام کوئی لے نہیں سکتا | سکونِ دل سے میرا نام کوئی لے نہیں سکتا

چھپے رہتے ہیں انوارِ محبت میرے سینے میں | مگر مجھ سے مرا انعام کوئی لے نہیں سکتا

[جلتا ہوا جہاز پکارتا ہے]

تیرتے ہیں میرے سینے پر ارادے حوصلے | فتح و ناکامی کی میں ایک شان ہوں تصویر ہوں

میرے دل میں مضطرب ہے آرزوئے فتحِ ارض | میں تمنائے دلِ انسان کی تصویر ہوں

وسعتیں پائی ہیں میں نے خاک سے بڑھ کر یہاں | وہ تو میرا خواب تھی، میں خواب کی تعبیر ہوں

میرا دریائی عمل ہے وجہ تقسیم زمیں | سلطنت والوں کا میں ایک شعلۂ تدبیر ہوں

[چار برطانوی سپاہیوں کی سنگت]

دو سپاہی

ٹوٹنے سے نہیں مٹتی ہے ہماری امید | ہم زمانے کو شجاعت کا سبق دیتے ہیں

اہلِ دانش کو خبر ہے کہ جہاں والوں کو | نقد دیتے ہیں سکوں مفت کا غم لیتے ہیں!

دوسرے دو سپاہی

پرچمِ شاہی کے نیچے سر کٹا کر جائیں گے | دھجیاں جور و تظلم کی اڑا کر جائیں گے

ہم سنبھل کر جائیں گے پھر کارزارِ دہر میں | کون کہتا ہے کہ ہم دامن بچا کر جائیں گے؟

[۲، جانوں کا نقصان جہاز ... ۳۰۰ گز کی حد میں ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی گولہ باری کے اندر کام کا نہیں رہتا۔ کپتان کی آواز آتی ہے۔ "واپس ہو جاؤ"]

پانچواں منظر

[اکسیٹر کی جنگ کے ساتھ ساتھ اجیکس اور اشیلز بھی مصروفِ جنگ تھے۔ دوپہر رات تک دونوں

برطانوی چھوٹے جہازوں نے کمال کے ساتھ پانچ مرتبہ گولہ باری کی۔ ''گرافت اسپی'' نے دھوئیں کا پردہ ڈال کے بچ نکلنے کا قصد کیا۔ اس سلسلے پر سخت جانی نقصانات ہوئے۔ اجیکس کے چار توپوں کے مورچے گرا دیے گئے۔ رات کے وقت خفیہ قندیلوں اور وائرلیس کے ذریعے دونوں میں مشورے ہوتے رہے۔ اجیکس پر چند سپاہی توپوں کے پیچھے کھڑے ہوئے ہیں۔ دوسرے تمام فوجی اور ملاح نہایت سرگرمی کے ساتھ جہازوں کو لڑا رہے ہیں۔

سپاہی

گو ہم سے قوی تر ہے یہ دشمن کا سفینہ — ہم ہاتھ سے ہنگام عمل جانے نہ دیں گے
ممکن نہیں گولوں سے اگر اس کی تباہی — نزدیک ہم اپنے بھی اسے آنے نہ دیں گے

دوسرا سپاہی یہ توپیں نہیں موت کے دست و بازو — جہنم کو دریا پہ پھیلا رہے ہیں
ہمارے نشانے ہمارے قرینے — فسونکار دشمن کو شرما رہے ہیں

برطانوی کپتان

دوڑو، چلو، بڑھو کہ غنیمت ہے وقتِ شب — پھر صبح زندگی کا اجالا بھی دیکھنا
گو دشمن قوی سے نکلتی ہے جان زار — ان نیم جانیوں کا سنبھالا بھی دیکھنا

ایک ملاح (دوڑ کے) وہ دیکھیے انجن پہ گرے بم کے شرارے
کپتان ہوتے نہیں اوسان خطا اس سے ہمارے

(دوسرا ملاح زخمی ہو کر گرتا ہے)

ملاح انجام دہی فرض کی ہر شے سے سوا ہے — عیسیٰ ترے قدموں پہ مری جان فدا ہے

کپتان (ملاح کی لاش سے اٹھتا ہوا)

سخت طوفانی جہازوں کو کیا ندرِ اجل — ٹکریں گولوں سے لیں اس مارِ آتشبار نے
دیکھنا ہاتھوں سے اپنے یہ نکل جانے نہ پائے — تو جہازوں کو ڈبویا ہے اسی غدار نے

ادھر ''گرافت اسپی'' پر کپتان ایا نگسڈارف غور سے صورت حال کا مطالعہ کر رہا ہے اسکے سامنے

نو برطانوی تجارتی جہازوں کے قیدی، سپاہی، اور کئی برطانوی عہدہ دار ہیں ان میں کپتان ڈوو بھی ہے

لیانگسڈارف

جنگ میں آئینِ خودداری دکھانا چاہیئے
موت کو معراجِ انسانی پہ لانا چاہیئے

گو بہت دشوار ہے ہٹلر کا بننا ہم خیال
خود اسے رازِ آشنائے غم بنانا چاہیئے

دیکھنا ان قیدیوں پر کچھ نہ ہو جور و ستم
اِن جوانمردوں کو دامن میں چھپانا چاہیئے

اک روایت ،، ایڈن ،، کی یاد ہو مجھکو ابھی
زندگی کو موت کے غم سے بچانا چاہیئے

ایک کپتان

تین سمتوں سے ،، گراف اسپی ،، پر برساتے ہیں بم
دشمنوں نے ہم کو گھیرا ہے بڑے انداز سے

لیانگسڈارف

چھپ کے جب ہر سمت سے سر پر چلی آتی ہو موت
دیکھتا ہے شیر اس کو بھی نگاہِ ناز سے

بارہ گھنٹوں کی دھواں دھار جنگ کے بعد۔ گراف اسپی پر ۳۶ جانوں کا نقصان ہوا۔ نیچے کی طرف سوراخ پڑ گئے۔ لیانگسڈارف جہاز کو بندرگاہ مانٹی وی ڈیو کی طرف لے جانے کا حکم دیتا ہے۔

ایک فوجی عہدہ دار نازیوں سے یہ خجالت کیا اٹھائی جائے گی؟

کپتان غم نہیں حسرت نئے سر سے نکالی جائے گی

دوسرا عہدہ دار گر وہاں جا کر نئی آفت میں ہو جائیں اسیر؟

کپتان دیکھیے دکھلائے کیا تدبیرِ غم یہ چرخ پیر؟

اس کا مددگار

کمزوروں کے گوروں کا نہ ہم ہوں گے نشانہ
رہ جائے گا دنیا میں ہمارا ابھی فسانہ

ہوتا نہیں اک آن، وہ مجبورِ خجالت
فاتح پہ بھی آتا ہے مصیبت کا زمانہ

ہم شیر ہیں، اور شیر کو گھیرا ہے اجل نے
ممکن نہیں آغوشِ فنا میں اُسے لانا

اس قلعۂ آہن پہ نہ ہوگا کبھی قابض
دشمن کو خبر دو کہ یہ ہوتا ہے روانہ

ریوالور ہی سے ہو سکتی ہے اور وہ بھی اتنے قیمتی ریوالور سے ؟ میری درخواست کو رد نہ کیجئے....
(اپنے بٹوے میں سے نوٹ نکال کر دیتا ہے) گن لیجئے.... ڈھائی سو ہیں.... (حبیب بادل نخواستہ نوٹ لیکر ریوالور دے دیتا ہے)

حبیب - مجھے آپ کا اعتبار ہے...... میں آپ کا شکریہ...... (کھڑا ہو جاتا ہے)

افروز - (میں نے جلدی سے ریوالور جیب میں رکھ لیا ہے) اس کی کیا ضرورت ہے۔

حبیب - (اپنا بکس اٹھاتا ہے) مجھے نہیں علم تھا کہ میں اس قدر بزدل ہوں (دروازے کی طرف چلتا ہے) ضمیر مجھ پر لعنت کر رہا ہے (دروازہ کھولتا ہے) میری قوتِ ارادی.... (چلا جاتا ہے)

افروز - (اکیلا ہے.... اپنی پیشانی پونچھتا ہے) اوف..... کیا منظر تھا...... میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ہونے والا ہے (اپنے کاغذ اکٹھے کر لیتا ہے) کیا واقعی وہ چلا گیا.... (کھڑکی میں سے جھانکتا ہے) ہوں...... وہ جا رہا ہے...... اگر میں نے بر وقت قسمت کا اصول نہ گھڑا ہوتا ...... وہ تو قدرت ہی نے کچھ ساتھ دیا..... تو یہ یہاں فرش پر پڑا ہوتا..... اس کا دماغ پاش پاش ہوتا...... (کانپتا ہے) یہی غنیمت ہے کہ میں ابھی جا رہا ہوں ورنہ کہیں بار بار اگر نہ تا تار (کھڑکی سے واپس آتا ہے) سر درد سے پھٹا جا رہا ہے..... (سوٹ کیس میں ڈھونڈتا ہے) میں نے اسپرین کہاں رکھی ؟ (مل جاتی ہے) یہ رہی تھوڑا سا پانی ہونا چاہئے (غسل خانے میں جاتا ہے)

داؤد - (ایک ہینڈ بیگ لئے داخل ہوتا ہے) اف.... تم تو ابھی یہیں ہو..... میں تو سمجھا تھا کہ تم چلے گئے ہوگے

افروز - ذرا دیر ہو گئی (غسل خانے میں سے ہی)

داؤد - میں تو اپنا سامان بھی لے آیا (ہینڈ بیگ کی طرف اشارہ کر کے) یہ دیکھو باقی نیچے ہے (ہینڈ بیگ رکھ دیتا ہے اور اسپرین کی شیشی پر نظر پڑتی ہے) کیا تم نے اسپرین کھائی ہے ؟

افروز - (غسل خانے سے واپس آتا ہے) یہ دیکھو ! (پانی کے ساتھ گولی نگل جاتا ہے)

داؤد - کیا سر میں درد ہو رہا ہے ؟

افروز - وہ تو غنیمت ہوا کہ بلا سر کے درد پر ہی ٹل گئی (گلاس رکھ دیتا ہے) اجی جناب ابھی ابھی میری ایسے

حادثہ سے غلامی ہوئی ہے کہ عمر بھر یاد رکھوں گا۔

داؤد۔ کب ؟

افروز۔ ابھی جب تم نواب پیارے صاحب کے ہاں گئے ہوئے تھے۔

داؤد۔ تمہارا مطلب نواب زادے صاحب سے ہے ؟

افروز۔ معاف کرنا...... خبر نہیں کیا بک گیا..... ابھی تک میرے ہوش و حواس ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔

داؤد۔ واقعی، تم زرد ہو رہے ہو..... اس کے پاس جاتا ہے، تم تو کانپ رہے ہو!...... تمہارے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے ہیں پیشانی پر پسینہ آ رہا ہے..... یہ آخر تمہارا حال کیا ہے ؟ کیا ہوا ؟

افروز۔ یاد نہ دلاؤ...... بہت ہی رنجیدہ اور غمناک ہے !

داؤد۔ آخر بتاؤ تو!

افروز۔ ابھی میرے پاس ایک مصیبت زدہ آیا تھا...... اپنی تصانیف کی بے قدری سے نا امید ہو چکا تھا نہیں خودکشی کرنے پر تلا ہوا تھا...... میں نے بہت سمجھایا لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہ آتا تھا۔ میں نے چاہا کہ روپے سے اس کی مدد کروں لیکن یہ اس نے منظور نہیں کیا..... وہ تو آخری لمحے ذہن میں ایک مدبیر آ گئی...... میں نے اس کا۔

داؤد۔ ریوالور خرید لیا !

افروز۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا ؟

داؤد۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ محمود یہاں مقیم تھے...... انھوں نے بھی اسی طرح ایک ریوالور خریدا تھا...... انھوں نے بھی ایسی ہی ایک المناک داستان سنائی تھی...... کہ وہ بہت خود دار تھا اور مالی امداد کسی طرح قبول نہ کرتا تھا..... ان کے ذہن میں بھی آخری لمحے یہی تدبیر آئی...... اور انھوں نے بھی اس کا ریوالور خرید کر اس کو خودکشی سے باز رکھا...... اس کا نام..... کیا تھا ؛

افروز۔ حبیب الرحمان حبیب ؟

داؤد۔ ہاں! یہی تھا !

افروز۔ اف (لمبا سانس لیکر) اب ذرا جان میں جان آئی ہے!

داؤد۔ دکھانا وہ ریوالور کہاں ہے؟

افروز۔ یہ لو (ریوالور دیتا ہے)

داؤد۔ (اس کو دیکھتے ہوئے) بالکل ویسا ہی ہے.......اس کی کیا قیمت دی؟

افروز۔ ڈھائی سو روپے

داؤد۔ ہوں! اس کی قیمت تو سو روپے بھی نہیں لیکن ہاں اس تمام ڈھونگ کی جو اس کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے بہت ہے (ریوالور واپس دیتے ہوئے) لیجئے جناب یہ آپ کو ہی مبارک ہو!

افروز۔ تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے؟......ٹھیرو......میں ابھی پولس کو اطلاع کرتا ہوں!

داؤد۔ کس بات کی؟......وہ تم سے خیرات نہیں مانگ رہا تھا......اس نے خود تم سے ریوالور خریدنے کو نہیں کہا......تم ہی نے اسے ریوالور بیچنے پر مجبور کیا......اور قانون اس شخص کے لئے کوئی سزا تجویز نہیں کرتا جو خودکشی کا ارادہ کرکے تبدیل کر دے!

افروز۔ لیکن پھر بھی دیکھنا چاہئے کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔

داؤد۔ لیکن تم اس سے اس قدر ناراض کیوں ہو؟

افروز۔ اگر تم میری جگہ ہوتے.....

داؤد۔ میں تو بہت لطف اندوز ہوتا۔

افروز۔ اچھا۔ واقعی!

داؤد۔ تم اس کے ساتھ زیادتی نہ کرو......یہ کونسا انصاف ہے کہ تم اس کو پولس کے حوالے کرو......ذرا غور کرو......تمہیں کئی بار لوگوں نے دھوکا دیا لیکن تم نے انھیں تو پولس کے حوالے نہیں کیا تم ان کی حرکت پر خاموش ہو گئے......اور اب تم حبیب کو برا بھلا کہہ رہے ہو۔.....اس نے تم سے کچھ زیادہ نہیں لیا......تمہیں تو اس کی قدر کرنی چاہئے......اس نے کیسا انوکھا سین تمثیل کیا......اور کس خوبی سے......مکالمہ اور اداکاری دونوں اتنے مناسب تھے کہ اصل کا دھوکا ہوتا تھا....

اور تمہارے تو فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلا کہ یہ سب ڈھونگ ہے۔ ۔ تمہیں اس کے ذہن کی رسائی کی داد دینی چاہئیے۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے فن کی تعریف کرنی چاہیئے۔ ۔ ۔ ایسی شخصیتیں کب ملتی ہیں میں تو اس کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ۔ ۔

افروز۔ اب تو یہ کہو گے ہی! تمہارا واسطہ نہیں پڑا نا۔ ۔ ۔ اُس نے تمہیں دھوکا نہیں دیا نا!

داؤد۔ وہ اپنے فن کا اُستاد ہے اور اُستاد کی قدر کرنا ہر دلچسپی رکھنے والے کا فرض ہے

افروز۔ اگر وہ مجھے اب کہیں مل جائے۔ ۔ ۔ ۔ (اپنا سوٹ کیس بند کرتا ہے)

داؤد۔ بڑے کینہ ساز ہو۔ ۔ ۔ جا رہے ہو؟

افروز۔ (گھڑی دیکھ کر) بہت دیر ہو گئی۔ ۔ ۔ اچھا پھر کبھی ملاقات ہو گی! (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

داؤد (ریسیور اُٹھاتا ہے) ارشاد! (افروز جانے والا ہے) احمد داؤد ۔ ۔ ۔ آپ کی تعریف ۔ ۔ ۔ حبیب الرحمان حبیب!

افروز (اپنا سوٹ کیس رکھتے ہوئے) بڑا بے حیا ہے! ۔ ۔ ۔ اسے یہاں آتے شرم نہ آئی۔

داؤد (ریسیور کو اپنے ہاتھ سے ڈھانکتے ہوئے) اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ۔ ۔ وہ سمجھا کہ تم چلے گئے ہو۔ کیونکہ تمہارا نام ہوسٹل کی فہرست میں نہیں ہے اور میرا نام تمہارے نام کی جگہ درج ہو چکا ہے ۔ ۔ ۔ اُسے پتہ چلا ہوگا کہ مجھے نواب زادے صاحب نے بلایا ہے۔ ۔ ۔ وہ تمہارے پاس سے نواب زادے صاحب کے پاس گیا ہوگا ۔ ۔ ۔ اُنھوں نے اُسے یہاں کا پتہ دیا اور یہ دیکھئے وہ یہاں موجود ہے ۔ ۔ ۔ کس قدر مستعد جوان ہے ۔ ۔ ۔ (یہ دیکھتے ہوئے کہ افروز جا رہا ہے) تم کہاں جا رہے ہو؟

افروز۔ اسے اس کھیل کا مزہ چکھانے

داؤد۔ اس جیسے ماہر فن کو! اس کی یہ قدر! ۔ ۔ ۔ یہ تو آرٹ کا خون ہے (ٹیلیفون پر بولتے ہوئے) برائے مہربانی حبیب الرحمان صاحب کو یہاں بھیج دیجئے

افروز۔ آخر تمہارا ارادہ کیا ہے؟

داؤد جلدی سے اپنا سامان اٹھاؤ (اس کا اور کوٹ اور ہیٹ خود اٹھاتا ہے) اور غسل خانے میں چلے جاؤ...... دروازہ قدرے کھلا چھوڑ دینا اور پھر سننا کہ کیا ہوتا ہے!

افروز۔ لیکن مجھے جانا ہے

داؤد۔ ایسی کیا جلدی ہے...... دیر تو ہو ہی چکی ہے...... تھوڑی اور سہی...... جلدی جاؤ اس کے قدموں کی آواز آرہی ہے (جلدی سے افروز اور اس کی چیزوں کو غسل خانے میں بھر دیتا ہے...... دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ داؤد جلدی سے لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتا ہے اور کچھ لکھنے لگتا ہے) اندر تشریف لے آئیے...... (حبیب داخل ہوتا ہے) ارشاد! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں!

حبیب۔ میں نے آپ کو اس وجہ سے تکلیف دی کہ مجھے اتفاق سے معلوم ہو گیا کہ آپ یہاں ہیں...... مجھے آپ سے غائبانہ تعارف تو تھا ہی...... مجھے علم ہے کہ آپ کس قدر نرم دل ہیں (پُر درد آواز میں)...... مایوسی انتہا کو پہنچ چکی ہے!...... میں تکلف سے دست بردار ہو چکا ہوں...... مصیبت سب کچھ کرا دیتی ہے...... میں اخلاق و آداب کی بندشوں سے دست بردار ہو چکا ہوں...... میری روئداد ناکامی...... (رکتا ہے)

داؤد۔ آپ تشریف رکھیے

حبیب۔ شکریہ!...... میری روئداد یہ ہے...... میں لکھنو کے ایک معزز خاندان کا فرد ہوں...... لیکن فلک کینہ ساز کسی کو ایک حالت میں نہیں دیکھ سکتا...... سب ہی کو یکے بعد دیگرے اپنی گردش میں پیس ڈالتا ہے...... میرے خاندان کے بھی بُرے دن آگئے...... میرے والدین نے...... (ذرا توقف کرتا ہے اس خیال سے کہ مداخلت کی جائیگی)

داؤد۔ فرمائیے...... میں ہمہ تن گوش ہوں!

حبیب۔ میری اوائل عمری ہی سے میرے والد نے مجھے فوج میں بھیجنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا..... لیکن مجھ
فوج کی نوکری سے سخت نفرت ہے..... میں ایک صلح پسند آدمی..... آشتی میرا ایمان ہے۔
داؤد۔ میرا بھی یہی ایمان ہے۔
حبیب۔ میں شہرت چاہتا تھا..... میری یہی آرزو رہی کہ میں ادب کی خدمت کر کے اپنا نام روشن کروں....
مجھے کامل یقین تھا کہ حبیب میرا غالب سے پیچھے نہیں رہ سکتا..... لیکن یہ سب توہمات تھے..
ایک سراب تھا جو میرے پیش نظر تھا..... ایک خواب تھا جو فضا میں منتشر ہو گیا..... میرے والد کی
رگوں میں فوجی خون ہے..... وہ ادب کو لغویات سے تعبیر کرتے ہیں..... شاعری تو ان کے
لئے تضیع اوقات ہے..... اساتذہ سے انھیں سخت نفرت ہے تشبیہ و استعارہ سے ان کا دم
الجھتا ہے..... میں نے ہمیشہ انھیں صاف بات کہتے سنا اور وہ بھی نہایت کرخت لہجے میں....
ان کے سامنے کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ان کی مخالفت کرے۔
داؤد۔ بڑے دلچسپ آدمی تھے۔
حبیب۔ جب میں نے فوج میں جانے سے انکار کیا تو ان کے غیض و غضب کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ انھوں
نے مجھے عاق کر دیا۔
داؤد۔ آپ تو بڑے خوش ہوئے ہوں گے کہ آپ کی خلاصی ہوئی۔
حبیب۔ جی ہاں..... اور قسم کھائی کہ دوبارہ کبھی میری شکل نہیں دیکھیں گے وہ اپنی بات کے پکے ہیں جو بات
ایک دفعہ منہ سے نکل جائے پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔
داؤد۔ آپ کو اور کیا چاہیئے؟..... اندھا کیا چاہئے دو آنکھیں
حبیب۔ (جواب سے بچنا چاہتا ہے) میں بڑی امیدوں سے ساتھ گھر سے نکلا..... دو سال تک زمانے کے ساتھ
جدوجہد کرتا رہا..... ہزارہا کوششیں کیں کہ کہیں سر کھانے کی جگہ مل جائے لیکن جدھر ہاتھ پیر مارے
ناکامی سے دوچار ہونا پڑا.......
داؤد۔ اب آپ زیادہ تکلیف نہ کریئے..... میں جانتا ہوں آپ کیا کہنے والے ہیں..... آپ مصیبت میں

ہیں.... آپ کے پاس کھانے کو نہیں

داؤد۔ کل دوپہر سے اب تک ایک روٹی بھی کھانے کو نہیں ملی (یہ دیکھ کر کہ داؤد نے اپنے بٹوے میں سے ایک نوٹ نکالا ہے) قبلہ آپ کیا کیا چاہتے ہیں؟

داؤد۔ آپ کو چونکہ کل سے روٹی......

حبیب (طنزیہ ہنسی ہنس کر) دس روپے؟...... مجھے؟ حبیب الرحمان حبیب کو؟

داؤد۔ نہیں...... پانچ روپے

حبیب۔ آپ مجھے پانچ روپے دینا چاہتے ہیں.... جیسے کہ میں بھکاری ہوں.... خیرات مانگنے آیا ہوں...... جی ہاں اسی کا نام تہذیب ہے؟..... اسی کا نام شرافت ہے؟ اسی طرح ایک ادیب کے ساتھ پیش آیا جاتا ہے؟ اس کی مصیبتیں سن کر اس کو بھیک دی جاتی ہے؟... نہیں.... نہیں..... اب تحقیر کی اور گنجائش نہیں رہی..... رسوائی کی بھی حد ہوتی ہے..... (اپنے بکس میں سے ریوالور نکال لیتا ہے)

داؤد۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

حبیب۔ میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں! اسی لمحے!

داؤد۔ کیا آپ نے واقعی کو سچ کا ارادہ کر لیا؟

حبیب جی ہاں...... اب اس میں تبدیلی ناممکن ہے۔

داؤد۔ اگر آپ نے ارادہ کر ہی لیا ہے تو شوق سے خودکشی کیجئے..... میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ کے لئے یہی راہ سب سے اچھی ہو گی...... آپ ضرور خودکشی کیجئے۔

حبیب۔ آپ میرے لئے خودکشی ہی بہتر سمجھتے ہیں؟

داؤد۔ جی ہاں..... میں تو آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں...... آپ کا استقلال قابل تعریف ہے.... آدمی کو آپ ہی جیسا ہونا چاہیئے..... آپ میں خودداری ہے...... قوت ارادی ہے...... اس پر سونے پر سہاگا...... قوت عمل ہے..... آپ کسی طرح کی مدد گوارا نہیں کریں گے.... میں اگر آپ کو سو روپے پانچ سو روپے یا اس سے بھی بڑی رقم دوں تو کیا آپ اپنے ارادے سے باز آجائیں گے

نہیں، ہرگز نہیں ..... ادب ..... ادب کی خدمت ..... اس میں شہرت ..... اگر آپ کو شہرت بھی مل جائے تو بھی ممکن ہے کہ آپ اپنے مقصد پر نہ پہنچیں ..... آپ مجھے ہی دیکھئے، آپ یہی سمجھے ہوئے ہیں نا کہ میں چونکہ ایک کامیاب ادیب ہوں اس لئے خوش بھی ہوں ..... اگر واقعی آپ کا یہ خیال ہے تو آپ بڑی زبردست غلط فہمی میں ہیں ... حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی مصیبتوں کا گنجینہ ہے ..... ذرا ان تکلیفوں کا تصور کیجئے جو مجھے ہر روز برداشت کرنی پڑتی ہیں ..... ہر روز اخبار کا ایک کالم لکھنا پڑتا ہے ..... ہر رات یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا ..... کل کیا لکھوں گا؟ ..... رات بھر اسی کاوش میں گذرتی ہے ..... کبھی سکون کی نیند میسر نہیں ہوتی ..... اور یہی نہیں ..... ہر سال ایک ناول لکھتا ہوں ..... اس کی الجھنیں اور ہی طرح کی ہوتی ہیں ..... اول تو یہ دغدغہ رہتا ہے کہ پبلشر اسے شائع بھی کریں گے یا نہیں ..... اور اگر شائع بھی ہوگیا تو آیا یہ مقبول بھی ہوگا یا نہیں اور پھر آئندہ سال کے ناول کا بخار چڑھتا ہے ..... ایک چکر ہے جس سے خلاصی نہیں ہوتی ..... مبصر الگ طرح طرح کے چرکے لگاتے ہیں ..... اگر تم نے ادب میں شہرت حاصل کر بھی لی ..... تو یہ ہے زندگی جو تمہیں بسر کرنی پڑے گی ..... دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں ..... شہرت سے جو بھی تمہیں توقعات ہیں تھوڑے عرصے کے بعد ہی ٹوٹتے نظر آئیں گے ..... وقت ہر لطف کو کوفت میں تبدیل کر دیتا ہے ..... اور اگر ایک بار اس میں داخل ہوگئے تو پھر واپس لوٹ آنا ناممکن ہو جاتا ہے تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہیں اس سے دوچار ہونا نہیں پڑا ..... میں تو اس زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ میں تمہارا بہت ممنون ہوں کہ تم مجھے اس سے خلاصی دلا دو گے۔

حبیب (پریشان) میرے ممنون!؟

داؤد - (سر سے اشارہ کرکے ہوئے) جی ہاں! ..... میں بہت دنوں سے خودکشی کرنے کی سوچ رہا تھا ..... لیکن ہمت نہ ہوتی تھی ..... آپ نے ہمت بندھائی ..... اب میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرنے کا مجھے اپنا راستہ صاف نظر آرہا ہے ..... زندگی کی معراج موت ہے ..... موت ہی ابدی زندگی ہے۔ اب بسم اللہ کیجئے ..... جلدی سے ..... آپ کے پیچھے پیچھے میں بھی عدم آباد میں آتا ہوں۔ (حبیب بہت

گھبرایا ہوا ہے ایک رنگ آرہا ہے ایک جارہا ہے...... پریشان ہے..... پیچھے ہٹتا ہے، پیچھے نہ ہٹئے۔ جہاں ہیں وہیں کھڑے رہئے..... یہاں آپ قالین پر گریں گے۔

حبیب۔ لیکن.......

داؤد۔ آپ میری کرسی لے لیجئے.... کرسی پر بیٹھ کر خودکشی کیجئے.... یہاں زیادہ آرام سے کام انجام دیا جاسکے گا..... آپ کنپٹی پر گولی چلائیں گے۔؟

حبیب۔ اوں..... یوں..... ہوں۔

داؤد۔ اگر آپ دل پر گولی چلائیں گے تو نشانہ خطا ہونے کا بہت کم امکان ہے!...کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟

حبیب۔ آپ کا مطلب؟

داؤد۔ نہیں..... میں دخل نہیں دینا چاہتا.... آپ اپنی مرضی کے مختار ہیں..... آپ دل یا دماغ جس کا چاہیں نشانہ بنائیں..... ہاہا..... وہ نظارہ کس قدر ہمت افزا ہوگا جب آپ کا دماغ پاش پاش ہوا پڑا ہوگا..... یا آپ کے دل سے خون کا فوارہ جاری ہوگا..... اور یہ سب ایک انگلی کے اشارہ کا کرشمہ ہوگا..... گھوڑا دبنے کی ذرا سی آواز پر چشم زدن میں کل نقشہ بدل جائے گا..... دفعتاً آپ تمام تکلیفوں سے مبرا ہو جائیں گے..... کوئی کاوش آپ کو نہیں پہنچ سکے گی..... آپ ابدی سکون سے ہمکنار ہوں گے..... بیان نہیں کرسکتا کہ میں اس سماں میں کس خوشی سے آپ کے عمل کی تقلید کروں گا..... مجھے بھی نجات مل جائے گی..... ہم کس اچھی طرح سے اپنے رقیبوں سے بدلہ لیں گے..... ہم دنیا کو ٹھوکر مار کر اس کی شہرت سے بے نیاز ہو جائیں گے..... ہماری لاشیں یہاں پڑی ہوں گی..... دنیا دیکھے گی کہ ہمارے چہروں پر نفرت کی ہنسی ہوگی..... ہا..... نجات کا تصور بھی کس قدر پرلطف ہے۔ جلدی کیجئے۔ آپ کی ہمت کی میں داد دیتا ہوں..... کس قدر استقلال ہے..... بس اب بسم اللہ کیجئے..... گولی چلائیے۔

حبیب۔ لیکن مجھے اپنی زندگی کو ختم کردینے کا مجاز ہے.....

داؤد۔ جی ہاں..... آپ ہی کے پاس اس کے کل حقوق محفوظ ہیں۔

حبیب۔ لیکن میں اپنے ساتھ آپ کو نہیں گھسیٹ سکتا ...... یہ خون ہوگا

داؤد۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کا استقلال جواب نہ دے جائے..... آپ کہیں آخری وقت ہمت نہ
ہار دیں..... ریوالور مجھے چلانے دیجئے ... میں نشانہ ٹھیک لگاؤں گا..... میں پہلے آپ کا خاتمہ
کروں گا...... اور پھر۔

حبیب۔ لیکن معاف کیجئے ......

داؤد۔ آپ اپنے ارادے سے ہٹ رہے ہیں؟

حبیب۔ نہیں۔

داؤد۔ واقعی؟

حبیب۔ لیکن آپ کا خون میرے سر ہوگا... خودکشی ہی بڑا گناہ ہے... میں آپ کا خون اپنے سر نہیں لے سکتا۔

داؤد۔ آپ تو تکلف کر رہے ہیں..... آپ نے تو کہا تھا کہ "میں تکلف سے دست بردار ہو چکا ہوں....
ارادے میں تبدیلی ناممکن ہے"

حبیب۔ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا..... میں آپ کے خون کا باعث نہیں ہونا چاہتا۔

داؤد۔ اچھا (ٹھنڈا سانس لے کر) مجھے تو آپ کی خاطرداری منظور ہے... آپ اجازت نہیں دیتے تو خیر
میں زندگی کی مصیبتیں ہی جھیلوں گا لیکن آپ کے پاک ارادے..... آپ کی نجات، آپکی
خوشیوں میں سدِ راہ نہیں ہوں گا۔

حبیب۔ آپ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ خودکشی نہیں کریں گے۔

داؤد۔ میں قسم کھاتا ہوں...... مجھے آپ پر رشک آتا ہے..... آپ کس قدر خوش قسمت ہیں ..... خدا حافظ
(بیٹھ جاتا ہے اور گردن جھکا لیتا ہے..... پھر گردن اٹھاتا ہے) کیا؛ آپ ابھی زندہ ہیں؟

حبیب (ریوالور کی طرف اشارہ کرکے) اس کی وجہ۔

داؤد۔ وقت ضائع نہ کیجئے..... جس قدر جلد ہو سکے سکونِ ابدی کے پہلو میں پہنچ جائیے..... گولی چلائیے!

حبیب۔ (امید کی جھلک چہرے پر آتی ہے) میرا ریوالور کام نہیں کرتا۔

داؤد۔ یہ تو بڑی خرابی کی بات ہے!

حبیب۔ اب کیا کروں؟

داؤد۔ آپ گھبرائیے نہیں! (اپنی جیب میں سے ریوالور نکال کر) آپ میرا ریوالور استعمال کر سکتے ہیں۔

افروز۔ (غسل خانے کا دروازہ کھول کر اس میں سے اپنا ہاتھ نکالتا ہے جس میں نو خرید ریوالور ہے) یہ ریوالور بھی آپ کی خدمت کر سکتا ہے (اپنا سر نکالتا ہے)

حبیب (پہچانتے ہوئے) مختار افروز صاحب

داؤد۔ یہ دیکھئے ریوالور تو دو دو ہیں آپ جو چاہیں استعمال کریں۔

حبیب۔ (بڑی مایوسی کے ساتھ) پردہ فاش ہو گیا..... اب پروپرائٹر کیا کہے گا؟

داؤد۔ کون پروپرائٹر؟

حبیب۔ دکان کے پروپرائٹر جن کا میں نوکر ہوں۔

افروز۔ میں سمجھ گیا..... وہ تم کو یہاں بھیجتے ہیں..... تم خودکشی کا دھوکہ دے کر ریوالو بیچتے ہو!۔

حبیب۔ جی ہاں..... افروز صاحب

افروز۔ تمہارا پروپرائٹر بہت ہوشیار آدمی معلوم ہوتا ہے۔

حبیب۔ لیکن اسے تو اس کا علم بھی نہیں..... یہ ترکیب تو میں نے نکالی ہے۔

افروز۔ تمہاری ہے؟..... تو اور بھی قابل تعریف ہے۔

داؤد۔ (قہقہہ لگا کر) یہ ریوالور بیچنے کا بڑا نرالا طریقہ ہے..... ہوں.... تو آپ خردہ فروش ہیں؟

حبیب۔ جی نہیں..... میرا اصلی پیشہ اداکاری ہے۔

داؤد۔ آپ ایکٹر ہیں.... ایکٹر.... تھیٹر کے؟

حبیب۔ جی ہاں... بچپن سے یہی کام کیا ہے..... اب تھیٹروں کے تماشے کون دیکھتا ہے...... نوکری کہیں ملتی نہ تھی..... پیٹ بھرنے کے لئے میں نے یہ ترکیب نکالی.... تین چار ریوالور دن میں بیچ لیتا ہوں اور اس طرح بڑی اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔

افروز۔ اب تو آپ کو کوئی دوسرا کام ڈھونڈنا پڑے گا۔

داؤد۔ آپ تھیٹر میں دوبارہ کیوں نہ نوکر ہو جائیں۔

حبیب۔ کس تھیٹر میں؟

داؤد۔ کسی میں بھی!...... افروز صاحب آپ کا تعارف کرا دیں گے۔ تو آپ کو........

افروز۔ میں کبھی بھی تعارف نہیں کرانے کا۔!

داؤد۔ ہیں ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا..... بندۂ خدا قسمت نے خود آن کر تمہارے دروازے پر دستک دی ہے اور تم چاہتے کہ دروازہ نہ کھولو...... تم ایکٹر کی تلاش میں تھے..... ایکٹر خود تمہارے پاس آ گیا...... اس میں شخصیت ہے...... کس قدر سنجیدگی سے پارٹ کرتا ہے..... درد کا کس اچھی طرح اظہار کرتا ہے..... یہ تمہارے ڈرامے کو چار چاند لگا دے گا.....

افروز۔ پس و پیش کے بعد) دیکھو! میں پارٹ پڑھوا کر دیکھوں گا..... میں وعدہ نہیں کرتا۔

حبیب۔ (بہت خوش ہے) افروز صاحب...... میں آپ کے احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا..... میں آپ کی خوشنودی کے لئے کوئی چیز نہیں اٹھا رکھوں گا..... میں اپنی جان لگا دوں گا..... اگر آپ کو میرا پارٹ پسند نہ آئے

داؤد۔ تو تم خودکشی کر لو گے!

حبیب۔ (خلوص کے ساتھ) اگر......

داؤد۔ (ہنس کر) ابھی آپ کے دماغ سے خودکشی نہیں اتری۔

افروز۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

پردہ

سید ناصر الدین صاحب شمسی

امواجِ تغزّل

(از حضرت فراق گورکھپوری)

چشمک ساغر میں یہ شوخی کہاں — آنکھیں تری پگھلی ہوئی بجلیاں!
کر نہ چکا عشق بھی شرح و بیاں — رہ نہ گئی بات جہاں کی تہاں
بعدِ ستم اُف یہ پشیمانیاں — ہے وہی تیری روشِ امتحاں
لالہ و گل انجم و مہتاب و مہر — سب ہیں ترے حسن کی پرچھائیاں
عالمِ اسباب سے تقدیر دیکھ — مجھ کو ملیں بے سر و سامانیاں
حسن کو کچھ نیند سی آئی ہوئی — خواب سے ملتی ہوئی بیداریاں
چل گئی کیا جانیے کیسی ہوا — آج بجھے دل سے بھی اٹھا دھواں
مست جوانی کی ادا بن گئیں — ابر میں لہرائی ہوئی بجلیاں
بہرِ طلب سیکھ لے کچھ جہل بھی — کام نہ آئیں گی ہمہ دانیاں
جتنے بگڑتے گئے بنتے گئے — پوچھ نہ کچھ عشق کے سود و زیاں
اب وہ کہاں بے خودیٔ حسن بھی! — اب وہ محبت کا بھی عالم کہاں
جو بھی ہو، تو ہو کہ ترا حُسن ہو — کوئی مگر آ ہی گیا درمیاں
تیرگیٔ محفلِ مے پر نہ جا — کر دیں چراغاں نہ سیہ کاریاں
کچھ وہ سناتے ہوئے چپ ہو گیا — اور سے اب اور ہوئی داستاں
اس کے قریب خود کو نہ محسوس کر — دور پہنچ جائیں گی رسوائیاں
دکھتے دلوں سے یہ ہوئے انقلاب — چوٹ کہاں تھی اُبھر آئی کہاں
آج کچھ آہٹ تو دلوں کو ملی — مدتوں ویران رہیں بستیاں

پا نہ سکی بھید یہ مست آنکھ بھی | یاد رہیں گی تری ہشیاریاں
حسن کے کچھ اور ہی خواب و خیال | عشق کے کچھ اور ہی وہم گماں
چارۂ غم کی بھی تمنا نہیں | پوچھ نہ کچھ عشق کی لاچاریاں
کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر | بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں
کیا وجود اور کہاں کا عدم | کوئی نہیں میرے ترے درمیاں
پار ہوا پار ہوا بحرِ غم | ڈوب چلیں ڈوب چلیں کشتیاں
گردشِ پیہم میں نگاہوں کی دیکھ | گھٹتی ہوئی بڑھتی ہوئی مستیاں
دام تو اٹھّے دلِ ناکارہ کے | بک تو گیا پوچھ نہ ارزاں گراں
اپنی جگہ عشق اجڑتا رہا | اپنی جگہ بستی رہیں بستیاں
شوخیوں کا رنگ لئے شرمِ یار | شرم کے آثار لئے شوخیاں
حسن میں اور عشق میں اب میل ہے | ختم ہوئیں معرکہ آرائیاں
سمع نوازی ہے کہ آتش زنی | باتیں تری ہیں کہ ہیں بجلیاں
آج تو خاموش نہیں عشق بھی | آج تو ہے اس کے بھی منھ میں زباں
کچھ ہے شکیبا دلِ بے تاب بھی | کچھ نگہِ شوخ بھی ہے مہرباں
اب تو جہاں بھر سے وہ مانوس ہو | اب وہ نہیں عشق کی بیزاریاں
آ ہی گئیں تجھ میں سمٹ کر تمام | عالمِ ایجاد کی رعنائیاں
کہہ گئیں کیا کیا دلِ پر شوق سے | شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائیاں
آ نہ گئی آ نہ گئی تیری یاد | چھا نہ گئیں چھا نہ گئیں بدلیاں
واسطۂ دار و رسن عشق کو | اور نہ کر اور نہ کر بدگماں

جیسے سیہ خانۂ غم میں فراقؔ
کوندتی ہوں چاروں طرف بجلیاں

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

پیام کیف:۔ از مرزا احسان احمد صاحب احسانؔ بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل۔ اعظم گڈھ۔ قیمت عمر

یہ احسانؔ صاحب کی غزلوں اور چند نظموں کا مجموعہ ہے۔ احسانؔ صاحب اپنی نثر کی وجہ سے کافی معروف ہیں۔ اکثر رسائل میں آپ کے علمی مضامین نکلتے رہے۔ لیکن یہ شاید زیادہ لوگوں کو نہ معلوم ہو کہ آپ شاعر بھی ہیں اور پرانے شاعر ہیں۔ چونکہ مزاج میں انکساری اور کسر نفسی بہت ہے اس لئے آپ کا کلام اب تک اس سے پیشتر شائع نہ ہو سکا۔

شروع میں خود ہی دیباچہ لکھا ہے اور اپنی کمزوریوں کی طرف خود ہی اشارہ کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں "فلسفہ اور تصوف سے میں بالکل ناآشنا ہوں ایک معمولی لکھا پڑھا دنیا کا انسان ہوں اس لئے میری ہرزہ سرائیوں میں کلیا نہ اسرار و معارف اور دقیق نکات کی جستجو فضول ہے ایک معمولی قوت تخئیل رکھنے والا شاعر ہوں۔ نظم کی قوت بھی کچھ بہت زیادہ نہیں ہے تاہم طرز ادا کی برجستگی اور صفائی کا حتی الوسع لحاظ رکھتا ہوں۔ دقت آفرینی اور مشکل گوئی کی میرے دماغ میں بہت کم صلاحیت ہے۔ البتہ میرے کلام سے ناظرین کسی حد تک دل کی تپش اور احساس کی گرمی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔" مرزا صاحب نے یہ اپنا اندازہ بہت صحیح لگایا ہے۔

جہاں تک کلام کا تعلق ہے صفائی اور پختگی بہت زیادہ ہے۔ مضامین پاک، منزہ اور بے لوث ہیں رکاکت یا سخافت آپ کے کلام میں کہیں نہ ملے گی۔ تغزل جو فی زمانہ عریانیت کی طرف مائل ہے آپ کے یہاں اصغرؔ کے رنگ میں بہت پاک اور سنجیدہ نظر آئے گا۔ جنوں باوجود پیام، کے کچھ پابند بیاباں ہی رہا ہے یعنی خلش دل کے باوجود آپ صفائی کلام کی طرف زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ بہ نسبت گرمیٔ کلام کے۔ اور غالباً یہ بہت زیادہ ضبط دل کا نتیجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ دل کی تپش اور

احساس کی گرمی صرف کسی حد تک آشکارا ہو سکی ہے۔ پھر بھی حسن بندش اور صفائی کلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ ایک نادر تحفہ ہے۔ ایک غزل ملاحظہ ہو۔

کچھ ایسے محو لذت درد نہاں رہے ——— دنیا سے بے نیاز رہے ہم جہاں رہے

یوں ہو نثار راہ محبت تو لطف ہے ——— دل میں بھرا ہو درد مگر چپ زباں رہے

پامالیٔ چمن ہو نگاہوں کے سامنے ——— اور اس پہ حکم یہ ہے کہ ضبط فغاں رہے

ذوق ستم سے ہو نہ سکا بے نیاز میں ——— ہر چند میرے حال پہ وہ مہرباں رہے

لٹتا رہا قفس کے قریب اپنا آشیاں ——— ہم سے کہ پھر بھی مائل خواب گراں رہے

اے چشم شوق آج ہو یوں عرض مدعا
ہر جنبش نگاہ میں اک داستاں رہے

کتاب کی کتابت و طباعت بہت خوب ہے مصنف سے مل سکتی ہے۔

رہنمائے تاریخ اردو:۔ مؤلفہ حاجی محمد عبدالقادر صاحب ریٹائرڈ وکیل بنارس قیمت ۱۲ ار

نام سے اردو زبان کی تاریخ معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل یہ فن تاریخ گوئی سے متعلق ہے۔ مؤلف نے بہت محنت سے تاریخ گوئی کے تمام قواعد اور تمام مشہور شاعروں کی تاریخیں اور ان کی وفات کی تاریخیں مجتمع کر دی ہیں۔ اردو میں یہ مجموعہ اپنی نوعیت کا پہلا ہے تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب بہت مفید اور پر از معلومات ثابت ہو گی۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے اور مؤلف سے مل سکتی ہے۔

زندگانی محمد:۔ از محمد حسین ہیکل تقطیع چھوٹی ضخامت ایک سو اٹھائیس صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۱۰ار۔ ملنے کا پتہ دفتر امت مسلمہ امرتسر۔

محمد حسین ہیکل مصر کے مشہور عالم اور وہاں کے روزنامہ اخبار السیاستہ کے ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے آنحضرت کی سیرۃ پر ایک کتاب لکھی تھی۔ موجودہ کتاب اس کا مقدمہ ہے جو عربی سے فارسی میں منتقل ہوا۔ اور اب عرشی صاحب امرتسری نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل کیا ہے اس

مقدمے میں ان تمام اعتراضات کے جواب ہیں جو مستشرقین اسلام پر وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ جوابات تمام تر عقلی اور تاریخی دلائل پر مبنی ہیں آخر میں خود عرشی صاحب کا ضمیمہ ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن پاک کی ترتیب الٰہی ترتیب ہے۔ ترجمہ صاف و سلیس ہے تعلیم یافتہ طبقے کے لئے اس کا مطالعہ از بس مفید ہے۔

رسالہ جات:۔

ساقی (دہلی) افسانہ نمبر صفحات ۲۰۰۔ ملنے کا پتہ دفتر ساقی کھاری باولی۔ قیمت عہ ر

ساقی نے حسب معمول اپنا افسانہ نمبر اس سال بھی نکالا ہے اور اردو کے بہت سے افسانہ نگاروں کے افسانے حاصل کئے ہیں۔ افسانے تقریباً تمام دلچسپ اور دل خوش کن ہیں کرشن چندر، عظیم بیگ چغتائی صادق الخیری، راجندر سنگھ بیدی۔ اپندر ناتھ اشک کے افسانے خصوصیت سے دلچسپ ہیں۔ سید رفیق حسین صاحب کا افسانہ شیریں فرہاد اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔

ندیم (گیا) بہار نمبر صفحات ۲۵۴۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ندیم گیا (بہار) قیمت عالر

شاید ہی کسی رسالے کا اتنا ضخیم اور اتنے کثیر مضامین پر مشتمل کوئی نمبر نکلا ہو۔ نثر و نظموں کی تعداد سو سے اوپر ہے اور تقریباً ۴۵ بلاک کی تصویریں ہیں۔ مضامین نگار حضرات میں تقریباً سب بہار ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور مضامین بھی زیادہ تر بہار ہی سے متعلق ہیں۔ مقالات اعلیٰ اور بلند پایہ کے ہیں مضامین و منظومات کی ترتیب بہت مناسب ہے اشتہارات میں بھی سنجیدگی کو دخل دینا چاہئے تھا۔ ذیل کے مضامین خاص کر بہت اہم ہیں

۱۔ مولانا شبلی اردو شاعر کے لباس میں	از علامہ سید سلیمان ندوی۔
۲۔ فاتح بہار و بنگالہ محمد بن بختیار خلجی	از ابو النظفر ندوی
۳۔ عمدۃ الملک نواب داؤد خاں قریشی	از سید رضا قاسم۔
۴ مہاراجہ کلیان سنگھ	از سید حسن عسکری
۵۔ فردوسی و دقیقی	از پروفیسر طاہر رضوی
۶ غالب کی خودداری	سید علی حیدر

تاریخ کی رفتار

۱۔ رومی سلطنت کے بھی کیا عروج کے دن تھے
ادھر جاتے فتح وظفر ان کے جلو میں ہوتی —— لیکن یہ
پوری سلطنت شروع صدی عیسوی میں وحشی قوموں خصوصاً
اٹیلا ہنس کے حملوں سے تباہ و برباد ہو گئی۔

۲۔ روم کے زوال پر یورپ کی شیرازہ بندی بکھر گئی
اور مسلمان فاتحین کی تکبیریں اسپین و فرانس میں گونجنے
لگیں —— لیکن ۷۳۲ء میں پوائٹرس پر ان کی قسمت
نے پلٹا کھایا اور وہ یورپ کو کھو بیٹھے۔

۳۔ فرانسیسی بادشاہ چارلیمین نے گذشتہ رومی سلطنت
کو پھر زندہ کرنا چاہا۔ مشرق میں پولینڈ کو فتح کیا جنوب میں
روم تک سب کو کاٹ ڈالا —— لیکن اس کے مرنے
پر اس کے مقبوضات دوسروں کے ہاتھ میں پہنچ گئے۔

۴۔ انگریزوں نے بھی پلانٹجنٹ بادشاہوں کے عہد
حکومت میں فرانس کو ہڑپ کر لینا چاہا —— لیکن جان آف
آرک نے ۱۴۲۹ء میں آرلینس پر ان کے حوصلے پست
کر دئے اور انگریزوں کو اپنے جزیرے پر واپس جانا پڑا۔

۵۔ پندرھویں صدی عیسوی میں فاتح جانباز ترک
یورپ میں بڑھتے چلے گئے۔ تمام بلقان ان کے
قبضہ میں آگیا —— لیکن وائنا سے آگے نہ بڑھ
سکے۔

۶۔ اسپین کے ہیپسبرگ خاندان نے شادیوں کے ذریعہ اپنی سلطنت بہت وسیع کر لی...... لیکن آرماڈا کی شکست نے ان کے تمام حوصلے پست کر دیئے

۷۔ اٹھارہویں صدی میں روس کے پیٹر اعظم نے بحیرۂ بالٹک کی تمام ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ سوئیڈن والوں کو بھی پولٹاوا پر شکست دی..... لیکن یہ سلطنت کچھ ہی دنوں قایم رہی

۸۔ ۱۷۹۹ء اور ۱۸۱۰ء کے درمیان نپولین نے اٹلی جرمنی۔ اسپین بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک اور پولینڈ لے لیا ...... لیکن واٹرلو نے اس ڈرامہ پر جلد پردہ گرا دیا۔

۹۔ ۱۹۱۴ء میں قیصر جرمنی نے جرمن سامراج کو بڑھانا چاہا...... لیکن مغربی مورچہ پر جرمنی کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔
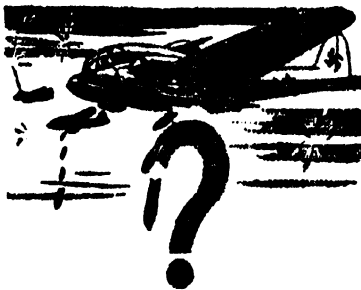
۱۰۔ اب ہٹلر تمام یورپ پر چھا جانے کی فکر میں ہے لیکن..........

اپنی اصلاح

مسلمان اور انجمن اتحادِ باہمی

جس طرح آج ہندوستان میں چاروں طرف غربت ہی غربت نظر آتی ہے۔ ایک سو سال پہلے یورپ میں بھی اسی طرح غربت نظر آتی تھی کسان اور مزدور مفلسی کے مارے پریشان تھے۔ سرمایہ داروں اور مہاجنوں کے ہمیشہ مقروض رہتے تھے غریب کسانوں کی مدد کرنے کے لئے انیسویں صدی کے وسط میں جرمنی کے ایک شخص رے فیسن نے ایک نئے طریقہ کی بنیاد ڈالی جس کا نام کوآپریشن (یعنی انجمن اتحاد) رکھا۔ شروع شروع میں تو یہ طریقہ ایک بہت محدود دائرہ میں رہا۔ دس بیس کسان مل کر ایک انجمن امداد باہمی بنا لیتے اس میں اپنا پس انداز کیا ہوا روپیہ جمع کر دیتے اور اس میں سے حاجتمند ممبر کو کچھ روپیہ کم شرح سود پر قرض دیدیتے۔ اس طرح سے ہر ممبر اپنی مالی ضروریات پوری کر لیا کرتا تھا۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوا کہ مہاجن کے پنجوں سے نجات ملی بلکہ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ تمام ممبر اپنی مجموعی ضمانت پر کسی بنک یا مہاجن سے کم سود پر روپیہ قرض لیکر اپنی ضرورتیں پوری کر لیا کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ امداد باہمی کی انجمنیں اقتصادیات کے دیگر شعبوں میں بھی رائج کی جانے لگیں۔ مثلاً بیس بیس کسان مل کر ایک انجمن بناتے جس کا کام عمدہ بیج یا زراعت کا دیگر سامان مہیا کرنا ہوتا تھا۔ بعض انجمنیں اس غرض سے بنائی گئیں کہ وہ پیداوار کو فروخت کریں۔ گاؤں میں سے بڑھ کر یہ طریقہ شہروں اور دیگر ملکوں میں بھی رائج ہونے لگا۔ آج شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں یہ طریقہ رائج نہ ہو اور اسے فروغ نہ دیا جا رہا ہو۔ اکثر اقتصادیات کے ماہرین کا تو یہ خیال ہے کہ اس طریقہ کو سرمایہ داری اقتصادی نظام کا بہترین بدل قرار دیا جائے۔ دنیا میں سے آہستہ آہستہ سرمایہ داری نظام کو ختم کر کے کوآپریشن کے طریقہ کو رائج کیا جائے۔ امریکہ میں اس کی بہت کچھ کوشش ہو رہی ہے۔

ہندوستان کی حکومت نے بھی اس طریقہ کو پسند کیا اور ۱۹۰۴ء میں ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے انجمن ہائے امداد باہمی قائم ہونے لگیں۔ لیکن ہندوستان میں بعض خرابیوں کی وجہ سے یہ طریقہ بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ ایک خرابی تو یہی ہے کہ حکومت کے حد سے زیادہ دخل نے اس کی صحیح روح فنا کر دی ہے۔ دوسرے اس کو صرف مالی ضروریات تک محدود کر رکھا ہے۔ اقتصادی زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسے بہت کم رائج کیا گیا ہے

حقیقت یہ ہے کہ کوآپریشن کا طریقہ ایک بہت ہی عمدہ طریقہ ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے لئے اس میں بہت ہی فائدے ہیں۔ کیونکہ موجودہ زمانے کے کاروبار میں لاکھوں روپیہ لگانے کی ضرورت ہے مسلمانوں کے پاس اتنا روپیہ نہیں۔ لہذا وہ کاروبار سے علیحدہ رہتے ہیں۔ دوسرے مسلمان کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں کاروبار بغیر سود کا لین دین کئے نہیں ہو سکتا۔ ہمارے مذہب میں چونکہ سود ناجائز ہے اس لئے ہم کاروبار نہیں کرتے۔ ضروریات زندگی کا تمام کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر مسلمان کوآپریٹو طریقہ (Cooperative System) کو سمجھیں اور اسی پر عمل پیرا ہوں تو یقیناً یہ کمی دور ہو جائے گی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس میں ایک اور فائدہ ہے موجودہ زمانے کی اقتصادی یکجہتی (Economic Nationalism) اس بات کی متقضی ہے کہ مل اور کارخانوں کو بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر نہ چلایا جائے کیونکہ مال کی نکاسی کے لئے اب مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ملک میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود کفیل (Self - Sufficient) ہو۔ اس چیز کا اثر ہندوستان پر بھی پڑے گا بہت ممکن ہے کہ حکومت کارخانوں کی وسعت پر پابندیاں عاید کر دے۔ ایسی صورت میں صاف ظاہر ہے کہ کوآپریٹو طریقہ کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے گا۔ اگر مسلمان اس طریقہ پر اب سے کاربند ہو جائیں تو بہت فائدے میں رہیں گے

یوں تو کوآپریشن کو اقتصادی زندگی کے ہر شعبہ میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اس وقت آپ کو آپریٹو طریقہ کی صرف ایک شکل بیان کروں گا جس کو مسلمان بہت آسانی کے ساتھ عملی جامہ پہنا کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کوآپریٹو اسٹور | کوآپریشن کا یہ ایک بالکل نیا طریقہ ہے جس کو دنیا بہت پسند کر رہی ہے کچھ آدمی مل کر ایک انجمن بنا لیتے ہیں۔ تھوڑا تھوڑا سا سرمایہ جمع کر کے اپنی ضروریات زندگی کی چیزیں تھوک قیمت پر بازار سے لے آتے ہیں۔ اور بازار کے بھاؤ اپنے بازاروں اور محلوں میں فروخت کرتے ہیں۔ تمام ممبر بھی اسی اسٹور سے اپنی ضروریات خریدتے ہیں۔ کوآپریٹو اسٹور کی یہ ابتدائی شکل ہے۔ جب ممبروں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے اور کچھ تھوڑا بہت نفع بھی ہونے لگتا ہے تو کام بڑھایا جاتا ہے۔ ایک دوکان خرید لی جاتی ہے۔ اس کے بعد کئی چھوٹے کوآپریٹو اسٹور مل کر ایک کوآپریٹو اسٹور بنا لیتے ہیں۔ جو براہ راست کارخانوں اور بڑی دوکانوں سے سامان لیتا ہے اور بازاری قیمت پر یا اس سے کچھ کم قیمت پر چھوٹے اسٹوروں کو دیدیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مسلمان کوآپریٹو اسٹور کس طرح قائم کریں | فی الحال تو مسلمانوں کو ان چیزوں کے کوآپریٹو اسٹور کھولنے چاہئیں جو ضروریات

زندگی ہیں۔ مثلاً اناج، کپڑا، شکر وغیرہ وغیرہ۔ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس محلہ یا مقام کے لوگوں کی کیا کیا ضروریات کی چیزیں ہیں۔ جہاں مسلمان کی دوکان موجود ہو وہاں اُس چیز کا اسٹور نہیں کھولنا چاہیئے جو وہ فروخت کرتا ہے۔ ان باتوں کا گاؤں اور شہروں میں غرض ہر جگہ خیال رکھا جائے محلہ یا اس مقام کے کسی تعلیم یافتہ یا قدرے سمجھدار انسان کو چاہیئے کہ لوگوں کو ایک جگہ جمع کرے اور ان کو کوآپریٹو طریقہ کے فوائد سمجھائے جب وہ خوب سمجھ جائیں تو پھر انکو ممبر بنائے ممبر جہاں تک ہو زیادہ سے زیادہ بنائیں لیکن اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ ممبر دور دراز کے رہنے والے نہ ہوں بلکہ قریب قریب کے دو یا تین محلوں میں رہتے ہوں کم از کم بیس ممبر ہوں ہر ایک ممبر سے ممبری کا ایک یا دو روپیہ چندہ لیا جائے۔ یہی چندہ کوآپریٹو اسٹور کا سرمایہ ہوگا اگر ضرورت محسوس کی جائے تو کچھ روپیہ مجموعی ضمانت پر کم شرح سود پر یا بغیر سود پر قرض سے لیا جائے جس چیز کا آپ کو اسٹور کھولنا ہے اسے بازار سے تھوک داموں پر خرید لیجئے۔ شروع شروع میں تو کوئی چھوٹی موٹی کوٹھری کرایہ پر لے لیجئے۔ وہاں یہ سامان رکھدیجئے اور ممبروں ہی میں سے کوئی دیانت دار آدمی فروخت کا کام انجام دے لے۔ جب کام میں توسیع شروع ہو تو باقاعدہ کرایہ کی دوکان لے لیجئے اور کوئی اچھا سا آدمی ملازم رکھ لیجئے جو حساب کتاب بھی جانتا ہو۔ فروخت بالکل نقد ہو ادھار کسی کو نہ دیا جائے اگر کام بڑا ہو جائے اور ممبروں میں سے بعض ملازم پیشہ ہوں تو کچھ روز کے ادھار پر بھی مال فروخت کیا جا سکتا ہے۔

تمام چیزیں بازار کے بھاؤ پر بیچنی چاہئیں۔ ممبروں کو مال کے خریدنے پر دو پیسہ کمیشن دیا جائے۔ اس سے ممبروں کو فائدہ بھی ہوتا رہے گا اور اسٹور کی بکری بھی بڑھتی جائے گی کیونکہ جتنا زیادہ کوئی خریدیگا اتنا ہی زیادہ اس کو کمیشن کی صورت میں فائدہ ہوگا۔ جو ممبر دو دو چار چار آنے روز کا سودا خریدیں ان کا دو دو چار چار آنے کا حساب جمع کیا جاتا رہے۔ مہینے کے بعد جتنے روپیہ جمع ہوں ان پر دو پیسہ فی روپیہ کے حساب سے انھیں کمیشن دیدیا جائے۔ وہ خریدار جو ممبر نہ ہوں ان کو کمیشن نہ دیا جائے جب تک وہ ممبر نہ بن جائیں۔

اسٹور کا انتظام کرنے کے لئے پانچ آدمیوں کی ایک اسٹور کمیٹی قائم کی جائے۔ اس کا کام اشیاء کو کم سے کم قیمت پر خریدنا، ان کی بازار کے مطابق قیمتیں مقرر کرنا، اسٹور کی دیکھ بھال کرنا، ملازم وغیرہ کو تنخواہ دینا اور اسٹور کا تمام روپیہ جمع کرنا وغیرہ وغیرہ ہوگا۔ کمیٹی اس بات کی تلاش میں رہے کہ مال عمدہ اور کم سے کم قیمت پر ملے خرید و فروخت کا روزانہ حساب کرتی رہے اسٹور کھولنے کے بعد ہی ممبروں میں سے پانچ ارکان چن لئے جائیں۔ ایک مہینے تک یہ کام کریں۔ مہینے کے

بعد اس میں سے تین ارکان کی بجائے دوسرے تین ارکان چنے جائیں اور یہ نئے تین منتخب شدہ ارکان پہلے دو ممبروں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ پھر ایک مہینے بعد اسی طرح تین نئے ممبروں کا تین پرانے ممبروں کی جگہ انتخاب ہو۔ جانے والے ممبروں میں دونوں وہ ممبر ہوں جو پچھلے مہینے میں باقی رہ گئے تھے اور ایک وہ ہو جو اس مہینے میں منتخب ہوا تھا۔ اس طرح سے ہر مہینے باقاعدہ انتخاب ہوتا رہے اس طریقہ سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ اتحاد کی صحیح سپرٹ موجود رہے گی۔ دوسرے پچھلے مہینے کے دو ممبر نئے تین ممبروں کو اپنے پچھلے تجربہ کا حال بتا دیا کریں گے۔ اس طرح سے ایک تسلسل قائم رہے گا۔ ایسا نہ ہوگا کہ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہر ایک ممبر کو اسٹور کمیٹی کا باری باری ممبر بنایا جائے۔ اسٹور کمیٹی کا ممبر لائق آدمی کو بنانا چاہیئے۔ فرض کیجئے اگر ایک لائق آدمی پہلی مرتبہ منتخب ہو گیا ہے تو وہ دوبارہ سہ بارہ بھی منتخب ہو سکتا ہے۔ مہینہ کے آخر میں انتخاب کے ساتھ تمام ممبروں کو پچھلے مہینہ کی پوری کارروائی سنا دی جائے۔

کمیشن دینے کے بعد بھی یقیناً اسٹور کو کچھ نہ کچھ منافع ضرور ہوگا اس منافع کو شروع شروع میں تو اسٹور کو وسیع کرنے میں صرف کیا جائے پھر اس میں سے کچھ حصہ ناگہانی نقصان کو پورا کرنے کے لئے محفوظ رکھا جائے اس کے بعد اگر کچھ بچے تو وہ ممبروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر منافع کے تقسیم کی نوبت آئے تو سالانہ ہو۔

جب شہر یا قصبہ میں مختلف محلوں میں بہت سارے چھوٹے اسٹور قائم ہو جائیں اور وہ چلنے لگیں تو پھر تمام اسٹور مل کر ایک بڑا اسٹور قائم کریں جو بلا واسطہ بڑی دوکانوں اور کارخانوں سے تھوک قیمت پر مال خریدے مال چھوٹے اسٹوروں کی ضروریات کے مطابق خریدے اور قیمت خرید سے کچھ زیادہ قیمت پر ان کے ہاتھ فروخت کرے اس زیادہ قیمت سے اپنا خرچہ پورا کرے۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ روپیہ منافع کی صورت میں جمع نہ ہونے پائے اگر منافع جمع ہو بھی جائے تو چھوٹے اسٹوروں میں تقسیم نہ کرے بلکہ ناگہانی نقصان پورا کرنے کے لئے قائم رکھے۔

اس اسٹور کی بھی ایک اسٹور کمیٹی ہوگی ہر چھوٹا اسٹور اپنی اسٹور کمیٹی میں سے ایک ممبر چن کر بھیجے۔ اس کمیٹی کا بھی وہی کام ہوگا جو چھوٹے اسٹور کمیٹی کا ہے۔

اگرچہ اس طریقہ کو اسی طرح اور وسیع کیا جا سکتا ہے۔ مگر میرے خیال میں ابھی اتنا ہی کافی ہے۔ کیا ہمارے کالج کے پروفیسر اور طلبا بھی تعطیل کا کچھ حصہ اس چیز کے پروپیگنڈا کرنے میں صرف کریں گے؟

(محمد یونس متعلم ایم۔اے)

شذرات

پچھلے جون کے مہینے میں ایک نئے عنوان ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب اور ان کا تمدن
کیا ہے کا آغاز کیا گیا تھا اور اس سلسلہ میں ہر نقطہ نظر خیال کے لوگوں سے درخواست کی گئی تھی
کہ اپنے اپنے افکار سے ناظرین جامعہ کو مستفید ہونے کا موقع دیں۔ لیکن ہمیں بہت تعجب اور
افسوس ہے کہ کسی اہل فکر نے اس طرف توجہ نہ کی۔ یا تو موضوع کو اس قابل نہیں سمجھا یا اس پر کچھ سوچنے
کی فرصت نہ ملی اور نہ ارادہ کیا۔ ذہنی کاہلی جسے شان استغنا کہیے مانع رہی۔ بہرحال ہم اپنے ناظرین سے
معذرت خواہ ہیں کہ ہم نے انھیں انتظار میں رکھا۔ ستمبر سے ہمیں امید ہے کہ ان کی خدمت میں اس
عنوان پر مسلسل مضامین پیش کرتے رہیں گے۔

گذشتہ مہینوں میں دو ایک موتیں بہت افسوسناک ہوئیں ایک تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے داعی
اجل کو لبیک کہا آپ دکن کے مستعد صدر اعظم رہ چکے تھے۔ آپ کو عربی۔ فارسی اور انگریزی تینوں
زبانوں سے واقفیت تھی۔ اردو فارسی میں اکثر غزلیں کہتے رہیں علمی مذاق بہت شستہ تھا۔ وضعداری
اور پرانی شریفانہ خصوصیات کا نمونہ تھے ہمیں ان کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔

دوسری وفات خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کی ہے۔ خواجہ صاحب اُن پرانے لوگوں میں
سے تھے جو لکھنؤ کے پرانے وضعدار لوگوں میں سے تھے۔ لکھنؤ میں لکھنوی نثر لکھنے والوں
کی فی زمانہ یونہی کمی ہے مرحوم کی وجہ سے لکھنؤ کا بہت کچھ بھرم قائم تھا۔ وہاں کی بول چال
محاوروں اور روزمرہ کو خوب برتتے تھے۔ اللہ تعالے مغفرت کرے اور وہاں کے لوگوں کو انکی
سی نثر لکھنے کا شوق دے۔

مرحوم نے اودھ کی خصوصاً لکھنؤ کی طرز معاشرت رسم و رواج اور وہاں کی تہذیب کے نمونے اپنی
مختلف تحریروں میں اچھے پیش کئے ہیں۔ قواعد زبان اور فن شاعری پر بھی کچھ رسالے یادگار چھوڑے ہیں

ہندوستانی مسلمانوں کا تمدن

اسلامی تمدن کے متعلق علی العموم اور مسلمانانِ ہند کے تمدن کے متعلق بالخصوص ایک عرصہ سے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ یہ تمدن جس کے متعلق اس قدر شور و غوغا بلند کیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ کانگریس کی روش نے اس کے وجود کو معرضِ خطر میں ڈال رکھا ہے کن خصوصیات کا حامل ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ آیا اس کا کوئی وجود بھی ہے یا یہ صرف فرقہ پرستوں کا ایک واہمہ ہے جس کا نام لے لے کر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف سے بدظن کیا جا رہا ہے اور آزادیٔ وطن کی راہ میں مشکلات پیدا کی جا رہی ہیں۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے تو حسبِ معمول اپنی جگہ اس مسئلہ کا تصفیہ کر دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ "اسلامی تمدن شمالی ہند کے مسلمانوں کے اونچے طبقوں کی بعض خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ مثلاً ایک خاص طرح کا پاجامہ ایک خاص طرح کا لوٹا، ترکی ٹوپی، لمبی داڑھی اور خشخشی مونچھیں غرضکہ اسی قسم کے چند خصائص ہیں جنھیں اسلامی تمدن کا معزز لقب دے دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیزیں جلد یا بدیر فنا ہو جائیں گی، نہ یہ کوئی ایسی بیش بہا متاع ہے جس کے ضائع ہو جانے پر کوئی عقلمند شخص ماتم کرے۔"

اس قسم کی سطحی باتیں صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جنھیں سیاسیات کے ہنگاموں سے اتنی فرصت نہیں ملتی ہے کہ وہ کسی مسئلہ پر گہری نظر ڈال سکیں یا اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکیں کسی قوم کا تمدن اگر صرف ایسی ہی خصوصیات سے مرکب ہوا کرتا جن کا بیان اوپر گذر چکا ہے تو دنیا میں ایک تہذیبی وحدت کا قائم کرنا کوئی دشوار امر نہ ہوتا اور ہر قوم کے لئے آسان ہوتا کہ وہ ایک مشترک عالمی تہذیب کی خاطر اپنی ان خصوصیات سے دست بردار ہو جائے۔

جس چیز کو تمدن کہا جاتا ہے اس کی حقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ آدابِ معاشرت، رسوم و شعائر، زبان و لباس ان سب کو زیادہ سے زیادہ تمدنی مظاہر کہا جا سکتا ہے

اگر دراصل تمدن انہیں عناصر کے مجموعہ کا نام ہوتا تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ مغرب میں ایک تمدن نہیں بلکہ اتنے ہی تمدن ہیں جتنی وہاں قومیں بستی ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم فرانسیسی تمدن، انگریزی تمدن، جرمن تمدن روسی تمدن اور اطالوی تمدن کا نام نہیں سنتے ہیں اس کے بجائے ہم ایک جامع لفظ مغربی تمدن استعمال کرتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ تمدن سے ہماری مراد یہ ظاہری صفات و خصوصیات نہیں ہیں بلکہ اس کا سرچشمہ کوئی ایسی شئے ہے جو مغرب کی تمام قوموں میں مشترک ہے۔

انگریزی میں ایک مقولہ ہے (The true seat of Culture is the mind of man یعنی ہر قسم کی شائستگی اور تہذیب کا اصلی محل انسان کا ذہن ہے۔ تمدن کی حقیقی تعریف یہی ہے کہ وہ ایک مخصوص ذہنی میلان یا انداز فکر کا نام ہے جو ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتہی ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ کسی قوم کا مخصوص اخلاقی اور عقلی مزاج ہے جس کے مطابق اس کے افراد قوم پر حالات و واقعات کا ایک خاص ردِّعمل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مغربی قوموں کے محسوس و ظاہر اختلافات کے باوجود ہم انہیں ایک ہی تمدن کے حامل کی حیثیت سے جانتے ہیں کیونکہ جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے ان کی سرشت کا خمیر تیار ہوا ہے وہ سب میں یکساں اور مشترک ہیں۔ جب مسلمان اپنے تمدن کو خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے تو دراصل اس کے دل و دماغ میں یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ اس کا اسلامی ذہن خطرہ میں ہے یعنی وہ ذہن جو اس کی مخصوص تہذیب و شائستگی کا محل ہے۔ اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت اسلامی تمدن کو مٹا دینے کے لئے کوشاں ہے تو ہماری مراد یہ نہیں ہوتی ہے کہ ہمارے آداب و اطوار ہمارے رسوم و شعائر لباس و زبان اور ہمارے علوم و فنون پر حملہ کیا جا رہا ہے یا ان کے مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ زبان کے مسئلہ نے جو اہمیت اختیار کر لی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ زبان کا معاملہ بجائے خود

اہم ہے بلکہ اُس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہوگئی ہے کہ اور چیزوں کی بہ نسبت ہمارے اسلامی ذہن سے اُس کا تعلق زیادہ قریب اور زیادہ گہرا ہے۔ جس چیز کے تحفظ کے لئے ہم واقعتاً مضطرب وبیقرار ہیں وہ وہی ہمارا اسلامی ذہن ہے۔ اگر یہ ذہن محفوظ وسلامت رہنے دیا جائے تو شاید ہمیں اپنے آداب ولباس، مراسم وشعائر اور زبان کے مٹ جانے پر کوئی افسوس نہ ہو۔ جو کچھ کشمکش ہے وہ اسی ذہن کو باقی رکھنے کے لئے ہے اور یہی ہمارے تمدن کی روح ہماری تہذیب کی جان اور ہمارے کلچر کی بنیاد ہے۔ یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک خالص سیاسی جدوجہد سے ہمارے اسلامی ذہن کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب بہت صاف اور سیدھا ہے اور وہ یہ کہ یہ جدوجہد جو ابتداءً خالص سیاسی نوعیت رکھتی تھی اب اپنا قالب بدل چکی ہے اور اس کا سیاسی پہلو اب اتنا قوی نہیں رہا ہے۔ اس جدوجہد نے ایک تہذیبی کشمکش کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہمارے سیاسی لیڈر اب صرف آزادی ہی نہیں چاہتے ہیں وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظریات ہندوستان کی پوری آبادی پر مسلط کر دیں۔ وہ ایک خاص نظام تصورات (Ideology) کے داعی اور مبلغ بن گئے اُن کی خواہش ہے کہ ہر فردِ قوم بلا امتیاز نسل و مذہب اس نظام تصورات کو قبول کر لے۔ یہاں پر ہمارا اسلامی ذہن درمیان میں آجاتا ہے کیونکہ اس نظام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنا ایک جداگانہ نظام تصورات رکھتا ہے جس کے علاوہ کسی دوسرے نظام پر عمل پیرا ہونے کے لئے راضی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر عدم تشدّد کے عقیدہ کو لیجئے۔ بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم میں اس عقیدہ کو بھی تعلیم کا ایک جزو قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہر طالب علم کو جو اس اسکیم کے تحت تعلیم حاصل کرے گا خواہ وہ مسلمان ہو یا کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس عقیدے پر ایمان لانا پڑے گا کہ عدم تشدّد تشدد سے بہرحال بہتر ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ طالب علموں پر اس عقیدہ کی نسبت کوئی جبر کیا جائے گا لیکن جب انھیں تعلیم ہی یہی دی جائے گی کہ عدم تشدّد سے اعلیٰ تر اصول زندگی اور کوئی نہیں ہے تو انہیں غیر شعوری طور سے

اس کی صداقت پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ اسلامی ذہن سے کلی مغایرت رکھتا ہے۔ اسی طرح اس عقیدہ کی بھی تلقین کی جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ سچے ہیں اور کسی ایک مذہب کے پیرووں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے مذہب کو دوسرے مذاہب سے فائق و برتر خیال کریں۔ جہاں تک مسلمان لڑکوں کا تعلق ہے اُن کے لئے اُس تعلیم میں یہ خطرہ ہے کہ اُن میں سے اسلام و کفر کے امتیاز کا ضروری احساس مٹ جائے گا۔ آگے چل کر میں یہ بتاؤں گا کہ اِس امتیاز کو برقرار رکھنا مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے لئے کیوں ضروری ہے۔

اسلامی ذہن نے جس تمدّن کو پیدا کیا ہے اُس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں جو اُسے دوسرے تمدنوں سے جدا کرتی ہیں۔ اس کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ یہ پورا تمدن خدا پرستی کی روح سے معمور ہے۔ یہ روح اس تمدن کے ہر شعبہ میں جاری و ساری ہے اسی کے ضعف و اضمحلال نے اسلامی تمدن کو مائل بہ انحطاط کر رکھا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی موجودہ پستی کا سبب بھی یہی ہے کہ اُن کی اکثریت خدا پرستی کی روح سے بیگانہ ہوگئی ہے، اس کے باوجود اب بھی مسلمانوں کی زندگی میں اُس کے مظاہر و علامات کثرت سے نظر آتے ہیں۔ ایک مسلمان بچہ جس وقت بطنِ مادر سے اس فضائے آب و گل میں پہلی مرتبہ قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلی آواز جو اُس کے کانوں میں پڑتی ہے وہ یہی خدا پرستی کی آواز ہے جو خدا کی عظمت و کبریائی کے اعتراف اور رسالت کے اقرار پر ختم ہوتی ہے۔ پھر جب تک وہ اس دنیا میں رہتا ہے ہر روز پانچ وقت یہی آواز اس کے کانوں میں پڑتی ہے۔ صبح و شام ہر موقعہ اور ہر محل پر مختلف طریقوں سے اُس کو خدا پرستی کا سبق دہرانا پڑتا ہے۔ ہر کام کی ابتدا وہ خدا کے نام پر کرتا ہے۔ کھانا کھاتا ہے یا پانی پیتا ہے تو الحمد للہ کہہ کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اپنا کوئی ارادہ ظاہر کرتا ہے تو انشاء اللہ کہہ کر خدا کی قدرت کو تسلیم کرتا ہے۔ صبح اُٹھتا ہے تو کلمہ طیبہ پڑھتا ہوا اور رات کو بستر پر لیٹتا ہے تو خدا کو یاد کرتے ہوئے سوتا ہے غرضکہ اُٹھتے بیٹھتے

کھاتے پیتے نہاتے دھوتے ہر وقت وہ کسی نہ کسی شکل میں اس سبق کو دہراتا ہے۔ یہ سب سے بڑا ثبوت ہے اس بات کا کہ مسلمان کی زندگی اور اُس کے تمدن کی بنیاد بھی خدا پرستی کی روح ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے یہ تمام اعمال اب میکانکی اور بے روح ہو گئے ہیں اور ان میں خدا پرستی اور یزداں طلبی کا حقیقی ولولہ سرد پڑ گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مسلمانوں کا تمدن اپنے پورے عروج پر تھا مسلمانوں کے یہ شعائر اُن کی روح خدا پرستی کو کیسی تقویت بخشتے ہوں گے۔ جس تہذیب و تمدن میں خدا پرستی کی یہ شدت ہو وہ اُن لوگوں کی نظروں میں کیونکر نہ کھٹکے گا جو عدالت میں صرف اس لئے حلف لیتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ ایسا کرتے ہوئے خدا کا نام زبان پر لانا پڑتا ہے۔ جس حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی اس کے تحت مسلمانوں کے مذہبی عقائد و اعمال کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس کے بعد بھی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے تمدن کی طرف سے جو خطرات لاحق ہیں وہ بے اصل و بے بنیاد ہیں۔ اسلامی تمدن کی ایک اور بڑی خصوصیت اس کی حقیقت پسندی (REALISM) ہے۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق اور انسانی فطرت کی کمزوریوں کو نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ وہ دنیا میں اعلیٰ ترین نصب العین اور شریف ترین مقاصد رکھنے کے باوجود ہر جگہ حقائق سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ مجرد فلسفیانہ تصورات اور افسانہ آمیز بلند خیالی کے لئے اس نظام تمدن میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اپنے ضابطۂ اخلاق میں، اپنے معاشرتی قوانین میں، اپنے معاشی اور عمرانی نظریات میں غرضکہ ہر شعبۂ حیات میں وہ نفس انسانی کے داعیات اور انسانی فطرت کی کمزوریوں کو ملحوظ رکھتا ہے اور انسان سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتا ہے جو اُس کی فطرت کے خلاف یا اُس کے امکان اور طاقت سے باہر ہو۔ اسلامی تمدن میں رقیت (Sentimentalism) کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس تمدن کا مقصد امن و امان کا قیام اور جنگ و خونریزی کا سدِ باب ہے۔ اس کے باوجود وہ کبھی اس فریب میں مبتلا نہیں ہوا کہ خالی عدم تشدد سے

دنیا میں امن قائم کیا جا سکتا ہے یا یہ کہ اگر ظلم وستم کا جواب خاموشی اور صبر و رضا سے دیا جائے تو ہمیشہ کے لئے اُس کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایک چیز جنگ و خونریزی سے بھی زیادہ بُری ہے اور وہ فساد ہے اُس کے مٹانے کے لئے تم کو تلوار ضرور اُٹھانی پڑے گی خواہ اس میں کتنے ہی بندگانِ خدا کی جانیں تلف ہو جائیں۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ انسانی ضمیر کی آزادی کے لئے لڑائی جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔ اگر خدا کی عبادت کرنے احکام شرعی بجالانے اور حق بات کہنے میں تمہاری مزاحمت کی جائے تو تم پر لازم ہے کہ جنگ کرو یہاں تک کہ تمہاری مذہبی آزادی بحال ہو جائے۔

رقیت (Sentimentalism) سے اس تمدن کو جو بُعد ہے وہ مسلمانوں کے معاشرتی تعلقات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اسلامی تمدن میں عورتوں کی ملکیت کا پورا پورا حق دیا گیا ہے۔ اگر اس حق سے فائدہ اٹھا کر کوئی عورت دولتمند بن جائے تو اُس کے لئے ضروری نہیں ہے اور نہ اسپر وہ مجبور ہے کہ وہ اپنی دولت کا کوئی حصہ اپنے شوہر کے حوالے کر دے۔ بلکہ مسلمانوں کی زندگی میں ایسی صورتِ حال بھی پیش آ سکتی ہے کہ کسی عورت کا شوہر اتنا غریب ہو اور خود عورت اتنی دولت مند ہو کہ وہ زکوٰۃ کا روپیہ فقراء اور مساکین کے بجائے اپنے شوہر کو دے دے۔ یہی حال مرد و زن کے دوسرے تعلقات کا ہے۔ جو لوگ زندگی کے حقائق سے منہ موڑ کر ایک خیالی شرافت کے تصور میں مگن رہتے ہیں وہ اس حقیقت پسندی کے متحمل نہیں ہو سکتے اور مسلمانوں کی ان معاشرتی خصوصیات پر معترض رہتے ہیں۔ ہندوستانی تمدن کے تحت زندگی بسر کرنے والے افراد کی نظروں میں تو یہ خصوصیات سراسر عیوب میں داخل ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک شرافت کا معیار یہ ہے کہ مرد و زن کے تعلقات میں عورت اپنے جذبات و داعیات کو شوہر کی مرضی پر ہمیشہ کے لئے قربان کر دے اسی لئے ہندوؤں میں طلاق ناجائز ہے اور خود یورپ میں جب تک عیسائیت کا کچھ بھی اثر باقی رہا طلاق کو ایک ناقابل تصور دناءت خیال کیا جاتا تھا اور مسلمانوں پر بڑی لے دے

رہتی تھی کہ انھوں نے ایسی معیوب چیز کو روا رکھا ہے۔

اسلامی تمدن کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے مسلمانوں میں دوسری قوموں کے تمدن پر اپنے تمدن کی فوقیت و برتری کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی تمدن کو آج تک یہ خطرہ کبھی پیش نہیں آیا کہ وہ دوسرے کسی تمدن سے مغلوب ہو کر اپنا امتیازی وجود کھو بیٹھے یا رفتہ رفتہ اس میں ضم ہو جائے۔ یہ احساس امتیازِ کفر و اسلام کی شکل میں ہر مسلمان کے دل میں موجود رہتا ہے۔ مخالفین اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس احساس کے ذریعہ مسلمانوں اور دوسری قوموں میں باہم نفرت و عداوت کا بیج بو دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اُس کی غلط تعبیر ہے۔ ہر قوم کے لئے جو اپنے تمدنی وجود کو باقی رکھنا چاہتی ہے اپنے تفوق کا احساس ضروری ہے۔ اگر اسلام بحیثیت ایک تمدن دوسری تمام تہذیبوں پر کوئی فوقیت نہیں رکھتا ہے تو پھر اُس کے وجود کی کوئی علت ہی باقی نہیں رہتی ہے۔ یہ کفر و اسلام کا امتیاز اسلامی تمدن کے لئے بہرحال ایک ضروری چیز ہے اور اس کو زندہ رکھنے کے لئے مسلمانوں کو بعض ایسی ظاہری علامات و خصوصیات قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جو مسلمانوں کو دوسری اقوام سے اوّل نظر میں ممتاز کر دیتی ہیں۔ یہ علامات اسلامی تمدن کی شناخت کا کام دیتی ہیں انہیں کا نام شعائرِ اسلامی ہے جن کی پابندی مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے۔ اِن شعائر کی اہمیت جو کچھ ہے محض اس لئے ہے کہ یہ امتیاز کفر و اسلام کے احساس کو زندہ رکھنے میں مدد دیتے ہیں اور مسلمانوں کو دوسری قوموں میں ضم ہو جانے سے بچاتے ہیں ورنہ بجائے خود ان شعائر کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں ہے۔ اسی امتیاز کفر و اسلام کو برقرار رکھنے کے لئے مسلمان شعائرِ اسلامی کی حفاظت کے لئے سینہ سپر رہتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ شعائرِ اسلامی کو خطرہ میں دیکھ کر مسلمان کے مذکورہ بالا احساس پر کس قدر کاری ضرب لگتی ہے اور اُس کو اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں اسی طرح وہ تمام علامات جو اُس کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہیں رفتہ رفتہ مٹ نہ جائیں اور اُس کا وہ تمدنی وجود دوسری تہذیبی وحدتوں میں گھل مل کر فنا

نہ ہوجائے جس کا باقی رکھنا وہ اپنی فلاح و بہبود کے لئے ضروری خیال کرتا ہے۔ کفر و اسلام کے امتیاز کا احساس مسلمان اسی مقصد کی خاطر زندہ رکھنا چاہتا ہے۔

یہاں پر یہ کہدینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تمدن کی جو خصوصیات اوپر بیان کی جاچکی ہیں وہ ہر ملک کے مسلمانوں میں مشترک طور سے پائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی ممالک کی تمدنی زندگی میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہ اختلافات صرف ظواہر و فروعات تک محدود ہیں مثلاً مسلمانوں میں زبان اور آداب معاشرت کا اختلاف پایا جاتا ہے یا لباس اور طرز زندگی میں بھی آپ ایک ملک کے مسلمانوں کو دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے جدا پائیں گے لیکن ان اختلافات سے اصل حقیقت نہیں بدل جاتی ہے جہاں تک اسلامی ذہن کا تعلق ہے وہ ہر ملک کے مسلمانوں میں یکساں طور سے مشترک ہے اور جیسا کہا جاچکا ہے اسلامی تمدن کا حقیقی سرچشمہ بھی ذہن ہے پھر وہ تمام اخلاقی اور عقلی محرکات جن سے اسلامی تمدن کی ترکیب عمل میں آئی ہے پوری دنیا کے مسلمانوں کو بلا امتیاز نسل و زبان ایک تہذیبی وحدت میں منسلک کرتے ہیں اور مسلمان جب تک مسلمان ہیں ان محرکات عمل سے خالی نہیں رہ سکتے۔

(محمد مظہر الدین صدیقی بی۔ اے)

ڈومینین اسٹیٹس

ڈومینی درجہ مبہم اور گول مول سی اصطلاح ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ اس درجہ کا نام ہے جو دوسری نوآبادیات کو حاصل ہے۔ یہ درجہ ان مشاورتوں اور کانفرنسوں کی سلسلہ در سلسلہ کڑیوں کا نتیجہ ہے جو آئین وسٹ منسٹر کی شکل میں نمودار ہوا۔ شاہی کانفرنس ۱۹۲۶ء کے ریزولیوشن کے مطابق آئین مذکور نے برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیات کو ایسے ممالک تسلیم کر لیا جو "سلطنت کے اندر خود اختیارانہ حیثیت رکھتے ہیں، درجہ میں مساوی ہیں اور کسی صورت سے ایک دوسرے کے ماتحت نہیں، نہ اپنے خانگی نہ اپنے بیرونی معاملات میں"۔ بظاہر خود اختیاری حکومت میں جو اس انداز سے بیان کی گئی ہو، اور سوراج میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ درحقیقت، جہاں تک داخلی امور کا تعلق ہے نوآبادیات یکسر آزاد ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے قوانین بھی بنا سکتی ہیں، خواہ وہ شاہی احکام کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ کوئی قانون بغیر اُن کی مرضی کے اُن کے سامنے نہیں لایا جا سکتا۔ خانگی امور میں وہ شاہی حکومت کے دستِ نگر نہیں ہیں مگر لطف یہ ہے کہ خارجی معاملات میں نوآبادیاتی خود مختاری کی اصل صورت کو ایک تھکا دینے والی ضابطگی میں بڑی حد تک چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصولاً نوآبادیاں جب چاہیں عہد نامے کر سکتی ہیں اور اگر چاہیں تو اپنے نمائندے مقرر کرنے کا حق بھی رکھتی ہیں۔ اپنے مادری ملک سے اشتراکِ عمل اور مراسلت کرنے کی انہیں صرف اس صورت میں ضرورت ہوگی، جب بیرونی تعلقات کے مسائل سامنے آجائیں۔ مگر عملی طور پر نوآبادیات کی خارجی حکمت عملی ہمیشہ شاہی حکومت کے اشارہ کی منتظر رہی ہے اور نوآبادیات نے ایسے حالات میں اپنے خود مختارانہ حقوق پر اصرار بھی نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک حد تک اس کا سبب ان کی اپنی کمزوری ہو، لیکن اس کی بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ برطانوی دفترِ خارجہ اور اُن کے مابین کسی اہم

مسئلہ میں کوئی سخت اختلاف رائے پیدا ہی نہیں ہوا۔ البتہ حال میں متعدد نوآبادیات میں بے اطمینانی اور اضطراب کے جذبات پیدا ہوئے اس لئے کہ شاہی کابینہ نے اہم معاملات میں نوآبادیات سے مشورہ لئے بغیر خود ہی سب کچھ طے کر دیا۔ دور دراز نوآبادیات سے مشورہ کرنے کے بعد حکمت خارجی کا تعین دشوار نظر آتا ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کوئی فوری ضرورت درپیش ہو۔ حکمت عملی میں اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہئے اس کے حل کا کوئی طریقہ دفعات وضع کر کے نہیں بتایا گیا۔ اسی طرح آئین وسٹ منسٹر اور بہت سے ضروری سوالات کا جواب دینے سے عاری نظر آتا ہے۔ مثلاً برطانوی جنگ میں حق غیر جانبداری یا حق علیحدگی" اور اسی طرح کے مسائل، جواب سے تشنہ چھوڑ دئے گئے ہیں۔ جنرل ہرٹزاگ اور دوسرے مدبرین نے اسی قسم کے حقوق کا مطالبہ کیا ہے، اگرچہ برطانیہ نے ان کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ موجودہ حالات کی روشنی میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی نوآبادی کو علیحدگی سے روکا نہیں جا سکتا، اگر علیحدگی اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی ہو۔ ممکن ہے کہ یہ سوال اُس وقت تک نہ پیدا ہو، جب تک کہ نوآبادیات کے جذبات کا لحاظ رکھا جائے۔ ڈمینی درجہ اپنی عملی حیثیت سے خود کافی لچک دار ثابت ہو چکا ہے، اور اس بارہ میں آئرلینڈ کی مثال سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ کیا کوئی شخص تصور کر سکتا تھا کہ خود اختیاری حکومت کے اس ملک کے لئے انجام کار کیا معنی ہوں گے؟

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برطانیہ اور نوآبادیات کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے والے حالات اب تک کافی وقیع ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ علیحدہ کرنے والی زبردست قوتیں بھی کارفرما ہیں۔ تمدنی اور اقتصادی اسباب نے ان ملکوں میں سلطنت برطانیہ سے علیحدگی کے رجحانات پیدا کر دئے ہیں۔ ہر ملک کو اس کے مخصوص مقامی حالات نے ایک زبردست معاشی جذبۂ قومیت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ بعض ملکوں، خصوصاً جنوبی افریقہ اور فرانسیسی بولنے والے حصۂ کینیڈا میں، اور اس سے کم درجہ پر دوسرے حصوں میں ایک

تمدنی جذبۂ قوم پرستی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ بقائے سلطنت کی بنیادوں کو سیاسی اور اقتصادی یکسانیت اور جذبہ اور نصب العین کی ہم آہنگی پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ باہمی مادی نفع کا لحاظ بھی سب سے ضروری چیز ہے، کیونکہ دنیا میں کوئی ملک اپنے حیاتی اور مرکزی معاملات کو، خواہ ان کا تعلق معیشت سے ہو یا سیاست سے، صرف خیالی اصول اخلاق یا نظریۂ اتحاد کی خاطر قربان کرکے زیادہ دنوں تک بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا

اب لوٹ کر ذرا ہندوستان اور ہندوستان کے معاملات کی طرف نظر ڈالئے،

ڈومینی درجہ کو ہندوستانی حکومت کی منزلِ مقصود سرکاری طور پر لارڈ اروِن نے اُس بیانِ ابتدائی میں قرار دیا تھا جو انھوں نے قانونِ حکومت ہند ۱۹۱۹ء کی وضاحت کے لئے شائع کیا تھا۔ ہندوستان کی آئینی تاریخ ایسی اصلاحات سے بھری پڑی ہے جو اس منزل تک پہنچانے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ لیکن کیا ہندوستان کی قومی بیداری کا وہ طوفان جو فطری حالات سے پیدا ہو کر موجیں مار رہا ہے، محض درجۂ نوآبادیات کی تسلی سے دھیما پڑ سکتا ہے؟ وہ قوتیں جو برطانیہ اور ہندوستان کو متحد کئے ہوئے ہیں یقیناً کمزور ہیں، ان قوتوں کے مقابلہ میں جو برطانیہ اور دوسری نوآبادیات کی باہم شیرازہ بندی کر رہی ہیں۔ تاریخی روایات، جذبات کی ہم آہنگی اور اختلافِ نظریہ کی خلیج بہت وسیع ہے عوام کے بہت بڑے حصہ اور خصوصاً روشن خیال طبقہ میں یہ میلانِ طبع یکسر ناپید ہے، اور اس معاملۂ خاص میں اہل الرائے کے وزن اور وقعت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ان ہی میں سے اکثر عوام کی رہنمائی کرنے والے پیدا ہوتے ہیں۔ خود ہندوستان کی ایک مخصوص تہذیبی قومیت کی تعمیر ہو چکی ہے جو اپنی قوت میں آئرلینڈ اور جنوبی افریقہ سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ تہذیب ان صدیوں کی گود میں پلی ہے جو ہندوستان کے مختلف قسم کے باشندوں کو اس ملک میں رہتے گذریں اور صدہا برس کی روایات نے اس پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ اور ہرچند کہ اس میں مغربی تہذیب سے دوچار ہونے

کے باعث، بہت بڑی بڑی تبدیلیاں ہوگئی ہیں، لیکن اب بھی ہندوستان اور مغربی تہذیبوں کے اختلاف کافی نمایاں ہیں۔ برطانوی جمہوریت کے پُرجوش حامی یہی کہتے رہے اور اب بھی کہتے ہیں کہ جمہوریت پر باہم ایمان لے آنا ہندوستان اور برطانیہ کو متحد کر دیگا۔ مگر یہ دلیل اب وزنی نہیں ہے۔ خود جمہوریت کی ایک مخصوص صورت ہے جس میں وہ جلوہ فرما ہوتی ہے، اور برطانوی جمہوریت ہندوستانی روشن خیال طبقہ کے دل کو ہمیشہ نہیں لُبھا سکتی۔ محض اپنے سامراجی خط و خال کی وجہ سے۔ ناانصافی ہوگی اگر اس ضمن میں برطانیہ کے جمہوری اداروں اور روایات آزادی کی تعریف نہ کی جائے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ حقیقی جمہوری روایات کو اس نے دوسرے نوآبادیات سے قطع نظر۔ کم از کم اپنے وابستہ ملکوں کے طرز عمل میں کبھی روا نہیں رکھا۔ دنیا کے دوسرے وسیع مسائل میں بھی ہندوستانی تاثرات نے ہمیشہ برطانیہ کی حکمت عملی کا ساتھ نہیں دیا۔ پس معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ہندوستان اور برطانیہ کے نظریوں میں اختلاف، سیاست کے بنیادی اصولوں کے سبب سے ہے۔

اقتصادی اور سیاسی حالات نے ہمیشہ ان ملکوں کے تعلقات کو متعین کر کے گویا ان کی حد بندی کی ہے۔ کوئی ملک اپنے حقوق کو فرضی اصولوں پر بھینٹ چڑھانا زیادہ دنوں تک گوارا نہیں کرے گا اور نہ اس مطمح نظر میں زیادہ عرصہ تک کوئی کشش باقی رہتی ہے جو قیام اتحاد کے لئے بنایا گیا ہو۔ جب لوگ برطانیہ سے نکل کر کنیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ تجارت کی غرض سے روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت اُن کے مادری ملکوں کے حقوق میں کوئی تصادم نہ ہوا، مگر اُن کے نوآبادیات میں بس جانے کے بعد حالات بدلتے گئے۔ برطانیہ سے مقابلہ کی وجہ سے ان نوآبادیوں میں ایک قسم کا اقتصادی جذبۂ قومیت پیدا ہوگیا جس نے اپنے آپ کو حکومت خود اختیاری یا آزادی کے مطالبہ کی صورت میں پیش کیا۔ اقتصادی جذبۂ قومیت ہندوستان میں بھی اسی طرح حقوق کے تصادم سے پیدا ہوا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک ناقابلِ انکار اور ساتھ ہی ساتھ افسوسناک واقعہ بھی ہے کہ یورپی تاجروں نے اپنی تجارتی

اغراض کی خاطر ہندوستان کو سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے بڑی حد تک جان بوجھ کر پامال کیا۔ مگر یہ یورپی ہندوستان میں اور نوآبادیات کی طرح رہ نہیں پڑے یعنی وہ ہندوستانی نہیں بنے نہ بننا چاہتے تھے۔ برطانیہ اور ہندوستان کا تعلق تاجر اور گاہک کا تعلق رہا، اور دو صدیوں تک رشتہ کی یہی صورت موجودہ زمانہ کے لگ بھگ باقی رہی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور برطانیہ کے اقتصادی مسائل میں کبھی باہم مماثلت پیدا نہ ہو سکی۔ اور معاملات کا تصادم اب بھی اپنی جگہ قائم ہے گو اس کا زور کچھ کم ہو گیا ہے۔ بلاشبہ حالات کے اسی پہلو نے خود اختیاری حکومت کی اس تحریک کو وہ جارحانہ قومی رنگ بخشا ہے جس میں ہمیں وہ آج نظر آتی ہے۔

حالات کی کشمکش کا یہ عالم ہونے کے باوجود بہت سے لوگوں کے خیال کے مطابق سلطنت کی محافظت ہندوستان کے لئے بے انتہا ضروری ہے اور یہاں اسی وجہ سے ڈومینین درجہ کی صورت میں صرف داخلی اختیارات کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اگر خاص عملی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں سلطنتِ برطانیہ میں رہ کر حکومت خود اختیاری قبول کر لینا سب سے بڑی مصلحتِ وقت نظر آتی ہے۔ ہندوستان کا سلطنتِ برطانیہ سے تعلق جاری رکھنا باوجود اپنی خامیوں اور محدود فائدہ کے اپنے اندر چند بڑے بڑے نفع رساں امکانات بھی رکھتا ہے۔ بین الاقوامی لاحکومیت کے اس دور میں کسی بڑی طاقت سے قریبی نسبت خود ایک بڑا بے بہا سہارا ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی کمزوری اس کا جغرافیائی لحاظ سے ایسی جگہ واقع ہونا جہاں سے حملہ آسانی سے ممکن ہے اور خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ دوسری سامراجی قوتیں ہندوستان کے مغرب اور مشرق دونوں جانب اپنے پنجۂ آز کو برابر دراز کر رہی ہیں۔ شاید طاقتور فوجی حفاظت کا طالب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سوال کیا جائے کہ اپنی کمزوری میں خود ہندوستان کا کیا قصور ہے؟ مگر یہاں ہمیں مسئلہ کے اس پہلو سے کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر سے

برطانیہ کی محافظت یہاں کے معقول اور امن پسند باشندوں کے لئے بڑی نعمت ہوگی۔ اور چونکہ ڈومینینی درجہ عملی حیثیت سے کافی لچکدار ثابت ہوچکا ہے لہذا کوئی وجہ نہیں کہ قومی جذبات کی بےچینی کو اس سے تسلی نہ ہو۔ قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈومینینی درجہ کے ماتحت ہندوستانی حکومت دوسری نوآبادیات کی طرح اپنے مطالبات اور ضروریات میں آہستہ آہستہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔

ہندوستان کو خود مختارانہ حکومت دینے کی جو کارروائیاں کی جارہی ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی رفتار بہت سست ہے حالانکہ سرکاری اعلانات اور وعدوں کے ذریعہ ہندوستان کا مقصد ڈومینینی درجہ بہت دفعہ قرار دیا جاچکا ہے۔ مگر شاید ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ جب کسی قوم کی قسمت کا فیصلہ دوسری قوم کے ہاتھ میں ہو تو ایسی صورت میں موخرالذکر سے جو حقوق خود اختیاری آئینی قوانین کے ذریعہ ملتے ہیں، قدرتی طور پر اس "فیاضانہ لطف و کرم" کی بخشش بہت آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ لمبی لمبی کانفرنسوں، معاہدوں اور اعلانات کا صبر آزما سلسلہ جو ایک صدی سے جاری تھا آخر اب جاکر قانونِ حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی صورت میں رونما ہوا ہے۔ اس وقت دستوری مسئلہ سے قطع نظر کرکے کہنا صرف یہ ہے کہ "ہندوستانی ہوم رول کے ایک قدم" کے لحاظ سے یہ قانون پچھلے قوانین سے کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھتا۔ بیرونی معاملات اور دفاع جس نے مالیہ کا ایک بہت بڑا حصّہ ہضم کرلیا ہے، محض محفوظ موضوعات کے لئے علحدہ رکھ لئے گئے ہیں اور ملک کے قدامت پرستانہ اور جاگیردارانہ عناصر کی آواز مجالسِ قانون ساز میں غیر ضروری طور پر بڑھادی گئی ہے۔ سیاست دانی کی ان شوخیوں کو دیکھ کر کبھی کبھی تو یہ خیال آتا ہے کہ کہیں ان حالات میں جمہوری خود اختیارانہ حکومت بالکل ناممکن الوقوع ہوکر تو نہیں رہ گئی؟ اس قانون نے بےاطمینانی کی ایک عام لہر ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک دوڑا دی تھی، یہاں تک کہ لبرل جماعت بھی جس کی ڈومینینی درجہ کے لئے حمایت، اب روائتی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔

اس سے خوش نہیں ان حالات میں قدرتی طور پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کو اس نصب العین تک پہنچنے کی، جس کا باضابطہ اعلان برابر ہوتا رہا ہے، کبھی اجازت دی بھی جائے گی یا یہ طفل تسلیاں یوں ہی جاری رہیں گی؟

ہندوستان اور سلطنتِ برطانیہ کا مسئلہ موجودہ آئینی مباحث کے دوران میں پھر اٹھا ہے۔ ہندوستان کی لبرل جماعت کی طاقت اور اثر اب کم ہو چکا ہے اور انتہا پسند عناصر پیدا ہو کر مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں، اور برطانوی تعلقات کے بالکل منقطع ہو جانے کا دوسرا نام مکمل آزادی ہے۔

آزادی کی یہ تحریک نتیجہ ہے اس زبردست اور جارحانہ جذبۂ قومیت کا جو معاشی اور تہذیبی دونوں اثرات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس کے پردے میں بڑی بڑی نفسیاتی قوتیں کارفرما ہیں۔ اور اس کو تقویت اِس رَدِ عمل سے ہوئی جو آئینی اصلاحات کی اس "آہستہ خرام بلکہ مخرام" جیسی رفتار، اور شہنشاہی پارلیمان کا اپنے اختیارات تفویض کرنے میں تامل کے باعث پیدا ہو چکا ہے۔

لیکن کیا موجودہ حالت میں ہندوستان کے لئے مکمل آزادی عملی حیثیت سے سودمند ثابت ہو گی؟ شاید اس سوال پر انتہا پسند طبقے نے اس توجہ سے غور وخوض نہیں کیا ہے، جس کا یہ مستحق ہے۔ مگر کہا یہ جا سکتا ہے کہ سیاست میں عملیت ہی ہمیشہ فیصلہ کن عنصر نہیں ہوتی اور سیاسی تحریکوں کی رہنمائی تو اکثر ایسی تصوریت سے ہوا کی ہے جس میں مشکل سے عملی حیثیت پائی جاتی ہے۔ شہنشاہی تعلقات سے علیحدگی کے یہ معنی ہوں گے کہ ملک کو بڑے خطروں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہندوستان کی کمزوری، اس کا بے موقع محل وقوع، اس کا فرقہ وارانہ مسئلہ۔ ملک کی یہ سب دشواریاں ایسی ہیں جن کی نوعیت دوسرے ممالک کے مسائل سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اِن دشواریوں، اور کچھ ان حالات نے جو اِن سے کم نمایاں اور اہم ہیں، بعض لوگوں کو یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ حکومت خود اختیاری کو

نصب العین قرار دینا بھی ہندوستان کے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔ بعض حلقوں میں حکومت خود اختیاری کو "ہندوستان کے وسیع اور تیح میل برّ اعظم" کے لئے ناموزوں قرار دیا گیا ہے اور ڈومینین درجہ کے وعدہ کو "جنگ کا نامعقول پروپگنڈا" بتاکر ملامت کی جاتی ہے، کیونکہ جنگ ہی کے زمانہ میں حکومت خود اختیاری ہندوستان کا مطمع نظر تجویز کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے پیچیدہ مسائل کی نزاکت کو کم یا نظر انداز ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسا ہوا ہے کہ اُن ممالک نے جو اسی نوعیت کے مسائل میں مُبتلا تھے، حکومت خود اختیاری یا آزادی حاصل کی ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس آزادی کی کوشش کو برقرار رکھنے کی کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان گوناگوں اور مختلف النوع حالات کے باوجود جو ہندوستانی زندگی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، قومی آزادی کی طرف تحریک اُٹھ اور پھیل چکی ہے۔ نوآبادیات کے تجربہ کو سامنے رکھ کر یہ مان لینا نامناسب نہیں کہ ہندوستان کے مخصوص مسائل، مثلاً ملک کی بے طاقتی، حکومتِ خود اختیاری کے زیر سایہ خود بخود رفع ہو جائیں گے۔ رہا فرقہ وارانہ مسئلہ، سو اس کے متعلق حالات کو دیکھتے ہوئے یہ توقع قائم کی جاسکتی ہے کہ جب آئینی مسئلہ تسلی بخش طور پر حل ہو جائے گا تو موجودہ لڑائیاں اور تلخیاں خود بخود جاتی رہیں گی، جس طرح دوسرے نوآبادیات، مثلاً کنیڈا یا جنوبی افریقہ میں ہوا ہے، اگر یہ ممکن ہے کہ اپنی اہمیت اور اثر اندازی میں وہ اس حد تک نہ پہنچا ہو۔

ہندوستان کے لبرلوں کا اثر کم ہو جانے سے ڈومینین درجہ کا مرتبہ ہندوستانی سیاست میں بہت گر گیا ہے۔ اب تحریک آزادی ہندوستان میں ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ قومی رہنما مکمل آزادی کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال کہتے ہیں کہ "ہم صرف ایک نیا نظام حکومت ہی نہیں چاہتے بلکہ ہم ایک نئی ریاست کے طالب ہیں"۔ اس نظریہ کے مختلف پہلو نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔ ہندوستان کی پست حالی قومی اصلاحی توانین چاہتی ہے تاکہ یہ ملک بھی دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہو سکے

قدامت پسندانہ اور رجعت پسند قوتیں اب تک اپنا کام کر رہی ہیں اور پہلے کی طرح آج بھی ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں پوری طرح حائل ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کی اثریت اس بیسویں صدی کے ہندوستان میں بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ مسلط ہے۔ قومی تحریک ان رکاوٹوں کی مخالف سمت میں اپنی راہ بنا کر اپنے آپ کو پھیلا رہی ہے۔ ہندوستان کا بنیادی مسئلہ یہاں کے فاقہ اور افلاس کا مسئلہ ہے جس میں ملک کے کروڑوں انسانوں کی معاشی زبوں حالی اور بے چینی کا راز پنہاں ہے۔ ہمارے ملک کا موجودہ نظام اس مسئلہ کے پیدا کرنے کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ ہمیں شاید ملک کی اقتصادی اور سماجی ترقی کے لئے ہندوستانی سماج کے ڈھانچہ کی نئے سرے سے تعمیر کرنا ہوگی۔ اس سلسلہ میں "بائیں بازو" کے عقیدہ کے حالات بھی قابل غور ہیں۔ اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اقتصادی اور سماجی آزادی کی اہمیت کسی طرح سیاسی آزادی سے کم نہیں۔ ملک کے معتدل اور صلح پسند عناصر اب تک شہنشاہی پارلیمان کی آئینی کارروائی کی نگاہِ سلطنت کے امیدوار ہندوستان کی خرابیوں کے رفع ہو جانے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ مگر جب حالات ایسے ناگفتہ بہ اور بیماریاں ایسی شدید ہوں تو کیا صرف اس نوع کا اقدام ہی اس کے جلد اور مؤثر علاج کے لئے کافی ہوگا؟ اب تو ضرورت اس کی ہے کہ شدید اصلاحی قوانین کو بروئے کار لایا جائے۔ اس کے لئے کم از کم مکمل داخلی حکومت خود اختیاری کی ضرورت ہوگی۔ ہندوستانی سیاست اور برطانیہ کے مابین مصالحت کی کوئی امید نظر نہیں آتی جب تک کہ حکومتِ خود اختیاری کے حق کو تسلیم نہ کر لیا جائے اور ہندوستان کو اس کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ اپنے خانگی مسائل کی گتھیاں خود سلجھا سکے۔ اس مقصد کے لئے بلاشبہ برطانیہ کو بادی قربانیاں کرنا پڑیں گی اور ہو سکتا ہے کہ برطانوی جمہوریت کو اپنے سرمایہ دارانہ انداز کے تبدیل کرنے کی ضرورت پڑے آج سامراجی طرزِ عمل کو ختم کرنے کے لئے جو آواز اٹھائی جا رہی ہے اس میں بہت کچھ اصلیت پنہاں ہے جب تک ایسا نہ ہو، دولت مشترکہ کے پاکیزہ مقصد اور بلند حوصلہ کی گفتگو خیال پرستوں کی سزا تصور کی جائے گی یا سامراجی پروپاگنڈا، جس کا طلسم کم ہو جانے کے باوجود اب بھی کچھ نہ کچھ ملک کی فضا پر طاری ہے!

مقبول الرحمن بی۔ اے (آنرز)

افلاطون کی ریاست
اور
اُس کا نظامِ تعلیم

انسانی زندگی بہر پہلو عمل اور ردِ عمل کا ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے۔ یہی زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ زندگی سے کتنا ہی دور یا کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو، کار فرما نظر آتی ہے۔ تعلیمی دنیا کا قانون بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یونان کی تاریخ تعلیم کا جس مرکز سے آغاز ہوتا ہے وہاں سے ہم ہمیشہ عمل اور ردِ عمل کی قوتوں کو زندہ و متحرک دیکھتے ہیں۔ اہلِ اسپارٹا اپنی سیاسی ضروریات کی بنا پر مجبور تھے کہ وہ اپنے ہر فرد کو ریاست کے مفاد کا ذریعہ کار بنائیں۔ خود اہلِ اسپارٹا تعداد میں نو ہزار تھے لیکن انہیں دو سو پچاس ہزار غلام رعایا پر حکومت کا جوا سنبھالے رکھنا تھا اس لئے کوئی تعجب نہیں جو وہ اپنی عورتوں کو بھی اس جسمانی ورزش کے لئے مجبور کرتے تھے جو مردوں کے لئے مقرر تھی، بچے پیدا ہوتے ہی ریاست کی نگرانی میں دیدئے جاتے تھے اور وہ بچے جن کے جوان ہو کر مضبوط سپاہی بننے میں ذرا بھی شک ہوتا تھا ماؤں کی گود سے چھین کر ہلاک کر دئے جاتے تھے۔ الغرض اہلِ اسپارٹا کی تاریخ تعلیم اول سے آخر تک سماج پر فرد کی قربانی کا ایک افسانہ ہے۔ لیکن جب سماج کی جکڑبندیاں برداشت سے زیادہ صبر آزما ثابت ہوئیں تو ایک قوت نے مخالف رخ میں کام کرنا شروع کر دیا اور یہ قوت انفرادیت کی قوت تھی۔ انفرادیت اہلِ ایتھنز کے زیرِ سایہ پھلی پھولی لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ انفرادیت بھی اسی قدر تکلیف دہ ایک قوت بن گئی جس قدر کبھی سماجیت تھی۔ سوفسطائی پیدا ہوئے جنھوں نے فرد کو ہر چیز کا پیمانہ قرار دیا — دنیا کا پیمانہ بھی اور عقبیٰ کا پیمانہ بھی۔ یہ اصول اپنی جگہ بُرا نہیں لیکن رفتہ رفتہ انفرادیت نے اس شرابی کی حیثیت اختیار کر لی جس کا ہر قدم بہکا ہوا

پڑتا ہے۔ انفرادیت کا پیمانہ بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھ گیا کہ اس میں ہر چیز غرق ہو کر رہ گئی۔ سوفسطائی جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ زمانہ خود ان کے لئے سازگار تھا۔ عہد جدید کے ایتھنز میں جمہوری رجحاناتِ کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ قریب کے ممالک سے ربط و ضبط سیاسی اور تجارتی معاملات میں وسعت پیدا کر چکا تھا۔ نئے زمانے کے نئے طور طریقے تھے اور نئی رسوم و روایات۔ دیوتاؤں کے قصے کہانیوں کے حادثات فطرت کو علمی نقطۂ نظر سے واضح کرنے کی کوشش ہونے لگی تھی۔ فلسفہ بھی فطرت سے زیادہ اب انسان کی قدر و قیمت پر روشنی ڈالنے لگا تھا۔ اسی طرح شعر و ادب میں بھی نادیدہ دیویوں دیوتاؤں کی جگہ انسان اور انسان کی زندگی کو ملی اور تقدیر سے زیادہ تدبیر پر زور دیا جانے لگا۔ قدامت پسند یونانی ان نئے سماجی رجحانات کو "انفرادیت کا جنون" کہتے تھے اور ارسٹافینز کے الفاظ میں اسی انفرادیت کے خبط نے ان کے بچوں کو ناپاک، عورتوں کو ایک مستقل عذاب، شوہروں کو نافرض شناس اور غلاموں کو کاہل بنا دیا تھا۔ سوفسطائی سیر و سیاحت کی بدولت عام یونانیوں سے ذرا زیادہ جہاندیدہ واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے نیک نیتی کے ساتھ ایتھنز کے نوجوانوں کو بدلتی ہوئی دنیا کے دوش بدوش چلنے کے قابل بنانا چاہا۔ لیکن جیسا کہ کسی کا قول ہے۔ "ہمارے سب سے زیادہ معصوم ارادے ہی بعض وقت ہمارے سب سے زیادہ مکروہ گناہ ثابت ہوتے ہیں" سوفسطائی بھی بہت جلد اپنے مقصد سے دور جا پڑے۔ تعلیم یونانیوں کے لئے محض ایک شغل فرصت تھی۔ سوفسطائیوں نے سب سے پہلے اسے افادی رنگ میں دیکھنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ورزشیں جن سے کبھی قوت اور صحت مقصود تھی جسمانی ساخت میں محض جمالیاتی اضافوں کا ذریعہ بن گئی۔ اور اس لئے وہ یونانی نوجوان جو کبھی پگھلی ہوئی برف کے چشموں میں کود پڑتے تھے گرم پانی سے غسل کرنے کے شائق ہو گئے۔ شعر و ادب میں جو اب تک مذہب و اخلاق کا دستور سمجھا جاتا تھا۔ قوس قزح کی رنگینیوں کا اضافہ ہوا۔ موسیقی جو کبھی جزو عبادت تھی نشاطی پہلو اختیار کر کے یکسر جذبات کی بجلی بن گئی۔ رقص جو کبھی صرف دیوتاؤں کو محظوظ کرنے کا ذریعہ تھا انسان کے لئے بھی جنت نگاہ بن گیا اور لائرد   امیں جس میں پہلے صرف سات تار ہوا کرتے تھے آٹھواں تار لگایا گیا۔ الغرض پہلے جہاں صرف آسمان کا ذکر تھا اب اس کے ساتھ زمین کا ذکر بھی آیا۔ پہلے جہاں

صرف دیوتا ہی دیوتا نظر آتے تھے۔ اب وہاں انسان کو بھی اذن باریابی نصیب ہوا اور پہلے جہاں دین ہی دین تھا وہاں دنیا کو بھی جگہ ملنے کا مستحق سمجھا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ علم اور علم دانی جو کبھی یونانیوں کے یہاں پختہ ذہنی کے معیار پر پرکھی جاتی تھی اب محدود ہو گئی خطابت کے ظاہری شور وغل تک اور ناقص منطق کی آڑ میں ایک ہی بات کو کبھی جھوٹ اور کبھی سچ ثابت کرنے تک نتیجہ بقول ارسٹا فینز یہ ہوا کہ یونانی نوجوانوں کے سینے سکڑ گئے اور ان کی زبانیں لمبی ہو گئیں"

انتشار اور تنزل کی اس پھیلی ہوئی موج کی روک تھام کے لئے کچھ مصلح پیدا ہوئے۔ جن میں سے بعض نے قدیم روایات کی طرف واپسی کا اعلان کیا۔ ان میں عموماً وہ امرا یا ان کے نظریات سے اتفاق کرنے والے تھے جنھیں اپنی سلامتی قدامت پرستی ہی میں دکھائی دیتی تھی۔ اور بعض نے اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ سماج آگے بڑھ سکتا ہے پیچھے نہیں ہٹ سکتا اپنا فرض یہ سمجھا کہ موجودہ واقعات و حالات کے ماتحت ہی کوئی ایسا اصلاحی لائحہ عمل تجویز کریں جس میں فرد کی انفرادیت بھی اپنے باثواب مفہوم کے ساتھ زندہ و باقی رہے اور جس میں سماج کے حقوق بھی پامال نہ ہوں یعنی ایسا نظام جس میں فرد سماج کا محافظ بن سکے اور ساتھ ہی ساتھ سماج فرد کی علو و ترقی کا ضامن قرار دیا جا سکے۔ انہیں مصلحان میں سے ایک زندۂ جاوید مصلح فلاطون بھی تھا۔

فلاطون ایک خیالی ریاست کی تخلیق کر کے یہ تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ سماج میں عدل کی کیسا حقیقت ہے اور یہ کہ عدل پر مبنی کسی نظام حکومت کی کیا نوعیت ہو گی اور اس ریاست کے مقاصد کی حصول یابی میں تعلیم کہاں کہاں کام آ سکتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے اس ریاست میں اس کا مقصود منشا یہ تھا کہ وہ فرد کی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر اس سے وہ کام لے جو فرد کے لئے عرفان خودی کا درجہ رکھے اور سماج کے لئے بھی باعث منفعت ہو۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے فلاطون نے جو نظام تعلیم تجویز کیا ہے وہ آج تک اپنی مثال آپ ہے۔ روسو کے الفاظ ہیں "اگر تم یہ معلوم کرنا چاہو کہ عوام کی تعلیم سے کیا مراد ہے تو فلاطون کی ریاست' پڑھو۔ وہ لوگ جو کتابوں کے عنوان سے کتابوں کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں اسے سیاسی کتابچہ

سمجھیں گے لیکن یہ تعلیم کے متعلق بہترین رسالہ ہے جو اب تک لکھا گیا ہے" فلاطون کی "ریاست" میں باضابطہ تعلیم سات سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے۔ سات سال تک بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ان کی مائیں اور آیائیں ہیں۔ فلاطون کے نزدیک تعلیم زیادہ کم عمری میں شروع نہیں ہو سکتی حالانکہ وہ بچے کے نرم دماغ پر اولیں ارتسامات کی اہمیت سے بے خبر نہیں ہے۔ اسی لئے اس نے ماؤں اور آیاؤں کو ہدایت کی ہے کہ وہ بچوں کو ابتدا ہی سے ایسی کہانیاں سنائیں جو اچھا اخلاق پیش کرتی ہوں کہانیاں ایسی ہوں جن سے بچے یہ سبق تو لیں کہ خدا صرف ان چیزوں کا خالق ہے جو اچھی ہیں نہ کہ ان چیزوں کا بھی جو بُری ہیں اور ایسی کہانیاں تو ہوں جو بچوں کو یہ تو سکھائیں کہ دیوی دیوتا انسان کے ہمدرد ہیں نہ یہ کہ وہ بھیس بدل بدل کر انسانوں کو ستانے میں کوئی مزا لیتے ہیں۔ مذہبی کہانیوں کے علاوہ بہادری اور شجاعت کی ایسی کہانیاں بھی سنائی جائیں جو بچوں میں موت سے بھی زیادہ غلامی کیلئے نفرت پیدا کریں۔ الغرض بچوں کے سامنے کوئی ایسی مثال عمل کی یا خیال کی پیش نہیں کرنی چاہیے جس سے یہ ظاہر ہو کہ دنیا میں کبھی شریر قسم کے لوگ بھی خوش رہ سکتے ہیں یا زندگی میں فریب کاری بھی کبھی کامیاب ثابت ہو سکتی ہے (آگے چل کر ادب میں یہی چیز 'عدل شعری' کا اصول بن گئی)

باضابطہ تعلیم سات سال سے شروع ہو کر سولہ یا سترہ سال کی عمر پر اپنی پہلی منزل پوری کرتی ہے۔ اس ابتدائی تعلیم میں تمام تر زور ورزش اور موسیقی پر دیا گیا ہے۔ ورزش کا مقصد جسمانی نشوونما اور موسیقی کا مدعا روحانی بالیدگی سمجھا جاتا ہے۔ موسیقی کے باب میں فلاطون کے لئے آرٹ برائے آرٹ والا تخیل کسی حد تک بھی قابل قبول نہیں۔ چنانچہ موسیقی میں ایسی راگ راگنیوں کو کوئی دخل نہ ہونا چاہیے جو جذبات کے نسائی حد تک نرم و نازک پہلو کو چھو سکیں۔ بلکہ صرف وہ راگ اور گیت شامل ہیں جو انسان کو متحمل مزاج اور شجیع بنائیں۔ اسی طرح جسمانی ورزش کی ساری غرض و غایت موسیقی کے ساتھ ساتھ روحانی تشکیل ہے۔ ورزش اور موسیقی کے علاوہ اگر کوئی بچہ ضرورت محسوس کرتا ہے تو اسے ریاضی اور ہندسہ وغیرہ جیسی چیزوں سے بھی روشناس کرا دیا جاتا ہے لیکن وہ بھی کسی دنیاوی فائدے کے لئے نہیں کیونکہ فلاطون کے یہاں تمام مفید ہنر سرے سے ذلیل سمجھے جاتے ہیں۔"

اس ابتدائی تعلیم کے دوران میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کون سے بچے تعلیم کی ابتدائی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور کون کون سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ جو بچے آگے نہیں بڑھ سکتے ان کی تعلیم یہیں ختم کر دی جاتی ہے اور ان کا کام زندگی میں تجارت کر کے اہل ریاست کو روزانہ کی ضروریات پوری کرنے میں سہولت بہم پہونچانا ہے۔ جو بچے آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں انہیں تین سال کی تعلیم کا اور موقع دیا جاتا ہے۔ یہ تعلیم اپنی نوعیت میں بیشتر فوجی تعلیم ہوتی ہے۔ اس تین سال کے عرصہ میں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ کون کون سے طلبہ جسمانی فعالی کی طرف زیادہ راغب ہیں اور کون کون سے ذہنی فعالی کی جانب۔ جو جسمانی اعتبار سے ریاست کے حق میں زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں انہیں سپاہی بنا کر ریاست کا تحفظ ان کا سب سے بڑا فرض قرار دیا جاتا ہے۔ اور جو طلبہ ذہنی معاملات میں غیر معمولی فراست دکھاتے ہیں ان کے لئے اعلیٰ تعلیم تجویز کی جاتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی منزل ۲۰ سال سے ۳۰ سال تک کے لئے مقرر ہے۔ اس منزل میں ریاضی، ہندسہ موسیقی اور فلکیات داخل نصاب ہیں۔ لیکن ان مضامین کا وہ مقصد و منشا افلاطون کے پیش نظر نہیں تھا جس کے آج ہم قائل ہیں۔ ریاضی کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کے دماغ میں قوت استدلال کی نشو ونما کرے افلاطون کے نزدیک اعداد و شمار انسان کو مادیت سے ہٹا کر روحانی دنیا تک پہونچا دینے والے زینے ہیں "مابعد الطبیعات کا راستہ ریاضی سے ہو کر ہے" وہ ریاضی کا اس قدر قائل تھا کہ ایک جگہ ریاست میں پوچھتا ہے۔ "کیا تم نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ جو حساب دانی کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں ہر قسم کے علم میں تیز ثابت ہوتے ہیں اور کند ذہن بھی ریاضی سیکھنے کے بعد اگر کوئی خاص فائدہ اس سے نہیں اٹھا سکتے تو پہلے کی نسبت کچھ تیز ضرور ہو جاتے ہیں" علم ہندسہ بھی عملی زندگی سے قطع نظر مختلف اشکال کا باہمی تعلق سمجھنے اور ذہن کو مادی اشیاء کی سطح سے بلند کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اشکال پر غور کرتے کرتے افلاطون جس نتیجے پر پہونچا تھا یہ تھا کہ دائرہ ہی فطرت کی سب سے مکمل شکل ہے اور اس لئے اجسام فلکی بھی دائرے میں گردش کرتے ہیں اجسام فلکی کی گردش کے متعلق افلاطون نے اس عقیدے کو اس قدر استحکام دیدیا تھا کہ اسے غلط ثابت کرنے کے لئے دو سو برس بعد کیپلر کی ضرورت پڑی تھی۔ ہندسے

کی اس روحانی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باعث ہی فلاطون نے اپنی اکادمی (قائم کردہ ۳۸۷ ق.م) کے دروازے پر یہ الفاظ کندہ کرائے تھے: "جو کوئی علم ہندسے سے واقف نہ ہو وہ اندر نہ داخل ہو"

فلکیات کا مقصد بھی کچھ اس سے ملتا جلتا تھا اور موسیقی کے متعلق تو اس کے یہ الفاظ "انسان کو زندگی کے ہر شعبے میں ہم آہنگی اور ترنم کی ضرورت ہے" ہر شخص جانتا ہے فی الحقیقت فلاطون کے یہاں موسیقی کا زیادہ تعلق ریاضی کے اصولوں سے ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی اس منزل کے بعد پھر ایک انتخاب کیا جاتا ہے اور ان طلبہ کو جو ان نظری علوم کی حدود سے آگے بڑھ کر ما بعد الطبیعات کے معاملات پر غور و فکر کے اہل ثابت نہیں ہوتے سماج میں کچھ ذمہ داریاں دے کر ان کی تعلیم یہیں ختم کر دی جاتی ہے۔ باقی ماندہ طلبہ کو پانچ سال کے لئے تصورات کے سمجھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

فلاطون کا خیال تھا کہ ہر وہ چیز جسے ہم مادی شکل و صورت میں دیکھتے ہیں اپنا غیر فانی اور روحانی اصل Pattern رکھتی ہے اور اگر علم کا کوئی مقصد ہے تو یہ کہ وہ انسان کے دماغ کی نشو و نما کر کے اسے مجاز سے حقیقت کی طرف لے جائے۔ فلاطون کے نظریۂ تصورات کو مندرجہ ذیل شکل سے اور زیادہ واضح کیا جا سکتا ہے
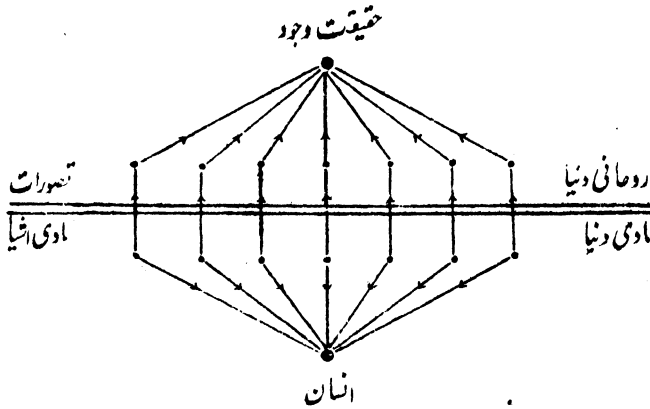
فلاطون کے خیال کے مطابق تصورات سے قریب تر ہو جانے کا نام حقیقی علم ہے۔ جو طلبہ تعلیم کے اس درجے کو پہونچتے ہیں وہ فلسفی شمار کئے جاتے ہیں گویا فلاطون کے نزدیک انسان جلوۂ حقیقت

اپنے اندر لیکر پیدا ہوتا ہے لیکن پیدائش کے وقت یہ جلوہ حجاب در حجاب ہوتا ہے اور تعلیم کا کام انھیں حجابات کو اٹھانا ہے۔ انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ولیم ورڈسورتھ کی مشہور نظم Ode on Intimations of Immortality کے اس مصرعے میں۔

"Our birth is a sleep and a forgetting"

فلاطون کے نظریے کی متضاد صورت نظر آئے گی۔ مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ اگر فلاطون تجربات اور علم کے ذریعے انسانی عقل و فکر کی بیداری کا قائل تھا تو ورڈسورتھ نے اس زندانِ آب و گل کو ایک دائمی مجلس سے سوا کوئی حیثیت نہ دی جہاں انسان اپنے روحانی مرکز سے دور ہوتے ہوتے یکسر تاریکیوں میں کھو جاتا ہے۔ فلاطون کا فلسفی ۳۵ سال کی عمر پوری کرنے کے بعد سماج میں واپس آتا ہے اور اس لئے کہ سماج کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے۔ ۱۵ سال تک سماج کو بہتر بنانے کی سعی و کاوش کے بعد پچاس سال کی عمر پر فلاطون کے فلسفی حکمران کو اجازت ہوتی تھی کہ وہ ریاست کے فرائض سے عہدہ برا ہو کر اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن حقیقت وجود پر غور و خوض کرنے میں سکون کے ساتھ گذار دے۔

فلاطون کے مجوزہ نظام تعلیم کی داد ہمیشہ دیجاتی رہی ہے اور دیجاتی رہے گی۔ اس نظام تعلیم کے ماتحت فرد کی انفرادیت اپنی جگہ باقی رہتی ہے اور وہ اس طرح کہ جو شخص فطرت سے جس کام کی صلاحیت لیکر پیدا ہوا ہے اس سے سماج میں وہی خدمت لی جائے گی اور اسے تعلیم بھی وہ ہی دی جائیگی جو اس کے حیطۂ فہم و عمل سے باہر نہ ہو۔ اہل مغرب تو روز بروز اپنی تعلیم میں اس اصول پر کاربند ہوتے جاتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ہماری تباہی اور بیکاری کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے تصور کر لیا ہے کہ ہر شخص ہر کام کر سکتا ہے حالانکہ نہ عقل اس کو تسلیم کرتی ہے اور نہ واقعات و تجربات اس کے امکانات کی شہادت دیتے ہیں۔ اسی بنا پر ڈیوی صاحب کا فلاطون کے اصول کے متعلق یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ "تعلیم کے مقاصد کے معانی اس سے زیادہ گہرے معلوم کرنا مشکل ہوں گے کہ فرد کی صلاحیتوں کو دریافت کیا جائے ان صلاحیتوں کی نشو و نما کی جائے اور انھیں اس طرح تربیت دیجائے کہ ان کا تعلق دوسروں کے اعمال و افعال سے بخوبی ہو سکے۔"

فرد کی انفرادیت کو باقی رکھنے کے ساتھ ساتھ سماج کی حیات و بقا کے لئے تعلیم اور علم کو زندگی سے الگ نہیں کیا۔ بلکہ ایک مفہوم میں سماج کی خدمت اور اعلیٰ اخلاق کو تحصیل علم ہی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ۳۵ سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہمارا فلسفی خود کو سماج سے بے نیاز کر کے گوشہ نشینی اختیار نہیں کرتا بلکہ وہ سماج کا حکمراں بن کر سماج کی رہنمائی کا ذمہ دار بنتا ہے اور اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "افلاطون کے یہاں یونانی زندگی ظاہری حسن سے ترقی کر کے اخلاقی یا روحانی حسن کی طرف بڑھتی ہے" گویا انسان ایک تاریک غار میں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ غار سے باہر نکل کر سورج کی روشنی اور صاف ہوا سے لطف اندوز ہوتا ہے تو غار میں جا کر دوسرے ساتھیوں کو بھی باہر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک اور اچھی بات جس کی وجہ سے ہم آج فلاطون کا نام عزت کے ساتھ لیتے ہیں یہ ہے کہ فلاطون نے تعلیمی معاملہ میں مرد اور عورت کو مساوی نظر سے دیکھا۔

"نہ عورت بہ حیثیت عورت اور مرد بہ حیثیت مرد کسی مخصوص صلاحیت کا مالک ہے بلکہ فطرت کے عطیات دونوں کو برابر سے ملے ہیں۔ مرد کے تمام مشاغل میں عورت صرف ایک کمزور مرد ثابت ہوتی ہے"

یہاں افلاطون کی علو حوصلگی کی داد دینے کے لئے ہم اس وقت اور مجبور ہو جاتے ہیں جب یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ افلاطون کے زمانے کی یونانی عورت کی قسمت سے تعلیم کی نعمت خارج کر چکے تھے۔ اہل اسپارٹا اس لحاظ سے کہ ان کی مائیں تندرست بچے پیدا کریں اپنی عورتوں کو جسمانی ورزش میں ضرور شریک کرتے تھے لیکن ایتھنز میں جہاں تعلیم نے اپنی تاریخ کا سب سے پہلا قابل ذکر فروغ پایا اس عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جو تعلیم کی شایق و جویا نظر آتی تھی۔

ہمارے نقطۂ نظر سے بھی فلاطون کا عورتوں کے لئے تعلیم ضروری ٹھہرانا مستحسن ہے لیکن شاید ہم عورت کی تعلیم کی نوعیت کو اس معیار سے جانچنا پسند نہ کریں جس سے مردوں کی تعلیم جانچی جاتی ہے اور نہ مرد اور عورت کی تعلیم نوعیت کا ایک ہونا ہی مناسب سمجھیں گے کیونکہ اب بھی بعض اعتبار سے عورت شیکسپیر کے ان الفاظ کا مصداق بنتی ہے۔ "اے عورت تیرا نام ہی کمزوری و نزاکت ہے"

ان تمام خوبیوں کے باوجود فلاطون کے نظام تعلیم کو کبھی عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ کیونکہ نظری طور پر یہ واضح کر دینے کے باوجود کہ سماج اور فرد کا کیا تعلق ہونا چاہئے فلاطون نے علم کو چند منتخب لوگوں تک محدود کر دیا تھا یعنی فلاطون ذہنی مساوات کا کسی حد تک بھی قائل نہیں تھا۔ ہمارے زمانے کی نفسیاتی تحقیق تو کچھ اس حق میں ہے کہ جس طرح پرندوں کے غول میں سب سے آگے یا سب سے پیچھے اڑنے والے پرند بہت کم ہوتے ہیں اور ایک ساتھ اڑنے والے زیادہ اسی طرح انسانوں میں زیادہ تعداد اوسط درجے کے دماغ رکھنے والوں کی ہے۔ اگر اس حقیقت کو کسی شکل سے واضح کریں تو ہمارے خطوط یہ ہونگے
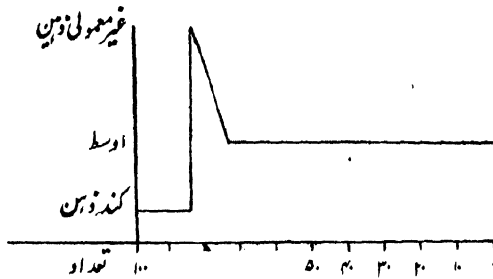
اس حقیقت کی روشنی میں ظاہر ہے کہ فلاطون نے ان چند لوگوں کی تعلیم کا پورا پورا انتظام کیا ہے جو غیر معمولی ذہانت اور فراست کے مالک ہیں اور جو فلسفی کے درجے تک پہونچتے ہیں۔ لیکن اس اکثریت کا کچھ خیال نہیں کیا جو غیر معمولی طور پر ذہین نہ ہونے کے باوجود اوسط یا اوسط درجے سے کچھ زیادہ اچھا ذہن رکھتے ہیں۔

پھر طریقۂ تعلیم بھی کچھ اس طرح کا ہے کہ اس طالب علم کو جو اعلیٰ تعلیم کے لئے جاتا ہے روزمرہ کی زندگی اور سماج سے قطعاً بے تعلق ہو جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ حصول تعلیم کے لئے اسے جس قدر یکسوئی اور غور وفکر کی ضرورت ہے اسے سماج کی عام زندگی برداشت نہیں کر سکتی بالفاظ دیگر ہمیں یہاں طالب علم کی زندگی اور سماج کی اس زندگی کے درمیان جس سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دوچار ہونا ہے وہ دیوار نظر آتی ہے جسے ہمارے عہد میں پروفیسر ڈیوی کی سماجیت (Socialization) والی تحریک نے توڑا ہے۔ فلاطون کا فارغ التحصیل طالب العلم حقیقت کو پہونچا ہوا انسان تو ضرور ہوتا ہے لیکن وہ دوسروں کو عملی زندگی میں حقیقت سے کیونکر قریب تر

کر سکتا ہے؟ اس کا جواب ہمیں فلاطون سے نہیں ملتا۔

ان باتوں کے علاوہ فلاطون نے اس نظام تعلیم کے لئے 'ریاست' میں جو ماحول مرتب کیا ہے اس کے متعلق چند باتیں قابل غور ہیں۔ فلاطون نے اپنی 'ریاست' میں صرف تین جماعتوں کی اجازت دی ہے ــــ تاجر، سپاہی اور فلسفی۔ لیکن ظاہر ہے کہ زندگی کے مشاغل تاجروں، سپاہیوں اور فلسفیوں کے مشاغل پر ہی ختم نہیں ہو جاتے۔ سماجی حیثیت سے قطع نظر نفسیاتی حیثیت سے بھی یہ تقسیم ناقص معلوم ہوتی ہے کیونکہ کسی تاجر کے عقل ہو سکتی ہے اور کوئی فلسفی خواہشات کا غلام بن سکتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ فلاطون کی ریاست ایک غیر متحرک (static) ریاست ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلاطون نے جماعتوں کی تقسیم اس اصول پر کبھی نہیں کی ہے جو آگے چلکر ہمارے ہندو سماج کے لئے زنجیرِ پا بن گیا۔ اس نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ فلسفی کی اولاد ہی سے ممکن ہے بعض بچے باپ کے رتبے کو نہ پہونچ سکیں اور تاجروں یا سپاہیوں کی جماعت میں شامل کئے جائیں یا کسی تاجر کی اولاد غیر معمولی ذہانت کی بنا پر فلسفی کے رتبے کو پہونچے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ایک فرد ایک جماعت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تو اس کی تعلیم اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کے مشاغل زندگی کی تعین کچھ اس سختی کے ساتھ ہوتی ہے کہ فرد کے لئے ذاتی نشو و نما کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس کی بڑی وجہ فی الحقیقت یہ ہے کہ فلاطون ایک نیا نظام تعلیم وضع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ریاست کو اپنے وقت کے یونان سے الگ یا بہتر کوئی چیز نہیں بنا سکا اس میں پس پردہ انہیں قوتوں کی کارفرمائی ہے جو اس عہد کے یونان کی روح رواں تھیں۔ چنانچہ فلاطون کی ریاست میں غلامی بھی روا رکھی گئی ہے اور بچوں کی ہلاکت بھی۔ اس کے علاوہ اگر کہیں اس ریاست نے الگ کوئی راستہ اختیار بھی کیا ہے تو وہ ارتقائی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور ظاہر ہے کہ جہاں دو چیزوں کے درمیان ارتقا کی کڑی موجود نہ ہو وہاں کسی بہتر نتیجہ کی توقع فضول ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ فلاطون کی ریاست میں تعلیم کا مقصد ریاست کو آگے بڑھانے سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ریاست کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھے۔

ریاست کی ایک اور بنیادی خامی یہ ہے کہ اس میں خاندان یا گھر کی زندگی کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی گئی ہے حالانکہ خاندان سماج کا سنگ بنیاد ہے۔ یہی وہ گہوارہ ہے جس میں انسان سب سے پہلے آنکھ

کھولتا ہے اور یہی وہ ادارہ ہے جہاں سب سے پہلے سماجی اقدار وضع وتعین کی جاتی ہیں۔لیکن فلاطون اپنی ریاست کا شیرازہ مضبوط رکھنے کے لئے خاندان کے ہر اثر اور خاندان کی ہر قوت کو نظر انداز کر دینے پر مجبور تھا۔ فلاطون کو ریاست کی بقا کے لئے امتیازات کو حد درجے میکانکی طریقے سے مٹانا ضرور تھا۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی ویرانہ بنائے اور اس کا نام امن کدہ رکھدے۔ روسو نے ان الفاظ میں ریاست کے متعلق ایک اہم حقیقت پیش کی ہے۔

"مجھے بخوبی علم ہے کہ فلاطون نے ریاست میں عورتوں کے لئے بھی وہی ورزشیں مقرر کی ہیں جو مرد کے لئے مناسب ہیں خاندان سے پیچھا چھڑا کر فلاطون عورتوں کو اپنے نظام حکومت میں کوئی جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ اسی لئے وہ عورتوں کو مرد بنا دینے پر مجبور رہے۔ فلاطون نے اپنے نظام میں ہر صورت حال کو تفصیل کے ساتھ مد نظر رکھا ہے۔ اس نے ایسی مشکلات کو نظرانداز نہیں کیا جو مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اس نے ایک حقیقی دشواری کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ میں یہاں "بیویوں کی جماعت کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں .... میرا مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ کس طرح فلاطون نے ایک مصنوعی صورت حال پیدا کرنے کے لئے انسان کے فطری اور نازک ترین احساسات کو دبا دیا۔ کیا زندگی کے رسوم ورروایات فطری بنیادوں کے بغیر قائم رہ سکتی ہیں؟ کیا ہم ان کی محبت کے بغیر جو ہمیں عزیز ہیں حکومت کے وفادار بن سکتے ہیں؟ کیا حب وطنی اس دل میں کوئی حرکت پیدا کرسکتی ہے؟ جہاں زمین کے اس ٹکڑے کی کوئی محبت نہ ہو جو گھر کہلاتا ہے؟ اور کیا اچھا شہری اچھے بیٹے اچھے شوہر اور اچھے باپ کے علاوہ کوئی اور شخص بھی ہو سکتا ہے؟"

فلاطون کو بھی اپنی ان کمزوریوں کا احساس تھا۔ اسی لئے اس نے "قوانین" میں مصالحانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جو قدم آگے بڑھ چکا وہ بڑھ چکا پیچھے ہٹانا کیا معنی۔

اس تمام ردوکد کے باوجود ہمیں فلاطون کو اس کے محاسن کے ساتھ دیکھنا ہے نہ کہ اس کی کمزوریوں کے ساتھ اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی نے کسی جمہوری نظام تعلیم کی داغ بیل ڈالی ہے فلاطون کا احترام کیا ہے اور اس کے خیالات سے فائدہ اٹھایا ہے۔

(فضل الدین اثر۔ ایم اے)

جنگ اور سکّہ

۱۹۱۸ء کے اختتام پر جب جرمنی کا سپاہی تھکا ہارا میدان جنگ سے اپنے ملک میں پہونچا تو اُس نے محسوس کیا کہ جنگ سے پہلے کسی چیز کی جو قیمت تھی اب اس کی چوگنی دینا پڑتی ہے۔ کھانا کپڑا، کرایہ مکان غرضکہ ہر ایک چیز کی قیمتیں چوگنی ہو گئی ہیں —— ایک سال بعد قیمتیں اور بھی بڑھ گئیں یعنی قبل جنگ ۱۹۱۳ء کی قیمتوں کے مقابلے میں ۵ اگنا اور ۱۹۲۱ء میں ۱۹ گنی ہو گئیں اس کے بعد تو پھر کوئی انتہا ہی نہیں رہی بیچارے سپاہی کا سر اس ننانوے کے پھیر میں پڑ کر ضرور چکرا گیا ہو گا یعنی ۲۲ء میں قیمتیں ۳۴ ہزار گنا اور ۲۳ء میں (جس سال فرانسیسیوں نے رور کے علاقہ پر حملہ کیا تھا) ۱۶۶۲۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ گنا ہو گئیں۔ جیسے جیسے قیمتیں بڑھتی تھیں مزدوری بھی اتنی ہی بڑھتی تھی لیکن پھر قیمتیں اور بھی بڑھ جاتی تھیں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مزدوری چیزوں کی قیمتوں کے برابر پہونچ پائی ہو۔ لوگ بیچارے کیا کرتے ہر ایک اپنا روپیہ نہایت تیزی و عجلت سے خرچ کر ڈالتا تھا اس ڈر سے کہ کہیں دوسرے وقت اُن کا سارا روپیہ کوڑی بھر قیمت کا بھی نہ رہے۔ اور جن بیچاروں کو پنشنیں ملتی تھیں وہ تو بالکل تباہ ہی ہو گئے تھوڑا بہت جو کچھ انھوں نے جمع کیا تھا اور جس سے اُمیدیں لگائی تھیں کہ بقیہ زندگی کافی آرام و اطمینان سے بسر کریں گے اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اُن کا تمام روپیہ ایک وقت کا کھانا بھی نہیں خرید سکتا تھا البتہ مقروض لوگوں کی اور مرتہن لوگوں کی اچھی بن آئی۔ انھوں نے اپنے قرض کا روپیہ یا زر رہن بظاہر تو پائی پائی ادا کر دیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اتنے روپیہ کا ایک انڈا یا ڈاک خانے کا ایک معمولی ٹکٹ بھی نہیں خریدا جا سکتا تھا۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ کیونکہ کوئی کسی سے آئندہ کی معاملت ہی نہیں کرتا تھا اِس ڈر سے کہ مبادا جرمن سکے کی قیمت آئندہ اور بھی گر جائے تو بالکل خسارہ ہی

رہے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ بلا مبالغہ اگر کسی کو ایک ہفتہ کا مکان کا کرایہ ادا کرنا ہوتو اُس کے لئے لازمی تھا کہ ایک پوری بیل گاڑی نوٹوں سے بھر کرلے جائے تب جا کر کہیں کرایہ ادا ہو سکے۔ جب صورت حال یہ ہوگئی تب اصلاح کی اس طرح کوشش کی گئی کہ مارک سکہ واپس لے لیا گیا اور ایک نیا سکہ زینٹس مارک، نامی جو جائداد غیر منقولہ پر مبنی تھا جاری کیا گیا۔ لیکن اسوقت تک جرمنی کا متوسط طبقہ بالکل تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

قیمتوں میں اتنا مضحکہ خیز چڑھاؤ کیوں ہوا جس کا لازمی نتیجہ تباہی و بربادی تھا؟ وجہ یہ تھی کہ گورنمنٹ نوٹ اس تیزی و کثرت سے بنا رہی تھی جتنی اُس کی مشینیں کام کر سکتی تھیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اجناس و مزدوری میں کسی قسم کا تناسب قائم نہ ہو پاتا تھا۔

یہاں ہم معاشیات کے ایک موٹے سے اصول کا ذکر کریں گے۔ اس اصول کا نام "زر کا نظریۂ مقدار" ہے۔ نظریہ یہ ہے کہ کسی ملک میں قیمتوں کا معیار اس مناسبت سے ہوتا ہے جس مناسبت سے اس ملک میں قابلِ فروخت اجناس کی مقدار ہوتی ہے اور جتنی آسامیوں کی کھپت ہوتی ہے۔ عام طور پر Inflation کا جو لفظ کہا جاتا ہے یعنی ملک میں زر کی مقدار بڑھا دینا تاکہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو جائے اس کی تہ میں دراصل یہی زر کا نظریۂ مقدار ہی کام کرتا ہے۔ جب زر اور اجناس و آسامیوں کی مقداروں کا تناسب نہیں رہتا تو کہتے ہیں کہ یہ زمانہ Inflation کا ہے یعنی قیمتوں کے چڑھاؤ کا۔ کسی ملک میں قیمتیں اسوقت تک مستحکم رہتی ہیں جب تک رائج زر کی مقدار اور اجناس و آسامیوں کی مقدار میں تناسب رہتا ہے لیکن اگر اجناس و آسامیوں کی مقدار قائم رہے اور زر رائج کی فراوانی ہو جائے تو قیمتیں بلا محالہ بڑھ جائیں گی کیونکہ روپیہ کافی سے زیادہ ہو جاتا ہے اس لئے دوکاندار قیمتیں بڑھا دیتے ہیں اور لوگ خوش خوش دے دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر زر رائج کی مقدار قائم رہے اور اجناس و آسامیوں کی مقدار یا تعداد کم ہو جائے تب بھی قیمتیں بڑھ جائیں گی کیونکہ چیزیں کم ہونے کی وجہ سے دوکاندار قیمتیں زیادہ لیتے ہیں ان دونوں حالتوں میں ہم کہتے ہیں کہ یہ بڑھاؤ کی حالت ہے۔

سکہ جب گورنمنٹ خود بڑھاتی ہے یعنی مصنوعی افزائش زر تو یہ اُن افراد کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے جن کی آمدنی بندھی ٹکی ہوتی ہے۔ مثلاً پنشن یافتہ لوگ۔ یا وہ جو روپیہ جمع کر رکھتے ہیں۔ نقصان کے علاوہ ایسے بڑھاؤ کی حالت میں روپیہ جمع کرنا مفید بھی نہیں۔ کیونکہ اس مصنوعی افزائش زر کے برعکس اس کا ردِ عمل بھی ہوتا ہے یعنی اُتار (Deflation) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ زر رائج کی مقدار اجناس کی مقدار کی بہ نسبت کم کردی جائے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ کاروبار بند ہو جاتے ہیں کیونکہ منافع بند ہو جاتا ہے۔ تنخواہیں کم ہو جاتی ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے کے گھنٹے کم کر دیے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جنگِ عظیم کے دوران میں اور اُس کے بعد تقریباً ہر ملک میں مصنوعی افزائش زر کا دور رہا۔ مثلاً انگلستان میں اگر ۱۹۱۳ء میں زندگی کی ضروریات کے لئے ۱۰۰ پونڈ خرچ کرنا پڑتے تھے تو ۱۹۲۰ء میں ۲۵۵ پونڈ ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد اُتار کا دور شروع ہوا اور قیمتیں اپنی اصلی حالت کی طرف آنے لگیں یعنی ۱۹۲۱ء میں ۲۲۲ پونڈ ہوئے ۱۹۲۲ء میں ۱۸۱ اور ۱۹۳۱ء میں ۱۴۷ پونڈ ہو گئے۔ اسی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۹۱۳ء میں ۱۰۰ پونڈ تھے ۱۹۲۰ء میں ۲۰۵ پونڈ ہو گئے ۱۹۲۱ء میں ۱۶۳ اور ۱۹۳۱ء میں ۱۴۰۔

موجودہ جنگ میں ابھی تک برطانیہ میں مصنوعی افزائشِ زر بہت کم ہوئی ہے لیکن گذشتہ کے تجربہ سے کہا جا سکتا ہے کہ عنقریب ہو جائیگی۔ جنگ کی تیاری کے سلسلے میں لاکھوں آدمی فیکٹریوں میں کام کر رہے ہیں یہ لوگ جو چیزیں بنائیں گے وہ فروخت کے لئے تو ہوں گے نہیں بلکہ دشمن کی تواضع کے لئے ہوں گی۔ اب جو یہ لوگ کام کر رہے ہیں اُن کو تنخواہیں دی جاتی ہیں اس لئے جنگ کی حالت میں امن کی حالت کی بہ نسبت زر رائج کی فراوانی لامحالہ زیادہ کر دی جائے گی لیکن اجناس کی مقدار (جسے اقتصادیات کی زبان میں قابلِ فروخت اشیا کہتے ہیں) جنگ کی حالت میں بہت کم ہو جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم امن کے زمانہ میں تو جاہے جتنا روپیہ چاہیں جیب میں ڈال کر چلے جائیں اور جو کچھ چاہیں دوکانوں سے خرید لیں لیکن جنگ کے زمانہ میں ایسا

نہیں ہوتا کیونکہ دوکانوں میں جنس اتنی تو ہوتی نہیں جتنی امن کے زمانہ میں ہوا کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر صورت حال پر گورنمنٹ قابو نہ پائے تو اجناس کی قیمتیں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں یا بڑھا دی جاتی ہیں اور اس طرح سے افراد کا روزمرہ کا خرچ بڑھ جاتا ہے۔ جب روزمرہ کا خرچ بڑھ جاتا ہے تو لوگ اپنے اپنے منیجروں یا افسروں سے جہاں کہیں وہ نوکر ہوتے ہیں تنخواہیں زیادہ مانگتے ہیں تاکہ گراں چیزوں کو خرید سکیں۔ جب تنخواہیں اور مزدوری زیادہ ملنے لگتی ہے تو دوکاندار چیزوں کی قیمتیں اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں اور پھر تنخواہوں میں اضافے کی درخواستیں شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ لامتناہی سلسلہ چلے ہی جاتا ہے' زیادہ قیمت' زیادہ تنخواہ۔ زیادہ تنخواہ زیادہ قیمت'۔ اس کو افزائش زر کا خبیث چکر کہتے ہیں۔

امن کے زمانہ میں تو یہ حالت، اُتار اور slump کے ذریعہ خود بخود درست ہو جایا کرتی ہے یعنی جب تمام فیکٹریاں اپنا زیادہ سے زیادہ کام کر رہی ہوں تمام مزدور کام پر لگے ہوں اور تمام مالی سرمایہ لگا دیا گیا ہو تو لامحالہ جنس کی فراوانی ہو جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ منافع کم ہو جائیگا منافع کم ہونے پر اجناس کی پیداوار کم کر دی جائے گی۔ پیداوار کم کرنے پر مزدور کم لگائے جائینگے اور اس طرح بے روزگاری بڑھ جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں 'اُتار' کا زمانہ آجائے گا اور اُن تمام زیادتیوں کی تلافی کر دے گا جو چڑھاؤ کے زمانہ میں ہوئی تھیں

لیکن یہ 'اُتار' والا عمل جنگ کے دوران میں نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک لڑائی جاری رہے گی گورنمنٹ ملک کے تمام وسائل کو مجبوراً جنگ کے مصارف اور ضروریات میں لگاتی رہے گی۔

اس لئے ایسی حالت میں اُس روپیہ کا کیا کیا جائے جو لوگوں کے پاس ہے۔ لوگ خرچ نہیں کر سکتے کیونکہ بازار میں مال کم ہے یا جو انہیں خرچ کرنا نہیں چاہیئے کیونکہ ایسا کرنے سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ جائیں گی؟

اس حالت کے بہت سے علاج ہوتے ہیں اوّل تو یہ کہ تنخواہیں کم کر دی جاتی ہیں تاکہ

فالتو روپیہ لوگوں کے پاس رہنے ہی نہ پائے اور انہیں صرف اسی قدر دیا جائے جتنے میں اُن کی روزمرہ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ آمری ملکوں میں یہی طریقہ برتا جا رہا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ٹیکس بہت ہی زیادہ بڑھا دئے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کا فالتو روپیہ اس طرح سے کم ہو سکے۔ لیکن اس صورت میں یہ ہونے لگتا ہے کہ کام کرنے والے جی لگا کر کام نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ زیادہ کام کرنے سے کیا فائدہ جب کہ اُن سے چھن جائے گا جتنا زیادہ کمائیں گے۔ ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک "ملکی کفایت شعاری فنڈ" کھولا جاتا ہے اور لوگوں سے زبردستی اُن کا فالتو روپیہ جمع کرا لیا جاتا ہے۔ ایک چوتھا طریقہ بھی ہے۔ اس کو مسٹر جے۔ ایم۔ کین کا طریقہ بھی کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ تنخواہیں یا مزدوریاں کچھ رقم روک کر دیجاتی ہیں پوری نہیں دیجاتیں باقی روپیہ آئندہ دینے کے لئے روک رکھتے ہیں اور اسوقت تک نہیں دیتے جب تک لڑائی ختم نہ ہو جائے۔ (ماخوذ از ورلڈ ڈائجسٹ)

جدید سیاسی دستورِ بین الاقوامیت

یورپ میں جب شخصی اور استبدادی حکومت کا دور دورہ تھا تو شاید روسو پہلا شخص تھا جس نے اس کے خلاف علم بغاوت اٹھایا اور آزادی انسان کا فطری حق سمجھا۔ اس کی تلقین نے فرانس میں ذہنی انقلاب پیدا کر دیا جس کا لازمی نتیجہ انقلاب فرانس میں ظاہر ہوا۔ انقلاب فرانس کے بعد سارے یورپ کے دماغ پر جمہوریت۔ اخوت۔ مساوات کا تصور چھا گیا اور ہر شخص اسی ڈھرے پر سوچنے لگا۔ مگر اس کے بعد دوسرا انقلاب رونما ہوا جس کو صنعتی انقلاب سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مشینوں کی اختراع کے بعد وسیع تعداد میں تھوڑے وقت اور کم محنت سے مصنوعات کی پیداوار نے معاشی نظام کا توازن بگاڑ دیا چھوٹے پیمانے پر چلنے والی صنعتیں تباہ ہو گئیں۔ سرمایہ سمٹ کر ایک جگہ جمع ہونے لگا بیکاری اور بے روزگاری بڑھنے لگی۔ کیونکہ مشینوں پر کم مزدوری پر بچوں سے بھی کام لیا جا سکتا تھا اور مزدوری کا فیصلہ کارخانہ دار کی مرضی پر تھا۔ اس طرح سے دو متضاد اور مختلف مفاد کی جماعتیں پیدا ہوئیں۔ یعنی "آمر یا سرمایہ دار" اور "مزدور" گو اس زمانے میں مصلح بھی پیدا ہوئے اور قانون کی مشنری بھی ان برائیوں کو دور کرنے کے لئے اس زمانے کے مطابق حرکت میں آتی رہی لیکن انسانی فطرت کے مطابق "آمر" قانون کی خامیوں سے فائدہ اٹھا کر ہمیشہ کم سے کم دے کر زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا اور بقول رسکن کے "Bags and Rags have the same effect on Rags" غریبوں پر اور مزدوروں پر سرمایہ کا وہی سلوک رہا جو قدیم شخصی اور استبدادی حکومت میں ہوا کرتا تھا۔ صرف ذریعہ تبدیل ہو گیا۔ پہلے جسمانی طاقت تھی اور اب مالی طاقت ہے

مصنوعات کی فراوانی اور اس کی کھپت کے لئے نئی منڈیوں کی جدوجہد اب جنگ عظیم کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ معاہدہ "ورسائی" نے ایک اور جنگ کے بیج بو دئے اور بنیادی نقائص اس سے دور نہ ہو سکے۔

اس جماعتی کشمکش اور دولت کی ناانصافانہ تقسیم کو دیکھ کر مفکروں کے دماغ نے سوچنا شروع کیا اور کارل مارکس اور رسکن وغیرہ نے اس کے متعلق اظہار خیالات کیا۔ کارل مارکس ان سب میں ممتاز ہے کیونکہ اس نے ایک عملی خاکہ پیش کیا۔ کارل مارکس کے خیالات کو عملی جامہ روس میں اشتراکیت کی صورت میں لینن نے پہنایا۔ اس نئے تجربے اور جماعتی کشمکش کے جدید استیصال نے لوگوں کو حیرت میں ڈالدیا اور وہ کامیابی اور ناکامی کے مخلوط جذبات سے اس کا مطالعہ کرتے رہے لیکن انھوں نے اپنی طرف سے کوئی عملی اقدام نہ کیا۔

چنانچہ دنیا میں ہر جگہ بے چینی، انتشار بڑھتا چلا گیا اور جنگ عظیم کے بوئے ہوئے بیج نے برگ و بار لانے شروع کئے اور آخر ایک اور جنگ ہو کر رہی یہ ایک کھلا راز تھا کہ جنگ ہوگی اس لئے دماغ پھر اس موجودہ نظام کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی فکر میں تھے کہ تلخ تاریخ پھر اپنے کو نہ دہرائے مفکروں اور سیاست دانوں نے "بین الاقوامیت" کو ان بیماریوں کا صحیح علاج بتایا۔

"بین الاقوامیت" کا چھوٹے پیمانے پر ایک تجربہ "مجلس بین الاقوامی تھی"، جنگ عظیم کے بعد کچھ عرصے تک کہا جا سکتا ہے کہ جنگ وجدل کو روکنے میں دنیا کی اس نے اچھی خاصی خدمت انجام دی ممکن ہے کہ لڑائی سے تھکا ہوا یورپ اس کا موجب ہوا ہو۔ مگر آخری دور میں اس نے بقول علامہ اقبال "انجمن کفن دزدان" کی حیثیت اختیار کر لی

دنیا کے امن کے قیام کے لئے پہلی چیز جو ہم کو سوچنی پڑے گی وہ سامراجی حکومتوں کا استیصال ہے۔ ہم ایک تاریخی دور کے آخری حصے میں سانس لے رہے ہیں اور ایک تغیر پذیر دور میں سے گذر رہے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کا وہ دور ہے جس میں یا تو ایک جدید نظام کی بنیاد رکھی جائے گی یا تباہ کاری، موت، تکالیف انسانی نسل کو بالکل معدوم کر دے گی۔ یہ مسئلہ معمولی مسئلہ نہیں جس کو کمرے میں بیٹھ کر سیاست کے اصولوں پر سلجھایا جا سکے۔ اس وقت لاکھوں انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے ان کو اخلاقاً اور دماغاً تباہ کیا جا رہا ہے۔ کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو اس کو روک سکے ممکن ہے کہ یہ اسی رفتار سے ہماری طرف بھی قدم بڑھا رہا ہو۔ اگر ہم اس سے بھاگنے کی کوشش کریں گے۔

تو وہ ہم کو بھی آئے گا۔ بہر حال ہم کو اس غور کرنا ہے، سوچنا ہے۔ سمجھنا ہے۔ موجودہ جنگ نے دراصل بنیادی مسئلہ کو چھوا تک نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ جنگ سب چیزوں کو تباہ کر دے اور پھر بھی کچھ طے نہ کر سکے وقت اور فاصلے پر قابو ہونے ہم کو اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم دنیا کے انسانوں کے جمیع مسائل کو ایک مرکزی ادارے میں طے کر سکیں۔ نئی ایجادیں۔ طاقت مشین نے زندگی کے ہر شعبے کی ترتیب کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔ آج ایک ایجاد ہوتی ہے اس کو ابھی پورے طور سے قبول نہیں کیا جاتا ہے کہ دوسری ترقی یافتہ ایجاد پہلی ایجاد کو بیکار کر دیتی ہے۔

سیاسی وفاق بغیر اقتصادی اجتماعیت کے بالکل ناکامیاب چیز ثابت ہوگی۔ ہم کو روسی انقلاب سے کہیں زیادہ عمیق انقلاب کی ضرورت ہے۔ روسی انقلاب اپنی انتہا پسندی۔ بے صبری۔ تشدد غیر رواداری کی وجہ سے ناکامیاب رہا۔ موجودہ انقلاب نسل انسانی کو پستی کی طرف بہنے سے روکنے کے لئے زیادہ بہتر اور مکمل ہونا چاہئے۔ اس کے معنی لوگوں کو سماجی، اقتصادی اور بین الاقوامی بے راہ روی سے روکنا ہے۔ اس کے معنیٰ ذاتی نفع کا استیصال اور پھر اس اصول کو بروئے کار لانا ہے جس سے ایک انسان دوسرے انسان کا خون نہ چوسے۔ اشتراکیت کی اوائل کوششیں اسی اجتماعیت کی تخلیق کی کوششیں تھیں لیکن "مارکیٹ" کے آغاز نے اجتماعیت کی ایک پیچیدہ صورت اختیار کر لی، ایک جماعت دوسری جماعت پر حاوی ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ امیر اور طاقتور جو عموماً زیادہ قابل اور عقلمند ہوتے ہیں ہر اس چیز کو جو ان کے ہاتھ لگی لے بھاگے۔ اور کم عقلمند اور بے فکر مزدوروں کو پسینے میں نہانے اور غلامی کے لئے چھوڑ دیا۔ آغاز تمدن سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ "قابضین" "محرومین" پر حاوی رہے اور "محرومین" ہمیشہ اس نظام سے نفرت کرتے رہے بعض صورتوں میں محرومین اتنے دست و پا بریدہ حالت میں رہے کہ وہ کسی قسم کی افراتفری پیدا نہ کر سکے۔ لیکن جب کبھی مزدوروں کی صورت میں یا فوج اور کاشتکاروں کی صورت میں رونما ہوئے تو ان کی انفرادی نفرت نے اجتماعی صورت اختیار کر لی۔ بعض صورت میں یہ بغاوتیں بہت تباہ کن ثابت ہوئیں۔ لیکن پرانے بنیادی اصول وہی رہے یعنی ایک دوسرے پر حاوی ہونے کی جد و جہد۔ اکثر

محرومین نے قابضین کو اتنا خوفزدہ کر دیا کہ ان کا سلوک بہت زیادہ بہتر ہو گیا۔ اکثر ایسا ہوا کہ محرومین کو کوئی ایسا سردار مل گیا۔ جس نے طاقت حاصل کر کے اعلیٰ جماعت کے لوگوں کو دار پر کھچوایا قتل کرایا ان کے سروں کو نیزے پر لگا کر تشہیر کرائی۔ ان طوفانوں کے بعد پھر اسی پرانے نظام پر آ جمے۔ محرومین کے پاس عقلمندی کا نقدان رہا اور قابضین کے پاس ضمیر کا۔

بہت سے فطری لحاظ سے قابل لوگوں کو ذرائع اور تعلیم کی کمی نے تاریکی میں ڈھکیل دیا۔ ان کی زندگی برباد اور تباہ ہو گئی۔ ان کو کبھی ابھرنے کا موقع بھی نہ ملا۔ بہت سے اشخاص اس دنیا میں مقابلہ اور نبرد آزمائی کی تاب نہ لا سکنے کی وجہ سے غربت اور عام زندگی میں ڈھکیل دئے گئے۔ موجودہ زمانے کے مفکرین نے اس انسانی ذرائع کی تضیع "کو پہچان لیا۔ ان کو ان کے خدمات یا اخلاق نے متحرک نہیں کیا بلکہ اس حقیقت نے کہ موجودہ نظام بہت تباہ کن اور احمقانہ ہے۔

مارکس نے اجتماعیت کا ایک بھدا خاکہ پیش کیا لیکن مارکس نے انسانی خلوص کو اپنے "طبقاتی جدوجہد" کے اصول سے جتنا صدمہ پہنچایا ہے۔ اتنا نقصان شاید کسی اور چیز سے نہیں پہنچا۔ اس نے دو جماعتوں کو نبرد آزما کر دیا۔

مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر حصے میں مکانوں کی کمی ہے اور جو مکان موجود ہیں ان میں سے بیشتر موجودہ معیار کے مطابق انسانی رہائش کے لئے ناموزوں۔ پریس اور سنیما کے ذریعہ ایسے مکانوں کا پرچار کیا جا سکتا ہے جن کا حصول ہر شخص کے امکان میں ہے۔ بڑے پیمانے پر آبادیوں کی سیاسی اغراض کے لئے نقل و حرکت نے ہم کو یہ بات سمجھا دی ہے کہ یہی چیز بہتر اغراض اور مقاصد کے لئے نہایت سہولت سے انجام دی جا سکتی ہے۔

انسانوں کے مساویانہ کچھ بنیادی حقوق ہونے چاہئیں۔ مثلاً۔

(۱) ہر شخص بلا امتیاز رنگ و قوم، عقائد، مذہب و پیشہ حق رکھتا ہے کہ خوراک۔ لباس۔ طبی امداد اس کے لئے فراہم کی جائے تاکہ وہ اپنی تمام جسمانی اور دماغی طاقتیں بروئے کار لا سکے اور اس کی صحت از پیدائش تا موت قائم رہ سکے۔

۲۔ وہ کافی تعلیم کا حق رکھتا ہے ایک کار آمد شہری رہنے کے لئے ہر شخص کو مسادیانہ ذرائع اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق حاصل ہونے چاہئیں۔

۳۔ اس کو ہر قانون اور ہر جائز پیشہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے جس کا معاوضہ اس کام کی اہمیت اور انسانی بہبودی میں اضافے کے مطابق ہوگا۔ اس کو اپنے پیشے کے انتخاب کا حق ہوگا اور اس انتخاب کو رد کرنے یا قبول کرنے کا اختیار پبلک کو ہوگا۔

۴۔ اس کو ہر ایک چیز کی خرید وفروخت کا حق یہاں تک اور اس حد تک ہوگا جہاں تک یہ اجتماعی بہبودی میں رخنہ انداز نہ ہو۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اجتماعی حکومت میں خرید وفروخت نفع کی غرض سے غیر ضروری ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوگی۔ "دار المبادلہ" بالکل معدوم ہو جائے گا۔ صرف ایسی چیزوں پر ملکیت کا حق ہوگا جو بغیر دوسروں کے ساتھ ناانصافی کئے ہوئے رکھی جا سکتی ہوں۔

۵۔ ذاتی ملکیت جو قانون اور جائز طریقے سے حاصل کی گئی ہو۔ مامون ومصئون رہے گی

۶۔ وہ دنیا میں آزادانہ اپنے خرچ پر سیر وسیاحت کر سکتا ہے۔ اس کا ذاتی مکان اس کا قلعہ ہے جس میں اس کی بغیر اجازت کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ وغیرہ وغیرہ

اجتماعیت کی مخالفت میں بہت سے لوگ اپنی کم عقلی کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں کہ اس نظام میں عمل کا محرک فوت ہو جائے گا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ قدرتی ذرائع کی ذاتی ملکیت کی وجہ سے فارغ البال محرک سے محروم ہو جاتا ہے اور غریب امید سے۔ جتنا انسان کو اچھا کھلایا جائے گا اور اچھی طرح رکھا جائے گا۔ اتنا ہی وہ عدم مصروفیت کی وجہ سے کچھ نہ کرنا چاہے گا۔

اس تصویر کے خدوخال میں ایک چیز اور نمایاں کرنی رہ گئی ہے یعنی افراد پر وفاق یا اجتماعیت کے فرائض۔ کچھ ایسے شعبے بھی ہیں جو کسی حالت میں بھی خوشگوار نہیں کہلائے جا سکتے۔ مثلاً تیمارداری پاگل خانہ۔ میکانکی محنت۔ کلرکی۔ جہات وغیرہ وغیرہ۔ انسانی فطرت سے ہم متوقع ہو سکتے ہیں کہ ان کاموں کے لئے رضاکارانہ خدمات حاصل ہو جائیں گی لیکن کیا باقی ماندہ لوگ صرف اس سے استفادہ

ہی حاصل کرنے کے لئے ہیں۔ پروفیسر ولیم جیمز کا حل اس کے لئے یہ ہے کہ نوجوان زندگی کا کچھ حصہ دنیا کی اس خدمت کے لئے ایک فرض کی حیثیت سے وقف کیا کریں گے وہ اس کام کو نہایت خوش اسلوبی اور جوش سے انجام دیں گے کیونکہ ان کو یہ علم ہوگا کہ ایک محدود عرصے کے بعد ان کو اس سے چھٹکارا مل جائے گا۔

موجودہ مجوزہ "بین الاقوامیت" کسی قسم کی ادھوری اور نامکمل بین الاقوامیت نہیں ہے بلکہ معاشی اقتصادی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں کو لئے ہوئے ہے۔ انگلستان کے مشہور انشاپرداز اور مفکر ایچ جی۔ ویلز نے اپنی کتاب "نظام جدید" میں اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

"بین الاقوامیت" کو عمل میں لانا ایک شخص کا کام نہ ہوگا بلکہ بہت سے دماغوں کا۔ یہ تدریج ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ہم تک پہنچے گی۔ جس طرح بہت سی حیرت انگیز اختراعیں اور انقلاب ایک ہی شخص کے مرہون فکر نہیں بلکہ بہت سے دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں جو اس کو ترقی دیتے چلے آئے ہیں۔

اس مجوزہ بین الاقوامیت میں ظاہر ہے کہ ساری قومیں اولاً شامل نہ ہوں گی کیونکہ بہت سی قومیں اس کو اپنے خودغرضانہ مفاد کے خلاف سمجھیں گی۔ لیکن اگر طاقتور قوموں کی اکثریت شامل ہوگئی تو باقی ماندہ قوموں کو اس میں شامل ہونا ناگزیر ہو جائے گا۔ کیونکہ ان کو اپنے خودغرضانہ مقاصد کی تکمیل کے لئے موقع نہ مل سکے گا۔ اور متحدہ قوموں کا اخلاقی اثر ان کو مجبور کر دے گا۔

ان قوموں کی ایک مجلس واضع قوانین جمہوری اصولوں پر مرتب ہوگی۔ جو معاشی۔ اقتصادی سیاسی اور سماجی مشترکہ مسائل کے متعلق قانون وضع کرے گی۔ اس نئے نظام کو وجود میں لانے کے لئے احتجاج اور مخالفت سے بھی مقابلہ کرنا پڑے گا لیکن عقلمند اور انصاف پرست اس کی پرواہ نہیں کریں گے۔ لوگوں کو اپنی ذہنیت تبدیل کرنی پڑے گی اور ان کی خوبی کا معیار یہ ہوگا کہ انھوں نے دنیا کو کیا دیا یہ نہیں کہ انھوں نے معاوضہ تنخواہ کی صورت میں کیا لیا۔

موجودہ اقتصادی نظام میں ہر قوم اور ہر ملک میں وہاں کے اصول اور رواج کے مطابق

ایک علیحدہ سکہ ہے۔ اور جس کا مبادلہ دوسرے ملک کے سکوں میں ہو سکتا ہے۔ لیکن جدید نظام" یا "بین الاقوامی وفاق" میں (مسٹر مور ایڈیٹر اسٹیٹس مین نے اس نظام کو وفاق دنیا کے نام سے موسوم کیا ہے) نئے یکساں سکے بنائے جائیں گے۔ جو موجودہ قسم کے سکوں سے مختلف ہوں گے "جدید نظام" میں دارلمبادلہ قرض دینے والے بینک اور اسی قسم کے سب ادارے اور فن معدوم ہو جائیں گے۔

ان سب چیزوں کے لئے روپے کی ضرورت ہو گی اور وہ کہاں سے فراہم ہو گا؟ لیکن روپیہ تو صرف ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ اگر روپیہ ہمارے سامنے مشکلات حائل کرے گا تو اس کو بھی جدید نظام میں کوئی جگہ نہیں دی جائے گی۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ موجودہ جنگ کا کیا نتیجہ ہو گا بدتر یا بہتر۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جنگ کے اختتام پر یہ نظام صرف ایک "دماغی لہر" کی صورت میں کتابوں میں یوں ہی باقی رہ جائے گا یا کوئی عملی صورت بھی اختیار کرے گا۔ (تلخیص)

(آغا اقبال مرزا امین)

اشتراکیت کی فلسفیانہ بنیادیں

ایک جواب

رسالۂ جامعہ کے اپریل نمبر میں مارکس کی تعلیمات پر چند اعتراضات شائع ہوئے تھے۔ افسوس ہے صاحبِ مضمون نے عمیق مطالعہ کرکے مارکس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ سنی سنائی باتوں پر یقین کرکے اعتراضات کر دیے۔

ذیل میں ان اعتراضات کو نمبر وار لکھے دیتا ہوں جس کے بعد میں ان کا جواب دوں گا۔

۱۔ صاحبِ مضمون نے مارکس کی تعلیم کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ افراد کا ہر عمل معاشی مفاد اور وہ بھی ذاتی غرض سے ہوتا ہے انھوں نے اس کی تردید کی ہے۔

۲۔ کارل مارکس نے صاحبِ مضمون کے نزدیک تاریخ میں افراد کی اہمیت سے انکار کیا ہے انھوں نے اسے غلط ٹھہرایا ہے۔

۳۔ انسان کے عمل کے اسباب معاشی ماحول کے ناگزیر تقاضے نہیں ہوتے

۴۔ ایک ہی معاشی ماحول میں رہنے والے اشخاص کا طرزِ عمل ایک ہونا ضروری نہیں ہے۔

تاریخ کے مادّی تصور کو اس قدر اختصار سے، جیسا کہ صاحبِ مضمون نے کیا ہے، بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ میں اسے کچھ اجمال سے بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مارکس کے فلسفہ کو سمجھنے سے پہلے ہیگل کی تعلیمات کا جان لینا ضروری ہے کیونکہ سرمایہ داری کے خلاف مارکس نے جو حربہ استعمال کیا ہے وہ مارکس کے اُستاد ہیگل ہی کا مرہونِ منت ہے۔

ہیگل کا کہنا یہ ہے کہ زندگی کا ہر عنصر تبدیلی کے مسلسل دور میں ہے۔ ہر لحظہ وہ تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ ہر عنصر میں دو مخالف جزو موجود ہیں۔ یہ اجزا لازمی طور پر ایک دوسرے کے ہمراہ ہیں۔ جب کسی ایک کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اور اس کا مصرف کچھ نہیں رہتا تو اُس کا مخالف اُس کی جگہ لیتا ہے۔ اسی طرح

زمانہ اپنی خامیوں اور غلطیوں کی خود اصلاح کرتا رہتا ہے۔ مارکس کا تخیل ہیگل کی تعلیم کے منافی ہے۔ مارکس سماج کی خرابیوں کو دور کرنے کا صرف ایک نسخہ تبلاتا ہے اور وہ ہے ایک اشتمالی۔ خونی۔ انقلاب۔ حالانکہ ہیگل کے لئے تاریخ نام ہے ایک تدریجی تبدیلی کا، نہ کہ انقلابات کا۔

تاریخ کا مادی تصور اس امر کی تکرار ہے کہ مادی حالات ہی ابتدأ انسانی تخیل میں تبدیلی کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ تصورات یا تخیلات انسان کی اس کوشش کا نتیجہ ہوتے ہیں جو اس نے اپنے گردوپیش کے ماحول کی تشریح کرنے میں کی ہے۔ انسان کا طریقۂ معاش اور معاشی حالات ان تخیلات کی تشکیل کرتے ہیں۔ لیکن اگر مادی تصور کا خاتمہ یہیں پر ہو جائے تو اس کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہتی کیونکہ یہ محض اس بات کو دہراتا ہے کہ انسانی تخیلات اس کے تجربہ کا نتیجہ ہوتے ہیں مگر نہیں یہ کچھ اور بھی ہے

عام ماحول کے تار و پود میں طریقۂ پیداوار کا درجہ اہم ترین ہے اور اس کی خصوصیت بہت بڑی انسان کی ضروریات کو پورا کرنے والی طاقتیں یعنی پیداواری طاقتیں ہی تخیلات اور اداروں کو جنم دیتی ہیں۔ تخیلات اور ادارے پیداواری طاقتوں (   ) کی بنیاد پر کھڑے ہیں۔ یہ تخیلات پھر ان پیداواری طاقتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ طریقۂ پیداوار ہی قانون، مذہب، حکومت اور معاشرتی تقسیم کا تعین کرتے ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ سرمایہ داری ہر ادارے کو اپنے فائدہ اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تبدیل کر لیتی ہے۔ قانون کی تشکیل بھی اسی طرح کی جاتی ہے کہ سرمایہ داروں کو فائدہ پہونچے۔

مادی حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ نئے بازار، پیداوار کے نئے طریقے اور خام پیداوار کا پتہ لگتا ہے۔ پیداوار اور تقسیم کے ادارے بدلتے اور ترقی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ معاشی دستور ناکارہ ہو جاتے ہیں اور ان کی بنیادوں میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ایم۔ بی رسل نے طریقۂ پیداوار اور تخیلات کے مابین رشتے کو ایک بڑی اچھی مثال سے واضح کیا ہے۔ آزادئ نسواں کی تحریک کی قدامت افلاطون تک پہونچتی ہے مگر اس نے بیسویں صدی تک کوئی عملی جامہ نہیں پہنا جبکہ عورتیں صنعت و حرفت

میں اس قدر تیزی سے داخل ہونے لگیں کہ اُن کے سیاسی حقوق کی نئے سرے سے تشکیل کرنی پڑی، رابرٹ براؤن اور ولیم سوم مذہبی آزادی کے حامی تھے مگر مذہبی آزادی سترہویں صدی تک نہیں دی جا سکی جبکہ مذہبی ایذا دہی کو تجارتی منفعت کے خیال سے ترک کر دیا گیا۔

آپ دیکھیں گے کہ مارکس کا مطلب کبھی وہ نہ تھا جو صاحب مضمون نے سمجھا۔ تخیل میں تبدیلی مادی حالات کی وجہ سے ہوتی ہے۔ صاحب مضمون نے یہ کہا ہے کہ جب ایک قوم مہذب و متمدن ہو جاتی ہے (یعنی بقول اُن کے فکر معاش سے آزاد ہو جاتی ہے) تو اُس کے عمل اور تخیل کے اسباب معاشی ماحول کے ناگزیر تقاضے نہیں ہوتے ہیں کیونکہ تب تو وہ تقاضے باقی ہی نہیں رہتے۔ مگر تخیل کی پرواز اس وقت بھی مادی حالات کو زیر اثر ہوتی ہے۔

صاحب مضمون کے بقول کارل مارکس نے تاریخ میں افراد کی اہمیت سے انکار کیا ہے۔ حالانکہ مارکس بھی اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ شخصیتیں تاریخ میں بہت اہم حصہ لیتی ہیں۔ اس کی کتاب Poverty of Philosophy میں اس لئے اس مسئلہ پر اچھی طرح بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخ لوگ ہی بناتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ اسے اپنے تخیل کی رنگینیوں کے مطابق نہیں بناتے اور نہ بنا سکتے ہیں۔ ہر نسل کو چند قطعی حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس کے بنانے میں اُن کا اپنا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ یہ اس نسل کی پیدائش سے پہلے تیار رہتے ہیں جو انہیں ماضی سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ اگر بڑے لوگوں کی کوئی اہمیت ہے تو یہ کہ انھوں نے حالات کو اور اسے تبدیل کرنے کے طریقے کو سمجھا۔ اگر وہ حالات کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں اور اسے اپنے تخیل کی پرواز کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو انکی حالت عجب مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔

مارکس کا یہ دعوٰے نہیں ہے کہ صرف مادی حالات تخیل کی تبدیلی کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے اسباب کی موجودگی سے انکار نہیں کرتا ہے۔ وہ حالات کو سب سے بڑی جگہ دیتا ہے۔ اس لئے بعض مواقع پر جو بہت شاذ و نادر ہوتے ہیں کسی دوسرے سبب کا حاوی ہو جانا مارکسزم کے بطلان کا ثبوت نہیں ہے۔

رشی عظیمی

استالین اور انقلاب اسپین

(از جناب ایم این رائے صاحب)

یہ مضمون عرصہ ہوا اخبار ٹریبون میں نکلا تھا۔ مترجم جناب آفتاب احمد خاں نے اسے اُس مضمون کے جواب میں بھیجا ہے جو رسالہ جامعہ میں ٹروٹسکی پر نکل چکا ہے اور جس میں ٹروٹسکی نے اسپین کی ناکامی کا سبب استالین کو گردانا تھا۔ (مدیر)

سپین کے انقلاب اور اور اس کے ردعمل کی اصل تاریخ اب بھی انکشاف کی محتاج ہے لارگو کبیلرو اس ڈرامہ کے ممتاز کرداروں میں سے تھا جو ایک ٹریجڈی کی صورت میں ختم ہوا ہے کبیلرو اسپین میں مزدور اور اشتراکی تحریک کے ایک ممتاز لیڈر کی حیثیت سے اس نے انقلاب کے ابتدائی منازل میں نمایاں حصہ لیا۔ اگرچہ ابتدا میں وہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا ایک رکن تھا۔ مگر بعد میں اس کا رجحان بائیں بازو کی جانب اتنا زیادہ ہوگیا کہ وہ عام طور پر انقلاب کا سب سے بڑا لیڈر سمجھا جانے لگا تھا۔ اس وقت جبکہ باغی فوجوں نے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کبیلرو انقلابی جمہوریت کا وزیراعظم تھا۔ خانہ جنگی کے ابتدائی ایام میں حکومت کی فوجوں کی باگ ڈور بھی اس کے ہاتھ میں رہی۔ شروع شروع میں باغیوں کو جس سرعت سے کامیابی ہوئی اس نے جمہوری حلقوں میں ایک ابتری سی پھیلا دی۔ اور کئی بار پے در پے نئی نئی حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ انجام کار کبیلرو نے تمام ذمہ دار عہدوں سے استعفےٰ دیدیا۔ اور اس کی کوئی سیاسی اہمیت نہ رہی۔ اس وقت اس شخص کے ستارۂ قسمت کے زوال کے متعلق بڑی قیاس آرائیاں ہوئی تھیں۔ جو پہلے انقلاب کا سب سے بڑا لیڈر سمجھا جاتا تھا۔

کبیلرو خود اپنی سوانح حیات لکھ رہا ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب میں ایسی بہت سی دستاویزات ضرور قلمبند ہوں گی۔ جن کا اسپین کی انقلابی تاریخ پر گہرا اثر پڑا ان سب دستاویزوں میں سے اہم ترین وہ خط ہے جو استالین۔ مولوتوف۔ وارشلوف نے کبیلرو کے نام ارسال کیا تھا مولوتوف سوویٹ روس کا وزیراعظم ہے اور وارشلوف سرخ فوج کا کمانڈر انچیف

خط کی پوری عبارت ذیل میں بجنسہ درج کی جاتی ہے۔ یہی ایک نقل ہے جو آج تک ہندوستان پہنچی ہے۔

"ہمارے سفیر و وزیر مقتدر کامریڈ روزنبرگ نے ہمیں آپ کا برادرانہ سلام بھیجا ہے نیز اس نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی کا غیر متزلزل یقین ہے ہمیں اجازت دیں کہ ہم آپ کے برادرانہ سلام کا شکریہ ادا کریں اور آپ کو مطلع کریں کہ ہم بھی انجام کار اہل اسپین کے اس یقین میں شمولیت کرتے ہیں کہ آخر میں فتح انھیں کی ہوگی"

"ہم نے ہمیشہ سے اپنا فرض جانا ہے اور اب بھی سمجھتے ہیں کہ ہمیں حتی الوسع حکومت اسپین کی مدد کرنی چاہئے جو فسطائی فوجوں کے خلاف اسپین کی صحیح جمہوریت اور مزدور پیشہ عوام کی جنگ لڑ رہی ہے درحقیقت یہ بظاہر فسطائی گروہ بین الاقوامی فسطائیت ہی کے آلۂ کار ہیں انقلاب سپین کی راہیں کئی ایک لحاظ سے انقلاب روس کی راہوں سے مختلف ہیں اور یہ اختلاف خاص سماجی تاریخی اور جغرافی حالات کے اثر سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس اختلاف کی وجہ بین الاقوامی سیاست بھی ہو سکتی ہے جس کے موجودہ حالات ان حالات سے بالکل مختلف ہیں جن کے درمیان انقلاب روس رونما ہوا تھا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اسپین میں آئینی طریق کار انقلابی ترقی میں روس کی نسبت زیادہ موثر اور فیصلہ کن ثابت ہو۔

اس کے باوجود ہمارا اب بھی یقین ہے کہ ہمارے تجربے اور خصوصاً خانہ جنگی کے تجربے اگر وہ صرف انقلابی جدوجہد میں استعمال کئے جائیں تو اسپین کے لئے بھی مفید ہو سکیں گے اسی خیال کے پیش نظر ہم نے کچھ فوجی رفقاء آپ کے پاس بھیجے تھے۔ جن کی تمام تر خدمات آپ کے لئے وقف ہیں ہم نے یہ اقدام آپ کی پیہم درخواستوں کے پیش نظر کیا تھا جو بہت سے مواقع پر رفیق روزنبرگ کے ذریعے ہم تک پہنچتی رہیں۔

ہم نے ان رفقاء کو یہ ہدایات دے رکھی ہیں کہ انہیں اسپین کی فوجوں کے کمانداروں کو صرف فوجی معاملات ہی میں مشورہ دینا ہوگا۔ انھیں یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسپین کے فوجی کمانداروں کا مدد و معاون تصور کریں انھیں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے

کہ وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ اس استحکام کے باوجود جو اسپین اور روس کے درمیان موجود ہے۔ سوویٹ روس کے باشندے جو اسپین میں اجنبی حیثیت رکھتے ہیں اسی صورت میں مفید ہو سکتے ہیں جبکہ وہ صرف اور صرف صلاح مشورہ کا کام ہی انجام دیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی ہمارے فوجی رفقا سے یہی کام لیں گے۔

ہم درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمیں مطلع کریں کہ ہمارے رفقا کس حد تک اپنے فرض منصبی انجام دینے میں کامیاب رہے۔ یقیناً جب تک آپ ان کے کام کو مفید نہ سمجھیں ان کا وہاں رہنا بے سود ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم آپ سے ایک اور درخواست کرتے ہیں کہ رفیق روزنبرگ کے متعلق بھی اپنی صاف اور صریح رائے کا اظہار فرمائیں کیا حکومت اسپین رفیق مذکور کے کام سے مطمئن ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر ہم ان کی جگہ اپنا کوئی اور نمائندہ بھیجدیں؟

(ہم مندرجہ ذیل تجاویز دوستانہ مشورہ کے طور پر پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں:-)

۱۔ کسانوں کی طرف خاص دھیان دینا بڑا ضروری امر ہے۔ کیوں کہ انھیں اسپین ایسے زرعی ملک میں خاص اہمیت حاصل ہے زرعی معاملات اور ایسے ٹیکسوں کے متعلق احکام جاری کرنا جو زراعت کی حفاظت کریں اور اُسے فروغ دیں بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ کسانوں کو فوج میں بھرتی کرنا اور انھیں گوریلا فوج کے دستوں میں منظم کر کے فسطائی فوجوں کے تعاقب کے لیے طیار کرنا اور بھی مفید ہوگا۔

کسانوں کے مفید مطلب احکام جاری کرنا اس سلسلے میں جو قدم آپ اٹھائیں گے اس کے لئے آسانی پیدا کر دے گا۔

۲۔ ادنیٰ اور متوسط طبقے کے بورژ د لوگوں کو حکومت کی طرف کھینچنا یا کم از کم ایسے حالات پیدا کرنا کہ ان کا رویہ حکومت کے متعلق غیر جانبدارانہ ہو جائے بڑا ضروری امر ہے یہ بات جائداد ضبط نہ کرنے کی ضمانتیں دینے اور جہاں تک ممکن ہو تجارت کی آزادی

دینے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر یہ حکمت عملی بروئے کار نہ لائی گئی تو وہ لوگ فسطائی فوجوں سے مل جائیں گے۔

۳۔ جمہوری جماعت کے لیڈر یعنی بورژوا لوگ (Bourgeois) جماعت سے نکالے نہ جائیں۔ بلکہ انہیں حکومت کے قریب تر لانا چاہیئے اور ہر طرح سے ترغیب دلائی جائے کہ وہ حکومت کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹائیں۔ جنرل ازانا اور اس کی پارٹی کی امداد اور اعانت حاصل کرنا حکومت کے لئے خاص طور پر ضروری ہے اور ان کی اجنبیت دور کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ ایسا کرنا اسپین کے دشمنوں کا منہ بند کرنے کے لئے بہت ضروری ہے جو اُسے اشتمالی جمہوریت کا نام دیتے ہیں۔ اور اس بہانے سے جو کھلی ہوئی مخالفت ہو رہی ہے اس سے اسپین کو بچانے کے لئے یہ امر لازمی ہے کیونکہ بیرونی مداخلت جمہوریت اسپین کے لئے سب سے بڑھکر باعث خطر ہے۔

۴۔ ایسے مواقع کی تاک میں رہا جائے جبکہ یہ اعلان کر دیا جائے کہ حکومت سپین دوسرے ملکوں کے باشندوں کی جائداد اور جائز مفاد پر کسی قسم کی دست درازی نہیں کرے گی بشرطیکہ وہ ایسے ملکوں کے رہنے والے نہ ہوں جو باغیوں کی مدد کر رہے ہیں"

اصل خط روسی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس کا ایک فرانسیسی ترجمہ کیبلرو کے پاس پہنچا۔ مندرجہ بالا خط ایک جرمن ترجمہ سے انگریزی اور انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے (مترجم) اس لئے نتیجتاً ممکن ہے کہ طرز بیان کی خوبصورتی میں فرق نمایاں ہو گیا ہو۔ مگر اس کے نفس مضمون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

یہ خط کیبلرو کے راز زوال پر بھی کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ یہ اس کے زوال کے تھوڑے عرصہ قبل لکھا گیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ خط میں پیش کردہ تجاویز پر کیبلرو کہاں تک رضامند یا نارضامند تھا ہمیں اس کے سوانح حیات کے شائع ہونے تک انتظار کرنا چاہیئے۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ ان تجاویز میں سے جو سب سے زیادہ اہم تھی اس پر عمل درآمد نہیں کیا گیا اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ ہم بیرونی

لوگوں کو معلوم نہیں، مگر اتنی بات تو صاف نظر آتی ہے کہ رفیق روزنبرگ ضرور اس ذمہ داری میں شریک تھے۔ کیونکہ حکومت سپین کی طرف سے اس پر بڑا اعتراض یہی تھا کہ وہ اپنی لیاقت اور قابلیت سے باہر ہر شعبہ میں منصبی مداخلت کرتا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسے ایسا کرنے کی ہدایات نہ تھیں لیکن اس نے ہدایات کے خلاف عمل کیا۔ بڑی اہم بات یہ ہے کہ خط لکھے جانے کے کچھ عرصہ بعد اسے سپین سے بلا لیا گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ابھارنے پر دائیں بازو کے مدبرین نے کبیلرو کی حکمت عملی کی مخالفت کی تھی انہیں حکومت میں بارسوخ عہدے دے گئے یقیناً انھوں نے خط میں پیش کردہ کچھ تجاویز کو ماننے اور دوسری کو رد کرنے میں بڑی ناعاقبت اندیشی سے کام لیا ہوگا۔

ایک بات اس خط میں بڑی مبہم سی ہے۔ اور اس لئے اس میں بجا طور پر غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ اور بدنیتی سے اس کی غلط ترجمانی بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ بات انقلاب اسپین کی ترقی میں پارلیمانی طریق کار کے بڑے بڑے امکانات سے متعلق ہے۔ لیکن ذرا اس کا تجزیہ کیا جائے تو لکھنے والوں کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب اس قدر عجیب و غریب ہے کہ انقلابی ترقی میں ایک نئے نظریہ کا آغاز ہوتا ہے جس کا تصور روایتی مارکسیت میں نہیں ہے۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ اشتراکیت کا حصول یوں بھی بغیر پرولتاریہ آمریت کے انقلابی دور کے ممکن ہے۔ اگر ہسپانوی انقلاب محض بورژوا جمہوری انقلاب (Bourgeois Democratic Revolution) کی حیثیت رکھتا تھا تو اس کی ترقی کو آئینی طریق پر حاصل کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا یہ اعتراض صرف اس وقت معقول ہوتا جبکہ اس انقلاب سے یہ امید رکھی جاتی کہ وہ ترقی کرتے کرتے اشتراکیت کے قیام کی جدوجہد میں بدل جائے گا۔ روایتاً یہ بات کٹر مارکسیت کا جزو ایمان بن گئی ہے کہ اشتراکیت کی جدوجہد پرولتاریہ آمریت کو پہلے ہی سے فرض کر لیتی ہے جو پارلیمانی طریق کار کے مخالف ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ایک ایجابی طریق کار پر عمل پیرا ہو کر اشتراکی انقلاب نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اسٹالین کو یہ توقع تھی کہ سپین کا انقلاب اس طریق کار سے عمل میں آ سکے گا۔ اسے کبھی یہ یقین نہ آ سکتا تھا کہ اس بین الاقوامی

طبقہ وارانہ جنگ کے دور میں جبکہ دنیا کا اصل تنازعہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کے درمیان ہے
ہسپانوی انقلاب آخر میں بورژوا جمہوری انقلاب کی حدود سے تجاوز نہیں کرے گا اور اشتراکیت
کے قیام کی جدوجہد کی صورت اختیار کرے گا۔ کیا یہ فرض کر لینا غلط تھا کہ یہ ترقی شاید پارلیمانی طریق
کے ذریعہ وقوع پذیر ہو سکتی تھی۔ یا یوں کہئے کہ پرولتاریہ آمریت کے قیام کی ضرورت باقی نہیں معلوم
ہوتا ہے کہ یہ تجویز اسی مفروضہ کی بنا پر پیش کی گئی تھی۔ استالین نے اپنے خط میں جو تجاویز سجھائی ہیں۔
ان میں سے ایک تجویز سے یہ بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نظریہ کو غلط قرار دینا گویا اپنی رائے
کو بالکل وہم سمجھنا ہوگا۔ کیونکہ بورژوا جمہوری انقلاب (Bourgeois Democratic Revolution)
پرولتاریہ کی زیر قیادت عمل میں آیا ہو تو پھر پرولتاریہ آمریت کی ضرورت ہی اُٹھ جاتی ہے۔ یہ
خیال محض فضول ہوگا کہ وہ انقلابی جمہوری ریاست جو پرولتاریہ نے خود قائم کی ہو اور اسی کے
زیر اثر ہو۔ پرولتاریہ جماعت اسی کا تختہ الٹ کر ایک خالص اپنی ریاست قائم کرے۔ جمہوری آزادی
کی ایسی جدوجہد جس کی باگ ڈور صرف پرولتاریہ جماعت کے ہاتھوں میں خود اس بات کا امکان
پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اس آزادی کو اشتراکیت کی تعمیر کے کام میں استعمال کرے۔ ورنہ اگر یہ بات
نہ ہو تو خالص پرولتاریہ قیادت سے فائدہ؟

(ایم۔ این۔ رائے)

(مترجمہ آفتاب احمد خانصاحب)

محسن کاکوروی اور غزل

(از پروفیسر سراج احمد صاحب علوی فانی ایم اے)

حضرت محسن کاکوروی کی ذات محتاج تعارف نہیں اس لئے کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص نکلے جو ادب اور شاعری سے ذوق رکھتا ہو اور ان کے مشہور مدحیہ قصیدہ لامیہ کے چند شعر اس نے نہ سنے ہوں۔ جو "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" کے مشہور مصرع سے شروع ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ مقبول خاص و عام رہا۔ اگرچہ لامیہ قصائد اکثر شعرا نے لکھے لیکن سچ تو ہے کہ محسن کے قصیدہ کی کوئی گرد کو بھی نہیں پہنچا، اس کا سبب چاہے اس کا مقبول بارگاہ رسالت ہونا سمجھئے، یا اس میں مقامی رنگ کی تشبیہوں۔ تلمیحوں اور استعاروں کو اس کی مقبولیت کی دلیل سمجھئے، بہرنوع یہ مسلم ہے کہ محسن کی شاعری کی دنیا میں شہرت کا باعث یہی ایک قصیدہ ہے۔

حضرت محسن کے کلام کے متعلق ہمیں کہیں اور کسی قسم کی اظہار رائے یا تنقید نہیں ملتی صرف دو تین ہلکے قسم کے مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوئے جو محسن ایسے بلند پایہ شاعر کے شایان شان نہیں، اور ان مضامین میں بھی بیشتر یا تو ان کے جزئی حالات زندگی ہیں یا پھر ان کے نعتیہ کلام کے متعلق معمولی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن میرے خیال میں کسی شاعر یا مصنف کے کلام یا تصانیف پر اگر مختلف زاویوں سے نظر ڈالی جائے اور اس کی تصانیف کے ہر ہر نقش کو اجاگر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ مصنف یا شاعر کا صحیح مرتبہ اور اس کے کلام کا صحیح معیار اسی طرح معلوم ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت محسن کاکوروی کی تمام شہرت جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ان کے مدحیہ کلام کی بدولت ہے اور کیوں نہ ہوتی جب کہ اس کا ہر شعر انتہائی خلوص اور عقیدت سے لکھا گیا ہو، مادی دنیا کے مادہ پرست حضرات خواہ اسے دیوانگی سے تعبیر

کریں خواہ توہم پرستی اور غلو یا نہ عقیدت کہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ مداح پیغمبر نے مدح کا ایک شعر کبھی بلا وضو نہیں لکھا جس شب کو طبیعت موزوں ہوتی ملازم کو یہ حکم دیا جاتا کہ خلوت میں اگر کی بتیاں اور عود سلگا دے اور خود نہایت مودب بیٹھ کر فکر شعر کرتے اور آج فکر شعر کے لئے جام و سبو درکار ہے "ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا" اس پر بھی ان کے کلام کو مقبولیت حاصل نہ ہو تو جائے حیرت ہے۔ جس شاعر کی یہ تمنا ہو کہ :-

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ میرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل

اور جو روز محشر اس شان سے نکلنا چاہتا ہو کہ :-

صف محشر میں تیرے ساتھ ہو تیرا مداح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل

اور جس کی عقیدت و محبت اس حد تک پہنچ گئی ہو کہ وہ اس بات پر فخر کرتا ہو کہ :-

سب سے اعلیٰ تری درگاہ ہے سب سے افضل
مرے ایمانِ مفصل کا یہی ہے مجمل

ظاہر ہے کہ اس کی ربودگی اور والہانہ شیدائیت کا اثر دوسرے قلوب پر کیوں نہ ہوگا۔

اس لئے میں اس صحبت میں محسن کے مدحیہ کلام کے متعلق کوئی تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ اور نہ ان کے محاسن بیان کرنا چاہتا ہوں بلکہ میرا مقصد اس وقت حضرت محسن کو ایک نئے لباس میں پیش کرنا ہے اور ان کی شاعری کا وہ رخ سامنے لاتا ہے جو عام نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور جسے مولف شعر الہند اپنی ژرف نگاہی اور نکتہ سنجی کے باوجود نظر انداز کر گئے اور وہ ان کا تغزل ہے۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ حضرت محسن نے غزل کو بہت کم نوازا اور جو غزلیں انھوں نے لکھیں اسکا بھی ایک بڑا حصہ نعت کے مضامین سے پُر ہے، لیکن اس کے باوجود جو قلیل سرمایہ عاشقانہ غزلوں

کا موجود ہے، اس سے اُن کے رنگ طبیعت کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے نعت کے پیچھے غزل اور دوسری اصنافِ شاعری کو تج نہ دیا ہوتا تو آج غزل گو شعرا کے دبستان میں ان کا ہی طوطی بولتا نظر آتا۔

حضرت محسن کی غزل پر اظہار رائے کرنے سے پیشتر ان کی خصوصیات کا مختصراً بیان کر دینا اور یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ کس دبستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جن حضرات کو اُن کے قصائد نعتیہ اور مثنوی چراغ کعبہ اور صبح تجلی وغیرہ کے مطالعہ کا اتفاق ہوا ہوگا۔ وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ محسنؔ دبستان لکھنؤ کی پیداوار ہیں۔ نعت میں ان کا وہی درجہ ہے جو مرزا دبیر کا مرثیہ میں۔ غزل میں بھی اسی اسکول کا رنگ نمایاں ہے، آتش کی طرح شیریں اور موٹے موٹے الفاظ، بے تکلفی صحت اور صفائی زبان ہر شئے بدرجہ اتم موجود ہے، لیکن بعض اشعار میں مضامین کی اوسط درجہ کی بلندی پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ روش زمانہ کے مطابق تناسب لفظی کا بھی کہیں کہیں التزام ہے لیکن جہاں بے تکلفی اور سادگی سے کام لیا ہے، وہاں ان کے اشعار آتش کے نشتروں سے کم نہیں ہیں۔

اب میں ان کی مختلف غزلوں کے چند شعر پیش کرتا ہوں جن سے ان کی صنف غزل میں قادر الکلامی اور علو مرتبگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خیال یار کو عاشق ہمیشہ عزیز رکھتا ہے۔ اور اس کے پیچھے اپنی عزیز ترین متاع کھو دینے میں اسے دریغ نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ تصویر یار کے دل میں جاگزیں ہونے کے بعد پھر دل کسی کام کا نہیں رہتا۔ اور تمام جذبات ماسوا سے وہ عاری ہو جاتا ہے۔ تصویر یار کی دولت کے آگے سب ہیچ ہے، ہر شاعر نے اس مضمون کو پائمال کیا۔ محسن کی طرز ادا دیکھئے

خیال یار رہے دل اگر نہ ہو نہ سہی　　نہ جائے زلف کا سودا جو سر نہ ہو نہ سہی

عشق کی دنیا تسلیم و رضا کی دنیا ہے اور در اصل کشمکش ناز و نیاز ہی کا نام عشق ہے، احکام عشق کی یہ تصویر کسی نے یہ کیا کھینچی ہے ؎

سر بہ وقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے

اور کسی نے اس طرح تصویر دکھائی ہے ؂

میں سر جھکائے اور وہ خنجر لئے ہوئے

محسن کا کھینچا ہوا مرقع دیکھئے ؂

سر جھکائے ہم ہیں وہ تلوار کو کھینچے ہوئے

یہ نیاز عاجز کا اور وہ ناز ہے مغرور کا

عاشق کے لئے مژدۂ وصل بڑی چیز ہے۔ جس کی آرزو اور انتظار اس کی عین حیات ہے، اس کی تمام کاوشیں، اس کی تمام تکلیفیں اور مہجوری کی المناکیاں صرف اس ایک خیال کے ماتحت قابل برداشت ہو جاتی ہیں کہ وصال محبوب آناً فاناً ان کی تالیف کر سکتا ہے۔ یہ خیال صرف خیال کی حد تک نہیں رہتا بلکہ یقین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور مہجور یار یہاں تک وصال یار کی قوت اور عالمگیر اثر پر ایمان رکھتا ہے کہ اس کے نزدیک ایک ادنیٰ سے وصل کا وعدہ کائنات کی ہر شے کو اس کا پابند بنا سکتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ وصال یار میں وہ قوت اور اہمیت ہے کہ ہر شے یار کی موافقت کے ساتھ اس کی موافقت اور معاونت کے لئے تیار ہو سکتی ہے۔ اس حسن ظن اور سادگی یقین کا کیا ٹھکانا۔ شاعر اس خیال کو کس خوبی سے ادا کرتا ہے۔

رات ابھی دوڑتی آئے جو کر و وعدۂ وصل

کہئے تو چار، گھڑی دن سے اندھیرا ہو جائے

رات کا دوڑے آنا اور چار گھڑی دن سے اندھیرا ہو جانا کس خوبی سے عاشق کے یقین اور اعتماد اور ساتھ ہی ساتھ اس ہیجان کا پتہ دیتی ہے۔ جو صرف اس خیال سے پیدا ہو گیا کہ وعدۂ وصل کا امکان ہے۔ شراب انگوری ہو یا حافظ کی شراب معرفت۔ ہیں دونوں شراب اور شراب کا طالب ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ وہ ہر وقت اس سے لطف اندوز ہوتا رہے، اس کی خواہش اور طلب دیوانگی اور جنوں کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ جبکہ

حسن اتفاق سے ایسے سامان مہیا ہو جاتے ہیں جو خواہش کی آگ اور مے کے اثر کو اور تیز کر دیتے ہیں اور طالب مے جوش طلب کی خود فراموشی کی حالت میں اگر مے تک دسترس نہیں پاتا تو اور بیچین ہو جاتا ہے۔ اس حالت کا نقشہ محسن نے یوں پیش کیا ہے ؎

شیشے سے نکل رند مے آشام ہیں بیچین
غمزے نہ کر اے دختر رز ایسی گھٹا میں

شمع و پروانہ کی داستان ایسے دو اشارات ہیں جنھیں شعرا نے نہ جانے کس کس انداز سے پیش کیا ہے۔ یہ اشارات محبت کی گہرائی اور جوابی محبت کے ثبوت کے لئے بہت موزوں سمجھے گئے عشق کی تکمیل کا منظر خاکستر پروانہ اور شمع کی سوزش کر دیتی ہے، کبھی یہی سوزش عشق اس صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے کہ عشق کے دونوں حریف اس طرح ایک دوسرے میں حل ہو جاتے ہیں کہ ان کی تمیز دشوار ہو جاتی ہے، خدائے سخن حضرت میر نے عشق کے اس مقام کو کیسے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

یک رنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے　　گل میں رگیں نہیں یہ ہیں نقش پائے بلبل

محسن نے بھی اس تکمیل محبت کی تصویر کھینچی ہے اور بالکل نئے انداز سے۔

شب کو یہ جذب محبت کا تماشا دیکھا　　شمع پروانے کے ساتھ اڑ گئی جگنو ہو کر

دختر رز کی تو سب سے آشنائی رہی ہے اور رند و زاہد ملا و محتسب سب ہی اس کے بیحد گرویدہ رہے)

مگر یہ امر معلوم ہے کہ ؎ گوہر ہر کس ازیں لعل توانی دانست۔ کے مصداق ملا اور محتسب کہاں تک اس کے اہل ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شراب بدنام ہوئی ہے، اس لئے محسن بھی اس لعل کو بے قدروں کے ہاتھوں میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

سنا ہے محتسب بھی تاک میں ہے دختر رز کی　　الٰہی رکھ لے تو حرمت شراب ارغوانی کی

پھر ایسی حالت میں کہ شراب کی اہمیت کا یہ عالم ہو۔ جرم ٹھہرا ٹوٹ جانا شیشۂ انگور کا۔

بہار کی فضائیں اور بادلوں کی سیہ مستی جب بے حس سے بے حس شخص کے دل میں ایک کیفیت پیدا کر دیتی ہے تو رند اور فطرت پرستوں کی مستیوں کا پوچھنا ہی کیا۔ شاعر ان کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے۔

مبارک میکشو کس دھوم سے شورش ہے بادل کی
خدا حافظ ہے بادل کا صراحی بے طرح چھلکی

یار کی باغ میں آمد ہے گھٹا چھائی ہے
کہو تیار رہیں ساغر و مینا والے

عاشق اپنی ہستی کو اور اپنے عشق کو دنیائے عشق میں سب سے اہم اور بلند تصور کرتا ہے۔ غیرت عشق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کوئی مد مقابل نہ ہو۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ہستی کائنات عشق کو پوری طرح سمیٹ کر اپنا لینے کی اہلیت رکھتی ہے اور یہ وسعت ظرف اور علو ہمتی عشق کا تقاضا ہے وہ اپنے آگے بڑے بڑے مدعیانِ عشق کو بے حقیقت سمجھتا ہے اس لئے کہتا ہے۔ ؎

قضا نے کس لئے فرہاد و قیس کو چھیڑا
مجھی کو پہلے بلانا تھا امتحاں کے لئے

تعطل اور جمود عشق کی دنیا میں عشاق کے لئے سب سے زیادہ حوصلہ شکن اور صبر آزما شے ہے۔ عشق کی بہار یہی ہے کہ محبوب کی لگاوٹیں خواہ ظلم و ستم کے جامے میں ہوں خواہ پرسشِ نگاہ کی صورت میں، جاری رہیں اور دل مبتلا کے لئے حیات نو کا باعث ہوا کریں۔ یہی اس کی غذا ہے اور عشق اسی پر جیتا ہے۔ اس لگاوٹ کا ایک پہلو عداوت بھی ہے اور عشق کے اظہار کے لئے کافی ہے اور اسی بنا پر غالب نے کہہ ڈالا ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

لیکن محبوب کی ایک سرے سے بے تعلقی جسے نہ تغافل کہہ سکیں اور نہ ظلم جذبات عشق کو متلاطم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اور جو سکرات اس وقت عشق پر طاری ہوتا ہے اس کے کرب کا اندازہ ناممکن ہے۔ اس خیال کو محسن یوں پیش کرتے ہیں ؎

کیں ابتدا میں تم نے غضب کی لگاوٹیں
عادت خراب کی دلِ خانہ خراب کی

اکبر الہ آبادی کا شعر ہے ؎

بتکدے میں شور ہے اکبر مسلماں ہو گیا
بے وفاؤں سے کوئی کہہ دے کہ ہاں ہاں ہو گیا

مطلب یہ ہے کہ بیوفائی کا جواب بیوفائی سے دیا گیا اور یہ آئین عشق کے خلاف ہے مجنوں نے بھی اسی کے قریب کہا لیکن اکبر کے دانت کے بدلے دانت والی مذموم اور مذہب عشق کے خلاف راہ نہیں اختیار کی جس طرح عشق رقابت برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح حسن بھی شرکت سے بیزار رہے، اور اسے اپنی توہین سمجھتا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ اپنے پابند کو اپنا ہی پابند رکھے اور کسی غیر کا گذر بھی نہ ہو۔ شاعر اس نکتے سے واقف ہے اور حسن کے اس تار رگ کو چھیڑتا ہے، وہ حسن کا ایک رقیب پیش کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ ایسا حربہ ہے کہ جس کے اثرات سے بچنے کے لئے حسن کی قوتیں کام کرنے لگیں گی اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ عشق کی پذیرائی کی صورت میں ہوگا۔ کہتے ہیں ؎

اے بت تو مجھ سے نہ بگڑ وجہ خدا بنتے ہو
کہیں بندہ بھی نہ اللہ کا بندہ ہو جائے

ہجر و فراق کے مصائب کے خواہ وہ عشق مجازی سے متعلق ہوں خواہ عشق صوفی سے سنگین ہونے میں کلام نہیں، جو انقباض اور گرفتگی پیدا ہوتی ہے اس کا وہی کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں جنھیں کبھی اس سے سابقہ رہا۔ اور پھر جو انبساط اور غیر اختیاری جسمانی اور دماغی تبدیلی دفعتاً وصال یار سے پیدا ہوتی ہے، اس کا اندازہ کرنے والے بھی معدوم نہیں ہیں، لیکن عاشق کے لئے ہجر سے زیادہ وصال روح فرسا اور مزید کلفت کا باعث ہو جاتا ہے اور وہ اس وصل کے خیال سے کانپتا ہے، وجہ یہ ہے کہ عشق کے دعویٰ کا حسن کبھی اقرار نہیں کرتا حسن کی شانِ بے نیازی یہی ہے کہ عشق کی سپردگیوں کو جھٹلاتا رہے اور یہ چیز عشق کے لئے بدترین مصیبت ہے۔ ظاہر ہے کہ دیدار حسن یا بہ الفاظ دیگر وصال یار عاشق کی حالت زار کا نقشہ بدل دیتا ہے جو کرب ذہنی اسے فراق میں نصیب ہوتی ہے اس کا مظاہرہ وہ محبوب کے آگے نہیں

کرسکتا اور بارگاہ حُسن سے اسے بناوٹ اور جھوٹ کے خطابات ادا ہوتے ہیں۔ غالب مرحوم نے اس بیچارگی اور تکلیف کی کس خوبی سے تشریح کی ہے۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

محسن نے بھی اسی خیال کو پیش کیا ہے۔

نہ کہو مجھ سے وہ آتے ہیں عیادت کیلئے
دل بیمار نہ اس دھوکے میں اچھا ہو جائے

غالب کے یہاں تغیر حال "یار کی دید" پر منحصر ہے اور محسن کے یہاں صرف خبر آمد کافی ہے ظاہر ہے کہ "تنکے کے سہارے کی مصداق پہلی حالت سے دوسری حالت زیادہ بن سکتی ہے اور اس لحاظ سے حرمان کی جو تصویر محسن نے کھینچی ہے وہ غالب سے کہیں زیادہ مؤثر ہے۔

عشق کی تحلیل نفسی نے آج نہیں مدتوں پہلے یہ نکتہ حل کر دیا کہ عشق کے وجود کے لئے یا یوں کہیے کہ محبت آفرینی کے لئے کسی خاص تزئین حُسن اور کسی ٹھوس معیار کی ضرورت نہیں بلکہ اس جذبہ کی آفرینش کے لئے کوئی بہانا ہونا چاہیئے، نیچر اور فطرت انسانی میں یہ جزو ودلیعت رہا اور اب بھی ہے، صرف ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے منظر عام پر لے آئے اور محرکات کی دنیا لامحدود ہے، اس حقیقت کا فارسی شعراء نے بھی اعتراف کیا ہے اور اردو شعراء نے بھی خواجہ شیرازی فرماتے ہیں:۔

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق ازو خیزد　　　　کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگار یست

اور سچ تو یہ ہے کہ عشق خود حُسن کو حُسن بنانے اور اس میں بڑی حد تک رعنائیاں پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

کچھ وہ ہے حسیں کچھ مری نظر میں بھی حسیں ہیں

محسن نے اس حقیقت کو نہایت لطیف اور سبک انداز سے پیش کر دیا ہے فرماتے ہیں

اک آن ہو جس میں وہ حسین ہے　　　　یوسف ہونے کی قید کیا ہے

"آن" کہہ کر اسباب محبت کے وسیع دفتر کو سمو لینا اور حسن کی معراج کو "یوسف" کہہ کر اسے تفصیل سے بے نیاز کر دینا محسن کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ اب طرز ادا، سلاست اور روانی کے چند نمونے دیکھو کہ کس طرح بیان کی بے ساختگی اور طرز ادا کی سادگی نے شعروں میں جان ڈال دی ہے۔ جب انسان رنج اور تکلیف کا خوگر ہو جاتا ہے، یا تلاش منزل کی سعی اور فکر کی لذتوں سے لطف اندوز ہو جاتا ہے تو اسے سکون اور جمود کی حالت میں ایک کلفت محسوس ہونے لگتی ہے اور دل کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ پھر انہی کاوشوں میں گرفتار ہو جائے اور اس کی زندگی ایک سعی لاحاصل کی خواہش میں پوشیدہ نظر آتی ہے۔ اور منزل کی قربت بجائے مسرت کے دل کو پژمردہ کر دیتی ہو غالب نے "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں" کہہ کر اسی لذت سعی کی طرف اشارہ کیا ہے، محسن بھی اسی خلش کو محسوس کرتے ہیں اور تقاضائے دل کو یوں پیش کرتے ہیں ؎

تڑپ تڑپ کے تو پہنچا ہوں کوئے دلبر تک
یہاں سے اے تپش دل اٹھوں کہاں کے لئے

سودا کا ایک شعر ہے ؎

فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے

شعر کیا ہے۔ اعجاز ہے زندگی کی مختصر مدت اور دنیا بھر کی ذمہ داری، خواہشات، تمنائیں اور ایک سے ایک بڑھ کر دلفریب و دلکش اور اس کا پورا نہ ہونا اور پھر اس سے جو حسرت اور ارماں نصیب ہوتا ہے ان سب کا ایسا مکمل مرقع پیش کرنا سودا ہی کا کام ہے جس کا جواب آج تک نہ ہو سکا، انسانی بیچارگی اور شکست کا اس سے بہتر اور دردناک ثبوت آج تک کوئی نہ پیش کر سکا۔ شیفتہ نے اسی ہجوم افکار کو آشفتہ خاطری سے تعبیر کیا ہے

اور انسان کی بے دست و پائی اور سکون کے فقدان کا یوں اظہار کیا ہے

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

لیکن محسن کی دور بین نگاہ نہ صرف فقدان سکون کو محسوس کرتی ہے اور اس کی شکایت کرتی ہے بلکہ یہ اسے ایسی خطرہ ہے کہ کہیں یہ بے اطمینانی انسان کے لئے دوامی نہ ہو اور انسان کی تکالیف کے اختتام کا کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ تو پھر زیست دوامی حاصل کرنے کی سعی بھی رائیگاں جائے

چنانچہ فرماتے ہیں ؎

شب فراق نہ ہو روز انتظار نہ ہو تو ہم بھی فکر کریں عمر جاوداں کیلئے

حقیقت یہ ہے کہ تشکیل فطرت انسانی کا حصّہ ہے اور یہ دل کا چور نا پید نہیں ہو سکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مداح پیغمبر کے دل میں بھی کانٹا چبھ رہا ہے، ایک جگہ مدح کے مضمون کو اس خوبی سے تغزل کے رنگ میں ادا کیا ہے کہ کہیں اس کا خیال نہیں گذرتا کہ اس شعر کا مخاطب صرف نسل انسانی کا بادشاہ ہے۔

نہ لگے تجھ کو نظر اے قدرعنا والے
بے طرح گھورتے ہیں عالم بالا والے

محسن کی بعض غزلیں جو چھوٹی بحر میں لکھی گئی ہیں سلاست اور روانی میں اور طرز ادا میں اس معیار کی ہیں کہ ان پر غالب و مومن کی غزلوں کا دھوکا ہوتا ہے۔ آتش کے دبستاں کے ایک نمائندے کے قلم سے یہ شعر کس قدر حیرت انگیز ہیں۔

ایک آفت جاں تری ادا ہے عاشق کو قضا کا سامنا ہے
دامن سے وہ پونچھتا ہے آنسو رونے کا کچھ آج ہی مزا ہے
لیلی کو پکارتا ہے بن میں مجنوں تجھے آج کیا ہوا ہے
محسن کو واعظو نہ چھیڑو
اچھا ہے جو کچھ برا بھلا ہے

لیکن ان نایاب اور بیش بہا موتیوں کے ساتھ وہ خزف پارے بھی ہیں جو دبستان آتش کے تمام خصوصیات کے حامل ہیں جن میں شعر کا دار و مدار لفظی مناسبات اور غریب استعاروں اور تشبیہوں پر ہے لیکن اپج سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً یہ شعر

خدا نے تل کیا پیدا لب رنگین جاناں پر
تو گویا تیل چھڑکا آتش لال بدخشاں پر

لب یار کو آتش لعل بدخشاں سے تعبیر کرنا اور اس پر تیل چھڑک کر اسے بھڑکانا اور اس سے زینت حسن میں اضافہ کرنا صرف آتش ہی کے اسکول کے شعراء کا کام ہے، دوسرا اس فرض سے اس خوبصورتی کے ساتھ عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شعر سنئے :-

فرہاد نہ پوچھ سختی ہجر
دن آج پہاڑ سا کٹا ہے

اگرچہ شعر میں مناسبات کا خاص التزام ہے لیکن دوسرے مصرعے میں محاورے کی بے تکلف بندش نے اس کی ثقالت کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے اور ہجر کی سختی کا واقعی احساس پیدا کر دیتا ہے۔

ایک شعر اس ضمن کا اور سنتے چلئے :-

آنکھ پر ٹھہری نظر مائل ابرو ہو کر
ہم پھرے کعبہ سے اے قبلہ تو ہندو ہو کر

ابرو کے حسن سے متاثر ہونا پھر آنکھوں کے اعجاز سے مسحور ہو جانا تسلیم، لیکن اسے کعبہ سے ہندو ہو کر نکلنے سے تعبیر کرنا بالکل نئی ترکیب ہے اور طرز ادا ہے جو لکھنؤ مدرسہ کے لئے باعث فخر ہے۔ اس سلسلہ کے دو تین اشعار اور سنئے۔

ہونے نہ پائی خشک بھی تر دامنی مری
محشر میں دھوپ ڈھلنے لگی آفتاب کی

گلے تک سیل اشک آ کر ہمیں آخر میں لے ڈوبا
چڑھانا دوش پر لازم نہ تھا اس طفل بد خو کا

لیکن یہ رنگ وافر نہیں ہے اور حیرت کا مقام یہ ہے کہ محسنؔ نے اس کو کس طرح جائز رکھا، اس لئے کہ لکھنؤ کے عام مذاق شاعری میں اس وقت تک تناسب لفظی کی بھرمار تھی۔

مندرجہ ذیل اشعار کہتے ہیں کہ دہلی کی شاعری کا اچھا خاصا اثر ان کی غزلوں میں پایا جاتا ہے[۵]

صاحب غیر دل سے جی خفا ہے — اور کیا اب مجھے آپ سے گلا ہے

بادل ہر سو گرج رہا ہے — طوطی مستوں کا بولتا ہے

اے مسیحا ترے بیمار کی یہ حالت ہے — نہ دوا چلتی ہے اس پر نہ دعا چلتی ہے

دشمن دود ست پہ شمشیرِ جفا چلتی ہے — آج کچھ اور ہی مقتل میں ہوا چلتی ہے

جھلملاتی نظر آتی ہے مجھے شمع حیات — صبح پیری ہے عیاں بادِ فنا چلتی ہے

تارِ نفس نے دیں خبریں اضطراب کی — اللہ خیر ہو دلِ خانہ خراب کی

سادگی کی قدر کچھ عہدِ جوانی نے نہ کی — جو اُمنگ آئی طرفدارِ خود آرائی ہوئی

رفتہ رفتہ یہ بڑھا ہے اس کو عاشق سے حجاب — یاد بھی اب دل میں آتی ہے تو شرمائی ہوئی

شب کو یہ جذب محبت کا تماشا دیکھا — شمع پروانے کے ساتھ اڑ گئی جگنو ہو کر

رو کے دھو ڈالئے سب نامۂ اعمال اپنا — چشمِ رحمت میں گذر کیجئے آنسو ہو کر

سُنا ہے محتسب بھی تاک میں ہے دخترِ رز کی — الٰہی رکھ لے تو حرمت شرابِ ارغوانی کی

جیتے تو ہٹتے پاؤں نہ بتخانے سے مگر — دھوکا دیا زمانۂ ناپائیدار نے

رُو برو جس کے تو آئے اسے سکتا ہو جائے — نقش دیوار ترا آئینہ خانا ہو جائے

اے بتو مجھ سے نہ بگڑو جو خدا بنتے ہو — کہیں بندہ بھی نہ اللہ کا بندا ہو جائے

نہ کہو مجھ سے وہ آتے ہیں عیادت کے لئے — دلِ بیمار نہ اس دھوکے میں اچھا ہو جائے

دامن سے وہ پونچھتا ہے آنسو — رونے کا کچھ آج ہی مزا ہے

صنم کدے سے اٹھوں زاہد و جناں کے لئے — کہاں سے مجھ کو اٹھاتے ہو تم کہاں کیلئے

سوادِ نجد نہ صحرائے بے ستوں چھوڑا — ہمارے شوق نے بھٹکے کہاں کہاں کے لئے

حالت نہ پوچھئے مرے شیب و شباب کی — دو کروٹیں تھیں عالم غفلت کے خواب کی

روئے عرق فشاں پہ ہے سرخیِ شراب کی — شبنم سے ہے لگی ہوئی لو آفتاب کی

کیا قہر ہے چھڑا کے گلستانِ میکدہ — لائے بہشت میں مری مٹی خراب کی
شیشہ سے نکل رندئے آشام ہیں بے چین — غم ہے نہ گرائے دخترِ رز ایسی گھٹا میں
شرمائی ہوئی آنکھوں کی چتون ہے قیامت — شوخی کی جھلک قہر ہے انداز حیا میں
برباد کی اُمنگ ہمارے شباب کی — مٹی خراب کی دل خانہ خراب کی
رفتہ رفتہ یہ بڑھا ہے اس کو عاشق سے حجاب — یاد بھی اب دل میں آتی ہے تو شرمائی ہوئی
کسی کو منزلِ دلبر کا راستا نہ ملا — ہزاروں کھو گئے اس راہ میں پتا نہ ملا
نہ دین کے ہوئے محسنؔ ہم اور نہ دُنیا کے — بتوں سے ہم نہ ملے اور ہمیں خدا نہ ملا

ابھی دیکھے ہی نہیں قامتِ رعنا والے — بہت اونچے نہ بڑھیں سدرہ وطوبےٰ والے
قطرہ قطرہ میں مرے اشک کی موّاجی ہے — مجھ سے کیا آنکھ ملائیں لبِ دریا والے

مندرجۂ بالا اشعار میں جہاں دلی کا رنگ گہرا ہے وہاں کہیں کہیں لکھنوی انداز بھی ظاہر ہو جاتا ہے، لیکن اشعار کے پڑھنے کے بعد غالباً اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا کہ حضرت محسنؔ نہ صرف نعت گو شعرا میں ہی بلند ترین مرتبہ رکھتے ہیں بلکہ لکھنؤ اسکول کے غزل گو شعرا میں بھی ان کا ایک امتیازی درجہ ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ تعصب اور غیر ضروری تنقیص کے دامن کو چھوڑ دیا جائے۔

انتظار

(از حضرت بسمل سعیدی ٹونکی)

وعدہ خلافِ وعدۂ فردا کب آئے گا
یارب وہ میرا بھولنے والا کب آئے گا

اب وہ نوید ذوقِ تمنا کب آئے گا
فردوسِ دل، بہشتِ نظارہ کب آئے گا

جانِ ادا و ناز سراپا کب آئے گا
میری طرف نہ دیکھنے والا کب آئے گا

بے دیکھے رہ سکوں نہ جسے دیکھ ہی سکوں
وہ آفتاب ذوقِ نظارہ کب آئے گا

حسنِ صبیح، میرے تصور سے رنگ رنگ
یارب مجھے نظر وہ تماشا کب آئے گا

چین جبیں، تلاطم امواج تیز تیز
پھر میری چشم شوق پہ غصہ کب آئے گا

دل ہے بجھا ہوا سا تمنا اداس ہے
وہ جانِ دل وہ جانِ تمنا کب آئے گا

کب تک رہے گا سلسلۂ اشک متصل
ان آنسوؤں کا پونچھنے والا کب آئے گا

اک میں ہوں اور سو تبسم نگاہیاں
رسوائیوں کا میری سہارا کب آئے گا

ہوتا ہے اس سے باغ میں جو موسم بہار
یارب بہار کا وہ زمانہ کب آئے گا

موجیں روش روش پہ نسیم جمال کی
سرو روانِ باغ تمنا کب آئے گا

وہ جس کا نقش نقش قدم صد نگار خانہ
وہ پیکر بہار سراپا کب آئے گا

اس میری جاں کی تجھ کو قسم ہے تجھے صبا
اس جانِ انتظار سے کہنا کب آئے گا

بسمل پھر آئے گا وہ ضرور آئے گا، مگر
اب اس کو یاد وعدۂ فردا کب آئے گا

انتخاب غزلیات

اشارے کُھل کے کر سکی نگاہِ شرمگیں کہیں
فراق ہو نہ ہو مگر یہ بجلیاں گریں کہیں

جھکی نظر سے دل تو کیا بنائے دہر ہل گئی
کہیں تھی اور پہونچ گئی یہ موجِ تہ نشیں کہیں

کہاں یہ دورِ آسماں کہاں یہ نظمِ زندگی
کہ لاکھوں ایسی محفلیں وہ آنکھیں لیے اُڑیں کہیں

یہ تیرگی یہ ابتری یہ پھبتیں یہ مستیاں
کہ کھل پڑی ہو جس طرح وہ زلفِ عنبریں کہیں

بس ابتدا ہی ابتدا ہے زندگیِ عشق میں
کہ بھول بھی سکی تری نگاہِ اوّلیں کہیں؟

نہ اب وہ دورِ عاشقی نہ اب وہ فرصتیں مگر
یہ درد بھی ضرور ہے کبھی کبھی کہیں کہیں

وہ رنگیاں نہ جا سکیں نگاہِ نازِ یار کی
ملال آفریں کہیں نشاط آفریں کہیں

کہیں تو لاکھوں داغِ دل ارے بھرے کھلے کھلے
دھواں دھواں اُداس اُداس وہ رُخِ حسیں کہیں

سکونِ عشق پر نہ جا ہے یوں تو عشق بے اثر
پلٹ نہ دے فلک کہیں اُلٹ نہ دے زمیں کہیں

فراقِ زیرِ چرخ کچھ چمک بھی ہے دھواں بھی ہے
کہ جیسے اُٹھ رہی ہو وہ نگاہِ سرمگیں کہیں

فراق گورکھپوری

نازک یہ مرحلہ ہے دلِ زار دیکھ کر
شکوہ سہی مگر نظرِ یار دیکھ کر

گلہائے لالہ رنگ کے چہروں کی آبھا
تم یاد آ گئے مجھے گلزار دیکھ کر

خونِ شہیدِ عشق ہے سرمایۂ بہار
کیا دل ہو شاد رونقِ گلزار دیکھ کر

اب کیا سمائیں میری نگاہوں میں جنتیں
عالم ہے اور جلوۂ رخسار دیکھ کر

سب حادثاتِ دہر فراموش ہو گئے
اُس جانِ کائنات کو غمخوار دیکھ کر

اختر ہے آپ حُسنِ کرم پر تُلا ہوا
عشقِ ادب سرشت کو خوددار دیکھکر

اختر تلہری

عشق اور آسودگیٔ شوق! میں قائل نہیں — جیتے جی آسان ہو جائے یہ وہ مشکل نہیں
آتشِ جاں سوز سے پانی ہوا جاتا ہے خوں — ذوق پھر بھی التماسِ شوق پر مائل نہیں
چاہنے والے کو چاہت کے سوا کیا چاہئے — کون سی لذت ہے اس لذت میں جو شامل نہیں

زخمِ دل کیونکر دکھائے کوکبؔ مجروحِ دل
بات بسمل کی وہ کیا سمجھے گا جو بسمل نہیں

کوکب شاہجہانپوری

عشق جنوں پرست ہے حسن جنوں نواز ہے — پردۂ سازِ زندگی ایک حریمِ راز ہے
کس نے جلا دیا یہ آج دل کا بجھا ہوا چراغ — محفلِ آرزو میں پھر شورشِ سوز و ساز ہے

منزلِ مہر و ماہ میں اس کا مقام سربلند
وادیٔ کہکشاں میں وہ محوِ خرامِ ناز ہے

منظفر حسین شمیم

بے مثال حسن ان کا بے بدل شباب انکا — اب کہاں نظیر ان کی اب کہاں جواب انکا
اس ادا سے بیٹھے وہ جیسے کچھ نہیں معلوم — دیدنی تھا محفل میں رنگِ اجتناب انکا
شکوہ کیا کریں اس کا اپنی اپنی قسمت ہے — غیر پر کرم ان کا، غیر پر عتاب انکا

جھلک نے کھل کے پردہ میں نہاں کافر جوانی ہے — مری گستاخ نظروں کی یہ ادنی مہربانی ہے

سرورِ کیف میں ڈوبی ہوئی انکی جوانی ہے
شرابِ ناب کے دریا میں موجوں کی روانی ہے

عظیم حیدرآبادی

پاس رہتا ہے دور رہتا ہے — دھیان میں وہ ضرور رہتا ہے
ہائے اس کی نوازشِ پنہاں — کس قدر دور دور رہتا ہے
شوق کی کامیابیاں تسلیم، — دل مگر ناصبور رہتا ہے
دل جو رہتا تھا اپنے پاس کبھی — وہ بھی اب دور دور رہتا ہے
ہائے عہدِ شباب کا عالم — چتونوں پر غرور رہتا ہے
حاصلِ عشق ہے یہی بسمل — یہ جو دل کو سرور رہتا ہے

ابن سعیدی

رفتارِ زمانہ

جاپان نے اس وقت خودسری کا جو انداز اختیار کیا ہے اسے دیکھ کر آپ کو شاید یاد آجائے کہ دنیا کی نئی سیاست کا پہلا قدم جاپان کا منچوریا پر حملہ تھا۔ نئی سیاست کو بسم اللہ کئے اب نو برس ہوگئے، اور آپ اس کی کارگذاری اور پھیلاؤ کو دیکھئے تو بڑا ہی اچنبھا ہوتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں یہ سیاست کمزور تھی اور مقابلے سے بھاگتی تھی، سرجون سائمن جو اُس وقت برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے۔ یہ سمجھے کہ اگر اسے کچھ بھیک دیدی گئی تو وہ خوش ہو کر بیٹھ رہے گی۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ آج کل مشرق کی بات کو مغرب تک پہونچنے میں دیر نہیں لگتی، جاپان کو کامیاب دیکھ کر جرمنی اور اٹلی کے حوصلے بھی بہت بڑھ گئے۔ ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ برطانیہ کی دولت اور ساری دنیا میں پھیلی ہوئی سلطنت کا صدقہ مانگ رہے ہیں، اصل میں وہ چاہتے تھے کہ یورپ کی نئی تنظیم کے بہانے سے یورپ پر قبضہ کریں۔ جرمنی کو ایک حد تک کامیاب اور برطانیہ کو اپنی حفاظت کی تدبیروں میں مصروف دیکھ کر اب جاپان نے پھر پیش قدمی شروع کی ہے۔ نئی سیاست نے مشرق اور مغرب کے سرے اس طرح ملا دئے ہیں کہ دنیا کے لئے ایک چکر بن گیا ہے۔

جرمنی اور جاپان کا ہر موقع سے فائدہ اٹھانا، ایک دوسرے کو سہارا دے کر اپنے اپنے سیاسی منصوبوں کو پورا کرنا کوئی اتفاقی بات نہیں ہے۔ نومبر ۱۹۳۶ء سے جب انھوں نے آپس میں ایک معاہدہ کیا جس کا نام کچھ تھا اور کام کچھ، ان کی سیاست آزاد رہی ہے مگر انھوں نے اس کا بہت خیال رکھا ہے کہ ایک دوسرے کا کھیل نہ بگاڑیں۔ جاپان نے جولائی ۱۹۳۷ء میں چین پر حملہ کیا تو جرمنی کے لئے ممکن تھا کہ وہ چین اور جاپان دونوں کے ہاتھ اپنا مال بیچے اور ان کی جنگ سے اپنی تجارت کو بہت فائدہ پہنچائے۔ مگر جاپان کے اصرار پر اس نے چین سے لین دین قریب قریب بند کر دیا اور جنگ کے ان جرمن ماہروں کو جو چین میں ملازم تھے واپس بلا یا۔

اس کے بدلے میں جاپان نے برطانیہ سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی اور سمجھیے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر جرمنی کو بتاتا رہا کہ اس کی مزاجی کیفیت کیا ہے۔ اس نے برطانیہ کے خلاف اپنی قوم کو بھڑکایا، چین میں برطانوی تجارت کو جہاں تک ممکن تھا نقصان پہنچایا، یانگ سی دریا میں اس کے جہازوں کی آمد و رفت بند کر دی، برطانوی سفیر کے موٹر تک پر بمباری تک کر دی اور آخر میں ٹی ایانٹس شہر کا محاصرہ کر کے وہاں کے بہت سے انگریزوں کو ستایا اور رسوا کیا۔

برطانیہ کی ۱۹۳۱ء سے یہ پالیسی تھی کہ جاپان کو جہاں تک ممکن ہو راضی رکھا جائے جب کبھی جاپان نے ان مختلف معاہدوں کے خلاف کچھ کیا جو اس کے، برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ملکوں کے درمیان مشترک طور پر ہوئے ہیں۔ جیسے کہ ۱۹۲۲ء کا نو ریاستوں کا معاہدہ، تو برطانیہ نے اسے فوراً ٹوکا، لیکن عملاً جاپان کی مخالفت نہیں کی۔ مخالفت کرنا آسان بھی نہیں تھا جب تک کہ امریکہ کی متحدہ ریاستیں برطانیہ کا پورا پورا ساتھ نہ دیں یعنی جنگ کا اندیشہ ہو تو برطانیہ سے مل کر جاپان سے لڑنے کا وعدہ نہ کریں۔ متحدہ ریاستوں کی عام رائے یورپ اور ایشیا میں اس طرح دخل دینے کے خلاف ہے۔ اور برطانیہ کی حکومت کو یقین رہا ہے کہ اگر جاپان سے لڑائی ہوئی تو متحدہ ریاستیں اس کا ساتھ نہ دیں گی۔ جاپان نے چین پر حملہ کیا تو انگلستان اور امریکہ میں اسے بہت برا بھلا کہا گیا۔ پریزیڈنٹ روزولٹ نے ایسی جوشیلی تقریریں کیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاپان سے لڑ بیٹھیں گے، لیکن جب چند مہینے بعد برسلز (Brussels) میں ان ریاستوں کی کانفرنس ہوئی جنھوں نے چین کی خود مختاری قائم رکھنے کا ذمہ لیا تھا تو اس کی کوئی امید نہ تھی کہ امریکہ والے میدان میں آئیں گے، اور ایسی حالت میں کانفرنس جھک مارنے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ اس کانفرنس کی ناکامی کے بعد برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ایڈن نے وہ بات صاف صاف کہہ دی جو اب تک کسی زبان پر نہیں آئی تھی۔ کہ برطانیہ اکیلا بحرالکاہل میں جاپان سے نہیں لڑ سکتا، کیونکہ جیتنے کے لئے جتنی طاقت چاہیے وہ برطانیہ کو دنیا کے اس حصے میں میسر نہیں ہے۔ یہی بات مسٹر چمبرلین نے بعد کو دہرائی اور اب صورت ایسی ہے کہ مسٹر چرچل

بے جیسے بلند ہمت آدمی کے لئے اسے دہرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اسی وجہ سے چند مہینے ہوئے جاپان نے برطانیہ کو اس پر آمادہ کر لیا کہ چینی حکومت کے اس چاندی کے ذخیرے کو جو ٹی ایپائنس برطانوی اور فرانسیسی بنکوں میں محفوظ تھا جنگ کے ختم ہونے تک چینی حکومت کو واپس نہ کرنے کا وعدہ کرے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ جاپان نے اس سڑک پر جو تھوڑے دن ہوئے برہما سے چین تک مال لے جانے کے لئے بنی تھی سامان جنگ بھیجنے کی ممانعت کرا دی اور برطانیہ کو شاید اس پر بھی راضی کر لیا کہ رنگون میں جاپانی نمائندے غیر سرکاری طور پر رہ کر اس کا اطمینان کرتے رہیں کہ ممانعت کے باوجود چینی حکومت کو اس رستے سے مدد نہیں پہونچائی جا رہی ہے۔

جاپان کو بے باک صرف برطانیہ کی صلح پسندی اور اُس کی اِس وقت کی مجبوریوں نے نہیں کر دیا ہے۔ پچھلے سال اگست میں جب روس اور جرمنی کے درمیان اچانک معاہدہ ہو گیا تو معلوم ہوتا تھا کہ جاپانی سیاست کو بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ جاپانی جرمن سیاست کے اس طرح قلابازی کھانے پر حیران بھی ہوئے لیکن پھر انھیں اس میں ایک مصلحت نظر آنے لگی اور وہ یہ کہ اب انھیں روس کی طرف سے کوئی خاص خطرہ نہ رہے گا۔ اور ایک طاقت جو ہر معاملہ میں ان کے مقابلہ پر آ جاتی تھی اب انھی کی سیاست کا سہارا بن جائے گی۔ آخر میں ہوا بھی یہی۔ روس نے جیسے جرمنی سے اتحاد کر لیا تھا ویسے ہی جاپان سے بھی صفائی کرا لی، اور جیسے جرمنی کو اس کا اطمینان دلا کر کہ روس کی طرف سے اس پر حملہ نہ ہوگا مغربی یورپ میں جنگ کا اعلان کرا دیا تھا ویسے ہی مشرقی ایشیا میں جاپان کو ایک محاذ کی طرف سے مطمئن کر کے اسے موقع دیا ہے کہ دوسرے محاذ پر دل کھول کر لڑے۔ کمیونسٹ سیاست کے رازداں کہتے ہیں کہ جرمنی اور جاپان سے اتحاد کر کے ستالن نے اس کا انتظام کر دیا ہے کہ سرمایہ دار ریاستیں آپس میں لڑیں اور اس طرح کمیونسٹ انقلاب اور پرولتاریہ کی حکومت کے لئے میدان صاف ہو جائے۔ انقلاب ہو یا نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ستالن کی حکمت عملی نے فساد بہت برپا کر دیا ہے۔

جاپان نے ایشیا کی نئی تنظیم کا جو ارادہ کیا ہے۔ کوئی بھید نہیں۔ اب تک وہ بہت

دیکھ بھال کر قدم بڑھاتا تھا، اب وہ بالکل نڈر ہو گیا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ متحدہ ریاستیں اس کی مخالفت کریں گی اور اسے ستائیں گی جیسا کہ پریزیڈنٹ روزولٹ نے تیل اور ردی لوہا جاپان کے ہاتھ بھیجنے کی ممانعت کر کے کیا بھی ہے لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئے گی، اس لئے کہ امریکہ اکیلا لڑ نہیں سکتا اور برطانیہ اب اسے کسی قسم کی مدد پہنچا نہ سکے گا۔ فرانس اور ہالینڈ، جن کی نوآبادیوں پر اس وقت جاپان کی نظر ہے۔ خود بے بس اور جرمنی کے پنجے میں گرفتار ہیں اور جرمنی ان سے جو چاہے منظور کرا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جاپان نے چین کو پوری طرح قابو میں کر لیا ہے، سوا اس تھوڑے حصے کے جہاں مارشل چیانگ کائی شک کا راج ہے۔ یہاں وہ اپنی قومی حکومت شوق سے قائم رکھیں۔ جاپان کا اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس نے تمام بندرگاہیں اپنے قبضے میں کر لی ہیں، چین کو مدد پہنچ سکتی ہے تو اس ڈھائی ہزار میل لمبی سڑک سے جو چین سے روس تک جاتی ہے، اور ادھر سے بھی بس اتنی ہی مدد آئے گی جتنی کہ روسی جاپان سے اپنے تعلقات کو دیکھتے ہوئے بھیجنا مناسب سمجھیں۔ جاپان نے قزاقانہ جنگ کا ہر موقع پر ایسا سخت بدلہ لیا ہے کہ اب قومی حکومت کے لئے اس کا جاری رکھنا بڑا مشکل ہے، اور جاپان کی محافظ فوج کا خرچ جو اتنا تھا کہ لوگ کہتے تھے وہ جاپان کو دیوالیہ کر دے گا اب چین کی آبادی پر ڈالا جا رہا ہے۔ جاپان کو اس سے بجائے نقصان کے اور فائدہ ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ ہزاروں لاکھوں آدمی جنھیں اپنا پیٹ پالنا پڑتا اب مزے میں کماتے کھاتے ہیں اور جاپان میں بے روزگاری کا نام نہیں۔ چین میں حکومت جاپانیوں کی ہے۔ نام مسٹر وانگ چنگ وے ہی کا ہے، صنعت اور تجارت مختلف جاپانی کمپنیوں کے ہاتھ میں دیدی گئی ہے اور اس میں کسی کی آڑ لینا بھی ضروری نہیں۔ حجت کرنے والے اب بھی کہتے ہیں کہ جاپان کو اس سرمایہ کی نسبت سے جو لگایا گیا ہے۔ بہت کم فائدہ ہو رہا ہے اور اس کی خاص مشکل کہ اس کے پاس اپنا کوئلہ، لوہا، تیل اور روئی نہیں ہے چین پر قبضہ کرنے سے حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن سب کچھ دیکھتے ہوئے کہنا ہی پڑتا ہے کہ افسوس جاپان نے چین کو فتح کر لیا۔ اور اب وہ کوئلے، تیل اور ربڑ کو بہانہ بنا کر چاہتا ہے کہ فرانسیسی ہند چینی اور ڈچ مشرقی ہند کو بھی فتح کر

آپ جانتے ہیں نئی سیاست بڑی منطقی ہے اور مروت کرنا جانتی ہی نہیں۔ اس منطق نے رومانیہ سے روس کو بس ارابیا دلوا دیا، اگرچہ رومانیہ فاشسٹ ریاستوں کی برادری میں شامل ہو گیا تھا اور جرمنی کی سرپرستی میں تھا۔ اسی منطق نے جرمنی سے اعلان کرایا کہ اسے جنوب مشرقی ایشیا کے جزیروں سے کوئی دلچسپی اور مطلب نہیں ہے۔ جس وقت یہ اعلان کیا گیا جرمنی کا صرف ہالینڈ پر قبضہ ہوا تھا اور اس اعلان کا مقصد جاپان کو اطمینان دلانا تھا کہ اس نے ہالینڈ کی ایشیائی نوآبادیوں پر قبضہ کر لیا تو جرمنی ہالینڈ کے سرپرست کی حیثیت سے کوئی اعتراض نہ کرے گا۔ اب فرانس اسی طرح جرمنی کے قابو میں ہے جیسے کہ اعلان کے وقت ہالینڈ تھا۔ اٹلی کو فرانس کی نوآبادیوں کا کوئی حصہ ابھی تک نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن جرمنی اپنی طرف سے فرانسیسی ہندچینی پر جاپان کا حق تسلیم کر لے تو یہ بات نئی سیاست کی منطق کے لحاظ سے بالکل درست ہو گی۔ اگر فرانسیسیوں کو نئی سیاست سے عقیدت ہو گئی ہے تو وہ اپنے نقصان پر افسوس اور شکایت نہ کریں گے بلکہ اسے ایسا ایثار سمجھیں گے جس سے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بڑھتا ہے۔

جرمنی جاپان، روس اور اٹلی کی نئی سیاست مشرق سے مغرب تک چھائی جاتی ہے۔ اور اب انگلستان اکیلا اس کا مقابلہ کر رہا ہے۔ امریکہ والوں میں دوراندیشی ہوتی تو وہ اس کا ساتھ دیتے لیکن وہ تو سمجھتے ہیں کہ ان کا مشرق اور مغرب بلکہ شاید زمین اور آسمان اپنا الگ ہے۔ اور انھیں فکر صرف اس کی ہے کہ کہیں یورپ کی ہوائیں وہاں کی بیماریوں کو امریکہ میں نہ پھیلا دیں۔ اپنی دنیا کی حدیں ہر ملک ہی نہیں، ہر شخص بھی مقرر کر سکتا ہے۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ ایسی دنیا بہت تنگ ہوتی ہے اور بڑی آسانی سے ایسا قید خانہ بن سکتی ہے کہ جس میں آدمی کا دم گھٹنے لگے ہمارا مقصد پریذیڈنٹ روزولٹ کی نصیحتوں کے جواب میں خود ان کو نصیحت کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے جسے وہ ہم سے بہت بہتر سمجھتے ہوں گے۔
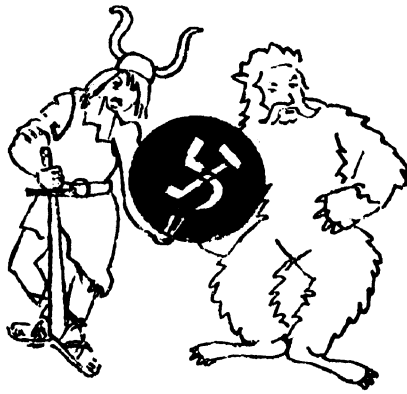
اتحاد؟

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تفہیمات حصہ اوّل:۔ تالیف سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ تقطیع بڑی۔ صفحات ۳۵۲ قیمت غیر مجلد عہ مجلد عا ملنے کا پتہ دفتر ترجمان القرآن لاہور

یہ کتاب مودودی صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر اسلام پر اعتراضات یا شبہات کے جواب میں ہیں۔ مثلاً کوتہ نظری ایک مسیحی بزرگ کے چند اعتراضات، آزادی کا اسلامی تصور، کیا نجات کے لئے صرف کلمہ توحید کافی ہے؟ کیا رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے؟ ایمان بالرسالۃ، حدیث اور قرآن، حدیث کے متعلق چند سوالات۔ قرآن اور سنت رسول وغیرہ۔ چند مضامین میں اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کو رفع کیا گیا ہے اور بعض میں اہم اسلامی امور کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی علمی و ادبی طبقے میں غیر معروف شخصیت نہیں۔ انھوں نے مذہب و متعلقات مذہب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور پھر خدا نے انھیں معقولیت، سنجیدگی، متانت اور شرافت سے بھی بہرہ وافر دیا ہے۔ زبان نہایت صاف ستھری اور طرز بیان سلجھا ہوا ہے۔ انھوں نے تمام اسلامی مسائل کو نقل کے علاوہ عقل سے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

آج کل زمانہ آزادی کا ہے۔ غلط طریقہ تعلیم کہیے یا نئے زمانے کا ماحول۔ اکثر جدید تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بڑی حد تک ناواقف ہے اور اگر واقف ہے تو ان مغربی کتابوں کے ذریعے جو اسلام کی مخالفت میں خوب زہر آلود ہوتی ہیں۔ اس لئے مستشرقین یا عیسائی مصنف اسلام پر جو کچھ اعتراض کرتے ہیں وہ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے بعض ,,علمائے کرام،، یا ,,عالم نما بزرگ،، جنھیں اپنی مذہبیت ,,سچائی،، اور صداقت کا غیر معمولی مغالطہ ہے۔ اسلام کی خدمت اسی میں

سمجھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کا مضحکہ اڑائیں اور اگر کوئی بات غلطی سے ان نوتعلیم یافتہ لوگوں کے منھ کو
نکل جائے تو اسے جھنڈے پر چڑھائیں اور اپنے معاندانہ اور زہر آلود فقروں سے انھیں طلب حق
کی راہ سے ہٹا کر ان میں عناد کا جذبہ بھر دیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تفہیمات میں ہمیں ایسی کوئی چیز
نظر نہ آئی۔ ہمارے خیال میں اس وقت اسلام کی یہی سب سے بڑی خدمت ہے۔

مولانا ان مضامین کے ذریعے ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ
تفہیمات کا دوسرا حصہ بھی ایسے ہی مفید مضامین کا حامل ہوگا۔ (ح۔ح)

خیال آفریں دماغ: ۔ از عرش تیموری صاحب۔ عالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر دہلی قیمت ۱۲ صفحات ۹۵

عرش صاحب نے ایک دلچسپ تمثیل لکھی ہے جس میں ایک شاعر کے خیالات بغیر کسی ترتیب کے
بجلسہ پیش کئے ہیں۔ پلاٹ صرف اتنا ہے کہ ایک رات کو شاعر کے دماغ میں مختلف قسم خیالات بلا کسی
ارادہ کے بلا کسی تسلسل کے چکر لگاتے ہیں۔ صبح کو مالک مکان اس شاعر کو اپنی کرسی پر مردہ پاتا ہے۔

اس قسم کے تحلیلی و تجزیاتی افسانے جو موجودہ زمانہ کے انگریزی ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں
کا چربہ ہیں ہماری اردو میں اس سے پیشتر بھی نکل چکے ہیں۔ انگارہ میں اس قسم کے کئی افسانے تھے
اور بھی اکثر نوجوان لکھتے رہتے ہیں۔ یہ جدید طریقہ کہ ایتلافات صفحۂ قرطاس پر آجائیں۔ آرٹ کی حیثیت
اختیار کر چکا ہے۔ بے رنگی میں رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور بے ترتیبی میں ایک ترتیب نکل آتی ہے
جیمس جوائس اور الڈوس ہکسلے وغیرہ اس طرز کے بڑے علمبرداروں میں سے ہیں۔ عرش صاحب اچھا
کریں اگر اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ یہ چیز ان کے دماغ سے ہم آہنگ بھی ہے۔ اور ان کی عمر ابھی
انتشار دماغی کے لئے موزوں بھی ہے۔ خیال آفریں دماغ کے بجائے اس تمثیل کا نام شاعر کا دماغ
بہتر ہوتا۔ کتابت و طباعت بہت خوب ہے۔

یاد اقبال حصہ اوّل: ۔ مرتبہ غلام سرور صاحب نگار۔ دفتر اقبال اکاڈیمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

صفحات ۱۲۰ قیمت عہ

یہ مجموعہ ان نظموں کا ہے جو علامہ اقبال پر ہندوستان کے متعدد شعرا نے وقتاً فوقتاً لکھیں اور مختلف کتابوں یا رسالوں میں شائع ہوئیں۔ اقبال کی یادگار کے سلسلے میں اقبال اکیڈیمی کا یہ قدم یقینی مستحسن ہے۔ حالانکہ اس حصہ میں بہت کافی نظمیں آگئی ہیں پھر بھی ابھی تھوڑی بہت باقی رہ گئی ہیں اقبال کی مقبولیت کے باعث ہندوستان کے طول و عرض میں شاید ہی ایسا کوئی شاعر ہو جس نے اپنے تاثرات کا اظہار نہ کیا ہو۔ علامہ اقبال کی وفات پر آل انڈیا ریڈیو نے ایک مشاعرہ اقبال کی یادگار میں منعقد کیا تھا اور اس میں مرحوم پر چند مشہور شعرا نے نظمیں پڑھی تھیں۔ بہتر ہو اگر وہ نظمیں حصہ دوم میں شامل کر لی جائیں علی گڈھ میں چند اچھی نظمیں مل جائیں گی۔ جو اس موقعہ پر وہاں پڑھی گئی تھیں۔ کتاب کی کتابت و طباعت اور کاغذ وغیرہ بہت خوب ہے۔

ادب و زندگی :۔ از مجنوں گورکھپوری، ایوان اشاعت گورکھپور، صفحات ۱۳۶ قیمت عہ

یہ مجنوں گورکھپوری کے چند تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر ریڈیو پر نشر ہو چکے ہیں اور بعض رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ مجنون صاحب کا انگریزی اور اردو ادب کا مطالعہ بہت کافی ہے۔ اس لئے وہ اردو ادبیات میں بہت سی ایسی نئی تنقیدی چیزیں پیش کرتے رہتے ہیں جن کی ہمارے یہاں کمی ہے۔ زیر نظر کتاب میں ادب و زندگی، ادب و ترقی، نظیر اکبرآبادی، حالی کا مرتبہ اردو ادب میں، اپنے موضوع کے اچھے مطالعے ہیں۔ چونکہ ان میں سے اکثر مضامین ریڈیو کے لئے لکھے گئے ہیں اس لئے ان میں جزئیات پر بحث نہیں ہو سکی ہے اور مجنوں صاحب محض طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے چلے گئے ہیں تفصیل نہیں آسکی ہے۔ صرف اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ انگریزی ادب سے ناواقف لوگوں کو اس میں خاطر خواہ دلچسپی نہ ہو سکے اور وہ اسے محض معلمانہ رعب اندازی کا ایک طریقہ سمجھیں کہ اتنی کثرت سے انگریزی ادب کو شامل کیا گیا ہے۔ مگر اصلیت اس کے خلاف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مجنوں صاحب کا طرز آسان عام فہم نہیں ہے اس لئے غالباً لوگ اسے

پڑھتے ہوئے گھبرائیں لیکن جسے ادبیات سے حقیقی دلچسپی ہے اسے اس مختصر مجموعے میں بڑے نکتے نظر آئیں گے۔ مختصر جملے وسیع معانی پنہاں رکھتے ہیں۔ طالب علموں کو اس مجموعہ سے خصوصاً مستفید ہونا چاہئے۔

تلاش مسرت :۔ از ایشور دیال سری واستوا، ناشر منشی کندن لال۔ ترکمان دروازہ، کلیان پورہ دہلی صفحات ۵۰، قیمت ۸ر

یہ افسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ ایشور دیال صاحب ابھی نوجوان آدمی ہیں زندگی کے تجربات کم ہوئے ہیں۔ اس لئے زیادہ تر وہ واقعات لکھے ہیں جو ان کے دماغ ہی میں ہو سکتے ہیں۔ ایشور دیال صاحب کو اردو اور انگریزی کے بڑے افسانہ نویسوں کا مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ وہ اس فن سے زیادہ اچھی طرح واقف ہو سکیں۔ حالانکہ افسانے روزانہ زندگی سے لئے ہیں اور رومانیت بھی زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی کوئی نئی بات نہیں پیدا کر سکے ہیں لیکن ایشور دیال صاحب کے لکھنے کا طرز بہت نرم اور بہت دلچسپ ہے امید ہے کہ آپ آئندہ مطالعہ اور تجربہ کی ترقی کے ساتھ اردو افسانہ نویسوں میں ممتاز جگہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ قربانی کا پھل، پانچ خطوط، تانگہ والا، اچھے افسانے ہیں۔

رسالہ داستان :۔ ایڈیٹر خلیل احمد و شبیر ہندی صاحبان ۴۵ ٹمپل روڈ، لاہور، سالانہ چندہ ۵ر

جون کے مہینہ سے یہ رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہندوستانی نوجوانوں کے احساسات کی ترجمانی کا دعویدار ہے مضامین اور افسانے فی الحال اچھے ہیں۔ امید ہے کہ رفتہ رفتہ یہ رسالہ اپنی جگہ پیدا کرلے گا۔

نقشہ جنگ یورپ مغربی محاذ :۔ مرتبہ نالد کمپنی۔ ترا با بہرام خاں دہلی۔ سائز بڑا۔ قیمت ۴ر

یہ کمپنی اردو میں اکثر مفید نقشے تیار کرتی رہتی ہے۔ موجودہ مغربی محاذ کا نقشہ ہر صورت سے مکمل اور عمدہ ہے، مفید حواشی بھی دے دئے گئے ہیں۔ حالانکہ اب وہ محاذ ختم ہو چکا ہے پھر بھی شائقین کیلئے اچھا تحفہ ہے۔ امید ہے کہ کارکنان کمپنی موجودہ محاذ کے نقشے بھی جلد از جلد تیار کریں گے۔

ادبیات کی تعلیم

آرٹ کورس کی اعلیٰ تعلیم کو میں کاہل، عیش کوش اور تن آساں بنا دینے والی چیز سمجھتا ہوں۔ ادب اور زبان کا علم ایسا ہے جو روح کو نرمی کی طرف لیجاتا اور آخر کار تن آساں، عیش پرور اور نکما بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی گذشتہ تعلیمی سرگرمی کو ملاحظہ فرمائیے تو یہی پتہ چلے گا کہ خلفاء عباسیہ کے زمانے سے ہندوستان کے آخری تاجدار ظفر شاہ تک۔ اور اسی طرح ایران، ترکی و مصر میں شاعری اور ادب سرائی طغرائے علمیت اور طرۂ فضیلت بن گیا تھا، سلاطین، علما و شعرا کو اپنے دربار میں جگہ دینا ان کی قدر و منزلت کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ مقصود در اصل اپنی شہرت بقا اور توصیف ہوتی تھی۔ کھانے پینے کی افراط میں سوائے بذلہ سنجوں اور خوش گپیوں کے کیا سوجھتا ہے۔ شعرا بات کا تبنگڑ بناتے۔ چنانچہ زندگی کے مفید علوم سمٹ کر شاعری میں غرق و فنا ہو گئے اور انھوں نے کچھ ایسا نشہ پلایا کہ اب تک اس کا سرور باوجود غلام ہو جانے کے ہم نہ بھولے۔ اور جس نے ہمارے نوجوانوں کو آتنا نکما، بزدل، کمزور اور نازک بنا دیا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ایسے مضامین لینے سے جی چراتے ہیں جن میں ذرا محنت پڑتی ہے یا جس میں دماغ زیادہ لگانا پڑتا ہے ہندوستان کے کسی کالج، کسی یونیورسٹی میں چلے جائیے وہاں آپ کو مسلمان لڑکوں کی اکثریت آرٹ کورس لئے ہوئے ملے گی اور اس میں بھی موجودہ علوم مثلاً سیاسیات، معاشیات نہ لیں گے جو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہ ذرا خشک اور محنت طلب ہیں۔ وہ ان کی بجائے فلسفہ تاریخ منطق اور اُردو فارسی ادبیات وغیرہ لیں گے کیونکہ یہ مضامین نہایت آسان اور کم دقیق ہیں۔ ڈگریاں آسانی سے دلا دیں گے۔ فلسفہ آج کل محض بیکار سی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ سوائے کرسی نشینی اور گفتگو کو فن بنانے کے اور کوئی کام اس سے نہیں آتا۔ منطق بھی غیر ضروری سا ہے اس لئے کہ ہماری روز مرہ زندگی کے لئے منطق نہ جاننا کچھ غیر مفید نہیں ہوتا۔ تاریخ گڑے مردے اکھاڑتی ہے جس سے

نہ ہم کوئی سبق حاصل کر چکے ہیں نہ کرنا چاہتے ہیں محض واقعات کا رٹ لینا تاریخ سے صحیح فائدہ اٹھانا نہیں ہے۔ ان تینوں علوم میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ ہم کو زندگی اور اس کی واقعیت سے دور لیجاتے ہیں ہم کو ہماری چاروں طرف کی زندگی سے آنکھیں بند کر دینے پر مجبور کر دیتے ہیں زبانوں اور ادبیات کے فضول ہونے کا تو تذکرہ کرنا ہی بیکار ہے کیونکہ یہ چیز اظہر من الشمس ہے کہ یہ محض دماغی عیاشی اور کاہلی سکھاتی ہیں عیاشی کا حق اگر ہمیں پہونچتا بھی ہے تو اس وقت جب ہم کچھ مفید کام کر چکے ہوں۔ یہ ادبیات شروع ہی سے ہمارے نوجوانوں کو تعیش پسند، آرام کوش اور محض شاعر قسم کا انسان بنا کر چھوڑ دیتی ہیں جو محض گفتار میں ہی جیتا مرتا اور محض الفاظ ہی کے گورکھ دھندوں سے خود کو اور دوسروں کو خوش کیا کرتا ہے۔

ہماری قوم میں بے عملی کی شکایت بہت مشہور ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس کی تہ میں بھی ادبیات اور شاعری نکلے گی جس نے ہمارے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقوں کو خراب کیا ہے اور جن کے اثر کی وجہ سے ہماری قوم میں بے عملی کی روایتی خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں ادبیات ہماری قوم و سوسائٹی کے لئے ایک افیون ہیں جو ہماری روحوں کو اتنا سرمست کر دیتی ہیں کہ اس قابل بھی نہیں چھوڑتیں کہ اپنا گھر لٹ جانے پر اس کا ماتم بھی کرنے دیں۔ مقصود چونکہ محض ڈگری لینا ہوتا ہے اور ڈگری آسانی سے ادبیات ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے عموماً طلبا اسی آسان راستے کو اختیار کرتے ہیں۔ ان کو اس ڈگری کی وجہ سے نوکریاں تو مل جاتی ہیں لیکن اس کے ساتھ جو چیز پیدا اور حاصل ہو جاتی ہیں وہ ہیں تعیش، نازک مزاجی، شاعری لفاظی اور اخلاقی کمزوری جس کی بدولت خوشامد اور اسی طرح کی ذلیل خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ تن آسانی اور تعیش لامحالہ اخلاقی طور پر انسان کی روح کو کمزور کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم میں دوسروں سے مرعوب ہونے اور ان کی خوشامدیں کرنے کی عادتیں پڑ جاتی ہیں۔ ہم زندگی کی تکالیف برداشت کرنے کے خیال سے کانپنے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ خوشامد، چاپلوسی یا اسی قسم کی دیگر ترکیبوں سے ہم زندگی آسانی سے بسر کرتے رہیں۔

یہ روحانی گھن اسی وقت دور ہو سکتا ہے اور ہماری قوم میں اولوالعزم نڈر بے باک اور عملی

آدمیوں کی اسی وقت فراوانی ہوسکتی ہے جب ہم اپنے نوجوان طالب علموں کو ادبیات کی بجائے ایسے علوم کی طرف متوجہ کریں جن سے ان میں محنت، مشقت اور سخت کوشی کی عادت پڑے۔ ان کے دماغ زیادہ مفید اور عملی نتائج سوچنے پر مجبور رہوں اور اس کے ساتھ ہی زندگی اور اس کے حقایق سے ان کی وابستگی اور دلچسپی بڑھے وہ اپنے کو ایک مفید ہستی ثابت کرسکیں اپنی سوسائٹی اور قوم کے لئے ایک بے مصرف اور ناکارہ فرد نہ ثابت ہوں محض خیالی قیاس آرائیوں میں مبتلا نہ ہوں محض ادنیٰ تنخواہ پاکر اپنی خودغرض زندگی نہ بسر کرتے ہوں اگر ایسے سخت کوش اور باعمل نوجوان ہماری یونیورسٹیاں اور کالج پیدا کرنے لگیں۔ تو مجھے قطعی امید ہے کہ بے عملی، کاہلی اور نکمے پن کا وہ مرض جو ہمارے افراد اور قوم کو تباہ کئے ڈال رہا ہے اور ہماری قومی زندگی کی عزت اور نیک نامی کو رسوا کر رہا ہے بہت جلد دور ہو جائے گا اور ہم اس مزمن تپ کو جو ہمیں بستر پر ڈالے ہوئے ہے دور کرکے بھلے چنگے ہوسکیں گے۔

ایسے مضامین بلاشبہ سائنس کامرس، طب یا ڈاکٹری، انجینرنگ، سیاسیات معاشیات ریاضی وغیرہ ہیں یہ ایسے علوم ہیں جو دماغ کو مجبور کرتے ہیں کہ زندگی سے اپنا رشتہ قائم رکھیں جو کچھ بھی کریں یا سوچیں وہ محض ہوائی اور یا در ہوا نہ ہو۔ ادبیات کے مضامین صرف وہی طلبا لے سکیں جن میں اس کی غیر معمولی صلاحیت اور غیر معمولی فطری مناسبت ہو۔ ہر کس و ناکس کو محض ڈگری کی خاطر ادبیات کے مضامین ہرگز نہ دینا چاہئیں کیونکہ اس طرح سے ہماری قوم میں کاہلوں کی تعداد بڑھتی ہے۔ کاہل والدین کاہل اور بے عمل بچے پیدا کرتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آج ہندوستان کے طول و عرض میں باعمل مسلمانوں کی کتنی کمی ہے۔ دوسری قومیں محنت کرتی ہیں اور ترقی کر رہی ہیں۔ دیکھئے کب تک ہماری آنکھیں بند رہتی ہیں!

(م۔ حسین)

اُردو تراجم

اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں

(یہ مضمون ایک طویل مقالے "اُردو تراجم" کا دوسرا حصّہ ہے۔ مقالہ سال گزشتہ آل انڈیا اُردو کانفرنس انجمن ترقی اُردو ہند (دہلی) میں پڑھا گیا تھا۔ اس کا پہلا حصّہ "پہلے دور کے اُردو ترجمے" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس صحبت میں دوسرے دور کے تراجم سے بحث کی گئی ہے اور چند سطروں میں پہلے مضمون کے خلاصے سے اسے مربوط کیا گیا ہے)

اگر ہم اِن کتابوں کو جو اُردو میں دوسری زبانوں سے براہ راست یا بالواسطہ ترجمہ کی گئیں دیکھیں تو ترجمے کی ارتقا کے تین خاص دور قائم کر سکتے ہیں، ابتدائی یعنی پہلے دور میں ترجموں کی تحریک زبان کی بے مائگی سے پیدا ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ زبان کا رنگ روپ پوری طرح ٹھہرنے نہیں پایا تھا، خاص خاص خیالات کو ادا کرنے کے لئے جن الفاظ، تراکیب اصطلاحات اور اسالیب کی ضرورت تھی وہ اس وقت تک بہم نہیں پہنچے تھے۔

الفاظ کو دیکھیے تو سرمایہ محدود، زبان پر نظر کیجیے تو کنجلک، اسلوب تلاش کیجیے تو کوئی سلیقہ دیکھنے میں نہیں آتا، بات یہ تھی کہ دربار میں اس وقت تک مسلمانوں کے زیر سایہ فارسی حکومت کر رہی تھی اور اُردو کو تو خیر بازاری ہی سمجھا جاتا تھا ہندوستانی مسلمانوں کی علمی زبان تو فارسی تھی ہی ہندوستان میں بسنے والی دوسری قومیں بھی اپنی عادت کے مطابق کہ "الناس علی دین ملوکہم" فارسی کو شاہی زبان سمجھ کر برضا و رغبت اختیار کر رہی تھیں، البتہ ہمارے مبلغ اور صوفیائے کرام تعلیم و تلقین کے لئے اور بعض شاعر محض تفنن طبع کے لئے نئی زبان پر دستِ شفقت رکھ رہے تھے، ان سب نے مل کر غیر ارادی طور پر اُردو کی ایسی خدمت کی کہ یہ بھی ایک نئی زبان بن بیٹھی بلکہ جلد ہی

فارسی کے مقابلہ میں اپنی حکومت کا دعویٰ کرنے لگی، لیکن یہ لوگ بھی فارسی کی گرم بازاری سے متاثر تھے چنانچہ جس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی یہیں سے مستعار لے لی، اور اس خوبی سے اسے اپنایا کہ مغائرت اور اجنبیت کی بو تک باقی نہ رکھی، الفاظ، محاورات اور اُن کے ترجمے تراکیب اور اُن کے ترجمے، اصطلاحات اور اُن کے ترجمے، بلکہ خالص ایسے خیالات جن کا تعلق ایرانی تمدّن و معاشرت اور تاریخ ایرانی سے تھا اپنی زبان کی ترکیب میں داخل کر لئے تالیف و تصنیف میں بھی فارسی سے ہی مدد لینا پڑی، مذہب پر کوئی رسالہ یا کتاب درکار ہوئی تو فارسی کی کسی مشہور اور مستند کتاب یا رسالے کا ترجمہ کر دیا، یا اُس کا خلاصہ کر کے پیش کیا، کسی تفریحی کتاب کو چاہا تو فارسی کی مروّجہ داستانوں اور مثنویوں میں سے کوئی ترجمہ کر لیا، بہت بڑھے تو یہ کیا کہ اپنی طرف سے کہیں ضروری اور دلچسپ اور کہیں غیر ضروری اور بے لطف اضافہ کر دیا، ظاہر ہے کہ ان ترجموں میں اسلوب بیان کچھ نہ کچھ اصل فارسی سے ضرور متاثر ہوا ہوگا، پرانے ترجموں کے مطالعہ سے اس خیال کو یوں اور بھی تقویت ہوتی ہے کہ بعض الفاظ کا بجنسہ ترجمہ موجود ہے۔

یہ دور در اصل دکھنی زبان میں تراجم تک محدود رہا اگرچہ اس کے آخر میں شمالی ہند میں بھی بعض کتابیں اسی ڈھنگ پر لکھی گئیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کے برخلاف دکھنی ادب کا سرمایہ بیشتر انہی تراجم پر مشتمل ہے، یہ ضرور ہے کہ بعض مصنفین اور شعراء نے اپنی فطری صلاحیت اور اپج کو بروئے کار لا کر نقش ثانی کو نقش اوّل سے بڑھا دیا ہے لیکن ایسی مثالیں نادر ہیں، عام طور پر اسالیب، محاورات اور تراکیب میں فارسی کی خوشہ چینی صاف جھلکتی ہے۔

فارسی کے علاوہ بعض چیزیں عربی سے بھی ترجمہ کی گئیں، ان کی تعداد فارسی کے بعد دوسرے درجہ پر ہے اور بالعموم مذہبی مباحث، پند و نصائح، تصوّف و اخلاق کے مسائل سے متعلق ہیں، ایک قلیل تعداد کتابوں کی ہندوستان کی دوسری زبانوں بالخصوص

علمی سنسکرت سے ترجمہ ہوئی، یہ کتابیں قصّوں اور کہانیوں کی ہیں اور ان میں بھی بعض براہ راست سنسکرت سے اور بعض فارسی کے واسطہ سے ترجمہ ہوئیں ان میں چونکہ بعض قصّے بہت دلچسپ ہیں اس لئے ترجمے در ترجمے موجود ہیں، لیکن اس قبیل کی کتابوں کی تعداد اس قدر کم ہے کہ زبان و اسالیب پر اس کا اثر معلوم نہیں ہوتا۔

ترجمہ کا یہ پہلا دور اس وقت تک قائم رہا جب تک ہندوستان میں فارسی زبان کی حکومت رہی، مغلوں کے آخر دور میں حکومت اور اقبال کے ساتھ ساتھ ان کی شاہی زبان کو بھی گھن لگ گیا، انگریزوں کے آتے ہی سیاست کی بساط اُلٹ گئی اور قدرتی طور پر فارسی کی شمع بھی گُل ہو گئی اور اس کی جگہ انگریزی زبان کا دور دورہ شروع ہوا، پہلے تو ہندوستانی انگریز، انگریزی زبان اور معاشرت سے بھڑکتے رہے لیکن جن کی حکومت میں رہنا تھا اُن کے احکام سے کیسے سرتابی کی جاتی، ایک طرف تو انگریز خود کوشاں تھے کہ جلد سے جلد دفتروں میں فارسی کی جگہ انگریزی دخل پائے۔ دوسرے خود ہندوستانی اپنا مستقبل دیکھ رہے تھے، جانتے تھے کہ ہماری شمع بجھ چکی اب روشنی کا کوئی دوسرا ہی سامان کرنا پڑے گا چنانچہ بعض نے سوچ سمجھ کر اور بعض نے محض تقلید کی خاطر انگریزی کو قبول کر لیا اور جو اثر پہلے دور میں فارسی کا تھا وہ دوسرے دور میں انگریزی سے ظہور میں آیا

اس دور میں پہلی مرتبہ چند ادارے خاص ترجموں کے مقصد سے قائم کئے گئے، کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج، لاہور میں سرکاری بک ڈپو، دہلی میں دلی سوسائٹی اور علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی نے اس کام کو بڑی مستعدی اور محنت سے مکمل کیا، ان ہی کی بابرکت کوششوں نے ہماری زبان کو علوم و فنون کے خزانے بخشے، انھوں نے زبان کو وسعت، خیالات کو سنجیدگی اور اسالیب کو پختگی بخشی، آج امرت کے جو چشمے بھی اس زبان کو سیراب کر رہے ہیں ان کے سوت میں ملتے ہیں۔

سائنٹفک سوسائٹی کا عہد در اصل ترجموں کے عصر قدیم اور دور حاضر میں ایک ارتجالی

وقفہ ہے اس کے بعد ترجموں کا تیسرا دور یعنی عہدِ جدید شروع ہوگیا، اس دور میں انفرادی کوششوں کے علاوہ انجمن ترقی اُردو ہند (دہلی) دارالترجمہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، اُردو اکاڈمی جامعہ ملیہ دہلی اور پنجاب کی بعض نشرگاہیں ترجمہ کرنے اور کرانے کی خدمت پر مستعد ہیں، سائنٹفک، علمی، تعلیمی، فلسفی، تاریخی، ادبی، سیاسی مباحث پر متعدد کتابیں ترجمہ ہوچکیں یا ہورہی ہیں اور اب اِن کی رفتار میں روز بروز سرعت پیدا ہورہی ہے۔

دورِ اوّل یعنی دکھنی دور کے اہم تراجم کی فہرست اور اس دور کی خصوصیات پر کہیں اور تبصرہ کرچکے ہیں، اب دوسرے دور کے ترجموں کا حال سنئے۔

دورِ اوّل دکھنی مصنفین اور مترجمین کا دور تھا اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس دور میں شمالی ہند میں اُردو کا وجود نہیں تھا، یا اسے قبول عام حاصل نہیں ہوا تھا، یہ امر بالکل قدرتی ہے کہ مسلمانوں اور دیگر ہندوستانیوں کا وہ لسانی مفاہمہ جو بعد میں اُردو کی صورت میں ظاہر ہوا ان علاقوں سے شروع ہوا ہوگا جہاں مسلمانوں کا قیام پہلے ہوا، یوں تو دکن میں عربوں کے تعلقات بہت پرانے ہیں لیکن یہ ایسے نہ تھے کہ مستقل زبان کی بنیاد ڈال سکیں، یہ کام سندھ، پنجاب، اور برج کے علاقے سے شروع ہوا، یہاں اُردو کی ابتدائی نشوونما سے بحث کرنے کا موقع نہیں صرف یہ ظاہر کرنا کافی ہے کہ اگرچہ شمالی ہند میں اُردو وجود میں آچکی تھی اور تالیف و تصنیف کا کام شروع ہوچکا تھا لیکن دکھنی مصنفین نے اس طرف زیادہ توجہ کی، ان علاقوں میں تو عدالتی اور دفتری زبان دکھنی تھی اور سلاطین خود اس زبان کی حمایت کرتے تھے اور اسی میں شعروشاعری اور تالیف و تصنیف کرتے تھے اور دکھنی گو شعراء و مصنفین کی قدر افزائی کرتے تھے۔

شمالی ہند میں عرصۂ دراز تک فارسی کو جو شرف حاصل رہا اس کی بنا پر جب کبھی اظہار قابلیت مقصود ہوتا، یا سلاطین و امرا تک رسائی پیدا کرنا ہوتی تو فارسی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا جاتا، مغلوں کی اس فارسی نوازی نے اُردو کی ترقی کی راہیں شمالی ہند میں مسدود

کردیں اور انگریزوں کے دورِ اقتدار تک اس ملکی زبان کو یہاں نظر انداز کیا گیا، یہاں اُردو کی ترقی فارسی کے زوال کے ساتھ وابستہ تھی، اس دور کے بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ چونکہ اب اکثر مرد اور زیادہ تر مستورات فارسی زبان پر قادر نہیں اس لئے ان کے سمجھانے کی خاطر زبانِ ہندی کو اختیار کیا، گویا اب تک اُردو لکھنے والا اس خفیف الحرکاتی کی معذرت پیش کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

انگریزوں کے اقتدار کے ساتھ ہی اُردو کی نشو و نما کے لئے منظّم کوششیں شروع ہوئیں۔ پہلا قدم فورٹ ولیم کالج کا قیام تھا، انگریزوں کو تجارت کرتے کرتے ہندوستان میں آزاد اور اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا تجارتی کوٹھیاں رفتہ رفتہ مضبوط اور محفوظ قلعے بن گئیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کے نمایندے ملکی سیاست میں عملی حصہ لینے لگے، اس سلسلہ میں انگریزوں کو اپنے کاروبار اور مصالح ملکی کی بنا پر اُردو زبان سیکھنے کی ضرورت پیش آئی اور ان کے صدر مقام یعنی کلکتہ میں اس مقصد کے حصول کے لئے فورٹ ولیم کالج کے نام سے ایک ادارہ کھلا، اس کالج کے منتظمین میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت معروف ہوئے انھوں نے نہ صرف اپنی بے بہا تصانیف سے اس زبان کے تہی دامن کو بھر دیا بلکہ ہندوستانی شعراء، ادباء، مصنفین، مولفین اور مترجمین کی ایک ایسی مجلس قائم کی جہاں سے جدید ادب کا نشاۃ الثانیہ طلوع ہوا یہاں کے کام کرنے والوں میں خود گلکرائسٹ کے علاوہ میر امّن[1] دہلوی، میر محمد حیدر بخش حیدری[2]، میر بہادر علی حسینی[3]، میر شیر علی افسوس[4]، مرزا کاظم علی جوان[5]، مولوی حفیظ الدین احمد دہلوی[6]، نہال چند[7] لاہوری، مولوی[8] امانت اللہ، مولوی[9] معین الدین فیض، للولال کوی[10]، مظہر علی[11] ولا، مرزا فطرت[12]، جوزف[13] ٹیلر، مولوی[14] اکرام علی، کپتان[15] بینی نرائن، مرزا[16] جان طپش، کپتان[17] طامس روبک، محمد خلیل[18] اللہ اشک، مولوی[19] امانت اللہ فضل، جان[20] شیکسپیر، مولوی[21] محمد اسلم اور ہنری[22] مارٹن بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات نے تصنیف سے زیادہ ترجموں پر زور دیا اور اسی

وجہ سے فورٹ ولیم کالج کے سرمایہ میں دوسری زبانوں سے ترجمے زیادہ ہیں۔ ذیل کے ترجمے خصوصیت کے ساتھ بہت اہم ہیں:۔

ترجمہ	مترجم	سنہ ترجمہ	اشارہ
باغ و بہار	میر امّن دہلوی	سنہ ۱۸۰۱ء	چہار درویش کا ترجمہ
طوطا کہانی	حیدر بخش حیدری	سنہ ۱۸۰۲ء	اصل قصہ سنسکرت میں ہے۔ ضیاء الدین نخشبی بدایونی نے فارسی میں ترجمہ کیا، اُردو ترجمے اسی فارسی کے ہیں۔
نثر بے نظیر	بہادر علی حسینی	سنہ ۱۸۰۲ء	سحر البیان کا ترجمہ
شکنتلا ناٹک	کاظم علی جوان	سنہ ۱۸۰۳ء	
ترجمہ اخلاق جلالی	مولوی امانت اللہ	سنہ ۱۸۰۴ء	
پند نامہ	مولوی معین الدین فیض	سنہ ۱۸۰۴ء	پند نامۂ عطار کا ترجمہ
ترجمہ شیر شاہی	منظر علی ولا	سنہ ۱۸۰۵ء	
ترجمہ انجیل	مرزا فطرت	سنہ ۱۸۰۵ء	
تاریخ فرشتہ	کاظم علی جوان	سنہ ۱۸۰۸ء	
ترجمہ چہار گلشن	کپتان بینی نرائن	سنہ ۱۸۱۱ء	
ترجمہ بہار دانش	مرزا جان طپش	سنہ ۱۸۱۱ء	
واقعات اکبر	خلیل اللہ اشک	سنہ ۱۸۱۹ء	ترجمہ اکبر نامہ
ترجمہ قرآن پاک	مولوی امانت اللہ فیض	سنہ ۱۸۰۳ء	
ترجمہ بوستاں	مولوی امانت اللہ		
اُردو محاورات	مرزا جان طپش		فارسی محاورات کا ترجمہ
ترجمہ ہفت پیکر	حیدر بخش حیدری		

ترجمہ	مترجم	سنہ ترجمہ	اشارہ
ترجمہ سادھوبل	مظہر علی ولا		
عہد نامہ جدید	ہنری مارٹن و مرزا فطرت	۱۸۱۴ء	
گل مغفرت	حیدر بخش حیدری	۱۸۱۴ء	ترجمہ دہ مجلس

فورٹ ولیم کالج تو ایک مستقل ادارہ تھا جہاں تالیف و تصنیف کا کام جاری تھا، اس کے علاوہ انفرادی طور پر بھی بعض لوگ اس کام میں مصروف تھے اور تصنیف سے زیادہ ترجمے ہی کیے جاتے تھے چنانچہ اسی دور میں ذیل کے تراجم بھی شامل ہیں۔

ترجمہ	مترجم	سنہ ترجمہ	اشارہ
طوطی نامہ	قادر بخش	۱۷۲۹ء	نخشبی کے طوطی نامہ کا ترجمہ
صرف و نحو ہندوستانی	ڈاکٹر جوشوا کیٹلر	۱۷۱۵ء	اس میں دعائے حضرت عیسیٰ کا ترجمہ کیا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اس عہد میں کس طرح ترجمہ کرتے تھے۔
روضۃ الشہدا	فضلی اورنگ آبادی	۱۷۳۲ء	
ترجمہ قرآن پاک	مولوی رفیع الدین	۱۷۸۸ء	
ترجمہ قرآن پاک	مولوی عبد القادر	۱۷۹۰ء	
تفسیر حقانی	سید شاہ حقانی	۱۷۹۱ء	
مجمع القوانین	عمال سلطنت ایسٹ انڈیا کمپنی	۱۷۹۳ء	
مجموعہ علم التشریح	پی برٹن	۱۸۱۷ء	مترجمہ اہلکاران سرشتہ نیٹو میڈیکل انسٹیٹیوشن
اتالیق الصبیان	سید صالح محمد دہلوی	۱۸۳۵ء	
قصہ گل باصنوبر	نیم چند کھتری	۱۸۳۷ء	
ترجمہ فقہ اکبر	سعد اللہ رامپوری	۱۸۴۰ء	
عجائب القصص	سید باقر حسین	۱۸۴۰ء	
ترجمہ شیر خانی	سرور	۱۸۴۷ء	

اب تک ہم ترجموں کے جس دور سے گزر رہے تھے اس میں "زبانِ اُردوئے معلیٰ" نے علمی حیثیت اختیار نہیں کی تھی، اس وقت تک درسیات کا سلسلۂ قدیم قائم تھا، اور طالب علم مکتب سے شروع کر کے کسی کامل فن کی صحبت میں منشی کا درجہ حاصل کر لیتا تھا لیکن رفتہ رفتہ انگریزی زبان کی اہمیت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ انگریزی کی تکمیل ہی تحصیل علم قرار پائی، ایک مقصد تو اس کا یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے نئے آقاؤں کی زبان سے آشنا ہو کر خذ ما صفا ودع ماکدر کے مصداق جو کچھ اُن سے حاصل ہو سکے حاصل کریں دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ یورپ کے علوم جدیدہ کو اگر حاصل کیا جا سکتا تھا تو صرف اس زبان کے واسطہ سے۔

اس سلسلہ میں سب سے گراں قدر خدمت مرحوم دلی کالج نے انجام دی جس کا قیام سنہ ۱۷۹۲ء میں عمل میں آیا اور جو سنہ ۱۸۲۵ء میں کالج کے مرتبہ کو پہنچ گیا، اس کالج نے جس قدر علمی خدمات انجام دیں ان کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں لیکن تراجم کے سلسلہ میں دلی سوسائٹی کا نام بہت روشن نظر آتا ہے۔ اس مجلس کا مقصد یہ تھا کہ علوم جدیدہ کی اشاعت ملکی زبانوں کے ذریعہ سے کی جائے، انجمن کے مقاصد میں واضح کر دیا گیا تھا کہ انگریزی، عربی فارسی اور سنسکرت سے اعلیٰ درجے کی کتابیں اُردو بنگالی اور ہندی میں ترجمہ کی جائینگی، اُردو میں تو بہت سے ترجمے ہوئے لیکن بنگالی اور ہندی میں کوئی ترجمہ نہیں کیا گیا، منجملہ اور وجوہات کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کارکنوں کے خیال میں ہندوستانی زبان یعنی اُردو کمپنی کے علاقوں کی رعایا کے لئے زیادہ اہمیت رکھتی تھی، اور ان کے خیال میں یہ زیادہ دشوار نہ تھا کہ رفتہ رفتہ ایسی زبان کو ان علاقوں کے سرکاری مدارس اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے، اسی بنا پر ان کی خواہش تھی کہ ہندوستانی زبان میں ایک مکمل "اسکول بک لائبریری" تیار ہو جائے۔

دلی کالج میں یہ کام سوسائٹی کے مستقل قیام سے پہلے بھی ہو رہا تھا کالج کے نامور پرنسپل مسٹر بتروس اپنے طور پر اسے انجام دے رہے تھے اور سوسائٹی کے قیام کے بعد بھی سارا کام کالج والے ہی کرتے تھے، اس طرح فورٹ ولیم کالج کے بعد یہ دوسری منظم اور

باقاعدہ کوشش تھی ان ترجموں کی ادبی حیثیت اگرچہ بہت زیادہ بلند نہیں لیکن بقول مولوی عبدالحق صاحب" اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اُردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی کوشش تھی جو خاص اصول اور قاعدہ کے ساتھ عمل میں آئی" ذیل کے ترجموں پر نظر ڈالنے سے اس دعوے کی حقیقت واضح ہو جائے گی

ترجمہ	مترجم	سنہ	اشارہ
تزک تیموری			فارسی سے
تاریخ ابوالفدا			عربی سے
تذکرہ شعرائے عرب			" "
تذکرہ گارسن دتاسی	متین صاحب		فرانسیسی سے
ترجمہ گلستاں			یہ ترجمہ اُردو اخبار پریس دہلی کے زیر اہتمام ہوا تھا
نیت پرکاش	بلدیو داس	سنہ ۱۸۷۲ء	پند نامہ سعدی کا ترجمہ
سنڈفورڈ اور مرٹن کا قصہ	راجہ شیو پرشاد	سنہ ۱۸۵۵ء	
رسالہ پیری			ایک لاطینی کتاب مصنفہ سیرو کا ترجمہ
اصول علم طبیعی	سری نراین و شیو نراین		آرنٹ کی کتاب کا ترجمہ
خلاصۃ الصنایع	بھولا ناتھ	سنہ ۱۸۵۴ء	انگریزی سے
رسالہ مقناطیس	سید کمال الدین	سنہ ۱۸۵۰ء	" "
اصول علم طبیعی	سیوا پرشاد/اجودھیا پرشاد	سنہ ۱۸۴۸ء	" "
اصول قواعد مائیات	اجودھیا پرشاد	سنہ ۱۸۵۰ء	" "
مقاصد العلوم	سید محمد میر	سنہ ۱۸۴۱ء	

ترجمہ	مترجم	سنہ	اشارہ
حدائق البلاغت			فارسی
جبر المقابلہ	مولوی کریم الدین		انگریزی سے
اقلیدس	"		" "
جغرافیہ حصہ دوم	اجودھیا پرشاد	سنہ ۱۸۶۱ء	" "
مفتاح الارض		سنہ ۱۸۶۷ء	کرنل ہالرائڈ کے حکم سے انگریزی سے ترجمہ
حقائق الموجودات	بنسی دھر چرنجی لال	سنہ ۱۸۵۵ء	سنسکرت سے ترجمہ
علم جغرافیہ	میر غلام علی	سنہ ۱۸۵۱ء	انگریزی سے
جغرافیہ کا پہلا رسالہ	"	سنہ ۱۸۵۳ء	" "
گنگا کی نہر	سدا سکھ لال	سنہ ۱۸۵۴ء	" "
مختصر دقائق النجوم	بڑے صاحب گھاسلے	سنہ ۱۸۴۸ء	" "
اصول علم ہیئت	ماسٹر رام چندر	سنہ ۱۸۴۸ء	" "
ترجمہ معاشیات مل	وزیر علی	سنہ ۱۸۴۴ء	مل کی کتاب کا ترجمہ
اصول علم انتظام مدن	دھرم نراین دہلوی	سنہ ۱۸۴۶ء	انگریزی سے
سیلف نالج			Self Knowledge "
حکایات گے			Tales from Gay
ترجمہ قرآن شریف			
ترجمہ الف لیلے			
ترجمہ اخلاق جلالی			
ترجمہ اخلاق محسنی			
ترجمہ شاہنامہ			

ترجمہ	مترجم	سنہ	اشارہ
ترجمہ ابن خلکان			
ترجمہ قصیدہ بردہ			
ترجمہ شکنتلا ناٹک			
ترجمہ تاریخ شیرشاہ			
مثلث مخروطات			
مسلم ہندسہ	ماسٹر رام چندر		
معاشیات			
تاریخ انگلستان			انگریزی سے ترجمہ
پنچ تنتران			
پندنامہ	فیض صاحب		
قصہ رسیلاس			انگریزی سے ترجمہ
قصہ قزلباش			"
قصہ رابن سن کروسو			
اکونومی آف ہیومن لائف			Economy of Human Life
ویکار آف ویکفیلڈ			The Vicar of Wakefeild
روضۃ الصفا	میر اخوند		فارسی سے
سفرنامہ بنیان			Bunyan's P. Progress
تاریخ طبری	جعفر شاہ		

ترجمہ	مترجم	سنہ	اشارہ
انوار سہیلی	کریم الدین		فارسی سے
تاریخ رشید الدین			" "
علم الارض			انگریزی سے
چراغ حقیقت		سنہ ۱۸۵۵ء	"
تاریخ حکما		سنہ ۱۸۵۵ء	"
خیالات فنیلان			
القول الاظہر			ابن مسکویہ کی کتاب کا ترجمہ

اس دور کے مذکورہ بالا ترجموں پر ایک سرسری نظر ڈال کر دور اوّل سے ان کا مقابلہ کیجئے تو کئی امتیازی خصوصیات معلوم ہوں گی، پہلے دور میں مذہب اور تفریحی ادب کے علاوہ کسی اور مبحث پر کوئی ترجمہ نہیں ملتا، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس وقت زبان میں اس قدر وسعت اور اسلوب میں ایسی پختگی کیسے پیدا ہو سکتی تھی جو سنجیدہ اور گراں مضامین کی متحمل ہو سکے دوسرے درسیات کا پرانا سلسلہ قائم تھا اسی وجہ سے نئے درسی نصاب کی ضرورت پیش آنے پر پرانی کتابیں تقریباً سب کی سب بیکار ہو گئیں اور نئے تراجم اور تصانیف کی حاجت ہوئی۔

اسلوب کے اعتبار سے بھی اس دور میں ایک اہم تبدیلی نظر آئے گی۔ جہاں اب تک فارسی خیالات تراکیب اور محاورات کے ترجمے رواں تھے وہاں اب انگریزی کا اثر زیادہ نمایاں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بعض اصطلاحات کا ترجمہ ہوا، اسلوب اور انداز بیان بدلا۔ آخر دور کی مرصع مسجع اور پر تکلف ایرانی اردو کی جگہ انگریزی کی صاف گوئی اور سادگی اپنا حسن دکھانے لگی جس کی وجہ سے خالص علمی، فنی، تاریخی مباحث کے لئے ایک موزوں

انداز نگارش پیدا ہو گیا۔

ان حالات نے اُردو کے مستقبل کو بہت کچھ تابناک بنا دیا۔ یہی بنیاد تھی جس پر آگے چل کر سرسید اور اُن کے رفقاء کی کوشش سے ایک قصر عظیم الشان اور فلک بوس تعمیر ہونے والا تھا۔ سب سے بڑا احسان دلی سوسائٹی کا یہی ہے کہ اس کا اخلاقی اثر بہت دور رس ثابت ہوا اور اسی نے اُردو کو وسیع امکانات کی راہ بتائی افسوس کہ بعض سیاسی ہنگاموں نے اس خالص علمی اور ادبی اجتماع کو درہم و برہم کر دیا اور اس کے بعد سائنٹفک سوسائٹی کو اس کا حق جانشینی ادا کرنا پڑا۔

سائنٹفک سوسائٹی کے ترجمے عصر قدیم اور دور جدید کے درمیان ایک طور پر عہد ارتجالی کے نمونے ہیں اس لئے اُن کی بحث انشاءاللہ آئندہ پیش کروں گا۔

محمد ابو اللیث صاحب صدیقی البدایونی

سماج اَور اُستاد

تعمیرِ حیات: کہتے ہیں کہ اُستاد تعمیرِ حیات کرتا ہے۔ اینٹ پتھر کے گھروندے، لکڑی لوہے کے نمونے نہیں بلکہ اُس کا کام تعمیرِ حیات ہے۔ نئی نسل کی زندگیوں کی تعمیر و تربیت ہے۔ اینٹ پتھر کی عمارت اگر بیٹھ گئی تو ایک دو کو لے کر بیٹھ جائے گی۔ اگر کسی نکمے اور سست کاریگر نے ہوائی جہاز میں ڈھیلا پرزہ لگا دیا تو ممکن ہے ایک بہادر ہوا باز کی جان اکارت چلی جائے۔ لیکن اگر ایک دل برداشتہ اور افسردہ اُستاد نے منزلِ حیات میں کوئی اینٹ ٹیڑھی بیڑھی لگا دی تو ڈر ہے کہ سماج کا پورا محل کھڑکھڑاتا ہوا نیچے نہ آجائے۔ ولایت میں ہر ہوائی جہاز کے کارخانے میں ایک ہدایت جلی حروف سے لکھی ہوئی ہے "خیال رکھنا تمہاری ایک غلطی سے ایک بہادر جانباز کی جان خطرے میں پڑ جائے گی" میں چاہتا ہوں کہ ایسی ہی کوئی ہدایت ہمارے مدرسوں میں بھی لگا دی جائے "خیال رکھنا تمہاری ایک غلطی سے پوری سماج کی زندگی خطرے میں ہے"

اُستاد کی کامیابی اور ناکامی کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کی گونج وقت کے ایوانوں میں سے گذرتی جائے گی۔ اُس کی صدا فضائے بسیط کی وسعتوں کو اپنے دامن میں لے لے گی، اس کی خامیوں کا اثر اپنی ذات سے بڑھ کر اُن دائروں کی طرح بڑھتا چلا جائے گا جو ایک پتھر پھینک دینے سے پانی میں پیدا ہو جاتے ہیں بڑے اور پھر اُس سے بڑے اور اُس کے بعد سب سے بڑے۔

جب تعلیم کے عمل کی اہمیت مکان و زمان کی حدود بھی پار کر گئی تو دیکھنا یہ ہے کہ اُستاد یعنی سماج کا نمائندہ جسے اس بارِ گراں کا حامل بنایا گیا اسے اُٹھانے کے قابل ہے یا نہیں۔ کہیں وہ قرآن کریم کا "ظلوماً جھولاً" تو نہیں جس نے وہ بار بھی اُٹھا لیا جو پہاڑوں سے نہ

اُٹھایا گیا۔ ہمارے ملک میں تو اُستاد کچھ ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ غریب ہے کم استعداد ہے۔ کم معاش ہے۔ کم منصب ہے۔ سماج کی محفل میں اس کی جگہ جوتیوں سے ذرا آگے اور مسند سے کہیں پیچھے ہے۔ جہالت اور بے علمی کے کوہ پیکر عفریت کے سامنے ہم نے ایک بالشتیئے کو کھڑا کر دیا ہے۔ ایک قوم کے دل و دماغ کی جراحی کے لیے ہم نے روائتی جراح کو دعوت دے دی ہے وہ جراح جس کے پاس جوہر دار آلات کی بجائے محض ایک زنگ خوردہ نشتر موجود ہے ہم اپنی آنکھوں سے اِس مایوسانہ جہاد کو دیکھ رہے ہیں جو اُستاد بے علمی اور کوزدقی کے خلاف لڑ رہا ہے کیا اس جہاد کو جاری رکھنے، اس کو کامیاب کرنے کی ذمہ داری ایک فرد واحد پر، ایک ملائے مکتب پر ہی عاید ہوتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں! یہ بوجھ جو ہمارے سر آن پڑا ہے سب کے اُٹھائے ہی اُٹھے گا اور یہ کام جو ہم پر آن پڑا ہے سب کے بنائے ہی بنے گا۔ اس عظیم الشان مجاہدہ میں سب لوگ ہمت باندھ کر اور سر جوڑ کر نہ لگیں گے تو اس میں یقیناً اُستاد کی ہار ہوگی اور اُستاد کی ہار کے یہ معنی ہیں کہ کُل سماج کی ہار ہوگی۔

پنجاب میں ایک کہاوت ہے کہ بچّوں میں سب کا ساجھا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد کوئی افلاطون والی جائیداد کی اشتراکیت نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ بچوں کی تربیت و تہذیب کا فرض محض ماں اور باپ پر ہی نہیں بلکہ ایک گونہ پوری بالغ نسل پر عائد ہوتا ہے۔ اس لئے ہم سب کا بھلا اسی میں ہے کہ خوب اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ سب کے بچوں میں سبھی کا ساجھا ہے۔ اس سماجی اشتراکیت میں نہ تو کوئی غریب ہے نہ امیر، نہ کوئی اونچا ہے نہ نیچا۔ اس میں ہمارا ہی بھلا نہیں بلکہ ہمارے بچّوں کا بھی بھلا ہے۔ ایک امیر زمیندار اپنے بچے کو ہمالیہ کی وادیوں کے اونچے یورپی مدرسوں میں تعلیم دے سکتا ہے، مگر تاہم کبھی نہ کبھی اسے بھی جلتے ہوئے تپتے ہوئے میدانوں میں اترنا ہوگا۔ اس مصیبت سے تو ہماری حکومتیں اور اُن کے عمال بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ ایک اونچے درجے کا سرکاری ملازم اپنے بچّے کو نجی طور پر تعلیم دلالے مگر ہر سمجھدار باپ جانتا ہے کہ علیٰحدہ طور پر نجی تعلیم کہاں تک

بچے کی شخصیت کی تعمیر او تکمیل میں امداد دے سکتی۔ اور کہاں تک اس قسم کی تعلیم اس کی سماجی جبلتوں کو ایک مفید شہری کی عادات میں بدل سکتی ہے بچے کی نفسیاتی زندگی میں آپس میں مل بیٹھنے اور مشترکہ کام کرنے کا بڑا گہرا جذبہ ہوتا ہے اور نجی تعلیم سے قوت عمل کی یہ سوت خشک ہو جاتی ہے اور اس کی خشک بالو میں سے جو گرد و غبار اٹھتا ہے وہ اس کی پوری نفسیاتی اٹھان پر ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا بن کر چھا جاتا ہے۔

بس ہم دیکھتے ہیں کہ امارت اور حکومت تعلیمی لحاظ سے ایک صیاد کے خطرناک جال ہیں۔ ہم جتنا بھی ان سے بچ کر نکلنا چاہیے ہیں ان کی گرفت ہم پر مضبوط ہوتی جاتی ہے۔
اگر ہمارے بڑے آدمی یہ سمجھیں کہ اپنے بچوں کو علیحدہ کر کے وہ انہیں اچھی تعلیم دلا سکینگے تو ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان بچوں کو اگرچہ اس وقت تو آپ نے ایک تعلیمی خلا میں ایک محفوظ اور مصئون شیش محل میں رکھ لیا لیکن جب ماحول کے زناٹے دینے والے جھکڑ اس خلا میں سائیں سائیں کرتے داخل ہوں گے تو یہ مصنوعی طرز سے اگائے ہوئے پودے زندگی کی روح بخش ہواؤں کے سامنے مرجھا کے رہ جائیں گے۔

ماحول کے اثر کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک کوئلے کی کان کا مالک سفید براق لباس میں مزدوروں کا کام دیکھنے اندر جاتا ہے اور واپسی پر سمجھتا ہے کہ وہ جیسا صاف تھا ویسا ہی لوٹ آیا، لیکن اسے یہ پتہ نہیں کہ شفاف اور چمکتے ہوئے ذروں کی ایک تہ اس کے پھیپھڑوں کے اندر ایسی بیٹھ گئی ہے کہ شاید اس کے دل پر بھی اثر کئے بغیر نہ چھوڑے گی۔ ماحول کا اثر نہ آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے نہ کانوں سے سنا جا سکتا ہے لیکن قدرت کے کارکنوں کی طرح اس کا خموش اور پائدار اثر برابر اپنا گھر بناتا چلا جاتا ہے۔

ہماری تعلیمی اور ماحولی وبائیں ایسی مصیبتیں نہیں جن سے ہم سول لائنوں میں رہ کر بچ سکیں۔ یہ ماحول ایک پرچھائیں کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ ان کا علاج ان سے بھاگنے میں نہیں بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرنے میں چھپا ہے۔ اگر ہم ایک اچھا تعلیمی ماحول پیدا کرنا چاہتے

ہیں تو ہمیں اس کام میں اُستاد کا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ ہمارے بڑے آدمیوں کو تعلیمی مسائل
میں ایک ہمدردانہ اور ذہین دلچسپی لینا ہوگی۔ ہمارے لئے نہیں اپنے لئے صرف اپنے لئے
ہی نہیں بلکہ اپنے بچوں کے لئے۔

ان لوگوں کے دل میں کبھی کبھی تو خیال آتا ہوگا کہ ہمارے اقدار میں کس قدر تبدیلی۔
ہمارے نظریوں میں کس قدر انقلاب کی ضرورت ہے۔ ایک حاکم ضلع کو شاید سالوں کے
ذاتی تجربے کے بعد پتہ لگ جائے کہ ہمارے بالغ شہری کی تعلیم شہریت میں کیا نقائص ہیں۔
ایک زمیندار کے دل پر شاید کبھی یہ چیز روشن ہو جائے کہ کھیتی اور آزاد کھیتی میں کس قدر تعلیمی
ممکنات ہیں۔ تو کیا ہرج ہے کہ وہ اُستاد کے لئے اپنے من کے مندر کے مقفل دروں کو کھول
دیں اپنے منصب اور اس کی پابندیوں سے بلند ہو کر ایک انسان کی حیثیت سے دوسرے
انسان سے گفتگو کریں۔ اس کے سینہ پر ایک محبت آمیز ٹھوکا دے کر کہیں۔ دیکھو ابھی ہم نے
بہت کم کیا ہے ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ترقی کی اس کٹھن اور دشوار گزار منزل میں ہمت
نہ ہارنا۔ ہماری دعائیں اور ہماری نیک خواہشیں تمہارے ساتھ ساتھ ہیں۔ دوسرے ممالک
ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہیں۔ ایک امریکی سیاح جب زیکوسلوویکیا کے ایک مدرسہ میں پہنچا تو اُس
نے دیکھا کہ ملک کا ایک مشہور و معروف مصنف اور ڈراما نویس بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے زیادہ
جستجو سے پتہ چلا کہ مصنف موصوف جو اپنے وقت کی ہر لمحہ کا کھنکتے ہوئے نقرئی اور طلائی سکوں
میں تبادلہ کر سکتا ہے۔ اکثر اوقات وہ اس مدرسہ میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ چیز اُس کے ماہانہ لائحہ
عمل کا ضروری حصہ ہے۔ ایک سیدھے سادے خلوص والے دل کے ساتھ وہ بچوں کی محبت
بھری سبھا میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا۔ اُن کے ساتھ رہتا سہتا ہے۔
اکثر جنگل کی سیروں میں وہ انہیں قدرت کے اس ابدی حسن سے متاثر کراتا ہے جس نے
اس کی تصنیفات کو سہانی روشنی سے جگمگا رکھا ہے۔ کبھی وہ بچوں کے ساتھ مطالعہ قدرت
کرتا اُن کے تشخیص و تفحص کے قواء کی مشق کراتا ہے۔ جو علت و معلول کے عینی مشاہدہ کے

ذریعہ اُن کی قوتِ استدلال کو روشن کرتا ہے۔

کیا ہمارے ملک میں بھی کبھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے؟ کیوں نہیں؟ اس صحرا میں بھی کہیں کہیں برگِ نخیل کی سبزی جھلک جاتی ہے۔ اکثر شانتی نکیتن کے آموں کے کنج میں ننھے ننھے بچے گُرودیو' رابندر ناتھ کے گرد حلقہ باندھ کر ناچتے ہیں۔

اکثر گوکھلے جیسا اُستاد بچوں کے ساتھ اس بنجر اور پتھریلی چٹان کے سایہ میں کھیلتا ہے جس پر ایک صبح اُس نے آفتاب کی کھلتی ہوئی کرنوں کے درمیان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ غربت اور خدمت خلق کی قسم کھائی تھی۔

جب ایک سیاسی کانفرنس کی ہماہمی اور گہما گھمی میں ملک کا سب سے مقتدر لیڈر تعلیمی نمائش کے معائنہ کو جاتا ہے۔ تو اُس کی ملاقات ایک بچے سے کرائی جاتی ہے۔ جس کے ہم جماعت سینکڑوں میل دور کمرے میں بیٹھے اپنے عزیز دوست کا جغرافیائی نقشہ پر تعاقب کر رہے ہیں۔ اُن کھیتوں کی پیداوار کا مطالعہ کر رہے ہیں جن کے درمیان سے ہو کر وہ گزرا ہے۔ ان درختوں کے متعلق دریافت کر رہے ہیں جن کے سایہ میں اس کا خیمہ تنا ہے۔ اُس کی روزانہ مصروفیات پر دلچسپ مضامین لکھ رہے ہیں۔ پورے نصاب کا کام ایک جھٹکے میں پرانے فرسودہ ڈگر سے ہٹ کر ایک اونچے تعلیمی معیار پر پہنچ گیا۔ سیاست داں کا چہرہ بچے کو دیکھ کر کھل جاتا ہے۔ مبارک ہے وہ بچہ جس نے اتنے بچوں کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا کر دی۔ اس بچے کے اُستاد کا دل اس واقعہ سے باغ باغ ہو گیا۔ اس واقعہ سے اُس کی تنخواہ میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا مگر جب وہ مجھے یہ باتیں سُنا رہا تھا تو میں نے اُس کے چہرے پر ایک تازگی، ایک بشاشت پائی جو ہماری آئندہ نسلوں کے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام ہے۔

ایسا ہی پیام دنیا کی زندہ قوموں کو اُن کے بڑے آدمیوں نے اکثر دیا ہے سقراط اور افلاطون، یونان کے درخشاں زمانے کے تابناک ستارے اپنا درس ایتھنز کے

بازاروں۔ اس کی سیرگاہوں میں دیتے تھے۔ سقراط ایک غریب ملازم کو روزمرّہ کی باتوں ہی سے فیثاغورث کا اصول سمجھاتے ہوئے نہیں شرماتا۔ اور افلاطون جیسا مفکّر نیکی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اس بات سے نہیں گھبراتا کہ اہل ایتھنز اُس کے سامنے سے ایک ایک کر کے اُٹھتے جارہے ہیں اور ارسطو کے سوا کوئی اس طوفانِ علم کی تاب نہیں لاسکتا۔ لیکن ہمارے بڑے آدمی مدرسوں میں جا کے کیا کرتے ہیں اکثر اُن کی آمد ایک جلوسانہ انداز میں ہوتی ہے کبھی کبھی کوئی بڑا آدمی مدرسے میں انعامات کے جلسے کی صدارت کرتا ہے کبھی کوئی بڑی ہستی معائنہ کرنے آجاتی ہے۔ کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے بچوں کو کسی بڑی ہستی کے استقبال یا خوش آمدید کے لئے رنگ برنگ کی جھنڈیاں دے کر خوبصورت قسم کی پگڑیاں پہنا کے یوں دو رویہ کھڑا کر دیا جاتا ہے جیسے مغلوں کے زمانے کے باغ میں روشوں پر سرو کے درخت کھڑے ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی کی سواری آئی فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ ننھے ننھے ہونٹوں نے کبھی ڈرتے ڈرتے کبھی جھجکتے جھجکتے کبھی کبھی ڈر کی وجہ سے دفعتاً اونچی آوازمیں ہپ ہپ ہُرّے کی صدائیں بلند کیں۔ بڑے آدمی کی سواری جس تیزی سے آئی اُسی تیزی سے آگے نکل گئی۔ بچوں نے دبی ہوئی آواز میں ڈرتے ڈرتے انگلیوں سے اشارا کیا صاحب ادھر بیٹھے ہیں۔ مگر اتنے میں اُستاد جو آوارہ بھیڑیں دوبارہ اکٹھا کر کے واپس مدرسے کو ہانکنے کو تیار ہے غصہ میں گھڑک کر بولا "تمہاری شامت تو نہیں آرہی۔ یہ مٹکتی ہوئی انگلیاں ڈنڈے سے چٹخائی جائیں گی تم ایک بڑے آدمی پر اشارہ کرنے کی جرأت کرتے ہو؟"

معصوم بچے سہم کر رہ جاتے ہیں۔ اُستاد اُن کی نگاہ میں ایک بہت بڑی ہستی ہے اور جس ہستی سے اتنی بڑی ہستی بھی اتنی خائف ہے وہ کتنی بڑی ہو گی۔ اُن کی ننھی سی قوتِ متخیلہ شاید اُس کی پہنائیوں کو اپنے دامن میں بھی نہیں لے سکتی۔ اب ایک نیا سین آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ مدرسے کے کھیل کے میدان میں ایک مخملیں شامیانے کے

نیچے ایک مانگے ہوئے قالین سے کے اوپر ڈائس ایک بڑی چوکی اور اُس کے اوپر صدارتی کرسی اور صدارتی کرسی کے اوپر ایک بڑا آدمی ایک طرف سے ایک بڈھا سا اُستاد جس کی عینک اُس کی ناک کی پھنگی پہ ٹکی ہوئی ہے، پیچھے کی قطاروں سے سمٹتا، سمٹتا، جھکتا۔ جھکاتا بچتا بچاتا۔ فرطِ ادب سے ایک سو بیس درجہ کا زاویہ بناتا چوکی کے ایک کونے پر ہی رک جاتا ہے اور کہتا ہے۔ "معزز حضرات آج اس ادارے کے لئے کس قدر فخر ومباہات کا دن ہے کہ جناب صدر نے ہمیں اپنے قدوم میمنت لزوم سے افتخار اور استشفا بخشا ہے۔ میرے عزیزو تمہیں پتا ہونا چاہئیے کہ ہمارے صدر محترم آج ہمارے صوبے کی سیاست کے سب سے درخشندہ ستارے ہیں۔ عزیز طالب علمو سیاست داں بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ بہت بڑے آدمی اُن کے دل ایک روحانی جذبے سے منور ہوتے ہیں اور اللہ کا اُن کے سروں پر سایہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔"

اس کے بعد تھوڑی سی ہلچل۔ تالیوں کے زبردست مظاہرے کے درمیان جناب صدر اپنی بھاری بھرکم شخصیت کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تقریر کے وقت صدر محترم اپنے ہاتھ کے دونوں انگوٹھوں کو واسکٹ کی جیبوں میں یا پھنسائے رکھتے ہیں۔ اور اُن کے دونوں ہاتھ اب اُن کی توند پر یوں جمے ہوئے ہیں جیسے کہ پہلے میز پر تھے۔ یہ توند اُن کی دنیاوی کامیابی کا جیتا جاگتا لڑھکتا پھڑکتا ثبوت ہے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ ببانگ دہل اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ دوستو زندگی کی کامیابی اسی میں مضمر ہے۔ اب ان کی تقریر شروع ہوتی ہے۔ "معزز خواتین اساتذہ کرام اور طالب علمو۔ میرے لئے یہ نہایت مسرت کا دن ہے کہ میں آپ لوگوں کو آج آپ کی اسکولی زندگی کی آخری تقریب میں شامل ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میرے عزیزو تم زندگی میں پہلا قدم رکھ رہے ہو۔ دیکھنا اگر ایک قدم آگے بڑھاؤ تو دوسرا قدم پیچھے نہ ہٹنے پائے۔ سیٹھ مکند لال کی طرف دیکھو جنہوں نے اپنی ہمت اور کوشش سے ایک کارخانے

سے شروع کرکے اب دس کارخانے کھول لیے ہیں راجہ حسن یار خاں بغتانہ کی جائداد اُن کی انتھک اور قابلِ مبارک باد کوششوں سے ہمارے دیکھتے دیکھتے چوگنی ہو گئی ہے۔ میرے عزیزو یہ درخشندہ مثالیں تمہارے سامنے ہیں۔ ان پر چلو قسمت کامیابی کا سہرا تمہارے سر پر رکھے گی......"

ماسٹر علی محمد صاحب تقریر سن رہے ہیں اور اُن کا دل بے طرح اُمڈا آ رہا ہے۔ اُن کا پچھلے سال کا سب سے اچھا طالب علم کچہری میں مہینوں سے جوتیاں چٹخار رہا ہے۔ ایک دفتری کی جگہ کا اُمیدوار تھا مگر مل نہیں سکی۔ دوسرا لوگوں کے طعنوں سے بچنے کے لئے گھر سے باہر نکل گیا ہے۔ اُن کے کانوں میں کامیابی کے یہ سنہرے خواب کچھ بھلے معلوم نہیں ہوتے۔ مگر بچے؟ بچوں کی نگاہ میں سیٹھ کمن دامل اور راجہ حسن یار خاں جو سامنے بیٹھے ہوئے اچھے خاصے بھلے آدمی نظر آتے تھے۔ اب دیوتا دکھائی دیتے ہیں۔ تقریر ختم ہوئی بڑے آدمی نے جلدی جلدی دو چار معززین شہر سے ہاتھ ملائے۔ ایک دو اُستادوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گویا ملانے کو ہیں۔ لیکن جلدی کے مارے صرف اُن کی اُنگلیوں کی پوریں چھو سکے اور ہاتھ دفعتاً یوں پیچھے کھینچ لیا۔ جیسے کہیں بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ بچوں نے اس بات کو دیکھ لیا ہے۔ بچوں کی نگاہ بڑی تیز ہوتی ہے۔ اُن کا عزتِ نفس کا احساس بہت بلند ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ اس سماج میں اُستاد کی کیا عزت ہے۔ بچوں کے حافظے بعض باتوں کے لئے بہت ہی قوی ہوتے ہیں۔ وہ اس واقعے کو سالہا سال نہیں بھولیں گے۔

اور جب یہ بڑا آدمی واپس پہنچتا ہے اُس کے چہرے پر ایک بیزاری کا انداز۔ اُس کی باتوں سے جھنجھلاہٹ معلوم دیتی ہے۔ کسی گھر والے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا بھی "کہ آج کہاں تشریف لے گئے تھے" تو کچھ ترش روسے ہو کر کچھ پیشانی چڑھا کے کچھ استغنا کے انداز میں بولے " اجی تھی ایک تقریر اسکول میں، میں تو تنگ آگیا بچے، اُستاد، ہنگامہ، شور،

میرے سر میں تو ہلکا ہلکا سا درد شروع ہو گیا ہے"۔ بہر حال سوال یہ ہے کہ اس قسم کی جلوسانہ تقریبوں سے کس کو کیا فائدہ پہنچا۔ کیا بڑے آدمی کی تقریر سے بچوں میں بڑے جذبات پیدا ہوئے میں کہتا ہوں کہ کیا کوئی ایسا موقع بھی ہوتا ہے جہاں بڑے آدمی اپنے آپ کو انسانی خلوص سے پیش کر سکیں۔ کیا کبھی اُن میں ایک حسین سادگی کی جھلک پیدا ہو سکتی ہے۔ سادگی، اخلاص، نیکی، وہ نیکی جو اپنے مخصوص انداز میں دوسروں کو بھی نیک بنا دے۔ وہ سادگی جو اپنے اثر سے دوسروں کو بھی سادہ بنا دے مدرسے کی دنیا سادگی کی دنیا ہے۔ اخلاص کی دنیا ہے۔ معصوم روحوں کی دنیا ہے۔ ایک حد تک سچی اقدار کی دنیا ہے کیا اُن سے کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے جلوسانہ انداز کو۔ اپنے دبدبے اور طمطراق کو۔ اپنے نمائشی اور جھوٹے لباس کو۔ اپنے آرائشی اور بھڑکیلے ملبوسات کو ایک لمحہ ایک پل کے لئے علیحدہ اُتار کر رکھ دیں اور اس بچوں کی دنیا میں ایک بچے کی سادگی کے ساتھ آئیں۔ اپنے اوج کے اخلاق عالیہ کی چمک اور ضیا سے اگر اس میں کچھ چمک ہے مدرسے کے ماحول کو جگمگا دیں۔ ایک سچے اُستاد کو تصنع اور نمائش سے دلی نفرت ہوتی ہے۔ خواہ یہ نمائش ایک لیڈر کی نمائش ہو یا ایک ایکٹر کی۔ اُس کی اُنگلیاں اس بھاری بھرکم اور فضول بھیس کو اُتار پھینکنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئیں۔ اور اُس کی تہ میں اُس کے سامنے ایک مخلص چہرہ اور ایک انسان کی زندہ روح عریاں ہو جانا چاہیئے

جس عظیم الشان مشغلے میں وہ مصروف ہے وہ زندگیوں کی تعمیر ہے اس تعمیر میں کہیں بھی کسی کچی اینٹ جھوٹے مصالحے۔ یا نمائشی رنگ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اُستاد بڑے آدمی چھوٹے آدمی۔ غریب اور امیر ایک بہت بڑے امر میں مصروف ہیں۔ شعوری طور پہ یا غیر شعوری طور پر سماج کی بھاری بھرکم اور وزنی گاڑی کو آگے ڈھیلنے کے لئے ہر ایک کو مردانہ وار اپنا سینہ تان کر زور لگانا چاہیئے۔ ایک مخلصانہ کوشش۔ ایک سچا جہاد جس میں ہر انسان دوسرے سے اخلاص اور باہمی مفاہمت کی سطح پر آ کر اشتراک عمل کر سکے۔

زندہ قوموں پر ایسے دور گزر چکے ہیں جب کہ وہ زندگی کی ایک نئی تعلیم۔ سماج کی ایک نئی تشکیل کے لئے جوشاں اور کوشاں تھے۔ اسی جوش اور ولولے کی رو میں بہہ کر ٹالسٹائی نے دیہاتی بچوں کے لئے اپنا مدرسہ کھولا تھا ایک بہت بڑی جاگیر کا مالک۔ ایک معزز خاندان کا درخشندہ ستارہ۔ دن کو بچوں کے ساتھ جماعت کے کمرے میں مغز مارتا ہے۔ سہ پہر کو اُن کے ہمراہ علمی سیروں میں حصّہ لیتا ہے اور رات کو ستاروں کی سہانی چھاؤں میں جنگل کے گھنے درختوں کے سایہ میں کبھی تو اُن کے دلوں میں قدرت کے لئے احساس حسن بیدار کرتا ہے اور کبھی کبھی ان معصوم کمسن بچوں کی امداد سے ادب و فن کی بدیہی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

روس میں وہ زمانہ کچھ عجیب بیداری کا زمانہ تھا آزادی اور انسانی ہمدردی میں سرشار ادیب اور مفکرین چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح وہ ملک میں نئی اقدار کے معیار پھیلا دیں ٹالسٹائی ہی نہیں چیخوف۔ ترگنیف، گورکی سبھی تعلیم کی سماجی اہمیت کو سمجھ رہے تھے۔ ایک دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ ایک آئندہ روشن مستقبل کی طرف نظریں جمائے بیٹھے تھے جس پر سے ظلمت کا پردہ ایک صحیح قسم کی تعلیم ہی اُٹھا سکتی ہے۔ وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ کسی نسل کی تعمیر کا کام خاموش محنت اور دیانتدار مشقت چاہتا ہے یہ کام اسٹیج کے تختوں پر دھما دم مچانے سے یا ایک منہ میں جھاگ بھر لانے ایکٹر کی شاعری اور تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔ میں حیران ہوں کہ اگر چیخوف کو ہمارے مدرسے میں اسی رسمی تعارف سے کرسئ صدارت پیش کی جاتی تو وہ کیا کہتا۔ اس کی مخلص اور نیک روح اس قسم کی ظاہر داری اور نمائشی تنظیم و شہرت سے کتنی گھبراتی تھی وہ اپنے اعزاز میں جلسوں اور دعوتوں کی تقریریں سن کر یوں گھبرا اٹھتا جیسے کسی نے اچانک اُس کی پیٹھ پر قمیص کے اندر برف جیسا ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔

ایک دعوت کے متعلق لکھتا ہے" میں ایک دوست کے ہاں جاتا ہوں شام کے کھانے کا انتظام ہے۔ بہت سے مہمان مدعو ہیں۔ بڑا لطف ہے خود بھی پی رہا ہوں دوسروں کو بھی پلا رہا ہوں۔ لڑکیوں سے بڑے لطف کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اتنے میں ایک صاحب کچھ بے طرح اہمیت کے

انداز میں کھڑے ہو جاتے ہیں گویا سرکاری وکیل ہیں۔ اور میری تعریف میں ایک تقریر جھاڑ دیتے ہیں۔ "الفاظ کا جادوگر..... بلند تخیل...... آج ہمارے مابین۔ تم ہر جگہ عقلمندی پھیلا رہے ہو..... انمٹ شہرت..... ابدی مقبولیت" ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مجھ پر سے کوئی ڈھکنا اُٹھا لیا گیا ہو اور کوئی شخص میری کنپٹی پر پستول کی نالی جمائے کھڑا ہے۔ تقریر کے بعد گفتگو کی ہلکی سی سرسراہٹ اور پھر ایک بھونڈی اور تکلیف دینے والی خاموشی۔ سب لطف خاک میں مل گیا۔ میرا ہمسایہ اشارہ کرتا ہے۔ تم بھی کچھ کہو۔ جی چاہتا ہے کہ اُس کے سر پر توپ اُٹھا کر دے ماروں"

اس کے برعکس جب وہ اپنے دیہاتی مکان میں بیٹھا ہوتا ہے اور کوئی گاؤں کا اُستاد کچھ گھبرایا سا۔ کچھ شرمایا سا۔ اُس سے ملنے آتا ہے۔ تو اُس کی روح کی کلی سی کھل جاتی ہے۔ اپنے دونوں بازو وں کو پھیلا کر وہ اُسے خوش آمدید کہتا ہے۔ اُس کے اخلاص۔ اُس کی محبت۔ اُس کی سادگی سے ایک چنگاری اُڑتی ہے اور اُستاد کے ظاہری اخلاقی خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ وہ بھی ایک مقناطیس کے زیر اثر آ کر مقناطیس ایک پارس کے قریب پہنچ کر دمکتا ہوا کندن بن جاتا ہے۔

جب کبھی وہ تندرستی کے لئے دیہی علاقوں میں نکل جاتا تھا تو وہاں ان جگہوں کے مدرسے دیکھتا تھا۔ اُستادوں سے باتیں کرتا۔ اُن کی مصیبت میں ہمدردی۔ اُن کی مشکلات میں ہمدردی کا ہاتھ بڑھاتا تھا۔

گورکی نے اسے اکثر کہتے ہوئے سُنا "بھئی گورکی۔ تمہیں پتہ ہے۔ ایک استاد ابھی ابھی یہاں آیا ہے۔ وہ بیمار ہے اور شادی شدہ بھی ہے۔ تم اس کے لئے کچھ کر سکتے ہو یا نہیں۔ فی الحال تو میں نے اس کے لئے انتظام کر دیا ہے۔" "دیکھنا گورکی ایک اُستاد تم سے ملنا چاہتا ہے وہ بیمار ہے اس لئے بستر سے تو اُٹھ نہیں سکتا ذرا تم ہی جا کر اُس سے مل آؤ۔"

چیخوف اکثر ان اساتذہ کی بے لطف پھسپھسی، اور بے ربط گفتگو بڑی توجہ سے سُنتا تھا شروع شروع میں چند ایک منٹ کے لئے یہ اُستاد اپنے احساس کمتری کی وجہ سے عجیب دلچسپ حرکات کر بیٹھتے تھے۔ ایک کرسی کے کنارے پر ٹکے ہوئے بیٹھ جاتے تھے۔ ایسی احتیاط اور نزاکت سے گویا اُس

کی سیٹ میں نہیں لگی ہوئی ہیں۔ اپنے بے ڈھنگے طریقہ پر خود ہی شرمسار، چہرہ شرم کے مارے سرخ
ہوا جا رہا ہے۔ ماتھے پر پسینہ چھوٹا پڑتا ہے۔ بڑی کوشش سے الفاظ چن رہے ہیں۔ جھنجھلا کر
ڈھونڈ رہے ہیں تاکہ اس بڑے مصنف کے سامنے نکو نہ بن جائیں اور سلیس اور عالمانہ گفتگو کرسکیں
اُن کے شرمیلے پن کا مظاہرہ کئی ایک طریقوں سے ہوتا تھا۔ یا تو گفتگو کا دھاوا دفعتاً کچھ بند سا
ہو جاتا تھا اور اُس میں سے کہیں کہیں کچھ بوندیں رستی رہتی تھیں یا کبھی کبھی اس کے قید و بند
ایک سیلاب کی آندھی میں ٹوٹ جاتے تھے اور وہ چیخوف پر بے ربط سوالوں کی ایسی بوچھار کر دیتے
تھے جو اُن کے ذہن میں نہ اب تک کبھی آئے تھے اور نہ کبھی آئیں گے۔ ہمارے ملک میں بھی
اکثر بڑے آدمیوں کو چھوٹے اور غریب اُستادوں سے ملنے کا اتفاق ہو جاتا ہے اُن کے بھی منہ
سے اکثر بات نہیں نکلتی۔ اور جب نکلنی شروع ہوتی ہے تو بند نہیں ہوتی۔ یہ بڑے آدمی اپنی منصب
کی بلندیوں سے اُن کے اوپر مسکراتے ہیں اور اپنی عظمت کے احساس اور دوسرے کی کم مائگی
کے تخیل سے یوں کھنچے جاتے ہیں جیسے سورج دیوتا کا چہرہ ہنسی کے گول گپے کی طرح سے پھیل جاتا
ہے وہ ایک شانِ استغنا سے چھوٹے آدمی کو تھپتھپا دیتے ہیں۔ کچھ اُن کے احساسِ برتری کو مہمیز
لگتی ہے۔ کچھ دوسرے کے احساسِ کمتری پر اوپری مرہم کا پھایا لگ جاتا ہے لیکن گفتگو اور ملاقات
کی سطح بہت مختلف ہے ایک چوکی پر نہیں بلکہ شملہ کی پہاڑیوں سے بھی اونچی چوٹیوں پر ٹکا ہوا ہے
اور دوسرا زمین پر ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ نیچے۔

چیخوف جب ان چھوٹے اُستادوں سے بات کرتا تھا تو وہ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
اُن کی زندگیوں کی مایوسیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُن کے ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا کو جسے
صرف ہمدرد دل رکھنے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں سننے کی کوشش کرتا تھا جب کبھی وہ اُن کی بے ربط
گفتگو اور اُن کے عجیب و غریب اضطراری حرکات دیکھتا تھا تو اُس کی غمگین آنکھوں میں ایک مسکراہٹ
جھلکتی تھی۔ اُس کے ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن پڑ جاتی تھی اور پھر وہ اپنی ملائم اور حسین آواز میں سادہ
صاف اور گھریلو الفاظ بولنے لگتا تھا۔ یہ سوال اُس کے مہمان کے لئے کچھ اچنبھا سا ہوتے تھے۔

اس کو دفعتاً غیر شعوری طور پر سادہ بنا دیتے تھے۔ کھیل کا ڈھنگ ہی بدل جاتا تھا اُسی اُستاد میں جو اپنے آپ کو بڑا شاطر اور عالم ظاہر کرنے کی چال چل رہا تھا ایک تبدیلی سی آجاتی تھی۔

ایسی ہی ملاقات کے متعلق گورکی لکھتا ہے "مجھے ایک اُستاد کے متعلق یاد ہے ایک اونچا پتلا دُبلا سا آدمی، پیلا رنگ اور بھوک کے مارے چہرے کے زاویے نمایاں، لمبی طوطے جیسی ناک چیخوف کے سامنے بیٹھا ہوا اپنی سیاہ آنکھیں اُس کے چہرے پر جمائے ہوئے غمگین اور مدہم سروں میں برابر بولے جا رہا تھا" تعلیمی سال کے دوران میں زندگی کے ایسے تاثرات کی وجہ سے ایک نفسیاتی توازن السحدین ہو جاتا ہے جو ہماری گرد و پیش کی کائنات کا ایک مادی مطالعہ بالکل مفقود کر دیتا ہے کائنات کیا ہے محض اضافی چیز ہے.... فلسفہ خودی..... تصوف"

وہ فلسفے اور تصوف پر سینگ جمائے ہوئے گویا پلا پڑ رہا تھا اور کبھی وہ مختلف علوم کی سطح پر یوں ڈگمگا رہا تھا جیسے کوئی شرابی برف پر اسکیٹ کر رہا ہے"۔ اتنے میں چیخوف نے بہت اطمینان اور نرمی سے پوچھا" اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے علاقے میں کونسا اُستاد بچوں کو پیٹتا ہے؟"

یہ سنتے ہی اُستاد اپنی کرسی پر سے اچھل پڑا اور مارے غصے کے دونوں ہاتھوں کو ہلانے لگا "جناب کیسے کہہ رہے ہیں؟ میں؟ نہیں! ہرگز نہیں" چیخوف دوبارہ مسکرایا۔ اس حرکت سے اُستاد کو اطمینان سا ہو گیا" ارے بھئی تم گھبرا کیوں رہے ہو۔ میں تمہیں نہیں کہہ رہا ہوں مجھے تو ویسے ہی یاد آ گیا تھا۔ خدا جانے کیسے معلوم ہوا۔ ہاں ہاں خوب یاد آیا۔ ایک دفعہ اخباروں میں پڑھا تھا کہ آپ کے علاقہ میں کوئی اُستاد بچوں کو پیٹا کرتا ہے" اُستاد اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھا اور ایک آرام کا سانس لے کر گہری اور مدہم آواز میں کہنے لگا۔ ہاں ہاں سچ ہے ایسی کچھ بات ہو ئی تو تھی۔ اُس اُستاد کا نام مکاروف ہے۔ آپ تو خوب جانتے ہیں کہ یہ چیز ایسی کچھ تعجب انگیز تو نہیں ہے زیادتی تو اُس نے ضرور کی مگر وجوہات بھی تھیں۔ ایک تو اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اور اُس پر چار بچے۔ ستم یہ ہے کہ بیوی بیمار اور خود تپ دق کا شکار۔ تنخواہ محض بیس روبل اور مدرسہ کچھ نہ پوچھیے، اصطبل سمجھ لیجئے یا تہ خانہ۔ اور اُستاد کے پاس ایک ہی کمرہ چاہے اوڑھ لے چاہے بچھا لے۔ اجی ایسے

حالات میں تو اگر فرشتہ بھی سامنے آجائے تو بغیر مار کھائے نکلنے نہ پائے گا۔۔۔۔اور نیچے؟ تو آپ سچ مانیے اُن میں فرشتے کی سیرت کا تو دور دور شائبہ بھی نہیں!

دیکھیے وہی شخص جو چند لمحے پہلے چیخوف پر اپنے فلسفیانہ الفاظ کے پتھر لڑھکا رہا تھا اور اپنی طوطے نما ناک روئی صورت سے ہلا رہا تھا۔ اُس نے اُس کی سادگی اور اخلاص کے اثر میں آکر سیدھے سادے پر معنی اور ہیرے کی کنی کی طرح کٹے چھٹے الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرنا شروع کر دیا۔ وہ الفاظ جو ایک آگ کی طرح اوسی گاؤں کی خوفناک اور بھیانک حقیقتوں کو روشن کر رہے تھے۔

جب اُستاد نے اپنے میزبان کو الوداع کہی تو اُس نے چیخوف کا چھوٹا مرمل سا ہاتھ اپنی کرزوَر اور پتلی انگلیوں میں تھام لیا اور کہنے لگا "میں تمہارے پاس اس تیاری کے ساتھ آیا تھا گویا میں کسی حاکم کے سامنے پیش ہو رہا ہوں میرا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ میں ایک مرغ کی طرح پر پھڑپھڑا کر اپنے آپ میں ہی مگن ہو رہا تھا۔ میں تم پر یہ ظاہر کرنے آیا تھا کہ میں ایک غیر معمولی انسان ہوں۔۔۔۔۔ اور اب میں تم سے بطور ایک اچھے گہرے دوست کے رخصت ہو رہا ہوں وہ دوست جو سب کچھ سمجھ رہا ہے۔ اور سب کچھ سمجھ لینا کس قدر شاندار چیز ہے۔ شکریہ۔ میں تمہارے پاس سے ایک دلفریب خیال لے کر جا رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بڑے آدمی سیدھے سادھے ہوتے ہیں۔ ہم چھوٹے آدمی بھی اُن کو سمجھ سکتے ہیں۔ وہ روحانی طور پر ہم لوگوں کے زیادہ قریب ہوتے ہیں بہ نسبت اُن بدبخت لوگوں کے جن کے درمیان اکثر ہم رہتے ہیں اچھا خدا حافظ۔ میں تمہیں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔"

جب وہ رخصت ہو گیا تو کچھ دیر تک چیخوف اُس کے پیچھے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا "کتنا بھلا آدمی ہے۔ مگر میرے خیال میں وہ زیادہ مدت تک اُستاد نہیں رہ سکتا۔" میں نے پوچھا کیوں؟ "ابھی محکمہ اُسے جلد ہی ڈھونڈ لے گا اور نکال باہر کرے گا۔ روس میں تو ایک نیک آدمی اُس ہوّے کی مانند ہے جس سے مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں۔"

عبدالغفور صاحب۔ ایم۔اے

ڈیوی کا نظریہ تعلیم

بیسویں صدی کی مایہ ناز و فخر روزگار ہستیوں میں جان ڈیوی کو خاص امتیاز اور اہمیت حاصل ہے۔ وہ اک طرف فلسفی۔ ماہر اخلاقیات۔ منطقی، ماہر نفسیات اور دوسری طرف معلم اور فلسفہ تعلیمات کا امام اور درخشندہ ستارہ ہے۔ اس کی تصنیف "جمہوریت اور تعلیم" افلاطون کی "ریاست" کے ہم پلہ خیال کی جاتی ہے۔ وہ ۲۰ راکتوبر ۱۸۵۹ء میں برلنگٹن میں پیدا ہوا۔ اپنی ابتدائی تعلیم نیو انگلینڈ اسکول میں حاصل کی اور اے۔ بی کی ڈگری جامعہ ورمانٹ سے ۱۸۷۹ء میں لی۔ ۱۸۸۴ء میں اس کو ہاپکنس یونیورسٹی واقع بالٹی مور نے پی۔ ایچ کی ڈگری عطا کی۔ ۱۸۸۴ء سے ۱۸۸۶ء تک جامعہ میچگان میں فلسفہ کا درس دیتا رہا۔ ۱۸۸۶ء میں وہ جامعہ مینیسوٹا میں پروفیسر مقرر ہوا۔ اور ۱۸۸۹ء میں دوبارہ شعبہ فلسفہ کے صدر کی حیثیت سے جامعہ میچگان گیا۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۹۰۴ء تک وہ جامعہ شکاگو میں شعبہ فلسفہ کے صدر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اسی جگہ سے اس کی شہرت تعلیمی حلقوں میں بڑھنی و پھیلنی شروع ہوئی۔ عرصہ تک وہ کولمبیا یونیورسٹی میں ۱۹۰۴ء سے فلسفہ کا پروفیسر رہا۔ اب ریٹائر ہو کر نیویارک میں مقیم ہے۔ ۱۹۰۴ء میں جامعہ وسکانسن اور ۱۹۱۰ء میں جامعہ ورمانٹ نے اس کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی وہ مختلف بڑی بڑی بین الاقوامی انجمنوں کا رکن و صدر رہے اور اس کے مضامین وقت کے علمی رسالوں میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

نظریہ عملیت (Theory of Pragmatism) جان ڈیوی، چارلس پرئیز اور ولیم جیمس کے نظریہ عملیت سے کافی متاثر ہو چکا ہے۔ اس نے منصبیت اور آلیت کی عمارت اسی بنیاد پر قائم کی ہے۔ اس نظریہ کی رو سے کسی شے کا معیارِ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کا تعلق انسانی اغراض و مفاد سے ہو۔ اور جو نظام عالم میں جاری ہو سکے وہ صحیح ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ابتدائی اسباب کے مطالعہ سے قطع نظر کر کے اس کے عملی پہلو اور نتیجہ کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ وہ حقیقت کی جستجو میں معقولات

زبانی حلوں، اٹل اصولوں، کلیات ازلی اور ابتدائی اشیا کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ صرف واقعات، تجربات ومشاہدات کو مشعل ہدایت بناتا ہے۔

ڈیوی کا خیال ہے کہ یہ فلسفیانہ طریقہ ڈارون کے خیالات وتحریرات کا رہین منت ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ڈارون کی کتاب "نوع انسانی کی ابتدا" کے شائع ہونے سے قبل غیر حیاتیاتی ہیئت طبیعات وکیمیا میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ اور دنیائے قدیم کی غیر معتدل وپائیدار اشیا کے بجائے بے ثبات ومتغیر عالم میں نئی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ڈارون نے حیاتیاتی سائنس میں انقلاب پیدا کیا لیکن اس کا اثر علوم سیاسیات، اخلاقیات، منطق ومذہب پر بھی پڑا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج شعبہ حیات کے ہر پہلو پر غور وفکر کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں طبیعیاتی وریاضیاتی عالم کا تصور اسی وجہ سے حیاتیاتی دھرکی سمجھا جاتا ہے۔

ڈیوی کا میلان ورجحان انسانی زندگی اور جد وجہد کی طرف ہے جو تحقیق وتفتیش اور تجربہ کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کی مثال وہ عالم اخلاقیات میں یوں دیتا ہے کہ اصول اٹل اور ابدی نہیں ہونے چاہئیں بلکہ مفروضہ دعویٰ ہونے چاہئیں تاکہ وہ برابر آزمائے جا سکیں اور ان میں وقتاً فوقتاً امتداد زمانہ کے مطابق تغیر وتبدل کیا جا سکے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان خیالات کے ساتھ ساتھ راہ وروش اور طور وطریقہ کو سمجھے تاکہ وہ زمانہ کی رفتار پر قابو پا سکے۔

ڈیوی کا خیال ہے کہ قابو حاصل کرنا افراد کی روشن خیالی اور فطانت پر منحصر ہے۔ اور یہ بات جمہوریت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے جو باوجود اپنی تمام کمزوریوں (خرابیوں) کے فرد کی مکمل نشو ونما اور ارتقا کا بہترین ذریعہ ہے نظریہ عملیت کے تحت وہ علم کو اخلاق سے جدا نہیں سمجھتا ہے۔ اس کے فلسفہ کا صحیح نظریہ تعلیمی نظریہ میں پنہاں ہے حقیقت یہ ہے وہ فلسفہ وتعلیم کے تعلق کو زندگی کی نشو ونما اور ترقی میں چولی دامن کا ساتھ سمجھتا ہے۔

<u>تجربہ کی مسلسل تعمیر نو</u> ڈیوی کے تمام فلسفہ کی اساس تجربہ ومشاہدہ ہے۔ وہ تعلیم کو نشو ونما کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں تعلیمی طریق وروش تجربہ کی متواتر تعمیر نو کا نام ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تجربہ بہترین معلم ہے۔ لیکن یہ رائے صائب نہیں کہ علم ایام زندگی کے گذرنے سے حاصل ہوتا ہے اور عہد طفولیت سے سن بلوغ تک ترقی کرنے میں عقل و فراست بھی ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہتی ہے۔ یہ اسکول کا فرض مین ہے وہ اس کی (تجربہ) ترقی میں ہاتھ بٹائے بلکہ علم کو اس کے دوش بدوش کافی سرعت ساتھ چلنے دے تاکہ زندگی کے صحیح و اصلی تجربات سے روشناس ہوکر شمع راہ کا کام دے، کیونکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر انسان تجربہ سے مختلف سبق حاصل کرتا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جن کو زندگی ہیں اول سے آخر تک یکرنگی اور جمود معلوم ہوتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کے لئے زندگی ہر روز ایک نیا علم و پیغام لاتی ہے اور ان کے خزانہ دانشمندی میں اضافہ کرتی ہے۔

ایسا اختلاف کیوں ہے؟ کیا یہ فطری قوتوں کے باعث ہے یا تعلیم کے اختلاف کا نتیجہ ہے؟ ڈیوی نے اس مسئلہ پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ اپنی تصنیف "جمہوریت و تعلیم" میں لکھتا ہے "تجربہ کی ماہیت کو یوں سمجھئے کہ وہ حرکت و جمود کے عناصر کا مجموعہ ہے۔ تجربے کا حرکی یا عملی پہلو سعی و کوشش ہے جس کی مکمل تشریح دار التجربہ یا عمل کا عمل اور تجربہ ہے۔ جمودی پہلو مصائب و آلام کو برداشت کرنے اور جھیلنے کا نام ہے جب ہمیں کسی شے کا شعور یا تجربہ ہوتا ہے تو وہ اس پر عمل کرنیکا محرک ہوتا ہے۔ اور ہمارا عمل کسی نہ کسی طرح اس سے متعلق ہوتا ہے۔ پھر ہم پر اس کے نتائج کا اثر ہوتا ہے۔ ہم اس چیز پر اثر ڈالتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں یہ ایک عجیب انوکھا اجتماع و ارتباط ہے۔ تجربہ کے ان دونوں پہلوؤں یا صورتوں کا اتصال و ربط اس کی قدر و مفاد کا معیار ہے۔ صرف عمل و حرکت ہی کا نام تجربہ نہیں ہے۔ وہ تجزیہ کرنے اور انتشار کو ایک مرکز پر لانے کا نام ہے۔ تجربہ بمعنی جد وجہد تغیر و تبدل کو اپنے ہمراہ لاتا ہے لیکن تغیر ایک بے معنی سی حالت ہوگی اگر اس کے ساتھ ساتھ ان نتائج کا احساس نہ ہو جو اس سے وابستہ و متعلق ہیں۔ جب کوئی عمل نتائج کے معلوم کرنے میں مسلسل جاری رہتا ہے اور جب عمل کے تبدل کا پرتو و انعکاس ہم میں تغیر پیدا کر دیتا ہے۔ تو مسلسل حرکت بہت پرمعنی ہو جاتی ہے اسی وقت ہم کچھ سیکھ سکتے اور حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً جب ایک بچہ اپنی انگلی آگ میں ڈالتا

ہے تو وہ تجربہ نہیں کہا سکتا بلکہ تجربہ اس حالت کو کہتے ہیں جب بچہ تکلیف کی شدت سے انگلی کو حرکت دیتا ہے اور اس کے نتیجہ کو بھگتا ہے آگ میں انگلی ڈالنے کے معنی جلنے کے ہوئے لیکن اگر اس بات کا احساس نہ ہو کہ یہ نتیجہ کسی اور وجہ سے ہوا ہے تو لکڑی کے جلنے کی طرح انگلی کے جلنے سے صرف اسکی ظاہری شکل وصورت بدل جائے گی.......... تجربہ سے کچھ حاصل کرنے اور سیکھنے کیلئے دوراندیشی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور پیش وپس پہ نگاہ رکھنی پڑتی ہے تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ اور آخر میں ہم کو کتنا لطف وسرور حاصل ہوتا ہے یا کتنی تکلیف وپریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

ڈیوی کے نظریہ کے مطابق تجربہ سعی وجدوجہد، نتائج کے برداشت کرنے اور ان دونوں کے تعلقات کے پہچاننے پر مشتمل ہے۔ اس میں حیات کا تسلسل اور اتحاد شامل ہے پیہم اور منتظم عمل ایک غیر مربوط اور کورانہ لائحہ عمل سے مختلف ہے اور جو کام آزمودہ ہو وہ عملی اقدام میں برابر معین ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمل افزائش پذیر ہے اور ہر ذمہ دار عمل اور کام کے لئے ہم کو ہمیشہ آزمودہ نتائج کو مدنظر رکھنا لازمی ہے۔

ڈیوی لکھتا ہے کہ" علم کا فرض ہے کہ وہ ایک تجربہ سے دوسرے تجربوں میں پوری طرح فائدہ پہونچائے۔ ایک مکمل علم تعلقات کی ایسی منتظم ومسلسل کڑی پیش کرتا ہے کہ پرانے تجربے کی روشنی میں نئے تجربات سے پوری طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے اور مشکل وپیچیدہ عمل بآسانی دریافت کیا جا سکتا ہے۔

ڈیوی قدیم چیزوں کی قدامت کو نہیں سراہتا بلکہ وہ ان کی قدر وقیمت اس وقت سمجھتا ہے جب وہ زمانہ حال کی ضروریات کو پورا کرنے میں معین ہوں۔ وہ لکھتا ہے" ماضی کے بعد جو زمانہ آتا ہے وہ حال نہیں اور نہ وہ جو ماضی کا پیدا کردہ ہو بلکہ حال زندگی کی طرح گذشتہ کو چھوڑ کر آگے بڑھنے کا نام ہے موجودہ متحرک ورقیت انگیز دنیا میں گذشتہ وماضی سے اسی حد تک مدد لی جا سکتی ہے جس حد تک ماضی سے ہماری تحریکاتِ جدیدہ کو ہدایت ورہبری ملے۔"

یہ ایک مقولہ ہے کہ غلطیاں اور لغزشیں نہ کرنا دانائی نہیں ہے بلکہ دانائی وحکمت یہ ہے کہ

ایک ہی غلطی بار بار نہ کی جائے۔ اور تجربہ ہمکو یہی حکمت و دانائی سکھاتا ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے
کہ تجربات کا سیلاب ہمارے اوپر سے گذر جاتا ہے اور ہم کو بالکل احساس نہیں ہوتا۔ کیا اس کی وجہ
یہ نہیں کہ ہم زندگی کو صرف سطحی نظر سے دیکھتے اور اس کی بناوٹی اور ظاہری خوبیوں سے محظوظ و متاثر
ہوتے ہیں لیکن ہم اس کی نزاکتوں اور لطافتوں سے بے حس اور اس کے مخفی اسباب و نتائج کے
تعلقات سے بے بہرہ و بے خبر رہتے ہیں۔ روزمرّہ کی ایک مثال سے یہ بات زیادہ واضح ہوجاتی ہے
ہر شخص کو ایسا موقع ضرور ہاتھ آیا ہوگا اور اس نے خوشی کا احساس بھی کیا ہوگا کہ جب نئے واقعات و
اہم مسائل سے دوچار ہونا پڑا تو آزمودہ تجربات نے اس کی پیچیدگی کے حل کرنے میں مدد کی۔ ہم یہ
بھی جانتے ہیں کہ جب ہم کسی الجھاؤ میں پھنس جاتے ہیں اور وہ گتھی سلجھتی نہیں تو افسوس یا غصہ کے
علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہوتا اور خیال کرتے ہیں کہ کاش وقت پر سوچتے تاکہ یہ دشواریاں آسان
ہوجاتیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور مشکلات کیوں سد راہ ہوئیں؟ ان سب کا جواب یہ ہے کہ ہم نے
گذشتہ مواقع کو ہاتھ سے جانے دیا اور تجربے سے نتائج اخذ کرنے سے قاصر رہے۔ یہی ناکامیاں
چشمۂ زندگی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اور مکمل زندگی کے منازل طے کرنے میں سد راہ ہوتی ہیں
ہم حقیقت میں مدارج ترقی کے ابتدائی زینوں پر ہیں۔ حالانکہ قدرت نے ہم میں اعلیٰ صفات و قوتیں
ودیعت کی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تجربہ نے ہماری مناسب و کماحقہ امداد نہیں کی اور نہ ہم نے
اس کی اعانت کی طلب و جستجو کی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور ہم تجربہ کی تشکیل اور تنظیم نو واقعی کریں تو ہماری زندگی
ترقی کی آخری منزل تک پہونچ سکتی ہے۔ یہی نشو و نما ہے۔ یہی ترقی کی راہ ہے۔ یہی صراط مستقیم ہے

تجربہ کی قدر و قیمت صرف وقتی نہیں ہے کیونکہ ہم تغیر پذیر عالم میں رہتے ہیں اور مستقبل کا خیال ہمیشہ
پیش نظر رہتا ہے۔ ڈیوی کی رائے میں تجربہ کو امروز و فردا کی شمولیت کا ماحصل و مآل کار ہونا چاہیئے
ہم واقعات رفتار و روش کو پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ کامیابی و ناکامی، حسن و قبح، امید و
بیم ہمارے لئے بہت پُر معنی اور اہم ہیں۔ ہم آئندہ تجربہ پر جس حد تک قابو حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کا
انحصار ہماری اس قوت پر ہے کہ واقعات فردا کے آثار کو واقعات حاضرہ کی روشنی میں دیکھیں اور

گذشتہ واقعات سے مستقبل کا اندازہ لگائیں۔ اور اس طرح سابق نتائج کی روشنی میں موجودہ دور میں تبدیلی پیدا کریں۔ لیکن بہر صورت حقیقتاً ہماری زندگی حال ہی میں بسر ہو سکتی ہے "ممکن ہے ایک زندہ ہستی کسی حد تک مجبور اور آزاد ہو لیکن دیکھنا یہ ہے کہ واقعات حاضرہ کا رد عمل کس طور پر واقعات فرد پر اثر انداز ہوتا ہے۔"

ذاتی تجربہ کو قابو حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا تجربی سائنس کی پیدا کردہ چیز ہے۔ سائنس کی جدید ترقی سے قبل تجربہ کا مفہوم صرف رسوم، روایات اور کورانہ تقلید تک محدود تھا لیکن اب ماضی کا تجربہ اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ ہمارے جدید و بہتر تجربہ کو ترقی کے مقاصد و اصول سے روشناس کرے۔ ہم کو صرف ماضی کا اعادہ نہ کرنا چاہیئے۔ اور نہ حوادث و سانحات کا انتظار کرنا چاہیئے کہ وہ مجبوراً ہم میں تغیر پیدا کریں۔ ہم گذشتہ تجربات سے اس لئے مدد لیتے ہیں کہ مستقبل کے تجربات بہتر عمدہ اور خوش اسلوبی کے ساتھ تعمیر کئے جا سکیں۔ تجربہ خود اس طریق عمل کا نام ہے۔ جو درستی و اصلاح کے تعین میں ہماری رہنمائی کرے۔

ڈنمارک کے ایک فلسفی کا قول ہے کہ ہم ماضی سے واقف ہوتے ہیں لیکن مستقبل ہمارا نصب العین ہوتا ہے۔ ڈیوی لکھتا ہے کہ ہمارا مستقبل اسی حالت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب واقعات گذشتہ ہمارے پیش نظر ہوں۔ اسی لئے وہ تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے "تعلیم تجربہ کی اس تعمیر نو یا تشکیل نو کا نام ہے جو تجربہ کے معانی و مفہوم میں اضافہ کرتا ہے اور آنے والے تجربات کی رہبری کرنے میں فہم و ادراک کو مزید ترقی دیتا ہے۔"

بے شک ہر فرد میں تجربہ سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیت بہت مختلف ہوتی ہے علم النفس کی جدید تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہر فرد میں نہ صرف تجربہ و استقرا کی اعلیٰ صفتوں اور قوتوں میں بیّن فرق ہوتا ہے بلکہ ابتدائی ارتسامات کے استفادہ اور ان کو محفوظ کرنے میں بھی بڑا اختلاف ہوتا ہے تجربات بھی اپنی علمی قدر و قیمت کے لحاظ سے مختلف النوع ہوتے ہیں۔ خاصکر اسکولی تجربات اگر ان کا بچے کی خارجی زندگی سے مقابلہ کیا جائے اسی لئے ان بچوں کی باتوں

میں تسلسل کی کمی اور بے ربطی پائی جاتی ہے جو بہت بڑی بربادی، بیکاری و تباہی کا باعث ہوتی ہے
ڈیوی اپنی تصنیف "مدرسہ اور معاشرۃ" میں لکھتا ہے بچہ کے نقطۂ نظر سے مدرسہ میں سب سے زیادہ تضیع علم کا باعث یہ ہے کہ وہ ان تجربات کا آزاد و صحیح استعمال مدرسہ کی چار دیواری کے اندر نہیں کرسکتا جو اس کو مدرسہ کے خارجی اثرات و ماحول سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ ان علوم کو بھی روزمرہ زندگی میں استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے جو وہ اسکول میں سیکھتا اور حاصل کرتا ہے۔ یعنی یوں سمجھئے کہ مدرسہ اور زندگی میں کوئی ربط نہیں اور دونوں کی دنیا الگ اور جدا جدا ہے۔ جب بچہ مدرسہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ ان خیالات، ذوق، دلچسپی اور مشاغل کو اپنے ساتھ لاتا ہے جو اس کے گھر، ماحول وغیرہ میں غالب و قوی تر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو مدرسہ روزمرہ کے تجربات سے استفادہ نہیں کرسکتا وہ دوسرے طریقہ کو استعمال کرتا ہے تاکہ بچوں میں اسکول درس کی دلچسپی پیدا ہو جائے۔

ڈیوی کے نظریہ کے مطابق مدرسہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ان تجربات کو مہیا اور فراہم کرے جو تعلیمی اقدار رکھتے ہیں تاکہ تمام طلبا اپنی استعداد و قوت کے مطابق علم سیکھ سکیں۔ وہ "ہمارا تعلیمی مسلک" کے دوسرے مضمون میں مدرسہ کو قومی یا جماعتی زندگی کے مشابہ خیال کرتا ہے جہاں سوسائٹی یا معاشرہ کو ترقی دے سکیں۔ مدرسے کو لازم ہے کہ وہ اپنی اندرونی زندگی کی تکمیل معاشرے کی زندگی کے نمونے پر کرے اور ایسے مواقع بہم پہونچائے جن سے فائدہ حاصل کر کے بچے اجتماعی مشاغل و مقاصد کو سمجھ لیں اور ایک حد تک اس میں حصہ لے سکیں۔ اگر مدرسہ بیرونی زندگی سے ربط و تعلق نہیں رکھے گا تو وہ معاشری زندگی کے لئے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ اور جو کچھ علم و ہنر لیاقت و استعداد بچے وہاں حاصل کریں گے۔ وہ اس کی چار دیواری تک محدود رہیں گی اور جب وہ اس چار دیواری سے باہر نکلیں گے تو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکیں گے۔

اس کی رائے میں مدرسہ ایک "مخصوص ماحول" کا نام ہے جو معاشرہ کا پیدا کردہ ہے۔

اور جہاں بچوں کے ذہنی اور اخلاقی رجحانات کی تشکیل ہوتی ہے اور جہاں ان کی جبلتیں انفرادی نشو ونما کے مطابق ڈھالی جاتی ہیں۔ اور جہاں ان کو اجتماعی مقاصد کے حاصل کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ ڈیوی نے اس ماحول کی تین خصوصیات بیان کی ہیں۔ مدرسہ کا ماحول ایسا ہو کہ جدید تہذیب وتمدن کے پیچیدہ مسائل وعناصر زیادہ سہل وآسان طور پر بچوں کے سامنے پیش کئے جائیں کیونکہ بچے بغیر تمثیل کے بآسانی سمجھ نہیں سکتے۔ مدرسہ کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ بچوں کے لئے ایک سادہ ماحول مہیا کرے اور زندگی کے ان عناصر کو منتخب کرے جو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کو نوعمر طلبا سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان میں ایک خاص ترتیب قائم کرے۔ ابتدا میں آسان چیزیں سکھائے۔ اور ان کی مدد سے آگے چل کر زیادہ مشکل وپیچیدہ امور کی تشریح کرتا ہے۔

دوسری خصوصیت اس ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تہذیب وتمدن کے وہی عناصر منتخب کئے جائے ہوں جو بچوں کی تربیت پر عمدہ اثر ڈال سکتے ہیں۔ اصلاح وترقی کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں ایسی چیزیں منتخب کی جائیں جو صریحاً مفید ہیں اور مستقبل اہمیت رکھتی ہیں اس طرح مدرسہ طلبہ کو ایک اعلیٰ تر معیار تمدن سے روشناس کر دیگا اور وہ بڑے ہو کر معاشرے کے مضر اداروں اور طریقوں کی تنقید اور اصلاح کر سکیں گے۔

تیسری خصوصیت مدرسہ کے ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تمدنی زندگی کے منتخب عناصر ایک خاص توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ مرتب کئے جائیں تاکہ تمدنی زندگی کے مختلف طبقوں اور جماعتوں کی کشاکش میں نوعمر بچے اور نوجوان جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو کسی خاص طبقے یا خیال کے ساتھ وابستہ کر کے قومی تمدن کے مجموعی نظام سے بے بہرہ نہ ہو جائیں لہٰذا اس مدرسے میں کسی فرقہ پرستی کی تنگ فضا کی جگہ وسیع قومی روایات کا وسیع تر ماحول بہم پہونچانا چاہیے اور اس کو اتنا وسیع وفراخ بنانا چاہئے کہ اس میں آفاقی انسانی تمدن کی روح پیدا ہو جائے۔ اس طرح افراد میں ہم آہنگی، وسیع النظری اور یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

معیاری نمونے کا مدرسہ محض مثالی گھر ہے۔ جو اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیا جاتا ہے تاکہ وہ تمام فرائض جو ادنیٰ معیار پر گھر میں انجام دیئے جاتے ہیں اور جن کی ضرورت جدید صنعتی و اقتصادی نظام کے اتفاقات میں برابر پڑتی رہتی ہے۔ باضابطہ و منظم طور پر انجام دی جا سکیں (اسکول و سوسائٹی، ۴۲،۴۵)

جب ہم ڈیوی کے اس نظریہ مدرسہ کا موازنہ اپنے مروجہ قومی اسکولوں کے نظری و عملی مشاغل سے کرتے ہیں تو ہم ان دونوں میں بہت کم اشتراک عمل اور اشتراک مقاصد پاتے ہیں مدرسے حالانکہ اس مقصد سے نہیں قائم کئے جاتے کہ ان میں مستقل سکونت اختیار کی جائے وہ صرف علمی درس و تدریس کے مرکز ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں کے فرائض علٰحدہ نہیں کئے جا سکتے بلکہ دونوں میں رشتہ اخوت و اتحاد ہوتا ہے ڈیوی لکھتا ہے کہ مدرسے عموماً اس لئے ہوتے ہیں کہ طلباء استاد کی سزا کے خوف سے چپ چاپ اور بے حس و حرکت بیٹھ کر اس کے سبق کو سنیں یا سوالات کا جواب دیں۔ جہاں بچوں کے ساتھ بجائے انفرادی حیثیت کے اجتماعی حیثیت سے برتاؤ کیا جاتا ہے اور جہاں بچوں میں جمود، انفعالیت، غیر اعتمادی، عدم طمانیت اور دوسروں پر مکمل اور غیر معقول انحصار کی عادت، فطرت کا جزو لاینفک بن جاتی ہے وہاں کے مدرسوں میں قومی زندگی، معاشری مواقع بالواسطہ ذہنی و اخلاقی اثر، خانگی زندگی، عمل کے نتائج سے تحصیل تجربہ وغیرہ کی امتیازی خصوصیات نہیں ہوتیں اس لئے اس معیار تک لانے کے لئے مدرسے کی نظری و عملی زندگی میں ازسر نو مکمل تنظیم کی ضرورت پڑے گی۔

عمرانی و اجتماعی تنظیم نو | ڈیوی کا خیال ہے کہ اگر معاشرہ کو ترقی پذیر ہونا ہے۔ تو تجربہ کی انفرادی تعمیر نو کے ساتھ ساتھ اجتماعی تنظیم ناگزیر ہے بچوں کی تعلیم معاشرہ کی مسلسل حیات کا ذریعہ ہے لیکن وہ معاشرے جو تعلیم کا واحد مصرف و استعمال اپنی حیات کی بقا، تعمیر عمرانی کا افادہ اور افزائش نسل کو تصور کرتے ہیں۔ وہ حالت جمود میں رہتے ہیں۔ ایک حرکی معاشرہ کا کچھ اور ہی فرض ہونا چاہئے اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایسی تعلیم دے کہ جو تغیر پذیر معاشرتی نظام میں آنے والے واقعات کی رہبری کرے تاکہ معاشرہ مستقبل موجودہ معاشرہ سے بہتر اور اعلیٰ ہو جائے۔

ڈیوی اپنی تصنیف "انسانی فطرت و روش" میں لکھتا ہے کہ حالات جدیدہ کا غیر دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مسلسل تدریجی، معاشی ترقی اور عمرانی اصلاح کا خاص ذریعہ بچوں کو تعلیم دینے کے مواقع کا استعمال کرنا ہے تاکہ مروجہ خیالات و خواہشات کو برتر و پاکیزہ کیا جاسکے۔ بچے اس زمانہ میں مقررہ رسوم و روایات سے پوری طرح متاثر نہیں ہوتے۔ ان کے غیر ارادی اور من موجی مشاغل زندگی، واضح، تغیر پذیر، آزمائشی شوقی اور استعجابی ہوتے ہیں۔ بالغوں کی عادتیں مقابلتہً زیادہ متین مستحکم و پختہ ہو جاتی ہیں۔ گردوپیش کے حالات و واقعات سے ان کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ البتہ وہ انتہائی کوشش و جد وجہد سے تغیر پیدا کرسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ واضح طور پر ضروری اور احتیاجی تبدیلی کا شعور و احساس کرنے سے قاصر ہوں یا ان کے نقصانات کے برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں لیکن وہ آئندہ نسل کے لئے بہتر مختلف زندگی کی تمنا کرتے اور خواہشمند ہوتے ہوں۔

لیکن نامعلوم مستقبل کے لیے تعلیم و تربیت دینا کیسے ممکن ہے؟ تعلیم اطفال لازماً بالغوں کے ذمہ ہوتی ہے جن کی عادات و قوت فکر یہ قریب قریب مستحکم و پائیدار ہو چکے ہوتے ہیں، عادات دائمی و استمرائی راہ کو اختیار کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم بدبختی کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور اخلاق و سیرت کی تخریب ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ درسی اداروں میں انقلاب پیدا کرنے اور ان مقاصد کی تکمیل کے وسائل حاصل کرنے کی کون سی راہیں ہیں؟ ڈیوی اس سوال کا جواب حسب ذیل الفاظ میں دیتا ہے

"تعلیم اطفال کو بار آور بنانے میں تاکہ معاشرہ کی ترمیم و اصلاح ہو، بالغوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی برتر و بہتر ریاست کا مدون و باضابطہ نصب العین پیش نظر رکھیں۔ اگر کسی تعلیمی مہم میں یہ روح جاری ہوگی تو وہ یقینی اپنی غیر متحرک اصلی حالت پر قائم رہے گی اور اس کا انجام تشدد میں ہوگا۔ ہمارے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان عادات و خصائل کی تشکیل و تعمیر کی جائے جو مروجہ خصائل سے زیادہ ذکی و زیرک، قوی الادراک، زود فہم، دوراندیشی میں ڈوبے ہوئے، ہست و بود سے زیادہ واقف کار، زیادہ خالص و غیر مبہم، زیادہ زود حس اور اثر پذیر ہوں۔ ایسی صورت میں وہ نئے اور دشوار امور سے دوچار ہوں گے اور ان کے حل و اصلاح کی خود ہی سوچ وبچار کریں گے۔ اس کے علاوہ تغیر پذیر معیار و اقدار کے باعث ملاج

کی مسلسل تعمیر کو کرنا انقلاب کی تخریب سے روکنے اور حصول استحکام کا واحد طریق عمل ہے۔ انتہائی جمود و غیر معقول سکون باغی و سرکش پیدا کرتا ہے۔ زندگی کی بقا تجدید و تعمیر پر قائم ہے۔ اگر حالات مسلسل تنظیم و تشکیل کے لئے نا مساعد ہیں تو اس کا اچانک وقوع پذیر ہونا کسی نہ کسی وقت لازمی ہے۔ انقلابات کے رونما ہونے کے ذمہ دار وہ لوگ ٹھہرائے جائیں گے جو ہم آہنگی اور تطبیق کے بجائے رسوم کی بقا کو اپنا مطمح نظر رکھتے ہیں۔

حیات امروزہ کی اہمیت | بقول ڈیوی تعلیم اور جدید تمدنی زندگی کا باہمی ربط و تعلق بے حد ضروری ہے وہ روسو کو تعلیم جدید کا پہلا اور سب سے بڑا پیمبر بتلاتا ہے۔ اس کے نزدیک روسو کی حقیقی عظمت اور حکمت و دانائی کا راز یہی ہے کہ اس نے تعلیم کے بنیادی اصول کو پورے طور پر سمجھ لیا کہ خواہ تعلیم کا مقصد عالی کچھ ہو اس کا نقطۂ آغاز بچے کی شخصیت و ذات ہے جس کی جبلتوں اور کمزوریوں اور مخصوص رجحانات کا احترام اور ان کی ہدایت معلم و استاد کا اولین فرض ہے۔ تعلیم کا مقصد اولیٰ صرف یہ ہے کہ بچوں کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کیا جائے لیکن اس کے یہ بھی معنی نہیں کہ ہم بچوں کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے کچھ نہ دیکھنے دیں۔ اور ان کو ان فرائض و ذمہ داریوں کے لئے تیار نہ کریں جن سے انکو مستقبل میں دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن اس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دینا بعید از عقل ہے جو عملی نتائج ہوئے وہ زیادہ مضر اور غیر مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ معلم بجائے اس کے کہ بچوں کی موجودہ ضرورتوں۔ قوتوں اور دلچسپیوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے انھوں نے مستقبل کی توقعات اور ضروریات کو اپنا نصب العین ٹھہرایا اور تعلیم کے مرکز ثقل کو بالکل بدل دیا۔ اس میں شک نہیں کہ منزل مقصود تو بلوغ کی زندگی ہے لیکن اس منزل تک پہونچنے کے لئے جس قدر درمیانی منزلیں راستے میں پڑتی ہیں وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ اتنی ہی اہم اور قابل توجہ ہیں جتنی وہ آخری منزل اور جب تک ہم بچے کے تعلیمی سفر یعنی اس کی نشو و نما کے ہر ہر قدم کو اس کے لئے معنی خیز اور دلچسپ نہ بنائیں ہم اس کی تربیت کو مکمل نہیں کر سکتے۔ اس کے تجربات میں وسعت اور گہرائی پیدا نہیں کر سکتے۔ معلم کے لئے غالباً سب سے زیادہ ضروری اس حقیقت کا پہچاننا ہے کہ ہر نو عمر بچہ ایک مخصوص شخصیت

کا مالک ہے۔ انواع و اقسام کے جواہر و بیش بہا قوتیں اور صفتیں اس میں پنہاں ہیں۔ وہ مخصوص شوق و رجحانات کا مالک ہے جس کا دریافت کرنا اس کا فرض ہے اور جن کی تربیت اور ترقی کے لئے مناسب ماحول اور وسائل فراہم کرنا اس کا خاص کام ہے۔

ڈیوی ان خیالات کی تائید میں روسو کی تصنیف ایمیل کا اقتباس اپنی کتاب "اسکول آف ٹومارو" میں نقل کرتا ہے "ایک انسان کو وہ تمام باتیں جاننا ضروری ہیں جو بچے کے خیال میں غیر مفید اور فضول ہیں کیا بچے کو کچھ سیکھنا لازمی ہے؟ کیا وہ تمام چیزیں سیکھ سکتا ہے جو ایک انسان اور بالغ آدمی کو جاننا چاہیئے؛ ہمارا فرض ہے کہ ہم بچوں کو ایسی چیزیں پڑھانے اور سکھانے کی کوشش کریں جو اس کے لئے بحیثیت بچے کے مفید ہیں اور اگر ایسا کیا جائے تو بچے پورے انہماک سے سارا وقت صرف کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اس کو اس عمر کے لئے تعلیم و تربیت دیں جس عمر تک شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکے؟ اور اس تعلیم و تربیت کو پس پشت ڈال دیں جو اس کی موجودہ ضروریات کے پورا کرنے میں مدد و معاون ہو لیکن یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اس کی تحصیل بے محل اور بے وقت ہو گی جبکہ اس کو ضروریات استعمال کا وقت آن پڑے۔ روسو لکھتا ہے کہ میں اس کے جواب دینے سے قاصر ہوں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کا قبل از وقت سکھانا ناممکن ہے کیونکہ ہمارا اصلی معلم تجربہ اور شعور ہے اور ایک بالغ آدمی اپنی ضروریات و حوائج کو بھی کبھی نہیں سیکھ سکتا جب تک کہ اس کو ان حالات سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ہر بچہ یہ بات خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ آئندہ چل کر بالغ و نوجوان ہو گا اس لئے اس کو انسان کے حالات سے روشناس کرنے سے شاید ہدایت کا موقع مل جائے لیکن اس کے لئے وہ تمام باتیں لاعلمی کی حالت میں رہنی چاہئیں جو اس کی عقل و سمجھ سے باہر اور بالاتر ہوں۔ میری پوری تصنیف تعلیم کے اسی بنیادی اصول پر مبنی ہے"۔

بچہ طفلانہ زندگی بسر کرتا ہے اور زندگی کی ہر منزل کی طرح وہ اپنی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جو بالغانہ زندگی کا پیش خیمہ ہونے سے بالکل جدا اور مختلف ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ نشو و نما کی حالت و فطرت اپنی سی ہے۔ اس لئے ہر منزل کی کامیابی کا انحصار اس کی گذشتہ منزل پر ہوتا ہے۔

ہم ادنی، مردہ و خالی الذہن عہد طفولیت پر مکمل و خوشگوار شباب کی زندگی کو استوار نہیں کر سکتے جین پال رچر کا خیال ہے کہ اگر شباب عہد زریں نہیں ہے تو یہ بری میل اور فضلہ ہے۔ عہد شباب اسی وقت خوشگوار و دلچسپ ہو سکتا ہے جب عہد طفولیت ہمارے لئے سرسبز و خوشگوار رہا ہو عہد بلوغ تمام تو توں کی تدریج ترقی کا نتیجہ ہے اور عہد شباب کی مکمل نشو و نما کے بغیر ناممکن ہے۔

ڈیوی کے نزدیک تعلیم کا کوئی خارجی مقصد یا کوئی علیٰحدہ منزل مقصود نہیں وہ خود ہی راہ ہے اور خود ہی منزل بالفاظ دیگر اس کا مقصد یہی ہونا چاہئے کہ اس کے ذریعہ سے انسان میں علمی، اخلاقی معاشرتی نشو و نما کی قوت زیادہ ہوتی جائے اور اس کی مجموعی شخصیت کی ارتقا برابر جاری رہے ایک واقعی تعلیم یافتہ و جاہل آدمی میں اصلی فرق یہی ہے کہ پہلے میں سیکھتے رہنے کی غیر محدود صلاحیت ہے اور دوسرے میں یہ صلاحیت نہیں پہلے کی تعلیم ہمیشہ جاری رہتی ہے کبھی ختم نہیں ہوتی۔ دوسرے کی اگر کبھی شروع بھی ہوئی تھی تو اب بند ہے........حیات بخش صرف وہی علم ہو سکتا ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے ہمیشہ متحرک رہے۔ جب علم میں یا تعلیم میں جمود پیدا ہو جائے تو اصل میں انسان کی زندگی کی مدت ختم ہو جاتی ہے۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر تعلیم کا منتہائے مقصود یہ ہو کہ بچوں کی تمام موجودہ فطرتی قوتیں، رجحانات جبلتیں، شوق اور دلچسپیوں کو بیدار کیا جائے۔ اور ان کی باقاعدہ تنظیم و تشکیل کی جائے۔ تو یقیناً طلبا کی زندگی بدرجہا افضل و بہتر ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مستقبل کے لئے مکمل طور پر تیار و مسلح ہو جائیں گے لیکن دماغی و اخلاقی ارتقائی برتری اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب طلبا خود بالارادہ اور اختیاری طور پر عملی قدم اٹھائیں۔ پروفیسر ڈیوی لکھتا ہے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو مستقبل کے لئے تیار کیا جائے یا نہیں اگر تعلیم کے معنی نشو و نما کے ہیں تو لازم ہے کہ وہ موجودہ امکانات کو بتدریج قوت سے فعل میں لائے۔ اور اس طرح افراد میں آئندہ کے فرائض پورا کرنے کی اہلیت پیدا کرے نشو و نما کوئی ایسی چیز نہیں جو یوں ہی کبھی کبھی واقع ہو جایا کرے۔ وہ تو برابر رفتہ رفتہ موجودہ

کیفیت سے مستقبل کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ اگر مدرسہ کا ماحول اور خارجی حالات ایسے ہیں جن میں بچوں کی موجودہ صلاحیتوں کو مناسب طریقہ پر کام میں لایا جا سکتا ہے تو مستقبل جو حال ہی میں سے پیدا ہوتا ہے۔ خود بخود بہتر اور حسب خاطر خواہ صورت اختیار کرے گا۔ غلطی یہ نہیں کہ بچوں کو مستقبل کیلئے تیار کرنے پر زور دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس مقصد کو موجودہ کوشش اور جد وجہد کا مرکز و مدار قرار دیا جائے۔ چونکہ واقعتاً یہ بات بہت اہم ہے کہ نوعمر طلبہ کو اس زمانے کی زندگی کے لئے جو دم بدم ترقی کرتی رہتی ہے تیار کیا جائے۔ اس لئے لازم ہے کہ ان کے موجودہ تجربات کو معنی خیز و گوناگوں بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اس طرح غیر محسوس طریقہ پر حال مستقبل کی فکر خود بخود کر لیگا

اس نظریہ کی رو سے تعلیم کے مطمح نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے ہم لوگ ابھی تک اسی خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ بالغوں کے معاشرہ کے معیار کے مطابق بچوں کی نشوونما و تربیت ہونی چاہیئے علم ذوق وشوق، عادات واخلاق میں بچے بالغوں کے معیار پر پرکھے و جانچے جاتے ہیں اور ہر شخص کی نظر میں اچھے بچوں کا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں اور بڑوں کو بہت کم پریشان و دق کرتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بچے اپنی طفلانہ زندگی میں بزرگوں سے بالکل مختلف ذوق وشوق، مشاغل اور اخلاقی معیار رکھتے ہیں اور یہی بچوں کے ذوق وشوق اور مشاغل ہر حصول علم کے لئے اور ان نتائج و مسائل کے لئے جو اس سے وابستہ ہیں بہت ضروری اور اہم ہیں بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیئے کہ بچے اس کے حاصل کرنے میں اپنے گزشتہ تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں اور موجودہ زندگی کے تجربات میں اضافہ کر سکیں تاکہ وہ مستقبل کے حوادث سے دوچار ہونے میں خضر راہ کا کام دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم کو از سر نو مدون کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

تدوین نصاب | اگر ہم واقعی چاہتے ہیں کہ بچوں کو ایسے تجربات بہم پہونچائے جائیں جو سبق آموز ہوں جو بچوں کے سوالات کا تشفی بخش جواب دے سکیں یعنی بچوں کی حاجت تجسس رفع کرنے میں معین ہوں تاکہ بچے کھیل کود کی طرح اس کو اختیاری طور پر سیکھ لیں تحصیل درس ہی ہمارا نصب العین نہ ہونا چاہیئے حصول علم

کے معنی حفظ کرنے کے نہیں بلکہ اس کا مقصد اعلیٰ زندگی کو اور زیادہ دلچسپ و کامیاب بنانا ہے۔ اس
عملی پہلو کے بغیر ہمارے تجربات کی تعمیر نو میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ روسو نے اسی چیز پر زور دیا تھا اور
اس کی آرزو تھی کہ قدیم طرز تعلیم جس میں پرانے آیات و نشانات علوم کو طوطے کی طرح رٹا دیا جاتا تھا مسترد
کر دی جائے اور اس کی جگہ تحصیل تجربات کو خاص اہمیت دی جائے بقول ڈیوی تعلیم و تدریس کے
سلسلہ میں معلم کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسا ماحول پیدا و مہیا کرے جو طلبا اور متعلم کے احساسات و رجحانات
کو بیدار کرنے کے علاوہ اس کی حیات میں معین ہو۔ دوسری بہت اہم بات عمرانی ماحول کا پیدا کرنا ہے
جو بچوں کے عادات و خصائل کی اصلاح ان کے اجتماعی احساس اور ان کی ذہنی و عقلی قوتوں کی نشو و نما کر سکے
مدرسے میں ایسے مشاغل ہونے چاہئیں جو عقلی تربیت اور سائنس کے معلومات حاصل کرنے میں آسانیاں
بہم پہونچائیں علمی تحقیقات، اختراع و ایجاد کے لئے بیشتر حصہ تجربہ و مشاہدہ سے حاصل کیا جاتا ہے لیکن
ہمارے ملک ہندوستان میں مروجہ و مقررہ نصاب تعلیم میں ایسے مواقع بہت مشکل سے پائے جاتے ہیں
ڈیوی نے نہایت خوش اسلوبی سے اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے

انسان کے جتنے مشترک اور اہم ترین مشاغل ہیں ان کا تعلق خوراک مکان، لباس اور مکان کے
ضروری سامان سے اشیاء کے بنانے، ان کا مبادلہ کرنے اور ان کو صرف کرنے کے ذرائع و وسائل
سے ہے چونکہ یہ تمام چیزیں انسانی زندگی کی ضرورت اور آسائش سے متعلق ہیں اسی لئے وہ انسانی جبلتوں
کی گہرائی تک پہونچتی ہیں اور ان میں جو معلومات اور اصول پنہاں ہیں وہ تمدنی لحاظ سے بہت اہمیت
اور قدر رکھتے ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ باغبانی، پارچہ بافی، لکڑی اور دھات کا کام، کھانا پکانا اور اسی
قسم کے مختلف مشاغل جو انسانی کاروبار میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں اور مدارس جدید میں داخل کئے
گئے ہیں محض روزی کمانے کا ذریعہ ہیں تو ہم ان کی واقعی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہیں گے، تا کہ عام
طور پر لوگوں کو صنعت و حرفت کے تمام کاروبار ایک ناگزیر مصیبت معلوم ہوتے ہیں جس کو محض حصول معاش
کی خاطر گوارا کرتے ہیں لیکن یہ قصور ان کاموں کا نہیں بلکہ ان حالات کا ہے جس میں یہ کام کئے جاتے
ہیں۔ دور حاضرہ کی زندگی میں اقتصادی معاملات کی اہمیت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے اس لئے

تعلیم کا فرض ہے کہ وہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ تمدنی بہبود کا انحصار ان معاملات پر ہے اور ان کا سائنس پر۔ مدرسوں میں یہ مشاغل کسی مالی منافع کی خاطر جاری نہیں کئے جاتے بلکہ اپنی داخلی قدر و قیمت کی بنا پر جب یہ تمام خارجی اثرات اور روپیہ کمانے کی خواہش سے آزاد ہو جاتے ہیں تو ان کے ذریعہ سے ایسے تجربات حاصل ہوتے ہیں جو بجائے خود مفید ہیں۔ اس وقت وہ واقعتاً دماغ کی آزاد تربیت کا باعث ہوتے ہیں۔

اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈیوی نے بہ حیثیت ناظم شکاگو ابتدائی اسکول اور مدرسین کی مدد و مشورہ سے ان مشاغل کا انتخاب کیا جو بچوں کے لئے بے حد مفید ہو سکتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے اپنے نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نصاب تعلیم کو حسب ذیل سوالات کے پیش نظر مرتب کیا۔

اول۔ کیا یہ ممکن ہے اور کیونکر کہ مدرسے کو بجائے تعلیمی و تدریسی مرکز بنانے کے جہاں صرف چند مضامین کی ترتیب ہو اس میں گھر اور گرد و پیش کی زندگی سے تعلق اور عملی ارتباط پیدا کیا جائے اور کون سی تدابیر اختیار کی جائیں کہ مدرسے اور روزمرہ کی زندگی میں جو وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے یک قلم مفقود ہو جائے؟

دوم۔ کون سی صورت اختیار کی جائے کہ تاریخ، سائنس، آرٹ اور دیگر فنون لطیفہ اصلی زندگی میں قطعی اور حقیقی فائدہ پہونچائیں اور چھوٹے سے بچے کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ اس کا حاصل کرنا عمدہ اور قابل قدر ہے؟

سوم ظاہری شعبوں کی تعلیم (مثلاً لکھنا۔ پڑھنا۔ ہندسوں کا استعمال) میں اور حال کی زندگی میں کس طور پر باہم ارتباط پیدا کیا جا سکتا ہے تاکہ بچے ان مضامین میں غیر معمولی شوق و دلچسپی حاصل کریں اور ان کو واقعتاً اس بات کا خیال ہو کہ وہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہیں؟

چہارم۔ بچوں کی طرف انفرادی توجہ کس طرح مبذول کی جا سکتی ہے؟

ڈیوی نے ان تمام مسائل پر ہر پہلو سے خوب غور و خوض کرنے کے بعد تدوین نصاب میں حسب ذیل مشاغل کو شامل کیا جو بچوں کی مکمل تعلیم کے لئے بہتر و مفید ہیں۔

مدرسوں میں طلبا، کاغذ، گتا، لکڑی، چمڑے، کپڑے، سوت، مٹی، ریت اور دھاتوں کا کام کرتے ہیں۔ کبھی اوزاروں کی مدد سے اور کبھی ان کے بغیر اس قسم کے کاموں کو کرتے وقت انھیں بہت چیزیں سیکھنی اور کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً کاغذ کاٹنا، تہ کرنا، سوراخ کرنا، ناپنا، ڈھالنا، ماڈل بنانا، نمونے کاٹنا، گرم کرنا، ہتوڑے، آری و ریتی سے کام کرنا یہ سب کام مشق کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مختلف دلچسپ مشاغل کے سلسلہ میں کرنے پڑتے ہیں مثلاً علاوہ طرح طرح کے کھیلوں کے تفریحی سفر کے لئے جانا، باغبانی، کھانا پکانا، سینا، چھپائی، جلد سازی، کپڑا بننا، رنگ بھرنا، تصویر کشی، ڈراما کرنا، کہانیاں کہنا اور لکھنا پڑھنا نہ صرف اس مقصد سے کہ ایک خاص فن سیکھنا ہے جو مستقبل میں فائدہ پہونچائے گا بلکہ اس خیال سے کہ یہ عملی مشاغل موجودہ اغراض و مقاصد کی تکمیل میں معین ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب طلبا میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ لکھنے پڑھنے سے وہ اپنے مشاغل کو کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں تو وہ ان کو اور زیادہ سرگرمی، شوق وانہماک سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مدرسے کے مشاغل میں خاص طور پر جس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ مضامین نصاب کا ربط ہے یعنی تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ ہر مضمون اپنی جگہ پر مکمل اور مستقل ہو بلکہ تاریخ وجغرافیہ، ریاضی وادب سائنس وفلسفہ، علم نباتات، علم حیوانات، علم زراعت وغیرہ کے درمیان باہمی تعلق و ربط ہو اور اس کے ساتھ ہی طلبا کی زندگی و تجربات سے بھی تاکہ بچے اپنے گردوپیش کے مشاغل، تعلقات اور کاروبار کو اچھی طرح سمجھیں اور جب زندگی کے پیچیدہ اور مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑے تو ان کے حل کرنے میں زیادہ دشواری و پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

ڈیوی کا مدرسہ تھوڑے ہی عرصہ تک قائم رہا لیکن اس نے تعلیمی دنیا میں ایسا بیش بہا اضافہ کیا کہ اس کا اثر چاردانگ عالم میں بہت گہرا اور مستقل ہوا۔ اس عملی مدرسہ نے وہ کامیابی حاصل کی کہ ڈیوی نے تمام دنیا سے مسلّم الثبوت استاد اور معلم ہونے کا لوہا منوا لیا۔ اس معلم ومفکر نے اپنی تصنیف "مستقبل کے مدرسے" میں ان تمام مدرسوں کا مفصل تذکرہ کیا ہے جو انھیں

اصولوں پر قائم کئے گئے ہیں ان کی تعداد ہر سال بڑھتی جاتی ہے اور ہر مدرسہ اپنی انفرادی کاوش و تجربہ سے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ ان مدرسوں میں جو انہیں اصول پر کامیابی کے ساتھ کام کر رہے ہیں مسز جانسن کا اسکول واقع فیرہوپ۔ پروفیسر جے ایل میریم کا میسوری ابتدائی اسکول گیری (انڈیانا) کا پبلک اسکول وغیرہ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر ایلسورتھ کولنگس چودہ پندرہ سال سے میسوری کے دیہاتی مدرسہ میں ان اصولوں پر عملی تجربہ کر رہے ہیں اور تجربات و مشاہدات عملی مشاغل اور سائنٹیفک نتائج کو ہم آہنگ کر رہے ہیں۔ انھوں نے بچوں کی ضروریات و مقاصد زندگی کو پیش نظر رکھ کر کام شروع کیا تھا۔ روزمرہ کے کام کی کامیابی و ناکامی کو دیکھ کر نصاب مرتب کیا اور بچوں ہی کی رائے کے مطابق تعلیم دیتے رہے۔ انھوں نے مقررہ مضامین کو بالکل اہمیت نہیں دی لیکن اگر ضروری سمجھا تو ان کو داخل بھی کر لیا۔ انھوں نے زندگی اور اسکول کے درمیان رشتۂ اتحاد و موانست کو قائم کیا روزمرہ کا دستور العمل (۱) قصہ گوئی۔ (۲) تعمیری کام (۳) کھیل کود۔ (۴) تفریحی سفر پر مشتمل تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بچے اپنے مشاغل کا احسن انتخاب کر سکیں اور ان کو نہایت خوبی و کامیابی کے ساتھ انجام دیں اور اس طور پر ان میں خلقی اُنس، روحانی محبت، اخوت، مساوات، دیانتداری حسن اخلاق وفاداری، نیک دلی، رحم، قومی روح، سماجی روح اور عملی زندگی پیدا کر دیں۔ پروفیسر کلپیٹرک مشہور و معروف پروفیسر ٹریننگ کالج نے اس مدرسہ کی کامیابی پر بہت عمدہ رائے کا اظہار کیا ہے

ہندوستان میں مسٹر ہیگی نے موگا اسکول کی بنا اسی منصوبی طریقے پر ڈالی ہے اور وہ کامیابی کے ساتھ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ وہاں بچوں کی مکمل اور عملی تربیت کے لئے ایسا ماحول پیدا اور فراہم کیا گیا ہے جس سے بچے نصاب تعلیم اور زندگی کے مشاہدات و تجارب میں ربط قائم کر سکیں موجودہ واردھا اسکیم بھی اسی اعلیٰ مقصد کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے اور منصوبی طریقے کو رواج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اسی نظریہ سے کسی حد تک تجاوز کر کے اور ہندوستانی ماحول کو پیش نظر رکھ کر شاعر اعظم

رابندر ناتھ ٹیگور نے شانتی نکتیبان اور شری نکتیبان کو قائم کیا۔ انھوں نے علمی ارتباط اور ذہنی تعاون کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ جہاں بچوں کی شخصیت کا احترام کیا جاتا ہے کیونکہ ان ہی کی فطرت خوابیدہ میں وہ جوہر پنہاں ہیں جن کو بیدار کرنے سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتے ہیں۔ بقول ٹیگور ,, ہر طفل نوزائیدہ دنیا میں پیغام لے کر آتا ہے کہ خدا انسان سے مایوس نہیں ہوا۔

دوسرا مدرسہ جامعہ ملیہ ہے جہاں بچوں کو اسکولی زندگی اور عملی زندگی کے تعلق سے روشناس کیا جاتا ہے۔ اور پروفیسر ہاورتھ کے اس قول پر عمل ہوتا ہے کہ مدرسہ کو بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہونا چاہیے۔ جس میں وہ تمام عمدہ اثرات اور مشاغل مہیا کئے جائیں جو تمدنی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔

(ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی)

ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کیا ہے؟

اس وقت جبکہ "مہذب و متمدن" اقوامِ عالم، نہایت بیدردی و سفاکی کے ساتھ ایک دوسرے کا خون بہانے اور اپنے ہاتھوں اپنی تہذیب و تمدن کے آثار مٹانے پر تلی ہوئی ہیں، مسلمانانِ ہند کے سامنے علمی حیثیت سے یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ ان کے تمدن و تہذیب کا کوئی مستقل وجود ہے یا نہیں؛ اگر ہے تو اس کے صحیح و متعین حدود کیا ہیں اور اس کی حفاظت و اشاعت کے طریقے کیا کیا ہو سکتے ہیں؛

مسئلہ زیرِ بحث پر رائے زنی کرنے والے حضرات تین قسموں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔ (۱) ایک وہ گروہ جس کے نزدیک، اسلامی تہذیب، ایک مکمل و جامع تہذیب ہے اور بغیر اس کو اختیار کئے مسلمان نہ تو روحانی ترقی کر سکتے ہیں اور نہ مادی (۲) دوسرا گروہ وہ ہے جو سرے سے اسلامی تہذیب کے وجود ہی کا قائل نہیں، اور اس کے نزدیک مذہب اور فرقہ کی بنا پر تہذیب کی تقسیم ہی غلط ہے (۳) تیسرا گروہ بین بین ہے۔ یہ گروہ اسلامی تہذیب اور اس کی شاندار ماضی کا قائل ہے لیکن ساتھ ہی موجودہ زمانہ کی پرآشوب فضا کے پیشِ نظر اپنی قوم کو "مصلحت اندیشی" کا مشورہ نیک نیتی کے ساتھ دینا چاہتا ہے۔

اس گروہ میں اچھی خاصی تعداد ان حضرات کی ہے جو عام ہنگامہ آرائیوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے کو علمی اور تعلیمی خدمات کے لئے وقف کر چکے ہیں اور ہر مسئلہ پر جذبات کی رو میں نہیں بلکہ دلائل کی روشنی میں غور کرنا چاہتے ہیں۔

مضمون ذیل میں پہلے گروہ یعنی اسلامی تہذیب کو مکمل اور جامع ماننے والوں کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کی جائے گی اور خصوصیت کیساتھ اس تیسرے گروہ سے جو مصلحت اندیشی کا قائل اور اپنے نزدیک روشِ اعتدال پر گامزن ہے گفتگو کی جائے گی۔ جون ۱۹۴۰ء کے جامعہ میں اس گروہ کے جذبات کی ترجمانی ایک فاضل پروفیسر کے قلم سے سنجیدگی و متانت کے ساتھ ہو چکی ہے۔

سب سے پہلے ہمیں اسلامی تہذیب کے مستقل وجود کو ثابت کرنا ہے۔ یہ دعویٰ کہ مسلمانوں کو

کبھی نرالے یا انوکھے بننے کا شوق نہ ہوا۔ اور ہماری تاریخ میں کوئی ایسا دور نہ ملے گا جب مسلمانوں کی زندگی میں ایسی عجیب یا غیر معمولی خصوصیتیں تھیں کہ جن پر فوراً نظر پڑتی اور آسانی سے بیان کردی جاتیں" تاریخ اسلام کی بدیہیات کے منافی ہے۔ عرب جاہلیت میں جو رسوم و رواج پھیلے تھے۔ اسلام نے ان سب کو کالعدم کیا۔ شراب و قمار، سود و بدکاری کے رائج الوقت طریقے جو اس زمانہ کی تہذیب کے عناصر تھے، ایک ایک کر کے حرام و ممنوع قرار دئے گئے۔ اسلام قبول کرنے والوں پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ کسی حال میں وہ ایک وقت میں چار عورتوں سے زیادہ اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتے۔ جھوٹ، مکر و فریب، مروجہ شاعری (جو ہر قسم کے لغو و سفلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ تھی) کو سخت ترین الفاظ میں مذموم اور قابل ترک ٹھہرایا گیا پھر نوبت یہاں تک پہونچی کہ عرب کی سرزمین کو مقدس اور محض مسلمانوں کے لئے مخصوص قرار دیا گیا اور جملہ دیگر تہذیبوں کا وہاں سے خاتمہ کر دیا گیا۔ اس اصول پر ان اماکن مقدسہ میں غیر مسلم کا قدم رکھنا جرم قرار دیا گیا۔ خلافت راشدہ میں اسلامی فتوحات جہاں جہاں ہوتیں مسلمانوں کی انفرادی حیثیت سر جا نمایاں رہی اور ہر جگہ وہ "نرالے اور انوکھے" سمجھے گئے۔ خلفاء خصوصاً حضرت عمرؓ عساکر اسلامیہ کے جنرلوں اور سپاہیوں سب کو اس امر کی مؤکد ہدایتیں دیتے رہے کہ اپنی وضع قطع و طرز معاشرت میں اپنے مفتوحوں سے جدا رہنا عجمیوں یا رومیوں کی تن پروری اور عیش میں نہ پڑنا۔ اس زمانہ میں روم و ایران کے تمدن عروج پر تھے۔ لیکن اس زمانے کے مجاہد مسلمانوں نے ان کو حقارت کے ساتھ ٹھکرایا اور ان کی جگہ اسلامی تمدن و تہذیب کی اشاعت کی کہ بغیر اس کے تبلیغ اسلام ناقص اور ادھوری رہتی۔ خلفاء عباسیہ کے دور میں جبکہ دربار میں بہت کچھ عجمیت داخل ہو چکی تھی، عباسی شہزادے، بچپن میں عموماً عرب بھیجدئے جاتے تھے تاکہ سرچشمہ اسلام عرب کے تمدن سے وہ بے گانہ نہ ہونے پائیں۔ ترکوں نے اسلام قبول کیا تو اپنے ملک کے رسم و رواج کو تقریباً فراموش کر کے تمام تر اسلامی تہذیب و تمدن اختیار کر لیا۔ حتیٰ کہ خلافت کا بار بھی اپنے کاندھوں پر لیا جس کا سلسلہ ۱۹۲۴ء تک جاری رہا۔ یہ خلافت کیا تھی؟ بڑی حد تک اسلامی تہذیب و تمدن کی یادگار اور اس کے لئے بمنزلہ سرچشمہ کے۔

ہندوستان کی تاریخ میں بھی مسلمانوں کی تہذیب کے آثار ان کے ہر دورِ حکومت میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اکبر کے سروسیع المشرب کے دعویدار کے دربار میں بھی تمدن اسلامی کی جھلک نظر آتی رہی علما و فضلا اپنے مخصوص لباس میں جو کسی طرح بھی اس زمانہ کے ہندی تمدن سے متاثر نہ تھا اس کے دربار میں بیٹھتے تھے۔ بلکہ بہت سے ہندو درباریوں نے بھی اسلامی تمدن بہت کچھ اختیار کر لیا تھا۔ چھوت چھات کی بندشیں جو اس زمانہ کی ہندو تہذیب کا ستون تھیں، مسلمانوں کی تہذیب میں ایک لمحہ کے لئے بھی جگہ نہ پا سکیں ستی اور اس قسم کی دوسری وحشیانہ رسوم پر پابندیاں مسلمانوں ہی نے عائد کیں۔ ہندوستان کا لباس مسلمانوں کی آمد سے قبل تقریباً نیم برہنگی کا تھا مسلمانوں کی آمد نے لباس کو پوری طرح لباسِ ساتر بنایا، اور یہاں کی مختلف بولیوں کو اکٹھا کر کے ایک نئی زبان کی تشکیل کی جس پر غلبہ اسلامی تہذیب ہی کا تھا۔ ہندوؤں کے متعدد گروہ خصوصاً کالیستھ اس سے اب تک بہت کچھ متاثر ہوئے۔ ان کی بول چال لباس بعض جگہ کھانا بھی مسلمانوں کا سا ہے۔ اگر مسلمانوں کی تہذیب کا کوئی مستقل وجود نہ ہوتا یا اس میں دوسروں کو جذب کرنے کی خاصیتیں نہ ہوتیں تو ہرگز ہندوستان میں مسلمان ایک طاقتور اقلیت بلکہ بعض بعض صوبوں میں اکثریت کی حیثیت حاصل نہ کر سکتے۔

مسلمانوں کی یہ تہذیب عالمگیر اور بین الاقوامی حیثیت کی مالک رہی ہے یہ ضرور ہے کہ ہر ملک کی آب وہوا، اور ماحول کے اثرات کی وجہ سے مختلف ممالک میں تھوڑی تبدیلیاں آپ کو ملیں گی لیکن ایسے ضروری اجزا جن سے ایک مسلمان فوراً ممتاز ہو جاتا ہے، مسلمانوں میں ہر جگہ آپ کو ملیں گے۔ سلام کا مروجہ طریقہ ہر اسلامی ملک میں ایک ہے۔ مسلمان خواہ کہیں بستا ہو۔ لازمی طور پر مختون ہوگا۔ اٹھتے بیٹھتے، اس کے اعمال و اقوال اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے بہت کچھ جدا ہوں گے۔ دائیں ہاتھ سے کھانا کھانا۔ طہارت کی پابندی۔ بات بات پر خدا کا شکر ادا کرنا، مصیبت پر تلقین صبر کرنا، شراب اور قمار وغیرہ سے بہ نسبت دوسری اقوام کے زیادہ محترز رہنا۔ مکہ معظمہ کو اپنا مرکز سمجھنا۔ شرک سے بچنا، بچہ کی پیدائش کے وقت اس کے کان میں بانگ اذان پہونچانا۔ مرنے کے

بعد تجہیز و تدفین کے مخصوص اعمال، وغیرہ اسی قسم کے صدہا امور ہیں جو دنیا کے ہر گوشہ کے مسلمانوں میں کم و بیش ملیں گے، اور ان میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جو مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسری قوم میں نہیں ملتیں۔

مسلمانوں کی اس تہذیب کی عالمگیریت اور بین الاقوامیت قائم رکھنے کے لئے اس تہذیب کا منفرد و ممتاز ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تبلیغ و اشاعت بھی جاری رکھی جائے۔ دنیا میں نئی نئی تہذیبیں پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ ابھی کل تک ہندوستان میں انگریزوں کی تقلید منتہائے فیشن سمجھی جاتی تھی ہر جا کوٹ پتلون والے کی عزت کی جاتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ پلٹ چلا، اب گاندھی ٹوپی اور کھدر کے لباس کو بہت کچھ اعزاز حاصل ہو گیا ہے۔ آئین جہاں یونہی بدلتا رہتا ہے۔ اسلامی تہذیب میں لچک بھی ہے اور سختی بھی تعصب بھی ہے اور رواداری بھی۔ وہ ہر تہذیب کی اچھائیوں کو اپنے اندر اس طرح لے لیتی ہے کہ اس کی جداگانہ ہستی ہونے پر کوئی ضرر نہ آئے، ہزار سال گذر جانے پر اس کی جداگانہ ہستی مضبوط چٹان کی طرح قائم ہے۔ اس کو کسی تہذیب کی چیز لینے سے اس بنا پر اعتراض نہیں کہ وہ فلاں فرقہ یا قوم کی ملک یا ایجاد ہے۔ ہاں اسے اس پر ضرور اعتراض ہے کہ اس اچھائی یا چند اور اچھائیوں کی بنا پر کسی دوسری تہذیب کو اسلامی تہذیب سے فائق سمجھ لیا جائے۔ ہر تہذیب کو خواہ وہ دیسی ہو یا بدیسی اسلامی تہذیب کے ماتحت رہنا چاہئے۔ آپ اسلامی تہذیب کو ایک گونہ جارحانہ تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن افسوس سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی بھی ہم پر قابو پا چکی ہے۔ اپنے یہاں کا زرِ خالص دوسروں کے پیتل کے مقابلہ میں بلحاظ آب و رنگ کمتر معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن نظر کی یہ غلطی اور ذہن کی یہ غلامی سدا قائم رہنے والی نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ان کی تہذیب بڑے بڑے خطرات سے دوچار ہو چکی ہے لیکن ہمیشہ پھر ابھری ہے اور اس کا ہر ابھار گمراہوں اور دشمنوں کو راہ راست پر لا چکا ہے اور ان سے اس تہذیب کی خوبیوں کا اعتراف کرا چکا ہے۔

آج کل اپنی رواداری اور بے تعصبی کے اظہار کے لئے ہمارے بعض علمی حلقوں میں یہ کہا

جاتا ہے کہ اب ہر جگہ علم کا شیوع ہو چکا ہے۔ اب مومن و مشرک، مسلم و کافر کی تفریق پر زور نہ دینا چاہئے
بلکہ اسلامی تہذیب کو اب دوسری تہذیبوں کے ساتھ ملا دینے میں کوئی خطرہ نہیں بلکہ اس امتزاج
پر مسلمانوں بلکہ انسانیت کی ترقی کا انحصار ہے۔ اس دعوی کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں
مومن و مشرک کی تفریق اور اس پر اصرار اس وقت تک ضروری تھا جبکہ مسلمان ہندوستان میں
نئے نئے آئے تھے۔ اگر اس وقت ایسا نہ کیا جاتا تو "اسلام" یہاں کے فرقوں میں سے ایک
فرقہ بن جاتا، علم، معقولیت اور فطرت کا مذہب نہ رہتا۔ لیکن اب جبکہ عقل کی قدر اتنی بڑھ گئی ہے
کہ مذہب بھی کہیں کا نہ رہا تو ہمارا اس پر اصرار کرنا کہ ہم سب سے الگ ہیں خود ہمارے آئین کے خلاف
پڑ سکتا ہے"۔

مذکورہ بالا دعوی ہندو بیرون ہند کے روزانہ کے واقعات کے جتنا خلاف ہے، کیا اس کے
بیان کرنے کی حاجت ہے؟ ہندوستان میں آج "عقل کی قدر" بڑھ جانے اور "مذہب کے کہیں کے
نہ رہنے" کے باوجود بھی کیا ہندو مسلم فساد موقوف ہو گئے ہیں؟ کیا خالص علمی درسگاہوں اور قومی انجمنوں
میں مسلم غیر مسلم کی تفریق پڑھے لکھوں کے ہاتھوں مٹ چکی ہے؟ کیا سرکاری محکموں اور دفتروں میں
جہاں جہلا نہیں تعلیم یافتہ ہی ہوتے ہیں محض کسی خاص فرقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر نا انصافی کے
واقعات سننے میں نہیں آتے؟ اردو ہندی کا جھگڑا، مشترکہ اور جداگانہ انتخاب کا قضیہ، پاکستان اور
دستور ساز اسمبلی کے مطالبے کیا سب پڑھے لکھوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے پھیلائے ہوئے نہیں؟
ہندوستان کے باہر نگاہ ڈالئے۔ ان ممالک پر نگاہ ڈالیے جو علم کے معدن، تہذیب کے مخزن سمجھے
جاتے ہیں وہاں کے امن کی جو حالت ہے اس کے متعلق کیا ایک لفظ بھی کہنے کی ضرورت باقی
ہے؟ جرمنی کے نزدیک ہٹلر ازم، روس کے نزدیک بالشویزم، اور اٹلی کے نزدیک فیسزم کی جبریہ
اشاعت، یورپی ممالک سے یہودیوں کا ایک خاص نسل سے تعلق رکھنے کی بنا پر اخراج یہ سب کس
چیز کو ظاہر کر رہے ہیں؟ علم و تعلیم نے، تہذیب و تمدن نے تفریق و امتیاز کو گھٹایا یا بڑھایا؟ غریب مذہب
جن چیزوں کے لئے بدنام تھا کیا ان سے بدرجہا زائد آج دنیا میں نہیں ہو رہا ہے؟

اس وقت ہمارا خاموش رہنا اور اسلامی تہذیب و تمدن کی اشاعت کو مصلحت اندیشی کی نذر کر دینا نہ صرف ہمارے وجود کو فنا کر دے گا بلکہ ساری انسانیت کے لئے تباہی و بربادی کا باعث ہوگا۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی تہذیب کی خوبیوں کو اپنے قول و عمل سے دنیا پر واضح کریں اور بتائیں کہ امن و سلامتی کا راستہ صرف یہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر مسلموں کا گلا کاٹنے لگیں یا ان کے مال و دولت پر حملہ شروع کر دیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم اپنی ہستی بحیثیت مسلمان کے قائم رکھیں۔ اپنی ان تمام خوبیوں کو جو ہماری تہذیب میں وراثتاً چلی آرہی ہیں (مثلاً جذبۂ انسانیت، مساوات، عقل کا صحیح استعمال سچے علم کی طلب اور محض طلب علم پر اکتفا نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل بھی)، نہ صرف قائم رکھیں بلکہ دوسروں کو بھی انھیں کی تلقین کریں۔ لیکن اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارے عقیدہ و عمل میں ہم آہنگی ہو۔ ذہنی غلامی اور غیروں کے رعب سے ہمارا عقیدہ شمہ برابر بھی متاثر نہ ہو۔ اور ہمارا عمل خلوص سے لبریز اور ریا سے معرا ہو۔

ہماری تہذیب کے علاوہ اس ملک میں دو بڑی و نمایاں تہذیبیں اور ہیں جن سے ہمیں مقابلہ کرنا ہے پہلی تو فرنگی تہذیب ہے۔ سات سمندر پار سے آئی ہوئی اور علاوہ حکمراں طبقہ کے جدید تعلیم یافتہ گروہ میں بھی بہت کچھ رائج۔ دوسری ہندوؤں کی تہذیب جو عرصہ تک مردہ حالت میں رہی تھی، لیکن بعض قومی تحریکات کی گرم بازاری کے ساتھ ساتھ اور بعض ہندو زعما کی جان توڑ کوششوں کی بدولت از سر نو زندہ کی جا چکی ہے۔ اور متحدہ قومیت کے پردہ میں اس کو مسلمانوں کے سر منڈھنے کی باضابطہ سعی کی جا رہی ہے۔ ان دونوں تہذیبوں میں باہم اختلافات بھی ہیں اور مشترک چیزیں بھی۔ اسماء و اصطلاحات کے اختلافات باہم ملیں گے، لیکن جہاں تک "اسلامی تہذیب" سے دشمنی کا تعلق ہے اور دشمنی بھی کیسی جانی دشمنی، ان دونوں تہذیبوں میں "تیر قضا" اور "پر تیر قضا" کا فرق ہے۔ سنکھیا کو خواہ آرسینک کے انگریزی نام سے پکاریئے یا اس کو سنکھیا کے ہندی نام سے موسوم کیجئے ہلاکت اس سے بہر حال یقینی ہے۔ نام اور اصطلاح کا فرق اس کی خاصیت کو تبدیل نہیں کر سکتا!

یہ دونوں تہذیبیں جیسا کہ ان کا طرز عمل بتاتا ہے سراسر جارحانہ ہیں۔ فرنگی تہذیب کو اگر حکومت کی سرپرستی اور ساتھ ہی فرنگی علوم نظری و عملی کی تائید حاصل ہے تو ہندی تہذیب کو ہندوستان کی

اکثریت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ہندوستان کے مہاتماؤں، اور سرگرم عمل قومی انجمنوں کی طرف سے اس کا پرچار جاری ہے۔ موجودہ زمانہ پروپگنڈہ کا ہے۔ ان دونوں تہذیبوں کے حامل مسلمانوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور کہیں زیادہ پروپگنڈے کی اہمیت سے نہ صرف آشنا بلکہ مالک ہیں تعلیم گاہوں میں عمومی طور پر وہی چھائے ہوئے ہیں، پریس ان کا، سنیما کے اسٹیج پر انھیں کے پیش کردہ مناظر، اور ریڈیو کی مشین سے انھیں کی بولی سنائی دیتی ہے۔ ان سب ذرائع و وسائل سے ہمارے تہذیبی خصائص ایک ایک کر کے مٹائے جا رہے ہیں۔ رواداری اس وقت تک روا رکھی جا سکتی ہے جبکہ خود ہماری ہستی قائم رہے۔ ایسی رواداری جس کی بدولت ہم فنا ہو جائیں، کس آئین دانش کے مطابق ہے

یہ دونوں تہذیبیں صاف صاف کہہ رہی ہیں کہ آؤ ہم میں ضم ہو جاؤ! ہم اس انضمام و اشتراک کے لئے شاید تیار ہو جاتے بشرطیکہ ہمیں یقین ہوتا کہ ہمیں اس سے کوئی فائدہ پہونچے گا۔ اور ہماری تہذیب انفرادی کے بجائے مشترکہ بن کر ہماری ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہو گی لیکن افسوس تجربہ اور عقل دونوں ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ یہ خیال سراسر خام ہے۔ ان تہذیبوں میں سے کسی ایک سے بھی اتحاد و انضمام ناممکن العمل ہی نہیں ناممکن التصور ہے۔

فرنگی تہذیب مسلمانوں نے اختیار کی اس میں انتہائی توغل و انہماک رکھنے اور نقل کو زیادہ سے زیادہ مطابق اصل بنانے کے باوجود بھی کیا ان کو یورپینوں کے مساوی حقوق حاصل ہو گئے؟ مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے نہیں خالص مادی و سیاسی اعتبار سے سہی؟ "نیٹو" اور اس قسم کے تحقیری کلمے وحشی اور جاہل ہندوستانیوں کے علاوہ تعلیم یافتہ و تہذیب یافتہ ہندوستانیوں کے متعلق کیا نہیں سنے گئے؟ رنگ و نسل کا سوال آج سے چند سال قبل تو اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں اور ریل کے اونچے درجوں میں کتنا زیادہ اٹھتا تھا؟ اور اب بھی کبھی نہ کبھی ایسے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ بڑے سرکاری عہدوں میں محض ہندوستانی یا مسلمان ہونے کی بنا پر کیا ناانصافیاں موقوف ہو گئی ہیں؟ یہ ان لوگوں کا انجام ہوا جنھوں نے اپنی تہذیب کو ترک کر کے فرنگی تہذیب اختیار کر لی تھی اور بالکل اس میں ضم ہو گئے تھے

اس سے مسلمانوں کو من حیث القوم، خالص مادی اعتبار ہی سے دیکھئے آخر کیا فلاح پہونچی؟ نصف صدی یا اس سے زائد کے تجربات کیا عبرت کے لئے کافی نہیں؟

اب رہی ہندو تہذیب جو ہندی قومیت کی آڑ میں لائی جا رہی ہے۔ فرض کیجئے کہ مسلمان اس کو جبراً یا برضا خود قبول بھی کرلیں، اور اپنی وضع قطع بالکل ہندوؤں کی سی بنالیں، پاجامہ کی جگہ دھوتی، لوٹے کے بجائے لٹیا، اردو کی جگہ ہندی وغیرہ کا استعمال شروع کردیں، تب بھی کیا ہندو ان کو اپنا سا سمجھنے لگیں گے؟ کیا اسوقت وہ ان کو اپنی طرح اس ملک کی قسمت کا حصہ دار تسلیم کرلیں گے؟ کیا ایسی صورت میں وہ مسلمانوں سے چھوت چھات چھوڑ دیں گے؟ کیا اسلامی نام رکھنے والوں کے ساتھ ملازمتوں وغیرہ میں جو تعصب برتا جاتا ہے، اس میں اس تبدیلی سے کچھ بھی کمی واقع ہو جائے گی؟ سوال کے جواب کے لئے نئے تجربہ کی ضرورت نہیں، ہندوؤں کی گزشتہ تاریخ پر نظر ڈال جائیے۔ اچھوت اقوام کی کروڑہا کی تعداد، کتنے زمانہ سے انسانیت اور شہریت کے ابتدائی حقوق سے محروم چلی آتی ہے؟ اور آج بھی باوجود مغربی تعلیم پھیل جانے کے یہ اچھوت زندگی کی کس منزل میں ہیں؟ کیا مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں، ان کی تہذیب و تمدن کے ہاتھوں، اپنے حق میں اچھوتوں سے بہتر سلوک کی توقع کرسکتے ہیں۔ خاصکر جبکہ مذہبی اختلاف بھی دونوں کے درمیان حائل ہو اور سیاسی کشمکش بھی عرصہ سے چلی آتی ہے۔ اس تہذیب میں ضم ہو کر مسلمان بجز اس کے کہ اچھوتوں کی تعداد میں کئی کروڑ کا اضافہ کردیں اور کیا کرسکتے ہیں اور کیا پا سکتے ہیں؟

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ دوسری اقوام کے ساتھ رواداری برتی ہے اور جن اقوام کو کہیں بھی پناہ نہ ملتی تھی، اپنے دامنِ عافیت میں پناہ دی ہے لیکن اس پناہ دینے میں یہ نکتہ ہمیشہ مدنظر رہا ہے کہ پناہ گزیں دامن کے نیچے رہے، یہ نہ ہو کہ انکا دامن چاک کرڈالے اور ان کو اپنی تن پوشی کے لئے اس کا محتاج ہونا پڑے۔ دوسری اقوام اور ان کی تہذیبوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو رواداری برتی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان اقوام کو زندہ رہنے اور ان کی تہذیبوں کو خود ان اقوام کے اندر پھلنے پھولنے دیا جائے لیکن انہیں اپنے کو ضم کردینا، اپنے حق میں سب سے بڑی ناروا داری اور سب سے بڑا ظلم ہے جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

(حکیم عبدالقوی دریابادی)

کانسٹی ٹیوئینٹ اسمبلی

موجودہ حالت میں وہ اقتدار اعلیٰ جس کے ہاتھ میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہے تاج برطانیہ کو حاصل ہے۔ لوگوں کے نمائندوں کے ذریعہ ہند کے دستور کی تشکیل کے لئے "دستور ساز مجلس" کے انعقاد کے یہ معنی نہیں کہ اقتدار اعلیٰ تاج برطانیہ سے لیکر ہندوستان کے عوام کو دے دیا جائے ہندوستانی ایک نئی حکومت کی بنا صرف اسی وقت ڈال سکتے ہیں جب ان کو سیاسی غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائے اور وہ برطانوی پارلیمنٹ کی محکومیت سے آزاد ہو جائیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں دستور ساز مجلس کے نئے معتقدین ایک بالکل ہی مختلف خیال رکھتے ہیں۔ لبرل لوگوں کی طرح ان کے نظریئے کی بنا اس خیال پر ہے کہ ترغیب و سمجھوتے سے قوت منتقل کرائی جا سکتی ہے۔ عوام کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے ترغیب کی بجائے مطالبہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر مطالبہ میں وہ زور اور دباؤ کہاں ہے جو آقاؤں کی پشت توڑ دے اور انکو ماننے پر مجبور کرے۔ کانگریس کا مطالبہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ کل کی کل ہندوستانی آبادی برطانوی سامراجی حکومت کی جگہ لے لیگی اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسٹر برلا اور دیگر مہاراجے دستور ساز مجلس کے ذریعہ ہندوستان کا دستور مرتب کرنے پر راضی ہو جائیں گے اور برطانوی سامراج کو ہٹا دینگے۔ کانگریس کے مطالبہ کو سیدھے سیدھے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ تم ہمیں زبردستی غلام نہ بناؤ بلکہ ہم کو اپنی خواہش سے غلام بننے دو۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہمارا بنایا ہوا دستور برطانوی پارلیمان نے مسترد کر دیا تو پھر؟ اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ ایسی حالت میں برطانیہ دنیا کی نظر میں اخلاقی مجرم ٹھریگا۔ اور بدنام ہو جاویگا۔ مگر کیا یہ بدنامی ہندوستان سے غلامی کی لعنت دور کر دیگی؟ آج تک تو ایسا ہوا نہیں۔

دستور ساز مجلس کا تخیل انقلاب فرانس کی پیداوار ہے۔ اور ہندوستان میں اول اول

یہ فقرہ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے موقع پر استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔ اُس وقت سے برابر اس خیال کو تقویت ہوتی گئی یہاں تک کہ کانگریس کے آفیشل پروگرام میں داخل کر لیا گیا۔ آج کل یہ کانگریس کی پالیسی کا خاص محور بنا ہوا ہے۔ بہرحال یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ مطالبہ کی انقلابی اہمیتوں کو نہیں سمجھا گیا ہے اور یہ مطالبہ کے بنیادی سیاسی فلسفہ کے متعلق اُلجھے ہوئے خیالات سے ہویدا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ عوام کو اس مطالبہ کے لئے طیار کرنے سے پہلے اس پراگندگیٔ تخیل کو صاف کر لیا جائے۔ دستور ساز اسمبلی کے مطالبہ کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستانی عوام اپنے حق خود اختیاری کے ظاہر کرنے کے لئے ایک آلۂ قوت کی تخلیق پر تُل گئے ہیں۔ دراصل حق خود اختیاری کے کوئی معنی ہی نہیں جب تک اُس کا عملی اظہار نہ ہو۔ اور اُس کے اظہار کے لئے ہندوستانی عوام کو ایک آلۂ کار کی ضرورت ہے۔ مکمل آزادی یا پورن سوراج کے مقصد کا حصول اسی بات پر مبنی ہے کہ ہندوستان کے عوام کے ہاتھوں میں طاقت حکومت آجاوے۔ جب تک کانگریس کے سیاسی پروگرام کے اس مفہوم کو نہ سمجھا جائے دستور ساز مجلس کا صحیح تخیل قائم نہیں کیا جا سکتا۔ دستور ساز مجلس کے منوانے کا موثر طریقہ معلوم کرنے سے قبل فلسفۂ سیاست کے دو بنیادی نظریوں کو اچھی طرح سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ یہ دونوں نظریے اصولِ ریاست و اصول دستور ہیں۔ جس دستور سے ہمیں مطلب ہے وہ ایک ریاست کا دستور ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ریاست کیا ہے؟ عام طور سے ریاست اور حکومت ایک چیز سمجھی جاتی ہے حالانکہ اس سے زیادہ غلط اور کوئی چیز نہیں۔ امور سلطنت کا انتظام حکومت کرتی ہے اور حکومت کی تشکیل میں یا اُن حضرات میں جو برسرِ حکومت ہوں وقتاً فوقتاً تبدیلی ممکن ہے اور ہو سکتی ہے لیکن ریاست یا سلطنت ایک مستقل ادارہ ہے جو افراد پر مشتمل نہیں۔ حکومت ایک ملک کی سیاسی تنظیمی حالت کا نام ہے۔ ایک خاص قسم کی سیاسی تنظیم جو اپنی جگہ پر اُن مخصوص عمرانی رشتوں پر مبنی ہے جو معاشی حالات کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ اُس آئینی مشینری کے پیچھے جس کو گورنمنٹ کہتے ہیں کچھ معین رشتے کام کرتے ہیں۔ ہندوستان کے معاملہ میں یہ رشتہ برطانوی تاج کی محکومیت کا تعلق ہے اور تاج برطانیہ ایک خاص معاشی

نظام کا علمبردار ہے جس کو برطانوی سامراج شاہی کہتے ہیں۔ ہندوستان میں جو سلطنت قائم ہے وہ یہ ہی محکومیت ہے۔

اس محکومیت کے رشتہ کی روح رواں برطانوی سرمایہ کے ذریعہ ہندوستانی جنتا کی معاشی لوٹ کھسوٹ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس سامراجی سلطنت کا انصرام ایک ایسی حکومت کے ہاتھ میں ہو جو ہندوستانیوں پر مشتمل ہو۔ وائسرائے بھی ہندوستانی ممکن ہے لیکن وہ جب تک تاج برطانیہ کا نمائندہ ہے ہندوستان اُس سامراج شاہی سلطنت کا ایک جزو خاص بنا رہے گا۔ اس لئے یہ صاف طور سے سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک آزاد قومی سلطنت بننے سے پہلے ہندوستان کو سلطنت برطانیہ سے تمام رشتوں کو توڑ دینا ہوگا جن تعلقات پر ایک سلطنت کی بنا ہوتی ہے وہ سیاسی یا آئینی نہیں ہوتے بلکہ اصل میں معاشی ہوتے ہیں۔ اور اس بنیادی معاشی رشتے کو ایک سیاسی شکل دے دی جاتی ہے جو گورنمنٹ اور اُس کا قائم کردہ نظام بن جاتا ہے۔ یہ سیاسی شکل بلا اندرونی حالات پر اثر انداز ہوئے بدل سکتی ہے۔ جب تک اِن معاشی تعلقات کی فہرست قائم رہتی ہے گورنمنٹ کی ہئیت میں تبدیلی سے ریاست کی تبدیلی لازم نہیں آتی۔ سلطنت جو طاقت کا آلۂ کار ہے بزور بنائی جاتی ہے اور بزور قائم رکھی جاتی ہے۔ اور اس لئے کسی قائم شدہ سلطنت کو صرف بزور ہی مٹایا جا سکتا ہے۔ یہ صرف بذریعہ انقلاب ممکن ہے۔ کسی قائم سلطنت کے قوانین کے حدود کے اندر رہ کر ایک نئی سلطنت کا دستور نہیں مرتب کیا جا سکتا۔ یہ اصول کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے مطالبہ کے وقت پوری طور سے ذہن میں رہنا چاہیئے اس طرح یہ مطالبہ خود بخود سیاسی طاقت پر قبضہ جمانے کے فرض کو لوگوں پر عائد کر دیتا ہے۔ اور قبضہ پانے کے معنی منطقی طور پر یہ نکلتے ہیں کہ قائم شدہ سامراج شاہی سلطنت کو اُلٹ دیا جائے۔

دستور حکومت کسی ملک کی سرکاری مشینری کے بیان کا نام نہیں مثلاً گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کوئی دستور نہیں کہا جا سکتا اور نہ بدقسمت نہرو رپورٹ میں کسی آنے والی آزاد

ہندوستانی سلطنت کا مسودہ ہے کسی ریاست کا دستور چند بنیادی اصولوں کا نام ہے جن کے
مطابق اس کے امور انتظام پانے چاہئیں۔ وہ ایک سلطنت کا بنیادی قانون ہے۔ تمام
وہ قوانین جو بعد کو حکومتیں امور ریاست کے انصرام کے لئے بنائیں گی دستور کے اندر لکھے
ہوئے اصولوں کے مطابق ہونا چاہئیں۔ موجودہ سلطنت جو ہندوستان میں قائم ہے اس
کے دستور کا اولین اصول یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ تاج برطانیہ کو حاصل ہو۔ اب کوئی دوسرا دستور
آ ہی نہیں سکتا جب تک اس بنیادی اصول کو کسی دوسرے بنیادی اصول سے کلیتاً
نہ بدل دیا جائے یعنی اقتدار اعلیٰ عوام کو حاصل ہو جائے۔ مگر ہم تو تاج برطانیہ
کے اختیارات کو بھی کم نہیں کر سکتے یہ حق کلیتاً برطانوی پارلیمان کو تفویض کیا گیا
ہے۔ ایک آزاد قومی سلطنت کے دستور کا ہندوستانی عوام کے ہاتھوں مرتب ہو جانا اس
امر کی دلیل ہے کہ اُس سے قبل تاجِ برطانیہ کا اقتدار ختم ہو گیا اور یہ حالت اُسی وقت پیدا
ہو سکتی ہے جب ہندوستان کے قوت و اقتدار کو منوا لیا جائے۔ ایک آزاد سلطنت کے
دستور بنانے کا ہندوستانیوں کو کوئی حق و اختیار نہیں ہو سکتا جب تک اس اختیار پر ایک
بیرونی طاقت کا دعوائے تسلیم شدہ ہے۔

ایک بات اور سمجھ لینے کی ہے وہ یہ کہ جس ریاست کے قیام کے ہم اس قدر خواہاں ہیں
اس کے اصول قبل سے طے کر لینا چاہئے۔ اور وہ اصول مظلوم اور تباہ شدہ لوگوں کے مفاد
کو پیش نظر رکھ کر قرار پانے چاہئیں جن کی بدنصیبی کے ذمہ دار وہ سماجی تعلقات ہیں جن پر
موجودہ سلطنت کی بنا رکھی گئی ہے۔ عوام کو تیار کرنے کے لئے ان اصولوں کو عملی طور پر وضع کیا
جائے اور ان میں اُن کی اشاعت کی جاوے۔ ایک دستور ساز مجلس ان عوام کے نمائندوں
کی جماعت ہے جو غلبہ حاصل کرنے کی انقلابی جد و جہد میں مصروف ہیں اور اس نمائندہ جماعت
یا اسمبلی کا بنایا ہوا دستور ان اصولوں کے آئینی جواز کا ضامن ہے جن کی اشاعت تحریک
آزادی کو بڑھانے کے لئے کی جا رہی ہے۔ دستور کا وضع کرنا ایک قانونی دستاویز کی طرح

نہیں جس کا مسودہ ایک قانون داں تیار کرے۔ دراصل وہ تو عملی نتیجہ ہے اُس بغاوت کا جو عوام قائم شدہ سیاسی رشتوں کے خلاف کرتے ہیں اور اس طرح ایک نئی ریاست کی بناڈالتے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ سلطنت کی بنا بدیشی سرمایہ کے ذریعہ یہاں کے عوام کی معاشیاتی لوٹ کھسوٹ ہے۔ اس کے بجائے ایک ایسی ریاست بھی قائم کی جاسکتی ہے جس میں ایک بہت چھوٹی سی تعداد ایک بہت بڑی کثرت آبادی پر حاکم و مسلّط ہو بیٹھے اور اس کثیر انبوہ کی لوٹ کھسوٹ جاری رکھے۔ اس حالت میں ہندوستان کو ظاہراً آزادی مل جائے گی مگر وہ جمہور کی آزادی نہ ہوگی اور نہ ہی وہ جمہوری سلطنت ہوگی۔ وہ دستور جو حقیقی آزادی کا علمبردار ہو ایسے اصولوں پر مبنی ہونا چاہیئے جن سے ظالمانہ سماجی تعلقات کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع ہوجائے تمام بالغوں کے لئے حق رائے دہی کا حاصل ہوجانا ہی کافی نہیں۔ قوت و اقتدار اُس وقت تک آئینی طور پر تسلیم شدہ نہیں جب تک معاشی استعمار اور سماجی ظلم سے بچاؤ کے لئے مؤثر سیاسی غلبہ نہ حاصل ہوجائے۔ ایک آزاد جمہوری ریاست کے دستور میں انہیں اصولوں کو دُہرایا جاتا ہے۔

حال کی تاریخ سے یہ سبق ملتا ہے کہ دستور ساز مجلس جمہور کی بغاوت سے پیدا ہوتی ہے۔ قائم شدہ سلطنت کو اُلٹ دینے کے بعد ہی ایک نئے دستور کا نفاذ ہوسکتا ہے جب کبھی ان دونوں میں سمجھوتہ کرلیا گیا ہے یا قائم شدہ سلطنت کی رضا و رغبت سے آئینی طور پر اُس کی طاقت کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ ایک کامیاب ردِ عمل ترقی کی راہ میں ہوگیا ہے پرانی سلطنت نے اپنی طاقت کو پھر مجتمع کیا ہے اور نئی ریاست کو اُلٹ دیا ہے۔ ایک نیا دستور وہی قوم بناسکتی ہے جو سیاسی طاقت پر قبضہ جمانے کی جد وجہد میں مصروف ہو۔ اور ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی اسی مقصد کے لئے ایک آلہ کار کا کام کرتی ہے۔ مظلوم اور تباہ حال جمہور کو خود اپنی جماعتیں بنانی چاہئیں جو قائم شدہ حکومت کے لئے چیلنج ہوں۔ یہ جماعتیں آزاد قومی سلطنت کی بناڈالیں گی۔ ہندوستان کی ایک بہت

بڑی کثرت آبادی ایسی ہے جن کے مفاد سامراج شاہی سے کبھی سمجھوتہ کے ذریعہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ وہ اِس دستور ساز اسمبلی کے مطالبہ کو منوا سکتے ہیں۔ اُن کے لئے ضروری ہے کہ غلبہ کے حصول کی جد وجہد جاری رکھنے کے لئے اپنی اپنی جگہ نمائندہ قومی جماعتیں قائم کریں۔ آخر میں یہ ہی پنچائتیں ایک قومی اسمبلی میں اپنے مندوبین بھیجیں گی۔ یہ نمائندہ قومی پنچائت یا مجلس اقتدار اعلیٰ اختیار کرے گی اور اپنے اجزائے ترکیبی کے مفاد کے مطابق چند بنیادی قوانین کو وضع کر کے ایک آزاد جمہوری ریاست کا قیام عمل میں لائے گی۔ دستور ساز پنچائت کے انتخاب کا نعرہ اقتدار پر قبضہ جمانے کے لئے ایک اجتماعی جد وجہد کا اشارہ ہوگا۔ صرف ایسی ہی جد وجہد کے بعد ایک حقیقی آزاد قومی ریاست کے دستور کو وضع کرنے کے لئے ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نمودار ہو سکتی ہے اور بس۔

مترجمہ سید محمد اصفہانی، بی، اے

غزل

کیوں نہ سب پہ ہو جاتا حالِ دل عیاں اپنا
ہر سکوتِ بیجا کی تہ میں تھا بیاں اپنا

دل سے کچھ اُمیدیں تھیں وہ بھی اب انہیں کا ہے
کاش عشق میں ہوتا دل ہی رازداں اپنا

تیرے در سے اُٹھ کر ہم جائیں تو کدھر جائیں
اب زمین اپنی ہے اور نہ آسماں اپنا

فصلِ گل جو یاد آئی آشیاں بھی یاد آیا
فصلِ گل میں اُجڑا تھا شاید آشیاں اپنا

تھا حریمِ ناز اُن کا دل کی آخری منزل
ہم نے اُن کو ڈھونڈا تھا مل گیا نشاں اپنا

بجلیوں سے غُربت میں کچھ بھرم تو باقی ہے
جل گیا مکاں یعنی تھا کوئی مکاں اپنا

زندگی کب اپنی ہے موت کس کے بس کی ہے
ہجر میں بنا لیتے کس کو مہرباں اپنا

اُس نے دل کی حالت کا کیا اثر لیا ہوگا
دل نے کیا کہا ہوگا۔ دل ہے بے زباں اپنا

نقشِ سجدہ گھبرا کر کیوں مٹائے دیتے ہو
اُس میں کیا نظر آیا سنگِ آستاں اپنا

پھر بھی نارسا ٹھہرا۔ اور کیا رسا ہوتا
عرش سے پرے پہونچا شورِ الاماں اپنا

گھر ہے اب قفس فانیؔ گھر کبھی چمن بھی تھا
ہاں کبھی وطن بھی تھا اب وطن کہاں اپنا

فانیؔ بدایونی

غزل

فسردہ پا کے محبت کو مسکرائے جا
اب آ گیا ہے تو اک آگ سی لگائے جا

بغیر علم بھی جیسے ہوائیں چلتی ہیں
یوں ہی کچھ اہل محبت کو یاد آئے جا

نگاہ یار ترا یوں تو ہے پیام کچھ اور
مگر کرم بھی کئے جا ستم بھی ڈھائے جا

اس اضطراب میں راز فروغ پنہاں ہے
طلوع صبح کے مانند تھرتھرائے جا

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آب حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

بھری نگاہ بتادے گی راز عشق ابھی
کسی کی چشم کرم کا فریب کھائے جا

تجھے کچھ اپنا پتہ یوں ہی چل رہے گا کبھی
ترے نثار ابھی مجھ کو آزمائے جا

پھر اپنا کام بھی کرتی رہے گی اس کی نگاہ
ابھی تو عشق کے گنو پر اُسے لگائے جا

ابھی تو ایک دھواں سا اٹھا ہے سینے میں
دل و جگر پر ابھی بجلیاں گرائے جا

ابھی تو اے غم پنہاں جہان بدلا ہے
کوئی دن اور زمانہ کے کام آئے جا

پھر اپنے ناز بھی اٹھتے نہیں محبت سے
ابھی تو ایک زمانہ کے ناز اٹھائے جا

کبھی تو حسن جگے گا، یہ عشق سے کہدو
کہ بن کے خواب ہی اس آنکھ میں سمائے جا

ابھی نہ کھول ذرا نیم باز آنکھوں کو
ترے نثار یہ جادو ابھی جگائے جا

وہ کیمیا ہی سہی پہلے خاک ہونا ہے
ابھی تو سوز محبت کی آنچ کھائے جا

تو مجھ کو چھوڑ رہا ہے خراب کرکے جسے
وہ عمر کیسے کٹے گی ذرا بتائے جا

شباب پر ہے زمانہ ترے ستم کے نثار
ابھر رہا ہوں اسی رنگ سے مٹائے جا

فراق چھیڑ تو تو نے کیا فسانۂ درد
سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مگر سنائے جا

(فراق۔ گورکھپوری)

آدم بیڈ

جارج ایلیٹ انیسویں صدی کی ایک مشہور انگریزی ناول نگار تھی۔ اسلوب میں ایک خاص قسم کا مزاح تھا پھر بھی جو چیز جھلکتی تھی وہ غم تھا۔ آدم بیڈ اس کی مشہور ترین ناول ہے۔ یہ ناول ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ پلاٹ سادہ ستھرا لیکن پختہ ہے۔ ناول نگار میں جتنی مذہبیت تھی اس کی بھی حامل ہے۔ خود مصنفہ کہا کرتی تھی کہ میرا سب سے چہیتا کردار دینا مارس ہے۔

جون ۱۷۹۹ء کا زمانہ ہے سلوپ کے گاؤں میں ایک بڑھئی مسٹر جاتھن برج کی بڑھئی کی دوکان میں پانچ آدمی کواڑے اور کھڑکیاں بنانے میں مصروف ہیں۔

ان پانچ میں ایک آدمی بہت لمبا ہے۔ تقریباً چھ فٹ اونچا، بہت مضبوط گٹھا ہوا بدن۔ آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی ہیں۔ بڑے بڑے اور مضبوط ہاتھ جس کے ایک گھونسا مارے وہ وہیں ختم ہو جائے۔ لیکن ہتھیلیاں بڑی بڑی اور انگلیاں پتلی پتلی۔ کاریگری اور استادی کے کام کرنے والوں کی ایسی ہی ہتھیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ بڑا سا کھڑا چہرہ لیکن چہرے سے سیدھا پن نیکی اور کافی ذہانت آشکارا۔ یہ آدم بیڈ ہے۔

قریب ہی اُس کا بھائی کام کر رہا ہے تقریباً اتنا ہی لانبا۔ اسی کی طرح کا چہرہ مہرہ۔ لیکن اسکے چوڑے کاندھے ذرا جھکے ہوئے ہیں اور اُس کی نظریں تیز نہیں بلکہ متبر اور رحیم معلوم دیتی ہیں اس کا نام سیتھ بیڈ ہے گاؤں کے لونڈے ہمیشہ اُس سے کچھ نہ کچھ وصول کر لیتے تھے۔ آدم سے البتہ اُن کی بات کرنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

شام کے چھ بج گئے ہیں۔ کاریگروں نے کام بند کر دیا اور چلے گئے صرف سیتھ ذرا رُکا رہا اور آدم کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ امید کر رہا ہے کہ اُس سے کچھ کہا جائیگا۔

آدم۔ وعظ سننے سے پہلے گھر جاؤ گے نا؟

سیتھ۔ نہیں گھر دس بجے سے پہلے نہ پہونچ سکوں گا دینا مارس کو گھر چھوڑ کر آنا ہے اگر اُس نے

منظور کر لیا تو۔ اس کے ساتھ تو کوئی پوسٹر کے گھر سے آتا ہی نہیں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔

آدم گھر روانہ ہو گیا۔ اور سلیتھ پونے سات تک گاؤں کے اس میدان میں پہونچ گیا جہاں میتھوڈلیسٹ وعظ دے رہے تھے۔ جب دینا مارس گاڑی پر چڑھی (گاڑی ایک ممبر کا کام دے رہی تھی) تو لوگ ذرا اس کے گرد سمٹ آئے۔ دینا میں نہ کسی قسم کی گھبراہٹ تھی نہ جھجک وہ گاڑی پر اسی اطمینان سے چڑھ گئی جیسے بازار جا رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں کسی قسم کی چمک یا تیزی نہ تھی وہ دیکھ نہیں رہی تھی بلکہ اپنی آنکھوں سے شفقت برسا رہی تھی۔ اس کی آواز میں طراری نہ تھی۔ جو کچھ کہتی تھی آہستہ لیکن صاف لہجوں میں۔ اس کی تقریر پہلے سے سوچی ہوئی نہ تھی۔ لیکن خلوص نے اس کی تقریر کو اتنا فصیح کر دیا کہ جب تک وہ بولتی رہی لوگ محو اور گرویدہ ہو کر سنتے رہے۔

جب اس کا وعظ ختم ہو گیا تو سیتھ بیڈ اس کے ساتھ پگڈنڈیوں پر ہو لیا جو میدانوں اور کھیتوں میں ہوتی ہوئیں اس کے گھر ہال فارم کو جاتی تھیں۔

غیر شعوری طور پر دینا کے چہرہ پر خاموشی متانت اور سنجیدگی تھی۔ یہ چیز ایک عاشق کے لئے ذرا مایوس کن ہوا کرتی ہے اس لئے سیتھ بیڈ سوچتا ہی رہا کہ کیا کہے اور کس طرح کہے اور جب تک یہ دونوں ہال فارم کے دروازوں کے قریب نہ پہونچ گئے سیتھ کچھ نہ کہہ سکا۔

"دینا اب کچھ کہنا ممکن ہے ذرا بیجا اور گستاخانہ ہو جب کہ تم اپنے خیالات مجھ پر ظاہر کر چکی ہو پھر بھی مقدس کتابوں میں شادی کی موافقت میں مخالفت سے زیادہ آیتیں نکل سکتی ہیں۔ سینٹ پال کا قول ہے "دو ایک سے بہتر ہیں"۔ یہ قول جہاں اور باتوں کے لئے درست ہے وہاں شادی کے لئے بھی درست ہے۔ کیونکہ دینا ہم تم دونوں یک جان و دو قالب ہو جائینگے میں تمہارا ایسا شوہر ہرگز نہ ہوں گا کہ تمہارے ان کاموں میں حائج ہو سکوں جو خدا نے تمہارے سپرد کئے ہیں۔ میں تو بلکہ تمہیں خوب آزادی دوں گا اس سے بھی زیادہ جتنی تمہیں آج کل میسر ہے کیونکہ ابھی تمہیں اپنی روزی کمانی پڑتی ہے۔ شادی کے بعد مجھے اپنے بازوؤں پر اعتماد ہے کہ

اتنا کما سکوں گا کہ ہم دونوں کے لئے کافی ہوگا۔"

وہ دونوں اب ہال فارم پہونچ گئے۔ دینا رُکی اور اپنی آہستہ اور نازک آواز سے کہنے لگی۔

"سیٹھ بیڈ۔ میں تمہاری محبت کی بیحد شکر گزار ہوں اور اگر میں کسی آدمی کو اپنے عیسائی بھائی سے زیادہ سمجھ سکتی تو میرے خیال میں وہ یقیناً تم ہی ہوتے۔ لیکن مجھ کو شادی کرنے کی یا دنیا میں گھر بار قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ خدا نے مجھے اپنا کلام سنانے کے لئے مقرر کیا ہے اور وہ میرے کام سے خوش ہے۔"

ہال کے دروازہ ہی پر اُن دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ کیونکہ سیٹھ اندر جانا نہ چاہتا تھا اور اُنہیں پگڈنڈیوں پر سے اور اُنہیں میدانوں اور کھیتوں میں ہوتا ہوا واپس ہوا جن پر سے وہ ابھی گذر چکا تھا۔ گھر پہونچتے پہونچتے دس بج گئے اور جوں ہی اُس نے دروازہ میں قدم رکھا اوزاروں کے کھنکنے کی آواز سُنی۔

"کیوں ماما۔ کیا پاپا اتنی رات گئے ابھی تک کام کر رہے ہیں؟"

"تیرا پاپا نہیں۔ یہ تیرا بھائی ہے۔ وہی تو سب کام کرتا ہی ہے اور کون کرے گا؟"

اُس کی ماں بڑبڑاتی ہی رہی۔ اُس کو بڑبڑانے کا موقع ہی کہاں ملتا تھا۔ بڑے لڑکے کی سنجیدگی اور اس سے بیحد محبت کی وجہ سے زیادہ بول ہی نہ سکتی تھی۔ سیٹھ ہی پر اپنی بوچھار کیا کرتی کیونکہ یہ کبھی اپنی ماں کو کچھ کہتا نہ تھا۔

سیٹھ سُنی اَن سُنی کرکے ذرا پریشان ہوکر کارخانہ میں چلا گیا۔

"ایڈی۔ کیا بات ہے؟ کیا پاپا تابوت بنانا بھول گئے؟"

آدم۔ نہیں بھائی بھولے نہیں وہی پرانا قصہ۔ لیکن آج میں اِسے ختم ہی کر ڈالوں گا (سیٹھ کے چہرے کی طرف دیکھ کر) کیوں تجھے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ تکلیف ہے؟

سیٹھ کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور نظروں سے گہری مایوسی ٹپک رہی تھی۔

"ہاں ایڈی۔ لیکن میری تکلیف کا کوئی علاج نہیں۔ یہ برداشت کرنا ہی پڑے گی.....
اچھا اب میری باری ہے۔ تم جا کر سو رہو۔"

"نہیں بھیا۔ اب میں جم کے بیٹھ گیا ہوں بہتر ہے میں ہی کام کرتا رہوں۔ کل صبح سات بجے تابوت تیار کر کے براکسٹن پہونچا دینا ہے۔ میں تجھے تڑکے پکاروں گا اور پھر ہم تم دونوں چل کے پہونچا آئیں گے۔"

آدم رات بھر کام کرتا رہا۔ اپنے بچپن اور اُس زمانہ کی خوشیاں یاد کرتا رہا اور اس کے بعد پھر تکلیفوں کے دن جب سے اس کا باپ شراب خواری کی لت میں پڑ گیا ہو اور اس کی ماں روتی رہتی ہے۔ اس کو خصوصاً وہ رات بہت یاد آتی رہی جس رات کو خود اُس نے اپنے باپ کو نشہ میں سرشار وحشیوں کے مانند آوارہ دیکھا تھا۔

صبح ہو گئی۔ تڑکے ہی دونوں بھائی لمبے تابوت کو اپنے کاندھوں پر رکھ کر چھ ہی بجے براکسٹن پہونچا آئے اور واپس ہو رہے تھے جب اُس سرسبز میدان میں پہونچے جس میں سے ہو کر چشمہ بہتا تھا کہ سیتھ ایکدم تیز چلنے لگا۔ کہا "ذرا دیکھنا پانی کے کنارے کیا چیز پڑی ہوئی ہے؟"

وہ دونوں دوڑ کر پہونچے۔ ایک لمبے بھاری جسم کو باہر کھینچ کر نکالا۔ اُس لاش کی بے نور کھلی آنکھوں کی طرف سکتے کے عالم میں دیکھتے رہے ـــــ یہ اُن کے باپ کی لاش تھی

ہال فارم۔ سُرخ اینٹوں سے بنا ہوا ایک بہت اچھا پرانا مکان ہے کسی زمانہ میں یہاں ایک لارڈ رہا کرتا تھا۔

یہاں بڑی چہل پہل ہے حالانکہ سال کا یہ کاہل ترین زمانہ ہے یعنی خزاں اور پھر یہ وقت بھی دن کا وہ حصہ جس میں سویا ہی جاتا ہے یعنی اسوقت مسز پوئسر کی خوبصورت ہفت روزہ گھڑی میں ساڑھے تین بجے ہیں۔

مسز پوئسر ایک قبول صورت کی عورت ہے ۳۸ تیس سے زیادہ عمر نہ ہو گی صاف رنگ

ہے، بھورے بال، متناسب اعضا، ہلکی پھلکی ابھی اپنا کروشیا کا کام اُٹھایا ہے۔ قریب ہی
اُس کی بھتیجی دِینا مارِن بیٹھی ہوئی ہے۔ ایک دوسری بیس بھتیجی ہٹی سارل سترہ اٹھارہ برس کی
ایک نہایت خوبصورت لڑکی قریب ہی پنیرخانے میں کام کر رہی ہے۔
مسز پوئسر:۔ دِینا تم جب سے سینے بیٹھتی ہو تو بالکل اپنی خالہ جوڈتھ کی تصویر معلوم ہوتی ہو۔ میں
اُس سے بھی ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ وہ دوسروں کی خاطر برابر ایثار کرتی رہے گی۔ وہ بھی میتھو
ڈیسٹ ہو گئی تھی لیکن وہ تم سے ذرا مختلف تھی۔ ٹوپی بھی تم سے ذرا مختلف قسم کی دیتی تھی تم سے
بھی یہی کہتی ہوں کہ اگر تم یہیں رہو گی تو بہت ممکن ہے کسی اچھے آدمی سے تمہاری شادی
جلد ہو جائے۔ بس تم یہ وعظ وغیرہ کا قصہ چھوڑ دو، دیکھنا کتنے آدمی تیرے لئے تیار ہو جاتے
ہیں۔ اگر تیرا ارادہ سیتھ بیڈ ہی سے شادی کرنے کا ہے تو حالانکہ وہ غریب ہے اور کبھی کچھ
بچا کے نہیں رکھتا پھر بھی تیرا چچا تجھ کو ایک سُور تحفہ میں دیگا اور شاید ایک گائے بھی کیونکہ میرے
عزیز داروں سے وہ بڑی مہربانی سے پیش آتا رہا ہے اور اپنے گھر پر ہر ایک کو خوش آمدید
کہتا ہے۔ تیرے واسطے بھی وہ اتنا ہی کرے گا جتنا ہیسٹی کے لئے حالانکہ وہ اُس کی اپنی
سگی بھتیجی ہے:۔۔۔۔۔۔

ہے سلوپ کے پادری مسٹر اِروِن اور کپتان ڈونی تھارن (جو لارڈ ڈونی تھارن کا
پوتا اور وارث ہے) کی کلفت آمد نے مسز پوئسر کی روانی طبع کو روک دیا۔
"دِینا میں قسم کھا کے کہتی ہوں کہ یہ لوگ تیرے وعظ کے متعلق کہنے آئے ہیں جو کل تو نے
دیا تھا۔ اب تو ہی اُن کو جواب دینا۔ میں کچھ نہ بولوں گی تو نے جو یہ مصیبت ہم لوگوں پر ڈالی
ہے میں اس کے متعلق کافی کہہ چکی ہوں اگر تو خود مسز پوئسر کی اپنی بھتیجی ہوتی تو پھر مجھے کوئی
غم نہ ہوتا۔ وہ جانتے اور اُن کا کام۔ میں بری الذمہ رہتی۔"
لیکن مسٹر اِروِن کو میتھوڈیسٹ کے وعظ پر ناراض ہونے کا خیال تک نہ تھا اور
نوجوان آرتھر ڈونی تھارن محض ہیٹی سارل سے کچھ باتیں کرنے کے خیال میں آیا تھا۔

باتوں باتوں میں پادری نے بیان کیا کہ تھامس بیڈ چشمہ میں ڈوبا مرا ہوا پایا گیا۔ یہ سنتے ہی دینا مارس نے طے کیا کہ اُسے مرحوم کی بیوہ کی تسکین کے لئے فوراً روانہ ہو جانا چاہیئے۔

ہیٹی سارل اپنی جگہ کپتان ڈونی تھارن کی اُن نظروں کے متعلق سوچ رہی تھی جو اُس نے ابھی اُس پر ڈالی تھیں۔ آدم اندر اُس کی تکلیفوں کا خیال کیوں آنے لگا۔ ایک خوبصورت نوجوان کی پسندیدہ تیز نظروں نے بیچاری ہیٹی کے دل کو لرزہ براندام کر دیا۔ حالانکہ اس قسم کی نظروں کی وہ بالکل عادی ہو چکی تھی۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ مسٹر کریگ، لارڈ ڈونی تھارن کا باغبان سرتا پا اُس کے عشق میں چُور ہے۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ آدم بیڈ، راستباز، ہوشیار اور بہادر آدم بیڈ۔ جس کا لوگوں پر اتنا اثر ہے اور جس کے متعلق اس کا چچا ہمیشہ خوش ہو کر کہا کرتا ہے کہ آدم اُن لوگوں سے بدرجہا واقف کار ہے جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ یہ آدم بھی جو اکثر لوگوں سے روکھے پن سے پیش آتا ہے، جو گاؤں کی دوسری چھوکریوں کے پیچھے گھوما نہیں کرتا یہ آدم بھی اُس کی ایک نظر ایک لفظ سے سُرخ و پیلا کیا جا سکتا ہے۔

ہیٹی کو بالکل یقین تھا کہ اُس کا چچا آدم کی ہمت افزائی کرنا چاہتا ہے اور وہ خوش ہو گا اگر وہ اس سے شادی کرلے گی۔ گذشتہ تین سالوں سے جب سے کہ اُس کی نگرانی میں نئے باڑے کا کام ہوا ہے آدم کی ہال فارم پر ہمیشہ خوش آمدید ہوتی رہی ہے اور دو سال سے تو ہیٹی برابر اپنے چچا کو کہتے ہوئے سنتی رہی ہے کہ آدم ممکن ہے ابھی تھوڑا ہی بہت کماتا ہو لیکن کسی دن وہ ضرور امیر کبیر ہو جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ جو عورت اُس سے شادی کرے گی بہت نفع میں رہے گی۔ اور وہ کہا کرتی "یہ سب تو ٹھیک ہے کہ ایک نیا بنا بنایا امیر مل جائے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک بنا بنایا بیوقوف بھی نکلے۔ اور پھر تو یہ کوئی اچھی بات نہ ہو گی کہ جیبیں روپے سے بھری ہوں لیکن جیب میں ایک سوراخ بھی ہو۔ ایک اچھی گاڑی میں بیٹھنا کچھ فائدہ نہیں رکھتا اگر اُس کا چلانے والا بیوقوف ہو۔ تھوڑی دیر میں وہ خندق میں گرا دیگا۔"

چنانچہ ہیٹی نے آدم کی کسی قسم کی ہمت افزائی نہ کی تھی۔ وہ صرف یہ محسوس کرنے ہی میں لطف لیتی تھی کہ ایک مضبوط آدمی اُس کے قبضہ میں ہے۔ رہا شادی کا سوال تو یہ قصہ ہی دوسرا تھا۔ ہیٹی ہمیشہ عیش وعشرت کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر آدم اتنا امیر ہو گیا کہ اُس کی دلی چیزوں کو مہیا کر سکا مثلاً بڑے خوبصورت بالے۔ ناٹنگھم کی لیس۔ ڈرائنگ روم میں بڑے بڑے غالیچے۔ تب وہ اُس کے ساتھ ضرور شادی کرے گی۔

لیکن حال کے چند ہفتوں میں ہیٹی پر ایک نیا اثر پڑ رہا تھا۔ اس کو احساس ہونے لگا تھا کہ مسٹر آرتھر ڈونی تھارن صرف اُس کی ایک جھلک کی خاطر کچھ تکلیفیں برداشت کر لیتا ہے اور پھر دینا بھی بھی اپنے وعظ وغیرہ دینے اور کچھ کام کرنے باہر دوسرے گاؤں میں چلی جاتی ہے

آدم بیڈ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ محبت کی وہ علامتیں جو دراصل دوسروں کے واسطے ہوتیں اپنے لئے سمجھتا رہا۔ ہال فارم کے باغیچہ میں ایک دن صبح آدم ہیٹی کو جب انگور توڑنے میں مدد دے رہا تھا اُس نے خیال کیا کہ آدمی ایک چیز عمر بھر نہیں بھول سکتا اور وہ بات یہ ہے کہ پہلی عورت جس سے وہ محبت شروع کرتا ہے آخر کار وہ دیکھتا ہے کہ وہ عورت خود اُس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ اُس نے بھی محسوس کیا کہ ہیٹی میں ایک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ ابتدائی محبت کی گھبراہٹ اور پریشانی اب ظاہری نمائش سے بہت آگے بڑھ گئی ہے چنانچہ آدم اکثر اس کو عالم محویت میں پاتا اور سمجھتا کہ یہ سب کچھ میرے لئے ہے حالانکہ وہ سب آرتھر ڈونی تھارن کے لئے ہوتا۔

آرتھر کچھ دنوں کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر حاضری اُس کے لئے کوفت کا باعث تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کے کانوں میں محبت کے نغمے سنائے جائیں۔ آدم سے اُس کو کچھ ڈر نہ تھا کہ وہ اُن کو محبت اور تعریفی خوشامدوں سے پریشان کرے گا وہ ہمیشہ اس سے سنجیدگی سے پیش آتا تھا۔ وہ اسی بات کے احساس میں خوش تھی کہ ایسا مضبوط

آدمی اس سے محبت کرتا ہے اور اس سے اتنا قریب ہے آدم ہی سے اُس نے ایک دن
سُنا کہ کپتان ڈونی تھارن دو ایک دن میں واپس ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی وہ آدم پر اور
بھی زیادہ مہربان ہو گئی۔ آدم ہرگز ہرگز ہیٹی سے اپنے عشق کا اظہار ابھی تک نہ کرتا اگر اس
بڑھتی ہوئی مہربانیوں سے بالکل عیاں نہ ہو جاتا کہ دوسری طرف بھی لگی ہوئی ہے۔ آدم نے
باغیچہ سے اُس کے لئے گلاب کا پھول توڑا اور اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے فارم کی طرف
واپس آیا۔ اور جب رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا تو مسٹر پوئسر نے کہا "ہیٹی اگر آدم تیرا شوہر
ہو جائے تو بہت جلد تو اپنی ذاتی گھوڑا گاڑی میں اُڑتی پھرے گی مجھے بالکل یقین ہے"۔
اُس کے چچا نے مگر یہ نہیں دیکھا کہ ہیٹی نے کس طرح منہ بنایا ایک گھوڑا گاڑی میں سوار
ہو کر گھومنا اس کے لئے بڑی ادنیٰ بات تھی۔

اٹھارہ اگست کی تاریخ تھی، آدم فارم پر کام کر کے اپنے گھر واپس جا رہا تھا، سامنے
کوئی بیس گز آگے دو رویہ درختوں کے ختم پر اس کو دو شکلیں دکھائی دیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے
کے مقابل ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے کھڑے تھے، جوں ہی آدم بیڈ کا کتا بھونکا وہ دونوں
ایک دم الگ ہو گئے۔ ایک شکل تو اس کنج کے دوسری طرف روانہ ہو گئی۔ دوسری یعنی آرتھر
ڈونی تھارن نہایت گھبرایا، سراسیمہ، منہ سرخ آدم کی طرف آگیا۔ نوجوان کپتان دو ایک
ہفتے ہوئے اپنی اکیسویں سالگرہ منانے آیا ہوا تھا اور دوسرے ہی دن اپنی رجمنٹ کو واپس
جانے والا تھا۔

ابھی تک ان دونوں جوانوں میں دوستی اور خلوص اور ایک دوسرے سے رفاقت
رہی تھی۔ لیکن آدم اس وقت یہ حالات دیکھ کر نہایت متحیر ہو گیا اور جلد ہی اس کا تحیر غیظ
و غضب میں تبدیل ہو گیا۔
آرتھر نے کوشش کی کہ معاملہ کو ٹال ٹول دیا جائے گا یہ کہہ کر کہ محض اتفاقیہ ہیٹی سے
ملاقات ہو گئی ہے۔ لیکن آدم نے محسوس کیا کہ اس آدمی نے جس پر وہ اعتبار کیا کرتا تھا

اس کے ساتھ نہایت مکاری اور دغابازی کا برتاؤ کیا ہے اس لئے یہ معاملہ یوں رفع دفع نہیں کیا جا سکتا چنانچہ دونوں میں وہیں جنگ ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر میں آدم کے ایک زور دار گھے نے آرتھر کو زمین پر گرا دیا جب آرتھر رخصت ہوا تو اس نے آدم کو یقین دلایا کہ وہ لام پر جا کر ہیٹی کو خط لکھ دے گا کہ اب وہ اُس سے کوئی معاملہ رکھنا نہیں چاہتا۔ نہ کوئی غرض اور آئندہ کے لئے اس سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے گا۔ چنانچہ آرتھر نے جیسا کہا کر دکھایا۔ آدم نے یہ سوچ کر اپنے کو اطمینان دے لیا کہ محض معمولی پسندیدگی شروع ہوئی ہوگی جیسی نوجوانی میں عموماً ہوا کرتی ہے اور اب تو وہ ختم ہی کر دی گئی۔ دن گذرتے گئے لیکن آدم نے محسوس کیا کہ وہ سکون و صبر جس سے وہ ہیٹی کی محبت کا انتظار کرتا رہتا تھا اس رات کے واقعہ کے بعد سے غائب ہو گیا ہے اس کی بجائے اب رقابت کی آگ سلگتی رہتی ہے جس کی وجہ سے اس کا سکون دماغی جاتا رہا۔

ہیٹی کو آرتھر کا خط ملا کچھ دنوں اس پر عجیب مایوسی کا عالم طاری رہا۔ اب اس کی طبیعت میں کچھ کچھ تبدیلی ہو رہی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ میں کیوں نہ آدم سے شادی کر لوں۔ جو کچھ ہوا سو ہوا۔

چنانچہ نومبر میں جب مسٹر برج نے آدم کو اپنے کاروبار میں شرکت کی دعوت دی تو آدم نے نہ صرف یہ کیا کہ اسے خوشی سے قبول کر لیا بلکہ یہ بھی طے کر لیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہیٹی سے شادی کی درخواست کرے چنانچہ اس نے درخواست کی۔ ہیٹی کچھ نہ بولی۔ آدم کا چہرہ لیکن اس کے چہرہ کے بہت قریب رہا بلکہ خود ہیٹی نے اپنے گول گول گال آدم کے گالوں سے ٹکرا دے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کو پیار کیا جائے وہ محسوس کرنا چاہتی تھی گویا آرتھر پھر اس سے قریب ہے۔

آدم۔ تو پھر میں تمہارے چچا اور چچی کو اطلاع کر دوں۔ کیوں نا ہیٹی؟

رات کو جب ڈرائنگ روم میں آگ خوشی خوشی جل رہی تھی اور ہر ایک کے چہرے اس کی روشنی میں سرخ سرخ چمک رہے تھے۔ آدم نے مسٹر اور مسز پوئسر سے کہدیا کہ اب میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک بیوی کا کفیل ہو سکتا ہوں اور ہیٹی میری بیوی بننے کے لئے تیار بھی ہو گئی ہے۔

اس اطلاع کے بعد بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی کہ آدم کا گھر کہاں بنایا جائے آخر کار جب

بہت دیر ہو گئی تو مسٹر پوئسر نے کہا: خیر۔ خیر اس کی کیا ضرورت ہے کہ سب باتیں اسی وقت طے ہو جائیں۔ اور تم ایسٹر سے پہلے تو شادی بھی نہیں کر سکتے ہو۔ حالانکہ میں زیادہ التوا میں رکھنے کا حامی نہیں ہوں پھر بھی تھوڑا بہت انتظام تو کرنا ہی ہے۔ اس کے بعد آدم رخصت ہو گیا۔

یہ نومبر کا زمانہ تھا۔

فروری میں ہیٹی سارل کی زندگی نے المیہ صورت اختیار کر لی۔ اس نے مکان چھوڑ دیا اور ایک دوسرے گاؤں میں جا کر اس کے بچہ پیدا ہوا۔ آرتھر ڈونی تھارن کا بچہ۔ ہیٹی نے اس بچہ کو ایک جنگل میں چھوڑ دیا اور جب اسے لینے واپس ہوئی تو وہ مر چکا تھا۔ پولیس، تحقیقات اور مقدمہ لیکن سزائے موت سے بچ گئی۔ عمر بھر کی جلا وطنی نصیب ہوئی۔ چند سالوں کے بعد اسے معافی مل گئی۔ مگر گھر واپس ہو ہی رہی تھی کہ راستہ میں فوت ہو گئی۔

سنہ ۱۸۰۱ء کی خزاں کا زمانہ ہے۔ دینا مارس ہال فارم پر واپس آئی ہوئی ہے لیکن پھر وہ عنقریب اپنے کام پر اپنے گاؤں جانے والی ہے لیکن مسز پوئسر نے دینا میں ایک نئی بات یہ محسوس کرنا شروع کی ہے کہ وہی دینا جس پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا تھا اب اگر کبھی آدم کہتا ہے کہ دینا اب ہم ہی لوگوں میں ہمیشہ کے لئے بس گئی ہے اب میرے خیال میں اپنے گاؤں جا کر کرے گی بھی کیا۔ تو دینا کے گالوں پر سرخی آ جاتی ہے۔

مسز پوئسر کہتی:۔ تمہارا خیال کیا سب کا یہی خیال ہے جو ذرا بھی سمجھ رکھتا ہے۔ لیکن آدم ایک بات اور بھی ہے۔ کسی میتھوڈیسٹ کی باتیں سمجھنے کے لئے پہلے میتھوڈیسٹ ہونا ضروری ہے اس کے بغیر تم اس کے دل کی بات نہیں جان سکتے

مسٹر پوئسر کہتے۔ کیوں دینا! آخر ہم لوگوں سے کیا خطا ہوئی کہ تم ہم لوگوں کو چھوڑ کر جا رہی ہو یہ تو خلاف وعدہ بات ہے۔ تمہاری خالہ کے تو کبھی دماغ میں بھی نہ آیا تھا کہ تم اس جگہ کو اپنا گھر نہ بناؤ گی۔

دینا اطمینان ظاہر کرتے ہوئے نہیں چچا۔ میں جب پہلے آئی تھی اسی وقت میں نے کہہ دیا تھا کہ میں

تھوڑے ہی دنوں کے لئے آئی ہوں اور اس وقت تک رہوں گی جبتک میں خالہ کی کوئی خدمت کر سکوں۔

مسز پونسر۔ تو بھلا تم سے کس نے کہا کہ تم اب میری خدمت نہیں کر سکتیں۔ اگر تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتی تھیں تو پھر تم آتیں ہی نہ۔ جو چیز ہونی نہیں تو پھر اس کے جانے کا خیال بھی نہیں ہوتا۔

دِینا آدم کے ساتھ روانہ ہو گئی کیونکہ آدم کی ماں کی طبیعت ناساز تھی اور اس نے اسے بلایا بھی تھا۔ راستہ میں آدم نے پھر ذکر چھیڑا "دِینا اگر خدا کہیں ایسا کرتا کہ تم کو ہماری بہن بناتا اور تم ہمارے ہی درمیان رہتیں تو میں کتنا خوش ہوتا!" دینا نے کچھ جواب نہ دیا اور دونوں چلتے رہے جب دونوں گھر کے قریب پہونچے تو آدم نے اوپر آنکھ اٹھائی دیکھا اس کا چہرہ تمامتر سرخ ہو رہا ہے گویا وہ کسی جذبہ کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اسے بڑا تعجب ہوا اور بولا۔ مجھے خیال نہیں کہ میں نے کوئی ایسی بات کہی جس سے تمہیں تکلیف ہوئی شاید میں نے بہت زیادہ آزادی برتی۔ میں تمہاری کسی بات کے خلاف نہیں جانا چاہتا تم اپنے لئے جو بہتر سمجھتی ہو وہی بہتر ہے۔ اگر میری بات سے رنج پہونچا ہو تو میں تم سے تیس چالیس میل دور رہا کرونگا بے چارہ آدم! سیدھے آدمی اسی قسم کی غلطیاں کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

اتوار کی صبح کو آدم کی ماں نے آنکھ کھولی۔ آدم قریب بیٹھا ہوا اپنی تصویروں دار انجیل پڑھ رہا تھا۔ اس کی ماں نے دِینا کی باتیں کرنا شروع کیں کہ کس طرح وہ اپنے گاؤں واپس جا رہی ہے حالانکہ وہ ہم لوگوں کے درمیان بھی رہ سکتی تھی۔ آدم نے اکتا کر کہا کہ بس اماں اس کا خیال دل سے نکالدو۔ وہ رک نہیں سکتی تو جانے دو اور اسے بھول بھی جاؤ ابھی تمہاری طبیعت اچھی بھی نہیں ہے۔

ماں۔ "نہیں میں اسے بھلا نہیں سکتی۔ میں تو سمجھتی ہوں وہ تیرے ہی لئے بنائی گئی ہے۔ مجھے اس یقین سے کوئی بات ہٹا نہیں سکتی کہ خدا نے اسے صرف تیرے لئے بنایا ہے اور ہمارے گاؤں میں سے صرف تیرے ہی لئے بھیجا ہے۔ اگر وہ میتھوڈیسٹ ہے تو کیا ہرج ہے۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گی۔

آدم کرسی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ سمجھ گیا کہ اس کی ماں کا اصلی مقصد کیا تھا۔ چنانچہ اس نے پھر کوشش کی کہ اپنی ماں کے دماغ سے دینا کا خیال نکالدے، لیکن اس کی ماں بھلا کیسے نکال سکتی

تھی بلکہ اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ دِینا کو خود تجھ سے محبت ہے اس بات نے آدم پر بہت اثر کیا اور اس نے طے کر لیا کہ اسے دِینا کے پاس جانا چاہیئے۔ اس نئے خیال نے اور تمام خیالوں کو برطرف کر دیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ واقعی اس میں صداقت ہے یا نہیں۔ اس نے سیتھ سے اس کا تذکرہ کیا۔ اس نے کہا میں نے تو مدت ہوئی اس سے شادی کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ بلکہ میں تو خوش ہوں گا اگر وہ تیری بیوی ہو جائے گی لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ شادی کے لئے تیار بھی ہو۔ پھر بھی پوچھ لو جب میں نے پوچھا تھا تو اس نے کچھ بھی بُرا نہ مانا تھا۔ اور تیرا تو مجھ سے زیادہ حق ہے"

چنانچہ آدم نے آخر کار دِینا سے جا کر پوچھ ہی لیا۔ دِینا نے کہا کہ میرا دل تو تمہاری طرف بہت راغب ہے لیکن جب تک خدا کی طرف سے بھی اس امر کی ہدایت مجھے نہ ہو اس وقت تک میں کوئی جواب نہیں دے سکتی ابھی انتظار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ ہال فارم چھوڑ کر اپنے گاؤں چلی گئی۔

آدم انتظار کرتا رہا کئی ہفتے گذر گئے آخر کار وہ اس کا جواب لینے دِینا کے گاؤں گیا۔

تھوڑی دیر وہ دونوں ٹہلتے رہے دِینا جواب میں کہنے لگی "آدم خدا کی مرضی یہی ہے۔ میری روح تیری روح میں اس قدر ضم ہو گئی ہے کہ تیرے بغیر میں صرف آدھی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ اس وقت تم میرے قریب ہو تو میں ایسا محسوس کر رہی ہوں گویا خدا کی مرضی اور اس کے احکامات کی بجا آوری کے لئے مجھ میں دوگنی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بات مجھ میں پہلے کبھی نہ آتی تھی"

"اچھا دِینا، تو پھر ہم دونوں اب کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ جب تک موت ہم کو جدا نہ کر دے"

گہری خوشی کے ساتھ ان دونوں نے ایک دوسرے کو پیار کر لیا۔

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

نظم اُردو۔ ازحکیم ابو العلا صاحب ناطق۔ صدیق بکڈپو، امین آباد پارک لکھنؤ، قیمت عـہ٫

ناطق صاحب نے اردو نظم و نثر کی تاریخ کو ۹۵ بندوں میں نظم کیا ہے۔ ناطق صاحب پُرانے شاعر ہیں لکھنؤ میں مقیم ہو جانے کے باعث زبان پر قدرت حاصل کر لی ہے۔ اس نظم میں دو چار ایسے مواقع آئے ہیں جہاں انھیں اپنے فنی کمال دکھانے کا موقع ملا ہے۔ پھر بھی نظم اپنے مخصوص موضوع کے باعث میٹھی نہیں ہو سکی ہے لیکن ناطق صاحب نے جو حاشیے لکھے ہیں وہ البتہ بڑی کاوش اور بڑی محنت سے ترتیب دئے ہیں۔ تمام پرانے نثّار اور شاعروں کی نثر اور نظم کے نمونے حاشیہ پر معہ تاریخ درج کر دئے ہیں۔ ان کے مختصر حالات بھی ہیں۔ یہ چیز ایسی ہے جو اردو داں طبقہ کے لئے عموماً اور طلبا کے لئے خصوصاً بہت مفید ہو سکتی ہے۔ امید ہے کہ ناطق صاحب کی اس محنت کی ضرور قدر کی جائے گی۔

سفرنامہ حکیم ناصر خسرو۔ مترجمہ ثروت اللہ صاحب کرمانی۔ ملنے کا پتہ: اشراف محلہ سندیلہ ضلع ہردوئی و مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ قیمت عـ٫

یہ سفرنامہ دراصل حکیم ناصر خسرو کی کتاب زاد المسافرین کا ترجمہ ہے۔ یہ سفر انھوں نے ۴۳۷ھ لغایۃ ۴۴۴ھ میں اختیار کئے تھے۔ شروع میں جناب چودھری محب اللہ صاحب کا تبصرہ ہے جس میں انھوں نے حکیم ناصر خسرو کی دیگر تصانیف پر بھی نظر ڈالی ہے اور زاد المسافرین کا ہلکا سا جائزہ لیا ہے اور حکیم ناصر خسرو کی تفصیلات پر دیگر سفرناموں سے کچھ اضافہ کیا ہے۔ دیباچہ میں مترجم نے انھیں مقامات کے سفر کا زمانہ حال کی آسانیوں سے مقابلہ کیا ہے جن مقامات کا حکیم ناصر نے سفر کیا تھا

ترجمہ بھی صحیح اور با محاورہ ہے۔

خاتم النبیین و آموزش اسلام :۔ جلد اول۔ از عباس شوستری صاحب۔ پروفیسر فارسی میسور یونیورسٹی
صفحات ۴۷۷، قیمت درج نہیں

مصنف نے یہ کتاب موجودہ فارسی زبان میں پیغمبر اسلام کی زندگی اور ان کے پیغام پر لکھی ہے۔ عباس صاحب لائٹ آف ایشیا کا بھی ترجمہ کر چکے ہیں اور اسی پر انھیں خیال ہوا کہ ایسی ہی کتاب پیغمبر اسلام کے متعلق بھی ہونی چاہیے۔ پیغمبر صلعم کی زندگی کے تمام واقعات قرآن کی روشنی میں پیش کئے ہیں۔ اور کوشش یہ کی ہے کہ یہ کتاب صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے یکساں دلچسپی کا باعث ہو سکے۔ عباس صاحب لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے اس مبارک کام کو سرانجام دیا اور بوجہ احسن انجام دیا۔

جنگ آلودہ دنیا :۔ وینکٹیش نارائن صاحب تیواری انڈین پریس الہ آباد صفحات ۶۰ قیمت درج نہیں

موجودہ جنگ نے یورپ کے نقشہ میں جو تبدیلیاں کر دی ہیں اور جن ممالک پر موجودہ اثر ہو رہا ہے ان ممالک کے تمام نقشے معہ مختصر حالات کے جمع کر دیے گئے ہیں آخر میں بہت مفید ضمیمے شامل کر دیے گئے ہیں۔ تقریباً اہم نقشے معہ چارٹوں کے ہیں۔ جنگ کے حالات سمجھنے میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

تذکرہ بے نظیر :۔ مؤلفہ سید عبدالوہاب افتخار۔ مرتبہ سید منظور علی ایم۔ اے۔ کتابستان الہ آباد قیمت عہ

سید منظور علی صاحب ریسرچ اسکالر نے ۳۶-۱۹۳۵ء میں عبدالوہاب افتخار کے تذکرہ بے نظیر کو ترتیب دیا تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ فارسی و عربی نے اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ میر عبدالوہاب بارہویں صدی ہجری میں دکن میں فارسی کے ایک معروف شاعر تھے۔

سنہ ۱۱۶۳ھ میں میر غلام علی آزاد بلگرامی کے وسیلے سے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ تذکرہ سنہ ۱۱۷۲ھ میں ترتیب دیا گیا۔ یہ تذکرہ دراصل ان ایرانی اور ہندی فارسی شاعروں کا ہے جو بارہویں صدی کے شروع کے ۲۷ سالوں میں مشہور و معروف تھے۔ تذکرہ قدیم طرز کی فارسی زبان میں ہے۔ ہندی شعرا میں بعض وہ بھی ہیں جو اردو کے بھی معروف شاعر رہ چکے ہیں۔ مثلاً قزلباش خاں امید، سراج الدین علی خاں آرزو، مظہر جان جاناں وغیرہ

شروع میں منظور علی صاحب کا لکھا ہوا ایک دیباچہ انگریزی میں ہے۔ مؤلف کے حالات اور اس کے اسلوب پر اس سے بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

نقشہ جات

لڑائی کا نقشہ (یورپ و دنیا) اور سنہ ۴۰ء کے میدان جنگ کا نقشہ:۔

یہ دونوں نقشے یو۔ پی کے محکمہ توسیع تعلیم کی طرف سے اردو میں شائع کئے گئے ہیں۔ جنگ کے موجودہ حالات کو سمجھنے کے لئے یہ نقشے بہت مفید ہوں گے۔ نقشے صاف اور اچھے بنے ہیں۔ پہلے نقشہ میں البتہ دریا ضرورت سے زیادہ دیدیئے گئے ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔ بہار گوا اسکول بکڈپو امین آباد پارک لکھنؤ سے مل سکتے ہیں۔

رسالۂ تاریخ:۔ مرتبہ حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری، دفتر تاریخ حیدرآباد دکن صفحات ۱۸۴، چندہ سالانہ درج نہیں

نواب لطف الدولہ اورنیٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے حکیم شمس اللہ صاحب قادری کی زیر نگرانی میں یہ سہ ماہی رسالہ نکل رہا ہے۔ زیر نظر نمبر میں پونا آلی کا قطب شاہی کتبہ، بیدر کے گنج دروازے کا منظوم کتبہ شہنشاہ بابر کے سکے، شیخ شہاب الدین سہروردی، سلاطین کلوہ، مہم ارکاٹ وغیرہ مضامین ہیں۔ جن میں آخری تین بڑے پر مغز اور تحقیقی مقالے ہیں۔ حکیم صاحب خود تاریخ و آثار قدیمہ پر بہت کام کر چکے اور کر رہے ہیں۔ تاریخ سے ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے یہ رسالہ بہت ضروری ہے۔

شذرات

مولانا احسن مارہروی کی وفات حسرت آیات نے اُردو کے شاعروں میں ایک اور کمی کردی مولانا احسن پرانے طرز کی شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے۔

داغ کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ مدتوں ان کے ساتھ رہے اور بہت کچھ کسب فیض کیا۔ خود مولانا کو تصنیف و تالیف سے بڑی دلچسپی تھی۔ کلیات ولی، تاریخ نثر اُردو وغیرہ ان کے مشہور کارنامے ہیں۔ خود ان کا کلام احسن الکلام کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ کتب بینی کا بہت زیادہ شوق تھا۔ مارہرہ میں خود انھوں نے اپنی لائبریری قائم کی تھی۔ باوجود ساٹھ کے اوپر ہو جانے کے، شوق کے باعث بہت زیادہ محنت کیا کرتے تھے۔ کوئی رسالہ ایسا نہیں جس میں ان کا کلام شائع نہ ہو چکا ہو۔ تندرستی بہت اچھی تھی۔ چند دنوں سے پیٹھ پر پھوڑا نکل آیا تھا جو آخر کار مہلک ثابت ہوا۔ ایسے اولوالعزم اور انتھک کام کرنے والے ادیب اردو کو مشکل سے نصیب ہوتے ہیں۔

اس ماہ میں یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ پروفیسر رضی الدین صاحب صدیقی کو نوبل پرائز ملا۔ پروفیسر صاحب آئن سٹائن کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں اور نظریہ کوانٹم پر موصوف نے کافی کام کیا ہے۔ یہ انعام انہی خدمات کا اعتراف ہے۔ جن لوگوں کو یہ انعام مل چکا ہے ان میں غالباً موصوف ہی سب سے کم عمر ہیں۔

اس شمارے سے ہم مشہور انگریزی ناولوں کا اختصار افسانے کی شکل میں پیش کر رہے ہیں اگر ہمارے ناظرین نے پسند کیا تو اس سلسلہ کو آئندہ بھی جاری رکھا جائے گا۔

اسلام ہیگل کی نظر میں

جرمنی کے مشہور و معروف مفکر ہیگل ۱۷۷۰ء۔ ۱۸۳۱ء نے فلسفہ تاریخ پر خطبات کا ایک سلسلہ تیار کیا تھا جو اس کے نظام فکر یہ کے لئے ایک عام فہم دیباچے کا کام دیتا ہے ہیگل کا سمجھنا دشوار اور اس کا صحیح سمجھنا دشوار تر ہے مگر ان خطبات میں اس کے مابعد الطبیات کے اصول ایک تاریخی اور سماجی ماحول میں اور مادی صورت میں روشن ہو جاتے ہیں ہیگل مسلہ وحدت الوجود کا قائل ہے اور اس کی نگہ میں نسل انسانی اخلاقی اور روحانی لحاظ سے اس ارتقائی شاہراہ پر گامزن ہے جس کا مقصود عقلِ کل کو پالینا ہے۔ اس شاہراہ پر کئی ایک منزلیں، کئی ایک قیام گاہیں رہی ہیں۔ جن میں سے مختلف اقوام عالم مختلف زمانوں اور ملکوں میں گذر چکی ہیں۔ اس کے خیال میں تاریخ کے تہذیب ساز عمل کا اصل مقصود ذہنی آزادی حاصل کرنا ہے اس لحاظ سے اس نے تاریخ عالم کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے سب سے پہلے دنیائے مشرق آتی ہے جس میں چین، ایران اور ہندوستان شامل ہیں۔ ان مذہبی تمدنوں میں عین حقیقت کو سمجھنے اور پالینے کے لئے انسان کو صور مادیہ کی ضرورت پڑی۔ اس کے بعد عالم یونان اور عالم روما آتا ہے۔ سب سے آخری لیکن سب سے اہم عالم المانوی ہے۔ اس دنیا کی سپرٹ نئی دنیا کی سپرٹ ہے۔ اس دنیا میں انسان اصل حقیقت کی جستجو کے ہزاروں سالہ مجاہدے کو کامیاب طور پر ختم کر دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پہلے دوروں میں نامکمل انسانیت خود ایک غلام ہے اس کے ہاتھ اور پاؤں پر روایتی عقائد، سماجی بندھنوں کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں سماجی زندگی کا منتہائے اعلیٰ انہی بندھنوں سے رہائی پانا ہے اور ذہنی آزادی کے معراج کو حاصل کر لینا ہے۔ انسانیت کا اصل مقصد اپنی حقیقت کو پالینا ہے اس دور میں روح کی مکمل نشو و نما ممکنات میں سے نظر آتی ہے۔ روح انسانی جس کی فطرت ہی آزاد واقع ہوئی ہے خارجی اور داخلی لحاظ سے اپنے

قید و بند کی کڑیوں کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالتی ہے۔ خارجی آزادی سے یہ مراد ہے کہ انسان ایسے خارجی قوانین اور اصولوں کا پابند ہو جن کو وہ دل سے خود بھی تسلیم کرتا ہو۔ اور داخلی آزادی سے مراد نفسانی خواہشات اور بہیمانہ جذبات سے مبرا ہو جانا ہے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہیگل نے باوجود اپنی عیسائی تربیت اور مذہبی اثر کے اسلام کی ان شاندار خدمات کا اعتراف کیا ہے جو نظام اسلامی نے نسل انسانی کو ان ارتقائی مدارج کے طے کرنے کے سلسلے میں کی ہیں۔ عالم المانوی پر لکھتے ہوئے وہ اپنی بحث کا آغاز ان ٹیوٹن نسل کے گروہوں اور جرمنی کے وحشی قبائل سے کرتا ہے جنھوں نے پہلے پہل عیسائیت کو قبول کیا یہ روح انسانی کے لئے ایک لازمی قسم کا تطہیری دور تھا۔ اس دور میں روح عین جو کل کائنات میں جاری و ساری ہے (مادّی) صورت میں تکمیل پا رہی تھی انسان ابھی اس قابل نہ ہوا تھا کہ اصل حقیقت کو اس کی تجریدی حالت میں بغیر کسی تشبیہ اور استعارے کے، بغیر کسی بت اور اصنام کے معلوم کرے۔ لیکن اسی زمانے کے قریب دنیائے مشرق میں اخلاقی اور سماجی لحاظ سے ایک نیا انقلاب آجاتا ہے۔ یہ انقلاب ہے طلوع اسلام۔ اس انقلاب کی رو میں بہہ کر انسانی دنیا قرنوں او صدیوں کی ارتقائی منزلیں سالوں اور مہینوں میں طے کر لیتی ہے عقل کے بادیا قاصد منطق کی بھول بھلیوں میں رہ جاتے ہیں۔ اور عشق کی مشعل سے اس کے خرمن عقل پر ایک چنگاری پڑتی ہے جس سے کہ اصل حقیقت جگمگا اٹھتی ہے حقیقت پا لینے کا یہ عمل ایک بجلی کی طرح انسانی ذہن پر چمک جاتا ہے اور اس حقیر بے مایہ ہستی کو جو ہزاروں سال تک عین حقیقت پا لینے کے لئے کبھی پتھروں کی محتاج رہی۔ کبھی فطرت کے منظروں کی۔ اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ عین ذات بہ تجریدی صورت میں نگاہ بھر کے دیکھ لے۔ ہیگل کے خیال میں انسانی روح کا کمال یہی ہے۔ اسی مذہبی اور سماجی عمل کی کیفیت جس کی امداد سے یہ معجزہ رونما ہوا ہیگل کے الفاظ میں سنئے]

ایک طرف یورپ اپنی تعمیر نو کر رہا تھا۔ قومیں اپنی بیخ و بن استوار کر رہی تھیں تاکہ آزاد حقائق کی ایک ایسی دنیا پیدا کریں جس کی وسعتیں اور جس کی ترقی ہر طرف ظہور پذیر ہو۔ ہم نے دیکھا کہ انھوں نے اپنے کام کی ابتدا اس طرح کی کہ تمام سماجی تعلقات کو تخصیص[1] کا رنگ دیدیا اور تخصیص بھی اس طور پر کہ اپنے کند اور تنگ ذہنوں سے ان باتوں کو جو فطرتاً عام اور حسب معمول ہیں اس طرح خرد برد کر ڈالا کہ وہ قدرتی کلیئے محض اتفاقی اور ناگہانی امور کا مجموعہ ہو کر رہ گئے جن کو ایک سادہ سے اصول اور سادہ قانون کی شکل میں ہونا چاہئیے تھا۔ رسوم کا ایک پیچیدہ اور الجھا ہوا جال بنا کر رکھدیا مختصراً یہ کہ جب مغرب اپنے کو اتفاق پیچیدگی اور تخصیص کی سیاسی عمارتوں میں بناو گزیں کر رہا تھا روحانی تجلی کا تناسب قائم رہنے کے باعث دنیا میں دوسری جگہ اس کے بالکل متضاد اصولوں کا ظہور ہونے لگا۔ یہ چیز مشرق میں انقلابی شان سے ظاہر ہوئی جس نے تمام تخصیص اور انحصار کے خرخشوں کو تباہ و برباد کر دیا اور طبع اور روح کا تنقیہ کر کے انھیں تمام تر پاک و صاف کر دیا محض مجرد ذات وحدہٗ کو اپنی توجہ و عبادت کا مرکز بنایا اور اسی قدر خالص داخلی عرفان —— یعنی اسی مجرد ذات وحدہٗ کے عرفان — کو حقیقت کا واحد مقصد گردانا یعنی اس ذات غیر مشروط کو شرط حیات قرار دیا۔

ہم مشرقی اصولوں کی ماہیت سے آگاہ ہو چکے ہیں[2] اور دیکھ چکے ہیں کہ وہاں کی ذات اعلیٰ محض منفی حیثیت رکھتی ہے یعنی اس کے نزدیک مثبتی حیثیت رکھنا محض مایا میں اپنے کو مبتلا کر دینا ہے اور روح کو مادی حقیقتوں کا غلام بنا دینا ہے۔ صرف یہودیوں میں ہم نے دیکھا تھا کہ مجرد وحدانیت کا اصول ان کے یہاں تفکر کی بلندیوں پر لے جایا گیا تھا۔ کیونکہ صرف وہی لوگ ذات وحدہٗ کا اعتقاد رکھتے تھے اور ان کا ذات وحدہٗ کا نظریہ تخیل کی صورت میں تھا یہ وحدانیت کا تصور اس وقت بھی قائم رہا جبکہ روحانی پاکیزگی کے لئے مجرد روح کے تصور کا مسئلہ طے سمجھ لیا گیا لیکن اس کو ابھی اس تخصیص سے آزاد ہونا تھا جو یہوداکی پرستش میں سدِ راہ ہوتی تھی۔ یہودا صرف

---

[1] Particularity یہاں بندوں سے مطلب ہے۔

اسی قوم کا خدا تھا[1]۔ ابراہیم کا، اسحٰق کا، یعقوب کا، صرف یہودیوں سے گویا اس خدا نے سمجھوتہ کر لیا تھا اس تعلقات کی تخصیص کو اسلام نے فنا کر دیا۔ روح کی اس عالمگیری میں تصور کی اس محدود و غیر معین سادگی اور پاکیزگی میں فرد انسانی کے لئے کسی اور مقصد کی ضرورت نہیں سوائے اس کے وہ اس عالمگیری سادگی کو حاصل کرے اللہ یہودیوں کے خدا کی طرح ایجابی اور محدود مقصد نہیں رکھتا اسلام کا مقصد اور واحد مقصد محض ایک ذات وحدہٗ کی پرستش ہے۔ آدمی کی داخلیت (روح) کے لئے صرف یہی ایک کام ہے کہ وہ اسی ذات وحدہٗ کی پرستش میں منہمک ہو جائے۔ اور تمام خارجی موجودات کو اسی ذات وحدہٗ کا مطیع بنائے۔ یہ ذات وحدہ دراصل روح کی خصوصیت رکھتی ہے لیکن چونکہ انسان کی داخلیت (روح) خارجی اشیا میں ملوث ہو جاتی ہے۔ یہ ذات وحدہٗ اس لوث سے منزہ رہتی ہے۔ اس طرح سے داخلیت ایک طرف تو بالکل روحانی طور پر آزاد نہیں ہو پاتی دوسری طرف اس کی عبادت کا مرکز مادی بھی نہیں ہونے پاتا لیکن اسلام ہندوانہ نہیں ہے نہ راہبانہ طور پر واجب الوجود میں گم ہو جانا۔ یہاں داخلیت زندہ اور غیر محدود ہے۔ یعنی یہاں داخلیت وہ قوت ہوتی ہے جو دنیاوی زندگی میں محض منفی مقاصد کے ساتھ داخل ہوتی ہے اور دنیاوی معاملات میں اپنے کو محض اس طرح سے مشغول کرتی ہے اور ان میں اس طرح مداخلت کرتی ہے جس سے ذات وحدہٗ کی خالص تحریم و تکریم میں ترقی ہو۔ اسلامی عبادت کا مرکز تمام تر عقلی ہوتا ہے۔ کوئی بت یا خدا کی کسی قسم کی صورت و شکل نہیں پیش کی جاتی محمدؐ پیغمبر مانے جاتے ہیں لیکن پھر بھی انسان یعنی انسانی کمزوریوں سے بالا نہیں؟ اسلام کے خصائص میں یہ بات جاری و ساری ہے کہ عالم موجودات میں کوئی چیز مقرر اور مستحکم نہیں ہو سکتی ہر چیز کی قسمت میں ہے کہ اپنے کو حرکت دے۔ زندہ بنے اور دنیا کی بے انتہا وسعتوں میں اتنی پھیل جائے کہ وہ تمام کُل سوائے اس ذات وحدہٗ کے علاقہ کے کسی اور صورت سے ایکھی نہ جا سکے یہ متحرک قوت اپنی وسعت میں قوم اور ذات پات کے تمام امتیازات کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ نسلی

---

[1] یہودیوں کا اللہ۔

سیاسی، موروثی یا ملکی کسی قسم کے حقوق تسلیم نہیں کئے جاتے۔ صرف انسان رہ جاتا ہے اور وہ بھی مومن انسان ۔ذات وحدہٗ کی عبادت و تعظیم کرنا، اسی میں ایمان رکھنا، روزے رکھنا تاکہ خصوصیت کا جذبہ اور دنیاوی علائق کی وجہ سے ذات نامحدود سے علیحدگی کا جو احساس ہو جاتا ہے وہ دور ہو جائے زکوٰۃ دینا یعنی مخصوص ذاتی ملکیت کے احساس سے نجات پانا، یہ اسلام کے احکامات کا نچوڑ ہیں اور ان سب میں ارفع حکم مذہب کی خاطر شہید ہو جانا ہے اسلام میں وہ شخص جو میدان جنگ میں ایمان کی خاطر شہید ہو جنت اس کے لئے یقینی ہے۔

مذہب اسلام عربوں میں شروع ہوا۔ ان کے وہاں روح اپنی سادہ ترین صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور ذاتِ بے صورت کا احساس وہاں اپنی خاص منزل رکھتا ہے کیونکہ ان کے ریگستانوں میں کوئی چیز مستحکم اور مضبوط صورت و شکل میں نہیں لائی جا سکتی۔ مسلمانوں کا سنہ محمدؐ کی ہجرت سے ۶۲۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ خود آپ کی زندگی میں آپ کے زیر قیادت لیکن آپ کے بعد خاص کر آپ کے خلفاء کی سیادت میں عربوں نے عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ پہلے انھوں نے شام پر حملہ کیا اور اس کے دار السلطنت دمشق کو ۶۳۴ء میں فتح کر لیا۔ اس کے بعد فرات و دجلہ کو عبور کر کے اہل فارس سے نبرد آزما ہوئے اور بہت جلد تمام فارس کو زیر کر لیا۔ مغرب میں انھوں نے مصر، شمالی افریقہ اور اسپین فتح کیا اور جنوبی فرانس میں بھی لوائر تک بڑھتے چلے گئے جہاں طورس کے مقام میں چارلس مارٹل انھیں روک سکا۔ مغرب میں تو یہاں تک پھیلے مشرق میں انھوں نے یکے بعد دیگرے فارس، سمرقند اور ایشیائے کوچک کے جنوب مغربی حصے کو فتح کر لیا۔ اور یہ تمام فتوحات اور ساتھ ہی ان کے مذہب کی تبلیغ غیر معمولی تیزی کے ساتھ ہوئی۔ جو کوئی اسلام لے آتا تھا وہ تمام مسلمانوں کے بالکل برابر ہو جاتا۔ جو اس سے انکار کرتے وہ شروع میں تو قتل کر دئے جاتے ؟ لیکن رفتہ رفتہ اہل عرب مفتوحین سے رحمدلی کا برتاؤ کرنے لگے اب اگر مفتوحین اسلام قبول کرنے میں معذرت کرتے تو ان سے صرف سالانہ جزیہ (ایک قسم کا ٹیکس) لیا جاتا اور وہ شہر جو جلد اطاعت قبول کر لیتے ان سے ان کی ملکیت کا صرف ۱/۱۰ لیا جاتا اور جو نبرد آزمائی کے بعد مفتوح

ہوتے ان سے لڑ۔

مسلمانوں کے دماغ میں تجریدیہ جاری وساری ہوگئی تھی۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ ایک مجرد عبادت جاری کر دیں۔ اور وہ اس مقصد کو پورا کرنے میں بہت جوش وخروش سے مصروف ہوگئے اس جوش وخروش کو ہم تعصب یعنی کسی مجرد چیز کے لئے شدت کہہ سکتے ہیں۔ ایسے مجرد خیال کیلئے جو موجودات کے نظام کے حق میں باطل شکن حیثیت رکھتا ہے۔ تعصب کی روح یہی ہے کہ مادی اشیا کے حق میں تباہ کن و برباد کن حیثیت رکھے لیکن اسلام کا تعصب اس کے ساتھ ساتھ نہایت ارفع واعلیٰ منزلوں پر بھی پہونچا دینے والا تھا۔ ایسی رفعت وبلندی تک جو معمولی اغراض سے بلند ہوتی اور فیاضی اور بہادری کے ضمن میں جتنی خوبیاں آتی ہیں ان سب کی حامل ہوتی

لیکن اصل زندگی تمام

مادی ہوتی ہے اور خاص مقاصد کا پابند بنا دیتی ہے۔ فتوحات حکومت و دولت کرتی ہیں موروثی خاندانوں کو شاہی سپرد کراتی ہیں اور افراد کو متحد کرا دیتی ہیں۔ لیکن یہ تمام طاقت کی عمارتیں ریت پر اپنی بیخ و بن رکھتی ہیں۔ یہ آج ہیں کل نہیں۔ ایک مسلمان چاہے جتنا شوق ودلچسپی اس سماجی تار و پود میں کیوں نہ ظاہر کرے دراصل اس کا دل ان چیزوں سے بے نیاز ہوتا ہے وہ محض اپنی قسمت کے جھگڑے میں دوڑتا رہتا ہے۔ اسلام نے اپنی وسعت کے زمانہ میں بہت سی سلطنتوں اور حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں اس بیکراں سمندر پر ہمیشہ موجیں آگے بڑھتی رہتی ہیں مستقل قیام کسی کو نہیں۔ جو کچھ یکجا کر ایک صورت شکل اختیار کر لیتا ہے اپنی چمک دکھلاتا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ وہ غائب ہو جاتا ہے۔ اُن حکومتوں میں بنیادی مضبوطی نہ تھی۔ حکومتیں اسی لئے ختم ہوگئیں اور وہ افراد جن سے وہ بنی تھیں گذر گئے جہاں کہیں ایک پاک روح اپنا امتیاز ظاہر کرتی ہے۔ بحر مواج میں ایک بڑی اونچی لہر کی طرح — وہ آزادی کی شان وشوکت کے ساتھ اپنی تجلی دکھاتی ہے۔ اس طرح کہ اس سے بڑھ کر اچھی، اس سے بڑھکر وسیع القلب اس سے بڑھ کر جری، اس سے بڑھکر مستعد کبھی دیکھی نہیں جاتی جب کسی خاص مقصد کا ارادہ وہ فرد کر لیتا ہے اس کو تمام تر اور کلیتہً اپنی روح کی تمام قوتوں سے وابستہ کر لیتا ہے۔ زندگی تو تعلقات اور اشکال کے بے شمار

بندھنوں میں پھنسے رہتے ہیں گویا کہ ہر فرد ان تعلقات و اشکال کا ایک با، ہوتا ہے لیکن اسلام میں فرد صرف ایک جذبہ اور اسی جذبہ کا حامل ہوتا ہے۔ اگر ظلم کرے گا تو بے انتہا ظالم، بہادر ہوگا تو بے انتہا بہادر، چالاک ہوگا تو بالکل مجسمہ اور فیاض ہوگا تو فیاضی کا سرچشمہ۔ جہاں کہیں محبت ہوگی وہاں بے خودی اور سرفروشانہ جذبہ کے ساتھ (جو محبت کی شدید ترین صورت ہوتی ہے) اگر کوئی بادشاہ اپنے غلام سے محبت کرتا ہے تو وہ اپنے محبوب کے قدموں پر اپنی تمام شان، اپنی تمام شوکت اور طاقت تاج و تخت سے بالکل بے پروا ہو کر نچھاور کر دے گا لیکن اگر اس سے نفرت ہو گئی تو اس کو تباہ بھی اسی شدت سے کرے گا۔ یہ بے پناہ شدت عربوں اور شرقیین کی گرم دہکتی ہوئی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں یہ گرمی اور روشنی دراصل تخیل کی بیباکانہ آزادی کی باعث ہوتی ہے۔ یہ تخیل اپنے مطلوب کی زندگی میں مدغم ہو جاتی ہے اور پھر اس سے اصلی جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خودی اور خودداری کو کلیۃً فنا کر دیا گیا ہے۔

جس تیزی سے عربوں کی فتوحات ہوئیں اسی تیزی سے علوم و فنون بھی اپنے معراج کمال پر پہنچ گئے۔ پہلے تو ہم ان فاتحین کو علوم و فنون کی قسم کی ہر چیز تباہ و برباد کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ عمرؓ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اسکندریہ کی بڑی لائبریری تباہ کرا دی[1] یہ کہکر کہ ان کتابوں میں یا تو وہی تمام باتیں ہیں جو قرآن میں ہیں یا اس کے علاوہ باتیں ہوں گی۔ دونوں صورتوں میں یہ بربادی کی مستحق ہیں" لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد عربوں نے ہر جگہ علوم و فنون کو شد و مد سے ترقی دینی شروع کی اور جہاں کہیں گئے انہیں لے گئے۔ ان کی حکومتیں خلیفہ منصور اور خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں اپنی معراج پر تھیں سلطنت میں جگہ جگہ پر بڑے بڑے شہر پیدا ہو رہے تھے جہاں تجارت، صنعت و حرفت ترقی کر رہی تھی۔ شاندار محلات اور مدرسے بنوائے گئے۔ تمام اقلیم کے ارباب علم خلیفہ کے دربار میں مجتمع تھے۔ ایسا دربار جو صرف ظاہری شان و شوکت، انمول جواہرات، اعلیٰ فرنیچر اور عالیشان محلوں سے مزین نہ تھا۔ بلکہ شاعری اور علم کے چراغاں سے بھی روشن تھا۔ شروع کے خلفاء نے تو ریگستان کے عربوں کی شہرۂ آفاق سادگی تمام و کمال قائم رکھی (خلیفہ ابوبکرؓ اس معاملہ میں خاص مشہور رہیں) جن کے آگے منصب، جاہ و ثروت کسی قسم کا

---

[1] عیسائی مورخوں کا یہ بہتان اب غلط ثابت کر دیا گیا ہے۔ مترجم

امتیاز بیکار تھا معمولی سے معمولی مسلمان، غریب سے غریب بے وقعت بڑھیا بھی خلیفہ سے برابر سے بات چیت کر سکتی تھی۔ بے تکلف سادگی کو کسی تہذیب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر مسلمان اپنی روح کو آزاد سمجھنے کے باعث اپنے حکمراں سے بھی برابری کے تعلقات رکھتا ہے

خلفا کی سلطنت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ جس کی بنا عالمگیر ہو اس میں کوئی چیز استقامت پذیر نہیں ہوتی۔ عرب کی عظیم الشان سلطنت تقریباً اسی زمانہ میں ختم ہوگئی جس زمانے میں جرمنک والوں کی سلطنت فرانس میں ختم ہوئی تھی۔ غلاموں نے اور سلجوق و منگول کے حملوں نے تاخت و تاراج کر دیا۔ نئی حکومتیں پنپیں اور نئی سلطنتوں کی بنیادیں ڈالی گئیں۔ عثمانی نسل نے آخر کار ایک مضبوط سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اور جاں نثاروں نے ایک مضبوط مرکز بنا لیا۔ تعصب و شدت اب سرد ہو چکی تھی افراد کی روحوں میں اخلاقی اصول باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کی وجہ سے فرنگیوں کی بہادری و شجاعت اونچی منزلوں پر پہونچ گئی۔ علوم و فنون خصوصاً فلسفہ مغرب میں عربوں ہی سے آیا۔ بلند مرتبہ شاعری اور آزاد تخیل جرمنوں نے مشرق ہی سے لیا۔ یہ ایسے واقعات ہیں جس نے گوئٹے کی توجہ مشرق کی طرف پھیری اور اس نے اپنے دیوان کو عشقیہ شاعری کے موتیوں کا ہار بنا دیا۔ اس میں جو گرمی اور تصور کی آرائش ہے اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ لیکن مشرق میں جب رفتہ رفتہ جوش فرو ہو گیا تو وہ خراب سے خراب برائیوں میں پڑ گیا۔ نہایت کریہہ جذبات ان پر مستولی ہو گئے اور اسلام نے جو اسی عشرت کے ابتدائی مدارج تک کی جو اجازت دی تھی اور جسے مومن کے لئے جنت کے انعام کی صورت میں ظاہر کیا گیا تھا۔ اب اس میں شدت بڑھ گئی۔ آج کل عیسائی طاقتوں کے حسد کی وجہ سے اسلام محض ایشیا اور افریقہ کے گوشوں میں پسپا کر دیا گیا ہے اور یورپ میں اسے محض ایک گوشہ میں رہنے کی اجازت ہے۔ اسلام اس طرح تاریخ کے صفحات سے عرصہ سے محو ہو چکا ہے اور اب مشرق کی آسودگی اور عیش میں خوابیدہ ہے۔

فرانس اور اسلام

۱۸۳۰ء میں الجیریا فتح ہوا اور اس فتح نے فرانس کی توسیعی پالیسی میں اہم تبدیلیاں پیدا کردیں کیونکہ شمالی افریقہ فرانس کی پرانی نو آبادیات سے جو بحیرۂ کریبیا اور بحیرۂ ہند میں تھیں بالکل مختلف تھا۔ فرانس کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ شمالی افریقہ یا (عربوں کی زبان میں مغرب) سے اُن اشیاء کا ملنا محال ہے جو عموماً گرم ممالک سے حاصل کی جاتی ہیں نیز یہ کہ وہاں کے باشندوں کو مٹا کر نہ تو یورپی نو آبادیوں کے لئے مسکن بنایا جاسکتا ہے اور نہ وہ غلام بن کر ان کی خدمت ہی کرسکتے ہیں۔ ان پر یہ بھی واضح ہوگیا کہ اسلام نے اِن لوگوں کے سامنے ایسا مذہبی اور تمدنی نمونہ رکھدیا ہے جس کی وہ شدت سے محافظت کریں گے۔ ظاہر ہے کہ فرانس کو کسی اسلامی اور مشرقی قوم پر حکمرانی کرنے کا تجربہ نہیں تھا۔ اس لئے فتح الجیریا کے بعد سے اس کو اپنے طریقہ کار کے لئے بے ربط کوششیں کرنا پڑیں۔ رفتہ رفتہ الجیریا سے ان کو وہ تجربے حاصل ہوئے جو اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں ٹیونس اور ۱۹۱۲ء میں مراکش میں کام آئے لیکن آج بھی فرانس میں نہ تو کوئی خاص نو آبادیاتی نظام ہے اور نہ مقررہ اصول ایسے مناسب ہیں جن سے وہاں کی مسلم پالیسی خوش اسلوبی کے ساتھ چل سکے۔

عام خیال ہے کہ شمالی افریقہ میں عرب آباد ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ وہاں بربروں کی آبادی ہے جو کافی عرصہ سے عربی رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ درحقیقت بربروں کو مسلمان کرنے میں اور ان میں سے جو قبیلے زیادہ غیر متمدن تھے ان پر عربی تمدن کی جلا کرنے میں عرب فاتحوں کو پانچ صدی سے کم عرصہ نہیں لگا۔ بربروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ کبھی فاتح اقوام کے تمدن کے ساتھ خلط ملط نہیں ہوئے۔ ان کو رومیوں، ترکوں، فرانسیسیوں عربوں، بزنطینیوں، ونڈالوں اور فنیشیا والوں کی زبردست فوجی طاقت سے زیر ہونا پڑا۔ لیکن ان تمام نشیب فراز میں انھوں نے اپنا تمدن محفوظ رکھا

ان کی غیر معمولی تخصیص پسندی اور غیر ملکیوں سے نفرت بدستور قائم ہے۔لیکن ان کی بیرونی اقتدار
سے نفرت جو کبھی سماجی بغاوت کی صورت میں رونما ہوا کرتی تھی اب قومی احتجاج بنکر پھوٹ نکلتی ہے
صدیوں تک بیرونی اثرات سے کشمکش کرنیوالے مخالفین چاہے مسلم، عیسائی، ترک یا فرانسیسی
کوئی ہوں، مذہبی جمعیتیں اور مقامی علما ہوتے رہے۔فرانسیسی نظام حکومت نے ان کو ہموار کرنے
یا ان کو کام لانے کے لئے ان کے وظائف اور اوقاف مقرر کردئے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا کہ جمعیتوں
اور مرابوطوں کی حیثیت بہت جلد گر گئی۔کیونکہ بربر اپنے مذہبی رہنماؤں اور غیر ملکیوں کی سازش کو
بہت مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔اب وہ پہلے کی طرح مذہبی فرقہ بندی میں اپنی بہتری نہیں
سمجھتے بلکہ قوم پرستی اور پان عرب ازم کی طرف مائل ہورہے ہیں۔

فرانسیسی محکومیت سے پہلے شمالی افریقہ میں سوائے شاید مراکش کے کہیں قوم پرستی کا نشان
تک نہ تھا۔بربروں کی مستقل سیاسی اور سماجی جماعت اگر تھی تو وہ محض ان کا قبیلہ تھا۔وقتاً فوقتاً
مختلف قبیلے مل کر بڑے بڑے قبیلے بھی بن جاتے تھے۔لیکن ان کو اقوام کسی صورت سے نہیں کہا
جاسکتا تھا وہ ایک عارضی اتحاد ہوتا تھا اور محض کسی خاص فائدہ کی غرض سے ایسی شکل اختیار کرلیتا
تھا۔فرانسیسی فتح کے بعد بھی شمالی افریقہ سیاست اور رسم و رواج کے اختلاف کی حیثیت سے تین
حصوں میں منقسم رہا۔الجیریا۔وزارت داخلہ کے زیر قلم اور مراکش اور ٹیونس (چونکہ زیر حمایت حکومتیں
ہیں اور جہاں بادشاہ برائے نام حکومت کرتے ہیں) وزارت خارجہ کو ایڈی آرسے کے ماتحت
ہیں۔یہ دونوں نظام ایک دوسرے کے اختیارات کو حسد کی نظر سے دیکھتے تھے۔اس لئے
انھوں نے حکومت کرنے کے مختلف طریقے اختیار کئے اور اس کی وجہ سے ہر حصہ کی خصوصیات
اور زیادہ متاثر ہوگئیں چنانچہ عرصہ سے مراکش، الجیریا، ٹیونس ہر ایک کی جداگانہ انفرادی حیثیتیں
ہوگئی ہیں۔گویا فرانسیسیوں نے ان خطوں کو جو پہلے خودمختار تھے اب ایک دوسرے سے ممتاز اور
متحد ممالک کی شکل دیدی۔اس سے ہر ایک ملک میں وطنیت کا جذبہ پیدا ہوگیا لیکن قبیلوں میں
وفاداری کا جذبہ مٹائے بغیر وطنیت کا جذبہ داخل کرنا دو متضاد باتیں تھیں مشرق کے اسلامی ممالک سے بھی

اثرات آئے جنھوں نے اس قومی جذبہ کو اور بھی بھڑکایا۔ اسلامی نشاۃ الثانیہ کا جذبہ مغرب کے تعلیم یافتہ طبقہ میں سرایت کر گیا اور اس کا ماحصل اس اصول کی شکل میں ظاہر ہوا۔ کہ تمام عربی بولنے والے ممالک ایک قوم میں متحد ہو جائیں۔

عرب اتحاد کی تحریک جو انیسویں صدی میں جاری ہوئی محض دو ہستیوں کی شروع کی ہوئی تھی یہ جمال الدین الافغانی اور شیخ محمد عبدہٗ تھے الافغانی نے دو مطالبات پیش کئے۔ اولاً یہ کہ عرب ممالک کو آزاد ہونا چاہیئے تاکہ آزاد خیال اداروں کے ماتحت اپنی ترقی جاری رکھ سکیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان کی ایک وسیع سلطنت بن جائے جس پر ایک ہی خلیفہ حکمراں ہو تاکہ وہ فرنگی شہنشاہیت کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ اُن کے مصری شاگرد شیخ عبدہ نے مذہب اسلام کو سائنس کے ساتھ ملانا چاہا تاکہ اہل اسلام مغربی طور طریقے اور خاص طور سے مغربی ہتھیار اختیار کرلیں لیکن مذہبی روایات پر اس کا اثر نہ پڑے اور وہ بدستور قائم رہیں۔ ان دونوں کی تلقین کے اثر سے اٹھارویں صدی کے آخر میں پیرس میں "عرب ممالک کی لیگ" قائم ہوئی اور عرب کانگریس کے اجلاسوں نے جو ۱۹۱۳ء اور اس کے بعد ہوتے رہے اس کو اور وسعت دی۔ اُن کی بنیادی یکجہتی، زبان نسل اور تاریخ کی یکسانیت کے باعث تھی۔

قدیم عربی زبان میں نئی روح پھونکی جا چکی ہے اور مختلف مستند درسگاہوں (خاص کر جامعہ ازہر قاہرہ) نے نوجوان علما کی مدد سے اس کو موجودہ ضروریات کے قابل بنا دیا ہے۔ نئی زبان بہت خوبی سے موجودہ سیاسی۔ سماجی، فلسفیانہ مسائل کی ترجمانی کر سکتی ہے اور یہ مصری اخبارات کے زیر اثر اسلامی دنیا کے لئے مقامی بولیوں کو مٹا کر ایک مشترک زبان بننے والی ہے۔ اس طرح سے اس کی سیاسی حیثیت بھی اہم رہے۔ کیونکہ یہ ایک سلطنت کی زبان ہو جائے گی اور اس کے بن جانے سے عرب اتحاد کی منزل نزدیک تر آجائے گی۔

یہ خیال سائنس کے اعتبار سے صحیح نہیں کہ اسلامی دنیا ایک ہی نسل سے وابستہ ہے اُن قبیلوں اور لوگوں میں جو ایمان لا چکے ہیں نسلی تنوعات اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن میں یکسانیت

تو قطعی کبھی ہو ہی نہیں سکتی لیکن اس نسلی یکسانیت کا خیال خصوصاً ان لوگوں میں بہت ہے جو عرب نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر نو مسلم بربروں نے پیچیدہ شجرے بنا کر عرب فاتحوں سے رشتہ جوڑا تاکہ اُن کی عزت بڑھ جائے۔ اس نسلی توہم نے افریقی مسلمانوں کو ایشیا والوں سے جا ملایا اور اس طرح وہ یورپی مداخلت کے مخالف بن گئے ہیں۔ ہر ایک مسلمان اسلام کی اخوتِ عالمگیری سے وابستہ ہے۔ اس کو بچپن سے سکھایا جاتا ہے کہ عرب ممالک کا زوال آزادی چھن جانے سے شروع ہوا۔ اور آزادی مل جانے پر خلفائے بنی امیہ اور بنی عباسیہ کا زرّیں عہد ایک بار پھر واپس آ سکتا ہے تاریخ کی یہ دوعملی تعلیم یعنی پان عرب ازم اور وطنیت مسلمانوں کو اپنے ماضی پر مفتخر اور مستقبل کا معتمد بنا دیتی ہے۔

جنگ عظیم نے عرب اتحاد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ شاہ فیصل کی حکومت قائم نہ رہ سکی۔ یہودی فلسطین میں بسا دیے گئے اور برطانیہ اور فرانس کے ماتحت عراق، شام، لبنان، ٹرانس جارڈن اور فلسطین میں مندوبین قائم ہو گئیں۔ ابن سعود نے عرب خاص میں وہابی طاقت میں اور اضافہ کر لیا۔ لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود عرب عوام پان عرب ازم کے حامی ہیں۔ گزشتہ بیس سال سے خلیج فارس سے لے کر بحر اوقیانوس تک تمام عربوں میں اپنے مذہبی اور تمدنی اتحاد کا احساس ترقی پذیر ہے اور وہ یورپ کے مقابلہ میں اس اتحاد کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عربی ممالک نے بڑھتے ہوئے جوش و خروش سے اپنے وطن کی آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔ پان عرب ازم اور وطنیت حالانکہ بظاہر متضاد ہیں لیکن مغرب کے مقابلہ میں مشرق کے یہ دونوں جذبے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ہیں۔

عرب نشاۃ ثانیہ کی روح شمالی افریقہ میں کتابوں اخبارات، حاجیوں اور طلبا کے ذریعے آئی جو مصری اور شامی جامعات سے فارغ التحصیل ہو کر آتے تھے۔ اسلامی عربی دنیا مغرب کو اپنا جزو سمجھتی تھی اور اسلامی کانگریس جو یروشلم میں ۱۹۳۱ء سے شروع ہوئی۔ ان میں شمالی افریقہ کے نمائندے برابر جاتے تھے۔ ان لوگوں میں جنھوں نے پان عرب تحریک کو شمالی افریقہ میں پھیلایا سب سے زیادہ سرگرم کارکن امیر شکیب ارسلان لبنانی رئیس تھا۔ اس اہم شخصیت

کا سیاسی کردار بہت طویل اور متنوع ہے۔ وہ قسطنطنیہ میں ترکی پارلیمنٹ کے نائب کی حیثیت سے بیروت کی نمائندگی کرتا تھا۔ اور ان وفدوں میں بھی شامل رہا جو ترکی نے جنگ عظیم کے زمانہ میں جرمنی بھیجے۔ کئی سال تک وہ سرگرمی کے ساتھ بلقان اور طرابلس میں اسلامی اقتدار قائم کرنے کی کشمکش میں لگا رہا لیکن اس کی سرگرمیاں داعی کی حیثیت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اس کو عربی پر اس قدر قدرت حاصل ہے کہ وہ "سلطان الفصاحت" کہلاتا ہے اور اسی وجہ سے ۱۹۳۸ء میں عرب اکاڈمی دمشق کا صدر منتخب ہوا۔ اس کی اعلیٰ تربیت، ان تھک سیاسی کوششوں اور باوقار شخصیت نے اس کو فطری طور سے لیڈر بنا دیا ہے۔

جنگ عظیم کے بعد شامی فلسطینی کمیٹی قاہرہ میں قائم کی گئی اور امیر شکیب ارسلان جنیوا میں اس کی مستقل طور سے نمائندگی کرنے لگا۔ وہاں اس کا کام جمعیۃ الاقوام کے سامنے عربوں کی ترجمانی کرنا تھا۔ یہ کام شکیب ارسلان جیسے کار آزمودہ اور اولوالعزم آدمی کی تحریکات کے لئے بیحد مناسب تھا اس نے فوراً ہی اپنے دفتر کو ساری اسلامی دنیا سے متعلق تمام اطلاعات اور پروپیگنڈے کے مسکن میں تبدیل کر دیا۔ اس کے اس نظام کی تحریکات اس قدر دوررس ہوئیں کہ جنیوا میں اسکا مکان اسلام کا خاص مرکز بن گیا۔ اس نے محض مسلمان لیڈروں ہی سے نہیں بلکہ یورپی مدبرین سے بھی تعلقات پیدا کر لئے۔ ان میں مسولینی خاص طور سے قابل ذکر ہے جس کا وہ خاص مداح تھا۔ وہ مقامی عرب جماعتوں کو ہدایات اور پروگرام بھیجا کرتا اور مختلف مسلم گروہوں اور لیڈروں کے قضیوں کو طے کرتا تھا۔ "القوم العرب" بھی ان کتابوں اور رسالوں میں سے ہے جن کو وہ شائع کرتا تھا۔ یہ کتاب جاوا سے مراکش تک وسیع پیمانہ پر تقسیم ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں وہ برلن چلا گیا اور اپنے اثرات کو جرمنی کی خدمت میں پیش کر دیا۔

شمالی افریقہ کے قوم پرست پان عرب ازم کے اس دائمی چشمہ سے پوری طرح سیراب ہوئے شکیب ارسلان عرصہ سے شمالی افریقہ کی سیاسی اہمیت سے واقف تھا جنیوا میں وہ مراکش اور ٹیونس کے نمائندوں کے ساتھ خوب گھل مل کر رہا۔ وہ نوجوان طبقہ اور مغرب کی مذہبی بیداری کی

کارپردازوں کا روحانی رہبر بن گیا اس نے ہر جگہ کی مقامی قوم پرستی میں جلا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس خیال کو مقبول بنانے میں ہر شخص سے زیادہ کوشش کی کہ ٹیونس، الجیریا اور مراکش ایک ہی بڑی اسلامی ملت کے حصے ہو جائیں۔

یروشلم کانفرنس نے "عرب پیکٹ" مرتب کیا اور اس میں عرب ممالک کا مکمل اور ناقابل تقسیم اتحاد" اور ہر شخص کی "ایک ہی منزل مقصود" کو تسلیم کیا گیا اس میں اس بات کی بھی ضرورت دکھلائی گئی کہ مستعمریت کو ہر ممکن طاقت سے دور کیا جائے عمل کے لئے جو یہ آواز بلند کی گئی۔ اس نے شمالی افریقہ کی قومی جماعتوں کے لیڈروں کو جوش دلایا لیکن وہاں اگر یہ پروگرام عمل میں لایا جاتا تو قومی لیڈروں اور فرانسیسی حکومت میں تصادم ہو جاتا۔ اس لئے شاید شکیب ارسلان ہی کی تحریک سے سمجھوتہ کی درمیانی شکل اختیار کی گئی بعد ازاں امیر سے تبادلہ خیالات کرنے کے بعد شمالی افریقہ کے لیڈروں نے ٹیونس اور مراکش سے ایک ہی وقت میں ایک ہی مفہوم کے اعلانات شائع کئے وہ اس پر مشتمل تھے کہ شمالی افریقہ کو فرانس کی مدد سے آزادی کی .... طرف چلنا چاہیئے۔ نیز یہ کہ فرانس یہ مدد دے کر شمالی افریقہ کے آزاد لوگوں کی حمایت ہمیشہ کے لئے حاصل کرلے گا اور ان کے درمیان مشترکہ اغراض و احسانات کے تعلقات باہم دگر قائم رہیں گے یہ بہت مدبرانہ اعلان تھا کیونکہ وہ قوم پرستوں کی توقعات کو فرانس کی برائے نام وفاداری کے ساتھ وابستہ کر رہا تھا۔ انھوں نے فرانسیسی حکومت سے خود مختاری کے نیاضانہ عطیہ کی درخواست کی تھی گو وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس کا حصول ممکن نہیں۔

اسی درمیان میں خطہ واری پابندیوں سے ایک اور وسیع تر قوم پرستی پیدا ہوئی جس نے تمام شمالی افریقہ پر گھیرا ڈال دیا ۱۹۳۶ء میں طلبا کی کانگریس نے اسکولوں میں ایسی تعلیم کا مطالبہ کیا جو "شمالی افریقہ میں ہمارے اتحاد کا احساس پیدا کرے۔ اس اتحاد کی بنیاد متحدہ عقلی نظریوں، واحد مذہب اور مشترکہ جذبات پر رکھی گئی ہو۔ اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ ہم فرضی اتحاد پیدا کر رہے ہیں نہیں ہزار دفعہ نہیں، ہم صرف دیرینہ اتحاد کی تجدید کر رہے ہیں جس کا تاریخ مشاہدہ کرے اور اس کی ضامن ہو"

قومی جماعتوں نے مل کر مشترکہ دستور العمل بنائے اور کام کرنے کے لئے متحد ہوگئیں۔ ٹیونس کے ایک مجاہد نے ۱۹۳۷ء میں لکھا کہ "ٹیونس، الجیریا اور مراکش جو ایک ہی نوآبادیاتی نظام کے ماتحت ہیں ایک ٹھوس اور مستحکم محاذ قائم کرنے کی طرف مائل ہیں"۔ اسی زمانہ میں الجیریہ کی قومی تحریک کے قائد نے اعلان کیا کہ "شہنشاہیت سے مقابلہ کرنے کے لئے ہم ٹیونس مراکش اور الجیریا والے اپنا مشترکہ محاذ قائم کر رہے ہیں"

یہ نظریہ جسے ہم "پان مغرب ازم کہہ سکتے ہیں یہ پان عرب ازم کی راہ میں دراصل قوم پرستی کی ایک منزل ہے۔ ابھی تک یہ ناکامیاب رہی ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ حکومت نے اس کو دبایا ہے بلکہ اس لیئے کہ خطہ وار امتیاز ابھی کچھ باقی ہے۔ اتحاد کی تمنا جس قدر بھی بھڑک رہی ہو ٹیونس مراکش اور الجیریا کے قومی گروہ ابھی مجبور ہیں کہ وہ مختلف خطوں کو منظم اور ہر ایک کے مطالبات الگ الگ مرتب کریں کیونکہ وہ مختلف نظاموں کے ماتحت ہیں۔

الجیریا اپنے دونوں پڑوسیوں سے کئی صورتوں میں مختلف ہے۔ فرانسیسی حکومت ٹیونس اور مراکش میں ریزیڈنٹ اور مقامی رئیسوں کے ذریعہ سے بالواسطہ حکومت کرتی ہے۔ مگر الجیریا میں ایسا کرنے کی بجائے اس نے ملک کو مختلف شعبوں یا فرانسیسی وضع کی تحصیلوں اور پرگنوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ وہ فرانس کی طرح پیرس کی پارلیمنٹ میں اپنے نائب اور اراکین بھیجتے ہیں۔ وہاں یورپی نوآبادیوں کا بھی نسبتاً زیادہ تناسب ہے ۱۹۳۶ء میں ۷،۲،۳،۴۸۲،۷ کی مردم شماری میں وہ ۹۸۷،۲۵۲ یورپی تھے تعلیمیافتہ باشندوں نے عرصہ سے اس حق تلفی کے خلاف علم بلند کر رکھا ہے اور وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی حیثیت فرانسیسیوں کی سی کر دی جائے۔ الجیری علما نے مراکش اور ٹیونس کی طرح جداگانہ حقوق طلب نہیں کئے بلکہ اس بات کی استدعا کی کہ ان کو فرانسیسی شہری بننے کا حق دیدیا جائے ساتھ ہی وہ مسلمان کی حیثیت سے رہیں اور تمام حقوق کو (مثلاً وراثت و نکاح وغیرہ برقرار رکھیں جو انھیں اسلام سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے شمالی افریقہ میں ایک نئی تحریک پیدا ہوئی جس نے فرانسیسیوں کے ساتھ اتصال کا رجحان طبع دکھایا۔ اگر حکومت مسلمانوں کے شہری

حقوق حاصل کرنیکے مطالبہ کو رد نکرتی اس تحریک کے روکنے کی ہر ممکن کوشش نہ کرتی تو یہ اور زیادہ وسیع ہو جاتی۔ ان لوگوں میں جنھوں نے اتصال کی پالیسی کو سراہا بہت سے مقامی باشندے بھی تھے جو انتخاب سے حاصل ہونے والے عہدوں پر فائز تھے عرصہ تک یہ مہم ایوانوں اور عوام میں جاری رہی اور بالاخر اس کا تصادم علما اور ثابتہ شمالی افریقہ سے ہوا۔ اس جماعت کے بارے میں ابھی کچھ اور بتایا جائے گا

علما اسلامی شریعت پرسند ہیں۔ انھوں نے مذہب کو ایک طرف تو مرابطوں اور فریبی ملاؤں سے اور دوسری طرف یورپ کا اثر قبول کرنے سے بچانا اپنا مسلک بنا لیا ہے۔ ان کی جمعیت نے جس کی تشکیل ۱۹۳۱ء میں ہوئی شیخ بن بدلیس کی قیادت میں، سارے الجیریا میں بہت زبردست اثر پیدا کر لیا۔ شیخ موصوف افریقی مسلم علما میں بہت ہی فاضل اور شمالی افریقہ کی زبردست شخصیت ہیں انھوں نے ایک طرف تو مرابطوں کی جماعت کو درہم برہم کر دیا اور دوسری طرف اُن فرانسیسی جماعتوں میں کسی کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کیا جو ان کے ساتھ کام کرنے پر کمربستہ تھیں۔ اس کی بجائے انھوں نے اپنی سرگرمیوں کو ان باتوں تک محدود رکھا جو علما کے اصلاحی پروگرام میں آسکتی ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی دیسی باشندہ فرانسیسی شہری بن جائے تو وہ اپنے مذہب سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

ثابتہ شمالی افریقہ نے بھی اتصال کی مخالفت کی یہ ایک انقلاب پسند اور قومی جماعت ہے جس کی بنیاد ۱۹۲۹ء میں پڑی۔ اس کا رہبر نہایت فصیح اور لسان حامی جمہور مینا الحاج تھا جو پہلے شکیب ارسلان کے ساتھ کام کر چکا تھا دیگر مطالبوں کے علاوہ مینا الحاج نے یہ مطالبہ بھی پیش کیا کہ الجیریا آزاد کر دیا جائے۔ ابتدائی دور میں ثابتہ شمالی افریقہ کی سرگرمیاں ان الجیری مزدوروں تک محدود رہیں جو پیرس کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ ظاہرا وہ ۱۹۲۹ء ہی میں ٹوٹ گئی لیکن اس کا کام خفیہ طور سے ہوا کیا ۱۹۳۳ء میں وہ پھر رونما ہوئی لیکن اگلے سال پھر حکومت کا عتاب اس پر نازل ہوا ۱۹۳۶ء میں موسیو بلوم نے حکومت قائم کی اور مینا الحاج جو اس درمیان میں جنیوا میں پنا

۔گزیں تھا پیرس لوٹ آیا۔کچھ عرصہ پیرس میں قیام کرنے کے بعد وہ الجیریا چلا گیا۔ وہاں اس نے مقامی انجمنیں بنائیں جن کو شعبہ جاتی دفاقوں میں منظم کیا۔

وہ کامیابی حاصل کرتا رہا لیکن اس کو نومبر ۱۹۳۷ء میں "شہنشاہ سلطنت کے خلاف بغاوت کرنے" کے جرم میں دو سال کی سزا ہوگئی۔ اس کے تمام شہری اور سیاسی حقوق چھن گئے اور اس طرح اس کی سیاسی تحریکات کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن عوام میں اس کی عزت قائم رہی وہ اب بھی اسکو خود مختار اور جابرانہ حکومت کا مظلوم سمجھتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ فرانس عہدوں داروں اور علما کے مطالبۂ اتصال کو بخوشی منظور کئے بغیر سیاسی اور مذہبی قوم پرستی کے سیلاب کو روک نہیں سکتا۔ موسیو بلوم اس بات کو خوب سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے موسیو وائولٹ وزیر حکومت کی معیت میں ۳۰ دسمبر ۱۹۳۶ء کو ایوان کے سامنے ایک بل پیش کیا۔ اس کے منظور ہو جانے پر چند خاص طبقوں میں سے بائیس ہزار باشندوں کو فرانسیسی شہریوں کے انتخاب کے حقوق دے دیئے جاتے۔ اسلامی شریعت کے ماتحت ان رائے دینے والوں کی ذاتی حیثیت بھی برقرار رہتی۔ ایسے حقوق ان کے ہم مذہبوں کو یوگوسلافیہ، فرانسیسی ہند۔ اور سینیگل میں بھی مل چکے ہیں۔

الجیریا کے مسلمانوں نے بلوم، وائولٹ تجویز کا نہایت جوش کے ساتھ استقبال کیا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ انھوں نے سلطنت فرانس سے ملحق ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ موسیو بلوم تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ مگر الجیریا کے فرانسیسی نوآبادوں نے اس کی اس قدر سخت مخالفت کی کہ موسیو بلوم کے جانشینوں نے ایوان میں اس پر بحث ہی نہ ہونے دی جو ناامیدی لوگوں میں پیدا ہوئی۔ اس سے میثا کی قومی جماعت کو بہت فائدہ پہونچا۔ وہ ہمیشہ سے فرانس کے وعدوں پر اعتبار کرنا مہمل سمجھتی تھی۔ حکومت نے اپنی سیاسی کمزوری پر زیادہ پر اثر اقتصادی مراعات سے نقاب ڈالنے کی کوشش کی مگر الجیریا والے دوسروں کی طرح وفاقی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی سیاسی تمنائیں زندگی کی اس بلند معیاری سے مردہ نہیں ہوئیں۔

جواب شہری اور دیہاتی زندگی میں رونما ہے۔

مراکش اور ٹیونس میں سلطان اور بے فرانس کے زیر حمایت برائے نام حکومت کرتے ہیں۔ وہاں مسائل کی دوسری نوعیت ہے۔ اس نظام کے موجدوں نے خیال کیا کہ اس سے حکومت کو الحاق کے تمام فوائد حاصل ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کا بار بھی نہیں پڑے گا لیکن اب ٹیونس میں فرانسیسی اعلیٰ افسر ٹیونس کے وزیروں کی جگہ اپنے اختیارات کام میں لانے لگے ہیں۔ شہری افسروں نے قائدوں کی طاقت اور فرانسیسی فوجی پولیس نے سپاہیوں کی قوت سلب کر لی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ٹیونس والوں نے جو فرانسیسی قانونی روایات کا مطالبہ کر چکے تھے ماتحت حکومت کی بدنظمیوں پر بہت زوروں سے نکتہ چینی کی ان کا دعویٰ تھا کہ باردو اور لا مرسا کے صلح ناموں نے فرانس پر اسکے زیر حمایت ملکوں کے بارے میں بہت سے فرائض عائد کر دیئے ہیں۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ وہ حکومت خود اختیاری کو بڑھا کر اور تعلیمی نظام میں توسیع کر کے ٹیونس کی سیاسی حیثیت بلند کر دیں۔ موجودہ عہد کی بجائے جس میں فرضی الحاق کارفرما ہے وہ فیاضانہ سرپرستی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے رفتہ رفتہ ٹیونس آزاد ہو کر محض معمولی وفاقی رشتہ سے فرانس کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ قانونی حیثیت سے معاملہ مضبوط ہے مگر فرانس کی حکمرانی کی تمنا کے ساتھ اس کا تصادم ہو جاتا ہے۔ آزادی کا خیال ٹیونس کے عوام میں متحرک ہے مگر فرانسیسی مدبر اس کو تباہ کن تصور بتا کر رد کر دیتے ہیں ریزیڈنٹ کبھی پورے اختیارات سے کام لیتے ہیں اور کبھی فیاضی دکھاتے ہیں، کبھی ٹیونس والوں کی عرضداشتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور جب وہ لوگ بہت زیادہ بضد ہو جاتے ہیں تو سختی سے بھی کام لیتے ہیں باوجود اس سختی و نرمی کے وہ قومی تحریک کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

جنگ عظیم کے بعد ہی ٹیونس میں دستور کا مطالبہ شروع ہوا۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں اس تحریک کے رہنماؤں نے پریسیڈنٹ ولسن کے نام ایک عرضداشت بھیجی اور "شہید ٹیونس" کے نام سے ایک گمنام پمفلٹ شائع کیا۔ اس پمفلٹ کا مصنف درحقیقت ایک عالم شیخ ثعلبی تھا۔ ان سے

اسلامی اصلاح کے اصول مشرق سے حاصل کئے تھے اور چاہتا تھا کہ ٹیونس ۱۸۸۱ء سے قبل کے حریت پسندانہ دور میں واپس آجائے جب کہ فرانیسی تشدد کا نام تک نہ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں دستور پارٹی قائم ہوئی جس کا مطالبہ یہ تھا کہ ٹیونس والے غلامی کی زنجیروں سے آزاد کر دئے جائیں" اور ایسا دستور ملے جس کی رو سے حکومت کی باگ اور بے اور اس کے خاندان کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ اس کے بعد فرانس کے خلاف اخباری پروپیگنڈہ اور سڑکوں پر مظاہرے شروع ہوئے وفود پیرس بھیجے گئے اور اقتصادی بائیکاٹ کی کوشش کی گئی۔ حکومت نے اس کا تشدد سے جواب دیا لیکن ۱۹۲۲ء میں نمائندہ مجالس قانون ساز بنا دیں۔ اس سے اعتدال پسند طبقہ کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔

۱۹۳۰ء میں دستوری جماعت کے دو حصے ہو گئے۔ نئے دستور والے جن کی باگ نوجوان طبقہ کے ہاتھ میں تھی اور ان کے نئے رجحانات تھے اور پرانے دستور والے جو روایات پر سختی سے کاربند تھے۔ نئے دستور والے چاہتے تھے کہ ٹیونس کے لوگ حکومت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ ان کی سیاسی تاروپود کچھ تو فرانس سے لی گئی تھی اور بیشتر فاشستی اٹلی سے۔ باوردی قواعد عرب اسکاؤٹوں کی تنظیم، مقامی انجمنوں کو مرکزی اداروں سے احکامات صادر کرنا اور مظاہروں کا پہلے ہی انتظام کر رکھنا وغیرہ اس کے خاص کام تھے۔ پرجوش قانون داں حبیب بورغیبی کی قیادت میں نئے دستور والوں کو ٹیونس کے عوام کی تقریباً کلی حمایت حاصل ہو گئی۔ نئے دستور والوں کی کمزوری جو ان کے پروگرام اور تدبیروں میں داخل تھی یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ محافظ حکومت سے مراعات وصول کر کے نئی اصلاحات مل سکتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اُن صلح ناموں کو تسلیم کرتے تھے جنھوں نے ٹیونس کو فرانس کے ساتھ وابستہ کیا تھا۔ بہت سے لوگ قومی تحریک کے اعتبار سے ان کو غلط راہ پر سمجھتے تھے پرانے دستور والوں کے ساتھ اس قسم کی کوئی کمزوری نہ تھی۔ اصولی طور پر ان کا نظریہ روسا اور اعلیٰ طبقہ کا تھا انھوں نے ماتحت حکومت کے اصول کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ریزیڈنٹ سے بھی کسی طرح تعاون کرنے پر تیار نہ تھے۔ پھر بھی

پرانے دستور والے الجیریا کی انجمن علما کی طرح پان عرب ازم اور اسلام کے سادہ اصولوں کی طرف رجعت کے موافق ہوتے ہوئے بھی اپنے مطالبات قطعی اور واضح طور پر پیش نہیں کرتے تھے۔ اور فرانسیسیوں کی سیاست کے مدوجزر کے ساتھ یہ اپنی پالیسی بدل نہیں دیتے تھے۔ اسلئے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان نئے دستور والوں کے ساتھ گورنمنٹ نے سخت انسدادی کارروائیاں کیں پرانے دستور والوں سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔

۱۹۳۶ء میں فرانس میں مقبول عام فرنٹ گورنمنٹ ہوئی اس نے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ ریگستان صحارا میں جو لوگ جلا وطن کر دیے گئے تھے ان کو واپس بلا لیا اور ان کو اپنے خیالات کے اظہار کرنے کی پوری پوری آزادی دیدی۔ دفتر خارجہ کا ایک ذہین نوجوان انڈر سکرٹری موسیو پیر ینو جو کسی زمانہ میں مراکش میں لاٹی کا شریک کار رہ چکا تھا ٹیونس اور مراکش کا منتظم بنایا گیا اور ایسی تدابیر اختیار کی گئیں جن سے پریس اور عوام الناس کو دوبارہ اظہار خیال کی آزادی مل گئی فرانس کا ساجی قانون بھی مقامی امور کا لحاظ کرتے ہوئے ٹیونس میں رائج کر دیا تھا لیکن یہ سب کافی نہ تھا کیونکہ گورنمنٹ کی ترکیب میں چند اور بنیادی اصلاحات کی ضرورت تھی۔ اس لئے موسیو دینو شروع ۳۷ء میں بطور خود اسکی تحقیق کے لئے ٹیونس گیا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ ملک کو کامل سیاسی۔ انتظامی اور اقتصادی تنظیم نو کی ضرورت ہے پھر بھی دستور کو اس سے کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ وینو نے کہا کہ حکومت از یہ حمایت دراصل غیر مشروط ہے اور اسلئے اسنے طے کر لیا ہے کہ وہ تمام قانونی ذرائع سے اس کی حرمت کو برقرار رکھے گا اور تمام فتنہ و فساد اور جھوٹے پروپیگنڈے کو دبا دیگا۔ فرانس میں موسیو بلوم کی وزارت کی شکست کے بعد یہاں پھر تحریکیں تیزی سے ہونے لگیں۔ تمام شمالی افریقہ میں فسادات اور جھگڑے پیدا ہو گئے جیسے کسی ایک ہی آدمی کے اشارے سے ہوئے ہوں (شاید شکیب ارسلاں کے اشارے سے) نئے دستور والوں میں جو زیادہ پیش پیش تھے انہوں نے مقبول عام فرنٹ گورنمنٹ کے وعدوں کی نا استواری کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا اور اصلاحات کے لئے زیادہ باعمل طریقوں کا مطالبہ کیا۔ دستور والوں کا زور اب اور بھی بڑھ گیا تھا۔ کیونکہ شیخ ثعلبی کی پندرہ سالہ

جلاوطنی کے بعد واپسی پر پرانے اور نئے دستور والوں میں جھگڑا ہونا شروع ہوا۔اس سے کافی گرما گرمی پیدا ہوگئی
اپنی جلاوطنی کے زمانہ میں شیخ مشرق قریب میں اسلامی نشاۃ الثانیہ کی تحریکات سے کافی وابستہ
رہا تھا۔ اس لئے اس نے اب یہ تجویز کیا کہ پرانے اور نئے دستور والوں کو متحد ہو جانا چاہئے۔ لیکن
چونکہ ثعلبی کی ہمدردیاں نئے دستور والوں کے جمہوری اور کامل وطنیت کے اصول کے خلاف تھیں
اس لئے ثعلبی کے ماتحت اس اتحاد کا مقصد یہ ہوتا کہ پرانے دستور والوں کی حیثیت رہتی۔ چنانچہ
نئے دستور والوں نے ثعلبی کی مخالفت کی۔ یہاں تک جب وہ پبلک میں بولنے کھڑا ہوتا تو یہ لوگ
خونخوار بلوہ کرا دیتے۔ پھر بھی ثعلبی نے یروشلم کے مفتی اعظم کی ہمت افزائی پر ذاتی طور پر مسلم اتحاد کی
لئے اپنی تبلیغ جاری رکھی۔ کچھ عرصہ بعد نئے دستور والوں نے محسوس کیا کہ ان کا مصلحتی پروگرام ثعلبی
کے مذہبی رنگ کے پروگرام کے مقابلہ میں نامقبول ہو جائے گا۔ حبیب برغیبٰی نے چنانچہ نومبر
۱۹۳۷ء میں اپنی پارٹی سے گورنمنٹ کی موافقت کی پالیسی کو چھڑوا دیا۔ اور الجیریا اور مراکش میں
جو جبری کارروائیاں گورنمنٹ نے کی تھیں اس کے خلاف ایک عام ہڑتال بھی کرادی۔ گویا اس
طرح نئے دستور میں مسلم یکجہتی اور مسلم اتحاد اس کے پروگرام کا خاص اصول ہو گیا۔ اسی زمانہ میں بہت
جلد فرانسیسی بائیں جماعت اور تجارتی یونین والوں کی ہمدردیاں اس سے جاتی رہیں۔ پرانے دستور
والوں سے سبقت لے جانے کے خیال سے برغیبٰی نے تجویز کیا کہ ماتحتی حکومت کا ہر ممکن صورت
سے اختلاف کرنا چاہئے۔ بغاوت بھی اس میں جائز ہے۔ چنانچہ اپنے ساتھیوں میں جذبۂ شہادت
و بغاوت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ٹیکس ادا کرنے اور فوجی خدمت کرنے سے منع کر دیا۔ اور عام
اژدہامی مظاہرے کرنے کی تلقین کی۔

۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو نئے دستور کے لیڈروں کے ماتحت (جب جرمنوں نے آسٹریا پر حملہ
کر دیا تو فرانسیسی کمزوری کا یقین کر کے) ایک منظم انبوہ نے پولیس پر حملہ کر دیا۔ ایک فرانسیسی کا گلا کاٹ
ڈالا۔ پولیس والوں نے فیر کئے بہت سے لوگ مر گئے لیکن جلد ہی امن قائم ہو گیا اور بہت سے
لوگوں کو سزائیں دی گئیں۔ چند گھنٹوں کے اندر حبیب برغیبٰی اور نئے دستور کے دیگر زعما قید کر لئے

گئے اور تین دن کے اندر اس پارٹی کو ختم کر دیا گیا۔ حالانکہ گورنمنٹ نے بعد کو بہت سے لوگوں کو
رہا کر دیا لیکن بلوم کی گورنمنٹ نے جو سماجی اصلاحات کی تھیں ان سب کو منسوخ کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ قید کی سزا سے بڑھ کر ٹیونس میں امن قایم کیا۔ نازی دہشت اور فاشسٹی
مطالبوں نے ستمبر ۱۹۳۸ء میں میونخ کا قضیہ ہوا لیکن ٹیونس بالکل خاموش رہا بلکہ پبلک فرانس
کے تعلقات پر پہلے سے زیادہ مستعد نظر آنے لگی۔ یہ نظریہ اور بھی ترقی پذیر ہو گیا جب اٹلی نے دسمبر
۱۹۳۸ء میں لاول اور مسولینی کے جنوری ۱۹۳۵ء والے سمجھوتے کو مسترد کر دیا اور فاشسٹی پریس
نے ٹیونس کے الحاق پر زور دینا شروع کیا۔ ٹیونس والوں نے کبھی فاشسزم کے متعلق اچھی رائیں
نہیں رکھیں لیبیا کی قربت نے ان کو مواقع دئے تھے کہ مسولینی کی مسلم پالیسی کا اصل مطلب سمجھ
سکیں لیبیا کو اطالوی وطنی علاقے میں داخل کر لینا اور اس کو چار صوبوں میں تقسیم کر دینا بیس ہزار
اطالویوں کو ۱۹۳۵ء میں وہاں عربوں کے درمیان بسنے بھیج دینا اور پھر یہ اعلان کرنا کہ ابھی اور
بھیجے جائیں گے یہ سب باتیں ایسی تھیں جنھوں نے عام مسلمان ملکوں میں اس کے خلاف حقارت
کی لہر پھیلا دی یہاں تک کہ شکیب ارسلان بھی باوجود مسولینی کے متعلق بلند رائے رکھنے کے ان امور
سے بہت متاثر ہوا۔

ٹیونس کی قوم کو اب کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ ان کے اپنے مفاد و اغراض کس سے وابستہ ہو سکتے ہیں
فرانسیسی اور اطالوی نوآبادیات میں کس کو منتخب کیا جا سکتا ہے۔ اس امر میں ایک نیا دستوری بھی اب تذبذب
نہ کریگا۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۸ء میں فاشست چیمبر میں مختلف نائبوں نے ٹیونس، جبوتی، کارسیکا کے مطالبے کا نعرہ
بلند کیا تھا۔ اس کا اثر ٹیونس میں فوراً اور بہت گہرا ہوا۔ اور اس کے ایک ماہ بعد موسیو دلادیئے کے ٹیونس جانے
پر عوام الناس نے اپنے جوش و خروش میں بہت خلوص کا مظاہرہ کیا۔ پھر بھی اطالوی مطالبوں کو رد کرنے کی
فضا سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انھیں فرانسیسی پالیسی منظور ہے۔ نئے دستور والوں نے ابھی تک اپنے وہی مطالبات
قائم رکھے ہیں اور وہ لوگ جو دور اندیش و محتاط ہیں اور فرانسیسیوں کے ساتھ شریک کار ہیں انھوں نے بھی اس
بات کو صاف ظاہر کر دیا ہے کہ ان کا اشتراک عمل ہمیشہ کیلئے قطعی نہ سمجھ لیا جائے جنگ کے بعد وہ ماتحتی حکومت

کی مکمل تنظیم نو کی امید رکھتے ہیں۔

مراکش میں قومی تحریک اسی قدر ترقی پذیر ہوئی جتنی کہ ٹیونس میں مراکش رؤسائے بعد ازاں سے لڑکے پیرس پڑھنے بھیجے گئے۔ جہاں انھوں نے فرانسیسی بائیں جماعتوں کے جمہوری اور سرمایہ داری کے مخالف نظریوں کو قبول کیا۔ واپسی پر انھوں نے مراکش کی آزادی کی تحریک کی بنیاد ڈالی اور ان تصورات اور نظریوں کو پیش نظر رکھا جو انھوں نے فرانس سے حاصل کئے تھے۔ گو کہ یہ گروہ تعداد میں بہت تھوڑا تھا پھر بھی یہ لوگ بہت سرگرم تھے اور آخر میں تو انھوں نے اُن لوگوں سے بھی اس کی قیادت منظور کرائی جو پرانے خیالات کے حامی تھے۔ مراکش کی بڑھتی ہوئی قومی تحریک کا سب سے زیادہ اثر انداز واقعہ ۱۹۲۵ء میں عبدالکریم کی بغاوت تھی۔ اس کے فیز کے دروازوں تک بڑھ جانے نے قوم پرستوں کو بتا دیا کہ مراکش کی آزادی حاصل کرنے کی راہ میں محض موجودہ ہتیاروں کا نہ ہونا مانع ہے۔

ریف کی جنگ ختم ہو جانے کے بعد مراکش میں کھلّم کھلا شورش ختم ہو گئی حالانکہ تعلیم یافتہ طبقہ میں سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی خواہش اسی طرح موجزن تھی۔ یہ دبی ہوئی آگ ۱۶ رمئی سنہ ۱۹۳۰ء میں 'بربر ظہیر' کے شائع ہونے پر پھر بھڑک اٹھی۔ اس بے موقع اور غلط فرمان کے ماتحت وہ قانونی قضیے جو اب تک بربر قبیلوں کی بعض قرآنی عدالتوں میں پیش ہوا کرتے تھے، اُن عدالتوں میں منتقل کر دیئے گئے جن میں قبیلوں کے رسم و رواج کے مطابق عدل کیا جاتا تھا۔ اس قانون کے خلاف مراکش کے تعلیم یافتہ طبقہ نے 'مراکشی عمل' نام کی جماعت میں منظم ہو کر شکیب ارسلاں کی زیر ہدایت ایک سخت احتجاج کرنا شروع کیا۔ انھوں نے اس کی بہت سختی سے مخالفت کی (اس وقت بھی جبکہ اس قانون کی بعض دفعات ہلکی کر دی گئیں تھیں) وہ کہتے تھے کہ اس سے ہم خدائی عدل سے محروم ہو جائیں گے۔ اس طور پر ان لوگوں نے اپنے کو پرانی نسل والوں کے سامنے (جنھیں ان کی مغربی تعلیم نے اسلام سے بیگانہ سا بنا دیا تھا) اسلام کے نگراں کی شکل میں پیش کیا۔ ان کے اس عمل کی تعریف یروشلم کی کانفرنس میں بھی ہوئی۔

یہ بات بہت اہم تھی کیونکہ ان نوجوانوں کو اپنے وطنی پروگرام بنانے میں اسلامی روایات، اپنے بزرگوں کے قدیمی رجحانات اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے پیرس کے مربیوں کے جمہوری اور انقلابی اصولوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ ایک مغربی طرزِ خیال کے آدمی کو یہ دونوں مقاصد صاف طور پر متضاد معلوم ہوں گے لیکن مراکشی عمل کے ان نوجوانوں کو ان میں کوئی بات متضاد نہیں معلوم ہوئی جیسا کہ اُن کے مراکشی اصلاحات کے پروگرام کی اشاعت سے ظاہر ہو گیا۔ یہ پروگرام انھوں نے ۱۹۳۴ء میں ایک فرانسیسی گروپ کے زیرِ ہدایت چھاپا۔ اس گروپ کے لوگ سیاست، صحافت، قانون اور علمی زندگی میں کافی مشہور تھے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ پروگرام قاہرہ میں بھی چھپوایا گیا یہ اعلان جو دراصل بجائے اصلاحات کے کسی خاص پروگرام ہونے کے مطالبات اور شکایات کی ایک طویل فہرست ہے پھر بھی اس تحریک کا یہی دفتری پروگرام ہو گیا۔ اس انجمن کے فرانس کی بائیں جماعت میں بہت سے دوست تھے اور جب یہ پارٹی ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں منتخب ہو گئی تو قدرتی طور پر یہ سمجھا گیا کہ اس انجمن کے مطالبات فوراً منظور ہو جائیں گے لیکن چند ماہ بعد یہ محسوس ہونا شروع ہوا کہ بلوم والی وزارت ان مطالبات کو منظور نہیں کرے گی۔ اس وقت اس انجمن نے بہت زبردست شورش مچانا شروع کر دی لیکن ۱۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو سلطان نے اس انجمن کو بے ضابطہ ٹھہرا کر شکست کر دیا۔ وطن پرستوں نے اس وقت طے کیا کہ صرف طاقت ہی سے کوئی بات منوائی جا سکتی ہے چنانچہ انھوں نے ملک کو اس بات کیلئے تیار کرنا شروع کیا۔ ان دیہاتی ضلعوں میں بھی دورہ کیا گیا جو دور دور واقع تھے تاکہ وہ بھی سخت قربانی کے لئے تیار ہو جائیں۔ اگست ۱۹۳۷ء میں باقاعدہ پہلے سے تیار کئے ہوئے بلوے ہونا شروع ہوئے اور کافی خون بہایا گیا۔ اکتوبر میں حکام نے کثیر تعداد میں لوگوں کو قید کرنا شروع کیا۔ ریزیڈنٹ جنرل نوگی نے ایک بڑی عقلمندی کی پالیسی یہ اختیار کی کہ نوجوان مراکشیوں کے شکوک کو ان کے کچھ مطالبات منظور کر کے رفع کر دیا۔ اور جن لوگوں کو قید کیا گیا تھا ان کو آزاد کر دیا۔ اس عرصہ میں وطن پرستوں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ تحت حکومت کو طاقت سے نہیں آزاد کرایا جا سکتا چنانچہ میونخ کا واقعہ بھی مراکش میں بغیر کسی اثرات کے گذر گیا

اب اگر ہم شمالی افریقہ کو تمام تر نظر میں رکھیں تو فرانسیسی پالیسی کے متعلق چند واضح کلیئے قائم

کر سکتے ہیں۔ شروع میں حکام نے ان مخالف اثرات کو صحیح صحیح سمجھنے میں غلطی کی جو مشرق قریب سے داخل ہو رہے تھے۔ وہ دستور، علما، تابتہ شمالی افریقیہ اور مراکشی عمل، ان سب کی جد وجہد کا مذاق اڑانے کی طرف مائل رہے۔ انھوں نے یہی خیال کیا کہ یہ چیزیں عوام الناس کی نمائندگی نہیں کر رہی ہیں۔ اس کے بعد دفعتاً واقعات سے معلوم ہوا کہ وطنیت کی اسپرٹ دیہاتی علاقوں کے قبائل تک میں پہونچ گئی ہے۔ اب یہ معلوم ہونے پر بے انتہا پریشانی پیدا ہو گئی۔ اور وہ تمام مطالبات جو وطنی پیش کرتے تھے ان میں جو خالص تمدنی قسم کے ہوتے وہ بھی اب فرانسیسیوں کو اپنے خلاف معلوم ہوتے۔ الجیریا میں یہ حالت خاص کر پیدا ہوئی اسی لئے وہاں اکثر بلا امتیاز جبر کیا گیا۔ ٹیونس میں تو اپریل ۱۹۳۸ء کے بلوؤں کے بعد محاصرے والی حالت قائم کر دی گئی۔ اور حکام کے ہاتھ میں جب اتنے جبری اختیارات دیدئے گئے تو وہ اکثر جرم کے لحاظ سے سزا بہت زیادہ دیتے تھے صرف مراکش میں بڑی مصالحت سے انسدادی تدبیریں کی گئیں، ایسی کہ لوگ خوش ہو گئے اگرچہ تمام تر مطمئن نہیں ہوئے۔

فرانسیسی حکومت جس طرح شمالی افریقیہ میں بدلتے ہوئے حالات سے عہدہ برآنہ ہو سکی اسی طرح ان مندوبی ملکوں یعنی شام اور لبنان میں بھی وہاں کی دشواریوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔ شام میں اس کو ان تعلیم یافتہ روسا سے مقابلہ کرنا پڑا جو ترکی دور حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہ چکے تھے، اور لبنان میں ان لوگوں سے جو کہ زیادہ تر عیسائی تھے اور جہاں تعلیم کی فراوانی کی وجہ سے صرف ۴ فیصدی جہالت رہ گئی تھی۔ فرانسیسی نوآبادیاتی حکام جن کی تربیت زیادہ تر افریقیہ کی نوآبادیات تک محدود تھی ان کو یہاں حکومت کرنے کے طریقوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ یہاں کے عام لوگ سیاسی اور سماجی ترقی کے باعث تہذیب کے اعلیٰ مدارج تک پہونچ چکے تھے۔

اس کے علاوہ فرانسیسی گورنمنٹ کو پیرس میں نہ اس کے حکام کو جو اس مقام پر تھے کچھ معلوم تھا کہ ایسے مندوب ملک پر کس طرح حکومت کرنا چاہئے۔ بعض کہتے تھے کہ فرانس کا یہ فرض ہے کہ وہ ان ریاستوں کو مکمل آزادی کے لئے جلد سے جلد تیار کر دے۔ دوسرے لوگ سیاسی، فوجی اور مالی وجوہ کی بنا پر یہ رائے ظاہر کرتے تھے کہ اس وقتی حکومت کو غیر مقررہ وقت تک طول دیا جائے۔ فرانس کی اس غیر متعین اور متضاد

پالیسی کے خطرات شام میں جولائی ۱۹۲۵ء میں آخر ظاہر ہو گئے۔ جبل دروز میں بغاوت شروع ہوئی اور اسکا اثر دمشق، جبل حرمان اور جنوبی لبنان تک جلد پہونچ گیا۔ ایسی شورش کے دفع کرنے میں گورنمنٹ نے کوئی اصولی پالیسی نہیں برتی۔ شام کے وطن پرستوں سے سمجھوتے ہوئے اور پھر توڑ دئے گئے اصلاحات جاری کئے گئے اور پھر بلا وجہ منسوخ کر دئے گئے۔ ۱۹۳۰ء تک فرانسیسی گورنمنٹ اپنی کمزوریوں کا اسی طرح مظاہرہ کرتی رہی۔ اس سے شام اور لبنان کی قدیمی چشمک، شام میں عیسائیوں کی اقلیت اور لبنان میں مسلمانوں کی اقلیت وغیرہ کے مسائل کبھی نہ طے ہو سکے۔

جون ۱۹۳۱ء میں مندوب کمیشن کے فرانسیسی رکن نے اس بات کا اعلان کیا کہ موجودہ طریقۂ کار محض شام ولبنان کو مندوب سے چھٹا کر آزاد کرنے کیلئے ہے اور اس میں بہت دیر نہیں لگے گی۔ اس وعدہ سے مطمئن ہو کر اور ۱۹۳۲ء میں عراق کو آزادی ملنے پر شام کے وطن پرستوں نے بھی کسی درمیانی سمجھوتہ سے انکار کر دیا۔ ۱۰ ر جنوری ۱۹۳۶ء کو انھوں نے الفاظ سے گذر کر عمل سے کام لینا چاہا۔ ۱۸ ر جنوری سے ۱۴ ر فروری تک تمام بازار بند رہے اور تمام باہر کے مال کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ دمشق، حمص، حلب، دیر الزور وغیرہ مقامات پر فسادات ہوئے جن میں ساٹھ مقتول اور سیکڑوں زخمی ہوئے۔ آخر کار پہلی مارچ کو گورنمنٹ نے وعدہ کر لیا کہ شام کو وہی حقوق مل جائیں گے جو برطانیہ نے عراق کو دئے ہیں۔

جون ۱۹۳۶ء میں موسیو بلوم کی وزارت فرانس میں قائم ہوئی۔ موسیو فلینڈن نے جو وعدے کئے تھے ان کی پابندی ان کو وراثتاً ملی اور اس سلسلہ میں ابتدائی کارروائیاں جو پیرس میں ہو رہی تھیں وہ بھی جاری رہیں موسیو ویئنو جس نے یہ طے کر لیا تھا کہ بہت جلد اور کامیابی کے ساتھ یہ امور ختم کر دیگا۔ اس نے ۲ ر ستمبر ۱۹۳۶ء کو ایک عہد نامہ پر شام کے وفد کے لیڈر ہاشم بے العطشی کے ساتھ دستخط کر دئے۔ اس کے بعد ۱۳ ر نومبر کو لبنان سے اور ۲۲ ر دسمبر کو شام سے ایک صلحنامہ پر دستخط ہو گئے۔ لبنان کو شام سے علیحدہ کر دیا گیا اور ہر ایک کو اس کی اپنی حکومت دیدی گئی۔ یہ تسلیم کر لیا گیا کہ شام تین سال میں آزاد ہو جائے گا۔ اس کے بدلے میں اس نے فرانس سے ایک پچیس سالہ اتحاد کا وعدہ کر لیا اور کچھ فوجی، اقتصادی اور تمدنی مراعات دینا بھی مان لئے۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس اب امن قائم ہو گیا۔ دمشق میں ہائی کمشنر اور وطن پرستوں کے درمیان کامل اتحاد ہونے لگا یہاں تک کہ جب اول الذکر نے صلحنامہ میں چند تبدیلیاں منظور کر لیں تو موخر الذکر نے بادل نخواستہ

سنجک کے علاقہ کو ترکی کو دینا منظور کرلیا تھا۔ اس اتحاد کے باوجود بھی گورنمنٹ نے اس صلحنامہ کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے میں دیر کی اس کے علاوہ اقلیتوں کے مطالبات کی ہمت افزائی کی گئی خصوصاً چند فرانسیسی حکام نے ان عیسائیوں کی بہت زیادہ طرفداری کی۔ ان باتوں سے شام میں عام خیال یہ پیدا ہوگیا کہ فرانس اس صلحنامہ کو بالکل ختم کردینا یا کم ازکم اس کی صورت بالکل مسخ کردینا چاہتا ہے۔ انتہا پسندوں کے سردار ڈاکٹر شاہ بندار نے یہ خیال پھیلایا کہ صرف جہاد ہی سے فرانس کو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ اپنے وعدے پورے کرے۔

حالات اتنے نازک ہوگئے تو شام کے وزیر اعظم جمیل مردم بے دمشق سے اگست ۱۹۳۸ء میں فرانس کے وزیر خارجہ موسیو بونے سے ملنے پیرس گئے، وہاں یہ دونوں حضرات متفقہ نتیجہ پر پہونچ گئے۔ ۱۴ر نومبر کو ان دونوں نے ایک مشترکہ اعلان شائع کیا کہ "ہمیں امید ہے کہ شام کی پارلیمنٹ دسمبر ۱۹۳۶ء والے صلحنامہ کو ۲۰ر جنوری ۱۹۳۸ء تک منظور کرلے گی اور یہ کہ فرانسیسی پارلیمان بھی جس کے سامنے مخصوص کمیٹیوں کی رپورٹ ۱۰ر دسمبر سے پہلے پیش کیجائے گی۔ اس صلح کو ۳۱ر جنوری ۱۹۳۹ء سے پہلے مان لے گی۔ ان شرائط کے ماتحت منتدوبی حکومت کے امور شامی نظام میں فروری تک مبدل ہوجائیں گے، اس کے علاوہ شام جمعیت الاقوام میں ۳۱ر دسمبر سے ۳۰ر ستمبر ۱۹۳۹ء تک شامل ہوجائے گی۔"

آپس کے یہ باہمی سمجھوتے بالکل واضح اور صاف تھے لیکن ابھی جمیل مردم بے دمشق واپس بھی نہیں پہونچے تھے کہ موسیو بونے نے دفتر خارجہ کی چند سازشوں کے زیر اثر اس بات کا اعلان کیا (۱۴ر دسمبر) کہ ابھی وہ ایوان کے سامنے اس صلحنامہ کو منظوری کے لئے نہیں لائیں گے۔ ایک پختہ وعدہ کے ایک مہینہ سے کم عرصہ میں اس طرح شکست ہوجانے سے شام میں خطرناک نتائج پیدا ہوگئے جمیل مردم بے ۱۸ر فروری کو عہدہ سے مستعفی ہوگئے۔ ان کے بعد دو کابینہ بنے۔ ایک وطن پرستوں کا دوسرا غیر جانبداروں کا لیکن یہ چند ہفتہ ہی قائم رہے۔ حالت اس قدر نازک ہوگئی کہ ہائی کمشنر نے پولیس کے اختیارات خود لے لئے اور مارچ میں دمشق میں فوجیں بلالیں۔ یہ حالت نازک تر ہوگئی جب ۲ر جولائی کو گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ اقلیتوں کو خود مختاری میں کچھ اور حصہ دیدیا جائے نتیجہ یہ ہوا کہ ہاشم بے العطشی نے اپنے عہدۂ صدر جمہوریہ سے استعفا دیدیا۔

اس صورت حال کا خاتمہ کرنے کے لئے ہائی کمشنر مجبور ہوا کہ دستور کو ملتوی کردے۔ ایوان کو برخاست

کردے اور حکومت کو ایک نظارت کے سپرد کردے جس کا نگراں وہ خود بنے اس نے اس کا بھی اعلان کیا کہ ملک کو اس قسم کی کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ فرانس اپنا اقتدار شام میں باقی رکھنا نہیں چاہتا، اس نے یہ بھی کہا کہ وہ بذات خود مندوبی طرز حکومت کو طویل مدت تک قائم رکھنے کا قائل ہے اور اُن وعدوں کے خلاف ہے جو فرانسیسی گورنمنٹ یکم مارچ ۱۹۳۶ء سے اب تک کرتی رہی ہے۔ اس کے نزدیک یہاں فرانسیسی ہی حکومت ہونا چاہئے کل نظام اس طرح درہم برہم کردئے جانے سے اور ان سزاؤں سے جو وطن پرستوں کو اس اعلان کے بعد دی گئیں فرانس کی شام کی پالیسی کا ایک نیا اور بہت عملی رخ ظاہر ہوا۔

اس وقت شام میں شمالی افریقیہ کی طرح دو سال کے اندر موسیو بلوم کے وسیع اصلاحات کے خلاف ردعمل ہوا اور حاکمانہ طریقہ حکومت کی طرف رجعت ظاہر ہوئی۔ موجودہ جنگ نے وطن پرست جماعتوں کو ایک بہت اچھا موقع بغاوت کیلئے دیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ان لوگوں نے اتحادیوں سے بے ساختہ اتحاد عمل شروع کردیا۔ دمشق، ٹیونس، الجیریا اور نیز ہر جگہ کے باشندوں کی رائے متحدہ طور پر ہٹلر کی نسلی طرز حکومت کے خلاف ہوگئی باوجود اس کے کہ برلن سے شکیب ارسلاں بہت مستعدی سے جرمنوں کا پروپیگنڈا کرتا رہا۔

لیکن اگر وطن پرست لیڈروں نے (خصوصاً شام میں) اپنے مطالبات کو فی الحال ملتوی کردیا ہے تو انھوں نے یہ بات بھی بالکل واضح کردی ہے کہ جنگ کے بعد وہ نئی شدت وقوت سے اپنے مطالبات پیش کرینگے جمیل مردم بے نے جہاں یہ کہا کہ شام ہمیشہ فرانس کا مددگار رہے گا اور اس کا ایک وفادار حلیف" وہاں ساتھ ہی یہ امید بھی ظاہر کی کہ فرانس کی گورنمنٹ اپنی قدیم روایتی پالیسی اختیار کرلے گی اور عربی ممالک کو ان کے وطنی عزائم کو پورا کرنے میں مدد دے گی۔ ڈاکٹر شاہ بندر نے اس سے زیادہ صاف الفاظ استعمال کئے۔ انھوں نے کہا، "گذشتہ جنگ میں عرب مسلح ہوئے اور اتحادی ممالک کی طرف سے لڑے۔ اب بیس برس بعد اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ دوش بدوش پھر کھڑے ہیں کیونکہ ان کی قسمت لازمی طور جمہوریتوں سے وابستہ ہے۔ اتحادیوں کی اس فتح سے ان کو اپنی آزادی اور خود مختاری کی امید ہے"

فرانس خود اپنی ذہنیت ظاہر کردے گا اگر اس نے جنگ کے بعد اپنی مسلم پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ شام اور لبنان میں اس کو اپنے کئے ہوئے وعدوں کا لحاظ کرکے شام و لبنان کے جمہوریوں کو

ضرور آزاد کر دینا چاہیئے۔ شمالی افریقہ کی ماتحت حکومتوں یعنی ٹیونس اور مراکش میں اسکو مکمل دستوری تبدیلیاں کرنا چاہئیں۔ ماتحتی حکومت کے نظریہ کو دوبارہ جانچنا چاہیئے اور اس کے قانونی اساس کی صحیح اور قطعی وضاحت کر دینی چاہیئے۔ الجیریا میں فرانسیسی آبادی کے حقوق تمام مسلمانوں کو بھی ملنا چاہیئے۔ سیدھا سادہ انصاف تو یہی ہے۔ اس سے فرانس کو بھی فائدہ ہوگا کیونکہ اس طرح وہ ایک قابل عبور رشتہ اس پان عرب ازم کی لہر کے لئے قائم کر دے گا جو مشرق سے شمالی افریقہ میں بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ان تمام ملکوں میں فلاحین (کاشتکار) کو زمین ضرور دینا چاہیئے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو سرکاری ملازمتیں دے کر ان کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ وطن پرستوں کے تمدنی مطالبات کو خواہ مشرق قریب ہی سے مستعار کیوں نہ ہوں اس روشنی میں نہ دیکھنا چاہیئے جس طرح مخصوص پارٹیوں کے سیاسی دستور العمل دیکھے جاتے ہیں اور آخری بات یہ کہ گورنمنٹ کو اطلاعات حاصل کرنے اور مسلم پالیسی کو متحد کرنے کے ذرائع کو ترقی دینا چاہیئے۔ حالانکہ بحر روم میں ہائی کمیٹی (جو وزیر اعظم کے دفتر سے ملحق ہے) اور شمالی افریقہ میں مختلف نظاموں کو متحد کرنے کی وزارت یہ دونوں اسی طرح کے اقدام ہیں لیکن ان جیسے اور بھی ہونے چاہئیں۔

سنہ ۱۹۴۰ء کے بجٹ پر دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء میں بحث کرتے ہوئے موسیو سرآ وزیر داخلہ، موسیو ہیریو صدر ایوان اور موسیو مینڈل وزیر نوآبادیات نے وعدہ کیا تھا کہ فرانس ان خدمات کو نہیں بھولے گا جو اس کی نوآبادیات موجودہ جنگ کے زمانہ میں انجام دے رہی ہیں۔ اپنے سمندر پار مقبوضات کو فرانس نے کافی مہذب بنا دیا ہے۔ اب جبکہ وہ خطرے میں ہے وہ اپنی تمام شفقت و وفاداری سے اس احسان کا بدلہ دے رہی ہیں۔ اگر کل صلح ہو جائے اور جیسا کہ تمام فرانسیسی امید کرتے ہیں کہ یہ صلح انصاف کی صلح ہوگی تو یہ انصاف محض یورپین قوموں کے لئے نہیں بلکہ نوآبادیاتی باشندوں کے لئے بھی ہونا چاہیئے۔

عرب کا مسئلہ بحر روم کے معاملات میں یقیناً بہت اہم حیثیت رکھے گا صرف فرانس و برطانیہ ہی نہیں بلکہ اٹلی و اسپین بھی دنیائے عرب کے واقعات سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ اسپین کی مثال لیجئے جب جنرل بیگ بید رمراکش کے اسپینی علاقہ کے ہائی کمشنر تھے تو انھوں نے وہاں کے بے شمار باشندوں کو فرانکو کی طرف سے لڑنے کے لئے نوکر رکھا اور انھوں نے مراکش کے فرانسیسی علاقہ

ہیں وطن پرستوں کی حریت کی آگ کو خوب مشتعل کیا۔ اب جبکہ وہ فرانکو کا وزیر خارجہ ہے ممکن ہے وہ یہی حکمت عملی دوسری آمری طاقتوں کی مدد سے دوسری جگہ بھی پھیلائے۔

جہاں تک اطالیہ کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ مسولینی کی مسلم پالیسی محض اس کی عام خارجی حکمت عملی کی ایک شکل ہے اطالیہ کی مسلم رعایا کی آبادی چالیس لاکھ جاہل حبشیوں اور سات لاکھ بے رہنما باشندگان لیبیا پر مشتمل ہے۔ ان کی بہبودی کے متعلق فاشستی حکومت کو کچھ زیادہ خیال نہیں ہے مسولینی کا مقصد فرانکو کی طرح منفی ہے یعنی فرانس اور برطانیہ کے مقبوضات میں دباری، کے ریڈیو اسٹیشن سے عربی زبان میں نشر کے ذریعہ اشتعال پھیلاتے رہنا اور اشتعال انگیز رسائل کا شائع کرنا اور شکیب ارسلاں کے سے شورش کرنے والوں کی ہمت افزائی کرنا۔ ۳۷ء میں مسولینی نے تو یہاں تک کیا کہ ترپولی میں ایک شاندار جلوس کے سامنے خود کو "محافظ اسلام" کا لقب دلوایا۔ فسطائی پروپیگنڈہ زیادہ کامیاب ہوتا اگر روم نے اطالوی نوآبادیوں کی نسلی برتری اور غیر مخلوط رہنے کے خیال سے چند شدید قوانین لیبیا اور حبش میں نہ بنا دئے ہوتے۔ لیبیا میں ایک "مخصوص اطالوی شہریت" قائم کر دی گئی ہے جس کی رو سے وہاں کے باشندوں کو افریقہ کے حدود میں محض چند حقوق دئے گئے ہیں اور انھیں صرف چند معمولی و شہری عہدوں کو حاصل کرنے کا مجاز ہے۔ بالفاظ دیگر ان مسلمانوں کے لئے جو اطالیوں سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور فرمانبردار ہیں، ایک قسم کی دوسرے درجے کی شہریت قائم کی گئی ہے۔

باشندوں کے حقوق سے اسی قسم کی نفرت فسطائی نوآبادیات کے تصور میں بھی پائی جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ بحر روم پر قبضہ حاصل ہو جائے اور اطالوی استبداد اور مستحکم ہو جائے۔ اپنے فوجیوں کو لیبیا کے ساحل پر آباد کرنے کے خیال سے فسطائی گورنمنٹ نے وہاں کے باشندوں کی عمدہ زمینیں انھیں دیدی ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے اٹلی شام پر بُری طرح بمباری بھی کر چکا ہے۔ یہ تمام واقعات دنیائے اسلام کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب اٹلی کو معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی مسلم پالیسی کی بدولت تمام مسلمان اس کے سخت دشمن ہو گئے ہیں۔

(ماخوذ از فارین افیرس)
(مترجمہ۔ ف۔ ا۔ کرمانی)

روس اور جرمنی کا اتحاد

یہ مضمون ڈبلو۔ بی۔ کری وٹسکی کی مشہور کتاب "میں اسٹالین کا ایجنٹ تھا" سے ماخوذ ہے کری
ڈسکی نے تقریباً بیس سال سوویٹ حکومت میں گذارے اور ہیگ میں سوویٹ کے فوجی خبر رسانی
کے محکمہ کا افسر اعلیٰ رہا۔ جب اسٹالین نے فوجی افسروں اور پرانے انقلابیوں کا قتل عام
کیا تو کری وٹسکی اور حکومت میں اختلاف پیدا ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرتی وٹسکی کو اپنی خدمات
سے سبکدوش ہونا پڑا۔ حکومت کا افسر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اُس کو حکومتی طبقہ کے خفیہ
ارادے معلوم تھے جن کا اُس نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔

ہٹلر کے قوت میں آنے سے دس سال پہلے معاہدۂ روپالو نے برلن اور ماسکو میں دوستانہ
تعلقات قائم کر دیئے تھے۔ اُس زمانہ میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہو گیا تھا
جرمن فوج اور سرخ فوج کا میل جول بڑھ گیا تھا۔ اور روس نے جرمنی کو اجازت دیدی تھی
کہ وہ سرزمین روس پر اپنی فوجی تنظیم کرے تاکہ ورسائی کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے
کے الزام سے بھی بچ جائے اور فوجی قوت بھی پیدا کرلے۔ اِس رعایت کے بدلے میں جرمنی
نے سرخ فوج کو نئے طریقۂ جنگ سکھانے کا وعدہ کیا تھا اس طرح دونوں ممالک کی دوستی
گہری ہو گئی تھی اور دونوں ملکوں میں خوب تجارت ہونے لگی تھی

جرمنی میں اس زمانہ میں تین پارٹیاں قوت حاصل کرنے کے لئے جد وجہد کر رہی تھیں۔
ان میں سے ایک پارٹی کا لیڈر ہٹلر تھا۔ پروگرام کے اختلاف کی بنا پر دوسری دونوں
پارٹیوں نے ہٹلر کے خلاف سمجھوتا کر لیا تھا اور یورپی سلطنتوں کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ
اب ہٹلر کی طاقت ختم ہوجائے گی لیکن اسٹالین کا یہ خیال تھا کہ چونکہ فوج ہٹلر کے ساتھ

ہے اس نئے آخری فتح اس کی ہی ہوگی چنانچہ اسٹالین نے پولٹیرو میں تقریر کرتے ہوئے کہا "جو کچھ جرمنی میں ہو رہا ہے نازیت کے زوال پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس کے برخلاف وہ ظاہر کرتا ہے کہ نازی ازم کو طاقت اور اقتدار حاصل ہو جائے گا۔"

اسٹالن کا خیال درست ثابت ہوا اور کچھ ہی مدت میں ہٹلر برسر اقتدار آگیا۔ لیکن نازی ہٹلر۔ کمیونسٹ اسٹالن کا دشمن نکلا ہٹلر نے قوت پکڑتے ہی روس سے تجارتی اور فوجی دوستی ختم کر دی۔ اس پر اسٹالن بہت پریشان ہوا اور اُس نے مخالف کو دوست بنانے کی کوشش شروع کر دی اور اسٹالن کی رائے کے مطابق پولٹبر (یعنی بولشیوک پارٹی کی سیاسی کمیٹی) نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہر ممکن طریقہ سے ہٹلر کو روس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اسٹالن بذات خود ہمیشہ ایک طاقتور دشمن سے سمجھوتہ کرنے کو بہتر خیال کرتا ہے وہ لینن کی موت کے بعد ہی سے جرمنی سے سمجھوتہ کرنا چاہتا تھا۔ نازیت کے عروج نے اس کی خواہش کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا لیکن اسٹالن ہٹلر کی طرف جتنا بڑھتا تھا ہٹلر اتنا ہی پیچھے ہٹتا تھا۔

۲۸ دسمبر ۱۹۳۳ء کو جب ہٹلر کو چانسلر بنے ہوئے گیارہ مہینے گزر چکے تھے مولوتوف نے سوویٹ کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے کہا "ہمارے بین الاقوامی تعلقات میں جرمنی ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ سوویٹ یونین کو کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جس کی بنا پر وہ اپنی پالیسی میں کوئی ایسی تبدیلی کرے جس سے روسی جرمنی تعلقات پر کوئی اثر پڑے" اسی دن خارجی کمیسار لٹویناف نے اپنی تقریر میں کہا "سیاسی اور اقتصادی وجوہات کی بنا پر دس سال سے ہمارے جرمنی کے ساتھ تعلقات ہیں۔ ہم ہی صرف وہ ایک ایسی قوم ہیں جس کو معاہدۂ ورسائی اور اُس کے نتائج سے کچھ واسطہ نہیں۔ ہم نے وہ حقوق بھی چھوڑ دیئے جو اس معاہدہ نے ہم کو دے تھے۔ ہماری خارجی تجارت میں جرمنی کو اوّل درجہ حاصل ہے اور روس و جرمنی نے ان اقتصادی اور سیاسی تعلقات کی بنا پر بڑے فوائد حاصل کئے ہیں۔ ہم جرمنی سے تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ سوویٹ اور جرمنی ان

تعلقات کی بنا پر سوائے فوائد کے اور کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم کو مشرق، مغرب یا کسی اور سمت میں بڑھنے اور اقتدار حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے اور ہم خوش ہوں گے اگر جرمنی بھی ہم سے یہی بات کہے۔"

۲۶ جنوری ۱۹۳۴ء کو استالین نے بذات خود سوویٹ کانگریس کے سترویں جلسہ میں ہٹلر سے سمجھوتہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور کہا "جرمنی میں فاشسزم کا قائم ہو جانا ہم کو کسی طرح مجبور نہیں کرتا کہ ہم اپنی پالیسی میں کسی قسم کی تبدیلی کریں کیونکہ ہم کو فاشسزم سے کوئی تعلق نہیں۔ اٹلی میں بھی فاشسزم ہے لیکن وہ روس اور اٹلی کے درمیان اچھے تعلقات قائم کرنے میں سد راہ نہیں ہوئی"

لیکن ہٹلر نے ان دوستانہ اشاروں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی چنانچہ مجبور ہو کر استالین کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑا۔

اب اس نے ہٹلر کو روس سے صلح کرنے پر مجبور کرنا چاہا۔ اس نے سوچا کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سوویٹ روس کو اب معاہدہ وار سائی کی حمایت کرنی چاہیئے۔ مجلس اقوام میں شامل ہونا چاہیئے۔ اور جرمنی کے خلاف دوسرے ملکوں سے معاہدے کرنے چاہئیں تاکہ جرمنی ڈر کر سمجھوتہ کرنے پر راضی ہو جائے۔ استالین نے اس تجویز پر ۱۹۳۴ء عمل کرنا شروع کیا۔ سرکاری اخباروں سے پراودا (Pravada) اور زیوسٹیا (Izvestia) میں جرمنی کے خلاف مضامین شائع ہونے لگے۔ استالین کے طرز عمل میں جو تبدیلی ہوئی تھی اس کا پروپیگنڈا ان اخبارات کے ذریعہ کیا جانے لگا لیکن مضامین اس ترکیب سے لکھے جاتے تھے کہ دوسرے ممالک کے کمیونسٹ تو یہ سمجھیں کہ روس کا اقدام بالکل جائز اور مناسب ہے اور جرمنی و روس کے درمیان سمجھوتہ کا دروازہ بھی کھلا رہے۔

ان مضامین کی تیاری میں استالین نے خود حصہ لیا تھا۔

ادھر تو یہ مضامین لکھے جا رہے تھے ادھر کمیسار لٹوینوف ہٹلر سے سمجھوتہ کرنے کی

کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اپریل ۱۹۳۴ء میں لٹوینوف نے ہٹلر سے یہ بات بھی کہی کہ دونوں ممالک مل کر بلقانی ریاستوں کی آزادی کا ذمہ لیں لیکن ہٹلر نے اس کو نامنظور کردیا

مضامین برابر چھپ رہے تھے اور دوسرے ممالک روس کی اس سیاست پر اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔ فرانس والے خوش تھے کیونکہ ان مضامین سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ روس فرانس کی طرف متوجہ ہوا چاہتا ہے اور بلقانی ریاستوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا آرزومند ہے تاکہ جرمنی کا گھیراؤ ڈال لے۔

اسی زمانے میں ریڈک استالن کے اشارہ پر ایک مضمون لکھتا ہے "جرمن فاشزم اور جاپانی شہنشاہیت ایسی جدوجہد میں مشغول ہے جس سے دنیا کا نقشہ بدل جائے۔ یہ جدوجہد دراصل سویٹ روس۔ فرانس، پولینڈ، چیکوسلیوکیا، رومانیہ۔ بالٹک کی حکومتوں چین اور ممالک متحدہ امریکہ کے خلاف ہے لیکن برطانوی شہنشاہیت یہ چاہتی ہے کہ یہ جدوجہد محض سوویٹ یونین ہی کے خلاف ہو۔ اور باقی کسی ملک کے خلاف نہ ہو"

ریڈک نے یہ مضمون تو چھپوا دیا لیکن جب کری وتسکی نے ریڈک سے اس نئی پالیسی کے بارے میں دریافت کیا تو وہ کہنے لگا " صرف بیوقوف ہی یہ خیال کرسکتے ہیں کہ ہم جرمنی سے بگاڑ سکتے ہیں۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ایک چیز ہے اور حقیقت دوسری جو کچھ جرمنی نے ہمارے ساتھ کیا ہے دوسرا ملک نہیں کرسکتا۔ جرمنی سے الگ ہوجانا ہمارے لئے ناممکن ہے"

غرضکہ جو مضامین اخباروں میں شائع ہوئے تھے اُن کو حقایق سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ تو محض اعلیٰ سیاسیات سے تعلق رکھتے تھے۔ استالین اس طرح جرمنی کو روس کے قریب لانا چاہتا تھا۔

رشتۂ اتحاد قائم کرنے کے لئے لیٹوینوف نے یورپی ممالک کا ایک دورہ کیا لیکن یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ اس کا دورہ جرمنی کو خوف زدہ کرکے اُس سے سمجھوتہ

پر آمادہ کرنے کے لیے ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ معاہدۂ لوکارنو کی بابت بات چیت کرنی ہے۔

۱۳ جون ۱۹۳۴ء کو لٹوینوف نے برلن پہونچ کر جرمنی کے وزیر خارجہ سے ملاقات کی اور مشرقی یورپی پیکٹ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ جب جرمنی نے اس دعوت کو بھی ٹھکرا دیا تو پھر یہ دھمکی دی کہ اگر جرمنی معاہدہ میں شامل نہ ہوا تو روس دوسرے ممالک سے فوجی معاہدے کرے گا۔ لیکن جرمنی وزیر خارجہ نے یہ کہہ کر کہ جرمنی فوجی گھیرے سے خوف زدہ نہیں ہے لٹوینوف کو خاموش کر دیا۔

اس واقعہ کے اگلے دن یعنی ۱۴ جون ۱۹۳۴ء کو ہٹلر مسولینی سے وینس میں ملا۔

استالن اس جواب سے بھی نا امید نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے پولینڈ کو پھسلانا شروع کیا کہ وہ اپنی پالیسی کی ایسی وضاحت کرے جو جرمنی مفاد کے خلاف ہو۔ لیکن پولینڈ روس کے اس اقدام سے گھبرا گیا اور اس نے جرمنی سے مدد چاہی۔ پولینڈ اور جرمنی کے تعلقات زیادہ مضبوط ہو گئے۔ جس سے استالن کو اور زیادہ تشویش ہو گئی۔ لیکن وہ اب بھی نا امید نہیں ہوا۔

دو ہفتہ بعد ریڈک نے اپنے مضمون میں لکھا "کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ فاشسٹ جرمنی اور سویٹ روس کیوں نہ ساتھ ساتھ چلیں جبکہ فاشسٹ اٹلی اور سویٹ روس میں گہرے تعلقات ہیں۔"

لیکن ہٹلر نے ہر بات سننے سے انکار کر دیا۔ فوجی گھیرے کی بھبکی بھی کارآمد ثابت نہیں ہوئی۔ آخر کار استالن نے اس بھبکی کو عملی جامہ پہنانے کی ٹھانی۔

لیٹوینوف دوبارہ جنیوا گیا۔ اور نومبر میں فرانس آ کر پیری لاول سے فرانس اور روس کے سمجھوتہ کے بارے میں گفت و شنید شروع کر دی۔ اور ۵ نومبر کو ان دونوں ممالک میں ایک معاہدہ ہو گیا۔ اس کے چار دن بعد لیٹوینوف نے یہ بیان جاری کیا سویٹ نے ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کی ہے۔ کہ وہ تمام ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے اور خصوصاً

جرمنی سے مجھے اُمید ہے کہ فرانس کا بھی یہی رویہ ہے۔ اور مشرقی یورپی پیکٹ ان تینوں ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے گا۔"

اب ہٹلر کو حرکت ہوئی۔ اُس نے سوویٹ کو ۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰ سونے کے مارکس کا قرضہ ۱۹۳۵ء میں دیا۔ جس کی وجہ سے استالن نے اپنی تقریر میں کہا "ہم کس طرح یقین کر سکتے ہیں کہ ہٹلر ہم سے جنگ کرے گا جبکہ وہ ہم کو اتنا بڑا قرضہ دیتا ہے۔ یہ بات ناممکن ہے کیونکہ جرمنی میں تجارتی گروہ بہت طاقتور ہے۔"

اسی دوران میں جرمنی اور جاپان کے درمیان سمجھوتہ کی خفیہ بات چیت ہو رہی تھی اور ہر فان ربن ٹراپ اور جاپانی فوجی اتاشی ہیروشی اوشی ما کے درمیان ایک فوجی معاہدہ ترتیب دیا جا رہا تھا۔ اس معاملہ کی دوسرے ملکوں کو خبر نہیں تھی۔ لیکن باوجود پردہ داری اور رازداری کے روسی حکومت کو اس خفیہ معاہدہ کا پورا پورا علم ہو گیا۔ استالن نے اس راز کو طشت ازبام کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ چپ لگائے رہا۔ یہانتک کہ ۱۹۳۶ء میں بعض اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ جرمنی اور جاپان میں کسی قسم کا خفیہ سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ ۱۰ جنوری کو مولوتف نے اپنی تقریر میں خفیہ معاہدہ کا اخباروں کے حوالہ سے ذکر کیا۔ لیکن یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ اُن کو اس معاہدہ کا پورا پورا علم ہے۔ ۱۲ جنوری کو ٹوکیو اور برلن نے اگرچہ اس خبر کی تردید کر دی۔ لیکن دوسرے ممالک کو یقین نہ آیا۔ اور تمام ممالک کی نظریں برلن پہ لگ گئیں۔ اب جاپان اور جرمنی نے اس خفیہ معاہدہ کو چھپانے کے لئے دوسرا معاہدہ انٹی کمنٹرن (Anti - Commintern) پیکٹ ترتیب دیا جب ۱۹۳۵ء کو برلن میں دستخط ہو گئے۔ لیکن اس پیکٹ کے پیچھے اصلی جاپانی جرمن معاہدہ کچھ اور تھا جس کی شرائط یہ تھیں۔

۱۔ برلن اور ٹوکیو سے جو بھی سیاسی کارروائی ہو وہ دونوں ممالک کے صلح و مشورہ سے عمل میں آئے چاہے اُس کارروائی کا تعلق مغربی یورپ سے ہو یا بحر الکاہل سے۔

۲- ان تمام معاملات کو جن کا تعلق روس اور چین سے ہو دونوں ممالک ترتیب دیں اور بغیر ایک دوسرے کی رائے کے نہ تو کوئی یورپ میں قدم اٹھائے نہ بحرالکاہل میں۔

۳- برلن نے اپنے جنگی اسباب اور ہتھیاروں میں جو کچھ تبدیلی اور نئی ایجاد کی ہے ٹوکیو کو بتلائے۔ اس معاہدہ میں کیمونزم کا لفظ تک نہیں آیا تھا۔ اور نہ کسی ایسے اقدام کا پتہ چلتا تھا جو کیمونزم کے خلاف ہو۔ اب استالن نے برلن کو بتانا چاہا کہ سویٹ گورنمنٹ خفیہ معاہدہ کی بابت سب کچھ جانتی ہے چنانچہ کیا رلٹو ینوف نے ۲۸ نومبر کو سویٹ کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"جہانتک جرمن۔ جاپان کے انٹی کمینٹرن پکیٹ کا تعلق ہے میں آپ سے کہوں گا کہ اس سے کوئی مطلب نہ نکالیں۔ کیونکہ اس معاہدہ میں درحقیقت کوئی معنی پوشیدہ نہیں ہیں وہ تو ایک دوسرے اصلی معاہدہ کو چھپانے کے لئے کیا گیا ہے اور وہ دوسرا معاہدہ نہ تو شائع ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس اصلی معاہدہ کے لئے پندرہ مہینے درکار ہوئے ہیں جس میں کیمونزم کا لفظ تک بھی نہیں آیا۔ اور وہ خفیہ معاہدہ اس جنگ کو جو ایک براعظم پر لڑی جائیگی دوسرے براعظم تک پھیلانے کے لئے ہے......!"

اس بیان سے جرمنی میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ لیکن ہٹلر پھر بھی خاموش ہی رہا۔ آخرکار استالن نے دوسری چال چلی۔ اس نے فرانس سے ایک اور معاہدہ کیا اور چیکوسلوکیا سے بات چیت شروع کی۔ اور ایک دوسرے کی مدد کا عہد کیا۔ انٹی فاشسٹ ممالک میں پروپگنڈا کیا۔ اور ان کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ پھر جرمنی اور اٹلی کے خلاف اسپین کی خانہ جنگی میں کود پڑا... تاکہ برطانیہ اور فرانس پر یہ ظاہر کر سکے کہ وہ جرمنی سے کسی طرح صلح نہیں کر سکتا دوسری طرف اس نے اپنے خاص سفید ڈیوٹ کینڈیلیکی سے کہا کہ وہ ہٹلر سے صلح کی بات چیت کرے۔ ان سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے ہٹلر ڈر گیا اور اس سے سمجھوتہ کرنے پر راضی ہوگیا۔ استالن کی چال چل گئی اس نے پولٹبرو ( ) کے اجلاس میں

اعلان کر دیا" مستقبل قریب ہی میں ہم جرمنی سے ایک سمجھوتہ کرلیں گے۔ ۱۹۳۸ء میں شروع کے تین مہینوں تک تو بات چیت ہوتی رہی۔ آخر کار معاہدہ کا ڈھانچہ تیار ہوگیا۔

۱۲ مارچ کو ہٹلر نے آسٹریا ہضم کرلیا لیکن روس نے اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی ستمبر میں سوڈیٹس لینڈ پر بھی قبضہ کرلیا اور روس نے کوئی صدائے احتجاج بلند نہ کی۔ غرضکہ ۱۹۳۸ء جیسا معرکہ آرا سال گذر گیا اور اسٹالن نے اپنی زبان تک نہیں ہلائی۔ آخر کار ۱۲ جنوری ۱۹۳۹ء کو ہٹلر اور روسی سفیر کے درمیان دوستانہ بات چیت شروع ہوئی ایک ہفتہ بعد نیوز کرانیکل میں یہ خبر شایع ہوئی کہ نازی جرمنی اور سوویٹ روس میں کوئی سمجھوتہ ہوا چاہتا ہے۔ ۲۵ جنوری کو ڈیلی ہیرلڈ کے نامہ نگار نے لکھا "نازی حکومت کو اب یہ یقین ہوگیا ہے کہ اب یورپ میں کوئی جنگ چھڑی تو روس غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کرے گا۔ جرمنی کے تجارتی وفد کا مقصد جو ماسکو جارہا ہے تجارتی نہیں بلکہ سیاسی ہے"

فروری کے شروع میں معلوم ہوا کہ ماسکو نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ اپنا تیل جرمنی اور اٹلی اور دوسری ایسی قوتوں کو جن کا تعلق روم۔ برلن سے ہے فروخت کریگا۔ یہ پالیسی برطانیہ اور فرانس کے بالکل خلاف تھی۔

آخر کار ۱۰ مارچ ۱۹۳۹ء کو اسٹالن بول اٹھا۔ اس نے ہٹلر کی کھلم کھلا طرفداری کی۔ اور یہاں تک کہدیا کہ جمہوریتیں فضا کو خراب اور زہریلا بنانا چاہتی ہیں تاکہ جرمنی اور روس میں ناچاقی پیدا ہوجائے لیکن روس اور جرمنی کے ظاہری تعلقات میں ناچاقی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اسٹالن کی تقریر کے پانچ دن بعد ہٹلر نے چیکوسلویکیا پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور اسٹالن خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔

اسٹالن کی پالیسی کا اظہار کہ وہ ہر صورت سے جرمنی سے سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے ایک اخبار میں اگست ۲۲ سے پہلے ہی شائع ہوچکا تھا اور ۲۳ اگست ۱۹۳۹ء کو دنیا دنگ رہ گئی جب برلن سے ہر فان ربن ٹراپ اور ماسکو سے مولوٹف نے روسی۔ جرمن پیکٹ کا اعلان کیا اور اس طرح یورپ کی آئندہ تاریخ میں ایک زبردست انقلاب پیدا کرنے کا سامان مہیا کردیا۔

(مترجمہ ایم ایم جوہر میرٹھی)

روسی ظرافت

قوموں میں یہ قوم وہ ہے جو لطیفے بڑے شوق سے سنتی ہے۔ مگر آخر میں یہ ضرور پوچھتی ہے کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ آپ منہ بنا کر ہنسنے کی وجہ بتائیے تو اس قوم کے لوگ آپ کی خاطر "اچھا یہ بات تھی" کہہ کر کھیسیں نکال دیتے ہیں۔ اور آپ اپنے لطیفے پر ترس کھا کر اور ہنسنے والے کی موٹی سمجھ پر افسوس کر کے رہ جاتے ہیں۔ اگر اس قوم کے لوگوں کو کسی بات پر ہنسی نہ آتی تو ہم سمجھ لیتے کہ گونگوں اور بہروں، لولوں اور لنگڑوں کی طرح ایک قسم ایسے آدمیوں کی بھی ہے جو ہنس نہیں پاتے۔ مگر لطف تو یہ ہے کہ یہی لوگ خوب ٹھٹھے مار کر ہنستے ہیں۔ اور مذاق کے سوا ہر طرح کی بات پر ہنس لیتے ہیں۔

لطیفے اور حکایت کے لئے ملک اور زبان اور قوم کی کوئی قید نہیں، اور بہت سے لطیفے ایسے ہیں کہ جو ذرا ذرا سا بھیس بدلے ہوئے آپ کو ساری دنیا میں ملیں گے۔ ظرافت کی قسمیں اور وہ باتیں جن پر ہنسی آنا چاہئے ہر جگہ قریب قریب ایک سی ہیں۔ بعض موقعے ایسے آتے ہیں جن پر لوگوں کو ہنسی ضرور آتی ہے۔ مثلاً یہ کہ کسی کی ٹوپی ہوا میں اڑ جائے اور وہ اس کے پیچھے دوڑے یا کسی موٹے آدمی کا پیر پھسل جائے اور وہ گرتے گرتے بچے۔ حماقتیں بیان کرنے اور ان پر ہنسنے کا بھی ہر جگہ رواج ہے۔ لیکن تہذیب نے اور پابندیاں لگانے کے ساتھ ٹھٹھا مار کر ہنسنا بھی نامناسب ٹھہرایا ہے۔ اس لئے ہر جگہ ہنسی کی قدرتی خواہش کو تہذیب کا لباس پہنا کر ظرافت کی شکل دیدی گئی ہے۔ اور اسے گدگدانے اور ہنسانے کے طریقے بتا دیئے گئے ہیں۔ روسی ناول نویس سکوت کا قصہ ہے کہ ایک زمیندار تھے جنھوں نے اپنے بھتیجے کو پڑھانے کے لئے ایک انگریز استانی رکھی۔ وہ دراصل کسی اور فراق میں تھی اور جب انھیں یہ معلوم ہوا تو یہ ایسے گھبرائے کہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ان کے اچانک گھر اور شہر چھوڑ کر بھاگ گئے سے پولیس کو شبہ

ہو، اور اس نے ان کا پیچھا کیا۔ یہ سمجھے کہ انگریز استانی ان کو پولیس کے ذریعے پکڑ انا چاہتی ہے تو یہ اور بھاگے۔ روس سے بھاگ کر جرمنی اور وہاں سے دوسرے ملکوں میں پہونچے۔ روسی پولیس نے اپنی طرف سے ضابطے کی کارروائی جاری رکھی۔ ہر ملک کی پولیس کو ہدایت کر دی کہ ان پر نظر رکھے اور یہ بے چارے مفت میں بین الاقوامی مجرم بن گئے۔ لِسکوف کا یہ قصہ ظرافت کی وہ قسم ہے جس میں ہنسی کی بات کا کوئی موقعہ یا واقعہ ہوتا ہے۔ ظرافت کی یہی قسم زیادہ مہذب، زیادہ نفیس بھی ہو سکتی ہے۔ لِسکوف ہی نے اپنے ناول "گرجا والوں" میں پادری اخلا کی کرامات بیان کی ہیں جو نہایت ہی تندرست، کھانڈرا اور جاہل تھا۔ یہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ بے دینی اور اس چیز کو جسے ہمارے یہاں ایک زمانے میں نیچریت کہتے تھے دور کرے۔ چنانچہ اُس کا ہر وقت میونسپل ہائی اسکول کے سائنس ماسٹر سے مقابلہ رہتا تھا۔ سائنس ماسٹر میونسپلٹی سے لاشیں مانگتا تھا کہ وہ علم تشریح پڑھا سکے۔ میونسپلٹی چاہتی تھی کہ نئے علم کی سرپرستی کر کے نام پیدا کرے۔ اس لیے وہ لاوارثوں کی لاشیں اور متفرق ہڈیوں کو خرید کر سائنس ماسٹر کو دیا کرتی تھی۔ انھیں لاشوں کو پادری اخلا چرا لیجاتا اور بڑی دھوم دھام سے دفن کرتا۔ یہ دین کی خدمت تھی اس لیے میونسپلٹی پادری اخلا کو لاوارث مردوں کو دفن کرنے کا انعام بھی دیتی تھی۔ سائنس ماسٹر کے لیے لاشوں اور ہڈیوں کا چوری جانا ہی ایک مصیبت نہ تھی۔ وہ آزاد خیال تھا، سائنس کی زبان میں گفتگو کرتا تھا لیکن اس کی ماں بیچاری جاہل تھی۔ اور جب لڑکے کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو اُسے شبہ ہوتا کہ لڑکے نے دین و ایمان کے خلاف کچھ کہا ہوگا اور وہ نحوست دور کرنے کے لیے اس کی ناک کے سامنے تالی بجاتی۔

انقلاب سے پہلے تک روس میں لِسکوف کی ظرافت بہت پسند کی جاتی تھی۔ انگریزوں کی ظرافت جس کا دنیا بھر میں چرچا ہے زیادہ تر اسی قسم کی ہوتی ہے۔ جرمن بھی ہنستے ہیں تو ایسی ہی باتوں پر۔ فرانسیسی البتہ زیادہ نفاست پسند ہیں۔ وہ ہنسنا تہذیب کی شان کے خلاف مانتے ہیں۔ ان کے یہاں صرف مسکرانا مناسب ہے اور ظرافت ذہانت اور قابلیت کو ظاہر کرنے کا طریقہ ہے۔ اپنی اچھی سے اچھی شکل میں فرانسیسی ظرافت نکلنے میں بسی ہوئی علم اور تجربہ کا نچوڑ ہوتی ہے۔ جو ظرافت اس

ئے کی نہیں ہوتی۔ اس میں دنیا کی، آدمی کی اور خاص طور سے عورت اور مذہب کی تحقیر پر لطف
مذاز سے کی جاتی ہے۔ ایسی ظرافت صرف اس شخص میں ہو سکتی ہے جو اپنے آپ کو زندگی اور دنیا
والوں سے اس قدر برتر سمجھے کہ آدمیوں اور ان کے کاروبار سے بے تعلق ہو جائے۔ زندگی اس
کے لئے ایک تماشا ہو جس پر وہ الگ کھڑا ہو کر اپنی رائے چٹکلوں میں بیان کرے۔ یہ ادا روسیوں
کی طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ بھی دل میں دنیا کو ایک دھوکا اور انسان کی آرزوؤں اور
کوششوں کو ہیچ سمجھتے ہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ دنیا سے کوئی دامن جھاڑ کر الگ نہیں ہو سکتا۔ ان
کے نزدیک جو اس مغالطے میں ہو کہ وہ دوسروں کی طرح خواہش اور امید، کوشش اور جستجو، کامیابی
اور مایوسی کے جال میں پھنسا ہوا نہیں ہے اور پھنس نہیں سکتا وہ سب سے زیادہ بے وقوف ہے
اور سب سے پہلے اسی پر ہنسنا چاہئے۔ فرانسیسیوں کی ظرافت شوخ اور منچلی ہے، روسیوں کی گہری
اور مسکین۔ ایک بجلی کی طرح زندگی کے دریا پر چمکتی ہے، اس کی سطح کو روشن کر دیتی ہے مگر اندر تک
نہیں پہونچتی۔ دوسری اسی دریا میں غوطے لگاتی ہے اور جو کچھ لاتی ہے دریا کی تہ سے لاتی ہے
کہنے والوں نے کہا ہے روسی ایک آنکھ سے ہنستا اور دوسری سے روتا ہے۔ یعنی دنیا کا تماشا
دیکھ کر اُسے ہنسی آتی ہے۔ لیکن اسے اُن لوگوں سے جنھوں نے اپنے آپ کو یک تماشا بنا دیا
ہے ہمدردی اور محبت اتنی ہے کہ ان کے حال پر اسے رونا بھی آتا ہے۔ اس کی نظر اتنی تیز
ہے کہ پردے اور اوٹ کو جو دنیا والے اپنے بھیدوں کو چھپانے کے لئے لگاتے ہیں
پار کر جاتی ہے۔ جس چیز پر پڑتی ہے اس کے ہر پہلو کو دیکھ لیتی ہے۔ اس لئے روسی کو ہنسی آئے
تو کچھ تعجب نہیں۔ اس کی نظر اوچھی پڑتی تو وہ ہنس کر رہ جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ روسی کی نظر زندگی
میں سا جاتی ہے۔ اور جیسے ہی اس کو ہنسی آتی ہے ویسے ہی اس کا دل درد سے تڑپ اٹھتا ہے
یہی وجہ ہے کہ روس کے پہلے بڑے ناول نویس نکولائی ویسل یوچ گوگول نے آخر عمر میں لکھنے پڑھنے
۔۔ ہنسنے ہنسانے سے توبہ کی جتنے مسودے چھپنے سے رہ گئے تھے انھیں جمع کر کے جلا دیا۔ اور
اپنے دوستوں کو بھی نصیحت کرنے لگا کہ گنہگاروں کی زندگی چھوڑ دو اور مذہب کی گود میں

پناہ ڈھونڈو!

گوگول نے شروع میں جو افسانے لکھے اور ان سے بھی بڑھ کر اس کے ڈرامے ظرافت سے لبالب بھرے پیالے ہیں جنھیں پی کر آدمی ہنسی سے بالکل بے قابو ہو جاتا ہے لیکن یہ خاص روسی ظرافت نہیں ہیں۔ اصل روسی ظرافت کے نمونے ہیں اس کے ناول "مردہ روحیں" میں ملتے ہیں۔ گوگول کے زمانے میں کسان زمینداروں کے غلام تھے۔ اور جیسے ہم آج کل حساب لگاتے ہیں کہ فلاں جائداد میں اتنے گاؤں ہیں ویسے ہی روس میں کہا جاتا تھا کہ فلاں زمیندار اتنی روحوں یعنی کسانوں کا مالک ہے اور انھیں کے حساب سے اس سے مالگذاری لی جاتی تھی۔ مردم شماری دس برس کے بعد ہوتی تھی اور اس درمیان میں جو کسان مر جاتے ان پر بھی مالگذاری ادا کرنی پڑتی تھی۔ ایک بہت چلتے ہوئے آدمی چچیکوف کو خیال آیا کہ ایسی مردہ روحوں کو زمینداروں سے خرید کے عدالت میں ایک بیان داخل کر دے کہ میں نے اتنی روحیں خریدی ہیں اور جب وہ ان کا مالک تسلیم کر لیا جائے تو اپنی اس روحوں کی جائداد کو کسی بنک میں گرو رکھ کر اس پر روپیہ قرض لے اور چلتا بنے۔ چچیکوف نے گاڑی کرایہ پر لی اور یہ انوکھا بیوپار شروع کیا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیسے کیسے آدمیوں سے ملا ہوگا۔ اوروں کو چھوڑیئے۔ بس دو کا حال ذرا سا سن لیجیے۔ ایک صاحب نوجوان زمیندار ہیں۔ بڑے شاعرانہ مزاج کے، دن بھر اونگھتے اور طرح طرح کی تجویزیں سوچتے رہتے ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ گھر کے پیچھے جو بڑا سا تالاب ہے اس پر پل بنوائیں اور اس پر دونوں طرف اچھی اچھی دوکانیں لگوائیں۔ لیکن ان کے ڈرائنگ روم میں برسوں سے کئی مونڈھے رکھے ہیں جن پر کپڑا چڑھانا رہ گیا ہے جو ملنے آتا ہے اس سے یہ کہتے ہیں کہ ان پر نہ بیٹھو، یہ ابھی تیار نہیں ہیں مگر مونڈوں پر کپڑا چڑھانے کی نوبت نہیں آتی۔ ان سے ملاقات ہوتی تو آپ فوراً پرکھ لیتے کہ یہ اپنے زمانے کے تعلیم یافتہ روسیوں کا نمونہ ہیں جنھیں قدرت نے چاہا تھا کہ بہت ہی اچھے آدمی بنائے مگر انھیں بنا نہیں چکی تھی کہ اور کسی کام میں لگ گئی اور یہ نامکمل رہ گئے۔ دوسرے صاحب ایک شہر کے سرکاری وکیل تھے۔ ان کی بائیں آنکھ جھپکتی رہتی۔ اسے جھپکتے دیکھ کر آپ سمجھتے کہ وہ آپ کو اشارہ کر رہے ہیں

بکہ پاس کے کمرے میں چلو تو تمھیں بڑے مزے کی بات سناؤں۔ مگر وکیل صاحب ایسے تھے ہی نہیں جیسا کہ ان کی آنکھ کے جھپکنے سے معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑے سیدھے، خاموش دبّو آدمی تھے۔ انھیں کوئی خاطر میں نہ لاتا اور بیان کرنے والے نے بیان کیا ہے کہ جب جان پہچان کے لوگوں نے انھیں مرتے دیکھا تبھی انھیں یقین ہوا کہ وکیل صاحب کے روح بھی تھی۔

روس میں ان وکیل صاحب سے زیادہ بے حقیقت لوگ تھے جو دنیا میں آتے اور پرچھائیں کی طرح گذر جاتے۔ ان کا نمونہ گوگول نے اپنے ایک افسانے میں پیش کیا ہے جس کا نام "لبادہ" ہے۔ "لبادے" کا ہیرو اکاکئی اکاکئے وچ ایسا آدمی ہے کہ جس کے نام کو سن کر اور صورت کو دیکھ کر لوگ مسکرا دیتے۔ طبیعت کا یہ نہایت مسکین۔ سب بے چاروں میں یہ سب سے زیادہ بے چارہ ہے۔ لوگوں کے سامنے آتے سڑک پر چلتے شرماتا ہے۔ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا نہیں اور دیکھتا ہے تو اس انداز سے کہ گویا وہ دنیا میں پیدا ہونے پر بہت نادم ہے اور اپنے قصور کی معافی چاہتا ہے۔ وہ ایک دفتر میں ملازم ہے اور اس کا کام کاغذات نقل کرنا ہے۔ اُسے خوش نویسی کا بڑا شوق ہے اور وہ کام جسے ہم آپ بہت خشک سمجھتے ہیں اُسے اتنا پسند ہے کہ اس میں وہ اپنی جان کھپا دیتا ہے۔ دنیا میں وہ اور کچھ نہیں چاہتا سوا اس کے کہ اپنی خوشخطی کی دُھن پوری کرتا رہے۔ مگر بے چارہ کیا کرتا اُسے سردی بہت لگتی تھی اور آخر مجبور ہو کر ایک موٹا لبادہ بنوانے کی آرزو کرنے لگا۔ اس نے برسوں پیسے جوڑ جوڑ کر اتنا جمع کر لیا کہ ایک لبادہ بنوا سکے۔ لبادہ اس نے بنوا لیا لیکن پہلے ہی دن جب وہ اسے پہن کر نکلا تو وہ چوری گیا۔ اکاکئی اکاکئے وچ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا، وہ مر گیا اور اس کا بھوت مدتوں تک شہر بھر میں لبادے کو ڈھونڈتا پھرتا رہا۔

اکاکئی اکاکئے وچ کے سراپے اور اس کی سرگذشت پر روسیوں کو ہنسی آئی۔ لیکن وہ خیال ہی خیال میں اس سے گلے مل کر رو دئے بھی اور کہا کہ ہم بھائی بھائی ہیں اور ایک دوسرے سے بہت ملتے ہیں۔ یہ ایک واقعہ بھی ہے کہ اکاکئی اکاکئے وچ کی دلگیر مسکینی روسی ادب پر کوئی پچاس برس تک چھائی رہی۔ گوگول کی کسی نے نقل نہیں کی لیکن اسے کوئی کیا کرتا کہ دس بیس، روسیوں میں، دو چار اکاکئی اکاکئے وچ

سکے ہم شکل اور ہم مزاج ضرور ملے گے کوئی گھرانہ کوئی محل ان سے خالی نہ تھی۔ گوگول نے کسی ایک آدمی کو پکڑ کر اس کا مذاق نہیں اڑایا تھا۔ اس کی نظر نے اس سانچے کو دیکھ لیا تھا جس میں لاکھوں آدمی ڈھلتے ہیں۔ اور آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ سانچا اب ٹوٹ گیا ہے یا قدرت اسے کام میں نہیں لاتی۔

گوگول کی طرح ایک آنکھ سے ہنسنے اور ایک آنکھ سے رونے کی عادت قریب قریب ہر روسی ادیب کو تھی۔ لیکن حقیقت کو لطیفہ بنا دینے کی جو قدرت گوگول کی تھی وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی گوگول سے پہلے فون ویزن اور گریبوئے دوف، اس کے بعد دستوفسکی اور گونچروف کی تصانیف میں ہمیں طنز اور ظرافت کے بڑے اچھے اچھے نمونے ملتے ہیں اور گونچروف اپنے ناول "اوبلوموف" میں تو گوگول سے بھی بازی لے گیا۔ تورگنیف مایوسی اور دستہ ئفسکی روحانی کشمکش میں ایسے مبتلا معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے نام کے ساتھ ظرافت کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ مگر تورگنیف کی ظرافت سنہری کرن کی طرح مایوسی کی کالی گھٹاؤں کو چیر کر نکل آتی ہے اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ وہ مصیبت، اور بے چینی کی اس فضا سے اثر نہ لے جو دستہ ئفسکی کی دنیا پر چھائی رہتی ہے اسے دستہ ئفسکی کے ناولوں میں بھی بہت سے دلچسپ موقعے اور واقعے مل جائیں گے کہ جن پر آدمی ہنس سکتا ہے۔ لیکن دستہ ئفسکی اس ہنسی میں شریک نہیں ہوتا۔ اسے رونا بہت آتا ہے ہنسی کسی بات پر نہیں آتی اور لطیفہ بیان کرنا وہ جانتا ہی نہیں۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ٹالسٹائی کا بھی ہے اس میں ظرافت کی کمی نہ تھی، مگر معلوم ہوتا ہے اسے ہنسنے ہنسانے کی مہلت نہیں ملی۔ آپ اس کی ظرافت کا اندازہ کرنا چاہیں تو اس چھوٹی سی حکایت کو سن لیجئے۔ اور دیکھئے کہ ٹالسٹائی ایک ذرا سے اشارے میں ہم سب کی زندگی کے کتنے دلچسپ موقعے اور واقعات یاد دلا دیتا ہے۔ کارینن نامی ایک صاحب جو بہت بڑے عہدے پر ملازم ہیں۔ اپنی بیوی آننا کی بے حیائیوں سے عاجز آ کر ایک وکیل سے طلاق کے بارے میں مشورہ کرنے جاتے ہیں۔ وکیل صاحب کی عادت تھی کہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہاتھ سے مچھر پکڑا کرتے تھے اور اس میں انھیں ایسی مشق ہو گئی تھی کہ جو مچھر ان کے پاس آتا وہ پھر بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔

جس وقت کارینن صاحب اپنی مصیبتیں بیان کر رہے تھے وکیل صاحب کی نظریں مچھر کو تلاش کرتی رہیں۔ جیسے ہی کارینن صاحب نے اپنی رام کہانی ختم کی ایک بہت بڑا مچھر وکیل صاحب کے سامنے سے گذرا انھوں نے اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ اٹھایا، مگر پھر انھیں کارینن صاحب کی پریشانیوں کا خیال آیا اور انھوں نے مچھر کو نہیں پکڑا۔

روس کے باہر روسی ظریفوں کا سرتاج چیخوف مانا جاتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ روس کیا دنیا کے ظریفوں کا بادشاہ ہے۔ چیخوف کا دل دنیا کے دکھ درد سے تڑپتا رہتا تھا اس کے بہت سے افسانے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر آدمی ہفتوں غمگین رہتا ہے بعض کو پڑھئے تو ایسا دم گھٹنے لگتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ لیکن جب وہ ہنساتا ہے تو آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ چیخوف بہت نیک آدمی تھا۔ اس کی ظرافت بھی بہت ہی نیک ہے۔ اس کے پھولوں میں کوئی کانٹا نہیں ہوتا چیخوف ہنساتا ہے تو کسی بات پر کسی آدمی پر نہیں ہنساتا۔ اس کی ہنسی میں یہ تاثیر بھی ہوتی ہے کہ وہ دل کو صاف کرتی ہے۔ ہم کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم عقلمند ہیں اور کوئی دوسرا بیوقوف۔ چیخوف کی ظرافت عقلمند اور بے وقوف کے فرق کو مٹا کر ہمیں یقین دلا دیتی ہے کہ جن باتوں پر ہم ہنستے ہیں وہ ہمارے ساتھ بھی پیش آسکتی ہیں اور تب ہم بھی کریں گے تو کیا کریں گے ہنس کر رہ جائیں گے چیخوف کی اس میٹھی دوا کی کوئی خوراک ہمیں اس وقت نہیں پلا سکتا۔ لیکن آپ تلاش کریں تو کتب فروشوں کے یہاں یہ دوا آپ کو آسانی سے مل جائے گی اور اکثر دواؤں سے سستی ہوگی۔ اس میں وقت اور خوراک کی کوئی قید بھی نہیں۔ بس جب ملے اور جتنی ملے۔

(پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن) (بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

تخلیقی ذہنیت کیا ہے؟

تخلیقی ذہنیت کے لئے آزادی اور انفرادیت کا وجود اور ان کا احترام لازمی ہے۔ انہیں سے افراد کی نشوونما اور تکمیل، اور ذہانت میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ وہی اشتراک عمل کا باعث ہیں اگر اخلاقی لحاظ سے دیکھیں تو ان کے ماتحت دوسروں کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگنی چاہیئے۔ نفسیاتی اعتبار سے اختلافات اور کشمکش کی وجہ سے ہم آہنگی اور یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ تعلیمی رو سے فرماں برداری، ہمدردی، اجتماعی خدمت اور ذمہ داری کی افزائش ہوتی ہے جدید سائنس نے زمان ومکان کے قیود کو فنا کر دیا ہے اور ذرائع آمد ورفت میں وسعت وہمہ گیری پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اچھے شہری کے لئے عالمگیر شہری ہونا ناگزیر ہے۔ جس میں وسیع النظری اور آفاقی ہمدردی کے جذبات اس طرح موجزن ہوں کہ وہ تمام نوع انسانی کو ایک خاندان خیال کرے جیسی کہ اسلام کی تعلیم ہے۔ اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللہ۔ ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ۔۔۔ کہ در آفرینش زیک جوہر اند (سعدیؒ)

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا ۔۔۔ کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا (حالیؒ)

اور وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور ابن آدم کی تقسیم چاہتا ہے حقارت کی نظر سے دیکھے۔ مولانا حالیؔ نے انسانیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے ؎

چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسائگاں ۔۔۔ از سموم نجد در باغ عدن پژمان شدن

خوار دیدن خویشں را از خواری ابنائے جنس ۔۔۔ در شبستان تنگ دل از محنت زندان شدن

آتش قحطے کہ در کنعان بسوزد باغ وکشت ۔۔۔ سرفراز تخت مصر از تاب وے بریاں شدن

آزاد شہری تیار کرنے کے لئے تاکہ وہ تخلیقی اعمال سے معاشرہ کی از سرنو تنظیم کر سکیں، حسب ذیل اوصاف لازمی ہیں:۔

۱۔ سماجی ذمہ داری کا احساس غالب ہونا چاہیئے جس میں دوسروں کی فلاح وبہبود اور ہر انسان کی آسائش وآرام کا خیال شامل ہے۔ ان میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ عوام کی غربت افلاس جہالت بیماری اور سماجی مشکلات کو دور کرسکیں۔ دوسروں کی خوش حالی کے لئے جدوجہد کرنا ذاتی اغراض کو پس پشت ڈالنا عوام کی فرماں برداری کے سامنے خواص کی اطاعت کو نظرانداز کرنا حقیقی مدنیت کے مرادف ہے۔

۲۔ قوم اور سماج کے کاموں میں پورے انہماک اور مستعدی سے حصہ لینا۔ فرائض کی انجام دہی میں پیچھے نہ ہٹنا اور اجتماعی ورثے سے پوری طرح استفادہ کرنا ان کا فرض عین ہے۔ اگر وہ اجتماعی ورثے کے عوض کوئی خدمت نہ کریں تو ان کی پرورش طفلی سے زیادہ نہ ہوگی۔

۳۔ ان کو آزادی کا مرشار و رشیدائی ہونا چاہیئے۔ وہ آزادی جو نہ صرف انفرادی ہو بلکہ سماجی اور ملی بھی ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حقیقی رواداری اور سچی محبت بھی ان کی سرشت کا ایک جزو ہونا چاہیئے۔

۴۔ بین الاقوامی سیاست اور بین الملی مسائل پر غور وفکر لازمی ہے۔ اس سے سلجھے ہوئے خیالات کی افزائش ترقی ہوتی ہے۔ جدید سیاست سے کافی دلچسپی لینا، بین الاقوامی تحریکات سے خواہ وہ سیاسی ہوں یا اقتصادی خوب واقف ہونا۔ جمہوری ممالک میں ایسا ہی ضروری ہے جیسے حیات انسانی کے لئے ہوا، پانی اور روشنی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک بچے کو مدنی زندگی کے لئے کس طرح سے تیار کیا جاسکتا ہے۔ اور اسکولوں میں کون سے ذرائع استعمال کئے جائیں کہ اچھی مدنیت کی تعلیم وتربیت ہوسکے اچھی مدنیت کے لئے مختلف سماجی اداروں کا باہمی تعاون ضروری ہے۔ مغربی ومشرقی اسکولوں میں جہاں جہاں آزادی اور اشتراک عمل کا دور دورہ ہے وہاں مدرسے نہایت کامیابی کے ساتھ اچھے شہری پیدا کر رہے ہیں۔ اچھے شہری پیدا کرنے کے لئے مکمل سلح کی تشکیل بھی لازمی ہے۔ جہاں بچوں کو ایسے مواقع بہم پہونچائے جائیں کہ وہ آزادی کے ساتھ مدنی فرائض کو عملی طور سے انجام دے سکیں

یہ اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی روح ہر عمل میں جاری و ساری ہو۔ اور اسکولوں کا نصب العین بجائے ذاتی غرض اور شخصی منفعت کے متحدہ خدمت، جماعتی منصوبے اور معاشرتی مقاصد ہوں اسکولوں میں ایسی سوراجی حکومت قائم کی جائے جس میں بچے خود حصہ لے سکیں۔ اور جس میں قیادت، ضبط و تادیب، باہمی آمد و رفت، ذمہ داریوں اور فرائض کی تقسیم، عہد و پیماں کے لحاظ وغیرہ کے لئے خاص طور پر مواقع دیئے جائیں۔ ان تمام اوصاف کو بیرونی زندگی میں کامیاب بنانے کے لئے بچوں کو ایسے مواقع دئے جائیں کہ وہ خارجی دنیا اور مسائل زندگی سے پوری طرح آشنا ہو سکیں، اس قسم کے مشاغل میں جو انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے ہوتے ہیں طلباء کو نہایت قابل قدر تربیت اور واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ان میں اعتماد ذات، صلاحیت عمل اور ذوق سلیم پیدا ہوتا ہے اور وہ مل جل کر تقسیم کے اصول پر کام کرنا سیکھتے ہیں۔ ہر اچھے مدرسے میں اس قسم کے بہت سے مشاغل خود بخود بچوں کے اپنے شوق و اہتمام سے رائج ہو جاتے ہیں مثلاً مدرسے کا رسالہ نکالنا، مختلف قسم کی علمی و ادبی انجمنیں قائم کرنا، تعلیمی سیر و تفریح کا اہتمام کرنا، مجلس مباحثہ کا چلانا، حکومت خود اختیاری کا انتظام، فرصت کے اوقات میں دستکاری کا شغلہ، اپنے شوق سے فنون لطیفہ میں سے کسی فن کی مشق۔" (اصول تعلیم از سیدین)

جدید نظریہ تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے طریق ڈلٹن، میڈم مونٹسوری طریقہ تعلیم اور گیری اسکیم وغیرہ عالم وجود میں آئے ہیں۔ ان طریقوں میں افراد کی نشو ونما کو امتیازی حیثیت دی گئی ہے اور ان کی تکمیل کے لئے انواع واقسام کے مشاغل اور طرح طرح کے سامان و آلات فراہم کئے جاتے ہیں جن کو وہ اپنے شوق سے عملی جامہ پہناتے ہیں۔ گیری اسکیم میں خاص طور پر سماجی معائنہ (Social Survey) کے فرائض کو اپنے طور پر انجام دینے کے لئے ذمہ داری بچوں ہی کے سپرد کی جاتی ہے۔ معلم کی حیثیت صرف ایک دوست اور رہبر کی ہوتی ہے جو راستہ دکھا کر لیکن اس راستہ پر چلنا طلباء پر چھوڑ دیتا ہے۔ سماجی معائنہ میں بچوں کو اپنے گاؤں یا شہروں کی

اجتماعی، اقتصادی تعلیمی اور حفظان صحت وغیرہ حالات کا معائنہ کرنا پڑتا ہے اور ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد ان کو مختلف سماجی خدمات کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً شبینہ اسکولوں کا قائم کرنا، اسپتالوں کی دیکھ بھال، غربا کی امداد، صفائی کا کام، اخلاقی برائیوں کی اصلاح حفظان صحت پر لکچر اور جسمانی خدمات وغیرہ۔ نیز اس کے ساتھ بین الاقوامی حالات کا تفحص اور تنقیدی مطالعہ تاکہ بچے زندگی کے مسائل عصریہ کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ جو لوگ علم اور تہذیب کو قدیمی روایات اور آثار تک محدود رکھتے ہیں اور علوم جدیدہ کو بے معنی خیال کرتے ہیں وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم علوم بھی ہمارے لئے اس واسطے ضروری ہیں کہ نئے علوم کی عمارت بغیر اس بنیاد کے تعمیر نہیں کی جا سکتی حقیقی تمدن میں جغرافی حدود کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک عالمگیر اور وسیع چیز ہے۔ برٹرنڈ رسل کا خیال ہے کہ عالمگیر شہری بننے سے ہمہ گیر انسانی معاشرہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اقوام کے نصب العین کے مطالعہ کا کافی موقع ملتا ہے اور حال کو ماضی اور استقبال کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

تعلیم میں مسائل حاضرہ، جدید تاریخ، سیاسی اور اقتصادی امور، اجتماعی معاملات اور سماجی اداروں کے ارتقاء شامل ہونا چاہیے۔ نصاب میں ان مضامین کی عدم موجودگی سے ہر شہری کو سخت نقصان پہونچے گا۔ اسکولوں میں ان معلومات کو دلچسپ اور آسان بنانے کے لئے رسائل و اخبارات کا مطالعہ، مکالمہ، مباحثہ کی ترویج، نیز فضلاء کے مقالات کا سننا بچوں کے لئے لازمی قرار دیا جائے تاکہ بچوں میں فطری شوق پیدا ہو اور وہ ہر مسئلہ پر گفتگو کرنے اور سمجھنے کی پوری کوشش کریں۔ اس کے علاوہ بچوں کو تاریخ محض پرانے واقعات، جنگ و جدال، قتل و خونریزی شاہانہ عظمت و جلال اور بھولے بسرے افسانوں کا مجموعہ سمجھ کر نہ پڑھائی جائے جیسا کہ عموماً ہمارے مدارس میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے نہ تو عمرانی تربیت میں مدد ملے گی نہ اخلاقی تربیت میں بلکہ تاریخ کی تعلیم بحیثیت "ارتقا، تمدن انسانی" کے پیش کی جائے۔ اور ماضی کا مطالعہ اس طرح کرایا جائے کہ اس سے موجودہ تمدنی اور سیاسی حالات پر روشنی پڑے اور جس سے تاریخ، نظام معاشرت اور اس کے تمام پیچیدہ اور ترقی یافتہ اداروں کی تفسیر کا ذریعہ بن جائے۔ تاریخ کا فرض یہ ہے کہ وہ

اس عمل ارتقا کی توضیح کرے اور طلبا کو یہ بتائے کہ مسلسل انسانی سعی اور جد وجہد سے تمدن کی ہر شاخ میں کس طرح ترقی ہوئی اگر طلبا اس کا مطالعہ غور وفکر سے اور صحیح نقطہ نظر سے کریں گے تو وہ انسانی ارتقا کی نوعیت، اس کی رفتار اور اس کے رجحانات کو پہچاننے لگیں گے۔ وہ اپنے اجتماعی و معاشری فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیں گے اور اپنے حقوق سے اچھی طرح استفادہ کرینگے .... بحیثیت مجموعی علم تاریخ انھیں یہ بتائے گا کہ جدید و قدیم تمدن کے رنگا رنگ تار و پود کے ملنے سے کس طرح یہ جامہ تیار ہوا۔ وہ کون سے محرکات تھے جو مختلف ایجادات، اختراعات، انکشافات اور جغرافی سیاحتوں کا باعث ہوئے۔ اور ان چیزوں نے کس طرح زندگی کے نئے نئے طریقوں کی بنیاد ڈالی۔

یہی حال جغرافیہ کا ہے۔ علم جغرافیہ چند اصطلاحوں اور رسمی ناموں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی معاملات اور ان کے باہمی ارتباط کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے بشرطیکہ اس کے مطالعہ میں معاشری اور انسانی پہلو مقدم رکھا جائے۔ تاریخ اور جغرافیہ دونوں میں انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ تاریخ تو انسان کا تعلق وقت اور زمانے سے دکھاتی ہے یعنی اس پر روشنی ڈالتی ہے کہ گزشتہ صدیوں میں اس کی زندگی اور تمدن میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ جغرافیہ انسان اور اس کے طبیعی ماحول کے تعلق سے بحث کرتا اور یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی نشو ونما کس حد تک ایک دوسرے پر منحصر ہے۔ بہر حال دونوں کو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے سروکار ہے۔ جغرافیہ کی اخلاقی اہمیت یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کے باہمی ربط کو ظاہر کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ وہ کیسے عالم طبیعی کے واسطہ سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور کس طرح اقتصادی اور مادی زندگی کی بقا اور اصلاح و ترقی کے لئے لوگوں کا باہمی تعامل ضروری ہے اور تقسیم عمل کے اصول پر زراعت، صنعت و حرفت اور مختلف پیشوں کی تنظیم لازم آتی ہے۔ اسی کے ساتھ جغرافیہ انسانی تخیل اور ہمدردی کا دائرہ وسیع کرتا ہے۔ اور اس طرح طالب علم کی عمرانی تربیت میں مدد دیتا ہے۔

سائنس کی تعلیم جس کو عام طور پر محض مادی مفاد کے حصول اور صنعت وحرفت کی ترقی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ دراصل اس زمانے میں اخلاقی و عمرانی تربیت کا جزو لازم ہوگئی ہے۔ کیونکہ اس کی مدد سے طلبا موجودہ تمدن کو سمجھتے ہیں جس کی بنیاد بڑی حد تک سائنس اور اس کے استعمال پر ہے اور اسی کے ذریعہ سے انسان فطرت کی طاقتوں کو مسخر کرکے انھیں مقاصد کے لئے کام میں لاتا ہے۔ قرآن حکیم نے سب سے پہلے یہ تعلیم دی تھی:-

وسخر لکم ما فی السموٰت وما فی الارض جمیعًا منہ ط (۴۵:۱۱)

اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ نے تمہارے لئے مسخر کردیا ہے۔ (یعنی ان کی قوتیں اور تاثیریں اس طرح تمہارے تصرف میں دیدی گئی ہیں کہ جس طرح چاہو کام لے سکتے ہو)۔

ہُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ط (بقر)

اسی نے تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے بنایا

ہو الذی انزل من السماء ماء لکم منہ شراب ومنہ شجر فیہ تسیمون ینبت لکم بہ الزرع والزیتون والنخیل والاعناب من کل الثمرات ط (نحل)

اسی خدا نے آسمان سے تمہارے لئے پانی اتارا کچھ اس میں سے تم پیتے ہو۔ کچھ درخت اُگتے ہیں جس میں جانور چراتے ہو، اور وہی خدا تمہارے لئے کھیتی، زیتون اور چھوہارے اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔

وسخر لکم الیل والنہار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ ط (۱۶-۲)

اور اس نے تمہارے لئے رات، دن، چاند اور سورج کو مسخر کیا اور ستارے اس کے حکم سے مسخر ہیں۔

وہو الذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحما طریا وتستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونہا وتری الفلک مواخر فیہ

اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو مسخر کیا تاکہ تم اس سے گوشت کھاؤ اور اس سے زیور کی

ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون ط (۱۴:۱۶)

قیمتی چیزیں نکالو جو تمہارے پہننے میں کام آتی ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر میں موجیں چیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں تاکہ تم خدا کے فضل کو ڈھونڈو اور شاید کہ تم اس کا شکر کرو۔

حضرت شیخ سعدیؒ نے اس مطلب کو یوں ادا کیا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

سائنس کے مطالعہ سے ہر شہری پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انسان نے دنیا میں جس قدر مادی ترقی کی ہے اس میں سب قوموں اور جماعتوں کا حصہ ہے اور جب تک تمام ماہرین سائنس اپنی اپنی علمی تحقیقات کے نتائج سے اپنے شرکار کار کو مطلع نہ کریں اور ان میں نہایت قریبی اشتراک عمل نہ ہو سائنس ترقی نہیں کرسکتی۔ علاوہ ازیں سائنس نے انسان کو سب سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز سبق یہ سکھایا ہے کہ اب وہ خود اپنی تربیت یافتہ عقل کے ذریعہ اپنے معاملات کی ہدایت اور رہنمائی کرسکتا ہے۔ اب اس کی قسمت کا انحصار نامعلوم اور خوفناک قوتوں کی مرضی پر نہیں ہے ......

......اچھے شہری کو سائنس کا مطالعہ صحیح طریقہ پر کرنا چاہیئے تاکہ وہ معاشری زندگی کے ان شعبوں میں کامیابی کے ساتھ شریک ہوسکے جن کی بنیاد سائنس کے علم پر ہے۔ جان ڈیوی لکھتا ہے:-

"نصاب تعلیم میں بھی سائنس کا کام وہی ہے جو اس نے نسل انسانی کے لئے انجام دیا ہے یعنی تجربہ کو اس کی مقامی اور عارضی پابندیوں سے آزاد کرنا اور عقلی ترقی کی ایسی راہیں کھول دینا جن میں شخصی عادات اور رجحانات کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اس طرح جب کوئی خیال اس مخصوص اور محدود دائرے سے جس میں وہ پیدا ہوا ہے نکال کر ایک مجرد تصور بنا دیا جائے اور اس کو زیادہ وسیع معنی دیدیئے جائیں تو انفرادی تجربے کے نتائج سب لوگوں کے کام میں آسکتے ہیں۔ اور انجام کار فلسفیانہ نقطہ نظر سے

سائنس عمرانی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ہے"

"ادب، انسانی خیالات و جذبات، انسانی آرزوؤں اور امنگوں، انسانی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ترجمان اور انسان کے قلب و روح کی واردات اور جد و جہد کا آئینہ دار ہے اس کے ذریعہ سے شہری نہ صرف مختلف قسم کی مفید معلومات حاصل کرتے ہیں بلکہ قدیم اور جدید خیالات و جذبات اور دنیا کے بہترین مفکرین کے شاہکاروں سے روشناس ہوتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ان کی نظر زیادہ وسیع، ان کی ہمدردی زیادہ عام، ان کی قدرشناسی کی حس زیادہ تیز ہو جاتی ہے اعلیٰ ترین ادب ایک شہری کو نہ صرف معاشری معاملات اور مسائل کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے، نہ صرف اپنی سحر آفرینی سے گذشتہ زمانوں اور شخصیتوں کو دوبارہ زندہ کر دکھاتا ہے۔ بلکہ ان صفات کو جو انسانیت کا جوہر ہیں نشوونما دے کر اخلاقی تربیت میں معاون ہوتا ہے۔ وہ ایک شہری کو براہ راست اخلاقی تلقین اور نصیحت نہیں کرتا بلکہ اپنے موضوع کو اس انداز سے پیش کرتا ہے اور واقعات اور افسانوں کو اس پیرایہ میں بیان کرتا ہے کہ ان کا مجموعی اثر اس کے جذبات کی تہذیب کا باعث ہوتا ہے......
عالی اور صالح ادب کی پہچان اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ غیر محسوس طریقہ پر ایک شہری کے بہترین خیالات اور جذبات کو ابھارے اور خود بخود اس کی سیرت میں سرایت کر جائے۔ ادب تربیت اخلاق کا ایک موثر ذریعہ ہے اور بقول ارسطو اس سے روحانی تنقیہ ہو جاتا ہے۔ زبان کی مشق کرانے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات و تجربات کے مطالعہ پر زور دیا جائے اور اس کی وساطت سے ہر شہری کو بنی نوع انسان کے بہترین خیالات و احساسات میں شرکت کا موقع ملے۔" (اصول تعلیم از خواجہ غلام السیدین)

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی

علم تاریخ کی اہمیت

اس تجارتی زمانہ میں ہر چیز کو افادی اُصولِ مادی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ تاریخ کو بھی بہت سے لوگوں نے اسی معیار پر جانچا اور یہ کہکر مسترد کر دیا کہ وہ غمِ روزگار کو دور نہیں کرتی ہماری معاشی دشواریوں کا حل نہیں تبلاتی اس لئے بیکار اور غیر مفید ہے۔ محمد تغلق ناکامیاب ہوا یا اکبر کامیاب ہوا۔ اس سے ہماری زندگی قطعاً متاثر نہیں ہوتی۔ پھر ہمیں کیا غرض ہے کہ اس دفترِ پارینہ کو پڑھیں اور بلا وجہ سر کھپائیں؟
انسان کسی حادثہ کی پیداوار نہیں ہے۔ آج جو اس کی شکل ہے۔ اس میں نہ معلوم ارتقا کی کتنی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات ظہور میں آئے اور حیوانات نے ترقی کر کے انسانی جامہ پہنا۔ اسی طرح انسانی ادارے بھی ماضی سے وابستہ ہیں اور محض دورِ حاضرہ کی چیز نہیں ہیں۔ بالفاظ دیگر انسان کوئی ہنگامی اور حیاتیاتی مظہر نہیں ہے۔ اس کا ماضی سے تعلق قدیم اور ازلی ہے۔ اور اس طرح ہم ازمنہ گذشتہ کے وارث حقیقی ہیں۔ ہماری کتنی بڑی بدنصیبی ہوگی اگر ہم ان لوگوں کے کارناموں سے بے خبر رہیں جنھوں نے ہمیں یہ وراثت بخشی ہے۔ تاریخ اس وراثت کا محضر ہے۔ اور تمام فوائد سے قطع نظر، اگر تاریخ کو اسی معیار پر جانچا جائے تو اس کا نہ پڑھنا اپنے اوپر سب سے بڑا ظلم ہوگا۔

ترقی کا انحصار ان شہریوں پر ہے جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے کماحقہ باخبر ہیں اور ان کا عقلی طور پر جائزہ لے سکتے ہیں۔ کامیاب زندگی کے لئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ فرد اور ماحول کے تعلقات میں ہم آہنگی اور استواری نہ ہو۔ شہریت کا احساس اور قومی ذمہ داریوں کا شعور اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہم اپنے ماحول کے نشیب و فراز سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ تاریخ ماحول ماضیہ کی داستان اور اسلاف کے تجربوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بغیر ہم حالات حاضرہ کو جو ماضی کے اثرات اور مستقبل کے امکانات کے باعث

کافی اُلجھے ہوئے ہیں، اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ علم تعلیم کی رو سے بھی تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہے
ایک بچہ اپنے اندر تاثر اور ردِ عمل کے بے شمار امکانات چھپائے ہوئے ہے۔ تاریخ ان سب کو بروئے کار
لاتی ہے اور اُس کی تمام ذہنی اور دماغی قوتوں کی صحیح تربیت میں امداد دیتی ہے۔ بچہ کی بے ترقی یافتہ
شخصیت ماضی کی ترقی یافتہ شخصیتوں سے دوچار ہوتی ہے اور اسطرح اس کی صلاحیتوں کے اُبھرنے اور سنورنے
میں سہولت پیدا ہوتی ہے تاریخ کے ذریعہ اس کی ہمدردیاں وسیع سے وسیع تر ہو سکتی ہیں۔ سیاسی تعصبات
دور ہو سکتے ہیں تخیّل میں صحت اور رفعت پیدا ہو سکتی ہے اور تحقیق و تلاش کا جذبہ بیدار ہو سکتا
ہے۔ غرض وہ کامیابی کے ساتھ زندگی گذارنے کا اہل بن سکتا ہے۔

یہاں اس غلطی میں نہ مبتلا ہونا چاہیئے کہ تاریخ کوئی مستقبل کی راہ متعین کرتی ہے یا ہمیں
زندگی بسر کرنے کے ضابطے اور قواعد فراہم کر دیتی ہے۔ تاریخ تو صرف ماضی کی روشنی میں
حال کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے وہ اقدام و عمل کی راہ مقرر نہیں کرتی۔ ہم چندر گپت موریہ
کے اصولوں کے ذریعہ ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کو نہیں سلجھا سکتے اور نہ اکبر کی پالیسی کے
ذریعہ موجودہ فرقہ وارانہ مسئلہ کو طے کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے
اور موجودہ دنیا میں تو واقعات اتنی تیزی سے رُونما اور تغیر پذیر ہوتے ہیں کہ اگلے روز اُن کی
صورت بھی نہیں پہچانی جاتی۔ تاریخی واقعات صرف حال کے پس منظر سے وابستہ ہیں
اور ہم اُن کی مدد سے حالاتِ موجودہ کو زیادہ ژرف نگاہی کے ساتھ دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔
اس لئے کہ حال کے گنجان درخت کی جڑیں ماضی کی تہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور یہ اتنی دور
تک چلی گئی ہیں کہ اگر ہم منزل بہ منزل چلتے رہیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ارتقائی سلسلہ عہد بربریت
سے بھی قبل شروع ہوتا ہے۔

یہ بھی کہنا غلط ہے کہ تاریخ درسیاتِ اخلاق کا مجموعہ ہے تاریخ کے جدید نظریہ کے ماتحت
ہمیں اپنے مخصوص معیارِ اخلاق کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے صادر کرنے کا حق ہے۔ تاریخ
کے ذریعہ اخلاق کی جو کچھ تعلیم ہو وہ بالواسطہ ہو، براہ راست نہیں جس طرح آرٹ کا اخلاقی اثر

غیر محسوس ہوتا ہے، اسی طرح تاریخ کا اثر بھی ناقابلِ ادراک ہونا چاہیئے اور طالب علموں کو غیر شعوری طور پر عظمتِ دیرینہ کا احساس، آئیڈیل کی برتری، و نیز بزدلی، فریب اور سفاکی کی برائی معلوم ہونا چاہیئے۔ ازمنہ گزشتہ کی خرابیوں کو اخلاق کی خاطر چھپانا نہیں چاہیئے بلکہ اُن کو صحیح طور پر پیش کرنے کی سعی کرنا چاہیئے تاکہ طلبا ارتقا کے اصول کو سمجھ سکیں اور اپنی آیندہ ذمہ داریوں کو بخوبی محسوس کرلیں۔

تاریخ کے فائدہ مند اور غیر فائدہ مند ہونے کا سوال یوں بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اُس کے ہمہ گیر اثرات، پہنائی اور وسعت کا صحیح اندازہ نہیں۔ تاریخ ایک بسیط مضمون ہے۔ ہر وہ چیز جس پر تغیر کا اصول اثر انداز ہوتا ہے وہ تاریخ کا موضوع بن سکتی ہے۔ موجودہ سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز "سکونیاتی" نہیں ہے اس لئے تاریخ پہنائے عالم اور اس کے ذرہ ذرہ کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کو تاریخی موج نے سیراب نہ کیا ہو۔ فن تعمیر، تنقید، فلسفہ، لٹریچر، سیاسیات، ہر چیز میں تاریخ کا پرتو نظر آتا ہے۔ لٹریچر کے تاریخی اور ارتقائی پہلو کو نظر انداز کئے بغیر ہم شیکسپیئر کے اوپر یہ اعتراض نہیں کرسکتے کہ اُس نے تمثیلی اصولوں سے کیوں روگردانی کی یا جرأت نے حیاسوز اور عریاں جذبات نگاری سے کیوں کام لیا۔ جرأت کے زمانہ میں سوسائٹی پر جوش و سرمستی، اخلاقی فرومائیگی اور تصنع اور بناوٹ کا رنگ چڑھا ہوا تھا وہی عکس معاشرتی آئینہ یعنی شاعری میں بھی آگیا۔ اسی طرح معاشیاتی حالت اور ذہنی آزادی اخلاق پر بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اور علم الاخلاق کا یہ مسئلہ بغیر تاریخ کی امداد کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ سوشلزم بھی تاریخی تعبیروں کا نتیجہ ہے اور بغیر تاریخی پس منظر کے اُس کے تمام پہلوؤں کو سمجھنا ناممکن ہے۔ غرض تاریخ نہایت وسیع مضمون ہے اور محض سیاسیات ماضیہ کی داستان نہیں ہے۔ اُس نے اپنی ضیا پاشیوں سے انسانی زندگی کے ہر گوشہ کو روشن اور منور کیا ہے۔

روسو کہتا ہے کہ ہماری تاریخیں اُس جگہ ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے دراصل انہیں شروع

ہونا چاہیے۔ وہ محض لڑائیوں، لغزشوں حماقتوں اور بدنصیبیوں کی داستانیں بن کر رہ گئی ہیں اور بعض اس درجہ ناقص طور سے لکھی گئی ہیں کہ انھوں نے علم تاریخ سے کافی بدظنی پیدا کر دی ہے۔ ان میں بہت سے غیر ضروری نام ہیں یا سیاسی واقعات اور معرکہ آرائیوں کا طولانی بیان ہے جن کو کم کر کے اگر دوسرے اہم اور تمدنی اور سماجی حالات کی جانب توجہ کی جاتی تو وہ ہمارے لئے کافی مفید ثابت ہو سکتے۔ ان ہی تاریخی کتابوں میں دور از کار قصے، غیر معتبر سنائی باتیں، بادشاہوں کی بے جا تعریف اور اسی طرح کے دوسرے زوائد شامل ہیں اور کام کی باتیں کم ہیں۔ تاریخ کو جدید نظریہ کے ماتحت ترتیب دینے کی ضرورت ہے ہماری تاریخ کو ایک بڑی داستان کا جزو معلوم ہونا چاہیئے اس طرح کہ اس کے پڑھنے کے بعد انسانی تہذیب کے تمام خد و خال نمایاں ہو جائیں۔ اور ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ ہمارے ملک نے کس طرح زوال اور ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ مورخ کو روایات کے احتساب اور اسباب و نتائج کی تصریحات کے سلسلہ میں ماخذوں کی چھان بین کرنا چاہیئے۔ اور حالات کے مرتب کرتے میں خصائص طبعی، ماحول زمانہ، قرائن عقلی اور بشریات، نفسیات، معاشیات، اور عمرانیات کے انکشافات جدیدہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ یہ مورخانہ موشگافیاں بہت جگہ ہوئی ہیں اور یہ انھیں کا طفیل ہے کہ انھوں نے تاریخ کو ہماری موجودہ ضرورتوں کے پورا کرنے کا اہل بنا دیا ہے۔

موجودہ سائنس نے تاریخ کے دامن کو بے حد وسیع کر دیا ہے۔ اب وہ محض لڑائیوں اور جھگڑوں کے بجائے انسانی عروج و ترقی کے مدارج و منازل کی سرگذشت ہے' وہ ایک ایسے فلسفیانہ علم میں تبدیل ہو گئی ہے جو ہمیں سچی مثالوں کے ذریعہ آگے بڑھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اُن بے شمار خیالات کی تو کوئی انتہا ہی نہیں جو تاریخ ہمارے ذہن و دماغ میں پیدا کرتی ہے لیکن وہ سب "کار جہاں کی درازی" کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ ابھی تہذیب انسانی مکمل نہیں ہوئی — تاریخ کی اس سے زیادہ اور کیا بڑائی ہوگی کہ وہ ہمیں عمل پیہم اور کوشش ناتمام کے لئے آمادہ کرتی ہے۔

(خواجہ احمد فاروقی' بی۔ اے)

مکاتیب مہدی

"خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود"

دور حاضر کے دو ادیبوں پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ ایک سجاد انصاری دوسرے مہدی افادی ایک میں شان جلالی تھی دوسرے میں شان جمالی۔ وہ اپنی آگ میں خود جل کر مر گیا۔ ان کی لطافت طبع ایک طویل بیماری کی گرانباریوں کی متحمل نہ ہو سکی۔ دونوں بہت مشہور نہیں۔ عوام شاید ان کا نام بھی نہیں جانتے دونوں بڑے اونچے پائے کے ادیب تھے مگر دونوں کا پیشہ کچھ اور تھا۔ سجاد وکیل تھے۔ مہدی تحصیلدار۔ تحصیلداری کے کاموں اور کاغذات پٹواری کی جانچ پڑتال میں سر کھپانے والا ادبی دلچسپیوں کیلئے بھی وقت نکال لیتا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ "جو حسین شے ہے، میری رشتہ دار ازلی ہے"، مہدی کا بھی یہی مقولہ تھا۔ وہ حسن کے سچے پرستار تھے۔ کوئی اچھی کتاب اچھی طرح چھپ کر آتی تو "عروس جمیل و لباس حریر" کہکر خطاب کرتے۔ ان کی کتابیں ان کی "نازنینان حرم" تھیں۔ جہاں وہ اپنی فرصت کے سارے اوقات صرف کرتے۔ پڑھتے زیادہ لکھتے کم، اور لکھتے بھی تو زیادہ تر خط لکھتے۔ یہ خط دوست احباب کے نام بھی ہوتے اور اخبار و رسائل کے لئے بھی۔ کچھ مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے۔ یہ سب افادات مہدی کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہو چکے ہیں۔ اب خطوط "مکاتیب مہدی" کے نام سے چھپے ہیں۔ تین سو صفحے جامعہ سائز، قیمت ۱۲؍ اور مہدی بیگم سے بسنت پور کے پتہ پر دستیاب ہو سکتے ہیں۔

افادات مہدی کہنے کو چند متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ منتشر سے خیالات، بکھرے ہوئے موتیوں کے مانند، مگر باتوں باتوں میں مہدی افادی بڑے بڑے مسائل پر تنقید کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ کتاب ادب و انشاء کا چمن بھی ہے اور نقد و نظر کا معیار بھی۔ مشرقی و مغربی تمدن کے ٹکڑے سے ایک شرر پیدا ہوا تھا جس میں دونوں کے اجزا ملے جلے تھے۔ افسوس ہے یہ شرارہ شعلہ نہ بن سکا اور وقت سے پہلے بجھ گیا مہدی کی بالغ نظری اور پر لطف انداز بیان کے بڑے بڑے قائل تھے۔ شبلی جیسا اونچا آدمی

جو اپنا معیار تنقید بھی اونچا رکھتا تھا اور معاصرین میں سے کم کو خاطر میں لاتا تھا ایک جگہ لکھنے پر مجبور ہوئے
"مضمون دیکھا نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا
نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن دیکھتا اور احباب کو دکھلاتا رہا"
ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ "کاش شعر العجم کے مؤلف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے" شروانی
کو ان کے انداز بیان میں یونان کے سنگ تراشوں کی سی نزاکت اور مصوری نظر آتی ہے۔ یہ سب
خصوصیات ان خطوط میں بھی پورے طور پر جلوہ گر ہیں۔

مہدی کا حلقہ احباب بہت بڑا نہ تھا۔ مگر پھر بھی اس میں اس نسل کے کئی اچھے ادیب اور
صاحب ذوق موجود تھے۔ اس مجموعہ میں شبلی، حالی، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی۔ پروفیسر
عبدالباری، دلگیر، ہوش بلگرامی، ریاض خیرآبادی، میر ناصر علی (صلائے عام والے) اور بعض دیگر احباب
کے نام خط موجود ہیں۔ شبلی کو انھوں نے بہت سے خط لکھے تھے اور بہت جی لگا کر۔ مگر افسوس ہے کہ
باوجود ان کی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے شبلی نے مہدی کے خطوط محفوظ نہ رکھے۔ صرف تین خط اس
مجموعہ میں موجود ہیں۔ سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر عبدالباری کو مہدی نے
بہت سے خط لکھے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب محفوظ رکھے گئے۔

ان خطوط کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا ادب کا ذوق فطرت کی طرف سے لے کر آیا
تھا اور وہ بہت سے پیشہ ور ادیبوں اور نثاروں سے بہتر لکھنے والا تھا۔ سید سلیمان ندوی نے ٹھیک
لکھا ہے کہ ان کا قلم باغ و بہار تھا۔ بلا کی شوخ اور شگفتہ طبیعت پائی تھی۔ اچھے خاصے خشک فلسفیانہ
مباحث میں وہ اپنے طرز بیان سے رنگینی پیدا کر دیتے۔ بڑے بڑے مولویوں کی تقدس مآب بارگاہوں
میں وہ ادب لطیف کی شمع روشن کرتے جس طرح لبریز ساغر سے شراب چھلک جاتی ہے، ان کی
طبیعت کی رنگینی الفاظ میں بکھری رہتی ہے۔

خطوط نثر کے دوسرے اصناف سے ذرا مختلف ہیں۔ کتاب سب کے لئے لکھی جاتی ہے خط
صرف ایک کے لئے۔ کتابوں میں جان ہوتی ہے۔ اِدھر چھپیں اُدھر زمانے کی زد سے محفوظ ہو گئیں لیکن

خطوں کے لکھتے وقت اگر اشاعت کا خیال ہو تو ان کی ساری نزاکت و لطافت جاتی رہتی ہے۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ بے تکلف خطوط ہوں۔ دلی جذبات کا آئینہ ہوں ان میں تصنع کا شائبہ نہ ہو۔ لکھنے والے کے چہرے پر نقاب نہ ہو۔ مکتوب نویس کا آرٹ کیا ہے صرف فطری ہونا۔ جہاں بناوٹ آئی خط خط نہ رہا مضمون ہو گیا۔ اچھا خط وہ نہیں ہے جس میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے جائیں بلکہ اچھا خط وہ ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے اور جس میں اس کی سیرت کا حقیقی عکس ہو۔ غالب اس گر سے واقف تھے جبھی تو وہ زبانِ قلم سے باتیں کرتے اور ہجر میں وصال کے مزے لیتے تھے۔ سوئفٹ بھی اس راز کو سمجھتا تھا۔ اسٹیلا کے نام جو خط ہیں ان میں انگلستان کا یہ سنجیدہ مزاح نگار اور بے مثل طنز نگار بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ سوئفٹ کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا ان خطوط کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہی ان کی قدر و قیمت ہے۔ اسی طرح جو حضرات مہدی افادی کے خطوط کا مطالعہ کریں گے انھیں ایک دلچسپ شخصیت ملے گی جس میں ایک خاص شان ہے۔

مہدی کا ادبی مذاق نہایت پاکیزہ تھا۔ دوم درجے کی چیز ان کی نظر ہی میں نہ آتی تھی۔ خیال میں بلا کی رعنائی تھی۔ اور کبھی کبھی اس کی وجہ سے الفاظ ڈھلے معلوم ہوتے تھے۔ نفاست و لطافت کو انھوں نے اپنی زندگی کا جزو بنا لیا تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتے تھے لیکن کتابوں سے علیحدہ نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ سب ادبی خطوط ہیں۔ اکثر ادیبوں اور ادب کے جاننے والوں کے نام ہیں۔ ان کے جو دوست ہیں وہ بھی اس شراب کے مست معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں عوام کی دلچسپی کی چیزیں کم ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ نہیں گذرا۔ جس چیز کو ڈرامائی کہا جاتا ہے وہ ان کے یہاں مفقود تھی۔ پہلی بیوی زندگی کی دوپہر ڈھلتے وقت داغ مفارقت دے گئیں ان کی یاد میں لکھتے ہیں ؎

ترا داغ دل میں نشانی رہے گا ۔۔۔ یہ سینہ میں تا زندگانی رہے گا

کچھ دن کے بعد دوسری شادی کی۔ خوش قسمتی سے بیوی نہایت اچھی ملیں حسن سیرت و صورت دونوں سے مرصع۔ اولاد بھی نہایت صالح۔ غرض زندگی اچھی طرح گذرتی تھی۔ مگر آدمی بڑے حساس تھے۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو پٹواری ہو جائیں تو گاؤں کی زمین پر پاؤں نہ رکھیں یہ بے چارے تحصیلدار

ہونے پر شرماتے تھے۔ نئی کتابوں کے نکلنے کا انتظار، نئی مطبوعات کا مطالعہ۔ دوستوں سے خط و کتابت یہی ان کی زندگی کے محبوب مشغلے معلوم ہوتے ہیں۔

مہدی کے خطوں میں مکاتیب کی سب سے بڑی خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے یہ ان کی زندگی کی پوری پوری تصویر ہیں۔ جو شخصیت ان کے مطالعہ سے سامنے آتی ہے وہ کتابی نہیں ان کی زندگی کی تمام خصوصیات کی حامل ہے۔ دوسری خصوصیت میں کچھ شبہ ہے یہ خطوط بے ساختہ اور بے تکلف خطوط نہیں مہدی کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہیں مہدی کو خط لکھنے کا شوق تھا۔ وہ اپنے طرز کی خوبیوں سے واقف تھے۔ ایک صاحبہ کی زبان سے کہتے ہیں :۔

"ایک صاحبہ جو پاس بیٹھی ہیں اس خط کو دیکھکر فرماتی ہیں تم سرسری خط میں جو کچھ لکھ دیتے ہو بڑے مضمون میں بھی اس کی سمائی نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ سچ ہے ؟"

"مقیاس الشباب کی آپ کو داد دینی ہوگی۔ نورجہاں کے ذکر کے ساتھ کیونکر ممکن تھا کہ اس کا خیال نہ آتا جسے مغربی شعراء بہترین عطیہ فطرت کہتے ہیں۔ میں نے اس موقع پر دفینۂ حسن کے لئے مقیاس الشباب لکھا ہے اور یہ خاص میری گھڑت ہے آپ دیکھیں گے کہ متانت میں کس قدر شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور گو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس ترکیب پر مجھے ناز ہے۔ تاہم لذت احساس سفارشی ہے کہ اچھی سوجھی آپ کی کیا رائے ہے کہیں اس سے میرے مذاق خاص کی غمازی تو نہیں ہوتی۔ میں آپ کی نگاہ میں ذرا ثقہ رہنا چاہتا ہوں"

تیسری خصوصیت ان خطوط کی یہی ہے جو آخری جملہ میں بیان ہوئی۔ مہدی مولویوں کے سامنے رند اور مسوڑوں کے سامنے مقطع بن کر آتے تھے۔ کسی نوجوان شاعر نے اپنی محبوبہ کی اس طرح تعریف کی ہے ؂

کبھی اس کی شوخی میں سنجیدگی تھی　　　کبھی اس کی سنجیدگی میں تھی شوخی

یہی بات ان خطوط میں ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ مباحث میں وہ ایسی ایسی باتیں لے آتے ہیں جو عراں

معلوم ہوتی ہیں۔ مگر ان کی عریانی "لالہ وگل" کے پردے میں رہتی ہے خوبصورت الفاظ کا ہیکر دے کر وہ اپنے خیالات کو حسین بنا لیتے ہیں۔ اپنے ثقہ دوستوں کو ان کی مولویت پر چھیڑتے رہتے ہیں۔ ذرا الفاظ ملاحظہ ہوں شبلی کو لکھتے ہیں :-

"مدت کی تلاش کے بعد وہ جنس لطیف ہاتھ آئی جو آپ لوگوں کو دوسری دنیا میں ملے گی"

"ہاں جناب ماجد ہوں یا آپ دونوں صاحبوں کی مدرسیت میری سمجھ میں نہیں آتی کہ عورت مرد بنا کر پیش کی جائے۔ اور اس سے انشا پردازی کی سنجیدگی پر استدلال ہو"

یہی بزرگ نکاح کی شب اول میں بیاہے تھے۔ انھیں لکھتے ہیں :-

"جیسے بستر شکن ہونا تھا۔ وہ شاعری کی اصطلاح میں شکن بستر نکلا"

پھر فرماتے ہیں :-

"دو آتشہ اچھی کھچی ہوئی ہو تو نشاط ہستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ میں اس نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں"

"نقاد" کا نام ابھی شاید پڑھے لکھے آدمیوں کو فراموش نہ ہوا ہو۔ کس دھوم سے نکلا تھا اور کیا اس کا انجام ہوا۔ اس کے متعلق ایک دوست کو لکھتے ہیں :-

"نقاد میں مضامین کیا لکھوں کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا۔ اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ پہلے ایک خانگی بہم پہونچائی گئی تھی اب ڈنکے کی چوٹ ایک سرائے والی پیش کی گئی ہے یعنی زمانی کی جگہ ایک شگفتہ کلی نے لے لی۔ شاہ صاحب "تصوف" کے دلدادہ لغزش مستانہ سہارا ڈھونڈھتی ہے موقع ملا اور پھسلے"

مولویوں کے سامنے رندانہ وضع اور رندوں کی محفل میں سنجیدگی کے تیور۔ یہ عجیب وغریب اجتماع آپ کو مہدی کے یہاں ملے گا۔ اسی سے ملتی جلتی ایک اور چیز دیکھئے جو نہایت دلچسپ ہے۔ اوپر میں لکھ چکا ہوں کہ مشرقی اور مغربی تمدن کے ٹکڑے سے یہ شرارہ پیدا ہوا تھا۔ ان کا دماغ مغربی تھا اور دل مشرقی۔ انگریزی اصطلاحوں کے لئے اردو مترادفات تلاش کرنے کی انھیں دھن تھی۔

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر الفاظ لاتے تھے۔ اپنے دوستوں سے پوچھتے تھے۔ خود کاوش کرتے تھے۔ اور انصاف یہ ہے کہ بعض اچھے اچھے مترادفات ان کے یہاں ملتے ہیں۔ مغربی طرزِ رہائش کا دلدادہ، انگریزیت کی بو میں بسا ہوا مغربی شائستگی و نفاست کا شیدا، سگرٹ کے لفظ کے لئے بھی "وسائل دود کشی" استعمال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ Etiquette کے لئے "عوائد رسمیہ" کلاسکس کے لئے "ادب العالیہ" ہائر کریٹی سزم کے لئے تنقید عالیہ، ماسٹرپیس کے لئے "اختراع عالیہ" ان ڈفرنس کے لئے بے رخی، لپ سروس کے لئے "وظیفۂ لب" ہنی مون کے لئے "عہد زفاف"، یہ سب ان کی ایجادات ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ترکیبیں بھی انھوں نے اچھی وضع کی ہیں۔ غیر ستائشی، جنبشِ لب، خمیازۂ شباب مقیاس الشباب، زہرۂ شب، محبت کا ثمر اولیں، اِن سے حسن آفرینی، معنی آفرینی اور اختصار تینوں کا حق ادا ہو جاتا ہے اور تحریر چمک جاتی ہے۔

ان خطوط کی ادبی اہمیت محض اس وجہ سے نہیں کہ یہ ایک صاحب طرز انشا پرواز کے لکھے ہوئے ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ ان میں ادبی مباحث، کتابوں، رسالوں، اور بہت سے ادیبوں پر اچھی خاصی تنقیدیں ملتی ہیں۔ افادات کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ مہدی باتوں باتوں میں بونے پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ یہی انداز بیاں بھی کارفرما ہے۔ مولانا ماجد نے ایک مضمون فلسفۂ غالب کے نام سے لکھا تھا۔ اس کے متعلق پروفیسر عبدالباری کو لکھتے ہیں:۔

"جو رکھ رکھاؤ غالب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر نکات بعد الوقوع ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ حکیمانہ صداقتیں ان کے کلام میں موجود نہیں، سوال یہ ہے کہ جس فلسفیانہ سانچے میں ہم اس کو ڈھالنا چاہتے ہیں۔ کیا شاعر بھی ہر جگہ اسی نکتہ سے واقف تھا۔

اس میں ذرا مجھ کو کلام ہے"

ریاض کے متعلق دلگیر کو لکھتے ہیں:۔

"مرحوم ریاض (خدا اسے مدتوں جلائے) عروس سخن کا آشنائے ازلی ہے۔ آپ لٹریچر کی جن نزاکتوں پر مٹے ہوئے ہیں، وہ ریاض کے قلم کی آواز بازگشت ہے۔ آج لٹریچر پر

طبع آزمائی کے لئے بہتیرے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ میں نے پہلے پہلے یہ تسلط "ریاض الاخبار" میں دیکھا جب اس کے مفہوم سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا۔ موجودہ لٹریچر ارتقا کی حیثیت سے ریاض سے بے نیاز نہیں ہے وہ جس طرح نظم کا مالک ہے، آقائے نثر بھی ہے اور یہی امتیاز فائقہ ہے جس کی بنا پر وہ انشا پردازی کا مسلم الثبوت ہیرو ہے۔ تاریخ آئندہ بتائے گی صف اوّل میں ریاض کو کہاں جگہ دی جائے گی"

اس قسم کے سینکڑوں اشارے ہیں جو خطوط میں بکھرے پڑے ہیں۔ انہیں کہاں تک دکھاؤں مگر یہ خیال رہے کہ خطوط میں مہدی صرف شبلی و خیام کے پرستار کی حیثیت سے نہیں تحصیلدار کی حیثیت سے بھی رونق افروز ہیں۔ اس کے علاوہ شوہر، باپ اور دوست کی حیثیت سے بھی ان کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک دوست دوسرے دوست کو لکھتا ہے :-

"تم آؤ شوق سے آؤ، سچ مچ آؤ۔ ڈنکے کی چوٹ یعنی توند پر ہاتھ پھیرتے آؤ۔ اور اپنی دیگر جوڑی یعنی شیخ کو بھی لاؤ۔ سمجھو یا نہ سمجھو، میری وطنیت یعنی دنیائے احباب تم ہی دونوں تک محدود ہے۔ اونچی سے اونچی سوسائٹی میں بیٹھا۔ بڑے بڑے جگمگاتے نظارے دیکھے۔ عمر اسی میں گذری لیکن قسم لے لو اگر آنکھیں خیرہ ہوئی ہوں۔ بجلی کی ہوش ربا روشنی میں بیٹھکر بھی کبھی اپنے سادہ چراغوں سے بے نیاز نہ ہوا"

ایک تحصیلدار جو اپنی بدقسمتی سے خوش مذاق بھی ہے اپنے حاکم ضلع کے استقبال کا سین کھینچتا ہے۔ کیمپ کی آرائشوں کے علاوہ ایک خاصہ کی چیز ملاحظہ ہو :-

"شکار کے نہایت شوقین ہیں۔ ایک روز معلوم ہوا صبح کے نکلے دو بجے واپسی کریں گے یعنی چاشت نذار و لنچ پر کسر نکالی جانے لگی۔ دو لیڈیاں بھی ساتھ تھیں بجلی کی طرح ایک خیال آیا جنگل میں ٹھیک بارہ بجے ایک چپراسی سادہ لباس میں ایک چھوٹی سی میز پر ضروری سامان آراستہ کر رہا ہے۔ اور متوقع آمد کا انتظار کر رہا ہے کہ دفعتاً شکاری ہاتھیوں پر نظر آئے جو باوجود کامیابی کے خستہ ہو رہے تھے۔ ہاتھی فوراً بٹھائے گئے اور سب کے سب مہمان ناخواندہ کی طرح میز پر ٹوٹ پڑے۔ داد کی داد تھی کہ میر قافلہ نے

خود کہا تحصیلدار صاحب نے بھیجا ہے؟ چپراسی کا مودبانہ جواب یہ تھا کہ عرض کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ (زور کا قہقہہ) واپس آئے تو متبسمانہ چہروں نے ظاہر کر دیا کہ راز کی پردہ دری ہو چکی ایک و خاتون کی جنبش لب شکریہ سے گرانبار نظر آئی۔ یہ میرا صلہ تھا۔ (غلطی نہ کیجئے گا مہر تحصیلدار کا نہیں)

غرض یہ خطوط ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ جب کبھی گذشتہ پچاس سال کی ادبی تاریخ لکھی جائے گی تو افادات اور مکاتیب والے مہدی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں ادبی کوششیں اور کاوشیں کیا تھیں۔ رسالوں کی قدر و نا قدری کے کیا مدارج تھے ایک ادیب دوسرے ادیبوں کے متعلق کیا خیالات رکھتا، یہ سب ان خطوط سے آئینہ ہو جائے گا۔

طرز بیان کی شوخی مہدی کو زندہ رکھنے میں بڑی معاون ہوگی۔ ممکن ہے کہ ادبیات میں جو نقطۂ نظر مہدی کا تھا وہ نہ رہے اور اسے رہنا بھی نہ چاہئے۔ اس لئے کہ ادب میں قوت بڑھنے اور پھیلنے ہی سے آتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مہدی کی رائے بعض ادیبوں کے متعلق بدلنی پڑے جنھیں وہ اول درجہ کا ادیب کہتے ہیں انھیں دوئم درجے میں بھی جگہ نہ ملے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ مکاتیب پھر بھی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ ان میں وہ جوانی ہے جس پر عمر کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ مستی ہے جو شراب انگور کی ممنون نہیں۔ وہ بانکپن ہے جس پر سادگی قربان اور وہ سادگی ہے جس پر بانکپن نثار ہے۔ تحصیلوں اور قصبوں کی بے کیف زندگی میں رہ کر بھی یہ صاحب ذوق حسن کا پرستار اور پجاری رہا۔ شمع انجمن ہو یا چراغ خانہ جہاں روشنی تھی اُسے عزیز تھی اور جہاں روشنی کا پتہ نہ تھا وہاں بھی وہ اپنی حرارت عشق سے شعلۂ حسن روشن کر لیتا تھا۔ اس نے کتنے مولویوں کو انسان بنانے کی کوشش کی۔ کتنے بد مذاقوں کی اصلاح کی کتنے بے راہروں کو ٹوکا۔ وہ اس میں کامیاب ہوا ہو یا نہیں لیکن اس کی کوشش کیا اس کی ادبی زندگی کی کافی ضمانت نہیں ہے؟

(آل احمد صاحب سرور ایم۔ اے)

جادوگرنی

اب سورج ڈوب چکا تھا، افق پر آگ سی لگی ہوئی تھی جس کی لوئیں سارے آسمان پر چھا رہی تھیں جنگل و میدان پر خونی چادر سی پھیلی ہوئی تھی، سامنے ایک تالاب شفق کی سرخی سے آگ کا شعلہ ہو رہا تھا۔ اس کے ایک کنارے بڑے پرانے پرانے درختوں کا ایک گھنا سا جھنڈ، جیسے کالے کالے دیو پرے باندھے کھڑے ہوں۔

ہم نے سوچا یہیں تالاب کے کنارے تھوڑا استالیں لیکن شکاری رُک گیا۔

"نہیں حضور وہاں نہیں۔ سورج ڈوبے وہاں کوئی نہیں جاتا۔ وہاں بھوتنیاں رہتی ہیں"

بات سنی ان سنی ہو گئی اور ہم اسی طرف چلتے گئے، شکاری نے بڑھ کے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا، شیر دن کا مارنے والا شکاری خوف سے کانپ رہا تھا۔

"نہیں حضور! کیا کرتے ہیں آپ............ وہ.... وہ سنیئے!"

لومڑی کی کیں کیں چیں چیں، اور گھگھو کی "ہو ہو گھو ہو" ہوا میں گونج رہی تھی۔

ہم وہیں میدان میں بیٹھ گئے۔

"حضور ان درختوں کے جھنڈ میں ایک کوٹھری ہے۔ اس میں ایک بڑھیا رہا کرتی تھی معلوم نہیں کب سے، میں نے اپنے بچپن سے اسے ایسے ہی دیکھا۔ بال سن سفید، جن میں منوں گرد صورت اُلٹے توے سے زیادہ کالی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی مٹیالی مٹیالی۔ بڑے بڑے دانت آگے کو نکلے ہوئے، انگلیاں پتلی پتلی سوکھی جیسے نیم کی سوکھی ٹہنیاں، ٹانگیں بس ہڈیاں جن پر سمٹی سمٹائی کھال چپکی ہوئی جیسے سوکھی جلانے کی لکڑیاں، دو چار چیتھڑے ادھر اُدھر لپٹے نیم برہنہ رال بہتی ہوئی، جدھر نکل جاتی بچے بھاگتے، گاؤں میں جس کو ترس آتا نوالہ روٹی دال سالن اس کے پیالے میں ڈال دیتا اور وہ واپس اپنی کوٹھری پر چلی جاتی۔ اس کے بعد وہ کیا کیا کرتی تھی کسی کو نہیں

معلوم جو کچھ کمایا جاتا کماتی، باقی کوٹھری کے سامنے ڈھیر کر دیتی۔ دن بھر چڑیاں چنتی چگتیں، باقی رات کو گیدڑ صاف کر جاتے۔

کہیں سے ایک کتا بھی اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ ایک دم کے لئے اس سے علیٰحدہ نہ ہوتا جب وہ مانگنے نکلتی ساتھ ساتھ چلتا اور راہ چلتے گلیوں گلیاروں میں پڑی پڑائی روٹی بوٹی سے اپنا پیٹ بھر لیتا۔ گانوں کے کتے اس کو دیکھتے دیکھتے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ وہ اس کو دیکھ کر کان بھی نہ ہلاتے، نہ وہ غریب کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا، جیسے وہ بھی اس بے چارے کو بھکارن کا کتا بھکاری سمجھ کر اس پر ترس کھاتے اور پڑا اگرا ٹکڑا نوالہ کھا لینے دیتے۔

پھر لوگوں نے دیکھا اس کے ساتھ کوٹھری میں ایک عورت اور رہتی ہے۔ وہ ایسی سوکھی نہ تھی لیکن اس سے زیادہ ڈراونی، اس کے بال کالے کالے جھبڑے جھبڑے، اس کی آنکھیں لال لال انگارہ سی، دن بھر تو اس کو نکلتے کسی نے دیکھا نہیں، سورج ڈوبے وہ نکل آتی، اس کے نکلتے ہی گھگھو بولنے لگتے، لوکھڑیاں چیخنے لگتیں، سیار ہوا ہوا کرنے لگتے، مینڈک غل مچانے لگتے

سب سے پہلے پنڈت جی نے اسے دیکھا، پوتھی دیکھ کر بتایا یہ بڑی نشٹ لڑکی ہے۔ جادو کرتی ہے اور چراغ جلے اپنا جادو جگانے نکلتی ہے

ایک دن بڑھیا وقت پر نہ آئی تھوڑی دیر میں وہی جھبڑی عورت کتا ساتھ میں لئے مانگنے نکلی پنڈت جی کے دروازے پر پہونچی تھی کہ ان کا بچہ سوتے سوتے پلنگ سے گر پڑا، بڑھیا کا کتا دروازے پر کھڑے کھڑے خلاف معمول زور سے ڈاڑھ مار کر رو دیا۔ پنڈت جی اچھل پڑے، موٹا سا ڈنڈا لے کر نکل ہی تو آئے۔

"نشٹ چانڈال کہیں کی..... میرے بچہ کو کھانے آئی ہے...... ؟

"مہاراج کرپا کرو....... دو نوالے..... !

"دو نوالے؟ .... ہوں .... یہ لے! .... لے!"

پنڈت جی نے دو ڈنڈے کس کس کے مارے وہ زمین پر گر گئی۔

"مر گئی! .... ہائے مر گئی! .... ہائے ......"

کتا مہاراج کی طرف دیکھ کر چاروں پیروں پہ اچھل پڑا اور "بھو دوں" کی صدا لگانے لگا گویا کہہ رہا تھا مہاراج ہم لاچار بھکاریوں پہ یہ ظلم کیوں؟ کہ پنڈت جی نے اس کے اس زور سے گھما کے ڈنڈا مارا کہ اگر ذرا کود نہ جاتا تو اس کا وہیں کام تمام ہو جاتا۔

اس واقعہ کو ابھی تین چار ہی دن ہوئے ہوں گے کہ پنڈت جی کے لڑکے کو بخار آیا۔ مہاراج نے کہا علاج سے کیا فائدہ یہ اسی چڑیل ڈنڈھیا کی کارستانی ہے۔ منتر پہ منتر پڑھنے لگے۔ پاس گانوں میں بڑی دیوی ہیں ان پہ بھی چڑھاوے پڑھائے لیکن بخار نہ اترا۔ تیسرے دن ہچکی بھی آنے لگی۔ پنڈت جی نے دن دن بھر پوجا کی اور ہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد پرشاد چٹاتے رہے لیکن اب پسلی بھی چلنے لگی، ہفتہ نہ نکلا تھا کہ بچہ جاتا رہا۔

گھر گھر اس کا چرچا ہو گیا، بھکارن سے لوگ اور دور دور بھاگنے لگے۔ جب وہ گاؤں میں داخل ہوتی سب دروازے بند کر لیتے۔ اب کوئی ایک ٹکڑا بھی دینے والا نہ تھا۔ وہ دروازے دروازے روتی پکارتی "میری لڑکی ہے وہ .... وہ بری نہیں ہے .... اس نے مہاراج کے بچہ کو کچھ نہیں کیا ..... پرماتما کی راہ مجھے کچھ دو .... میں بھوکوں مر رہی ہوں ...... آج تین دن ہو گئے ...... ہائے میری بچی! پنڈت جی نے ایسا مارا! .... ہائے اس سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا ..... میں کیا کروں کس کے پاس دکھڑا لے جاؤں! .... بخار میں بھن رہی ہے، ٹانگیں سوجی ہوئی ہیں .... پرماتما کی راہ میں .... بھوک سے مری جا رہی ہوں ......"

وہ ہر جگہ کھڑی روتی ..... بین کرتی لیکن پنڈت جی نے ایسا ڈرا دیا تھا کہ کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ کواڑ کھولتا اور پنڈت جی نے کیا ڈرایا سب کو اپنے اپنے بچوں کے لالے پڑے ہوئے

تھے ..... سب نے پنڈت جی سے منتر لے کر دروازوں پر لٹکائے۔ اس کے رونے منت سماجت
کرنے پر کسی کو رحم آتا تو ٹکڑا نوالہ باہر پھینک دیتا لیکن باہر نہ نکلتا۔ وہ کہیں کوڑے کرکٹ پڑی سوکھی
روٹیاں سڑی دال اٹھا لیتی کچھ وہیں بیٹھ کر کھا لیتی کچھ لے جاتی۔

اس طرح ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ ایک روز وہ کوڑے پر آ کر بیٹھی تو پھر نہ اٹھی۔ لوگ سمجھے
وہ پڑی سوتی ہے۔ لیکن اس کا کتا رہ رہ کر اسے سونگھتا اور ڈاڑھ مار کر روتا، سراسیمہ اِدھر اُدھر
بھاگتا اور پھر یہی حرکت کرتا۔ لوگوں کو شک ہوا، ڈرتے ڈرتے شام تک کہیں کسی نے جا کر دیکھا
تو وہ مری پڑی تھی۔ اس طرح رات گذر گئی .... برسات کی رات! دن کو دوپہر تک اس کا
پیٹ پھولنے لگا۔ گاؤں والوں نے ایک ایک دو دو پیسے جمع کر کے دو چمڑوں کے ہاتھ دھرے
کہ اس کو دور لے جا کر کہیں پھونک دیں۔ دو بانسوں میں باندھ کر وہ اسے اسی تالاب کے کنارے
لے آئے کتا بھی پیچھے پیچھے آیا۔ جب چتا کے شعلے بلند ہوئے اور اس کی بو میدان میں پھیلی
تو کتا بھونکتے بھونکتے اسی آگ میں کود پڑا۔ کسی عورت کی چیخنے کی آوازیں آنے لگیں وہ سمجھ گئے
بڑھیا بھوتنی ہو گئی اور اس کو ادھ جلا چھوڑ کر بھاگ آئے۔

دو روز تک رہ رہ کر چیخنے کی آوازیں آتی رہیں اور اب بھی شام کو سورج ڈوبے کبھی
کبھی وہی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہی بھکارن اپنے کتے کے ساتھ تالاب کے کنارے گھومتی
نظر آتی ہے، اور وہ سرخ آنکھ اور کالے بالوں والی جادوگرنی رات کی خاموشی میں الوؤں
اور سیاروں کے ساتھ گھومتی جادو جگاتی پھرتی ہے"

مہکاری ڈر سے کانپ رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی .... ایک گھگھو
ہمارے اوپر سے اڑتا ہوا نکل گیا ...... گھو ہو۔ ہو ہو۔ تالاب و جنگل پر اب ہیبت ناک سیاہی
چھائی ہوئی تھی، آسمان پر گہرے گہرے بادل، سامنے تاریک جنگل، درخت معلوم ہوتے زمین
سے آسمان تک لمبے لمبے دیو، بھوت ہمارے اوپر چڑھے چلے آرہے ہیں...... اور پھر جنگل
سے اٹھتی ہوئی ہیبت ناک آوازیں .... ہمارے دل بھی کانپ گئے .... کہ اتنے

میں دو انگارہ سی آنکھیں نظر آئیں.......ہم پسینہ پسینہ ہوگئے۔ ہمارے ہاتھ غیر شعوری طور سے بندوقوں پر گئے.......شکاری چلایا، وہ آگئی.......، وہ گاؤں کی طرف بھاگا، اور رات کی سیاہی میں ہماری نظروں سے گم ہوگیا۔ دو سے آنکھیں چار ہوئیں چھوٹا سا کوئی جنگلی جانور تھا۔ ....ہمارے اوسان بجا ہوئے۔

دوسرے دن ہم اس جگہ واپس آئے۔ کوٹھری کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ کوٹھری پر چھت کے بجائے چھپر تھا اور وہ اندر گر چکا تھا۔ ہم دیوار پر چڑھ گئے۔ اندر پھوس و مٹی میں دبے ہوئے چند گودڑوں کے ڈھیر تھے۔ دروازے سے ملا ایک گھڑا رکھا تھا۔ اس کے پاس...... ......ایک پنجر......اس بدبخت عورت کا!........ جادوگرنی کا!......

(جری احمد سید)

غزل

کچھ اور سادہ محبت کی زندگی ہوتی
تو اور رنگ سے شرح غم و خوشی ہوتی

تجھے بھلا کے جسے اہل دل بسر کرتے
وہ زندگی بھی محبت کی زندگی ہوتی

جہاں کے رنج و خوشی کا بھرم تو کھل جاتا
شراب عشق سلیقے سے تو نے پی ہوتی

نثار شیوۂ تسلیم و بے نیازیٔ حسن
مری خوشی بھی کہاں تک تری خوشی ہوتی

عجب یہ غنچۂ دل میں ہوا سمائی ہے
شگفتہ ہو کے بھی کم کم فسردگی ہوتی

جہاں بھی جستجوئے دوست میں ٹھہر جاتے
یقین جان کہ منزل قریب ہی ہوتی

تمہیں تو اہل ہوس امتحاں سے بھاگ چلے
یہ کیا ضرور کہ ہوتی تو موت ہی ہوتی

بس اس قدر ہے شکایت غم محبت میں
شریک تو نہ ہوا تیری دوستی ہوتی

اب اس کے بعد محبت کی زندگی معلوم
تری نگاہ نے اس دم کمی نہ کی ہوتی

سمجھ میں آئے نہ آئے معمۂ دنیا
تری نگاہ سے دنیا بدل گئی ہوتی

یہ سوچتا ہوا دنیا سے اٹھ گیا کوئی
تری نگاہ بھی ہوتی تو کیا ابھی ہوتی

کچھ انتظار کا عنوان تو بدل جاتا
جو غم کی شام ہوتی تھی تو صبح بھی ہوتی

یہ اختصار بڑی چیز ہے محبت میں
تری نگاہ مری شرح خامشی ہوتی

اگر وہ ہوتا جسے ہم نے تم نے سوچا تھا
تو حسن و عشق کی دنیا کچھ اور ہی ہوتی

ہزار غم ہو نہیں چاہتا کوئی دل سے
کہ اس کے بدلے کوئی اور زندگی ہوتی

فراق زندگی عشق کو بھی کیا کہیے
اگر یہ موت نہ ہوتی تو زندگی ہوتی

(فراق گورکھپوری)

شیخ سے خطاب

آخر تری جبیں یہ شکن در شکن ہے کیوں
اے شیخ کچھ بتا تو خلاف وطن ہے کیوں

شہکار ہیں ترے ہی روایات غزنوی
ننگ سلف یہ دغدغۂ برہمن ہے کیوں

تو تو وہ ہے کہ جس کی رسائی ہے عرش تک
آخر تجھے یہ شکوہ چرخ کہن ہے کیوں

وہ ولولہ وہ گرمئی منصور ہے کہاں
تجھکو یہ خوف سختی دار و رسن ہے کیوں

کیا تجھ کو پاس سنت شرب حسین نہیں
تو شکوہ سنج تلخی کام و دہن ہے کیوں

نان شعیر پر ہے ترے زور کا مدار
یہ تجھ کو جہد پرورش جان و تن ہے کیوں

معراج دل میں سوزن عیسیٰ ہے بنفس قلب
اپنی خودی کا آپ ہی خود راہزن ہے کیوں

اس قید میں ہے کون سا اعزاز یوسفی
مرغوب یہ غلامی اہل وطن ہے کیوں

خوابیدہ کیوں ہے سبزۂ بیگانہ کی طرح
رہ کر چمن میں غافل فکر چمن ہے کیوں

اوروں کے کہنے سننے پہ جاتا ہے کس لئے
آخر بتا تو بندۂ تخمین و ظن ہے کیوں

جامہ میں اس کے خسرو پرویز ہے چھپا
اے سادہ لوح معتقد پیرزن ہے کیوں

(از شایق ہندو)

باتیں

وہ سرد و سبک چاندنی راتوں کی فضائیں
خوشبوئے محبت سے مہکتی ہوئی باتیں

آتے ہوئے آغوش تمنا میں سمٹ کر
رکتے ہوئے انفاس جھجکتی ہوئی باتیں

بکھری ہوئی زلفوں سے الجھتے ہوئے اکثر
نشے میں محبت کے بہکتی ہوئی باتیں

اللہ بھلائی نہیں جاتیں

یہ ترش و تنک نفرت و تحقیر کا لہجہ
شعلوں کی طرح گرم بھڑکتی ہوئی باتیں

نشتر رگ احساس محبت میں چبھوتی
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی ہوئی باتیں

چڑھتی ہوئی تیوری کبھی بدلی ہوئی نظریں
انگاروں کی مانند دہکتی ہوئی باتیں

واللہ اٹھائی نہیں جاتیں

(سعید ٹونکی)

اپنی اصلاح

محفل میلاد النبی

ماہ جولائی کے جامعہ میں جمعہ اور عیدین کے خطبہ کو اردو زبان میں بیان کرنے کے لئے ایک مفید مضمون شائع ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ علمائے دین ان مواقع کو بجائے اس کے کہ کارآمد بنایا جائے اپنی بے توجہی کی وجہ سے کھوتے چلے جاتے ہیں اور زمانے کی رفتار کا ساتھ نہ دے کر اب بھی کھو رہے ہیں۔ ایک دوسرا موقع ہے جس کو بھی اسی طرح ہمارے رہنمایان دین نے بجائے اس کے کہ کارآمد بنایا جائے محض اوہام پرستی کے قربان کر دیا ہے۔ میرا مطلب میلاد النبی کی محفلوں سے ہے جو سارے ہندوستان میں وقتاً فوقتاً اور کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ضرور منعقد ہوتی ہیں۔ منشا اس محفل کا تو یہ ہے کہ آنحضرت کی سیرت بیان کی جائے اور مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی زندگی کے تزکیہ کے لئے ایسی مثالیں پیش کی جائیں جو علاوہ بااثر ہونے کے صحیح مشعل راہ ہوں مگر حقیقت میں کیا ہوتا ہے آنحضرت کے پیدائش سے لیکر آپ کی وفات تک کے حالات میں ایسی ایسی روایتیں پڑھی جاتی ہیں جو علاوہ غیر مستند ہونے کے جن اصول پر آنحضرت نے اسلام کی تبلیغ کی اس کے بالکل خلاف ہوتی ہیں میرا مطلب ان معجزات یا خرق عادات سے ہے جو آنحضرت کی طرف پیدائش بلکہ قبل پیدائش کے زمانے سے منسوب کی گئی ہیں۔ اس قسم کی روائتیں اُن کتابوں میں جو محفل میلاد میں عام طور پر سے پڑھی جاتی ہیں بھری پڑی ہیں۔ ان روایتوں نے عام مسلمانوں میں ایک ایسی ذہنیت پیدا کر دی ہے کہ وہ آنحضرت کی ذات با صفات کے ساتھ خرق عادت کا ہونا لازمی سمجھنے لگے ہیں۔ یہ اصول بالکل تبلیغ اسلام کے خلاف ہے جس کے ثبوت میں قرآن پاک کی آیات پیش کرتا ہوں۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ	کہتے ہیں ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں
يَنبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ	تک تو زمین سے ہمارے لئے ایک چشمہ جاری
فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ	کر دے یا تیرے لئے کھجور اور انگور کا باغ ہو

عَلَينا كِسَفاً اَوْ يَاتِيَ بِاللّٰهِ وَالملٰئكة قبِيلاً ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بيتٌ مِنْ زُخرُفٍ اَوْ ترقیٰ فِي السَّمَآءِ ط وَلَنْ نُؤمِنَ لِرُقِيِّكَ حتّٰى تُنَزِّلَ عَلَينا كِتٰباً نَقْرَؤُهٗ ط قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ اِلَّا بَشَراً رَّسُوْلاً ۝

اور اس میں نہریں جاری ہوں یا تو اپنے دعویٰ کے مطابق آسمان کے ٹکڑے ہم پر گرائے یا تو خدا اور فرشتوں کو گواہ بنا کر لائے یا سونے کا ایک مکان ہو یا تو آسمان کی طرف چڑھ جائے اور تیرے چڑھ جانے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک تو ہمارے لئے کتاب اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ تو کہدے میرا رب پاک ہے۔ میں تو صرف اس کا بھیجا ہوا ایک بشر ہوں۔

اب ذرا غور سے دیکھا جائے کہ آنحضرت کے پہلے کے پیغمبروں سے تو اللہ تعالےٰ ان کی تبلیغ کے ثبوت میں معجزہ یعنی خرق عادات کا اظہار کراتا ہے مگر حضرت محمد صلعم سے ایسی عادات کے اظہار ہونے کا موقع نہیں دیتا۔ صرف ایک لفظ بشر پر کفار کے مطالبہ کا جواب دے دیا یہ کیوں؟ پہلے کے جتنے پیغمبران ہوئے ہیں وہ صرف اپنی ہی قوم کے ہادی تھے۔ اور اسی کے لئے بھیجے گئے تھے اور ان کے معجزات ایسے ہوئے ہیں جو اس قوم کی عام ذہنیت کے باہر نہ تھے۔ اور جس کو وہ آسانی سے سمجھ سکتے تھے اور اس سے متاثر ہو سکتے تھے۔ آنحضرت کا مشن دوسرا تھا۔ آپ خاتم النبیین ہیں۔ آپ کی تبلیغ کا دارومدار ایسی چیز پر ہے جس کو نہ صرف عرب بلکہ سارا عالم اس کو قبول کرے۔ اس میں زمانہ کی قید نہ ہے وہ چیز کیا ہے یعنی عقل جس کو بشر سے تعلق ہے۔ قرآن پاک کو لیجئے۔ اس میں عقلی دلائل ایسے ہیں جو آج تک سائنس و فلسفہ سے رد نہیں ہو سکے۔ بلکہ جوں جوں سائنس کی ترقی ہوتی جاتی ہے اللہ پاک کا کلام پایۂ ثبوت پر پہنچتا جاتا ہے مثلاً لیجئے۔ دنیا کے اور جتنے مذاہب ہوئے ہیں ان میں ایسی کوئی ہدایت نہیں ہے کہ نیچر کی جتنی طاقت ہے اس کو انسان اپنے کام میں لائے بلکہ برعکس اس کے ان مذاہب کے پیروؤں نے انھیں پرستش کرنا شروع کیا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ صاف ہدایت کرتا ہے کہ نیچر کی طاقتوں کو اپنے کام میں لاؤ۔ هُوَ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمسَ

وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (النحل)

کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اور نیز غیر مسلمانوں نے اس ہدایت پر عمل کیا اور اس کا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اور مثالیں لیجیے۔ طائف میں آنحضرت پر اس قدر پتھر برسائے گئے کہ آپ لہولہان ہو گئے آپ کے ساتھیوں نے کہا ان کے لئے بددعا کیجئے۔ آپ نے یہ نہیں کیا بلکہ یہ کہا ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان کو ایمان دے۔ یہاں معجزہ کیا تھا۔ جذبہ انتقام جو فطرتی ہے اوس کو اظہار کا مطلق موقع نہ دیا۔ جس سے ایک عمدہ مثال پیدا ہوگئی کہ ملت و مذہب کی بہبودی کے لئے اس جذبہ کو زیر کر لیا فتح مکہ کے بعد آپ نے کل دشمنوں کو معافی عطا کی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے۔ یہاں بھی آپ نے جذبہ انتقام سے کام نہیں لیا بلکہ ایسی فراخ دلی دکھائی جس سے کفار مکہ متاثر ہو گئے۔ کیا تاریخ میں کوئی ایسا بھی جنرل ہوا ہے جو لڑائی میں فتح یابی کے بعد ایسی نرمی سے پیش آیا ہو کیا یہ خرق عادت نہیں ہے اور بشریت کے ارتقائی مدارج کا سب سے اعلیٰ نمونہ نہیں ہے؟ ایک اور مثال لیجئے۔ غار ثور میں جب آپ تنہا حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ تھے اور دشمن ان کے درپئے تھے۔ اس وقت کے واقعہ پر ذرا غور کیجئے۔ دو ہستیاں ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ ہم صرف دو آدمی ہیں اور دشمن ہمارے پیچھے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ گھبراؤ نہیں ایک تیسرا یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے یہاں کیا چیز تھی۔ آنحضرت کا بھروسہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کی امداد پر اس قدر مضبوط اور اٹل تھا کہ وہ ساری دنیا کی مشکلات اور مصیبتوں سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ یہ ایک ایسی مثال ہے جس کو عیسائی مورخوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ یہی چیز تھی جس نے آپ کی تبلیغ کو کامیاب کیا اور کیا یہ معجزہ نہیں ہے؟ اور کیا اس کو بشریت سے تعلق نہیں ہے؟۔

ایک اور مثال لیجئے۔ سبھوں کو معلوم ہے کہ آنحضرت نے اپنی رسالت کی ابتدا کیسے کی اور تیئیس سال کے اندر سارے عرب میں اسلام کو پھیلا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے اختیارات کو سمجھانے کے "کن فیکون" کہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اسلام کو بھی کن فیکون کے ذریعہ پھیلاتا اور سارے عرب کے قلب کو اس کی طرف پھیر دیتا

اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں؟ یہ بشریت کے خلاف ہوتا جب اس کو یہ کام ایک بشر کے ذریعہ کرانا تھا تو ایسا نہیں کرسکتا تھا عقل کے خلاف یہ بات پھر بھی ایک اقل مدت میں محض بے سروسامانی کے باوجود اس نے اس کو ایسا مکمل کیا جس کی مثال آج تک دنیا میں نہیں ہوا ہے۔ کیا یہ معجزہ نہیں تھا عقل یہی ہے کہ انسان اپنے ارادہ میں اگر پوری طرح سے مستحکم ہو اور خدا پر بھروسہ کرے تو ہر مشکل کو سر کرسکتا ہے۔ یہ بہت بڑا سبق ہے جس سے مسلمانوں کو اپنی زندگی میں فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ آنحضرت کی سیرت میں ایسی مثالیں بہت ہیں جن سے مسلمان مستفید ہوسکتے ہیں بشرطیکہ ان کو بااثر طریقہ سے سنایا جائے۔ اور سمجھایا جائے۔ خانگی معاملات میں آپ کی زندگی کی مثالیں اگر پیش کی جائیں تو اس سے مسلمان اپنے معاملات کو خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ میرا مطلب اس مختصر مضمون سے یہ ہے کہ محفل میلاد میں بجائے اس کے کہ غیر مستند کہانیاں سنائی جائیں آنحضرت کی سیرت اور اسلامی تاریخ سے مثالیں سنائی جائیں جو سامعین کے بہترین جذبات کو بیدار کریں اور جن سے وہ اپنی عملی زندگی میں مستفید ہوسکیں۔ اب رہا یہ سوال کہ ایسے واعظ جو اس کام کو کرسکیں ہر جگہ نہیں ملتے۔ عام طور سے محفل میلاد میں پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے تھوڑی اردو پڑھ لی اور اپنے لحن سے زیادہ کام کیا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے خدا کے فضل وکرم سے دارالمصنفین جیسے ادارے ہمارے ملک میں ہیں۔ منجملہ اس کے خود جامعہ ہے۔ اگر عام فہم اردو زبان میں میلاد کی کتابیں ایسے اصول پر جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے تیار کریں اور کم قیمت پر اس کی اشاعت کرائیں تو انشاء اللہ مجھے امید ہے کہ لوگ اسے پسند کریں گے اور رفتہ رفتہ آنحضرت کی سیرت سے بخوبی واقف ہوجائیں گے۔

(عطاء الرحمٰن صاحب ایم۔ اے)

تنقید و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

آزاد حیدرآباد :- ناشر و مرتب جناب مرزا مظفر بیگ صاحب مالک "مکتبہ ابراہیمیہ"
تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۸۰ صفحات، طباعت و کاغذ معمولی قیمت ۱۲ر، ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

ریاست حیدرآباد ہندوستان کی ان چند مخصوص ترقی یافتہ ریاستوں میں ہے، جس نے گذشتہ ربع صدی میں تعلیمی، معاشی اور اقتصادی حیثیت سے نمایاں طور پر قابل لحاظ ترقی کی ہے۔ اور یہ ترقی ہنوز ختم نہیں ہو جاتی بلکہ "جامعہ عثمانیہ" کی وسیع تعلیم نے رعایا حیدرآباد کو ایک آزادی خواہ روشن خیال شہری بنا کر والی حیدرآباد کے ان گنت احسانات اور وسیع النظری کے باعث آج کے حیدرآباد کو برطانوی ہندوستان کی طرح خوش حال تعلیم یافتہ زرخیز اور صنعت گر بنا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل کے زمانہ میں جبکہ شاہ پرستی زمانہ قدیم کی ایک فرسودہ رسم خیال کی جاتی ہے۔ رعایا حیدرآباد بلا تخصیص قوم و مذہب بادشاہ پرستی کو اپنے لئے باعث فخر اور ذریعہ ترقی و عافیت خیال کرتی ہے۔

زیر نظر مجموعہ مضامین اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو نواب بہادر یار جنگ بہادر صدر مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد اور کل ہند ریاستی مسلم لیگ کے "تاثرات" اور "کلمہ ناشر" کو چھوڑ کر مختلف حضرات کے اٹھارہ مختلف سیاسی مضامین پر مشتمل ہے۔ جو اس سے قبل مختلف اخبارات و کتب میں شائع ہو چکے ہیں۔

کتاب کا آغاز خسرو دکن و برار کی اس شاہی تقریر سے کیا گیا ہے جو اعلیٰ حضرت نے گذشتہ دو صد سالہ جشن خود مختاری سلطنت آصفیہ کے موقع پر کی تھی۔ ابتدا میں بادشاہ حیدرآباد و برار کی مختصر سوانح حیات پیش کرنے کے بعد حکومتی معاہدات کی روشنی میں ریاست حیدرآباد کی آئینی حیثیت پیش کی گئی ہے ساتھ ہی ساتھ وسیع رقبہ ریاست، خارجی تعلقات۔ خاص

ریاست حیدرآباد کا ڈاکخانہ، کرنسی نوٹس، حکومت خود اختیاری اور مختلف برطانوی اعلانات و معاہدات کی رو سے آزاد حیدرآباد کے تخیل کو پیش کر کے رعایا حیدرآباد کے مخصوص تاثرات کو خاتمہ کتاب پر مجلس اتحاد المسلمین کی اس یادداشت کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے جو مجلس مذکور نے رعایا حیدرآباد کی جانب سے صدر اعظم حکومت سرکار عالی کی خدمت میں پیش کی تھی۔ کتاب کے شروع میں ریاست حیدرآباد کا ایک نقشہ بھی دیا گیا ہے جس میں خاص طور پر اس کی تشریح کی گئی ہے کہ قدیم حیدرآباد کا رقبہ کیا تھا اور اب موجودہ حیدرآباد کا کیا ہے

اس مجموعہ مضامین "آزاد حیدرآباد" کو دیکھنے سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ جس طرح دوسری ریاستوں میں سیاسی تحریکات کو کچل کر رعایا کو اسکے حقیقی جذبات و احساسات کے پیش کرنے سے روکا جاتا ہے اور ان کو حدود ریاست میں کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ اور جس کے باعث عام ریاستی رعایا موجودہ نظام سے سخت نالاں و بیزار رہتی ہے۔ اس کے برعکس رعایا حیدرآباد کو برطانوی ہند کی طرح بہت کافی بہتر اور کافی آسانیاں حاصل ہیں جس کی کہ ایک آزاد شہری کو ضرورت ہوتی ہے۔

غرضکہ اس مختصر مجموعہ مضامین کو دیکھنے سے ریاست حیدرآباد کی تاریخی و آئینی حیثیت اور باشندگان حیدرآباد کا وہ نصب العین جو انھوں نے اپنے لئے متعین کیا ہے کسی نہ کسی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ گو بعض مضامین تشنہ اور غیر مکمل ہیں، اور طرز تحریر بعض جگہ ضرورت سے زیادہ شاعرانہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ مجموعہ مضامین ان لوگوں کے لئے جو حیدرآباد سے دلچسپی رکھتے ہیں معلومات حاصل کرنے کا مفید ذریعہ ہے۔ (ہادی نقشبندی)

مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میگزین (ستمبر ۱۹۴۲ء) یہ رسالہ علیگڈھ اسکول سے حسب عادت وقتاً فوقتاً نکلا کرتا تھا لیکن اب کی سید محمد صاحب ٹونکی کی زیر نگرانی اس میں کچھ جان پڑ گئی ہے اڈیٹوریل نوٹ اور شذرات بھی ہیں نیز زیادہ تر مضامین لڑکوں کے لکھے معلوم ہوتے ہیں جن میں بعض خاصے اچھے ہیں ایک خاص بات اور یہ ہے کہ ظہور وارڈ کے بہت چھوٹے بچوں کی بھی ہمت افزائی کی گئی ہے ہر جماعت کے جو قلمی رسالے نکلتے ہیں ان کے اچھے مضمون بھی اس میں شامل کر دئے گئے ہیں پھر بھی ابھی اس میں چند خامیاں باقی رہ گئی ہیں۔ مثلاً غزلیں اس مجموعے میں نہ ہونا چاہئے تھیں دسویں درجہ تک کا زمانہ غزلوں کا نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے نظمیں رکھنا چاہئے تھیں اور معصوم شرارت کی قسم کے افسانوں کا تو اس میں قطعی گذر نہ ہونا چاہئے۔ ظہور وارڈ کے ننھے قارئین کے لئے بھی ان کی دلچسپی کی چند لوریاں یا ملی نظمیں ہونا چاہئے تھیں ہمیں امید ہے سید محمد صاحب ان امور کا ضرور لحاظ رکھیں گے

اسلامی ہندی تمدن

ہندی اسلامی تمدن کا درخت تین سرزمینوں کا رہین منت ہے۔ اس کی بنیادوں نے سرزمین عرب میں جڑ پکڑی، ایران میں اس نے حسن وہم آہنگی کا جامہ پہنا اور ہندوستان میں یہ برگ و بار لایا۔ اس تمدن کی ماہیت اصلی کا اسی وقت اچھی طرح علم ہو سکتا ہے جب ہم اُن تمام اثرات کا مطالعہ کریں جن کا اثر اس تمدن پر اس کی تاریخی تشکیل کے ایام میں بہت زیادہ مرتب ہوا ہے قبل اس کے کہ ہم ان تاثرات اور ان کے عناصر کا تجزیہ کریں یہ ضروری ہے کہ ہم "تمدن اسلامی اور ہندی" کی اصطلاحات کے معانی واضح کریں تاکہ بعد میں ان کے باہمی ربط سے جو مفہوم اور معانی پیدا ہوتے ہیں اس کے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

تمدن کے گہرے فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی پہلو کو ہم اس وقت نظرانداز کر دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ہمارے مباحث بہت طویل ہو جائیں گے۔ ہم اس وقت فلسفہ تمدن کے اُن مختلف نظریوں کی طرف بھی اشارہ کرنا نہیں چاہتے جو فلاطون سے لے کر ابن خلدون ہیگل اور عہد جدید میں اشپنگلر نے پیش کئے ہیں۔ تمدنی مسائل سمجھنے کے لئے ان نظریات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے اور صرف اسی علم کی روشنی میں کسی تمدن پر ایک جامع نظر ڈالی جا سکتی ہے لیکن اس کے لئے تو تمدن کی ماہیت پر ایک مستقل بحث کی ضرورت ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ہم اس وقت صرف تمدن کی ایک مختصر تشریح پر اکتفا کریں گے تاکہ ہم اپنے اصل عنوان یعنی "اسلامی ہندی تمدن" کی ماہیت کو واضح کر سکیں۔

تمدن جس طرح عام طور پر سب ہی جانتے ہیں۔ مدن اور مدنیت سے نکلا ہے اس کا بڑا گہرا تعلق شہر اور شہریت سے ہے۔ تمدن کی ابتدا شہری زندگی سے ہوئی اور اس وسیع اصطلاح میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو شہری زندگی میں پائی جاتی ہیں مثلاً شہریوں کا رہنا سہنا، اس رہنے سہنے کا طریقہ، رسوم و رواج، معاشی و سیاسی جدوجہد، اخلاق و مذہب وغیرہ یہ سب ہی کچھ تمدن میں شامل ہے اور اس سے بہت کچھ تمدن کے مفہوم کی تشریح بھی ہو جاتی ہے لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں تمدن کے صرف خارجی پہلو پر زور دیا جا رہا ہے

نتائج مرتب ہوتے ہیں جو تعلیمات اسلامی کا دوسرا اہم پہلو ہیں توحید کے مابعد الطبیعاتی تعین کا اخلاقی پہلو اخوت انسانی ہے۔

اسلام نے اخوت انسانی کا صرف نصب العین ہی پیش نہیں کیا بلکہ اُسے مکمل طور پر موثر بنانے کے لئے ایک اجتماعی قانونی شکل بھی دیدی۔ نماز روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر اسلامی احکامات کے ذریعہ نہ صرف نفس انسانی کی روحانی نشوونما مدنظر ہے جو دراصل ایک صالح جمیعۃ کے قیام کے لئے بنیاد کا کام دیتی ہے بلکہ اس کے ذریعہ بیش از بیش اخوت انسانیہ کی تربیت بھی مقصود ہے۔ اس اخوت انسانیہ کے تصور کے باعث حرمت انسانی نے اسلام میں ایک بہت اہم شکل اختیار کر لی۔ انسانی ضمیر کو مقدس اور دین میں ہر قسم کے جبر واکراہ کو ممنوع قرار دیا گیا۔ تمام انسانیت کو ایک جسم واحد اور ہر فرد کے خلاف کسی قسم کا گناہ انسانیت کے خلاف گناہ قرار دیا گیا۔ اخلاقیات میں اس روح نے مساوات انسانی کا جامہ اختیار کیا تو سیاست میں جمہوریت کا اور حقیقت میں ایک ایسے نظام کا جو تمام افراد انسانی کی مادی احتیاجات کا کفیل ہو۔ مظلوم افراد اور اقوام کی حمایت اسلام کا شروع ہی سے طرۂ امتیاز رہا غرضکہ تمدن اسلامی کا دھارا شروع ہی سے اخوت انسانی آزادئ ضمیر، جمہوریت، نظم، اطاعت امیر، درمیانہ روی، رجائیت، علم کی آزادانہ تفتیش، حمایت مظلومین وغیرہ جیسی اخلاقی خوبیوں سے شروع ہوا۔ یہ دھارا جہاں جہاں پہونچا وہاں کم یا زائد یہ خوبیاں موجود رہیں۔ اقوام اور ممالک کے خصائص بیشک اثر انداز ہوتے رہے۔ یہ ہر جگہ اسی قدر بارآور رہا جس قدر قبول کی صلاحیت وہاں موجود تھی۔ مثلاً عرب بالطبع آزاد تھے اس لئے جمہوریت ایران کے مقابلہ میں جو شہنشاہیت پرست تھے زیادہ کامیاب ہوئی۔ عرب کا سادہ اخلاق ایران میں قائم نہ رہ سکا لیکن اسلام کی علمی روح اس وقت تک مکمل طور پر برگ و بار نہ لاسکی جب تک کہ ایرانیوں نے اس کی پرداخت بغداد کے دربار عباسیہ میں نہ کی۔

ہندوستان میں اسلامی تمدن کا ہندوستان کے قومی اور ملکی خصائص سے اثر پذیر ہونا ایک لازمی امر تھا۔ اسلام ہندوستان میں دو راستوں سے داخل ہوا۔ اوّلاً جنوبی ہند کے ذریعہ جہاں عرب تاجر بغرض تجارت آیا کرتے تھے۔ یہ تاجر خالص مذہبی روح سے معمور تھے اور ان کے اثرات اہل ہند پر بہت ہی اچھے مرتب ہوئے۔ اسی سلسلہ میں محمد بن قاسم سندھ میں فاتحانہ طریق پر داخل ہوا مظلوم رعایا نے اس کا

استقبال کیا۔ خالص سیاسی نقطۂ نظر سے یہ کوششیں زیادہ کامیاب نہیں لیکن خالص مذہبی نقطۂ نظر سے یہ اثرات بہت ہی موثر اور دیرپا ثابت ہوئے۔ اسلام کو یہاں خود عربوں نے بہت کچھ اس کی اصلی شکل و صورت میں پیش کیا تھا۔ یہ لوگ خود مساوات کے حامل تھے اس لئے مساوات کا سبق انھوں نے اہل ہند کو دیا جو ذات پات کی تفریق سے بیزار ہو چکے تھے۔ اس لئے سندھ کے باشندے کثیر تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے کامیاب کوششیں ان بزرگان دین کی بھی تھیں جنھوں نے اپنی روحانی اور اخلاقی طاقت سے اہل ہند کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا اور مساوات صداقت اور نیکی کی طرف ان کی رہنمائی کی تھی۔ یہ اسلام اور ہندوستان کا بلا واسطہ تعلق تھا۔ لیکن بعد میں ایک زبردست بالواسطہ تعلق بھی پیدا ہو گیا۔ اس تعلق کے پیدا کرنے والے ایرانی اور مغل تھے۔

اسلامی ہندی تمدن نے جہاں مذہبی اور اخلاقی عناصر عرب سے حاصل کئے وہاں ادبی اور جمالی عناصر اُس نے ایران سے لئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے طرز تعمیر، مصوری، نقاشی اور موسیقی پر ایرانی اثرات بہت زیادہ مرتب ہوئے فنون لطیفہ کے ان مظاہرات نے اپنے اصلی ہندی خصائص کو ترک تو نہ کیا لیکن ایرانی اثرات کا اس قدر غلبہ رہا کہ شروع میں ایک ہم آہنگ توازن قائم رکھنا دشوار ہو گیا۔ بالآخر ایرانی اور ہندی عناصر کی ترکیب سے ایک ہندی مسلم فن تعمیر، مصوری اور موسیقی پیدا ہو گئی۔ فن تعمیر میں اس کا بہترین نمونہ حسین و جمیل تاج ہے جس میں اس زمانہ کی ہم آہنگ تمدنی روح کا اظہار ہے۔ جو چیز اس زمانہ کی سب سے دلکش یادگار ہے وہ زبان اردو ہے۔ اُردو نے شروع شروع میں تو فارسی نظم و نثر کے زیر سایہ نشو و نما پائی لیکن بالآخر اس نے اپنا آزادانہ رنگ اختیار کر لیا۔ اولاً نثر نے یہ آزادی حاصل کی پھر نظم کی باری آئی لیکن اس وقت بھی ہماری شاعری فارسی سے پورے طور پر آزادی حاصل نہیں کر سکی ہے۔ وہ ہنوز گل و بلبل کی مصنوعی فضا میں پرورش پاتی ہے۔ خیالات بیشک ہندی روح کے حامل ہیں لیکن اس کا جامہ ہنوز ایرانی ہے۔ اردو کی جدید شاعری کے ساتھ جس میں عوام کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی جا رہی ہے غالباً یہ نقص بھی دور ہو جائے گا۔ آریہ النسل ایرانیوں نے جہاں ہمارے تمدن کو ادب، شاعری، موسیقی مصوری اور فن تعمیر کے ذریعے حسن و جمال سے مالا مال کر دیا وہاں مغلوں نے ریاست

اور نظم کے تصور کے باعث ہماری قومی زندگی میں ارتباط پیدا کر دیا۔انھوں نے ہندوستان میں ایک منظم، مضبوط اور واحد زندگی کی بنیاد رکھی، اپنی سیاست دانی، تدبر، میانہ روی، رواداری، بہادری اور فراخ حوصلگی کے باعث ایک ایسی مرکزی حکومت کی بنیاد رکھی جس نے ہندوستان کے بہت ہی متضاد عناصر کو باہم ایک سر رشتہ میں پرو دیا۔ پُر امن اور عادلانہ ریاستی نظام کے سایہ میں ہندی تمدن کا درخت سرسبز ہونے لگا۔ عرب، ایرانی مغل اور ہندی نژاد قوموں کی ذہنی عناصر کی ترکیب سے ایک نیا تمدن وجود میں آیا۔ یہ تمدن اپنی نشو و نما کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ ہندوستان مغربی اقوام کا شکار گاہ بن گیا۔ حاکم قوم کو اس تمدن سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اس نے اپنی سیاسی مصالح کی بنا پر ایک ایک کر کے ان سر رشتوں کو کاٹنا شروع کیا جو اس تمدن کو باہم مربوط کئے ہوئے تھے حتیٰ کہ یہ تمدن آزاد سیاسی اور اس کے اپنے نفسی سرچشموں سے غذا نہ ملنے کے باعث سوکھ کر مرجھا گیا۔ زندگی اور نمو کی اس میں قوتیں باقی نہ رہیں۔

اسلامی ہندی تمدن پر اس کی آج کل کی زبوں حالت دیکھ کر بے جا تنقید کی جاتی ہے۔ آج کل کے زندہ تمدنوں کے مقابلہ میں اس کا معیار بہت پست ہے لیکن اپنی تاریخی ترقی کے دور میں وہ انسانیت کی عظیم الشان خدمت انجام دے چکا ہے۔ اسلام کی مذہبی روحانی قدروں کا وہ ہمیشہ حامل رہا۔ مساوات اور جمہوریت کی اخلاقی قدروں کا اجتماعی طور پر زیادہ اظہار نہ ہو سکا۔ اس کا بہت بڑا سبب یہ عجمی قومیں تھیں جنھوں نے ہندوستان میں حکومت صرف مذہبی مقاصد کے لئے قائم نہ کی تھی بلکہ دنیاوی مقاصد کا حصول ان کو زیادہ مطلوب تھا باوجود اس کے بھی عدل و انصاف کا تصور بعض مستثنیات کے علاوہ جماعتی زندگی پر حاوی رہا سیاسی طور پر اس عہد میں ملک کو ایک واحد نظام ریاست میسر آیا۔ علوم و فنون میں یہ عہد عباسیہ کے عربی تمدن کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ فنون لطیفہ میں ایران کا تاہم ان شعبوں میں بھی اس کا حصہ کچھ بہت کم نہ تھا۔ اسلامی ہندی تمدن نے ہندی اثرات کے باعث اس ملک میں ایک قسم کا داخلی رنگ اختیار کر لیا۔ تصوف کا ورثہ اسے بہت کچھ ایران ہی سے ملا تھا اس ملک کے ماحول اور ہندی نژاد قوموں کے نفسی خصائص کے باعث یہ رنگ یہاں اور بھی بہت گہرا ہو گیا۔ خانقاہیں عام طور پر تمام ملک میں قائم ہو گئیں۔ اور باطنی تربیت پر ظاہری اعمال سے زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس داخلیت پر قدرے جمالی رنگ بھی

چڑھ گیا جس کے باعث جذباتی انسانوں کے لئے اس تمدن میں بڑی کشش پیدا ہوگئی۔ ان داخلی جمالی اسلامی ہندی تمدن کی بہترین مثال امام خسرو کی ذات میں ملتی ہے۔ اسلام کبھی بھی ہندوستان میں ایک سخت خارجی اخلاقی نظام کی صورت نہ اختیار کر سکا جس طرح کہ اس نے عرب میں کیا تھا اور جب اہل حدیث کی تحریک نے اس کی یہاں کوشش کی تو وہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔

اسلامی ہندی تمدن پر ایک سرسری تاریخی تنقیدی نظر ڈالنے سے ہمیں اس کی ماہیت اصلی کا پتہ چل گیا ہے ہمیں اُن عناصر کا بھی پتہ چل گیا ہے جن سے اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ وہ حضرات کس قدر سطح بیں ہیں جو اس کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے یا جو اس کی بقا اور تحفظ کے ہر وقت بلند وبانگ دعوے کرتے رہتے ہیں لیکن نہ اس کی ماہیت اصلی سے واقف ہیں اور نہ اس کے ان عناصر سے جن سے اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ نہ ہی ان کی زندگیوں میں اس کا اثر پایا جاتا ہے جس کے بغیر تمدن کی اصلی روح سے واقف ہونا ناممکن ہے۔ اسلامی ہندی تمدن کی وضاحت کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی عہد حاضر میں کیا قدر وقیمت ہے۔ وہ خود ہندی مسلمانوں، ہندوستان، عالم اسلامیہ اور تمام عالم انسان کے لئے کس قدر مفید یا مضر ہے۔ اس کی مستقبل میں کیا حیثیت ہوگی؟ عہد حاضر کی تمدنی کش مکش میں وہ کس حد تک اپنی حیثیت باقی رکھ سکتا ہے؟ دنیا کی دیگر تحریکات مثلاً مغربی وطنیت فسطائیت، روسی اشتراکیت اور ہندو تحریک قومیت کے مقابلہ میں اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ اس پر ان تحریکات کا کیا ردّعمل ہوگا؟ وہ کس حد تک اپنی داخلی روح اور خارجی مظاہر کے باعث ان تحریکات کو رد کرے گا یا قبول کرے گا۔ یا وہ کوئی ایک معتدل مطابقت کا راستہ اختیار کرے گا قطعیت سے ان سوالات کا جواب دینا بہت مشکل امر ہے۔ تاریخ مستقبل کی آغوش میں پوشیدہ ہے۔ ہم صرف ان سوالات کا یہاں ایک محدود جواب دینے کی کوشش کرینگے

جدید مغربی قومیت کی تحریک عہد وسطی کے کلیسا کے تشدد کے خلاف ایک بغاوت تھی اس لئے آزادی اور بغاوت کے جراثیم اس میں شروع ہی سے موجود تھے۔ وہ مذہب اور سیاست میں مرکزیت کے خلاف ایک لامرکزیت کی تحریک تھی اس لئے نہ تو وہ کسی عالمگیر مذہب کو تسلیم کرتی تھی اور نہ ہی ایک عالمگیر ریاست کو۔ یورپ میں اس تحریک کے باعث جہاں رومن کلیسا کے خلاف پروٹسٹنزم، کالونیزم، اور

اینگلو سیکسن چرچ وغیرہ قائم ہوگئے وہاں ہر ملک کی ایک جداگانہ حکومت بھی قائم ہوگئی۔ قومی جذبات اور جداگانہ ریاستوں کے باعث ہر قوم میں ایک نئی روح دوڑ گئی اور علوم فنون، صنعت وحرفت نے بے انتہا ترقی کی اس تحریک کا لیکن دوسرا نتیجہ بھی مرتب ہوا بین الاقوامی کی جگہ قومی اخلاق نے لے لی۔ یعنی قوم کے حدود کے اندر تو کسی حد تک اخلاقی معیار کو تسلیم کیا گیا لیکن دوسری اقوام کو اپنی قومی اغراض کے لئے تباہ و برباد کرنا نہ صرف برا نہ خیال کیا گیا بلکہ مستحسن قرار دیا گیا۔ اسی زمانہ میں مغرب کی زندہ اور قوی اقوام نے مشرق کی مضمحل اور کمزور اقوام کو سیاسی اور معاشی لحاظ سے غلام بنالیا۔ اسلامی ہندی تمدن کو مغرب کی اس پیش قدمی سے سخت نقصان پہونچا۔ وہ یکایک اب ایک ایسی حکومت کا تابع فرمان ہوگیا جو اس کو آزادانہ ترقی اور نشو ونما کا موقعہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ معاشی اور سیاسی نظام کی تباہی کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور تمدنی نظام بھی منتشر ہوگیا۔ تعلیمی شعبہ میں کچھ کوشش اس تمدن کو بچانے کی کی گئی مگر ضرب اس قدر کاری تھی کہ خاطر خواہ نتائج مرتب نہ ہوئے۔ ہم اس وقت بھی تمدنی تباہی کے اسی گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔

مغربی قومی تصور بھی دو قسم کا تھا ایک اخلاقی جسے اس کے فلسفیوں اور قومی رہنماؤں مثلاً روسو فشتے، میزینی وغیرہ نے پیش کیا تھا۔ اس میں قومیت کا تصور انسانیت کے خلاف نہ تھا۔ بلکہ قوم کو انسانیت کی خدمت کے لئے ایک زینہ قرار دیا گیا تھا۔ اس قسم کا تصور اسلامی ہندی تمدن کی بنیادی روح کے خلاف نہ تھا جو انسانیت کے تصور کی حامل تھی لیکن اس قومیت کا ایک جارحانہ پہلو بھی تھا جو قوم کو سب سے اعلیٰ نصب العین قرار دیتا تھا اور ہر جائز و ناجائز طریق پر صرف اپنی اپنی قوم کا فائدہ کرنا چاہتا تھا۔ اس جارحانہ قومیت کے تصور کے باعث انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی وغیرہ میں شہنشاہیت کا جذبہ پیدا ہوا اور دوسری اقوام کو ان اقوام نے خوب ہی تباہ و برباد کیا اور یہ سب ہی کچھ اخلاق اور تہذیب و تمدن کے پھیلانے کے بہانے سے کیا گیا۔ اس قسم کا قومیت کا تصور ہمارے تمدن کی بنیادی روح کے خلاف ہے اور ہم اسے بغیر اپنے تمدن کو سخت نقصان پہونچائے کبھی بھی قبول نہیں کر سکتے۔ مغربی قومیت کے تصور کا اثر دیگر اسلامی ممالک مثلاً ترکی، ایران اور مصر پر بہت پڑا۔ اس کے باعث ان میں دوبارہ زندگی اور قوت پیدا ہوگئی۔ مگر وہ اپنی بعض قابل قدر خصائص کھو بیٹھے۔ اس نقالی کے خلاف لیکن ان ممالک

میں بھی اب ردِعمل شروع ہو گیا ہے اور امید ہے کہ بہت جلد وہاں صحیح توازن قائم ہو جائے گا۔ ہندوستان میں مغربی تمدن چونکہ شہنشاہیت کے ذریعہ پہونچا اس لئے بدقسمتی سے یہاں وہ خوشگوار نتائج بھی نہ مرتب ہوئے جو اس تمدن کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً جذبۂ آزادی، علوم و فنون کی آزادانہ تحقیق، ملک و قوم کی محبت وغیرہ یہاں تو صرف وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں جو دوسروں کی غلامی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے یعنی احساس کمزوری فقدان عمل، مایوسی، کم ہمتی، نقالی، تعصب، فرقہ پروری، غلامی پر قناعت، تنگ نظری، قوم فروشی جیسی مہلک اخلاقی بیماریاں اس ملک میں پیدا ہو گئیں۔ افسوس ہے کہ مسلمان بھی جو اعلیٰ اخلاقی خوبیاں رکھتے تھے، جلد ہی ان تمام امراض کا شکار ہو گئے۔ مغرب کی علمی روح مسلمانوں کے اُن اثرات کے باعث پیدا ہوئی تھی جو یورپ پر اسپین جنوبی اٹلی، سسلی وغیرہ کے ذریعہ مرتب ہوئے تھے۔ یہ علمی روح (scientific spirit) مسلمانوں کی روح کے عین مطابق تھی۔ فطرت کے آزادانہ مطالعہ اور تحقیق کی قرآن میں بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسی تعلیم سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے علوم فطری میں بہت کچھ کام انجام دئیے جب یورپ نے مسلمانوں ہی کے لگائے ہوئے پودے کو ایک ترقی یافتہ شکل میں پیش کیا تو مسلمانوں نے اس سے اپنی لاعلمی اور کوتاہ نظری کے باعث غیریت ظاہر کی۔ غرضکہ بہت جزوی فائدوں کے علاوہ مسلمانوں کے لئے مغربی تمدن ہندوستان میں مضرت رساں ثابت ہوا۔ وہ جاپان اور ترکی کی طرح یہاں ایک نئی زندگی نہ پیدا کر سکا مسلمانانِ ہند میں تھوڑی بہت نئی زندگی مغربی تمدن کے باعث پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کے خلاف ردِعمل کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ اسلامی ہندی تمدن مغرب کے اخلاقی تصورِ قومی کو جس کے مدنظر قوم کے ذریعہ انسانیت کی خدمت ہے قبول کر سکتا ہے۔ مگر وہ اس کے جارحانہ تصورِ قومی کو مطلق بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ جہاں تک مغرب کی آزادانہ علمی روح کا تعلق ہے دراصل وہ اور اسلامی علمی روح ایک ہی نفسی کیفیت کے مظاہر ہیں اور دونوں تاریخی لحاظ سے بھی باہم مربوط ہیں۔ اسلامی ہندی تمدن کو مغربی تمدن کے اس عنصر کو فوراً اپنے آپ میں چونکہ وہ اس کی فطرت کے مطابق ہے جذب کر لینا چاہئے۔

جس طرح جارحانہ قومیت کو جس کا لازمی نتیجہ شہنشاہیت اور سرمایہ داری کی شکل میں ظاہر ہوتا

ہے اسلامی ہندی تمدن قبول نہیں کر سکتا اسی طرح وہ عہد جدید کی فسطائیت کی تحریک جس کے نمائندے جرمنی اور اطالیہ ہیں قبول نہیں کر سکتا۔ فسطائیت دراصل جارحانہ قومیت کی ایک سب سے زیادہ شدید شکل ہے جس میں ملک و قوم کو ایک دیوتا تسلیم کر لیا گیا ہے جس کی بلا چون و چرا عبادت ہر ریاست کے شہری پر لازم ہے۔ اس کی بنیاد نسل و خون کی برتری پر استادہ ہے۔ جو اسلامی تصور کے خلاف ہے فسطائیت کا نتیجہ بھی بالآخر قتل و خونریزی اور شہنشاہیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس کے مناظر ہم یورپ میں دیکھ رہے ہیں۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد فسطائیت جمہوریت کے خلاف ایک ردعمل تھا جمہوریتیں دراصل جمہوریتیں نہ رہی تھیں بلکہ وہ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اپنی ذاتی اغراض حاصل کرنے کے لئے آلہ کار ہو گئی تھیں۔ حکومتوں پر غریبوں کا کچھ بھی اثر نہ تھا اس لئے وہاں جو بھی قوانین بنتے تھے ان کا مقصد امراء کے مفاد کا ہی تحفظ تھا۔ ایسے فرسودہ نظام کے خلاف ردعمل ہونا لازمی امر تھا پھر جنگ عظیم نے اطالیہ اور خصوصاً جرمن کے قومی وقار کو جو صدمہ پہونچایا اس کو یہ قومیں فراموش نہ کر سکتی تھیں۔ ان اقوام نے سرمایہ دارانہ شہنشاہی پرست اقوام سے ہٹلر اور موسیولنی کی رہنمائی میں بالآخر بدلہ لینا شروع کیا۔

ایک رہنما پر یقین اور اس کی کلی اطاعت فسطائی تعلیمات کا ایک بہت اہم جزو ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت جمہوریتیں ناکارہ ہو جائیں عوام الناس میں نہ قومی مسائل سمجھنے کا مادہ ہو اور نہ ان کے حل کرنے کے لئے وہ کوئی عملی موثر قدم اٹھا سکیں، سرمایہ دار اپنے ذاتی اغراض کے لئے عوام کو ان کی جہالت کے باعث خوب ہی لوٹیں۔ ملک کی مختلف پارٹیاں اپنا تمام وقت بجائے ملکی مفاد کے حصول کے صرف آپس کی خانہ جنگی میں صرف کریں۔ بلکہ بسا اوقات وہ خارجی ریشہ دوانیوں کے لئے آلہ کار ثابت ہوں، ایسی صورت میں ملک کو جلد از جلد تباہی اور بربادی سے بچانے کا صرف ایک ہی ذریعہ باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ملک کے سب سے قابل، بہادر اور عقلمند شخص کو بشرطیکہ خوش قسمتی سے کسی ملک کو ایسا رہنما مل جائے تمام اختیارات تفویض کر دیے جائیں اس طرح قومی مسائل کے حل کے لئے جلد از جلد عملی اقدام اٹھائے جا سکیں گے۔ لیکن اس کا ضرور خیال رہے کہ اس رہنما کو قوم کے سامنے جوابدہ

ضرور ہونا چاہیئے اور تمام ملک کی ایک بڑی اکثریت کو اسے برضا و رغبت اپنا راہ نما تسلیم کر لینا چاہیئے۔
فسطائیت کے رہنما کا تصور اسلامی تصور امیر سے بہت ملتا جلتا ہے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا تمام عمر کے لئے انتخاب کر دیا گیا۔ وہ امت کے سامنے ضرور جواب دہ تھے مگر ہر چند برس کے بعد انتخاب کا خطرہ ان کی قومی اور ملکی پالیسی کی راہ میں حائل نہ تھا۔ ہمارے لئے یہ امر بہت زیادہ غور طلب ہے کہ قومی کارکردگی بڑھانے کے لئے ہم کس حد تک دوبارہ اصول امارت کو زندہ کر سکتے ہیں تاکہ قومی زندگی کا انتشار ختم ہو اور موثر عمل کے لئے ایک راستہ کھل سکے۔

روسی اشتراکیت بھی سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کے خلاف جنھوں نے شہنشاہی رنگ اختیار کر لیا تھا ایک ردعمل ہے۔ اس تحریک کا محرک لیکن فسطائیت کی طرح نسل و قوم کی برتری کا خیال نہیں ہے۔ بلکہ عوام الناس کی محبت ہے۔ یہ تحریک انسانیت کو اس کی موجودہ غربت اور جہالت سے نجات دلانا چاہتی ہے۔ اس کا نقطہ نظر قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ وہ دولت کے سرچشموں کو عوام کے قبضہ میں ان کی حکومت کا ذریعہ کر دینا چاہتی ہے تاکہ سرمایہ دارانہ نظام دوبارہ پیدا ہی نہ ہو سکے۔ یہ تحریک ایک زبردست اخلاقی احساس کا نتیجہ ہے جو قوم نسل اور ملکی تعصبات سے بالا ہو کر انسانیت کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دینا چاہتی ہے۔ جہاں تک اس تحریک کے ان مندرجہ بالا ثبوتی پہلوؤں کا تعلق ہے اسلامی ہندی تمدن کی روح اس سے کلیتاً متفق ہے۔ اسلام بھی سرمایہ دارانہ نظام کا سخت مخالف ہے وہ یہ نہیں چاہتا کہ دولت صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں جمع ہو جائے اور باقی تمام رعایا مفلوک الحال ہو جائے۔ وہ غریبوں کی کفالت اور ان کے لئے کام مہیا کرنا ریاست کے سپرد کرتا ہے۔ وہ افراد کو صرف اسی حد تک دولت کمانے کی اجازت دیتا ہے جس حد تک کہ وہ اجتماعی مفاد کو نقصان نہ پہنچائے وہ اس امر کو مستحسن نظر سے نہیں دیکھتا کہ انسان اپنی مادی احتیاجات سے زیادہ اپنے پاس دولت جمع کر رکھے۔ وہ اپنے قانون وراثت، زکوٰۃ، بیت المال اور دیگر ٹیکسوں کے ذریعہ ایک ایسا نظام معاشی پیدا کرتا ہے جس میں سرمایہ داری کا وجود ہی نہ ہو سکے۔ حضرت عمرؓ جو مسلمانوں کے خلیفہ تھے بیت المال سے اپنے لئے بھی صرف اسی قدر روزینہ لیتے تھے جس قدر کہ کوئی دوسرا مسلمان۔ اس مسئلہ پر یہاں تفصیل سے بحث

کرنے کا موقع نہیں ہے (اس سلسلہ میں ناظرین "اسلام کا اقتصادی نظام" از مولانا حفظ الرحمن صاحب ملاحظہ فرمائیں،۔ ناشر ندوۃ المصنفین۔ نئی دہلی) اسلام یقیناً صرف ایک ایسے ہی نظام معاشی کی تشکیل چاہتا ہے جس میں دولت پر عوام الناس کا قبضہ ہو اور وہ اسے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کریں اس کی عملی شکل وہ خلفائے راشدین کے عہد میں پیش کر چکا ہے۔ افسوس ہے کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں اجتماعی طور پر کبھی بھی اسلام کی اصل معاشی روح کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ باوجود اس کے بھی یہ نصب العین آنکھوں سے اوجھل نہ رہا۔ صوفیوں کی خانقاہوں میں محدود طریقہ پر اس کو عملی جامہ پہنایا گیا بعض بعض بادشاہوں نے اپنی زندگی میں اس کا عملی نمونہ پیش کیا مثلاً اورنگ زیب علیہ الرحمہ جو صرف اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے اور نہایت سادہ زندگی گذارتے تھے۔

اسلامی نظام معاشی کا مقصد لیکن صرف سرمایہ داری اور اس کے مضر اثرات کو ختم کرنا ہے لیکن وہ ہر قسم کی معاشی میدان میں ذاتی جد وجہد اور اپج کا خاتمہ نہیں کر دینا چاہتا۔ ہر قسم کی ذاتی اپج کے ختم کر دینے سے انسان میں عمل کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسلام تجارت اور دیگر معاشی اعمال میں ذاتی جد وجہد کی اجازت تو دیتا ہے لیکن اس کی بروقت ریاست نگرانی کرتی ہے تاکہ وہ جماعت کے لئے مضر ثابت نہ ہو۔ روس میں بھی ابتداً اشتراکیت کی انتہائی شکل کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی مگر فی الحال انسانی فطرت کی مجبوریوں کے باعث اس میں انھیں بہت کچھ تبدیلی کرنی پڑی ہے اور ذاتی معاشی جد وجہد کے لئے مواقع دینے پڑے ہیں۔

انسانیت کے نصب العین اور غربا کی محبت میں اشتراکیت سے اسلام کی روح ہم آہنگ ہے لیکن وہ اس کے اس مادی فلسفہ کو یک قلم رد کر دیتا ہے جس پر اس کی بنیادیں قائم ہیں۔ اسلام کائنات کی حقیقت مادہ کو نہیں بلکہ روح کو قرار دیتا ہے اس کے نزدیک یہ دنیوی زندگی ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ یہ بھی زندگی کی مسلسل منازل میں سے ایک منزل ہے۔ وہ صرف اسی منزل تک انسان کی نظر محدود کر دینا نہیں چاہتا بلکہ ارتقا کی انتہائی چوٹی تک اسے لیجانا چاہتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے تمدنی ترقی اور تنزل کے آخری عوامل معاشی نہیں ہیں جس طرح کارل مارکس دعوی کرتا ہے بلکہ نفسی ہیں نفس انسانی میں تغیر انقلابات کا موجب ہوتا ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر اس معاملہ میں خارجی پہلو کے بجائے داخلی پہلو پر زور دیتا ہے لیکن اسلام صرف داخلیت ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ داخلی انقلاب کے ذریعہ وہ ایک خارجی انقلاب بھی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ غرضکہ روسی اشتراکیت اور اسلامی ہندی تمدن میں جہاں تک

معاشی مسائل کا تعلق ہے بہت کچھ مطابقت ہو سکتی ہے لیکن دونوں کے نفسی عوامل، محرکات، مقاصد اور نصب العین ایک دوسرے سے کلیتاً متضاد ہیں۔ انسانیت کا نصب العین دونوں میں مشترک ہے لیکن اشتراکیت انسانیت کی معاشی ترقی یا زیادہ سے زیادہ ذہنی ترقی چاہتی ہے لیکن اسلام انسانیت کی معاشی اور ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی اخلاقی اور روحانی ترقی پر بھی بیحد زور دیتا ہے بلکہ وہ انسان کی معاشی اور ذہنی ترقی صرف اس لئے چاہتا ہے کہ انسانیت اپنی اخلاقی اور روحانی ترقی کرے

مغربی تحریک قومیت کی طرح روسی اشتراکیت کا بھی مسلم نوجوانوں پر کچھ کم خراب اثر مرتب نہیں ہو رہا ہے عوام کی شدید غربت کا احساس انہیں اشتراکیت کی آغوش میں لیجاڈالتا ہے اور وہاں جا کر وہ اپنی متاع عقل و ہوش اور دین و ایمان کھو بیٹھتے ہیں حتیٰ کہ بیجا جذبۂ آزادی سے سرشار ہو کر وہ اخلاقی قیود سے بھی آزادی حاصل کر لیتے ہیں جو ہیئت اجتماعیہ کی بقا کے لئے ازبس ضروری ہیں اسلامی ہندی تمدن کو اس شدید حملہ سے بچانے کی صرف ایک ترکیب ہے اور وہ یہ کہ وہ خود قرآن اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں اپنے اعلیٰ معاشی نصب العین کی عملی تفسیر پیش کرے۔ وہ اپنے آپ کو مسلم سرمایہ داروں سے اسلامی تعلیم کے خلاف وابستہ نہ کر دے ورنہ یہاں بھی اسی قسم کا ردعمل ہونا ضروری ہے جس طرح روس میں کلیسا کے خلاف ہوا تھا جس نے اپنا مفاد زار روس کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا مسلمانان ہندیہ اجتماعی معاشی نظام جو عدل و مساوات پر مبنی ہو ہندوستان میں علیحدہ قائم نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں دیگر اقوام بھی آباد ہیں لیکن وہ ہمیشہ ترقی پرور عناصر کا ساتھ دے کر اس اجتماعی نظام کے حصول میں بہت زیادہ ممد ہو سکتے ہیں۔ دراصل اسلامی ہندی تمدن کے مستقبل کا بہت کچھ انحصار اس پر ہے کہ وہ کس حد تک عوام کے جذبات، خیالات، امیدوں اور نصب العین کا ترجمان بنتا ہے امرا، روسا، شہنشاہ پرستوں اور سرمایہ داروں کے خلاف روح عصری کام کر رہی ہے اور جو بھی اپنے آپ کو ان سے وابستہ کر دے گا۔ اس کا مستقبل یقیناً تاریک ہے۔ اسلام کی تعلیم رسول اللہ صلعم کا اسوہ حسنہ، تاریخ اسلامی کا عہد زریں یعنی خلافت راشدہ کی تاریخ اس کے بالکل خلاف ہے۔ ضرورت ہے کہ اسلامی ہندی تمدن اب دوبارہ ان سرچشموں سے غریب اور مظلوم انسانیت کی محبت کا جذبہ حاصل کرے اور اس کو اسلام کی عملی روح سے متاثر ہو کر ایک اجتماعی قانونی شکل دے۔

ڈاکٹر عبدالحمید صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (برلن)

(باقی آئندہ)

عربوں کا مستقبل

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے میں نے یہ قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
(علامہ اقبالؒ)

ذیل کا مضمون رسالہ ایشیا کے تازہ ترین نمبر سے ماخوذ ہے۔ یہ ترجمہ ہے (L. Farago) کے مضمون (The Future of The Arabs) کا ایک غیر مسلم کی زبان سے عربوں کے مستقبل کی نسبت ان امیدوں کا اظہار علامہ اقبالؒ کی پیغمبرانہ بصیرت پر سب سے بڑی گواہی ہے (مترجم)

آج سے تین سال قبل جب میں امیر عبداللہ کے محل میں ان کا مہمان تھا۔ امیر موصوف نے ایک ایسی بات کہی جس پر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ یہ بات جتنے یقین و اعتماد کے ساتھ کہی گئی تھی وقت و حالات کو دیکھتے ہوئے اتنی ہی حقیقت سے دور معلوم ہوتی تھی۔ امیر موصوف تاریخ کے تمدنی اور شہنشاہیتی دوروں پر گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اب ہم تاریخ کے اس دور تک آ گئے ہیں جہاں ملک گیری اور فرمانروائی کے تخت پر عربوں کا ایک بار پھر قابض و متصرف ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ یہ بات انہوں نے کچھ اس انداز سے کہی کہ گویا ان کے دل میں یکایک ایک انوکھے خیال نے کروٹ لی تھی لیکن ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ امیر موصوف نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ اس کے لئے ابھی سو پچاس سال کا عرصہ درکار ہے۔

چونکہ عرب شہنشاہیت کے متعلق یہ پہلا ادعا تھا جو میرے کانوں نے سنا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ گویا امیر عبداللہ اس وقت نیند میں زور زور سے باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہی خیال میرے سامنے مختلف اوقات میں کئی جگہ دہرایا گیا بغداد کے ایک عرب وکیل تھے جنہوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی تھی میں نے یہی یہ بات سنی۔ اسکندریہ کے ایک اخبار نویس نے زیادہ مدلل طور پر میرے سامنے اسی خیال کا اظہار کیا اور جدہ کے ایک افسر کے مکان پر بھی اس سے زیادہ تیقن کے ساتھ میں نے یہی بات دہرائے جاتے سنی۔

یہ صحیح ہے کہ ان تمام مقامات پر جو آوازیں میرے کانوں میں پڑیں ان میں یقین کی پختگی کے ساتھ

امید و آرزو کی جولک تھی لیکن جہاں کہیں میں نے اس مسئلہ کی بابت کچھ سنا اس میں اعتماد کی روشنی صاف طور سے نظر آتی تھی۔ اس خیال کا حقیقی سبب عربوں کا یہ ایمان ویقین ہے کہ ان کی ملی زندگی کے نقوش کا یکسر معدوم ہو جانا بالکل غیر ممکن ہے۔ شجاعت وبسالت عربوں کا قومی ورثہ ہے۔ وہ ایک عظیم الشان تمدن کے حامل بھی رہ چکے ہیں اس لئے قدرتاً انھیں اس بات پر اصرار ہے کہ اندلس سے اخراج کے بعد بھی تاریخ میں ان کا حصہ محفوظ ہے کسی نہ کسی طرح یہ اعتقاد عربوں کے ذہن میں راسخ ہو گیا ہے کہ اگر ان کی ذہنی قوتیں بیدار ہو جائیں اور فکر و نظر کے ایوان میں وہ ایک مرتبہ پھر مسند نشیں ہو جائیں تو ان کی فوجی قوت کا دوبارہ زندگی حاصل کر لینا بالکل قرین قیاس ہے۔

موجودہ حالات میں جبکہ مغربی شہنشاہیت کا کریہ المنظر دیوتا اپنے پورے جلال و جبروت کے ساتھ انسانیت کو پامال کر رہا ہے اور پوری دنیا کو اپنی ملک بنانے کے لئے مصروف جہاد ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عربوں کی یہ امیدیں اور حوصلے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ رکھتے ہیں۔

اِدھر اطالیہ عربوں کے دروازہ پر دستک دے رہا ہے۔ اُدھر جرمنی اور روس توسیع مملکت پر تلے بیٹھے ہیں، ایسی حالت میں عربوں کے لئے آزادانہ زندگی کا کیا مستقبل ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شہنشاہیت پسندوں کے نقطۂ نظر سے بھی عربوں کا ملک ایک بے برگ و گیاہ ریگ زار اور چند خانہ بدوش قبائل کے وطن مالوف سے کہیں زیادہ اہمیت سیاسی رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ صرف ایک جغرافیائی وحدت ہی نہیں بلکہ ایک روحانی مملکت ہے جس کی مذہبی اہمیت سیاسی قوت کی طرح گزوں میلوں خام پیداوار اور صنعتی وسائل کے پیمانہ سے نہیں ناپی جا سکتی ہے۔ جب تک مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ میں اسلام کی معنوی حکومت قائم ہے عرب کا چھوٹا سا ملک ایک مستقبل رکھتا ہے۔ یہ عرب صرف اس جزیرہ نما تک محدود نہیں ہے جو تین طرف بحر ہند، بحیرہ احمر اور خلیج فارس سے گھرا ہوا ہے، بلکہ اس کے حدود مملکت اگر ایک طرف ہندوکش کے پہاڑوں اور شمالی ہند کے میدانوں تک پھیلے ہوئے ہیں تو دوسری جانب زنجبار سے لے کر وادیٔ نیل بلکہ ٹینجیر کے واسطے سے جنوبی یورپ سے بغلگیر ہیں۔ یہ روحانی مملکت اشتراکِ نسل، اشتراکِ زبان اور سب سے بڑھ کر ایمان و اعتقادات کی وحدت پر قائم ہے۔ یہ اسلامی

وفاق ایک مضبوط اور ناقابل تقسیم وحدت ہے جس کا مماثل تاریخ یورپ کے صفحات میں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا۔ اس میں شام ولبنان، فلسطین، سعودی عرب، یمن عمان، بحرین، حضرموت عدن تینوں صومالستان مشرقی حبشہ، مصر، لیبیا، ٹیونس، الجیریا، مراقش، افغانستان، ایران، جمہوریہ روس کی بعض نیم آزاد ریاستیں اور ہندوستان میں شمالی مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب، کشمیر اور سندھ تک شامل ہیں۔ یہ مملکت عظیم تیس کروڑ مسلمانوں کا وطن ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ جس میں کروڑہا نفوس آباد ہیں۔ مغرب کی نئی ملوکیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس جاندار اور زندگی سے معمور شہنشاہیت کو جس نے اب یورپ سے سر نکالا ہے، مغربی یورپ کی نیم جان جمہوریتوں کا سامنا نہیں ہوگا جن کی شاخ حیات شاداب بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مرجھاگئی۔ عربوں کے ملک میں اس نئی شہنشاہیت کا مقابلہ ہوگا۔ اسلام کے نظام جمہوریت سے جو اخلاق و سیاست کا ایک انوکھا مجموعہ ہے اور مادیت و روحانیت کے اضداد کی ایک عجیب و غریب وحدت ہے۔

یہ تو یقینی ہے کہ عربوں کو خواہ انھیں یہ چیز کتنی ہی ناگوار ہو۔ یورپ کے طیاروں اور دبابوں کے سامنے چاروناچار سر اطاعت خم ہی کردینا ہوگا۔ لیکن مجھے کامل یقین ہے کہ اس فوجی اطاعت کے بعد بھی وہ قرآن کو لے کر اپنی لڑائی جاری رکھیں گے۔ کیونکہ بلاشبہ قرآن مارکس کے سرمایہ اور ہٹلر کے صحیفہ "میری جدوجہد" دونوں کا جواب ہے اگر ایک طرف ہٹلر کے اصول عمل (یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے لئے دانت) کا داعی اور مبلغ ہے تو دوسری طرف مارکس کے معاشی اور عمرانی نظریات کا بھی توڑ رکھتا ہے

غرضکہ ادھر ہٹلر یورپ کو مغلوب کرنے کے لئے اٹھا ہے اور ادھر عربوں کا ملک نہضت و ارتقاء کے ایک نئے دور میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس دور کا آغاز اس وقت سے ہوا جب برطانیہ نے ابن سعود کی خودمختاری کو تسلیم کرلیا۔ کئی ایک حیثیتوں سے ابن سعود عربوں کا ہٹلر ہے۔ اس نے بھی ہٹلر کی طرح آہستہ آہستہ رک رک کر احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانا شروع کیا۔ ایک ایک دشمن سے الگ الگ معاملہ نپٹایا اور اپنی تمام چالوں میں بالآخر کامیاب رہا۔

ابن سعود کی برق آسا فتوحات عربوں کی حالیہ تاریخ کو اسی طرح روشن کئے ہوئے ہیں جس طرح وہ عربوں کے مستقبل کی ضمانت دے رہی ہیں ۱۹۱۳ء میں اس نے ترکوں کو نجد سے نکال باہر کیا ۱۹۲۱ء میں اس نے شمّار فتح کیا ۱۹۲۵ء میں حجاز کا الحاق کیا ۱۹۲۶ء میں وہ عسیر پر قابض ہو گیا۔ جزیرہ نمائے عرب میں اگر اب بھی بعض نیم آزاد ریاستیں باقی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن سعود اپنی فتوحات کو مستحکم اور ان سے حاصل ہونے والے منافع کو دیرپا بنانا چاہتا ہے اور اپنی سلطنت کو روز روز کی لڑائیوں سے کمزور کرنا نہیں چاہتا ہے۔ ابن سعود کی فوجی مہمات کی روح رواں اس کا مکمل معاشی اور عمرانی نظام عمل ہے۔ یہاں بھی ہٹلر کے نظام عمل سے اس کی مشابہت نمایاں ہے۔ خانہ بدوش قبائل کی توطن پذیری ملک کی مکمل کارکردگی میں اضافہ۔ قدرتی وسائل کا صحیح استعمال اور تعمیرات کا ایک خاکہ یہ ہیں اس نظام عمل کے بعض اہم اجزا۔ ابن سعود کی وہابیت میں بھی جس میں اب تھوڑی نرمی پیدا ہو گئی ہے۔ نازیوں کے فلسفہ کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔

لیکن ہٹلر اور ابن سعود میں ایک بہت بڑا فرق ہے یہ حسیات کا اختلاف ہے اپنی ظاہری درشتی تحکم اور ہیجانی کیفیت کے باوجود ابن سعود کا دل انسانی ہمدردی سے معمور ہے۔ وہ ایک صحیح اور توانا ذہن رکھتا ہے جس میں ہٹلر کے احساس کمتری کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ یہ چیز ممکن ہے کہ اس کی اعلی نسبی اور خاندانی شرف وافتخار کا نتیجہ ہو۔ یا اس کے ذہنی اور جسمانی قوی کی پختگی اور بالیدگی کا اثر ہو۔ بہر حال ابن سعود بڑے دل کا آدمی ہے اور ہٹلر کی طرح اسے تیرہ باطنی سے نجات حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اس کی انسانیت مختلف طریقوں سے اپنے لئے اظہار کا راستہ تلاش کرتی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ جدہ میں اسے ایک قیدی کو رہا کرتے ہوئے دیکھا جس نے قتل کا ارتکاب کیا تھا۔ اس نے صرف اتنی سی بات پر قیدی کو رہا کر دینے کا حکم دیا تھا کہ جو گواہی دی گئی تھی اس سے قیدی کے گذشتہ کردار پر کوئی بری روشنی نہیں پڑتی تھی میں نے اسے کئی بار اپنے چھوٹے بچے کو پیار کرتے ہوئے دیکھا اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اپنی ایک مرحوم بیوی سے سچی محبت کرتا تھا۔ آج تک اس کی یاد ابن سعود کے دل سے نہیں گئی ہے

اپنی موجودہ بیویوں سے بھی وہ حسن سلوک اور لطف و محبت سے پیش آتا ہے۔ ابن سعود اور ہٹلر کے درمیان اور بھی نمایاں اختلافات ہیں۔ ابن سعود کی شخصیت اپنے اہل وطن پر اس طرح چھائی ہوئی نہیں ہے جیسے ہٹلر کی شخصیت جرمنی پر چھا گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن سعود قدیم عربی نسل کی پیداوار ہے۔ اور موجودہ جرمنی ہٹلر کی پیداوار ہے۔ اگر ہٹلر کو فتح ہوئی تو وہ جرمنی کے مستقبل کا علمبردار ہوگا لیکن ابن سعود عربوں کی گذشتہ تاریخ کا نمائندہ ہے۔

ابن سعود کا زمانہ ختم ہو رہا ہے۔ اس کی عمر ستر سال کے لگ بھگ ہے وہ اس وقت قوت و اقتدار کا مالک ہوا جب اس کی زندگی بہار ختم ہو گئی تھی۔ ابن سعود کی تمام کامیابیاں اس کی دوسری جوانی کی قوتوں نے حاصل کی ہیں۔ ابن سعود اس وقت فرمانروائی کی مسند پر جلوہ آرا ہوا جب دوپہر کی آگ اور روشنی دھیمی پڑ چکی تھی جس میں عقل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں۔ جوانی کا جوش سر پر سے گذر چکا تھا ڈھلتے دن کی روشنی میں فہم و تدبر کی آنکھیں کھل گئیں اور اسے اپنا راستہ صاف نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ کا وار جتنا سخت ہوتا تھا اس کی چارہ گری اور مرہم سازی اتنی ہی موثر ہوتی تھی۔ اس کی فوجی مہمات تباہی اور موت کے زلزلے نہیں ہوتے تھے۔ جو کچھ نقصان ہوتا تھا۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے جیسے کسی سرجن کا چاقو زخم سے مواد خارج کرتا ہے۔ ایسے بہت سے زخم عربوں کے قومی جسم پر اب بھی موجود ہیں خصوصاً اس تیز و تند مخالفت کے زخم جو ابن سعود کے وہابی تبعین اور عام عربوں کی عیش پسند آبادی میں مسلسل عرصہ تک جاری رہی لیکن یہ زخم بھی اب مندمل ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ ابن سعود نے اپنے تبعین کے مذہبی غلو اور دینی امور میں وہابیوں کی سخت مزاجی کو بہت کچھ نرم کر دیا ہے

عرب کا مستقبل سعودی دور کی اصلاحات پر تعمیر ہوگا۔ ابن سعود کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عربی اقوام کے نیم خوابیدہ قومی شعور کے لئے ایک اخلاقی تحریک شروع کر دی۔ عربوں کے اس قومی احیاء کی بابت برٹرم ٹامس لکھتا ہے، "مسلمانوں کی تجدد پسندی کا ایک مذہبی پہلو بھی ہے تعلیم یافتہ حلقوں میں بیدینی اور مذہبی بیزاری کے ایک دور کے بعد اب مذہبی احیا کا وقت آیا ہے عربی النسل نوجوانوں میں اب ایسی تحریکیں پیدا ہو چلی ہیں۔ جو اس اعتقاد پر مبنی ہیں کہ کسی جماعت یا قوم کے جسد سیاسی میں

اس وقت تک صحت و توانائی پیدا نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ سیاست کی جڑیں مذہبیت کی زمین سے نہ پھوٹیں۔ اور عالمگیر صلح و امن کا خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ اقوام عالم میں باہمی اخوت کا احساس رواداری اور فراخدلی کے جذبات پیدا نہ کر دے"

میں بہت سے عرب ڈاکٹروں انجینیروں، وکیلوں اور معلموں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں جو اپنے روزمرہ کے کام چھوڑ کر نماز کے لئے پانچ وقت اٹھ پڑتے ہیں۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وقت آنے پر وہ اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو کر لڑنے اور جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے میں نے دیکھا کہ قرآن کا مطالعہ اب بھی ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے حالانکہ وہ ہمارے مغربی ادب سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کا مذہبی جوش اور مذہبی فرائض کی پابندی ان کے لئے کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس مذہبی ورثہ کے تحفظ سے وہ ایک ایسی قوت کی تخلیق میں مصروف ہیں جس کے لئے موجودہ زمانہ بری طرح سے حاجتمند ہے۔

شمال کے ان مہذب مسلمانوں کی انسانی عظمت اس بات کو گوارا نہیں کرتی ہے کہ وہ سعودی عرب کو صرف اس لئے حقیر جانیں کہ وہاں تار برقی یا اسی طرح کے دیگر لوازم تہذیب ناپید ہیں۔ مجھے ابھی تک اس تعلیم یافتہ اور روشن خیال عرب کی تلاش ہے خواہ وہ کتنا ہی تجدد پسند ہو جو پرانی روش کے مولوی یا درویش پر ہنسے یا ان کا مذاق اڑائے کہ وہ اپنی عبا خود بنتے ہیں اور بازار جا کر اپنا جوتا خود خریدتے ہیں۔

اس طرح مکہ اور مدینہ کو اور جو بھی ان شہروں پر حکمراں ہو اس کو مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کی روحانی سیادت حاصل رہتی ہے اور دوسری طرف شمال کی عرب قوموں کا مادی تفوق بھی برقرار رہتا ہے یہ چیز بجائے اس کے کہ نزاع و اختلاف کا سبب ہو عرب اقوام کے اتحاد کو اور مضبوط کر دیتی ہے۔ یورپ کی موجودہ جنگ اس اتحاد کی پہلی بار آزمائش کرے گی۔

لیکن عربوں کے مستقبل پر تاریکی کا ایک اودا بادل بھی نظر آتا ہے۔ ابن سعود بوڑھا ہو گیا ہے اور موت کے دروازہ سے بہت قریب ہے۔ عربوں کا دوسرا بڑا حکمراں امام یحییٰ ہے جس کی عمر ستر سال سے متجاوز ہے۔ ان دونوں نے عربوں کے مستقبل کی تعمیر کے لئے بہت کچھ

کام لئے ہیں اور اگر انھیں ایک زندگی اور دیدی جائے تو وہ اس تعمیر کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دینگے لیکن ان کی اولاد سے یہ امید نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ اس کام کو جاری رکھے گی۔

سعودی عرب اور یمن میں جانشینی کی بابت دو متوازی فتنے سر اٹھا رہے ہیں۔ ابن سعود اور امام یحییٰ دونوں کثیر العیال ہیں۔ اس لئے ان کی جانشینی کا مسئلہ آسانی سے طے نہیں ہو سکے گا۔ ابن سعود نے پہلے ہی اس مشکل کا اندازہ کر لیا ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے بیٹوں میں سے دو بڑے بیٹوں کا انتخاب کر کے ان میں سے ایک کو حجاز کا اور دوسرے کو نجد کا وائسرائے مقرر کر دیا ہے ان دونوں میں دوستی اور محبت کا رشتہ قائم کر دینے میں بھی اسے کامیابی ہوئی مجھے شاہزادہ سعود اور امیر فیصل دونوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ ثانی الذکر سے مجھے معلوم ہوا کہ اس کو اپنے بھائی کی جانشینی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ شاہزادہ سعود انتظامی صلاحیت رکھنے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کا مدبر اور فاضل عصر ہے۔ شجاعت اور بہادری کے ساتھ اس کی شخصیت بھی بہت موثر ہے اور ان تمام خصوصیات کی بنا پر وہ اپنے عظیم المرتبت باپ کا حقیقی جانشین ہو سکتا ہے۔

لیکن ان بیدار مغز بھائیوں کے پیچھے ابن سعود کا ایک اور بیٹا امیر محمد ہے جس کے نمایاں اوصاف اس کی ضد، قدامت پرستی اور اس کا حسد ہے۔ راسخ العقیدہ وہابیوں پر اس کا بہت زیادہ اثر ہے۔ عرب میں بعض رجعت پسند عناصر بھی امیر محمد کے مداح اور حامی ہیں۔ موٹر پر بیٹھنے اور ٹیلیفون پر بات کرنے سے اجتناب اس کی بڑی اعلیٰ صفت خیال کی جاتی ہے وہ عرب کے قرون وسطیٰ کا نمائندہ ہے جس کے علائم و آثار سے عرب کو پاک کرنے میں ابن سعود زندگی بھر مصروف رہا۔

امیر محمد کی مخالفت اطالیہ کے مفید مطلب ہے۔ اطالوی ایجنٹ ہر لمحہ اس کے جلو میں رہتے ہیں اور بھائیوں کے خلاف آنے والے جھگڑے میں اس کی اعانت و نصرت کا دم بھرتے ہیں۔ اگر جانشینی کی جنگ ایک طرف شاہزادہ سعود اور امیر فیصل اور دوسری طرف امیر محمد کی متقابل قوتوں پر چھوڑ دی جائے تو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ شاہزادہ سعود کی مسلح موٹریں امیر محمد کے اونٹوں کو شکست دیدیں گی لیکن اگر اطالیہ امیر محمد کی حمایت پر کمر باندھ لے اور عرب میں اس کے عقب سے گھس آئے تو امیر محمد کی فتح اور عرب

کی خود مختاری کا خاتمہ یقینی ہے۔

امام یحییٰ کے تیرہ لڑکے ہیں۔ یہ لڑکے باپ سے بہت مختلف ہیں بعض متقی پرہیزگار اور پابند شریعت ہیں بعض چالاک اور بعض جاہل ہیں۔ دو لڑکے سیف الاسلام حسین اور سیف الاسلام قاسم تخت نشینی کے دعویدار ہیں حسین نہایت متقی اور پارسا ہے اس کے ساتھ ہی وہ ایک چالاک سیاستداں بھی ہے اور لندن پیرس، ٹوکیو اور روم میں اپنے باپ کی نمائندگی کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دے چکا ہے۔ بھائیوں میں صرف ایک اس کا مدمقابل ہے یہ شاہزادہ قاسم ہے جو تلوار کا دھنی اور پرانی طرز کا فوجی لیڈر ہے اگر باپ کے مرنے کے بعد ان دونوں میں تخت نشینی پر جھگڑا ہوا تو اطالیہ یقیناً مداخلت کرے گا اور ابن سعود موقع سے فائدہ اٹھا کر یمن کو اپنی سلطنت میں ضم کرلے گا۔

یہ فرض کرتے ہوئے کہ شاہزادہ سعود اور حسین بالآخر فتحیاب ہو گئے اور عربوں کا ملک ایک بہتر مستقبل کی طرف قدم اٹھانے لگا تو سوال یہ ہے کہ عرب شہنشاہیت کے مقاصد کیا ہونگے۔ اس سوال کا جواب ہر عرب کے ذہن میں موجود ہے اور وہ ایک لفظ میں ظاہر کیا جاسکتا ہے یعنی اتحاد عرب۔ معنوی حیثیت سے یہ جزیرہ نمائے عرب میں ایک نسل ایک زبان اور مذہب رکھنے والی قوموں کا اتحاد ہوگا۔ جغرافیائی حیثیت سے یہ موجودہ ترکی کی جنوبی سرحد سے لے کر مشرق میں خلیج فارس تک پھیلی ہوئی ایک سلطنت ہوگی۔

عربی اتحاد کی تحریک ایک خالی خولی خواب نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بات ابن سعود کی غیر معمولی فراست پر شاہد ہے کہ وہ اس اتحاد کے حصول کے لئے ابھی وقت اور موقع کا منتظر ہے مغربی سلطنتوں اور ان کی مشرقی مقبوضات کا انتشار عربی اتحاد کو بہت جلد ممکن العمل بنا سکتا ہے یا ان سلطنتوں کی مسلسل باہمی پیکار اور ہٹلر کی فتوحات کی غیر مستحکم حالت بھی اس تحریک کو جلد بار آور کرسکتی ہے۔ تاریخی واقعات کی طبعی رفتار ہی بالآخر اس تحریک کی کامیابی کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ ابن سعود نے ایک بار مجھ سے کہا کہ جب ایک مرتبہ عربی النسل قوموں کا وفاق قائم ہو جائے گا تو عرب شہنشاہیت کی توسیعی جدوجہد کی کوئی حد وانتہا نہ رہیگی یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اس حقیقت پسند اور پختہ کار حکمران کو خواب وخیال کی دنیا میں پرواز کرتے دیکھا۔ اس کا خیال ہے کہ اسپین پھر ایک مرتبہ عربوں کی نوآبادی ہوگی۔

اس زمانہ اور ان حالات میں عرب شہنشاہیت کا تذکرہ کرنا اور اس کی کامیابی کے امکان پر بحث کرنا خیال آرائی کے محل میں بیٹھکر ہوائی قلعے تیار کرنا ہوگا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ حالات کی رفتار اس شہنشاہیت کو بہت جلد ایک زندہ حقیقت بنا سکتی ہے۔ فرانس کی شکست کے بعد جنرل میکل ہارس کا لڑائی جاری رکھنے سے انکار کر دینا ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس نے شام اور لبنان کو ایک لاوارث ملک بنا دیا ہے۔ اٹلی، ترکی اور برطانیہ تین طرف سے موقعہ کے منتظر ہیں۔ ادھر جنرل موصوف نے شام کی آبادی سے استصواب نہیں کیا۔ اس ہنگامہ میں شامی عرب اپنی تیاریاں الگ کر رہے ہیں وہ جو کچھ کرینگے اس کیلئے انھیں عراق، ترکی اور پوری عربی دنیا کی تائید حاصل ہوگی حالات جیسے کچھ ہیں انھیں دیکھتے ہوئے اور فرانس کی شکستہ حالی کا لحاظ کرتے ہوئے شام کی آزادی ناممکنات میں نہیں ہے یہ آزادی اتحاد عرب کا ہراول ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی دنیا شامی عربوں سے متوقع ہے کہ وہ اس راہ میں پہلا قدم اٹھائیں گے۔ کیونکہ شامی عرب سب سے زیادہ متمدن سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر ہیں۔ شام کی حقیقی آزادی سے عراق پر برطانیہ کی گرفت ڈھیلی ہو جائیگی اور اعراب فلسطین خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ طوعاً و کرہاً برطانیہ کو ان کا حق دینا ہی ہوگا خصوصاً جبکہ وہ دوسری طرف مصروف جنگ ہوگا یہ ہیں امکانات جو موجودہ جنگ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ابن سعود کا خیال ہے کہ ابھی اتحاد عرب کیلئے پچاس سال اور درکار ہیں۔ ابن سعود نے اپنے ایک دوست کو ایک بار خط میں لکھا۔ "خارجی دباؤ سے آزادی حاصل کر لینا ہی حصول مدعا کے لئے کافی نہ ہوگا۔ ہمیں پہلے خود اپنے اوپر فتح حاصل کرنی ہوگی"۔

یہ فتح خاموشی کے ساتھ جاری ہے۔ برٹرم ٹامس لکھتا ہے "اس طرح تقدیر کا پہیہ پورا چکر کاٹ چکا ہے ایک ہزار برس قبل عرب لوگ یورپ کو تہذیب کا درس دے رہے تھے"۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ کے عرب یورپ سے تہذیب کا درس حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ٹامس برٹرم نے جس پہیہ کا اشارہ کیا ہے وہ ایک اور چکر کاٹ سکتا ہے۔ عربوں کی روح امکانات سے لبریز ہے۔ عربوں کی آخری فتح میں ان کی دو صفات فیصلہ کن ہوں گی جو ہماری نسائی تہذیب میں ناپید ہیں یعنی ان کی سچی شجاعت اور ان کی حقیقی فراخدلی۔ ممکن ہے یہ صفات عربی اقوام کو ایک بار پھر زمین کا وارث بنا دیں اور شجاعت و فراخدلی جو فی زمانہ مردہ ہو چکی ہے۔ انسانوں کے سینوں میں زندہ اور مجسم ہو جائے۔

مترجمہ محمد مظہر الدین صاحب صدیقی۔ بی۔ اے

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری

"اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی نے ایک طویل مقالہ اردو ادب میں تنقید نگاری اور مولانا عبدالحق کے عنوان سے ترتیب دیا تھا یہ مضمون اسی طویل مقالے کا دوسرا جزو ہے" (مدیر)

مولانا عبدالحق جس مستعدی، انہماک اور خلوص سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اس کی مثال ہندوستان میں مشکل سے ملے گی۔ یہ واقعہ ہے کہ مولانا پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے۔ اردو کی خدمت کا جذبہ ان کے دل و دماغ میں اس قدر رچ گیا ہے کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اسی کی خدمت کے لئے زندہ ہیں اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ورنہ اس پیری کے زمانے میں جبکہ لوگ صرف عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ سراپا جوش اور قوت عمل کا مجسمہ ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ جوں جوں ان کی عمر بڑھتی جاتی ہے اسی طرح ان کو اپنے اس معشوق مجازی (اردو) سے بھی محبت بڑھتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ ان کی علمی و عملی سرگرمیوں میں بھی روز افزوں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مولانا اگر ایک طرف زبان و ادب میں اصلاح اور اس کے ذخیرے میں اضافہ کر رہے اور اپنی تنقیدی و تحقیقی تحریروں سے اس کی خدمت کر رہے ہیں تو دوسری طرف مخالفین اردو سے بھی نبرد آزما ہیں جو اردو کی جگہ ہندی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے ہیں۔ جہاں اردو کی بقا و تحفظ کے لئے مخالفین کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں وہاں اردو کے تمام خدمت گاروں کی فوج منظم کرنے کے لئے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے چپہ چپہ کی خاک چھان رہے ہیں اور اپنی مسلسل اور انتھک کوششوں سے تمام ملک کو اردو زبان کے مسئلہ میں متحد اور ہم آواز کرنے میں مشغول ہیں۔ چنانچہ ان کی تگ و دو اور سرگرمی کو دیکھ کر سروجنی نائیڈو نے کہا تھا:-

"مولوی عبدالحق کی کوشش ہے کہ تمام دنیا کی زبان اردو ہو جائے"

بظاہر یہ مبالغہ ہے لیکن ہندوستان کی حد تک اس میں حقیقت کی جھلک ضرور موجود ہے اور شاید اسی لئے یہ مشہور قول ہے کہ "اردو اور عبدالحق مترادف الفاظ ہیں۔"

جہاں اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے مولانا کے یہ علمی و عملی کارنامے ہماری تاریخ ادب میں غیرفانی قدر و منزلت کے مستحق ہیں وہاں مولانا کی وہ ادبی خدمات بھی جو انھوں نے اس کے معیار ادب کو بلند کرنے اور اسے زمانے کی دستبرد سے بچانے کے لئے انجام دیں ہمیشہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔

مولانا عبدالحق نے اقلیم تنقید نگاری میں اس لئے قدم نہیں رکھا تھا کہ وہ ایک دن اس سلطنت کے بادشاہ ہوں گے بلکہ ان کی دوربیں نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس وقت اردو زبان کو سب سے زیادہ تنقید کی ضرورت ہے۔ حالی و شبلی نے جس کی داغ بیل ڈالی تھی اسے تکمیل تک پہونچانے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس بارگراں اور مشکل ترین فرض کو اپنے ذمہ لیا۔ مولانا کی حساس طبیعت نے جب محسوس کیا کہ ہماری زبان و ادب کے موجودہ دور ارتقا میں گرد و پیش کے رجحانات اور زبان کے تخلیقی امکانات سے متاثر ہو کر اہل قلم اظہار خیال کے لئے نئی نئی راہیں تلاش کر رہے ہیں ۔اور ادب اردو کو طرح طرح کے افکار و خیالات سے مالا مال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو انھوں نے ضروری سمجھا کہ ایسی حالت میں رطب و یابس حسن و قبح، اصل و نقل میں امتیاز کرنے کے لئے سنجیدہ اور ذمہ دارانہ تنقید کی اشد ضرورت ہے۔ ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارے ادیب اس دشوار گذار منزل میں صحیح راہ چھوڑ کر غلط راہ نہ اختیار کریں اور سطحی چیزوں کو قابل قدر چیزوں پر ترجیح نہ دینے لگیں۔ مولانا نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس وقت جبکہ زبان و ادب کی ترقی کے لئے تمام قوموں اور ملتوں اور تمام صوبوں کی متحدہ کوشش اور ان کے اتحاد و یگانگت کی ضرورت ہے کہیں بے جا اختلافات نہ پیدا ہو جائیں اور ہمارے ادب کی ترقی کا یہ بہترین موقع ان کے بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ انھوں نے سمجھا اور بالکل صحیح سمجھا کہ اس وقت اعلیٰ تنقید نگاری ہی اردو ادب کی بہترین خدمت ہو سکتی ہے چنانچہ مولانا نے اپنی جولانیٔ طبع کو اسی میدان کے لئے مخصوص کر لیا۔ ہمارے اس خیال کی تائید بالواسطہ طور پر مولانا عبدالحق خود اپنے انڈین اورنٹیل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اس طرح کرتے ہیں۔

تنقید کی ابتدا مولوی حالی نے کی اور اب اس فن پر متعدد لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں:......
حال کے انقلابات اور تغیرات سے ہمارا ادب بھی متاثر ہوا ہے اور اس میں طرح طرح کی
جدتیں پیدا ہو رہی ہیں ان کے جانچنے کے لئے پرانے اصول کام نہیں آسکتے۔ ان نئی چیزوں
کے پرکھنے کے لئے ہمیں نئے اصولوں سے کام لینا پڑے گا۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۱۴)

حق تو یہ ہے کہ اس دور تغیر و تبدل اور ادب اردو کی ترقی کے اس نازک وقت میں مولانا کی تنقیدوں نے ان تمام خطرات کے مقابلہ میں سپر کا کام دیا اور ہماری زبان کو دست برد سے بچا کر ترقی کی صحیح راہ پر گامزن کر دیا۔ علاوہ ازیں مولانا کی تنقیدوں نے جہاں ہمارے ادبی معیار کو بلند کرنے میں مدد دی وہاں وہ مولانا جیسی قابل شخصیت اور پختہ کار صاحب قلم کے ہاتھ میں آکر تنقید ہمارے ادب کی جان اور اس کی ایک اعلیٰ صنف ہو گئی اور مولانا عبدالحق اس اقلیم کے بلا شرکت غیرے شہنشاہ ہو گئے۔ ایسے نازک وقت میں یہ رہبری ضرور تاریخی حیثیت اختیار کرلے گی۔

مولانا کی ادبی اور تنقیدی زندگی کی ابتدا | مولانا عبدالحق علی گڈھ کالج کے اُن ہونہار فرزندوں میں سے ہیں جن پر یہ ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ اگرچہ بی۔ اے میں آپ کے مضامین میں فلسفہ اور تاریخ تھے لیکن اردو زبان و ادب سے آپ کو ابتداہی سے ذوق تھا چنانچہ آپ چھٹیوں میں گھر جانے کے بجائے سرسید کے ساتھ علمی اور ادبی مشاغل میں معروف رہتے تھے جب مولانا حالیؔ علی گڈھ تشریف لائے تو ان سے بھی پوری طرح استفادہ حاصل کیا اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کے دل میں اردو زبان و ادب کی خدمت کا شوق سرسیدؒ نے پیدا کیا اور تحقیق و تجسس اور تنقید نگاری کا وہ جذبہ جس نے مولانا کو اس عروج و کمال تک پہونچایا حالیؔ کی مخلص کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس بیان کی تائید مولانا حالیؔ کے خط سے ہوتی ہے۔ جس میں انھوں نے مولانا عبدالحق کے اس ارادے پر مسرت ظاہر کی تھی جب انھوں نے ایک خط میں اس امر کا ذکر کیا تھا کہ وہ جدید اردو لٹریچر کے ناموران پر تنقید لکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا حالی لکھتے ہیں

"اس پر ضرور لکھئے کہ اردو لٹریچر میں درحقیقت اب تک کوئی نمونہ یورپین کریٹیسزم کا موجود نہیں"
(مکاتیب حالی صفحہ ۴۴)

اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں حالی اور سرسید کی خدمات اردو کے سلسلے میں اس عظیم الشان کارنامے کو بھی شامل کرنا پڑے گا کہ انھوں نے مولانا عبدالحق جیسا اردو کا محسن ادیب اور نقاد پیدا کیا۔

ہمارا یہ خیال محض قیاس آرائی پر نہیں بلکہ واقعات پر مبنی ہے۔ چنانچہ دوران تعلیم میں مولانا کے جذبۂ خدمت میں ڈوبے ہوئے مضامین اردو زبان و ادب کی ترقی کے متعلق "تہذیب الاخلاق" اور "علیگڈھ میگزین" میں شائع ہوتے رہے۔ پھر ۱۸۹۵ء میں جبکہ آپ ابھی طالب علم ہی تھے صرف پن چکی کے کتبخانہ کی تلاش میں علی گڈھ سے اورنگ آباد تک کا سفر کیا۔ علاوہ ازیں مولانا کا مذاق۔ ان کے خیالات اور اسلوب بیان پر مولانا حالی کا اثر اور حالی سے ان کی غیر معمولی عقیدت و نیازمندی جو ان کے تمام مضامین میں نمایاں اور ممتاز ہے۔ ہمارے خیال کے بین ثبوت واضح شواہد ہیں۔

۱۸۹۴ء میں جب مولانا نے بی۔ اے کی سند حاصل کی تو اورنگ آباد میں انسپکٹر آف اسکولز مقرر ہوئے۔ ایک تو آپ کا ذوق علمی اور پھر حیدرآباد کی پرسکون اور علمی فضا۔ ان دونوں نے آپ کو اپنے ان ارادوں اور منصوبوں کو جن کا اظہار طالب علمی کے زمانہ میں کرتے تھے اور جن کا عہد و پیمان حالی اور سرسید کے اثر سے کیا تھا اب عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا۔ مولانا نے ملازمت کے دو سال بعد ہی ۱۸۹۶ء میں رسالہ "افسر" جاری کیا۔ اسی سے آپ کی تنقید نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس رسالے کے جہاں اور بہت سے ادبی مقاصد تھے اور ان پر ملک کے بلند پایہ ادیب خامہ فرسائی کرتے تھے۔ وہاں اس کا ایک اہم مقصد تنقید نگاری بھی تھا جسے خود مولانا لکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ چاند مرحوم لکھتے ہیں:۔

"اردو چونکہ اس وقت قصہ کہانیوں کی سرحد سے نکل کر علمی میدان میں قدم رکھ رہی تھی اس لئے اس کی دیکھ بھال اور رہنمائی کے لئے تنقید بھی رسالہ (افسر) کا مقصد قرار دیا گیا اور غالباً یہ پہلا اردو رسالہ ہے جس نے کتابوں پر تنقید کرنے کو اپنا فرض قرار دیا۔"

(رسالہ "نورس" عبدالحق نمبر)

افسر پانچ سال تک اردو زبان و ادب کی خدمت اور تنقیدی کام انجام دیتا رہا اور اس کے بعد بند ہو گیا "مولوی صاحب صرف شوق علمی اور مطالعہ کتب کے لئے زندہ ہیں اور بس" اس لئے آپ نے

آفس کے بند ہونے بعد بھی علمی ادرادبی مشاغل کو جاری رکھا۔ اس زمانے میں اردو زبان کے بہت سے نایاب نسخے جمع کئے۔ اردو ادب کے قدیم ترین ماخذوں کی تلاش و جستجو میں مصروف ہو گئے۔ انھیں نہایت ہی محنت اور جانکاہی سے جمع کرتے اسی کے ساتھ مقدمے بھی لکھتے تھے۔ جن میں سے بعض نہایت ہی مبسوط اور طویل ہیں۔ مقدمے درحقیقت کتاب اور مصنف پر بہترین تنقید ہوتے تھے۔ مولانا کے مقدموں کی اہمیت اِسی وجہ سے زیادہ ہے ورنہ اردو زبان میں مقدمہ نگاری قدیم اور عام ہے۔ کبھی کبھی کتاب کے آخر میں قدیم الفاظ کی فرہنگ بھی تیار کرکے شامل کرتے تھے۔ غرضکہ آپ کے یہ ادبی کارنامے جو ایک طرف بہت ہی تحقیقی اور علمی ہوتے تھے تو دوسری طرف آپ کی تنقیدیں انھیں چار چاند لگا دیتی تھیں جس سے نہ صرف ان کی قدر و منزلت بڑھ جاتی تھی بلکہ ادب کا معیار بھی ان تنقیدوں کی بدولت بلند ہو رہا تھا۔

اس وقت جبکہ ہمارے ادیب بلا کسی منزل مقصود کے بھٹک رہے تھے اور بلا کسی مقصد و منہاج کے اپنی تحقیقی قوتوں کو بیکار اور کھوکھلی شاعری۔ بے ربط اور بے مقصد نثر نگاری میں ضائع کر رہے تھے۔ ان کی توجہ مولانا کے اچھوتے اور بلند پایہ کام کی طرف ہوئی اور رہنمایان قوم نے ۱۹۱۱ء میں آپ کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں میں اپنی زبان اور ادب کی صحیح ترقی کا راز مضمر سمجھ کر انجمن ترقی اردو کو جو کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک معمولی شعبہ تھی مولانا کے سپرد کر دیا۔ اس کے متعلق شیخ چاند مرحوم لکھتے ہیں:۔ مولوی صاحب کا۔

> "فراغ تعلیم سے لے کر ۱۹۱۲ء تک جو زمانہ گذرا ہے اس میں آپ نے نہایت بلند پایہ مضامین لکھے۔ اعلیٰ درجہ کی کتابوں پر نہایت ناقدانہ اور مبصرانہ مضامین لکھے۔ اردو ادب میں مغربی طرز کا تنقیدی عنصر داخل کرنے کی کوشش کی اور چند ہی دنوں میں اپنی مشہور تنقیدی قابلیت، ادبی ذوق اور علمی شغف سے قدیم و جدید طرز کے عالموں، ادیبوں اور انشا پردازوں کو قائل کر دیا اور بہت جلد شہرت اور ناموری حاصل کر لی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ ۱۹۱۱ء میں انجمن ترقی اردو کے اعزازی معتمد منتخب ہو گئے۔"

(رسالہ "نورس" عبدالحق نمبر)

حق تو یہ ہے کہ مولانا عبدالحق کی ادبی زندگی کا مطالعہ. زبان و ادب کی ترقی اور نقادی کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت کا ایک بین ثبوت اور روشن دلیل ہے. نقاد کی حیثیت سے آپ نے اپنی شخصیت اور مرتبہ کو جس طرح دوسروں کی نظروں میں بلند کیا. زبان میں جس طرح ترقی کی اور اس کے ادب میں جو اضافہ کیا اور اس کے معیار کو جتنا اعلیٰ کیا۔ یہ سب ایسی کامیابیاں ہیں جو ایک ناقد کو ادیب سے ممتاز کرتی ہیں۔ انھیں صلاحیتوں کی بنا پر زبان و ادب کو ترقی دینے کا عظیم الشان بیڑا آپ نے اٹھایا اگر ایک طرف انجمن ترقی اردو کے ذریعہ اردو زبان کو منظم طریقے پر ترقی دینے کی کوشش کی تو دوسری طرف دارالترجمہ حیدرآباد کے ناظم کی حیثیت سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ نقاد زبان کی استعداد، ادب کی وسعت اور جدید خیالات پھیلانے کی خدمت بھی کس طرح انجام دے سکتا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اردو زبان کی ترقی میں مولانا عبدالحق اور انجمن ترقی اردو نے جو کوششیں کیں انھیں جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے تمام کام مولوی صاحب کی سرگرمی کا نتیجہ ہیں اور اس کی موجودہ ترقی ان کی مسلسل اور انتھک کوششوں کی رہین منت ہے۔

اردو زبان کے تنقیدی کارناموں میں انجمن ترقی اردو کے ترجمان رسالہ "اردو" کو بھی مولانا کی طرح غیر فانی شہرت حاصل ہے. مولوی صاحب نے جب دیکھا کہ صرف نئی کتابیں اور ان کے ساتھ مقدمے شائع کر دینے سے تنقید نگاری کا پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ بلکہ ہماری زبان میں جس قدر بھی کتابیں شائع ہوں ان کو بھی ادب کا معیار بلند کرنے کے لئے تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے۔ اور زبان کی اصلاح اور معیار مقرر کرنے کے لئے ایک ایسے ادبی رسالہ کی ضرورت ہے جو صرف اردو ادب کے متعلق ہو اور جس کا مقصد "تنقید یعنی زبان و ادب کی خوبیوں کا معیار قائم کرنا اور اس معیار پر پرانے اور نئے لکھنے والوں کی کتابوں کو پرکھنا" ہو چنانچہ "اردو" کے پہلے پرچے جنوری ۱۹۲۱ء میں آغاز کے عنوان کے تحت مولانا لکھتے ہیں :-

"تنقید جو ادب کی جان اور ذوق سلیم کی روح رواں ہے ابھی ہمارے یہاں ابتدائی مرحلے میں ہے اسے صحیح رنگ میں دکھانا بہت بڑا فرض ہے اس کے بغیر ادب کی

خدمت ادا ہونی ممکن نہیں۔"

مولانا نے "اردو" کے ذریعہ اب اپنے میدان تنقید کو بہت وسیع کر لیا ہے اور اقلیم اردو پر چھا گئے ہیں۔ اس رسالہ میں مولوی صاحب نے اردو زبان کی جدید مطبوعات پر تبصرے لکھنا شروع کئے جس سے اردو کتابوں کا معیار بہت بلند ہو گیا۔ اور صنف تنقید کو بھی صحیح رنگ میں دکھا کر کمال عروج تک پہونچا دیا۔ چنانچہ شیخ چاند مرحوم رسالہ اردو کی تنقید نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:-

"افسر" کے مقاصد میں تنقید بھی ایک مقصد تھا۔ مولوی صاحب کا وہ قدیم خیال اور پختہ ہو گیا اور "اردو" میں اس کے لئے ایک حصہ وقف کر دیا ہے۔ اس سے قبل اردو زبان میں تنقید کا عنصر اس قدر کمزور تھا کہ وہ کسی شمار اور کسی لحاظ کے لائق نہیں۔ "اردو" نے اس خصوص میں بڑی قابل قدر خدمتیں انجام دی ہیں آئندہ تنقیدی ترقی اس کی ممنون رہے گی۔" (نورس عبدالحق نمبر صفحہ ۱۴۳)

یہاں اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ رسالہ اردو کی تنقیدیں زیادہ تر مولانا عبدالحق صاحب کے قلم کا نتیجہ ہوتی تھیں اس لئے مذکورہ بالا بیان میں "اردو" کی تنقید نگاری کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ فی الحقیقت مولوی صاحب کی تنقیدوں کے متعلق ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب فرماتے ہیں:-

"رسالہ "اردو" کے تنقیدی مضامین اس قدر متین ہیں کہ اردو زبان کیا دنیا کی کسی زبان میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان مضامین کے علاوہ رسالے نے تنقید و تبصرہ کا ایک مستقل باب کھولا ہے جس میں نئی کتابوں اور رسالوں پر اور کبھی کبھی علمی انجمنوں کے جلسوں اور علمی اداروں پر فاضلانہ اور محققانہ تنقید کی جاتی ہے۔ نو سال کے عرصے میں اکثر تبصرے ایسے نکلے ہیں جو بجائے خود ادبی نکات اور معلومات کے مخزن ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر عبدالحق صاحب اور کمتر دوسرے نقادوں کے لکھے ہوئے ہیں مولوی صاحب کا کمال یہ ہے کہ تنقید کے اعلیٰ اور پاکیزہ معیار کو بھی قائم رکھتے ہیں

---

[1] یہ مضمون ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔

اور بت۔یوں اور نو مشقوں کی ہمت افزائی میں بھی دریغ نہیں کرتے۔موصوف کی تبصرہ نگاری پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ان کی تنقیدوں نے ملک میں یہ مقبولیت اور وقعت حاصل کی ہے کہ لوگ انھیں ملوا افسانوں کی طرح شوق سے پڑھتے ہیں اور شرعی عدالت کے فیصلہ کی طرح ادب سے تسلیم کرتے ہیں۔"

(نورس، عبدالحق نمبر صفحہ ۴۵)

اگرچہ اب اردو زبان و ادب کی ترقی کے سلسلے میں مولانا کے عملی مشاغل میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی خدمات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے لیکن اب بھی مولانا تنقید کو ادب کی جان اور ذوق سلیم کی روح رواں سمجھتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ اگر تنقید کو صحیح رنگ میں نہ دکھایا گیا تو بے راہروی سے بچنا مشکل ہوگا۔اس لئے اگر ایک طرف وہ اردو کی بقا و قیام کے لئے ہندی کے دعویداروں سے دست و گریبان ہیں۔اور اس کو ملک کے طول و عرض میں پھیلانے کے لئے شب و روز مسافرت میں رہتے ہیں تو دوسری طرف اس کے باوجود اب بھی آپ کی زندگی کا اہم ترین مقصد تنقید نگاری ہے جس کے ذریعہ آپ اردو زبان کی استعداد اور خیالات میں وسعت پیدا کر رہے ہیں اور اس کے معیار کو روز بروز بلند تر کر رہے ہیں۔اس لئے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تنقید نگاری آپ کی زندگی کا جزو اور ایمان ہو گئی ہے جس سے آپ کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔

مولانا عبدالحق کے تنقیدی کارنامے | قبل اس کے کہ مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری کی خوبیوں سے بحث کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کارناموں کا ایک مختصر سا جائزہ لے لیا جائے تاکہ ان کی تنقیدات کی نوعیت اور ان کی قسموں سے واقفیت ہو جائے۔

مولانا عبدالحق کے ادبی مشاغل کا ہر لمحہ تحقیق و تجسس اور تنقید نگاری میں گذرتا ہے۔اسی لئے آپ کی تقریباً تمام ادبی خدمات تاریخ و تنقید اور نقد و نظر پر مشتمل ہیں۔یہ آپ کا بہت بڑا کمال ہے کہ ابتدا میں جن فرائض کو اپنے ذمے لیا تھا ان کے علاوہ کسی دوسری چیز کے لئے قلم نہیں اٹھایا۔اس سے جہاں آپ کو اپنے مقرر کردہ مقصد سے سچا لگاؤ اور جذبۂ خدمت میں خلوص ثابت ہوتا ہے

وہاں اولوالعزمی، ولولہ اور پختگی ارادہ کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی چالیس سالہ ادبی وعلمی زندگی میں منکر، ادیب اور صاحب قلم ہوتے ہوئے بھی ان تمام ارادوں، حوصلوں اور محرکات کو جو انسانی طبیعت کو شاعر، ڈرامہ نویس، افسانہ نگار اور مصنف بننے کے لئے اکساتے ہیں دل و دماغ میں بالکل جگہ نہ دی یہ ایسا ہی مشکل کام ہے جیسے نفس کشی جو ہر شخص کے لئے ممکن نہیں نفس کشی صرف وہی شخصیتیں کرسکتی ہیں جو کسی سچے نصب العین کے لئے اپنی زندگی کو تج دیں اور ان کا رہنا، سہنا اور مرنا، جینا سب اسی بلند مقصد کے لئے ہو چنانچہ مولوی صاحب کے ادبی کارناموں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو علمی کارناموں اور تحریروں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ملتا ہے جس کا ہر صفحہ اور ہر ورق اپنے مقرر کردہ جادۂ راہ سے الگ نہیں۔ اس کا ہر لفظ و ہر جملہ تحقیق و تفتیش اور صحیح تنقید کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

مولانا کے ادبی کارناموں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وہ تصانیف، مضامین اور مقالے خطبات تنقیدات اور مقدموں پر مشتمل نظر آئیں گے۔ جن میں سے ہر ایک کا مفصل ذکر حسب ذیل ہے۔

(۱) تصانیف: "صرف و نحو اردو" اور "قواعد اردو"، مولانا عبدالحق کی دو اہم تصانیف ہیں جن کا بظاہر مولانا کی تنقید نگاری سے کوئی تعلق نہیں لیکن اگر ان کی نوعیت پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان تصانیف کے پیش نظر بھی اصول تنقید تھے اور مولانا نے وسیع النظر ادیب اور بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے ان تصانیف میں کمال پیدا کردیا ہے۔ صرف و نحو اور قواعد زبان کے مسائل پر یہ کتابیں مسلم الثبوت ہیں۔ مولانا نے ایک نقاد کی حیثیت سے ضروری سمجھا کہ جس زبان کی اصلاح کی جائے اور جس پر تنقید کی جائے اس کے متعلق مسلمہ اصول بھی ہونے چاہئیں اسی لئے آپ نے بڑی محنت اور جانکاہی سے ان کتابوں کی تصنیف کے فرائض انجام دیئے۔

(۲) ۲۔ مضامین: مولانا کی تصانیف کو چھوڑ کر ان کے تمام مضامین خواہ وہ سیرت سے متعلق ہوں یا تاریخ سے وہ کسی حد تک تنقیدی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لئے مولانا کے علمی اور ادبی مضامین کو ان کے تنقیدی کارناموں سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ان تنقیدوں

کا تعلق اگرچہ کسی کتاب سے نہیں ہوتا مگر وہ لوگوں کی سیرت ان کے کلام اور ان کے کارناموں پر ایک ناقدانہ بحث ہوتی ہے۔ آپ کے بہترین مضامین کا مجموعہ "چند ہمعصر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں زیادہ تر ان شاعروں، ادیبوں اور قومی لیڈروں کے حالات ہیں جو آپ کے ہمعصر تھے۔ اور ان میں سے اکثر سے آپ کا قلبی اور جگری تعلق تھا۔ اس کے مطالعہ سے مولانا کی صناعی اور قدرت بیان کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے اور چرچل کی مشہور کتاب (My Contemporaries) یاد آجاتی ہے۔ اس کتاب (چند ہمعصر) میں مضامین کی تعداد کل چودہ ہے جن میں سے خاص خاص مولوی چراغ علی، مولوی محمد عزیز مرزا، سید علی بلگرامی، محسن الملک، مولانا محمد علی، اور مولانا حالی ہیں۔ اور ان سب میں گدڑی کا لعل نور خاں ہے جو کہ خوبی زبان اور جوہر قلم کے اعتبار سے بہت ہی لاجواب ہے۔ بعینہ تمام مضامین جہاں ان بزرگ ہستیوں کا صحیح ترین خاکہ ہیں وہاں ان میں ان کے ادبی کارناموں، کلام اور زبان پر بھی تنقید کی گئی ہے اور اس لحاظ سے آپ کے مضامین دوسری سیرتوں سے جو کہ ان بزرگ ہستیوں کے متعلق لکھے گئے ہیں بہت ہی بلند پایہ اور مسلم الثبوت ہیں۔

(ب) مقالے:- آپ کے علمی مقالے بھی مستقل تصنیفات ہیں جو کہ تحقیقی اور تنقیدی لحاظ سے مہتم بالشان ہیں اس حیثیت سے یہ مقالے اردو ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان مقالوں میں آپ نے جو تحقیقات پیش کی ہیں وہ انتہائی صحیح اور مسلم ہیں۔

"اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" لکھ کر آپ نے ہماری تاریخ ادب کی ایک گمشدہ کڑی کا پتہ چلایا ہے۔ دوسرا اہم مقالہ جو تحقیق و تنقید کے لحاظ سے بہت اہم ہے، "مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر" کے نام سے شائع ہوا ہے یہ وسعت نظر اور عالمانہ تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔

"مرحوم دہلی کالج" بھی آپ کا نہایت ہی معرکہ آرا مقالہ ہے جس میں مولانا نے اس کالج کی اردو زبان و ادب کی ترقی میں اہمیت اور اس کی کوششوں کو خوب سراہا ہے اور اس کے کارناموں پر تنقیدی بحث کی ہے۔ ان مقالوں کے علاوہ آپ نے دکنی مصنفین، شعرا اور ان کی تصنیفات کے متعلق بہت ہی اہم اور معرکہ آرا مقدمے لکھے ہیں، جن میں سے قدیم اردو اور دوسرے مقالے بہت ہی

قابل قدر ہیں اور ان کی وجہ سے دکن کے اکثر ادیبوں کو قدیم دکنی ادب سے دلچسپی ہوگئی ہے اور ان پر کام کیا۔

(۳) خطبات :۔ مولانا عبدالحق کے ادبی کارناموں میں خطبات کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نہ صرف اس لئے قابل قدر ہیں کہ علمی اور ادبی جلسوں میں پڑھ کر مقبول ہوئے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ زبان وادب کی خوبیوں سے مملو ہیں۔ اگرچہ یہ خطبات تنقیدی رنگ سے الگ ہٹ کر لکھے گئے ہیں اور انھیں ایسا ہونا بھی چاہیئے لیکن اس قسم کے خطبات کو بھی ماہر فن اور مسلمہ نقاد کی تنقید نگاری کا جزو سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ نقاد کے کلام و بیان میں بھی ناقدانہ شان پائی جاتی ہے۔ ان میں وہ جہاں زبان وادب کی خامیوں اور خوبیوں کا محاکمہ کرتا ہے وہاں اصلاحی اور علمی تجاویز بھی سامعین کے سامنے رکھتا ہے جو کہ نقاد کا فرض ہے۔ اس لئے کسی نقاد کا اس مرتبہ پر پہونچ جانا کہ وہ مسلم الثبوت ہو جائے اور بڑی بڑی محفلوں اور مجلسوں میں صدارت اور صلاح و مشورہ کے لئے طلب کیا جائے اس کے کمال تنقید کی دلیل سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ مولانا کی تنقیدوں نے جس وقت سے اردو داں حلقہ میں بہت مقبولیت حاصل کی ہے اور نقاد کی حیثیت سے ان کی صلاحیتوں کو ملک میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اس وقت سے مختلف زبان وادب کے جلسوں میں مولانا عبدالحق مسند صدارت کے لئے مدعو کئے جاتے ہیں چنانچہ آپ کے دس خطبات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس میں سے ہر خطبہ پڑھنے کے قابل ہے اور یہ تمام خطبات مولوی صاحب کی عام مقبولیت کی دلیل ہیں ان خطبات میں انجمن حمایت اسلام، انجمن ترقی پسند مصنفین، بہار اردو کانفرنس، ہندوستانی اکیڈمی اور انڈین اورنٹیل کانفرنس کے خطبات بہت ہی پر مغز ہیں۔

(۴) تنقیدات :۔ یہی تنقیدات مولوی صاحب کے ادبی کارناموں کا بہت ہی اہم جزو ہیں کتابوں کے تبصروں میں مصنف اور کتاب کے ہر پہلو پر مفصل بحث ہوتی ہے جس کی بنیاد انصاف پر ہوتی ہے ان میں تحقیق کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ مولانا کی تنقیدیں تحقیقی واقعات اور کبھی کبھی ظرافت آمیز جملوں سے مملو ہوتی ہیں۔ تنقید کیا ہوتی ہے کتاب کا نچوڑ ہوتا ہے۔ جس میں اصل کتاب کے پڑھنے سے زیادہ

لطف آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سادگی زبان اور زور بیان سے بھی آراستہ و پیراستہ ہوتی ہیں۔ اس لئے لوگ انھیں صرف ادبی معلومات کے لئے ہی نہیں بلکہ دلچسپی اور زبان کی چاشنی کے لئے بھی پڑھتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ سالوں میں آپ کی تنقیدات کے دو مختصر مجموعے "تنقیدات عبدالحق" کے نام سے شائع ہو کر مقبول عام ہوئے ہیں آپ کی مشہور تنقیدوں میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

"سرگذشت الفاظ" بہت ہی پرلطف تنقید ہے جس میں الفاظ کی تاریخی سرگذشت اور ان کی شکل و معانی کی تبدیلی پر مولانا نے جہاں مصنف کی کوششوں کی داد دی ہے۔ وہاں چند الفاظ کی مضحکہ خیز تشریح کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور خامیوں کی خود تصحیح کی ہے۔

"مکاتیب امیر مینائی" پر نہایت منصفانہ اور بے لاگ تبصرہ ہے۔ مشہور شاعر کے محاسن و معائب کو بلا روک ٹوک بیان کیا گیا ہے۔

"اصلاح سخن" پر مولانا کی تنقید دوسری تنقیدوں سے مختلف نوعیت کی ہے۔ جہاں مصنف کی شوخی کی داد دی گئی ہے وہاں ان کی اخلاقی غلطی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ انداز بہت ہی ظرافت آمیز اور دلچسپ ہے۔

"فیضان شوق" کا تبصرہ بھی بہت ہی باکمال ہے۔ حضرت شوق جیسے مستند زبان داں اور مسلم الثبوت استاد کی شاعری کی خامیاں دکھانے کے ساتھ ساتھ زبان دانی کی غلطیاں بھی پیش کی گئی ہیں۔ ان کے کلام کا مختصر انتخاب اور ان کی شاعری پر تبصرہ بھی ہے۔

"اردو لٹریچر" پر تبصرہ بھی انتہائی دلچسپ ہے۔ اس کا انداز تنقید بھی جدا ہے۔ مولانا کی وسعت نظر اور تاریخ و زبان پر عبور اور واقفیت کا بہترین نمونہ ہے۔ نہایت ہی دلچسپ غلطیاں مثالاً پیش کی گئی ہیں۔ اگرچہ فاش غلطیوں کی فہرست بہت لمبی چوڑی ہے جس کی کہ کتاب یقیناً مستحق تھی لیکن پھر بھی لب و لہجہ میں کسی قسم کی سختی کا شائبہ نہیں پایا جاتا ہے اور ان خامیوں کے باوجود آخر میں مصنف کی کوششوں کو سراہا گیا ہے۔

غرضکہ مولانا کے مختلف تبصرے انداز تنقید کے لحاظ سے مختلف اور بہت ہی دلچسپ ہیں۔ جنکے

پڑھنے سے صرف صحیح تنقید نگاری کا رنگ ہی سامنے نہیں آتا بلکہ زبان کا لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔
اور ادبی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مولانا کی تنقیدوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انھیں
پڑھ کر کتاب کا بالکل صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے اور کتاب کا نچوڑ سامنے آجاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا
کی تنقیدوں کے دونوں مجموعے مختصر اور ناکافی ہیں اس لئے تمام تنقیدات کو ایک جگہ جمع کرنے کی ضرورت ہے
۵۔ مقدمات :۔ مولوی عبدالحق صاحب، مقدمہ باز مشہور ہیں اور ہونا بھی چاہئے۔ مگر باز میں ذم کا پہلو
حذف کرنے کے بعد۔ کیونکہ مولانا جیسا مفکر اور ادیب جس کی زندگی کا مقصد ہی عالمانہ اور تنقیدی مقدمے
لکھنا ہو اور جن کے تحقیقی و تنقیدی مقدمے علمیت زبان اور اعلیٰ معیار کی وجہ سے جوار زدیاد میں مشہور ہیں۔
اگر وہ مقدمہ باز کہلائیں گے تو کون ؟ مقدمہ نگاری تنقید نگاری ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس سے
بلند تر۔ اس کا لکھنا اُس سے زیادہ مشکل اور کٹھن ہے۔ مقدمہ نگاری کے لئے زیادہ علمیت اور صلاحیت
کی ضرورت ہے۔ تنقید صرف معیار پرکھنے کی کسوٹی ہے لیکن مقدمہ کتاب کی حد سے نکل کر موضوع
بحث مصنف اور خود کتاب پر تنقید ہوتی ہے۔ مولانا عبدالحق کے مقدمے نہایت ہی محققانہ اور مبصرانہ
ہوتے ہیں اور ان میں تحقیقی رنگ بھی شامل ہوتا ہے۔ اپنی نوعیت اور معیار کے اعتبار سے مولانا کے مقدمے
دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں کے بہتر سے بہتر مقدموں کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں مولانا
کا تبحر علمی اور ان کی وسعت نظر جہاں ان کے مقدموں کو زیور علم سے آراستہ و پیراستہ کرتی ہے
وہاں ان کی قدرت زبان اور اسلوب بیان زیورات علم کو جلا دیتے ہیں۔ اسی لئے ان مقدمات کو پڑھنے
سے اگر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے تو طبیعت کو سرور بھی حاصل ہوتا ہے مولانا کے مقدمے اکثر و بیشتر
صورتوں میں اصل کتاب سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں اور جس کتاب کے ساتھ شائع ہوتے ہیں اسے
چار چاند لگا دیتے ہیں۔ مولانا کے مقدمات کتاب کے پڑھنے میں بہت ہی مفید ثابت ہوتے ہیں اور
کتاب کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے اور موضوع کتاب کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ مولانا
کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر موضوع پر مقدمے لکھ سکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ سب بلند پایہ
ہوتے ہیں۔ لیکن زبان و ادب کے مسائل میں ان کی رائے قطعی اور ان کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔

مذہب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، زبان و ادب اور ساجی مسائل کے متعلق کتابوں پر ان کے مقدمات بہت بلند پایہ ہیں مقدمات کی تعداد تینتیس سے اوپر ہے جن میں سے چند کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے تاکہ ان کے مقدموں کی نوعیت اور طرز مقدمہ نگاری کا ایک خاکہ ذہن میں قائم ہو جائے۔

مقدمہ معرکۂ مذہب و سائنس، ڈاکٹر ڈریپر کی کتاب مذہب و سائنس پر نہایت ہی عالمانہ مقدمہ ہے بلکہ اس کتاب کے مقابلہ میں اس مقدمے کو ایک مستقل تصنیف سمجھنا چاہئے جس میں مذہب کی حقیقت اس کی اہمیت اور سائنس پر نہایت ہی فلسفیانہ اور منطقی بحثیں کی گئی ہیں۔ نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ وجود باری تعالیٰ اور مذہب کی ضرورت کو ثابت کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ آپ کے دوسرے مقدموں سے اس حیثیت سے مختلف ہے کہ اس میں تمام تر علمی بحث ہے جو کہ زبان اور خیالات کی خوبیوں کی وجہ سے بہت ہی دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مقدمہ حیات النذیر، دوسرے مقدموں سے مختلف نہیں بلکہ آپ کے خاص رنگ میں ہے جس میں مولانا نذیر احمد کے حالات زندگی پر بہت اچھی اور صحیح بحث کی گئی ہے۔ ابتدائے مقدمہ میں آپ نے ان لوگوں کا جو کہ تاریخی شخصیتوں کی سیرت لکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے دور کی شخصیتوں کے حالات زندگی لکھتے ہیں، دونوں کے فرائض اور مشکلات کا محاکمہ کیا ہے۔ اس کے بعد مولانا نذیر احمد کی زندگی کو جس سبق آموز انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی قابلیت اور علمی صلاحیتوں کو جس قدر سراہا ہے۔ اس کی توقع بہت کم لوگوں سے کی جا سکتی ہے۔ آخر میں اہانۃ الامہ کے مسئلہ پر بلا خوف و خطر پوری وضاحت اور زور بیان کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مقدمہ تمدن ہند، میں سید علی بلگرامی کے حالات زندگی بہت خوش اسلوبی کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ اس کے بعد تمدن ہند پر نہایت ہی فاضلانہ طور پر تنقید کی ہے اس میں جہاں ایک ادیب اور عالم کی حیثیت سے بے لاگ تنقید کی ہے وہاں اپنی تاریخ دانی کے جوہر بھی خوب دکھائے ہیں۔

مقدمہ ذکر میر، میں جس قدر بہتر طریقہ پر اور جتنے صحیح حالات موجود ہیں کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے میر صاحب کے متعلق تمام غلط فہمیوں کا بہت خوش اسلوبی کے ساتھ ازالہ کیا گیا ہے۔ میر صاحب اور خان آرزو

کارشتہ اور ان کے باہم تعلقات پر اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کئے ہیں۔

مقدمہ 'انتخاب کلام میر' عبدالحق صاحب کے معرکہ آرا مقدموں میں سے ایک ہے اس میں جہاں میر کے مفصل حالات بیان کئے گئے ہیں وہاں ان کے کلام پر بہت ہی بلند پایہ اور وقیع تبصرہ بھی ہے اگرچہ تشنۂ تکمیل ہے۔

مقدمہ 'خطوط عطیہ بیگم' اپنی نوعیت کا بالکل جدا مقدمہ ہے کیا بہ اعتبار طرز بیان اور کیا بہ اعتبار مقدمہ نگاری۔ اس میں اصل رنگ کو چھوڑ کر طنز آمیز لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی کے وہ خطوط جو انھوں نے عطیہ بیگم کو لکھے تھے ان کے ذریعہ ان کی زبان کی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے کیرکٹر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ اگرچہ دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس میں مولانا اپنے انصاف اور سنجیدگی کو قائم نہ رکھ سکے۔

مولانا کے جس قدر بھی مقدمے ہیں سب کسی نہ کسی حیثیت سے اہم اور معرکہ آرا ہیں۔ اس لئے یہ مشکل ہے کہ کس کو کس پر ترجیح دی جائے۔ ابھی ابھی ہم صرف چند مختلف النوع مقدموں کا ذکر ان کی مقدمہ نگاری کے انداز کو سمجھنے کے لئے کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مقدمہ 'باغ و بہار'، مقدمہ 'سب رس'، مقدمہ 'مثنوی خواب و خیال'، 'نصرتی' اور مقدمہ 'دریائے لطافت' بہت ہی بلند پایہ اور قابل قدر ہیں۔

(باقی آئندہ)

(اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی)

تربیت، تہذیب، امن عام

کیا تربیت* وحشت و بربریت کا خاتمہ کر سکتی ہے؟

وحشت و بہیمیت، جنگ و جدال، خونریزی و سفاکی یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے سنتے ہی ہمارے ذہن کے سامنے ایک مکروہ منظر آجاتا ہے اور یہ بھی بلاشک و تردید واضح ہے کہ یہ مناظر انسانیت کے لئے ننگ ہیں چنانچہ ہمیشہ مصلحین انسانیت کی یہ کوشش رہی ہے کہ ان باہم خونریزیوں اور وحشتناکیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تاریخ کے صفحات بھی بتلاتے ہیں کہ انسانی اقوام کے ہر ہادی نبی، پیغامبر اور ریفارمر کا درد مند دل اس لئے مضطرب رہا ہے کہ اس طلسم سرائے عالم میں ایک امن اور عالمگیر امن و سلامتی کا دور دورہ ہو اور یہ دنیا محبت اور انسانیت کی ایک سچی راہ پائے۔

ایک انسان کے ذہن میں یہ خیالات چکر لگاتے ہیں اور کبھی کبھی وہ تنہائی میں سوچتا ہے کہ آخر انسان اپنے بھائیوں سے کیوں لڑتا ہے؟ کیا ان ہولناک سفاکیوں کا استیصال کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا کوئی ذریعہ ہے کہ ان افراد اور جماعات کے دلوں سے جذبۂ حرب و قتال دور ہو سکے؟ یہی وہ کھٹکتے ہوئے سوالات ہیں جو ہمیشہ سے مفکرین کے سامنے ہیں اور اس پر غور و فکر ابتدا سے جاری ہے لیکن اس کی سرگرمیاں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۳ء تک بہت زیادہ ہو گئیں تھیں اور داعیان امن و سلامتی کی مجاہدانہ کوششیں کہہ رہی تھیں کہ وہ جدال و بربریت کو مٹا کر دنیا کو ایک نئی زندگی بخشنے والے ہیں جسے "تجدید شباب عالم" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ——— اس وقت اس کی بڑھتی ہوئی ترقی بہت امید افزا تھی اور اس کی عظمت دیکھ کر خوش آئند مستقبل کی ایک جھلک سی نظر آجاتی تھی مگر آج یاس و ناامیدی کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں اور آج گذشتہ کی رجا و امید ایک مضحکہ ہے ——— لیکن پھر بھی امید ناامیدی سے بہرکیف بہتر ہے فتح کے لئے اقدام کی جد و جہد شکست کی پشت زنی سے محمود اور لائق احترام ہے گو فعل اول عبث ہی ——— لہذا یہ بے محل امر نہ ہوگا اگر اس بحث پر ایک سرسری نظر ڈالی

جائے اور نفسی و اجتماعی تحلیل کے بعد گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے اب تک کے قیام امن کی کوششوں اور اس کے طلبا و مدارس اور کانفرنسوں کے کچھ حالات سنائے جائیں۔

محرکات جنگ علم النفس پر بحث کرتے ہوئے ہمیں دو نفسیتیں بیان کرنی ہوں گی پہلے افراد اور پھر جماعت کی۔ افراد میں جنگ کا محرک "محافظۂ نفس" کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ انسان اور حیوان میں بالکل یکساں ہے کہ جب وہ اپنے اردگرد ناساعد حالات دیکھتا ہے تو ان تمام چیزوں کے ساتھ جو ممکن ہیں اپنی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اپنی چمکتی ہوئی بجلی سے بادلوں کی اس متکاثف تیرگی و ظلمت کو کافور کر دے۔ اس فطرت کو وہ جذبے جو فطرت ثانیہ بن کر راسخ ہوتے ہیں اور تقویت پہونچاتے ہیں۔ غیظ و غضب، خوف و ہراس، بد اخلاقی و کج خلقی۔ یہ جذبات جو بالعموم حیوانات و انسان میں آ جمع ہوتے ہیں۔ ان کا اتصال فطرت محافظت کو نامعلوم حدوں تک دوبالا کر دیتا ہے۔ تہذیب کا کام یہ ہے کہ وہ ان جذبات کی اصلاح اور انسانی طبیعتوں کو ان کی کثافت سے پاک و صاف کرے لیکن بدقسمتی سے تمام اصحاب علم و فضل اس پر متفق ہیں کہ گزشتہ پچیس سالوں میں تہذیب اور امن کی جتنی بھی کوششیں کی گئیں ان کا صرف یہ نتیجہ نکلا کہ انسانی طبیعت پر ایک سنہری سی پالش ہو گئی، اور حال یہ ہے کہ اگر ہلکی سی بھی ہوا چلی تو حیوانیت کی دبی دبائی آگ بھڑک اٹھے گی اور وہ تمام بہیمیت صادر ہو گی جب یہ آج سے مدتوں پہلے ہمارے آباؤ اجداد تھے جبکہ انھیں تہذیب و تمدن کی ادنیٰ جھلک بھی نہیں پہونچی تھی)۔

اب ہمیں اس سے الگ ہو کر جماعت کی نفسیات سے خفیف سا تعرض کرنا چاہئے۔ جماعتی نفسیات کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جماعت کے پاس صرف جذبہ ہی جذبہ ہوتا ہے وہ عقل و فکر سے ایک دم عاری ہوتی ہے اور اس کے نزدیک یہ الفاظ بے معنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت میں تلون مزاجی۔ اشتعال پسندی اور برانگیختگی کے جذبات بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ایک ذرا سی حرکت پر ابل پڑنے کو تیار رہتے ہیں گویا ایک پیمانہ ہے جس کے چھلکنے میں ایک ٹھیس کی دیر تھی۔ اسی لئے اگر جماعت کو اس کا علمبردار و ہادی کسی بہتر کام میں مصروف نہ رکھے تو لازم ہے کہ جماعت کے جذبات وحشت و تخریب کی طرف مائل ہو جائیں۔"

جماعتی خصائص کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ افراد جو تہذیب و تربیت کے پروردہ ہیں اور جنہوں نے تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ منزل طے کر لی ہے اور جو منفرداً ضبط نفس اور فطرت حیوانی کے انسداد پر پوری طرح قادر ہیں یہاں تک کہ اگر ایک دم حکومت (کنٹرول) کا وجود نہ ہو تو وہ بالانفراد امن و صلاحتی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ وہ بھی جب جماعتی شیشہ میں گھل جاتے ہیں تو منظر بالکل بدلا سا ہوتا ہے اور یہی صاحبان ضبط و تربیت جماعت کے ساتھ بڑی بڑی خونریزیوں، سفاکیوں، قتل و غارت اور دنیا کے ارذل ترین جرائم کے ارتکاب میں مصروف رہتے ہیں ——— اس کے دلائل و شواہد بے شمار ہیں۔ اس کا ہم ایک معمولی سا قیاس ایک جنگجو فوج سے کر سکتے ہیں جو فتح و نصرت کے جھنڈوں اور ترانوں کے ساتھ دشمنوں کے شہر میں فاتحانہ اور حقارت کی نظریں ڈالتے ہوئے داخل ہوتی ہے۔ اس کا انسانی معیار اتنا پست ہوتا ہے اور اتنے بہیمانہ حیوانی گناہوں کی مرتکب ہوتی ہے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر یہ بھی معلوم ہے کہ اس میں سے کتنے یونیورسٹی اور کالج کے فارغ شدہ ہیں اور نہر علم و انسانیت کے سیراب کردہ ہیں۔ اسی طرح جب پارٹیوں میں اختلافات کے مظاہرے ہوتے ہیں تو کیا وہ مناظر نہیں دیکھے جب جلیل القدر وزرا، اور ممبران مکروہ ترین تصادم پر اتر آتے ہیں لیسا اس وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ بالانفراد آنریبل وزیر کے لئے شایاں اور اس کو زیبا ہے۔ اسی طرح اب تاریخ کے بڑے بڑے انقلابات پر ایک نظر ڈالئے اور بتائیے کہ وہ کون انقلاب ہے کہ جس کی روح اور جس کی مشنری کے پرزے انسانیت کے اعلیٰ پتلے نہیں ہیں اور ان انقلابوں کو بھی شمار کر لیجئے جو مساوات و اخوت کے لئے ظاہر ہوئے مگر کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ وہ کونسی حیوانیت تھی جس سے وہ انقلاب پاک اور وہ کون سی ناموزونیت تھی جو برسر عمل نہ آئی ——— یہ ہے جماعتی ذہنیت اور خصائص نفسی کا ایک معمولی سا پہلو یا ایک ادنیٰ خاکہ جو اشارہ کا کام دے سکتا ہے اور ایک ناظر جماعتی نفسیات کے مناظر دیکھ سکتا ہے۔

اجتماعی نظام کی پیچیدگیاں بالکل اقتصادی اور سیاسی نظام کی سی ہیں، جو ہمیشہ کینہ پروری اور اختلافات کے گناہوں میں ملوث رہتا ہے اور علمائے اجتماع ان جغرافیائی اور اقتصادی و سیاسی مسائل کے حل میں ہمیشہ

قاصر رہے ہیں جو باہم قوموں کے تعلقات اور رشتہ کو خراب بنا کر انھیں جنگ کے آتشیں میدان میں بالمقابل لا کھڑا کر دیتے ہیں اور اس عالم ترقی و ایجاد میں حکومتوں کے بدترین تعلقات اور اجتماعی مشکلات کو دیکھ کر ایک انسان صرف حیرت میں کھڑا تکتا رہتا ہے۔ اسی سلسلہ میں پانچ باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

سب سے پہلے یہ کہ انسانی تاریخ کا اہم ترین واقعہ انسان کی وہ عقلی و علمی ترقی ہے جس نے دنیا کو علوم و ایجادات اور تمدن کے لئے مادی ذرائع کے سیلاب میں لا ڈبویا اور جس کی تاریخ عالم میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

دوسرے یہ کہ اب تک انسانی طبیعت، اس کی غریزت و وجدان اور عواطف و احساسات اپنے اس مقام سے ایک قدم بھی آگے نہیں ہٹ سکے ہیں جس پر کہ ہمارے اسلاف تھے جبکہ وہ اپنے چارپاؤں سے چلا کرتے اور درختوں پر کودا پھاندا کرتے تھے اس وقت انھوں نے انسانیت کا خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔

تیسرے یہ کہ عقل انسانی کی یہ غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی اور اس کے بالمقابل جذبات انسانی کی ناگوار پستی کا شدید ترین اختلاف، توازن کی پراگندگی اور نظام کائنات کو مختل کرنے میں پیش پیش ہے اور اگر آج اس علم و ترقی کی بدولت امن و سلام کے ایام میں گو یہ بالانفرادیین کی زندگی بسر کر لیتے ہیں تو اسی کے مقابل میں جنگ کا وہ منظر بھی ہے جبکہ جماعتوں کی ہزاروں جانیں بیک وقت نذر اجل ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد قوموں میں باہم تعلقات ناممکن کی حدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔

چوتھے یہ کہ علما، اجتماعیات جو دور جدید کی پیداوار ہیں وہ جماعتوں کے عقل و جذبات میں تناسب پیدا کرنے سے ایک دم قاصر ہیں جس طرح کہ اب تک علما، اخلاق و مذہب افراد میں ان کی باہم توفیق نہیں دے سکے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ ان مذکورہ باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے علما، تہذیب کے سامنے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جدید ذرائع تربیت اور اصحاب تہذیب کی حسن نیت کے باوجود اجتماعی امن ممکن ہے؟ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اصلاح و تربیت کا تعلق زمانہ اور سالوں سے نہیں ہے بلکہ ہر تہذیب کے آثار آنے والی نسلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ یقینی ہے کہ اس سبیل میں جو بھی کوشش

کی جائے گی اس کا نتیجہ اگر فی الفور نہ ظاہر ہو تو ممکن ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر پشتوں اور صدیوں کے بعد یقیناً ظاہر ہو کر رہے گا۔ چنانچہ آج ہم جس وحشت و بہیمیت پر نالہ کن ہیں اگر اس کا مقابلہ گزشتہ تاریخ سے کیا جائے تو یہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے یہ سب ثمرہ گزشتہ تہذیب و تمدن کا ہے گو حقیر سہی۔ اسی لئے آج امن کی جو بھی کوشش کی جائے گی اس کا نتیجہ آگے چل کر یقیناً ظاہر ہوگا اور اس وقت اس تہذیب امن وسلام کی فتح عیاں ہو جائے گی۔

تعلیمی درسگاہیں اور سیاسی خواہشات

ہم یہاں پر افسوس کے ساتھ اس بات کا ذکر کر دینا چاہتے ہیں کہ سیاسی خواہشات جس طرح ہر شئے پر چھا گئیں اسی طرح تعلیمی درسگاہیں بھی ان کے دسترس سے محفوظ نہ رہ سکیں جنگ عظیم کے بعد درسگاہوں میں قیام امن کی کوششیں پورے زور و شور سے شروع ہو گئیں لیکن عجیب بات ہے کہ ایک طرف طلبا کو امن کی تربیت دیجا رہی تھی اور دوسری طرف ان میں قومیت کی زہریلی روح پھونکی جا رہی تھی حتیٰ کہ اس سے بڑی بڑی جمہوری حکومتیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں چنانچہ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ایک شخص ولیم ہال ٹوماس نے امریکہ کے تاریخی کورس کیلئے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے انگلستان پر بڑے زبردست حملے کئے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی اسے کورس میں کچھ ہی مدت ہوئی تھی کہ انگلستان اور ولایات متحدہ (واشنگٹن) کے درمیان عظیم الشان ناچاقی کا مظاہرہ ہو گیا۔ اس کتاب کو لکھنے کا سبب صرف یہ تھا کہ اس کا مصنف آئرلینڈ کا باشندہ تھا اور آئرلینڈ و انگلینڈ کے درمیان جو تعلقات ہیں وہ لائق ذکر و تفسیر نہیں۔

جرمنی بھی اپنے جمہوری عہد میں یعنی نازی ازم کی حکومت سے پہلے امن وسلام کا بڑا دلدادہ تھا۔ جرمنی حکومت نے اس روح کو تقویت پہونچانے کے لئے اس کے اداروں اور کمیٹیوں کی معاونت میں حصہ لیا تھا چنانچہ مشہور امریکی آل کارنجی نے ۱۹۲۷ء میں برلن میں حکومت کی طرف سے ایک درسگاہ قائم کی تھی جس کا مقصد امن عام کو رواج دینا اور قوموں کے باہم تعلقات کو خوشگوار بنانا تھا مگر جوں ہی ہٹلر نے زمام حکومت سنبھالی اسے ایکدم بند کر دینے کا حکم نافذ کر دیا۔ اس لئے کہ اس کے مبادی و اغراض نازیت کی موجزن عسکری روح سے متصادم ہو جاتے تھے۔ اور ابھی چند سال بھی نہیں گذرے تھے کہ

جرمنی کورس کی تمام کتابیں خواہ وہ تاریخ ہو یا جغرافیہ، ریاضی ہو یا گرامر، ادب ہو یا شعر و شاعری تمام ایک فاسد زہر سے بھر دی گئیں۔ یہاں پر ان کے نمونے درج کرنا تطویل ہوگا۔ اس لئے اسے چھوڑتے ہیں۔

طلبائے امن | اس قومیت پرستی و عسکریت پسندی کے باوجود بہت سے ممالک میں لاتعداد ادارے قائم ہوئے جن کا مقصد تبلیغ امن تھا۔ ہمیں اس کا ایک عظیم الشان منظر نیویارک میں نظر آتا ہے جہاں دریائے ہڈسن پر ایک جلیل القدر اور عظیم الشان محل کھڑا ہوا ہے قریب پہونچنے کے بعد جو چیز اور اس کی عظمت کو دوبالا کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے صدر دروازے پر یہ عبارت منقوش ہے "یہاں تک کہ امن و اخوت کا دور دورہ ہو" یہ عمارت جان روکفلر کی سخاوت اور امن و تہذیب پسندی کا نتیجہ ہے جسے انھوں نے غیر ملکی طلبا کے لئے تعمیر کرایا ہے۔ اس میں امریکیوں کی تعداد دس فیصدی ہے طلبا کی کل تعداد پندرہ سو ہے۔ جو مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس درسگاہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ مختلف متبائن قوموں میں ارتباط پیدا کیا جائے اور انھیں ایک دوسرے سے قریب بنایا جائے۔ جان روکفلر نے اس طرح کی اور دوسری عمارتیں برکلی (کیلیفورنیا) اور پیرس وغیرہ میں بھی بنوائی ہیں لیکن ہمیں یہاں بھی افسوس کے ساتھ وہ چیز ظاہر کرنی پڑتی ہے جسے ہم ابھی پہلے بیان کر چکے ہیں کہ باوجود ان تمام کوششوں کے کہ ان مختلف القومیت طلبا کو باہم قریب تر اور ایک بنا دیا جائے قومیت کے آثار مٹ نہیں سکے ہیں اور یہ چیز پیدا نہیں ہو سکی ہے چینیوں، جاپانیوں اور انگریزوں، ہندوستانیوں میں عداوت کی آگ برابر مشتعل ہے اور ہر بلند قوم دوسری قوم کو حقیر نظروں سے دیکھتی ہے۔ چنانچہ آج اس قسم کے واقعات ہمارے سامنے رونما ہیں۔

میونخ کے متنافقات | اس طرح کا ایک دوسرا منظر میونخ (جرمنی) میں ہے جسے تقریباً ہر سیاح دیکھتا ہے کہ وہاں ایک بہترین پارک میں جو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سبزوں اور پھولوں سے آراستہ ہے۔ ایک طرف ایک فرشتہ کا مجسمہ ہے جس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے ہیں گویا فضا میں بلند ہو رہا ہے یہ امن وسلام کا فرشتہ ہے جو جرمنوں اور فرانسیسیوں کے عہد نامہ امن کی یادگار رہے جو ۱۸۷۰ء میں منعقد ہوا تھا۔ لیکن عجیب دلچسپ بات ہے کہ یہ مجسمہ جو کسی وقت مقدس ولولوں کے ساتھ نصب کیا گیا ہوگا آج اس کا حال یہ ہے کہ اسی پارک میں آپ کو اہل میونخ کی بڑی تعداد ملے گی جو اس پر باہم ایک تبصرہ انگیز تبسم کا

اظہار کرتی نظر آئیگی اور اس تبسم کا مطلب لوگوں سے مخفی نہیں جو ۱۹۱۸ء سے ۱۹۱۹ء اور آج کل کے حالات و رفتار سے باخبر ہیں۔

اب اس منظر کو چھوڑیئے اور سیو یخ کی علمی نمائش گاہ پر ایک نظر ڈالئے۔ دنیا کی سب سے بڑی علمی نمائش کہی جاتی تھی یہاں جس چیز کا وجود سراسر چھایا ہوا تھا وہ سب آلات گیس اور بجلیوں کا تھا۔ ہر جگہ صرف آگ، ہوا، بجلی گیس، مقناطیس، شعاع آواز وغیرہ کے نظریات و اکتشافات کی تشریح تھی اور علمی مظاہرہ!

اس سے اور آگے بڑھیئے تو آلات حرب کی متوحش اور حیرت انگیز کثرت تھی۔ دنیا کا کوئی تباہ کن آلہ نہ ہوگا جس سے کہ اس علمی نمائش گاہ کو آراستہ نہ کیا گیا ہو گا گویا دنیا کو دکھلایا جا رہا تھا کہ اب تک کی ترقی اور علم کا جو کچھ نتیجہ اور اس علمی جدوجہد کا جو کچھ حاصل ہے وہ یہی مخرب انسانیت آلات ہیں جن سے انسانیت کی گردن پر خونی وبال آنے والا ہے۔

امن کی کوششیں | لیکن اس کے باوجود مدعیان تہذیب مختلف ممالک میں مختلف ذرائع سے تبلیغ امن میں منہمک رہے ہیں، اس سلسلہ کی دلچسپ بحث تہذیب عالم کی کانفرنس کے وہ اجلاس ہیں جس میں اس مسئلہ پر تقریریں اور غور و خوض ہوا تھا یہ جلسے جنیوا میں آخر جولائی اور اوائل اگست ۱۹۲۹ء میں منعقد ہوئے تھے فرانس کے نمائندے پروفیسر تلفار نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ وہ ۱۹۱۹ء سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ فرانس میں درس سے ان تمام رسائل اور کتابوں کو خارج کر دیا جائے جن سے باہم اختلافات کا خدشہ ہو اور جو کسی طرح بھی طلبا میں ایک گندی روح پھونکتے ہوں اور ان میں انسانیت کے بجائے جذبہ حیوانیت کو برانگیختہ کرتے ہوں اور اس کے برخلاف ایسی کتابیں اور ایسی چیزیں طلبا کو پڑھائی جائیں۔ جن سے اخوت و محبت کا جذبہ پیدا ہو اور ہمدردی و غمگساری کی روح مشتعل ہو اور دوسرے یہ کہ تاریخ میں طلبا کے سامنے علمائے عالم اور ان کی خدمتوں اور کارناموں پر حقیقی معلومات پیش کئے جائیں اور طلبا کو ان سے حقیقی طور پر واقف بنایا جائے اور اس میں جنسیت اور قومیت کی بو ایک دم نہ آنی چاہیئے چنانچہ آج اسی کا نتیجہ ہے کہ تھوڑی مدت کے بعد طلبا کو جیمس واٹ، گوئٹے، شکسپیر، ڈانٹے، شوپنہار، اڈیسن روسو، ابراہام لنکن وغیرہ کا اچھا خاصہ علم ہے۔

ڈاکٹر فریڈرک جابنرجو برلن یونیورسٹی کے پروفیسر تھے انھوں نے اپنے مقالہ میں جو اجلاس میں سنا گیا تھا بتایا تھا کہ جرمنی کی جدید جمہوری وزارت نے طے کیا ہے کہ جرمنی کے کورس کو ان تمام آلائشوں سے پاک کرے گی جن سے کہ وہ اب تک بھرے پڑے ہیں چنانچہ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا "درسگاہوں کی تعلیم کی غرض صرف اخلاقی شخصیت پیدا کرنا ہے اور قومی اجتماعی احساس کو تقویت پہونچانا ہے اور ان سب سے بڑھ کر تعلیم کا مقصود ایک امن اور عالمگیر امن کا قیام اور حکومتوں میں خوشگوار تعلقات کا پیدا کرنا ہے" آگے چل کر یہ کہا کہ "اس وقت جرمنی حکومت ہر اُس ممکن وسیلہ کو استعمال کر رہی ہے جس سے کہ باہم حکومتوں میں اچھے تعلقات مستحکم ہو سکتے ہیں چنانچہ جو کمیٹیاں اس وقت امن عام کی کوشش میں مصروف ہیں ان کے نظام اور حالات سے ہم اپنے طلبا کو باخبر رکھتے ہیں اور جب بھی کوئی قومی مسئلہ آجاتا ہے جس میں دیگر مجالس شرکت کرتی ہیں تو ہم بھی اپنے طلبا کی نگاہیں اس طرف پھیرتے ہیں۔ اور ان سب کے علاوہ ہمارے طلبا ہر سال دوسرے ممالک کی سیر کرتے ہیں تاکہ دوسروں کے خیالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے اور حسن فہم اور صداقت پیدا ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ ہم نے مراسلات کا سلسلہ بھی قائم کیا ہے تاکہ غیر ملکیوں سے اچھے تعلقات پیدا ہو سکیں۔ اور یہ سب ان تعلیمی کوششوں کے علاوہ ہے جس میں کہ ہم پوری طرح منہمک ہیں۔"

یہاں پر موقع نہیں ہے کہ بحثوں اور تقریروں کا خلاصہ پیش کیا جائے۔ المختصر کہ یہاں وہ تمام زبان سے کہہ ڈالا گیا جو کہ اس سبیل میں ممکن ہو سکتا تھا۔ جلسہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ افتتاح سے پہلے جنیوا کے ہر مقام پر بڑے بڑے پوسٹر چسپاں تھے جس پر لکھا ہوا تھا۔ "جنگ کا خاتمہ تعلیم و تربیت کر سکتی ہے" اس سے جلسہ کی دھوم دھام اور تزک احتشام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح کی مفید کتابیں شائع کرنے کے لئے پیرس میں جان روکفلر کی درسگاہ کی طرف سے ایک ادارہ تالیف و تصنیف قائم ہوا تھا۔ اس کی تالیفات تحریک تہذیب و امن کے مقاصد کو پوری طرح پورا کرتی تھیں اور ان تمام خباثت سے ان میں احتراز کیا جاتا تھا۔ جو کہ باہم اختلاف و جنگ کا سبب بن سکیں اسی لئے اس کی کتابیں اپنے حلقہ میں کافی مقبول ہوئیں اور ان کتابوں کو پبلک اور یونیورسٹی لائبریریوں نے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔

قیام امن کی کوششوں میں سرمایہ داروں اور اصحاب ثروت نے جو حصہ لیا ہے اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ امریکہ کے لاتعداد اصحاب ثروت نے اس سبیل میں اپنی دولت کو جس فراخدلی سے خرچ کیا ہے دنیا اس کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں آں کرنیجی کا نام سر فہرست جلی حرفوں سے لکھا جائے گا جنھوں نے جنگ عظیم کے بعد سے حال تک امن و تربیت کے لئے اپنی دولت کا دروازہ پوری طرح کھول دیا تھا اور غیر محدود ادارے قائم کئے ـــــــــــ ماہرین تعلیم کی خدمتوں کے علاوہ مصلحین اور پیغمبران امن بھی ہمیشہ مفتخر شخصیتوں کے نام سے یاد کئے جائیں گے جس میں برناڈ شا اور ڈاکٹر بوکمان وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی حسن نیت کے باوجود اپنی تحریک امن کے ذریعہ ایک دنیا پر ایک مصیبت مسلط کر دی ہے اس لئے کہ اس تحریک نے جن ممالک میں رسوخ پایا اور وہاں کے باشندوں کی زنگ آلودہ طبیعت کو صیقل کیا وہ سب جمہوری تھے اور ان کے برخلاف دوسری طرف ایسے ممالک تھے جہاں انھیں اوقات میں جنگ کی آگ بھڑکائی جا رہی تھی اور نونہالان وطن کو جنگ کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ فرانس، بلجیم، ڈنمارک، ناروے وغیرہ میں وہاں کے نوجوانوں کو سکون و امن کے اتنے خواب دکھائے گئے کہ ان کی طبیعتیں سکون پسند ہو گئیں اور جنگی توجہ ہٹنے کے ساتھ جنگی قوت بھی ان سے مٹتی رہی حتیٰ کہ انھوں نے اپنی مدافعت کی بھی طاقت کھو دی اور دوسری طرف جاپان، روس، جرمنی، اٹلی نے اپنے نوجوانوں کی جس ماحول میں تربیت کی وہ سراسر جنگی اور وحشیانہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بھیڑیوں نے ان بکریوں کو کھا ڈالا اور ابھی تک یہ بھیڑیے آزادانہ خونخواری کر رہے ہیں

ـــــــــــ یہ ہے تربیت، تہذیب و امن کی پچھلی کہانی ـــــ ! (اقتباس)

(مترجمہ صدر الدین الحسنی)

تاریخی نظریہ کا ارتقا

تاریخ کی آج تک کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکی اور اس کا شاید سبب یہ ہے کہ تغیرات زمانہ کے ساتھ اس کے مفہوم میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ یہ اس وجہ سے کہ مورخین کی نیتیں مختلف رہیں۔ اُن کے ذرائع معلومات میں تفاوت پیدا ہوتا گیا اور ان کے نظریے تبدیل ہوتے گئے۔ یوں تو تاریخ کی ایک عمومی اور وسیع ترین تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ انسانی اعمال و افعال کی داستان ہے۔ کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ اپنی پوری تاریخ کا حامل ہے۔ ہمارے نظریے اور ادارے بھی کسی حادثہ کا فوری نتیجہ نہیں ہیں اور نہ وہ جابرانہ قواعد و ضوابط میں محبوس رہے ہیں بلکہ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ان میں بھی تغیر ہوا ہے۔ اسی لئے ہمارا کوئی خیال و عمل سکونیاتی نہیں ہے۔ اس میں ایک ارتقائی شان پوشیدہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ اپنے وسیع دامن میں انسان کے ہر اس خیال یا عمل کو جگہ دے سکتی ہے جو اس سے کبھی بھی سرزد ہوا ہے۔

ہمارے تاریخی نظریہ نے ارتقا کی مختلف منزلیں طے کی ہیں اور مختلف ادوار میں اس کے مفہوم میں ایک گونہ تبدیلی ہوتی گئی ہے۔ ایک زمانہ میں تاریخ علم الاصنام سے وابستہ تھی اور بہت سے خرافات قصّے اس کے عناصر ترکیبی تھے۔ چوتھی اور پانچویں صدی کے لوگ اس کو "منشائے ایزدی" کا مظہر سمجھنے لگے۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے اس کی اساس اخلاقیات پر رکھی۔ بعض نے اُسے محض "افسانہ یاران کہن" سمجھا اور بعض نے اُسے ادبیات کا جزو اور سیاسیات گذشتہ کی داستان قرار دیا۔ غرض مورخین کے نظریوں کے ساتھ ساتھ تاریخی ترتیب میں بھی تغیر و تبدل ہوتا گیا۔

تاریخی مواد کو سب سے پہلے رزمیہ نظموں میں پیش کیا گیا۔ ان شعراء کو تنقید کے اصولوں سے بحث نہیں تھی۔ انھوں نے اپنی نظموں کے لئے صرف ایسا مواد مہیا کیا جو ان کی نظر میں دلچسپ یا پبلک کے لئے جاذب توجہ ہو سکتا تھا۔ ہرڈوٹس صحیح معنوں میں تاریخ کا ابوالآبا کہا جا سکتا ہے

اس نے اپنی تحریروں میں تحقیق وتلاش کو ایک معتد بہ جگہ دی اور بعض اوقات مختلف بیانات کا خلاصہ پیش کر دیا تاکہ قاری یا سامع خود حق و صداقت تک پہونچ جائے لیکن اس کے باوجود ہیروڈوٹس کی شہرت ایک بلند پایہ ناثر اور قصہ گو سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کو ہم بیانیہ تاریخ کا پیش رو کہہ سکتے ہیں اور حقیقتاً اس میدان میں اس کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا۔

اس کے بعد تھیوسائیڈس (جو جنگ پولپینیشیا کا مورخ ہے) ایسے واقعات ضبط تحریر میں لایا جو اس نے خود دیکھے تھے یا دوسروں نے دیکھے تھے اور جن کے متعلق اس نے کافی تحقیق کرلی تھی۔ یہ کام بڑا مشکل تھا اس لئے کہ مشاہدہ کرنے والوں کے بیانات میں تضاد تھا۔ کیونکہ وہ فریقین کی لڑائی سے خود دلچسپی رکھتے تھے۔ تھیوسائیڈس کا خیال تھا کہ سیاسی واقعات وحالات کا صحیح مرقع سیاسی اصولوں کی ترویج میں بے حد مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کا مقصد خالصتہً ناصحانہ ومعلمانہ تھا اور اس نوع کی تاریخ لکھنے میں وہ اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

اہل روما نے زبان وبیان پر بہت زور دیا اور اُن کے عہد حکومت سے ایک ایسی تاریخ کا دور شروع ہوتا ہے جس میں خطیبانہ بلند آہنگی غالب ہے۔ اس دور کی بہترین پیداوار سسرو ہے اسی زمانہ میں ٹیسی ٹس نے تاریخی صنعت گری کے حسین نمونے دکھلائے۔

عیسائیت کے آغاز سے تاریخ میں مذہبیات بھی شامل ہو گئی اور عہد متوسط کی تاریخوں میں مافوق الفطرت حالات بھی داخل ہو گئے۔ عربوں نے تاریخ نگاری کا بالکل ایک نیا ڈھنگ نکالا انھوں نے وہ واقعات لکھے جو عینی شاہدوں نے دیکھے یا وہ جو ان کے ہم عصروں کے ملاحظہ سے گذرے اور تاریخ لکھنے والوں نے یہ واقعات جو مختلف راویوں سے ہو کر ان تک پہونچے تھے نہایت احتیاط کے ساتھ قلمبند کر دئے گئے۔ یہ گویا شہادتوں کی فراہمی وموازنہ اور نیتوں کی جانچ اور تحقیق کی ابتدا تھی اور اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ سائنٹفک طریقۂ تاریخ نگاری کی جڑیں ہمیں دور عربیہ میں ملتی ہیں۔

دور نہضت دنیا کی تاریخ میں بڑا مہتم بالشان زمانہ ہے اُس وقت ہر چیز کو ٹھوک بجا کر دیکھا جا رہا

تھا۔ ہر شعبہ کی جانچ پڑتال ہو رہی تھی، اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جس کے اوپر تنقید و تنقیح کے اثرات نے کام نہ کیا ہو۔ اس زمانہ کے رومی و یونانی علم و ادب اور تاریخ قدیم کے ماہروں نے تاریخی مواد کو تولنا، پرکھنا چاہا لیکن چونکہ اس وقت قدما کی تقلید کا زور تھا۔ اس لئے مورخین افلاطون اور سسرو کے کھینچے ہوئے دائروں ہی میں گردش کرتے رہے۔ تاریخ ادب العالیہ کا ایک جزو بن گئی، متقدمین کی کتابوں کے ساتھ ساتھ اس کی بھی ضمنی تعلیم ہوتی تھی لیکن چونکہ مقصد ادبی و لسانی تھا اس لئے اس نے ہمارے تاریخی شعور کو پوری طرح بیدار نہیں کیا۔ تاریخ کو "غیر مذہبی" بنانے کا کام میکاولی (اطالوی مفکر) نے شروع کیا اور اٹھارویں صدی میں گبن، والٹیر، ہیوم اور رابرٹسن وغیرہ نے اسے پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا۔

مذہبی اصلاح کے زمانہ میں تاریخ میں سائنٹفک تحقیق کا اضافہ ہوا۔ یہ زمانہ شدید تحقیقی مباحثوں اور مناظروں کا تھا اس لئے تاریخی معلومات کی دریافت و تلاش بھی ممکن ہو سکی۔ اٹھارویں صدی میں ہیگل نے تاریخ سے مذہبیات کو بالکل خارج کر دیا۔ اور اس اصول پر زور دیا کہ فطرت کا ہر تغیر تدریجی ہوتا ہے نہ یک بیک اور بے سلسلہ۔ اس طرح گویا ہیگل نے تاریخ میں "قانون تسلسل" کی ابتدا کی اور موجودہ تاریخی تصور کا سنگِ بنیاد رکھا۔

انیسویں صدی سے سائنس کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس وقت علوم جدیدہ کو فروغ حاصل ہو رہا تھا ان سب نے تاریخ اور فن تاریخ نگاری پر بڑا اثر ڈالا۔ سائنس نے تفتیش و تجسس، احتساب و تنقیح کے جس جذبہ کو ابھارا تھا اس نے صدیوں کے الجھے ہوئے روابط علت و معلول کی عقدہ کشائی کی اور ہمیں تاریخ کے جدید ترین تصور سے قریب تر کر دیا۔ اب تاریخ کا معیار یہ ہو گیا کہ مواد گذشتہ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اس سے محض عہد متعلقہ ہی کی ایک صحیح تصویر ہمارے سامنے نہ آجائے بلکہ عہد موجودہ کے بھی سمجھنے میں امداد حاصل ہو۔ تاریخ کے قانون تسلسل کا یہی اقتضا ہے کہ ہم ماضی کے ذریعہ حال کو سمجھنے کے اہل ہو جائیں:

تاریخ میں ارتقاء اور تسلسل کا خیال کوئی نیا نہیں ہے۔ یہ چیز قدما کے بھی پیش نظر تھی لیکن

علوم جدیدہ نے اس کو ایک خاص شکل اور فن تاریخ نگاری میں اس کو سب سے ممتاز درجہ عطا فرمایا۔ ارتقاً کا نتیجہ تدریج اور تسلسل ہے اور تسلسل کا نتیجہ وحدت، اور تمام اجزائے تاریخی کا ربط و اتحاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کو ہم انسانی ارتقاء کی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ اب تاریخ نویس کا فرض یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کسی قوم کی تاریخ نے موجودہ دور کی خلاقی اور تہذیب حاضرہ کے بنانے میں کس حد تک مدد دی ہے۔ ارتقائی زنجیر کی یہ متواتر و مسلسل کڑیاں ہم کو اُن انکشافات سے قریب کر دیتی ہیں جن پر آئندہ تقدیرات کا انحصار ہے۔ ماضی نے حال کو پیدا کیا ہے اور ماضی و حال مستقبل کو پیدا کریں گے۔ اس لئے علم التاریخ کے ذریعہ ہم حالات موجودہ کی صحیح واقفیت اور مستقبل کا اشاراتی اندازہ کر سکتے ہیں اور یہ ہماری زندگیوں کے سدھارنے اور کامیاب بنانے کے لئے بیحد ضروری ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ ہمیں اقدام و عمل کے لئے سندیں اور نمونے فراہم کرتی ہے کہ ہم انھیں خطوط پر اپنی زندگیوں کو چلانے لگیں تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی اس کا ہر واقعہ ایک خاص نوعیت کا حامل ہے۔ وہ حالات جنھوں نے ایک واقعہ کی تخلیق کی ہے وہ ہر واقعہ کے ساتھ مشترک نہیں ہیں اس لئے تعمیم نہیں کیجا سکتی اور چند واقعات کی بنا پر کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ مہاتما بدھ کے اسباب کامیابی سے لیوتھر فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا اور نہ ولنگٹن کے فوجی انتظامات جنرل فرانکو کے لئے مفید ہو سکتے تھے۔ ہٹلر نپولین نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح بابر اور نپلین کے اسباب فتحیابی دوبارہ کبھی نہیں پیدا ہو سکتے۔ انقلاب فرانس ہمیشہ انقلاب فرانس ہی رہے گا۔ اس لئے کہ ہر تاریخی واقعہ اپنی جگہ بے مثال اور مخصوص نوعیت کا مظہر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں بکل نے جب تاریخ کو سائنس بنانا چاہا تو وہ کامیاب نہ ہو سکا اسی طرح ڈریپر کا خواب بھی شرمندہ عمل نہ ہو سکا اور وہ نفسی و طبعی قواعد و ضوابط دریافت نہ ہو سکے جو افعال انسانی کے ذمہ دار ہیں تاریخ کبھی طبعیات کی طرح سائنس نہیں بن سکتی۔ وہ تمام علوم جدیدہ سے امداد لیتی ہے لیکن اُن کی پابند نہیں ہو سکتی نتائج اور شہادتوں کی تحقیق و تنقیح کے لئے تاریخ علوم مروجہ سے کسب ضیا کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی متاع گرانمایہ کو کبھی ان علوم کے سپرد نہیں کر دیا

۔ اسی طرح تاریخ کا پرتو ہر ہر علم میں جلوہ گر ہے لیکن یہ "نور مستعار" انھیں تاریخ کا درجہ نہیں دلوا سکتا۔

گذشتہ اسی برس کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تاریخ نویسی کا طریقہ سائنٹفک ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس کے "قانون تسلسل" کو سائنس اور فلسفہ کے اصولوں سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تاریخ میں تنقید و تبصرہ کی گنجائشیں نکالی گئی ہیں۔ ذاتی عصبیت کو خارج کر کے اسے زیادہ سے زیادہ واقعی اور معروضی بنانے کی سعی کی جا رہی ہے دیانتداری اس کا اصل اصول قرار پایا ہے۔ موجودہ تاریخی تصور کی بنیادیں قوت آخذہ، تنقید معنوی۔ جامعیت اور کمال اجتہاد پر قائم ہیں بعض اوقات تو محض ممکنات کا موازنہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے اور کوئی نتیجہ مستنبط نہیں کیا جاتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مواد گذشتہ کو اس طرح حسن ترتیب سے جلوہ گر کیا جاتا ہے کہ ماضی کے آئینہ میں حال و مستقبل کا خاکہ نظر آجائے واقعات موثر کی تفصیل چھوٹنے نہ پائے۔ اور امور غیر موثر سے بحث نہ ہو۔ یہ کام جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ پتھروں کے بے پناہ انبار سے جواہر ریزوں کو منتخب کرنا آسان نہیں ہے لیکن یہ سب کچھ ہمیں صحیح علم اور معقول زندگی کی خاطر کرنا ہے۔ زندگی ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کا نام ہے۔ اور یہ اس وقت تک کامیاب نہیں کہلائی جا سکتی جب تک کہ فرد اور ماحول میں مناسب تعلقات نہ ہوں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ فرد حالات موجودہ اور وراثت ماضیہ سے پوری طرح باخبر ہو۔ تاریخ بنی نوع انسان کا "حافظہ" اور اس کے تجربات کا خلاصہ ہے۔ انسان جتنا اس سے فائدہ اٹھائے گا اتنا ہی اپنی آئندہ زندگی کو کامیاب بنا سکے گا اس لئے ضرورت ہے کہ ہر تاریخی واقعہ کو ارتقا کی ایک کڑی سمجھا جائے اور تاریخی مواد کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ تہذیب انسانی کے خط و خال ہمارے سامنے آ جائیں۔ ہم اپنی زندگی کو ایک بڑے کل کا جزو سمجھیں اور اپنی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ یہ مقصد جو تاریخ کے تصور جدید نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے نہایت ارفع و بلند ہے۔ اس لئے کہ ہم اس کے ذریعہ مستقبل کی شاندار تعمیر کر سکتے ہیں اور حیات نفسی کی بھی رونق بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

(خواجہ احمد صاحب فاروقی بی۔ اے)

بہار کی گمنامی کا اصلی سبب

صوبہ بہار اطراف دلی کی طرح اُردو کا مولد تو نہیں ہے مگر اطراف لکھنؤ (صوبہ اودھ) کی طرح اس کا قدیم مسکن ہے یوں تو دلی کی تباہی کے بعد مقامی امرا، اور روسا کی سرپرستی اور علم دوستی کی وجہ سے علم وادب کے بہت سے مرکز قائم ہو گئے تھے۔ مگر اودھ میں لکھنؤ اور بہار میں عظیم آباد پٹنہ نے اس وقت دیگر مرکزوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی۔ دلی کے بعد اُردو کے نامی گرامی شاعر اور ادیب بیشتر ان ہی دو شہروں کی خاک سے اٹھے۔ گو حسب مقدور جس نے جو ڈھونڈا ویران دہلی سے اپنا مقسوم پا کے اسی پر اس نے ناز کیا مگر دلی نے خاص طور سے ان دو شہروں پر اپنے تمام خزانوں کے منہ کھول دئے دونوں نے اپنی بساط بھر کسب فیض کیا۔ لکھنؤ نے تو گویا دلی کو اپنے قالب میں سمو لیا۔ مگر عظیم آباد پٹنہ بوجوہ چند اتنا متمتع نہ ہو سکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب لکھنؤ ہر طرح مالا مال ہو گیا اور اپنے تمام خزانوں کو اس نے معمور دیکھا تو ببانگ دہل بغاوت کا اعلان کیا اور مدِ مقابل بن کر دلی کی طرح اہل زبان کہلانے کا مدعی ہوا۔ اور اس کی ٹکسال کے سکے بے چون وچرا پچھم سے پورب تک رائج ہو گئے۔

عظیم آباد پٹنہ بھی دلی کے گنج بے پایاں سے فیض یاب ہوا مگر اسی حد تک کہ یہ زباندان کہلانے کے رتبہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے زبان دانوں اور ماہرین فن کا غلغلہ تو یہاں سے وہاں تک بلند ہوا مگر اس کی زبان پایۂ استناد کو نہ پہونچ سکی[1]۔ اس نے اسی پر اکتفا کیا اور جب یہ شہر اردو علم وادب کا تیسرا مرکز تسلیم کر لیا گیا تو اس نے اپنا روئے سخن دلی اور لکھنؤ کے سوا ہندوستان کے کسی شہر کی طرف نہ کیا۔ ان ہی دو شہروں کی

---

[1] اس موقع پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ارباب عظیم آباد میں ایسے افراد بھی ہیں جنھیں یہ تسلیم نہیں۔ خصوصاً قدیم خاندانوں کے بزرگوار کسی کی تقلید نہیں کرتے بلکہ اپنے ہی گھرانے کی زبان کو مستند سمجھتے ہیں۔ نواب خیال مرحوم نے "تزک خیال" (مطبوعہ رسالہ جادو ڈھاکہ) میں اور جناب شاد مرحوم ومغفور نے۔ اپنی کتاب "فکر بلیغ" میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے (م۔ احمد)

تحسین اور سکوت کو قابل اعتنا سمجھا۔ لکھنؤ کی طرح اس نے دلی سے بغاوت تو کبھی نہیں کی مگر لکھنؤ کو ہمیشہ رشک و رقابت سے دیکھا کیا بات یہ ہے کہ قدامت کے اعتبار سے عظیم آباد پٹنہ کی مرکزیت دیگر شہروں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ جب شمالی ہند میں اردو شعر و شاعری کسر شان سمجھی جاتی تھی اور اہل علم فارسی کو اپنی شاعری کی جولانگاہ سمجھتے تھے۔ اس وقت اس شہر نے فارسی کے عظیم المرتبت شاعر اور ادیب پیدا کئے۔ پھر اردو میں بھی یہاں جس وقت راسخ عظیم آبادی اور جوشش عظیم آبادی وغیرہ شاعری کے جوہر دکھا رہے تھے اس وقت درد، میر، مصحفی اور میر حسن جیسے اہل کمال دلی ہی کی محفل ادب کے چراغ تھے۔ یہی تمام سرمایہ روایات لکھنؤ سے رشک و رقابت کا سبب تھا، مگر لکھنؤ نے گھٹنوں اور پاؤں پاؤں چلنے کے بجائے پیدا ہوتے ہی بولنے اور صاف بولنے کا معجزہ دکھلا کے زمانے کو حیرت میں ڈالدیا تھا۔ اس لئے عظیم آباد پٹنہ نے بھی اس کے اس اعجاز کے آگے سپر ڈالدی۔

یہ سب کچھ سہی مگر آیئے دیکھیں کہ مورخین اردو کی موجود تحقیقات صوبہ بہار اور خاص عظیم آباد کے متعلق کیا ہیں۔ اردو زبان و ادب کی چھوٹی بڑی متعدد تاریخیں اب تک لکھی جا چکی ہیں۔ میں صرف تاریخ ادب اردو" (مؤلفہ جناب رام بابو سکسینہ و مترجمہ جناب مرزا عسکری لکھنوی) کو لیتا ہوں صوبہ بہار اور عظیم آباد کی خدمات ادب کے متعلق فاضل مورخ کی جو تحقیقات ہیں ذیل میں درج کئے دیتا ہوں (عظیم آباد "مہاراجہ شتاب رائے جو اس زمانے میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے شاعروں کے قدردان اور خود بھی شاعر کیا کرتے تھے۔ ان کے بیٹے جو راجہ تخلص کرتے تھے۔ میر ضیاء الدین ضیا معاصر سودا کے شاگرد تھے کہ وہ لکھنؤ کے بعد عظیم آباد چلے گئے تھے۔ اسی طرح اشرف علی خاں فغاں بھی مہاراجہ موصوف کے دربار میں پہونچ گئے تھے اور ان کی مہاراجہ بہت قدر کرتے تھے۔ میر باقر حزیں شاگرد مرزا مظہر جان جاناں نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامن دولت سے وابستہ تھے اور وہیں انتقال کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہار میں شعرائے دہلی کی بڑی قدر تھی اور شعر و سخن کا چرچا یہاں خوب تھا)

بہار کی خدمات زبان و ادب کے تفصیلی مطالعہ کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہونچتے ہیں اس کے

پیش نظر فاضل مورخ کی تحقیقات میں کوتاہی اور تشنگی نظر آتی ہے۔ آب حیات (مولفہ جناب مولانا محمد حسین آزاد دہلوی) کی لغزشیں اس لئے درگذر کی جاتی ہیں کہ وہ اپنی نوع کا پہلا تذکرہ تھا اس زمانہ میں معلومات کے ذرائع کم تھے اور کتابوں کی فراہمی دشوار تھی مگر اس زمانے میں جبکہ پہلے کے مقابلے میں کچھ آسانیاں ہوگئی ہیں ایسی باتیں یقینی قابل توجہ ہوں گی۔ خدمات بہار کا جہاں تک تعلق ہے اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو "آب حیات" اور "تاریخ ادب اردو" دونوں ایک ہی منزل میں معلوم ہوتی ہیں۔ باوجودیکہ موخر الذکر کتاب بہت بعد کو لکھی گئی ہے اس پر بھی کچھ فرق یا اضافہ نظر نہیں آتا جس طرح مولف آب حیات نے دہلی کے اکثر شعرا، کو عظیم آباد پہونچا کے چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح اس فرض کو مولف تاریخ ادب اردو نے بھی سرانجام دیا ہے۔ اسی لئے یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یو، پی، پنجاب اور دکن کی خدمات زبان کے معلوم کرنے کے لئے تو یہ پر از معلومات کتاب ہے اور اسے ضرور پڑھنا چاہئے۔ مگر خدمات بہار کے نقطۂ نگاہ سے اس کتاب کا مطالعہ مفید نہیں معلوم ہوتا۔ نہ صرف یہاں کی ادبی اور علمی تحریکوں کے ذکر سے اس کے اوراق خالی ہیں بلکہ جن چند نامور شعرا اور ادبا کا اس میں ذکر ہے ان کو بھی مرتبہ کے مطابق مناسب جگہ نہیں ملی ہے۔ مگر چونکہ تاریخ زبان و ادب کی یہ آخری کتاب نہیں ہے بلکہ بعضوں کو کو اس کا اختصار گراں بھی گذرا ہے۔ اس لئے اس امر کا اظہار بے محل نہیں معلوم ہوتا کہ کم از کم ایسی کتابیں جو مجموعی حیثیت سے اردو کے تمام مرکزوں سے تعلق رکھتی ہوں ان میں تحقیقات کا یہ معیار نہیں ہونا چاہئے جس طرح دکن، مدراس، گجرات اور پنجاب کے اردو کارنامے ہمارے سر آنکھوں پر ہیں اور ان کا ذکر ہمارے لئے حوصلہ افزا ہے اسی طرح بہار اور عظیم آباد کی ادبی اور علمی کاوشوں اور کوششوں کا علم بہی خواہاں اردو کے لئے تقویت کا باعث ہوگا۔ صرف اسی خیال سے اس قابل قدر کتاب (تاریخ ادب اردو) پر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے

آج صوبہ بہار اور اس کے صدر مقام عظیم آباد (پٹنہ) کے متعلق ارباب اردو کو جو کچھ واقفیت ہے وہ آپ کو معلوم ہوگیا اور صورت حال سے آپ مطمئن نہیں ہوئے بلکہ کسی قدر مایوسی ہوئی پچاس ساٹھ سال پیچھے پوٹ کے دیکھنا چاہئے کہ اس وقت اس علمی اور ادبی مرکز کے کارناموں کا زمانہ کو اعتراف تھا یا آج کی طرح اس عہد میں بھی ہ

ان محنتوں پہ بھی یہ مرا ہو رہا تھا حال — لڑکوں کی تھی سند پہ ہیں غیر مستند

شاد عظیم آبادی

کا عالم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلی کی قید سے لکھنؤ تازہ تازہ رہا ہوا تھا۔ رات دن کی زور آزمائیوں کے بعد پاؤں کی بیڑیاں کٹ تو گئیں تھیں مگر ایام اسیری کے کچھ داغ ہنوز موجود تھے۔ بغاوت کا اعلان تو ہوتا تھا مگر مصلحت دیکھ کے کبھی دبی زبان سے اور موقع پا کے کبھی کھل کر اس کا اظہار ہوتا تھا۔ دلی، لکھنؤ کے اس فعل کو اپنی شان میں گستاخ آمیز حرکت سمجھتی اور اس کو فرق مراتب کی طرف تنبہ کرتی۔ مگر آخری داؤ بھی لکھنؤ کو معلوم ہو چکا تھا۔ اس لئے دلی کی ایک بھی پیش نہ گئی۔ اور جو جوا لکھنؤ اتار چکا تھا پھر اسے چڑھا نہ سکی۔ یہی زمانہ تھا جب عظیم آباد اور اس کے مضافات کے اہل علم لکھنؤ کی اس قدر و منزلت کو دیکھکر رشک کرتے تھے اور دلی کے طرفداروں کی صفوں میں نظر آتے تھے۔ چونکہ یہ موضوع سے ہٹی ہوئی بحث ہے اس لئے اس کو یہیں چھوڑتا ہوں۔ اسی زمانے میں اخباروں میں ایک بحث چھڑ گئی تھی۔ مولانا آزاد دہلوی کی کتاب آب حیات پر صاحب مہتمم دلگداز نے ,,ہمارا لٹریچر،، کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں آب حیات کی کوتاہیوں کا ذکر تھا اور صاحب آب حیات پر لکھنؤ کے مٹانے کا الزام عائد کیا گیا تھا اور اسی سلسلہ تحریر میں انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا۔

,,دہلی والوں کو لکھنؤ کا احسان ماننا چاہئے تھا جو ہونہار بچہ ان کے شہر میں پیدا ہوا تھا اس کی وہ ذرا تربیت نہ کر سکتے تھے لکھنؤ کے روسا اور بادشاہوں نے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا اور پوری ترقی دلا دی بخلاف اس کے اکثر دیکھا گیا ہے کہ حضرات دہلی اپنی تحریروں اور کارسازیوں کے ذریعہ سے لکھنؤ پر حملہ کر جاتے ہیں اگرچہ لکھنؤ کے شعرا جو ہمارے سرمایہ ناز ہیں ان کو ان رکیک حملوں کی ذرا پروا نہیں ہوتی،،

اس کا جواب مولوی محمد خاں تپش نے اپنے اخبار ,,مشیر قیصر،، لکھنؤ ۵ فروری ۱۸۹۰ء میں ,,اردوئے معلیٰ کا مالک کون ہے؟،، کے عنوان سے دیا تھا میں اس کا ایک حصہ پیش کرتا ہوں:۔

,,اے حضرات! اس ترقی اور اس گنگا جمنی زبان سے تو کاش لکھنؤ ترقی نہ کرتا تو بہتر تھا۔ یہ ترقی اس کے حق میں عین تنزل ہے۔ کیا معنی کہ اور صوبجات ہند میں جو اردو بولی جاتی ہے وہ سب دہلی کے نام لیوا ہیں اور وقتاً فوقتاً تازہ تازہ محاورات اور ترقیات زبان کے فائدے اٹھاتے رہتے ہیں۔ بخلاف لکھنؤ کے کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ چن کے خود ترقیات زبان یعنی خاص الخاص اردوئے معلیٰ سے محروم رہا۔ اگر کہئے کہ لکھنؤ کا بھی تو نام بڑا ہے۔ بیشک انیس وغیرہ یہاں کے اتنے بڑے شاعر گذرے ہیں کہ جن کا جواب نہیں

مگر درحقیقت یہ فخر دہلی کو ہونا چاہئے نہ کہ لکھنؤ کو۔ کیونکہ انیسؔ میر حسن دہلوی کی اولاد سے ہیں، ورنہ جبتک اس خاندان کی زبان اہل لکھنؤ سے اکثر محفوظ رہی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ لکھنؤ کے بعض شاعر اور بھی اچھے نہیں گزرے نہیں اچھے اور بہت اچھے مگر وہ فن کے اعتبار سے اچھے سمجھے جائیں گے اور کسی قدر زبان کے اعتبار سے بھی نہ اہل زبان ہونے کے اعتبار سے۔ اے حضرات! کسی زبان کی نظم و نثر میں اعلیٰ درجہ کا مذاق پیدا کرلینا اور بات ہے اور اہل زبان ہونا اور بات۔ پس لکھنؤ پر کیا منحصر ہے ہندوستان کے ہر شہر میں ایک دو شاعر نامور گذرے ہیں مگر سب مقلد رہے۔ مراد آباد میں زکی مراد آبادی اور مرشد آباد و بنگلہ وغیرہ میں اخترؔ اور انشاؔ وغیرہ کیا کم تھے۔ اردو پر کیا منحصر ہے ہند کے شعرا فارسی گو مثل خسروؔ، بیدلؔ، فیضیؔ، غالبؔ وغیرہ بہت سے شعرائے ایران سے کہیں بڑھ کر گذرے ہیں مگر اہل زبان نہ ہونے سے مقلد کہلائے۔ انھوں نے اہل زبان ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا پس کوئی وجہ نہیں کہ لکھنؤ خلاف اہل دہلی کے خود مجتہد و مطلق العنان ہو جائے بلکہ مثل اور صدہا مقامات ہند کے دہلی ہی کا مقلد اس کو بھی رہنا چاہئے۔ دعوی بے معنی سے کچھ حاصل نہیں گو وہ اپنے آپ کو کتنی ہی دور کھینچے مگر سمجھنے والے خوب سمجھتے ہیں اور خوب قہقہے لگاتے ہیں۔ اگر اجتہاد زبان کا حق پہونچتا تو میرٹھ وغیرہ بعض آس پاس کے شہروں کو پہونچتا جو دہلی سے بہت نزدیک ہیں مگر درحالیکہ زبان کا کوچہ ایسا ٹیڑھا ہے کہ عرب سرائے مغل پورہ بلکہ پہاڑ گنج تک کے باشندوں نے کبھی ایسی بیہودہ بات زبان سے نہیں نکالی جو شہر پناہ کے زیر سایہ رہتے ہیں تو کسی غیر ملک والے کو کیونکر حق زبان پہونچ سکتا ہے۔ صرف شعرائے دہلی کے لکھنؤ آجانے اور نوکر ہو جانے سے اگر ایسا ہے تو رام پور، حیدرآباد، بھوپال اور وغیرہ کو سب سے پہلے اجتہاد کا قصد مناسب ہے۔ بلکہ میرے نزدیک پٹنہ سب سے زیادہ اس دعویٰ کا مستحق ہے۔ جہاں صدہا شاعر محقق و کامل آج کل لکھنؤ اور دہلی دونوں سے زیادہ موجود ہیں اور خوش گو بھی انتہا کے ہیں۔"

اس اقتباس سے ایک ہلکا سا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے کہ پچاس برس ادھر عظیم آباد (پٹنہ) کی اہل ادب میں کیا اہمیت اور وقعت تھی۔ اس زمانے میں اس شہر کی زبان دانی کا طوطی سارے ہندوستان میں بول رہا تھا۔ یہی زمانہ تھا کہ جب علامہ شوقؔ نیموی، مولانا فوقؔ شاگرد شوقؔ، جناب سید حبیب جناب اعد اللہ

اور دیگر اہل قلم نے اپنا اور اپنے شہر کی زباندانی کا وہاں ملک سے منوالیا تھا اور سارا زمانہ ان کو تسلیم کرتا تھا۔ عہد ماضی اور زمانہ حال کی صورتوں کو سامنے رکھیے تو حالات میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ کہاں اسلاف کے علم و فضل کا وہ شہرہ اور کہاں اخلاف کی یہ کس مپرسی کہ محفل ادب میں ان کے وجود تک کا یقین نہیں۔ ان کی نیک نامیوں میں اضافہ تو کیا ہوتا ان نیک ناموں کو اخلاف کی غفلت نے پردۂ گمنامی کے اندر ڈال دیا۔ درحقیقت موجودہ صورت حال دوسروں کی کوتاہیوں اور سہل پسندیوں سے زیادہ خود اپنی غفلت جمود اور تعطل کا نتیجہ ہے

تمام اہل اُردو دھن کے پکے نہ سہی کسی حد تک غافل ہی سہی گر پھر ہر جگہ بے خبروں اور مدہوشوں میں اہل ہوش بھی نظر آتے ہیں۔ تقریباً اردو کے تمام مرکزوں کی انجمنیں قائم ہیں۔ ادارے زندہ ہیں، رسالے نکل رہے ہیں، اخبارات نکل رہے ہیں اور حوصلے والے بڑھ بڑھ کے کام کر رہے ہیں۔ مگر ذرا بہار اور عظیم آباد کے دعویٰ داروں کا جوش و خروش اور ان کی سرگرمیاں ملاحظہ کیجیے۔ تو بعض باقیات صالحات کے متعلق معلوم ہوگا کہ آپ کو اپنی "کہنہ مشقی" پر ناز ہے اور دور حاضر کے "جہل" سے بیزار ہیں۔ بعض نازک خیال گوشہ نشیں منھ پھیر کے فرمائیں گے ؎ مشتاق تماشا آنکھ نہیں کیا خاک دکھائیں جوہر ہم۔ بعض طبیعت داروں کی بارگاہ میں حاضری دیجیے تو "رسالہ بازی" کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سرے سے اس سرے تک دیکھ جائیے ایک غفلت اور جمود کا عالم ہے۔ نہ انجمنیں ہیں نہ ادارے نہ اعلیٰ رسالے ہیں نہ عمدہ اخبارات۔ پورے صوبہ میں ہیں ان چار یا پانچ اداروں کی خبر ہے معلوم نہیں اس وقت ان میں کون زندہ ہے اور کون سدھار چکا (خدا مغفرت کرے)

انجمن ترقی اُردو پٹنہ (شاخ مرکزی انجمن ترقی اردو دہلی) ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کے کرتا دھرتا جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ہیں بیرسٹر صاحب بحیثیت محقق زبان کے اہل اردو میں کافی شہرت رکھتے ہیں شاید اسی انجمن کے ذریعہ "کلام شاد" کی طباعت ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد معیار نام کا رسالہ قاضی صاحب کی ادارت میں نکلا تھا شاید اسی انجمن کا آرگن ہو۔ پھر بعد میں شاید بند ہو گیا۔ قاضی صاحب نے رسالہ "اردو" اورنگ آباد کے ذریعہ جوشش عظیم آبادی کے کلام کے شائع کرنے کا اعلان کیا تھا کہ یہ ۱۹۳۰ء میں شائقین کے ہاتھوں میں ہوگا۔ معلوم نہیں یہ کام سرانجام ہوسکا یا رہ گیا۔ ہم کو اس ادارہ کے

کارناموں کے متعلق دور رہنے کے سبب سے بس اتنا ہی معلوم ہے۔ مرکزی انجمن ترقی اردو دہلی کے کارنامو کو دیکھتے ہوئے اس انجمن سے بھی بہت سی توقعات رکھنا بے جا نہیں ہے۔

طاق بستان، آرہ | یہ ادارہ جناب مولانا عبدالمالک صاحب آروی نے قائم کیا ہے۔ جناب عبدالمالک صاحب کی ذات گرامی اہل ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ نے اس ادارہ کے سلسلہ مطبوعات کے متعلق اعلان شائع فرمایا تھا (۱) اقبال کی شاعری (۲) خواب کی دنیا۔ شائع ہو چکی ہیں (۳) الہامات شاد (۴) نیا زمانہ زیر طبع ہیں کسی رسالہ میں ان کتابوں پر ریویو پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک یہ کتابیں شائع نہ ہو سکیں۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ انجمن ہنوز زندہ ہے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں سرگرم ہے خدا کرے یہ ادارہ اپنی کارگذاریوں کے ذریعہ اہل علم میں اعتبار کی نظر سے دیکھا جائے۔

انجمن طلبائے قدیم ندوہ صوبہ بہار پٹنہ | اس ادارہ کی خیر حال میں اخباروں کے ذریعہ معلوم ہوئی تھی۔ بڑی خوشی ہوئی کہ کام کرنے والوں کی ایک جماعت کام کرنے کے لئے آمادہ ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس کی ایک کانفرنس غالباً پھلواری شریف جیسے مقدس مقام میں ہوئی۔ اور ایک رسالہ غالباً "ندوی" نام کا نکالنے کی تجویز بھی منظور ہوئی۔ مسرت ہوئی تھی کہ ایک سنجیدہ علمی رسالہ کا اضافہ ہوگا۔ مگر معلوم نہیں اس راہ میں کیا کیا دشوار گھاٹیاں آئیں کہ پورے کا پورا قافلہ مدتوں سے نظروں سے اوجھل ہے۔ حالانکہ ان ندوی حضرات پر پورے صوبہ کو ناز ہے کہ ان فاضل بزرگوں کے ذریعہ صرف بہار ہی کی علمی خدمت نہیں ہو رہی ہے بلکہ ہندوستان کے دوسرے باوقار ادارے بھی ان کی علمی ادبی خدمتوں کے رہین منت ہیں۔ خدا کرے یہ پھر اکٹھے ہوں اور کسی ادارے کی بنیاد ڈالیں۔ جو کالج اور یونیورسٹی والوں سے نہ ہو سکا یہ کر دکھائیں۔

دادارہ ندیم گیا | یوں تو جناب انجم صاحب گیاوی کا نام صوبہ کی ادبی تاریخ مرتب کرتے وقت خارزار گفتگو میں لکھا جائے گا مگر جب سے ان کے جاری کئے ہوئے رسالہ ندیم کی ادارت جناب مولانا سید ریاست علی ندوی جیسے فاضل اور ریختہ کار اہل علم کے ہاتھوں آئی ہے اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ چنانچہ رکنیت دوامی کے ذریعہ ایک ادارے کی بنیاد ڈالدی گئی ہے اور اس کے

ذریعہ کئی دلچسپ کتابوں کے شائع کرنے کا اعلان بھی ہو چکا ہے۔ خدا کرے یہ ادارہ پھولے پھلے۔
اور اس کے ذریعہ صوبہ کی علمی نمائندگی ہو سکے۔

رسالہ سہیل گیا ہرچند رسالہ سہیل گیا کے پیش نظر کسی ادارہ کے قیام کا تخیل نہیں ہے پھر بھی اس کی کوشش
صوبہ بہار میں ادبی زندگی پیدا کرنے میں محرک ثابت ہو رہی ہیں اس لئے یہ بھی قابل ستائش ہے
اس کے بعض پچھلے نمبروں میں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کے تعلقات اپنے شہر کے ہم مقصد رسالہ
سے اچھے نہیں ہیں، ندیم، زندگی کے مراحل طے کرنے میں کافی نشیب و فراز کا مقابلہ کرنے کے بعد
اس قابل ہوا ہے کہ آج اس کی آواز صوبہ کی آواز ہے اور جس کی رسائی ملک کے مقتدر اداروں
اور سنجیدہ مذاق اصحاب تک ہوئی ہے۔ ضرورت ہے کہ جس کے ذریعہ ایک اہم کام انجام پا رہا ہو
اس کو کمزور نہ کیا جائے۔ یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے جانب داری نہیں بلکہ بر بنائے خلوص و محبت ہے
امید ہے کہ رسالہ سہیل (جس کی ترقی کا میں خواہاں ہوں) کے موقر ارباب ادارہ اس کو ایسا ہی سمجھیں گے۔

اول تو ادارے نہیں جو ہیں ان کے کارنامے پیش کر دئے گئے۔ ان اداروں کا ذکر ارباب ادارہ کو
خوش کرنے یا ایک دوسرے کی پیٹھ ٹھونکنے کی نیت سے نہیں کیا گیا ہے درحقیقت ان کو قائم اور مستحکم کرکے
ان سے بڑے بڑے کام لینے ہیں جو انفرادی کوششوں سے کبھی سرانجام نہیں پا سکتے۔

اہل اردو اس بات کے معلوم کرنے کے لئے مشتاق ہیں کہ پچھاں کی رہنے والی اردو نے جب قلعہ معلے
سے بے سر و سامانی میں باہر قدم نکالے تو پورب آنے کے بعد اس کے چہرے مہرے اور رنگ روغن پر کیا اثر
پڑا اور اس کی کیا گت بنی اس کے معلوم کرنے کے لئے تاریخ ماضی کے اوراق کو الٹنا ہوگا تاکہ معلوم ہو سکے کہ اردو
نے یہاں کون کون سے اور کہاں کہاں نقوش چھوڑے ہیں۔ ابتدا سے لے کر آج تک اس کو ارتقاء کی کیا کیا
منزلیں طے کرنی پڑی ہیں۔ کہاں کہاں اس کا چہرہ بگڑا پھر کیسے کیسے اس کی مانگ پٹی سنواری گئی۔ یہ اسی وقت
معلوم ہو سکتا ہے کہ زمانہ قدیم کے تمام اردو کارنامے قدیم دکنی نسخوں کے طرز پر چھاپ دئے جائیں۔ مگر طباعت سے
پہلے ان نسخوں کی فراہمی کا سوال سامنے آتا ہے۔ تو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ بایں ہمہ تعطل صوبہ کے بعض
محققین اس قسم کے نسخوں اور کارناموں کا کھوج لگا رہے ہیں۔ ممکن ہے بعض حضرات پہلے سے بھی اس قسم کی

دلچسپی رکھتے ہوں مگر جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اس سلسلے میں جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی مدظلہ ہی نے اپنے بزرگوں کے ایک قدیم مخطوطہ کا ذکر چھیڑ کے اس کی طرح ڈالی جس وجہ سے محققین کا رجحان اس طرف ہوا اور اُن چھپے اور ڈھکے ہوئے نسخوں کے متعلق بیش قیمت معلومات بہم پہونچیں خصوصاً جناب اختر ابدالی صاحب کا مضمون "اردو نثر کی ارتقا میں ارباب بہار کا حصہ" (ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء) قیمتی معلومات کا حامل تھا۔ جناب معروف کی تحریر سے معلوم ہوا کہ بہت سے قدیم نسخے ان کی نظر سے گذر چکے ہیں جو خانقاہوں میں محفوظ ہیں (خدا اپنے حفظ و اماں میں رکھے) پھر صدہا شعرا ہیں جن کا کلام اپنے عہد کی زبان کا نمونہ ہے۔ نام سنے ہیں مگر کلام دیکھنے میں نہیں آیا۔ تذکرے ہیں کہ بحث طلب مسئلے بنے ہوئے ہیں کہ یا تو چھپے ہی نہیں یا چھپے تو اب معدوم ہیں یا پھر یہاں نہیں لندن کی لائبریریوں میں ہیں۔ پھر جناب مختار الدین صاحب آرزو نے پتہ لگایا کہ وہ بعض بہاری اہل ذوق کے پاس موجود ہیں۔ ایسی باتیں پایۂ تحقیق کو جب پہونچیں گی کہ ان کا صحیح صحیح علم ہو جائے تاکہ کوئی فیصلہ قطعی کیا جا سکے۔ جب یہ تمام قدیم نسخے جو کہیں مطبوعہ ہیں کہیں قلمی ہیں۔ کہیں کرم خوردہ منتشر ہیں اور کہیں بزرگوں کے تبرک کی حیثیت سے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی (اداروں کے ذریعہ) کوشش کے ذریعہ دستیاب ہو جائیں گے۔ تو پھر ان کی طباعت کا کام ان اداروں کے ذمہ ہوگا۔ اگر زیادہ غفلت اور بے اعتنائی برتی جائے گی اور ان کے شائع کرنے کا کام شروع نہ کیا گیا تو آج جس طرح بہت سے نسخے تلف ہو چکے ہیں اسی طرح یہ رہے سہے نسخے بھی نایاب ہو جائیں گے۔ ان مراحل کے طے کر لینے کے بعد کہیں ایسی کتاب مرتب ہو سکے گی جس میں پورب میں سرگذشت اردو کا پورا پورا بیان ہوگا۔ درحقیقت بہار میں سرگذشت اردو کے مرتب کرنے کا وقت وہی ہوگا اور اس سے پہلے جو کتاب بھی مرتب کی جائے گی موجودہ معیار تحقیق سے فروتر ہوگی اور اس کو ان ہی کتابوں کے ڈھیر میں رکھ دیا جائے گا۔ جس میں چند شعرا کا ذکر اور ان کے کچھ پھڑکتے ہوئے شعر (یا دردانگیز نالے) ہدیتاً درج کر دئے جاتے ہیں۔ ایسی کتاب کے شائع کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ کوئی صاحب ذوق ان ہی نسخوں میں سے کسی ایک کو مرتب کرنے کے لئے منتخب کر لیں کیونکہ یہ کوشش پھر بھی اس کار آمد اور طویل زنجیر کی ایک مفید اور مضبوط کڑی ثابت ہوگی۔ جیسا کہ ابھی حال میں جناب پروفیسر سید حسن عسکری صاحب نقوی نے بہار کی ایک قدیم مثنوی "گوہر جوہری" کو مرتب کرنے

کا وعدہ رسالہ "اردو" دہلی (اپریل ۱۹۴۰ء) میں فرمایا ہے۔ اسی طرح جناب حمید عظیم آبادی نے میخانۂ الہام" (دیوان شاد عظیم آبادی) مرتب کرکے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور اب ندیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء کے ذریعہ انتخاب کلام راسخ عظیم آبادی کے شائع کرنے کا قابل خیر مقدم اعلان کیا ہے۔ ایسے اہل علم کے ایک دو اور بھی نام یاد ہیں جن کے وعدوں کے ایفا کے لوگ منتظر ہیں۔ مثلاً جناب عبدالباقی صاحب نے "تازہ بہار نمبر ۴۲ء میں ایک قدیم کتاب "شیر اللہ" کے شائع کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ یا ہمارے عزیز محترم محب گرامی جناب پروفیسر سید منظر الحق صاحب دسنوی جنھوں نے اعلان تو نہیں کیا ہے مگر خطوں کے ذریعہ آگاہ کیا تھا کہ ان کی تحقیقات کا موضوع "بہار کی مثنویاں" ہے۔ آج کل چونکہ اپنے تمام نیازمندوں سے خفا ہیں اس لئے معلوم نہ ہو سکا کہ اس راہ میں کس منزل تک ان کے قدم پہونچے۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ عظیم آباد کے کسی شاعر کے کلام میں خارجیت پائی جائے تو اس کو لکھنؤ اسکول کا پیرو بتانا یا اگر داخلیت کا غلبہ ہو تو اس کو دہلی اسکول کا مقلد سمجھنا مولانا عبدالمالک صاحب آروی کی تحقیق کے مطابق صحیح نہیں۔ ان کی تحریر[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظیم آباد اسکول کی انفرادیت کے قائل ہیں اور اس موضوع پر شاید کام بھی کر رہے ہوں۔ یہ ایک دلچسپ بحث ہے عظیم آباد اسکول کی خصوصیات شاعری پر اسی وقت مکمل بحث ہو سکتی ہے۔ جب یہاں کے شعرا کا کلام سامنے ہو۔ اس لحاظ سے بھی ان نسخوں کی جستجو لازم آتی ہے۔

بہار کا مشہور اخبار الپنچ بانکی پور ۱۸۸۵ء ایک عمدہ اخبار تھا۔ اس وقت کے تمام بہاری ادبا اور شعرا اس کی بزم میں شریک تھے۔ اودھ پنچ کو لکھنؤ اور اس کے اطراف میں جس وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ الپنچ بانکی پور کو بھی اطراف بہار میں وہی اہمیت حاصل تھی ضرورت ہے کہ "گلدستہ پنچ" انتخاب اودھ پنچ کی طرح اس کا بھی ایک انتخاب شائع کیا جائے۔ ان کے خاص نامہ نگاروں کے مختصر سوانح حیات اور ان کی خصوصیات تحریر پر بحث کی جائے۔ ان بزرگوں کی نتھری ستھری ڈھلی ہوئی زبان اور ان کی مفید اور کار آمد بحثیں موجودہ نوجوان ادبا کے لئے درس کا کام دے سکتی ہیں۔ پھر ان کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوگا

---

[1] دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری" (نگار جون ۱۹۳۸ء) از عبدالمالک صاحب آروی۔

کہ ٹھیٹھ بہاری الفاظ اور محاورے کہاں تک اردو میں داخل ہو گئے تھے۔ ارباب اودھ کی تحریروں میں مقامی الفاظ کافی موجود ہیں جن سے اطراف دہلی کے اہل قلم پہلے بھڑکتے تھے مگر یہ بعد میں مقبول ہو گئے۔ اسی طرح یہاں کے ذخیرۂ الفاظ بھی اگر سامنے آجائیں تو ان کے رواج اور ترک پر غور کیا جا سکے گا۔ غرض سرگرمی عمل دکھلانے کے لئے میدان کا میدان سامنے ہے صرف کمر ہمت باندھ کے طیار ہونے کی ضرورت ہے۔ ورنہ یوں اپنی ،،خاموش سنجیدہ علمی خدمت،، کا راگ آپ الاپتے رہنا۔ کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔

بہر حال اوپر کی سطروں میں جس کام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی کوششوں کا محتاج ہے اور اس کے لئے کسی نہ کسی ادارے کے قیام اور اس کے استحکام کی فکر کرنی ہی پڑے گی۔ اسی کے ذریعہ یہ آرزو پوری ہوگی۔ ایسی کوششیں اہل اردو کے لئے خدمات بہار کے معلوم کرنے کے لئے صحیح اور قابل اعتبار ماخذ ثابت ہوں گی اور پھر وہ داغ گمنامی جو اس کی پیشانی پر لگا ہوا ہے مٹ سکے گا۔

آخر میں ایک بات عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے صوبہ کے کسی ادبی گروہ سے کسی طرح کا تعلق نہیں۔ جس شخص یا جس ادارے کے متعلق میری جو کچھ معلومات ہیں اُن ہی کی روشنی میں میں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے ہو سکتا ہے کہ کسی خدمت گذار ادارہ کی اس میں حق تلفی ہو گئی ہو تو امید ہے کہ اسے محض میری لاعلمی سمجھ کے قابل معافی سمجھا جائے گا۔

(شاہ مقبول احمد صاحب ایم۔ اے)

غزلیں

سکوت ناز ہے تصویر جوش بیانیِ حسن
رہے گی یاد محبت کو بے زبانیِ حسن

سلوک دوست وفا و جفا کی چیز نہیں
سمجھ سکی نہ محبت بھی مہربانیِ حسن

بس ایک درد کا اٹھتا ہے اور چمک جانا
وہی شباب محبت وہی جوانیِ حسن

رشدہ شدہ یہ خبر اہل دل تک آئی ہے
کہ کچھ اداس سی رہتی ہے شادمانیِ حسن

نشاطِ عشق بھی عکس جمال ہے تیرا
یہ کامرانیِ دل بھی ہے کامرانیِ حسن

کسی کا عذر خطا اس طرح قبول نہ ہو
کہاں گئی وہ محبت ہے سرگرانیِ حسن

کیا ہے کام تبسم سے ستو تکلم کا
عجیب رنگ سے تھی آج گلفشانیِ حسن

یہ کامیاب نظر اور تبسم دوست
کہ کھل کے بھی نہ کھلے عشق پر معانیِ حسن

صدائے ساز انا البحر ہے کہ طوفاں ہے
یہ جزر و مد محبت یہ بیکرانیِ حسن

ز فرق تا بقدم سوز و ساز کا عالم
یہ کس کے غم کی ہے تصویر شادمانیِ حسن

نوید آمد مہماں ہے ہر در و دیوار
فراقؔ تجھ کو مبارک یہ مہربانیِ حسن

(فراقؔ گورکھپوری)

جب محبت کا ذکر آتا ہے
دل مایوس کانپ جاتا ہے

اس کو مجھ سے حجاب کیا معنی
جرأت شوق آزماتا ہے

ہائے وہ عہد وصل کی راتیں
چاند میری ہنسی اڑاتا ہے

تم کو مجھ سے کبھی محبت تھی
یہ تصور ہی کھائے جاتا ہے

دل خانہ خراب اے اخگرؔ
دیکھئے اور کیا دکھاتا ہے

(حبیب اخگرؔ دہلوی)

سنا ہے ایک جہاں اس جہاں سے پہلے تھا — عجب جہاں تھا اگر آسماں سے پہلے تھا

اگرچہ سجدے ہیں ممنون آستاں لیکن — مذاق سجدہ مجھے آستاں سے پہلے تھا

تمہیں کہو کبھی تم نے سنا تھا خوش ہو کر — تمہارا ذکر جو میرے بیاں سے پہلے تھا

قبول خاطر عشاق ہو کے رہ نہ گیا — ترا فسانہ مری داستاں سے پہلے تھا

نہ شوق رہزنیٔ دل، نہ ذوق غارت جاں — عجب طریق مرے کارواں سے پہلے تھا

بہار تھی نہ خزاں، برق تھی نہ تھا صیاد — چمن نہ تھا جو مرے آشیاں سے پہلے تھا

اسی جہان کو انکار تھا قیامت کا — یہی جہان جو اک نوجواں سے پہلے تھا

کچھ اس طرح ہے مجھے درد عشق کا احساس — یہ جیسے مجھ کو یونہی جسم و جاں سے پہلے تھا

وہ ناز بن کے پھر آخر نیاز ہو کے رہا — انھیں غرور جو میری فغاں سے پہلے تھا

زہے وہ بزم کہ ہوتا ہے رو رہ یہ محسوس — کہ جیسے کوئی تعلق یہاں سے پہلے تھا

ہنوز دل میں اسی شد و مد سے ہے بسملؔ
وہ حوصلہ جو مجھے امتحاں سے پہلے تھا

(بسمل سعیدی ہاشمی)

کیوں ہم سے کہا جاتا ہے تقدیر کا غم کیا — یہ چال زمانے کی سمجھتے نہیں ہم کیا؟

آزادیٔ افکار سے بھی جو ہوئی محروم — سچ یہ ہے کہ اس قوم نے جینے کا بھرم کیا؟

بیداد زمانے کو مٹانے جو اٹھے ہیں — وہ خود بھی اٹھائیں گے زمانے کے ستم کیا؟

دل پر مجھے اک نقش مچلنے کا یقیں ہے — ثابت نہ ہوا اس سے ترا نقش قدم کیا؟

کعبے میں ہے پتھر کی پرستش ابھی موجود — ہو سکتا ہے ورنہ سبب طوف حرم کیا؟

سائل کوئی طامع بھی اسے صاحب الطاف — اتنے پہ بدل جاتا ہے انداز کرم کیا؟

زندہ ہے ابھی زیبؔ عجب راز ہے ورنہ
اک کافر نعمت کی سزا موت سے کم کیا؟

(زیب عثمانیہ لودھیانوی)

تنقید و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے

گناہ کا خوف:۔ مؤلفہ چودھری محمد علی ردولوی، نیا سنسار لکھنؤ، قیمت ۱۲/ صفحات ۱۴۹، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

یہ چودھری محمد علی صاحب ردولوی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ چودھری صاحب ردولی کے تعلقدار ہیں لیکن رہتے زیادہ تر لکھنؤ میں ہیں۔ لکھنے والے تو پرانے ہیں، "صلاح کار" ان کی ایک مستقل تصنیف ہے، اودھ پنچ میں بھی ان کے مضامین چھپتے رہے لیکن اب نیا رنگ اختیار کیا ہے جو کافی مقبول ہو گیا ہے کچھ تو اس لئے کہ چودھری صاحب اب کڑھ گئے ہیں۔ کچھ اس لئے کہ اب لوگوں میں پہلا جیسا کٹر مولوی پن نہیں رہا ہے۔

چودھری صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی نظر زندگی کے جزوی حصوں پر نہیں پڑتی بلکہ زندگی کو بہ تمامتر دیکھتے ہیں اور جس جزوی حصے کو بیان کرنا چاہتے ہیں اس کو گرد و پیش کے حالات اور اس کا گذشتہ سے ربط اتنا واضح اور گہرا دکھاتے ہیں کہ اگر یہ جزوی حصہ سماج کے اقدار کے لحاظ سے لائق ملامت ہو تو ماحول اور گذشتہ کے بندھنوں کے نتیجہ کے طور پر وہ حرکت بے اختیاری لائق ملامت نہیں معلوم ہوتی بلکہ معلوم ہوتا ہے یہ عمل مجبوراً ظہور پذیر ہوا انسان اسباب کا غلام نظر آتا ہے اس لئے بے قصور ہے۔ اس قسم کا فلسفیانہ مطالعہ چودھری صاحب کے افسانوں میں اکثر و بیشتر نظر آتا ہے۔ حالانکہ معلوم ہوتا ہے یہ چیز وہ دانستہ نہیں کرتے بلکہ بوجہ اپنی داستان گوئی کے ان سے سرزد ہو جاتی ہے۔ امیری کی بو، گناہ کا خوف، تیسری جنس، میں یہ بات واضح طور پر نمایاں ہے۔ یہ ان کے طرز کا کمال ہے۔

چودھری صاحب کا طرز ایک داستان گو کا طرز ہے جن لوگوں کو چودھری صاحب سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کو اس کا کس قدر ملکہ ہے اور انھیں دوسروں کو خوش کرنے کے کیسے کیسے گر یاد ہیں۔ ان کے افسانے تقریباً تمام تر ان کے برتے یا دیکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں

اور یہ بھی ان کی خوبیٔ نگارش پر دال ہے موصوف کی زندگی بھی ایسی ہے کہ اگر وہ اپنا روزنامچہ ہی لکھا کریں تو ہر روز کی داستان افسانہ نظر آئے۔ اس لحاظ سے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کاش وہ لکھنے کی طرف زیادہ مائل ہو جائیں تو اردو ادب بڑے فائدے میں رہے گا۔ اور اب اس عمر میں ان کو اس طرف مائل بھی ہونا چاہیئے۔

چودھری صاحب کی نظر بہت تیز ہے حالانکہ بہت گہری نہیں۔ خاتمے اکثر امید کے موافق زوردار نہیں ہوتے "آنکھوں کی زبان"، "آنکھوں کی سوئیاں"، "امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات"، دلچسپ خاکے ہیں جس خلوص کے ساتھ انھوں نے نیچے طبقے کی زندگی کی تصویریں کھینچی ہیں اگر اسی طرح اس اونچے طبقے کی بھی افسانے پیش کریں جس میں وہ زندگی گذارتے ہیں تو مجھے امید ہے اس میں بھی وہ کم کامیاب نہیں ہونگے اور اگر وہ افسانوں کے بجائے سال بھر میں ایک ناول لکھدیا کریں تو مجھے امید ہے کہ سب سے زیادہ کامیابی ان کو اسی میں ہوگی۔

چودھری صاحب کا فن داستان گوئی بہت پر لطف ہے۔ ان کے افسانے ہمیں ہماری اپنی زندگی کی سچی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں نہ اس میں مغربی فن افسانہ نگاری کی چالیں ہیں نہ ان کے افراد میکانکی قسم کے انسان۔ یہ ہمارے مشرق کے سچے نمونے ہیں اور ان کا بیان اس طرح ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی ہماری توجہ کو زبردستی کھینچنا چاہتا ہے بلکہ ہم خود اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں یہی داستان گوئی کا کمال ہے۔ بہ لحاظ زبان لکھنؤ اور اس کے گرد و پیش کے مشہور قصبوں کی زبان ہے۔ آج کل لکھنوی زبان کے نمونے خواجہ عشرت مرحوم کی وفات کے بعد اگر ہم کسی میں دیکھ سکتے ہیں۔ تو وہ چودھری صاحب ہیں۔ ممکن ہے اودھ کی یہ زبان باہر کے لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ تلفظ ضرور غلط ہو جائے گا اس لئے ایسے الفاظ پر اعراب ضرور لگا دینا چاہیئے تھا۔

عاصمہ: مصنفہ مولوی ابو المظفر موید الدین۔ صفحات ۱۹۶ کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۱۲/
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن،

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ ناول لکھی گئی ہے کہ ملک کے مسلمان دہقانوں اور کاشتکاروں کی کیفیت، عمال دیہی کی حالت، زمینداروں اور ساہوکاروں کا عمل، دیہی انتظامات طبی، پروردہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت، تعلیم نسواں، قومی انجمنوں کا انتظام، دار الیتامیٰ کی ضرورت، محبت اولاد کے حقیقی معنیٰ، پروردہ لڑکیوں کا درجہ، کنیز کا غلط مفہوم، مطلقہ اور بیوہ کا مرتبہ، امیروں کی ڈیوڑھیوں کی حالت، سلیقہ مند اور بدسلیقہ گھروں کا موازنہ، کرایہ کی گاڑیوں کی کیفیت تعلیم و تربیت، شادی، برات، جہیز وغیرہ کا حال پیش کیا جائے۔ جو اپنی جگہ مستحسن ہے۔ لیکن ناول نگار کے سامنے یہ مقصد اس قدر زیادہ رہا ہے کہ کتاب محض ان حالتوں کی ایک اچھی فہرست ہو کر رہ گئی ہے۔ ناول پن نہیں آنے پایا۔ نذیر احمد کے ناولوں کی طرح پلاٹ کی ایک کمزور ڈور میں واقعات و اصلاحات کے گٹھر باندھ دیے گئے ہیں۔ ناول لکھنے کے بھی ڈھنگ ہوا کرتے ہیں، یہ کتاب اس سے معرا ہے۔ البتہ جن حضرات کو مندرجہ بالا حالات کا اچھا نقشہ دیکھنا ہو اور حیدر آباد کی ساجی کمزوریوں کو سمجھنا ہو۔ ان کے لئے یہ کتاب بہت کار آمد ہو گی۔

اسلام زندہ باد:۔ مرتبہ جناب عبدالمجید صاحب قریشی، سائز $\frac{20+30}{16}$ ضخامت ۲۰۸ صفحات کاغذ طباعت عمدہ، قیمت عہ، ملنے کا پتہ:۔ منیجر سیرت کمیٹی، پٹی ضلع لاہور،

مرکزی سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور گذشتہ بارہ ۱۲ سال سے خاموش طور پر علمی تبلیغی کام کر رہی ہے اور ہر سال سستے قسم کا اعلیٰ اصلاحی لٹریچر شائع کرتی رہتی ہے امسال کی شائع شدہ کتابوں میں زیر نظر تالیف "اسلام زندہ باد" ہے۔

مرتب نے یہ مجموعہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کے مقصد تبلیغ اسلام کے پیش نظر ان کی تحریک کے دس سال بعد شائع کیا ہے جو دو ابواب میں تقسیم ہے۔ باب اول میں بہ تحت عنوان "اسلام کی شان" بارہ نومسلم حضرات کے ان تاثرات کو قلمبند کیا گیا ہے جن کے باعث ان اصحاب نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ ان میں سے بعض حضرات قبول اسلام کے بعد اسلام کے زبردست مبلغ ثابت ہوئے۔ ابتدائی چار واقعات داؤد داؔلبن مرحوم ایڈیٹر "مسلم آؤٹ لک" لاہور، لیڈی بارلنس، ایک ہندو جج کی بیوہ اور ایک ہندو

کے قبول اسلام کے واقعات بالترتیب "حضرت علامہ مرحوم کے بیان کردہ ہیں۔ اسی سلسلہ مضامین میں جناب خالد لطیف گابا کی وہ تقریر بھی درج ہے۔ جو موصوف نے قبول اسلام کے بعد شاہی مسجد لاہور میں کی تھی جس میں ممدوح نے مختصراً اپنے قبول اسلام کی حسب ذیل چار وجہ بیان کی ہیں (۱) اسلام کی سادگی اور ہدایت (۲) اسلام کی جمہوریت اور مساوات (۳) اخوت اسلامی (۴) اسلام دور حاضر کی ضروریات کے عین مطابق ہے۔

باب دوم میں "مسلمانوں کی شان" کے تحت پندرہ مضمون درج ہیں جن میں پیغمبر اعظم کے عنوان کے تحت آنحضرت صلعم کی حیات مبارکہ دی گئی ہے بعد میں بالترتیب حضرت علیؓ کے سبق آموز منتخب حالات، حضرت عمر بن عزیزؒ کی سوانح عمری، ایک چینی وزیر سید عمر اجلؒ کے حالات، سلطان صلاح الدین ایوبی، گیلی پولی کے ہیرو مصطفےٰ کمال اور غازی انور بے کے کارنامے وغیرہ درج ہیں۔ جن کے ذریعہ صحیح اسلامی تعلیم پیش کی گئی ہے۔ تاکہ دنیا سمجھ سکے کہ مذہب اسلام، امن پسند، امن دوستی، سادگی، تعلیم مساوات اور شرافت نفس میں آپ اپنی نظیر ہے اور اس کے ماننے والوں کی قومی خصوصیات، سیاسی تدبر، بہادرانہ کارنامے۔ کمزوروں اور مظلوموں کی دستگیری اور محافظت ہے اور اسلام دنیا کی غلامی کو آزادی میں بدل دینے کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

اس طرح اس مجموعہ مضامین کو تبلیغ اشاعت کا کارآمد ذریعہ بنایا گیا ہے اور یہ کتاب موجودہ دور میں نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوگی، اگر سیرت کمیٹی دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کا بھی مختلف زبانوں میں ترجمہ کرا کے شائع کرے تو زیادہ انسب ہوگا (ہادی نقشبندی)

روح اسلام یا جیل و اذان :۔ مولفہ جناب مولوی سید حسن آرزو صاحب سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۴۲ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ و دیدہ زیب قیمت ۸ر۔ پتہ سید حسن آرزو صاحب پھلواری شریف ضلع پٹنہ

مؤلف نے اس مختصر رسالہ میں، اسلامی تعلیمات، ارکان، اخلاقیات اور فلسفہ عبادت نیز اس مسئلہ کو جو کہ عام طور پر غیر دلچسپ اور خشک سمجھا جاتا ہے۔ مصنف نے اپنے خاص طرز نگارش سے

دلچسپ بنا دیا ہے، گو بعض جگہ مصنف سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں جو غالباً نظر ثانی میں دور ہو جائیں گی۔ بہرطور آج کل کے مذہب سے ناواقف نوجوان طبقہ کے لئے یہ کتاب ہر طرح مفید ہے۔ (ہادی نقشبندی)

دستور الاصلاح :- مصنفہ جناب سیاب اکبر آبادی۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ قیمت ۸ صفحات ۴۴ چھوٹا سائز

زیر نظر کتاب میں سیاب صاحب اکبر آبادی نے متقدمین، متاخرین اور موجودہ اساتذہ کی اصلاحات کے مختصر نمونے مختلف کتابوں سے جمع کئے ہیں۔ شروع میں اصلاح زبان، اپنی اصلاح، اصلاح خیال، مجلسی اور اجتماعی اصلاح نیز اصلاح لینے و دینے کے طریقوں پر بھی مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سیاب صاحب آگرہ میں جو کچھ اردو زبان اور فن شعر کی خدمت کر رہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں اور نہ کسی کو اس سے انکار ہو سکتا ہے لیکن اب آپ کی تصانیف میں جیسی کہ زیر نظر کتاب ہے انانیت اور ذاتی پروپاگنڈے کی قسم کی چیز پیدا ہو چلی ہے۔ اگر اس نظر سے قطع نظر کر کے یہ مختصر کتاب دیکھی جائے تو اپنے موضوع کا اچھا احاطہ ہے۔

نئے مسائل :- مرتبہ و مترجمہ جناب محمد مرغوب الدین صاحب بی۔ اے بی ٹی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۱۲ صفحات کاغذ و طباعت عمدہ قیمت ۸ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن

زیر نظر کتاب ایک انگریزی کتاب "آوٹ لائنز آف ماڈرن فالج فار بوائز، گرلز اینڈ پیرنٹس" کے ایک مستقل باب کا ترجمہ ہے۔ اس میں چند اچھے اخلاقی قسم کے مضامین ہیں جو موجودہ دنیا کی بے راہ روی ظلم اور مصائب سے بچنے کے لئے مشہور مفکرین کے خیالات کے مطابق ترتیب دئے گئے ہیں اور لڑکوں اور جوانوں کو ان کے اجتماعی اور ذاتی فرائض بتائے گئے ہیں مثلاً تمہیں کس طرح کی دنیا مطلوب ہے؟ انسانی نسل کی بہتری کی تدبیریں کیا ہیں؟ دنیا کی نسبت ہمارے محسوسات کیا ہونے چاہئیں، وغیرہ ترجمہ اچھا ہے لیکن کچھ اور آسان ہوتا تو بہتر ہوتا۔ بہرحال مفید مضامین نوجوان طلباء کو ضرور پڑھنا چاہئے۔

یادگار نصیر:- مرتبہ ظہیر الدین احمد صاحب علوی۔ شروانی بکڈپو، شروانی پریس علی گڈھ قیمت غیر مجلد عہ، مجلد عہ صفحات ۱۲۴، سائز

یہ مجموعہ انتخاب کلام نصیر الدین صاحب علوی مرحوم منصف علی گڈھ کا ہے۔ رشید احمد صاحب صدیقی، جگر مراد آبادی کے تعارف نامے بھی شامل ہیں۔ مرحوم علی گڈھ کے بڑے معروف لوگوں میں سے تھے اور بہ حیثیت انسان بڑی اعلی صفتوں کے مالک تھے۔ شعر و شاعری سے کافی شغف تھا اور ان کا مکان اکثر بزم مشاعرہ بنا رہتا تھا احسن مارہری مرحوم اور جگر مراد آبادی وغیرہ ان کے دوستوں میں سے تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

روئے جاناں نقاب کیا جانے — شمع روشن حجاب کیا جانے
تیری زلفیں سکھائے دیتی ہیں — ورنہ دل پیچ و تاب کیا جانے
عفو و عصیاں میں کیا توازن ہے — محتسب یہ حساب کیا جانے
میری ہستی ہے کامیاب الم — عیش ناکامیاب کیا جانے

دل نہیں کیا ہو پاسداری دل — بیدلی اب ہے یادگاری دل
آپ لے جائیے مگر یہ غلط — آپ اور پھر نگاہداری دل
بن گیا جوشش اضطراب سکوں — اللہ اللہ پردہ داری دل

رسالے:-

مجلہ عثمانیہ:- جلد ۱۲، شمارہ سوم و چہارم قیمت عا ر صفحات ۲۸۰

عثمانیہ یونیورسٹی کا زیر نظر مجلہ اس کا مدیر نمبر ہے جس میں تمام گذشتہ مدیروں کے مضامین ملک عبدالعلی خاں مدیر مجلہ نے بڑی کاوش سے فراہم کئے ہیں۔ اس میں اکثر مضامین بہت اچھے اور قابل مطالعہ ہیں: عہد سلطان العلوم سے قبل کا آصفی ادب، میں وہ شعرا اور ادیب جو دربار آصفیہ

سے وابستہ رہے ان کی فہرست اچھی دی گئی ہے۔ نادار، ایک ڈرامائی نظم یا غنائی ڈرامہ ہے۔
جو بہت خوب ہے۔ اس کے علاوہ، ہندی تھیٹر، پریس اور مملکت، جدید روسی تھیٹر، شیخ چاند مرحوم
کا مطبوعہ مضمون، زبان کی تشکیل و توضیح و اشاعت و ترویج میں سودا کی کارگزاری، مسئلہ طلاق، ہندو سماج
میں عورت کی حیثیت، ترقی نسواں میں تعلیمیافتہ جماعت بہت اچھے مطالعے ہیں۔ عبدالعلی صاحب
اس نمبر کی کامیابی پر قابل مبارکباد ہیں۔

مجلہ عثمانیہ، جلد ۱۳، شمارہ ۱ و ۲، صفحات ۲۹۰ قیمت۔

یہ نمبر احمد خاں صاحب بی۔ اے اعثمانیہ کی زیر ادارت مرتب ہوا ہے۔ ادبی مقالوں میں اندر سبھا
سے پہلے، اور سنسکرت شاعری میں محبت کا عنصر، معاشیاتی مضامین میں، منڈی میر عالم، موضع پہل ماڑی
کی معاشی تحقیق، قابل قدر مضامین ہیں۔

مندرجہ بالا ہر دو رسالے دفتر مجلہ عثمانیہ، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے مل سکتے ہیں۔ چندہ
سالانہ عام طور سے ت ر روپے ہے لیکن ویسے بہت سے درجے ہیں جو خط لکھکر معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا، مترجمہ محمد عبدالمقیت صاحب نیموی صفحات ۱۰۰ قیمت فی نمبر ۸ر، چندہ سالانہ
ئے ر، ناشر جدید پریس بیگم پور، پٹنہ سٹی۔

مشہور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جو مستشرقین نے ابھی حال ہی میں ہالینڈ سے انگریزی، جرمنی
اور فرانسیسی تینوں زبانوں میں شائع کی تھی۔ اب عربی میں ماہوار قسط کے طور پر مصر سے شائع ہونا
شروع ہوئی ہے۔ عبدالمقیت صاحب نے یہ بڑا مفید کام اپنے ذمے لیا ہے کہ اس کا اردو ترجمہ
ہر دو ماہ کے فصل سے کرنا شروع کر دیا ہے۔ زیر نظر اس کی پہلی قسط ہے۔ نیموی صاحب نے ترجمہ کے
ساتھ اس میں کچھ اضافے بھی کر دیئے ہیں جو بہت مفید بات ہے۔ بہتر یہ ہو کہ اس معاملہ میں ملک کے
دیگر مستند عالموں سے بھی مشورہ لیتے رہیں تاکہ یہ کام اور بھی بہتر ہو سکے
دعا ہے کہ ایسی مفید اور کارآمد چیز سے اردو جلد مالا مال ہو جائے۔ نیموی صاحب اس ہمت

پر لائق مبارکباد ہیں۔

شاہین:۔ مدیر مضطر نعانی ایم۔اے، زیر نگرانی رشید احمد صاحب صدیقی صفحات ۸۸ چندہ سالانہ عہ؍ روپے۔ پتہ بالائے قلعہ علی گڈھ

یہ ایک سہ ماہی علمی ادبی رسالہ علی گڑھ سے نکلنا شروع ہوا ہے، شاعری میں خرافات، سلطنت اودھ کی ابتدا اور شعر وشاعری کی محفل کا قیام، ہم اور وہ، وغیرہ اچھے مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ کاغذ، طباعت وکتابت عمدہ ہے۔ اس ارزاں اور اچھے پرچے کی طرف امید ہے لوگ زیادہ سے زیادہ توجہ کریں گے۔

معاصر:۔ زیر ادارت عظیم الدین احمد صاحب۔ چندہ سالانہ للعہ؍ فی پرچہ ۶؍ صفحات ۷۰، پتہ نیا سنسار کتاب گھر، بانکی پور، پٹنہ، کاغذ، طباعت وکتابت عمدہ۔

یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جو نومبر سے جاری ہوا ہے۔ نمونہ مضامین یہ ہے۔ اردو تنقید پر ایک نظر، میر تقی میر کی شاعری پر ایک نظر، کلام فغان، ٹی۔ ای لورنس، زبان کی تاریخ، دیوان ہمایوں بادشاہ وغیرہ۔ بہار سے ضرورت ہے زیادہ سے زیادہ پرچے نکلیں اور نکلتے رہیں۔ امید ہے یہ رسالہ بھی وہاں کے دیگر مشہور رسائل میں جلد اپنی جگہ بنا لے گا۔

کتب موصولہ جن پر آئندہ مہینے تبصرہ ہوگا

۱۔ سریلے بول:۔ مجموعہ کلام عظمت اللہ صاحب مرحوم

۲۔ اقبال اور قرآن:۔

۳۔ رحمت عالم:۔

۴۔ ہندو مسلم اتحاد کی تدابیر:۔ ایک مختصر کتابچہ، مصنفہ منشی رام پرشاد ماتھر بی۔ اے، علیگ، قیمت ۱؍ ۱۶۔ سروجنی دیبی لین۔ لکھنؤ۔

(اپنی اصلاح)

مسلمان اور شعروشاعری

شاعری پیٹ بھرے کا سودا ہے اور ایک ذہنی تعیش ایک کو اپنا ذہن تعیش میں رکھنے کا کب مجاز ہے۔ جب اس کے افراد فاقے کر رہے ہوں اور جب اس کی بنیادیں بیخ و بن سے متزلزل ہو رہی ہوں اور متزلزل کی جا رہی ہوں۔ تعیش کا حق اسی وقت ہوتا ہے اور اس کا موقع اسی وقت جائز ہے۔ جب اپنی بنیادیں مضبوط کر لی گئی ہوں۔ دشمنوں سے پناہ اور امن ہو اور پھر اس تعیش میں بھی اسی قدر پڑنے کی ضرورت ہے جس سے ہمارے قویٰ تازہ ہو سکیں، مفلوج نہیں۔ بدقسمتی سے ہماری ہندی مسلمانوں کی قوم میں جس میں شاعری اس کے بادشاہوں اور نوابوں کے طفیل بنسے رچی اور پروان چڑھی تمام مسلمانوں میں اتنی جاری و ساری ہو گئی کہ ایک طرف تو ان کی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو کمزور کر دیا۔ دوسری طرف، ایسا نشہ چڑھایا کہ جس نے ان کی آنکھیں بند کر دیں اور ایسی بند کیں جو اب تک باوجود دشمنوں کی کامیابیوں کے پوری طرح نہیں کھل سکی ہیں۔

شاعری زندگی اور حقیقت سے گریز کا نام ہے۔ ہم شخصی یا قومی طور سے جب زندگی سے بھاگتے ہیں تو فسق و فجور، مے نوشی اور شاہد پرستی کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ فرانس کی قوم کی مثال سامنے ہے۔ یہ حالت تو عوام کی ہوتی ہے خواص شاعری اور موسیقی کی طرف پڑ جاتے ہیں۔ ہوتی گریز وہ بھی ہے۔ اگر ایک جسمانی ہوتی ہے تو دوسری ذہنی۔ مسلمانوں کی ابتری اور زبوں حالی بہت کچھ اسی ذہنی اور مادی تعیش کی وجہ سے ہے خلفائے عباسیہ کے زمانے سے لے کر ہندوستان کے سلاطین مغلیہ، ترکی کے خلفا۔ ایران کے شاہوں غرضکہ ہر جگہ اسی گریز کے مظاہرے ہوئے۔ عوام الناس نے سلاطین سے سبق لیا چنانچہ وہ بھی اسی قسم کی ذہنی اور جسمانی کاہلیوں میں مبتلا ہو گئے اور ابھی تک مبتلا ہیں۔

شاعری فائدہ اسی وقت کرتی ہے جب زندگی کی ممارست اور ان میں حد سے زیادہ انہماک ہمارے قویٰ اور ذہن کو خشک اور میکانکی بنا دے۔ شاعری اس وقت ان میں لطافت اور لچک پیدا

کر دیتی ہے لیکن زندگی سے بھاگ کر شاعری کرنے میں، یا بنجر زندگی میں حد سے زیادہ ممارست کے شاعری میں پڑ جانے سے کسی طرح فائدہ نہیں۔ یہ شخص اور قوم دونوں کے قوائے ذہنی کو دنیا کے سنجیدہ کاموں کے لائق نہیں رکھتا۔ انھیں بس لذت کی تلاش ہوتی رہتی ہے۔ یہ لذت کوشی بدقسمتی اور قومی انحطاط کی علامت ہے۔

ہندو ایران کی سرسبز وادیوں کا برا ہو جنھوں نے مسلمان قوم کو عیش پرست بنا دیا وہ یہاں کے نغمہ و رنگ میں ایسے پھنس گئے کہ آگے بڑھنا تو درکنار انھیں اپنے یہاں کے قیام و بقا کی فکر نہیں رہی، ہر آنے والی مصیبت کو دفتر بے معنی کہہ کر غرقِ مے ناب کر کے اسے بھول جانے کی کوشش کرنا یہ ہے تعیش کی حد جب پیٹ بھرا ہوتا ہے تو انسان کی روح آسودہ ہو جاتی ہے اور روح کی آسودگی ترقی کے لئے سم قاتل ہے۔ روح تو کسی حال میں اور کبھی آسودہ ہی نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ قومی ترقی کی خاطر مواقع تراشنے چاہئیں کہ کسی طرح روح کو آسودہ نہ کیا جائے۔ افسوس مسلمانوں کے ساتھ یہی نہیں ہوا۔ وہ سیلابی دریاؤں کی شان سے اُٹھے اور ہند و عجم کے مرغزاروں میں آسودہ ہو کر رہ گئے۔ کاش یہ ذہنی آسودگی یہ روحانی طمانیت انھیں نہ حاصل ہوتی تو صرف ہند و ایران ان کی سرحدیں ہو کر نہ رہ جاتیں۔

ہمارے ہند کا مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کس قدر ادبیات اور شعر و شاعری کا دلدادہ ہے شعرا کی کس قدر عزت، توقیر اور آؤ بھگت کرتے ہیں۔ کیسے کیسے انھیں سر پر چڑھاتے ہیں یہ باتیں بظاہر بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں کہ ہماری قوم ہمارے ادیبوں اور ہمارے شاعروں کی عزت افزائی اور ہمت افزائی کر رہی ہے۔ ہاں واقعی یہ بات بظاہر بڑی اچھی ہے لیکن ذرا اندر کی طرف بھی دیکھئے تعیش شعری کا حق ہمیں اس وقت پہونچتا ہے۔ جب ہم میں قوت ہو استحکام ہو اور ہم اپنی بقا کی طرف سے مطمئن ہو گئے ہوں۔ ہم نے محنت و مشقت کر کے تکلیفیں اٹھا کے جد و جہد کر کے اپنی بقا و استحکام کے لئے اتنا کچھ کما لیا ہو کہ ہم اس میں سے تھوڑا سا تفریح طبع کے لئے خرچ کر سکیں اور وہ بھی اس لئے خرچ کر سکیں تاکہ ہمارے ذہن اور ہمارے قویٰ دوسرے دن کی محنت و مشقت کے لئے تر و تازہ

ہو جائیں تفریح کا افادی پہلو بھی محض اسی قدر ہے کہ آئندہ کی مشقت کے لئے پھر سے چستی پیدا کی جا سکے لیکن تفریح میں بقدر قلیل پڑنا تو درکنار خود تفریح کو مقصد زندگی بنا لیا گیا ہے۔ یہ سمجھنا تو الگ رہا کہ تفریح کا حق محنت کے بعد ہوتا ہے۔ ہم نے تفریح ہی کو محنت کے معنوں میں سمجھ لیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم صرف خرچ ہی کرنے پر تلے ہیں۔ جمع کچھ نہیں کرتے۔ ایسی قومیں یقیناً فنا کے دروازے اپنے آگے کھول رہی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہماری ہندی مسلمانوں کی قوم ان میں سے ایک ہے۔

ہماری شاعری پیداوار ہی ہے ایک انحطاطی دور کی، اورنگ زیب کے بعد ہم دہلی کی سڑکوں پر مغلیہ افواج کی نقل و حرکت کے ہنگامے اتنے نہیں دیکھتے جتنے قوالوں اور شاعروں کی نغمہ سرائیوں کے چرچے، محفلوں اور مشاعروں کے غلغلے۔ نادر شاہ پنجاب تک آ جاتا ہے لیکن محمد شاہ کو راگ راگنیوں سے کہاں فرصت، دکن بنگال اودھ سب خود مختار ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن بزم کے سرور میں رزم کی ہرزہ گردیاں کیا معنی رکھتی ہیں شاعر مصاحب ہیں اور مصاحب شعرا اور آخر کار یہ شاہ ہند محض شاہ اقلیم سخن اور تاجدار قلمرو معانی رہ جاتا ہے۔

آج کل ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا اگر کچھ فرض ہونا چاہیئے تو ہم میں قوت، خود اعتمادی اور آگے بڑھنے کے جذبات مشتعل کرانے کی کوشش کریں۔ ہماری ذلیل حالت کا ہم کو احساس کرائیں اور پھر آگے بڑھنے کی صورتیں اور ان پر عمل کیلئے اکسائیں۔ آج کل تو ان کی خدمت یہی ہونی چاہئے۔ عشق و محبت کی داستانیں ہمارے پاس اتنی کافی ہیں کہ آئندہ بھی کام دے سکتی ہیں مگر اس وقت عشق کو بھلا دینے کی ضرورت ہے۔ آجکل مسلمانوں پر تو ایسی آفت ہے کہ بہتر تو یوں ہو اگر شخصی شاعری فی الحال ملتوی کر دی جائے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو محض وہ افراد اس میں اپنے کو ڈالیں جو محسوس کرتے ہیں کہ وہ فطرتاً مجبور ہیں بلکہ بیحد مجبور ہیں۔ باقاعدہ شاعری کے اکھاڑوں یا مدرسوں کی سی جو شکلیں بن گئی ہیں ان کو فوراً ختم کر دینا چاہئے۔

ہم اب تک محض ترانوں اور غزلوں میں ڈٹے رہے ہمارا تعلیمیافتہ طبقہ اپنے ذہنوں اور اپنی روحوں کو نرم و لطیف خیالات و استعارات میں لوریاں دیتا رہا اب وقت وہ آگیا ہے کہ ہم انھیں لوریوں کو فوجی ترانوں اور جنگی گیتوں میں تبدیل کر دیں۔ ہمارا معشوق عورت کے بجائے فی الحال اپنی قوم ہو جائے کاش ہم اور ہمارے شعرا و ادبا اس پر عمل کر سکیں

(م حسین)

ہندوستانی کھیل

مصنفہ، الطاف علی صاحب، نگران تربیت جسمانی، جامعہ

ہمارے ملک میں بچے کی جسمانی تندرستی سے نہایت افسوس ناک حد تک بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور
اس کی تفریحی ضروریات کی طرف تو سرے سے توجہ نہیں دی جاتی۔ عام طور پر ہمارے ملک کے بچے جسمانی لحاظ سے
کمزور ہوتے ہیں اور ان کی چال ڈھال میں وہ مستعدی نہیں پائی جاتی جو اُن بچوں میں ملتی ہے جنھیں کثرت سے کھیلنے کے
مواقع ملتے ہیں۔ بچوں کو ہم سے لے کر ۲ گھنٹے تک ہر روز آزادی کے ساتھ کھیلنے کا موقع دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے اعصاب
کی تربیت کرسکیں جو بچہ ایسے ماحول میں تربیت پائے گا وہ ملک و ملت کے لئے سرمایہ افتخار ہوگا اور زندگی کے تمام نشیب و
فراز میں اس پر اعتماد کیا جاسکے گا۔ مصنف نے انھیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر تقریباً ڈیڑھ سو ہندوستانی کھیل اس کتاب میں
درج کئے ہیں جو مختلف عمر کے بچے کھیل سکتے ہیں۔ قیمت عہ

مرقع فطرت

مصنفہ، ڈاکٹر پریم ناتھ صاحب

اس کتاب میں مصنف نے ابتدائے کائنات سے لے کر انسان کے پیدا ہونے تک کی قدرتی داستان
بیان کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ زمانے کے ساتھ انسانی خیالات میں کیسے تبدیلی ہوئی پر حقیقت خیالات کیوں
قایم رہے اور بقیہ کیسے فنا ہو گئے لیکن وہ انسان کی عادت کیوں کر بن گئے۔ سائنس کی رہنمائی میں انسان
نے کائنات کی حقیقت کو کہاں تک سمجھا ہے۔ دنیا اور جانداروں کی پیدائش کیسے ہوئی۔ دیوی، دیوتا،
خدا اور مذہب کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ نیکی اور بدی کیا ہے۔ ان تمام باتوں کو سادے اور آسان طریقے
سے سمجھایا گیا ہے۔ قیمت ۱۲/

باقیاتِ بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم سے اردو دنیا اچھی طرح واقف ہے ان کا پہلا کارنامہ دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ) کا دیباچہ ہے۔ اسی کی بدولت انھوں نے اردو داں طبقے میں مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ اپنی علمی قابلیت اور زبان آوری کی بدولت ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، طرزِ تحریر میں انھوں نے اپنی ایک الگ اور مجتہدانہ راہ نکالی تھی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ اور علمی مباحث میں بھی شگفتگی زباں ہاتھ سے نہ جانے پاتی تھی۔ یہ جواہر ریزے جو ایک طرح سے ان کے علمی وادبی تبرکات ہیں۔ صرف ادب وزبان کی حیثیت سے قابل قدر نہیں ہیں بلکہ ان میں بعض اہم علمی ومعاشرتی مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔ مکتبہ جامعہ نے اس کی ظاہری نمود پر بھی بہت توجہ صرف کی ہے، پوری کتاب ٹائپ میں چھپی ہے، جلد اور گرد پوش نہایت دیدہ زیب۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ)

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

خطوط محمدؐ علی

مولانا محمدؐ علی کی زندہ جاوید اور عظیم الشان شخصیت کا ایک صفحہ تو آپ مضامین محمد علی میں ملاحظہ فرما چکے، مرحوم کی شخصیت کا دوسرا صفحہ "خطوط محمدؐ علی" میں دیکھیے۔

مضامین مرحوم کی سیاسی، اور اجتماعی سرگرمیوں کا مرقع ہیں، اور خطوط آپ کی شخصی اور باطنی زندگی کے آئینہ دار۔ محمد علی کی یہ زندگی بیحد تابناک اور بلند تھی، اس لئے خطوط کا یہ مجموعہ مرحوم کی بہترین متاع ہے۔

بزرگوں کا وفادار اور نیازمند، دوستوں کا جاںنثار اور عاشق زار، بے باک اور بے ریا، ظاہر و باطن میں کھرا، حق کی خاطر اپنوں اور بیگانوں دونوں کی پروانہ کرنے والا، اور مرتے دم تک اپنے اصولوں کا راسخ القدم محمدؐ علی۔ یہ خطوط اسی محمدؐ علی کی تصویر ہیں۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ؍)

مکتبہ جامعہ
دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی